سپر مین آف اسلام
مغز متفکر اسلام
امام جعفر صادقؑ
محمد علی بک ایجنسی
جامع مسجد و امام بارگاہ امام الصادقؑ G-9/2
اسلام آباد فون نمبر 0333-5121442
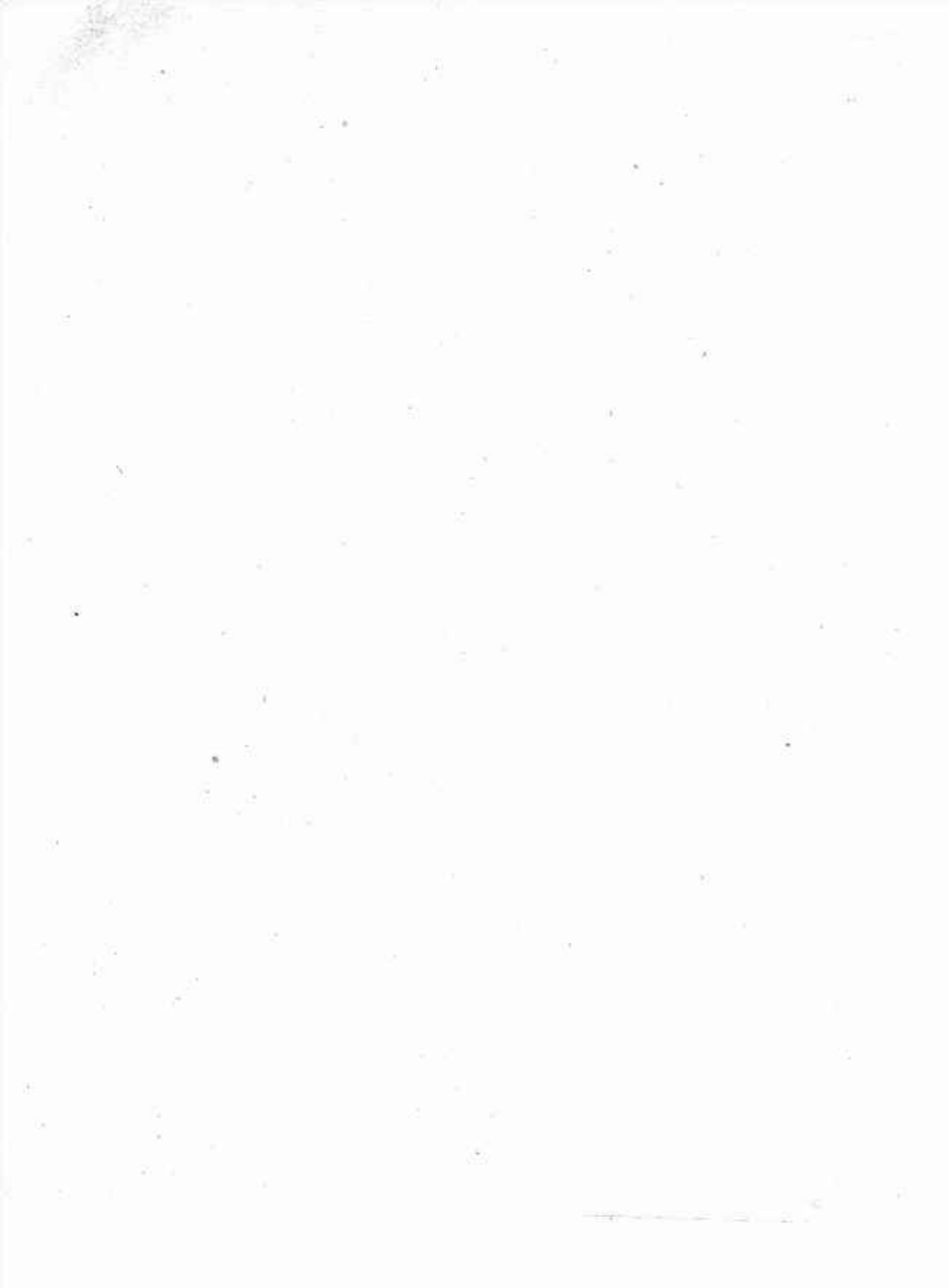
یہ کتاب "سپر برین آف اسلام"

آسمانِ امامت کے بارھویں آفتاب

امامِ زمانہ حضرت حجت ابن الحسن العسکری (امام مہدی عجل اللہ فرجہ الشریف)

کے نام معنون کی جاتی ہے۔

محمد علی بک ایجنسی

ا۔ امامبارگاہ امام الصادقؑ G-9/2 اسلام آباد

فون نمبر 0333-5121442

# سپر برین آف اسلام

## (گولڈ میڈل یافتہ)


| | |
|---|---|
| مرتبہ | ۲۵ محققین (غیر مسلم و مسلم) |
| | اسلامک اسٹڈیز سنٹر اسٹراسبرگ فرانس |
| اردو ترجمہ | سید کفایت حسین نقوی |
| معاونت | سید ذاکر علی زیدی |
| ایڈیشن | دوم |
| تعداد | ۱۰۰۰ |
| قیمت | ۲۰۰ روپے |

ملنے کا پتہ

**محمد علی بک ایجنسی**

۱۔ امامبارگاہ امام الصادقؑ G-9/2 اسلام آباد

۲۔ امامبارگاہ یادگار حسینؑ سٹیلائیٹ ٹاؤن راولپنڈی

۳۔ امامبارگاہ قصر ابو طالبؑ مغل آباد راولپنڈی

۴۔ امامبارگاہ قدیم راجہ بازار راولپنڈی

فون نمبر 0333-5121442

ای میل: m_alibookagency@hotmail.com

http://www.daily-pakistan.com

ہمارے لیے اللہ ہی کافی ہے اور وہی سب سے بہتر مددگار ہے (القرآن)

272727 - 30

جلد 9 | پیر 13 دسمبر 1999ء 4 رمضان المبارک 1420ھ 29 مگھر 2056ب صفحات 12 قیمت 7 روپے | شمارہ 325

# بین الاقوامی شہرت کے حامل ادیب کفایت حسین کے اعزاز میں تقریب

## تقریب میں ان کی معروف تصنیف ''سپر برین آف اسلام'' کو گولڈ میڈل سے نوازا گیا

اسلام آباد (پ ر) ہزارہ آرٹس کونسل مانسہرہ نے بین الاقوامی شہرت کے حامل ادیب اور صحافی سید کفایت حسین شاہ کو ان کی معروف تصنیف سپر برین آف اسلام پر گولڈ میڈل سے نوازا ہے۔ اس سلسلے میں ایک خصوصی تقریب کا انعقاد کیا گیا جس میں کتاب اور صاحب کتاب کے موضوع پر مضامین پڑھے گئے۔ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے مقررین نے کہا کہ یہ کتاب اسلامی تاریخ کیلئے ایک بہترین اور مستند حوالہ قرار پائے گی۔

# "سپر برین آف اسلام" (گولڈ میڈل یافتہ) کا تعارف

یہ کتاب مرکز مطالعات اسلامی اسٹرابرگ (Islamic Studies Centre Strausberg) (فرانس) کے اراکین کی کاوشوں کا ثمر ہے۔ ان اراکین کا تعلق دنیا کے مختلف ممالک سے ہے۔ یہ لوگ عام طور پر اکٹھے نہیں ہوتے لیکن ہر دو سال کے بعد ان کا اجتماع اسی شہر میں ہوتا ہے۔

مستشرقین نہایت ہی لگن اور جانفشانی سے نہ صرف امام جعفر صادقؑ کی شخصیت اور ان کے کارناموں پر گہری تحقیق کر کے اپنے تحقیقی کام کو منصۂ شہود پر لائے ہیں بلکہ ان کی تحقیق امامؑ کی زندگی کے ایسے پہلو بھی اجاگر کرنے کا باعث قرار پائی ہے جو مختلف وجوہات کی بناء پر عمومی معلومات کا حصہ نہ تھے۔

اگرچہ آپ کی علمی شخصیت و روحانی عظمت کا احاطہ کسی انسان کے بس کا روگ نہیں اور نہ ہی پیش نظر کتاب سمندر کو کوزے میں بند کر سکی ہے۔ البتہ ایسی مساعی سے نوع بشر کیلئے آپ کی عظیم علمی خدمات کا اعتراف ضرور سامنے آتا ہے۔

فرانسیسی کے بعد انگریزی، عربی اور فارسی جیسی جدید اور زندہ زبانیں اس کتاب کے وجود سے اپنا دامن مزین کر چکی تھیں لیکن ہمیشہ کی مانند اردو زبان اس سعادت سے ایک عرصہ تک محروم رہی۔ جس کا ازالہ 1995 میں اس کی پہلی اشاعت سے کیا گیا۔ اس پہلی اشاعت کا نام "Super Man in Islam" قرار پایا۔ لیکن کتاب کی یہ اشاعت نام اور کام کے معیاری اور نسبتی تقاضوں کو کماحقہ کمال تک پہنچانے میں کامیابی کے زینے طے کرنے سے قاصر رہی۔

جس کے بعد قارئین کے بعد اصرار، قیمتی آراء اور ان کی تسکین خاطر کو مد نظر رکھتے ہوئے کتاب کو بہتر حالت میں پیش کرنے کی ٹھانی گئی۔ جو اگرچہ جان جوکھوں کا کام تھا، لیکن بہر حال قارئین کے جذبہ اشتیاق کی نسبت پر کاہ کی حیثیت کا بھی حامل نہیں۔ لہٰذا ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ہماری خوش قسمتی ہے اور ہم خداوند متعال کے انتہائی شکر گزار ہیں کہ اس نے ہمیں توفیق بخشی کہ ہم اس مفید مسودے کو اشتباہات سے مبرا و منزہ کر کے ایک مرتبہ پھر بہتر نام اور بہتر کام کے ساتھ قارئین کے حضور پیش کر سکیں۔ لہٰذا احباب کے مشورے کے بعد اس کتاب کا موجودہ نام Super Brain of Islam رکھا گیا۔ ادارہ احباب کا انتہائی مشکور ہے کہ انہوں نے صحیح سمت میں راہنمائی فرمائی۔

ہماری یہ کوشش ہوگی کہ انشاء اللہ جلد ہی مزید مفید کتب منظر عام پر لائی جائیں۔ تاکہ اس طرح دینی مضامین پر مستقل طور پر ہمہ گیر نوعیت کا تسلسل جاری رہے اور تشنگانِ علم، آئمہ کے علمی بحر زخار سے مستفید ہوتے رہیں۔ نیز ہماری یہ کوشش ہے کہ نہ صرف اردو بلکہ انگریزی اور فارسی زبانوں میں بھی اشاعت کا اہتمام کیا جائے۔ اس سلسلے میں انشاء اللہ جلد ہی کام کا آغاز ہوا چاہتا ہے۔ ضمناً پیش نظر کتاب کی اہمیت وافادیت کے متعلق عرض ہے کہ یہ کتاب ہزارہ آرٹس کونسل مانسہرہ اور سوسائٹی فار چلڈرن ایجوکیشن مانسہرہ کی جانب سے 1999 میں گولڈ میڈل حاصل کر چکی ہے۔ اور امید ہے کہ اس کی موجودہ اشاعت کو پہلے سے زیادہ مقبولیت و پذیرائی حاصل ہوگی۔

ادارہ

# Super Brain of Islam

"Super Brain of Islam" کی اشاعت کے سلسلے میں معاونت کرنے والے معزز و محترم حضرات کا مختصر تعارف اور کلمات تشکر

اس کتاب کے بارے میں رائے عامہ کے جائزے سے یہ بات اظہر من الشمس ہوئی ہے۔ کہ یہ کتاب نہ صرف زمانے کے تقاضوں کے عین مطابق بلکہ وقت کی ضرورت ہے۔ اگر پیش نظر کتاب کے متعلق رائے عامہ کے جائزے کو تفصیلاً پیش کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی۔ لہٰذا اختصار کے پیش نظر صرف چند حضرات کا مختصر تعارف اور کلمات تشکر پیش خدمت ہیں۔

**حجۃ الاسلام والمسلمین شیخ محسن علی نجفی**

**پرنسپل جامعۃ اہل البیت، اسلام آباد:**

آپ کی آفاقی نگاہ نے کتاب کا مسودہ دیکھتے ہی اسکی افادیت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ لہٰذا جب کتاب کا مکمل اردو ترجمہ آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو آپ نے نہ صرف اس کی چھپائی کی زبانی و کلامی حوصلہ افزائی فرمائی بلکہ پہلی اشاعت کے موقع پر مختلف اشاعتی اداروں کی نشاندہی بھی کی۔

آپ کا قول ہے کہ "میری دلی خواہش تھی کہ اس کتاب کا کچھ حصہ ترجمہ ہو کر عوام الناس کے استفادہ کیلئے پیش کیا جائے لیکن اس کتاب کا کامل اور من و عن ترجمہ یقیناً ایک عظیم کام ہے"۔

**حجۃ الاسلام والمسلمین محترم جناب عباس ایلیا، مقیم واشنگٹن:**

آپ نے اس کاوش کو زبانی کلامی و کتبی سراہتے ہوئے اسے ایک عظیم کارنامہ قرار دیا ہے، اور اس سلسلے میں حتی المقدور تعاون کی پیشکش کی ہے۔ آپ کے یہی الفاظ نہ صرف ہماری جدو جہد کیلئے مہمیز کا کام دینگے بلکہ ہمارے لیے سعادت و خیر و برکت کا منبع قرار پائینگے۔

جنرل (ر) سید ذاکر علی زیدی : سابق چیئرمین انسٹی ٹیوٹ آف اسٹریٹجک اسٹڈیز، اسلام آباد
اس کتاب کی اشاعت دوم کے سلسلے میں جنرل صاحب نے جس عملی اشتیاق و معاونت کا مظاہرہ کیا ہے اسکے لئے ہمارے پاس شکریہ کے الفاظ نہیں۔ آپ کا یہ عظیم اور قابل تقلید اقدام لائق تحسین و آفرین ہے۔

سید علی رضا نقوی، لاہور :
کتاب کی پہلی اشاعت آپ کی مرہون منت تھی۔ آپ کا شمار ملت کے ان دلسوز افراد میں ہوتا ہے جنکی شب و روز کاوشیں کسی سے پوشیدہ نہیں۔ یقیناً آپ جیسی شخصیات ہی کی بدولت وطن عزیز میں ملت کا بول بالا ہے۔ آپ کا شمار ان عالی دماغ افراد میں ہوتا ہے جو کسی بھی قوم کا Intellegencia کہلاتے ہیں۔ ہم آپکی دینی و سماجی خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر سید ناصر حسین نقوی؛ پشاور
ڈاکٹر صاحب کی ساری زندگی قومی خدمت کے جذبے سے سرشار رہی ہے۔ آپ وہ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے پیش نظر کتاب کے ترجمے کا نہایت ہی قیمتی مشورہ دیا اور فارسی مسودہ مہیا کیا تھا۔ اسکے علاوہ بھی آپ کی ملی خدمات کسی سے پوشیدہ نہیں۔

سید امداد حسین نقوی (اعلی اللہ مقامتہ) پیراں، مانسہرہ۔
آپ کا تعلق ضلع مانسہرہ کے گاؤں پیراں سے تھا۔ آپ کی علاقائی و دینی خدمات زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ اگرچہ آپ اس کتاب کی پہلی اشاعت سے قبل ہی ابدی سفر پر روانہ ہو گئے تھے۔ لیکن آپ کی دیرینہ خواہش یہی تھی کہ یہ کتاب جلد از جلد تشنگانِ علومِ آلِ محمدؐ تک رسائی حاصل کرے تاکہ اسطرح دنیا خصوصاً صادق آل محمدؐ کے کارناموں کی ایک جھلک سے متعارف ہوسکے۔ ہم جوار آئمہؑ میں مرحوم کے بلندیٔ درجات کیلئے دعا گو ہیں۔

### ڈاکٹر علامہ سید شبیہہ الحسن رضوی۔ راولپنڈی ۶

ادارہ آپ کا بیحد ممنون ہے کہ آپ نے حتی المقدور دینی معاملات میں اپنے مفید مشوروں سے نوازنے میں کبھی تساہل وتغافل سے کام نہیں لیا۔ آپ ہی کی پس پردہ کاوشوں کا ثمر ہے کہ ہمارے ملکی اخبارات حقیقی اسلامی موضوعات کو وقتاً فوقتاً منظر عام پر لانے پر مجبور ہیں۔ کتاب کے سلسلے میں آپ نے جن قیمتی آراء سے نوازا ہے۔ ادارہ اس کے لئے آپ کا بیحد مشکور ہے۔ **خصوصاً پی۔ٹی۔وی۔۲ کے حوالے سے آپکی ملی خدمات قابلِ تحسین ہیں۔**

اس کے علاوہ مومنین و مومنات کی ایک کثیر تعداد اس کتاب کی افادیت کی زبردست معترف ہے۔ ہم سب کے ممنون و مشکور ہیں اور بارگاہ احدیت میں محمدؐ و آلِ محمد کے توسل سے ان کی ہر نوع کامیابیوں کے طالب ہیں۔

ادارہ حق محمدؐ و آلِ محمد تمام مومنین و مومنات کی دنیوی کامیابیوں اور اخروی سعادت کے لئے بارگاہ احدیت میں دست بدعا ہے۔

اراکین ادارہ

The Twelfth Apostle's Publications
P.O. Box 483, G.P.O. Islamabad
Islamabad, Pakistan
May 2, 2000

# پیش لفظ

پیش نظر کتاب "سپر برین آف اسلام" سب سے پہلے اسلامک سٹڈیز سنٹر اسٹرا سبرگ نے فرانسیسی زبان میں چھاپی۔ اسکے تراجم دنیا کی کئی جدید زبانوں میں چھپ چکے ہیں۔ یہ ایک تحقیقی کتاب ہے اور اسکے مصنفین میں زیادہ تعداد ان مستشرقین کی ہے جو غیر مسلم ہیں۔

اسٹرا سبرگ کا اسلامک سٹڈیز سنٹر ان اداروں میں سے ہے جو مذاہب پر تحقیق کرتے اور اپنی تحقیقات کو عوام الناس کے استفادہ کیلئے منظر عام پر لاتے رہتے ہیں۔ یہ مستشرقین ہر دو سال میں ایک مرتبہ اجلاس منعقد کرتے ہیں۔ ان کا اجلاس اسٹرا سبرگ (فرانس) کے اہم واقعات میں شمار کیا جاتا ہے۔

آج مغرب میں اسلام اور مسلمان اکابرین کے متعلق جو تحقیق ہو رہی ہے اس سے کون آشنا نہیں۔ اگرچہ مغرب علمی اور سائنسی میدان میں اسلامی ممالک کو بہت پیچھے چھوڑ چکا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ تمام سائنسی علوم کی بنیاد آلِ محمدؐ نے رکھی۔ نہ صرف یہ بلکہ انہوں نے حکمت (فلسفے) کو بھی چیلنج کر کے دنیا کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ انہوں نے فلسفے کے سورماؤں پر تنقید کر کے ان کی غلطیوں کی نشاندہی کی۔

مستشرقین اس بات پر حیران و سرگرداں ہیں کہ آلِ محمدؐ اور خصوصاً امام جعفر صادقؑ نے یہ تمام علوم کیسے حاصل کئے۔ اور کسی تجربہ گاہ کے بغیر کیسے معلوم کیا کہ پانی سے بجلی پیدا ہوتی ہے؟ فلکیات کے متعلق ان کا اظہار خیال کس علمی منبع کا حاصل ہے؟ انہیں کیسے معلوم ہوا کہ مختلف آسمانی ستارے زمین سے کتنے فاصلے پر ہیں؟ اور انہیں کس نے بتایا کہ کرہ ارض پر آلودگی چھا جائیگی؟ وغیرہ وغیرہ۔

البتہ اس کتاب کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ مستشرقین مختلف مقامات پر اس بات کا برملا اعتراف کر رہے ہیں کہ مومنین کا یہ کہنا ہے کہ ان کے آئمہ علم لدنی کے حامل تھے۔ انہیں کسی کے سامنے

زانوئے تلمذ تہ کرنے کی حاجت نہیں تھی۔ وہ منصوص من اللہ تھے۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ مسلم و غیر مسلم علماء نے اپنے اپنے دور میں محمدؐ و آلِ محمدؑ کی علمی برتری اور عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ اس بات سے بھی کسی کو انکار نہیں کہ خداوند تعالیٰ جب اس دنیا کی بساط لپیٹنا چاہے گا تو اس سے قبل آلِ محمدؐ سے ایک ایسے ھادی کا ظہور کرے گا جو ظلم و جور سے بھری ہوئی اس دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دے گا۔ دنیا کے تمام مذاہب اس بات پر متفق ہیں کہ آخری زمانے میں وہ ھادی برحق ضرور ظاہر ہوگا۔ اگرچہ اس ھادی کو تسلیم کرنے کا انداز جداگانہ ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اس بارے کہا ہے۔

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ تو لباسِ مجاز میں
کہ ہزار سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

اس ھادی برحق کا ظہور ایک اٹل حقیقت ہے۔ جب اس کا ظہور ہو گا تو تمام عنوانات اسی کے نام سے ہوں گے اور تمام موضوعات کا رخ اسی کی طرف ہوگا۔ وہ آچکا ہے اور آکر غائب ہو گیا ہے۔ بحکم خدا ظہور فرمائے گا اور دنیا کی کایا پلٹ دے گا۔ آج ہم سب دانستہ یا نادانستہ طور پر اسی کی راہ تک رہے ہیں۔ اور خداوند تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ اس کے ظہور کی گھڑیوں کو قریب تر کر دے۔ (آمین یارب العالمین)

قارئین محترم!

آج کا دور تہذیبی جنگ اور تصادم کا دور ہے۔ مختلف تہذیبیں آپس میں دست و گریباں ہیں۔ مغربی تہذیب نے مشرقی اور اسلامی تہذیبوں کو ہدف بنا رکھا ہے۔ اسکی وسعت پذیری نہ صرف دوسری تہذیبوں کے لئے چیلنج بن کر رہ گئی ہے بلکہ اس نے انہیں روحانی اعتبار سے بھی کمزور کر دیا ہے۔

آج کا دور ہمارے ارباب فکر و دانش اور اہلِ قلم پر بھاری ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ یہ طبقہ عوام میں ایمانی قوت، اسلامی شعور اور اخلاق حسنہ کو نکھارنے میں اپنی بھرپور صلاحیتوں کو کماحقہ استعمال میں لائے تاکہ ہمارے ہاں صحیح معنوں میں اسلامی معاشرے کی تشکیل ہو سکے اور ہم مغرب کی ثقافتی یلغار کا مقابلہ کر سکیں۔ مغربی تہذیب کی یلغار اور چکا چوند

نے ہمارے معاشرے کی بنیادی اکائیوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ اگر اس کا سدباب نہ کیا گیا تو آنے والی نسلیں ہمیں کبھی معاف نہیں کریں گی۔ اسی حقیقت کے پیش نظر اس کتاب کو پیش کیا جا رہا ہے۔ تاکہ ہماری موجودہ اور آئندہ آنے والی نسلیں اسلاف کے کارناموں پر نہ صرف یہ کہ فخر کر سکیں۔ بلکہ ان کے ارشادات سے راہنمائی حاصل کر سکیں۔

جن اسکالرز نے مرکز مطالعات اسلامی کی اس تحقیقی کاوش میں حصہ لیا ہے ان کے نام گرامی مندرجہ ذیل ہیں۔

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۔ | مسٹر آرمان بل | پروفیسر یونیورسٹی آف برسلز اینڈ گان | بلجیئم |
| ۲۔ | مسٹر جان اوربن | پروفیسر یونیورسٹی آف گان | " |
| ۳۔ | مسٹر برونستویک | پروفیسر یونیورسٹی آف پیرس (فرانس) | فرانس |
| ۴۔ | مسٹر کلائیڈ کاھن | " " " " | " |
| ۵۔ | مسٹر اریکو جرالی | پروفیسر یونیورسٹی آف اٹلی | اٹلی |
| ۶۔ | مسٹر ہنری کوربن | پروفیسر یونیورسٹی اینڈ ڈائریکٹر آف تھیالوجی سٹڈیز | فرانس |
| ۷۔ | مسٹر توفیق محل | پروفیسر یونیورسٹی آف اسٹراسبرگ | فرانس |
| ۸۔ | مسٹر فرانسسکو جبرائیلی | پروفیسر یونیورسٹی آف روم | اٹلی |
| ۹۔ | مسٹر رچارڈ گراھم | پروفیسر یونیورسٹی آف جرمنی | جرمنی |
| ۱۰۔ | مس این لمٹن | پروفیسر یونیورسٹی آف لندن | برطانیہ |
| ۱۱۔ | مسٹر جرار لوکینٹ | پروفیسر آف اورینٹل لینگویجز یونیورسٹی آف پیرس | فرانس |
| ۱۲۔ | مسٹر ایون لینن ڈویل فونڈ | ڈائریکٹر انسٹی ٹیوٹ آف نالج ریسرچ، پیرس | فرانس |
| ۱۳۔ | مسٹر ویلفریڈ مڈلونگ | پروفیسر یونیورسٹی آف شکاگو | امریکہ (U.S.A) |
| ۱۴۔ | مسٹر ہنری ماسے | پروفیسر یونیورسٹی آف پیرس | فرانس |
| ۱۵۔ | مسٹر حسین نصر | پروفیسر واشنگٹن یونیورسٹی | امریکہ (U.S.A) |
| ۱۶۔ | مسٹر چارلس پلا | پروفیسر یونیورسٹی آف پیرس | فرانس |

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۷۔ | مسٹر موسیٰ صدر | ڈائریکٹر اسلامک سٹڈیز کالج بیروت | لبنان |
| ۱۸۔ | مسٹر جارج ویزڈا | پروفیسر یونیورسٹی آف لیون | فرانس |
| ۱۹۔ | مسٹر آرنلڈ | " " " " " | " |
| ۲۰۔ | مسٹر الیاس | پروفیسر یونیورسٹی آف کیلیفورنیا | امریکہ |
| ۲۱۔ | مسٹر دوراں ھیج کلف | پروفیسر یونیورسٹی آف لندن | برطانیہ |
| ۲۲۔ | مسٹر فرتز میئر | پروفیسر یونیورسٹی آف بال (پیرس) | فرانس |
| ۲۳۔ | مسٹر جوزف مانوز | پروفیسر یونیورسٹی آف فرائی برگ | جرمنی |
| ۲۴۔ | مسٹر ھینس مولر | " " " " " | " |
| ۲۵۔ | مسٹر ھینس رومر | " " " " " | " |

ان مستشرقین کا تعلق مختلف ممالک سے ہے۔ انہوں نے اس کتاب کی صورت میں جن مطالب کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ آج تک کسی دوسری کتاب کی زینت نہیں بنے۔ حالانکہ میں یہ کہنے میں حق جانب ہوں کہ حضرت امام جعفر صادقؑ کا علمی اور انسانی مرتبہ اس کتاب کی رسائی سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ لیکن امید کی جاتی ہے کہ محققین امام کے بارے میں اس سے زیادہ جامع اور ضخیم مواد تصنیف و تالیف کریں گے۔

ضمناً یہ بات عرض کرتا چلوں کہ کتاب فرانسیسی سے مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوئی تو راقم کو اس کا ایک نسخہ فارسی زبان میں ملا۔ جس کا ترجمہ پیش خدمت کتاب کی صورت میں حاضر ہے۔

فارسی مترجم جناب ذبیح اللہ منصوری نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے کہ اگرچہ میں ایک اثنا عشری مسلمان ہوں لیکن مجھے آج تک یہ معلوم نہ تھا کہ شیعہ مسلک کو جعفری کیوں کہا جاتا ہے؟ مجھے امام جعفر صادق علیہ السلام (چھٹے امام) کے بارے میں اتنا ہی معلوم تھا کہ آپ امام محمد باقرؑ کے فرزند ارجمند اور امام موسیٰ کاظمؑ کے والد گرامی ہیں۔ میں آپ کی سوانح حیات سے مکمل بے بہرہ تھا اور زیادہ سے زیادہ یہی جانتا تھا کہ آپ کی ولادت و شہادت کہاں واقع ہوئیں۔ مجھے قطعاً

معلوم نہ تھا کہ امام جعفر صادقؑ نے زندگی کے بارے میں کیا فرمایا؟ اور کیسے کیسے کارنامے سرانجام دیے؟ حتیٰ کہ اس بات سے بھی نابلد تھا کہ شیعہ مسلک کو جعفری کیوں کہا جاتا ہے؟ کیا ہمارے پہلے امام حضرت علی ابن ابی طالبؑ نہیں ہیں؟ اور کیا امام حسینؑ کی قربانی اور ایثار کو مد نظر رکھتے ہوئے مناسب نہیں کہ شیعہ مسلک کو حسینی کا نام دیا جائے؟

ان تمام سوالوں کا جواب مجھے اس وقت ملا جب امام جعفر صادقؑ کے بارے میں اسلامک اسٹڈیز سنٹر اسٹرابرگ کے مقالہ جات پر مشتمل اس کتاب کو پڑھا۔

یہ الفاظ فارسی مترجم کی ذہنی رسائی کے آئینہ دار ہیں۔ اور ہر کسی کو اپنی رائے رکھنے کا اختیار حاصل ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ رقم کرنے کے سلسلے میں ہاتھ بٹانے پر اپنی اہلیہ، بھائیوں اور مومنین کا مشکور ہوں اور بحق محمدؐ و آلِ محمدؐ، خداوند تعالیٰ سے ان کی صحت، سلامتی، دنیوی و اخروی امور کی اصلاح اور توفیقاتِ خیر میں اضافے کیلئے دست بدعا ہوں۔

التماس دعا

احقر العباد

سید کفایت حسین پیرانشہری

The Twelfth Apostle's Publications
P.O. Box. 483, G.P.O. Islamabad, Pakistan

# فہرست عناوین

# امام جعفر صادقؑ کی ولادت باسعادت

ماہ ربیع الاول کی سترہ تاریخ ۸۲ھ، امام زین العابدینؑ کے گھر میں امام محمد باقرؑ کے صلب مقدس سے مدینہ منورہ میں ایک فرزند ارجمند کی ولادت ہوئی جن کا نام نامی جعفر صادقؑ ہے۔(۱)

جس وقت یہ مولود متولد ہوا تو دائی نے جو بچے کی پیدائش میں مدد کرنے کے لئے آئی تھی دیکھا کہ بچہ چھوٹا اور کمزور ہے۔ اس نے خیال کیا کہ بچہ نہیں بچ سکے گا۔ باوجودیکہ اسے بچے کے زندہ بچ جانے کے بارے میں تردد تھا اس نے خوشخبری کے عوض میں تحفہ حاصل کرنے کو فراموش نہ کیا اور بچے کو ماں کے پہلو میں لٹا کر اس کے والد سے اس خبر کے بدلے تحفہ وصول کرنے کے لئے کمرے سے باہر چلی گئی۔ اگر یہ نومولود لڑکی ہوتا تو دائی ہرگز اس کے والد کو خوشخبری نہ سناتی اور نہ ہی تحفہ طلب کرتی کیونکہ اسے علم تھا کہ کوئی عرب باپ بیٹی کی پیدائش پر تحفہ نہیں دیتا۔ لیکن ہر باپ اگرچہ وہ کتنا ہی مفلس کیوں نہ ہو بیٹے کی پیدائش پر دائی کو تحفہ ضرور دیتا تھا۔ ہجرت کے تراسی (۸۳) سال بعد بھی عربوں نے دور جاہلیت کے اس رواج کو ترک نہیں کیا تھا۔ وہ بیٹی کی پیدائش پر خوش نہیں ہوتے تھے جبکہ بیٹے کی پیدائش پر بھرپور خوشی کا اظہار کرتے تھے۔ دائی نے نومولود کے والد کو تلاش بسیار کے باوجود گھر میں نہ پایا کیونکہ پیدائش کے موقع پر امام محمد باقرؑ گھر میں نہیں تھے پھر دائی کو کسی نے بتایا کہ بچے کے دادا گھر میں موجود ہیں اور وہ انہیں مل سکتی ہے لہٰذا وہ دائی امام زین العابدینؑ سے اجازت لے کر ان کے قریب گئی اور کہا خداوند تعالیٰ نے آپ کو ایک پوتا عطا کیا ہے۔ امام زین العابدینؑ نے فرمایا امید ہے کہ اس کے قدم اس گھر کے لئے برکت کا باعث ہوں گے اور اس کے بعد پوچھا کیا یہ خوشخبری اس کے باپ کو دی ہے ؟ دائی نے کہا وہ گھر پر نہیں ہیں ورنہ یہ خوشخبری ان ہی کو دیتی۔ امام زین العابدینؑ نے فرمایا۔ دل چاہتا ہے اپنے پوتے کو دیکھ لوں لیکن میں نہیں چاہتا کہ اسے اس کی ماں کے کمرے سے باہر لاؤں کیونکہ باہر موسم قدرے ٹھنڈا ہے اور زکام لگنے کا اندیشہ ہے۔ اس وقت امام زین العابدینؑ نے دائی سے پوچھا کیا میرا پوتا خوبصورت ہے؟ دائی میں یہ کہنے کی ہمت نہ ہوئی کہ ان کا پوتا کمزور اور ناتواں ہے اس نے کہا اس کی نیلی آنکھیں بہت خوبصورت ہیں۔ امام زین العابدینؑ نے فرمایا پس اس طرح تو اس کی آنکھیں میری ماں رحمۃ اللہ علیہا کی آنکھوں کی مانند ہیں۔ یزدگرد سوم کی صاحبزادی شہربانو جو امام زین العابدینؑ کی والدہ تھیں ان کی آنکھیں بھی نیلی تھیں۔ گویا اس طرح جعفر صادقؑ نے مینڈل کے قانون کے مطابق نیلی آنکھیں اپنی دادی سے ورثہ میں حاصل کیں(۲)۔

ایک مشہور روایت کے مطابق یزدگرد سوم کی دوسری بیٹی کیہان بانو کی آنکھیں بھی نیلی تھیں جو اپنی بہن کے

ساتھ اسیر کر کے مدائن سے مدینہ لائی گئیں تھیں۔اس طرح امام جعفر صادقؒ نے دو ایرانی شہزادیوں سے نیلی آنکھیں ورثہ میں پائی تھیں۔ کیونکہ کیہان بانو ان کی نانی تھیں۔ امام علی ابن ابی طالبؑ نے جو مدینہ میں ایرانی حکومت کے خاندان کے قیدیوں کے بہی خواہ تھے' شہربانو کو اپنے فرزند حسینؑ کے عقد میں دیا اور کیہان بانو کو حضرت ابوبکر کے بیٹے محمد بن ابوبکر کے ساتھ شادی کی کیونکہ جناب امیرؑ حضرت محمد بن ابوبکر کو اپنے بیٹوں کی مانند چاہتے تھے اور مسند نشین ہونے کے بعد محمد بن ابوبکر کا رتبہ اتنا بلند کیا کہ انہیں مصر کا گورنر مقرر فرمایا جو بعد میں معاویہ کے حکم پر اسی ملک میں قتل ہوئے۔ محمد بن ابوبکر اور کیہان بانو کے ہاں ایک بیٹا قاسم پیدا ہوا اور قاسم کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام ام فروہ تھا ان کا نکاح محمد باقرؑ کے ساتھ ہوا۔ اس طرح ماں کی طرف سے بھی امام جعفرصادقؒ کا رشتہ نیلی آنکھوں والی ایک ایرانی شہزادی سے جا ملتا ہے۔ ابھی تک مہاجرین مکہ میں نومولود کو دودھ پلانے کے لئے اجرت پر رکھنے کا رواج موجود تھا۔ گو جعفر صادقؒ کی پیدائش کے وقت ہجرت کو تراسی (۸۳)سال ہو گئے تھے اور اب نہ تو مہاجرین مکہ کو مہاجرین کے نام سے نہ ہی مدینہ کے قدیم باشندوں کو انصار کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

لیکن دوسرے مہاجر خاندانوں کی طرح امام زین العابدینؒ کے خاندان میں بھی نومولود کو دائی کے سپرد کرنے کا رواج ابھی باقی تھا۔ جعفر صادقؒ کی ولادت پر ان کے والد گرامی بیحد خوش ہوئے اور انہیں دودھ پلانے کے لئے ایک دائی کے بارے میں سوچنے لگے' لیکن ام فروہ نے کہا میں اپنے بیٹے کو خود دودھ پلاؤں گی۔شاید نومولود کی کمزوری اور ناتوانی کو دیکھ کر ماں کو ایسا خیال آیا ہو اور پریشان ہوگئی ہوں کیونکہ دائی جتنی بھی رحمدل کیوں نہ ہو ماں کی طرح نگہداشت نہیں کرسکتی۔ جعفر صادقؒ کے بچپن کے بارے میں شیعوں کے ہاں کئی روایات پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے کچھ روایات تو بغیر راوی کے ہیں جبکہ کچھ روایات کے راوی موجود ہیں۔

روایات میں آیا ہے کہ امام جعفر صادقؒ ختنہ شدہ اور دانتوں کے ساتھ دنیا میں تشریف لائے۔ اگرچہ ختنہ شدہ کی روایت کو قبول کیا جا سکتا ہے کیونکہ بعض لڑکے دنیا میں ختنہ شدہ آئے ہیں لیکن اس روایت کی صحت میں تامل ہے کہ وہ دانتوں کے ساتھ دنیا میں تشریف لائے۔ کیونکہ ایک تو علم حیاتیات کی رو سے یہ بات صحیح نہیں دوسرا یہ کہ اگر ان کے دانت تھے تو ان کی ماں انہیں دودھ نہیں پلا سکتی تھیں اور تجربہ شاہد ہے کہ جب بچہ دانت نکالتا ہے توماں بچے کو دودھ دینے میں تکلیف محسوس کرتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب بچہ دانت نکالنا شروع کرتا ہے تو اس کا دودھ چھڑا دیا جاتا ہے۔(۳)

امام جعفر صادقؒ کی ولادت کے متعلق ایک اور روایت یہ ہے کہ جب آپ اس دنیا میں تشریف لائے تو آپ نے فوراً باتیں کرنا شروع کردیں۔ اسی طرح کی ایک اور روایت ابوہریرہ صحابی کے ذریعے پیغمبراکرم ﷺ سے نقل کی گئی ہے کہ انہوں نے کہا' میں نے پیغمبراسلام ﷺ سے سنا ہے کہ ان کی نسل میں ایک ایسا

فرزند پیدا ہوگا جس کا نام صادقؒ ہوگا اور کسی دوسرے کا یہ نام نہ ہوگا۔ جہاں کہیں بھی صادق کا نام لیں گے سب سمجھ جائیں گے کہ کہنے والوں کا مطلوب وہی ہے۔ اگرچہ ابوہریرہ سے نقل کی گئی کچھ روایات جھوٹ پر مبنی بھی ہیں لیکن خود ابوہریرہ ایک سادہ انسان تھا اور شاید جھوٹا نہیں تھا لیکن چونکہ اسے پیغمبر اسلام ﷺ بہت عزیز تھے اور دن کا کچھ حصہ آپؐ کے ہمراہ گزارتا تھا اس لئے بعض جعلی حدیثیں گھڑنے والوں نے بہتری اس میں دیکھی کہ وہ حدیثوں کو ابوہریرہ سے منسوب کریں تاکہ پڑھنے اور سننے والے دونوں انہیں قبول کرلیں۔ چنانچہ بعض جعلی حدیثیں گھڑنے والوں نے شاید پشیمانی یا ندامت ضمیر کی وجہ سے اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے جعلی حدیثیں گھڑی تھیں۔

یہ بات واضح ہے کہ اس طرح کی روایات تاریخی لحاظ سے قابل قبول نہیں ہیں اور یہ روایات شیعوں کے اپنے امام کے علم اور قدرت مطلقہ کے بارے میں اعتقاد کا نتیجہ ہیں۔ چونکہ ان کے ہاں امام منصوص من اللہ اور علم لدنی کا مالک ہوتا ہے اسی لئے کہتے ہیں کہ امام بچپن میں بھی ویسا ہی ہوتا ہے جیسا جوانی اور بڑھاپے میں، لیکن ایک تاریخی محقق امام جعفر صادقؒ کو پہچاننے کے لئے اہم ترین مسائل کی طرف توجہ دیتا ہے اور ایسی روایات کو خاطر میں نہیں لاتا۔

## بچپن

امام جعفر صادقؒ کے بچپن کے دوران چار چیزیں ہمیں ایسی ملتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ قدرت ان کے موافق رہی ہے۔ امام جعفر صادقؒ لاغر اور امراض الاطفال کے مریض ہونے کے باوجود زندہ رہے اور جونہی ان کی عمر دو سال ہوئی وہ صحتمند ہوگئے۔ جبکہ دوسری روایت سے پتہ چلتا ہے کہ امام جعفر صادقؒ نے ایک خوشحال گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ان کے والد و دادا مدینہ کے کھاتے پیتے لوگوں میں شمار کئے جاتے تھے۔۔ آپؒ کی والدہ محترمہ ام فروہ خاندان ابوبکر کی اکثر عورتوں کی مانند پڑھی لکھی تھیں اور ان کے والد گرامی امام محمد باقرؒ جلیل القدر دانشور تھے۔

ماں اور باپ نے امام جعفر صادقؒ کو دو سال سے ہی تعلیم دینا شروع کردی تھی اور موجودہ زمانے کی تعلیم و تربیت یہ کہتی ہے کہ ایک بچے میں حافظے کی قوت کا بہترین زمانہ دو سال اور پانچ سال یا چھ سال کے درمیان ہوتا ہے۔ دور حاضر کے ماہرین تعلیم کا یہ بھی کہنا ہے کہ دو سال سے چھ سال کی عمر تک کے عرصے میں مادری زبان کے علاوہ دو اور غیر ملکی زبانیں بھی بچے کو تعلیم دی جا سکتی ہیں۔ عموماً" وہ خاندان جن کے آباء و اجداد دانشمند ہوتے ہیں ان میں دانشمند بچے پیدا ہونے کے مواقع عام

لوگوں کی نسبت زیادہ ہوتے ہیں۔
امام جعفر صادقؒ کے والد گرامی ایک دانشمند انسان تھے اور ان کے دادا امام زین العابدینؑ کا شمار بھی فاضل لوگوں میں ہوتا تھا۔ انہوں نے بہت سی کتابیں لکھیں جن کا ذکر ابن الندیم صحاف نے اپنی کتاب "الفہرست" میں کیا ہے لیکن افسوس اب یہ کتابیں ناپید ہیں۔ امام جعفر صادقؒ والدین کی اکلوتی اولاد نہیں تھے بلکہ آپ کے چند بھائی تھے۔ امام محمد باقرؑ اور ان کے والد گرامی امام زین العابدینؑ کو دوسری اولاد کو پڑھانے میں اتنی دلچسپی نہیں تھی جتنی امام جعفر صادقؒ کو پڑھانے میں تھی۔ اسی لئے امام جعفر صادقؒ کو دو سال کی عمر میں ہی پڑھانا شروع کردیا تھا۔ کبھی آپ کے دادا امام زین العابدینؑ آپ کو پڑھاتے تھے اور کبھی آپ کے والد گرامی۔
ماں، باپ اور دادا کی طرف سے خصوصی توجہ اس لئے تھی کہ امام جعفر صادقؒ غیر معمولی طور پر ذہین تھے۔ شیعہ اس ذہانت و فطانت کو امامؑ کی خوبیوں میں سے جانتے ہیں لیکن مشرق و مغرب میں ایسے بچے ہو گزرے ہیں جو غیر معمولی ذہین و فطین تھے، حالانکہ وہ امام نہیں تھے۔
مشرق میں ابن سینا اور ابوالعلا مصری جبکہ مغرب میں ٹالسٹائی (۴) ایسے افراد تھے جنہیں بچپن میں جو کچھ صرف ایک مرتبہ پڑھا دیا جاتا تھا وہ اسے کبھی نہیں بھولتے تھے۔ یہ تین نام نمونے کے طور پر ذکر کئے ہیں ان کے علاوہ بھی بہت سے لوگ ایسے ہو گزرے ہیں جو غیر معمولی طور پر ذہین اور فطین شمار کئے جاتے ہیں۔
مدینہ کی دائی جو پیدائش میں زچہ کی مدد کرتی تھی ایک طرح کی سرجن ہوتی تھی کیونکہ وہی بچے کا ختنہ بھی کرتی تھی۔ اسی دائی نے امام جعفر صادقؒ کی ولادت کی خبر ان کے دادا امام زین العابدینؑ تک پہنچائی۔ آپؒ کے بھائی کا ختنہ بھی کیا تھا اور اسے تین دینار معاوضہ دیا گیا تھا۔ جس دن اس نے امام جعفر صادقؒ کی ولادت کی خوشخبری ان کے دادا کو دی اسے پانچ دینار عطا کئے گئے کیونکہ ایک معزز عرب گھرانے میں بچے کی پیدائش ایک غیر معمولی اور پر مسرت واقعہ ہوتا تھا۔
کہتے ہیں کہ جب امام جعفر صادقؒ دو سال کے ہوئے تو ام فروہ نے ان کے لئے درج ذیل اشعار پڑھے۔ آپؒ اکثر بچپن میں اس وقت جبکہ آپ ایک چھوٹی سی تلوار اور لکڑی لے کر ایک کھیل جسے "تلوار کا رقص" کہا جاتا ہے دوسرے بچوں کے ہمراہ کھیلتے تھے اور انہی اشعار کو پڑھتے تھے۔
البشر و احبابا۔ قده طال نما۔ وجهه بدر السماء۔ یعنی "تمہیں مبارک ہو کہ اس کا قد بلند ہو رہا ہے، وہ بڑا ہو رہا ہے اور اس کا چہرہ چودھویں کے چاند کی مانند ہے"۔
امام جعفر صادقؒ کا گھر جس میں ان کے پردادا حسینؑ ابن علیؑ پیدا ہوئے تھے مسجد نبویؐ کے پہلو

میں واقع تھا۔ مسجد کی توسیع کی غرض سے اسے گرا دیا گیا اور جو رقم اس کے بدلے میں بیت المال سے ملی اس سے انہوں نے ایک جدید روڈ کے کنارے (جس کا نام مستی تھا) کچھ زمین خرید کر وہاں ایک گھر بنایا۔ یہ گھر بھی مدینہ اور مکہ کے بہت سے دوسرے گھروں کی مانند ایرانی معماروں نے تعمیر کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس گھر کا صحن حضرت علیؑ نے بنوایا تھا جو کافی وسیع تھا اور بچوں کے کھیل کود کے لئے بہترین جگہ تھی۔ امام جعفر صادقؑ بھی جب سبق سے فارغ ہوتے تو دوسرے لڑکوں کے ساتھ اس صحن میں کھیل کود میں مشغول ہو جاتے۔

والد گرامی امام محمد باقرؑ کے حلقہ درس میں ان کی حاضری کے متعلق چند روایات ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ والد کے مدرسہ میں پانچ سال کی عمر میں داخل ہوئے تھے۔ تاہم مراکش کا ایک مسلمان مورخ ابن ابی رندقہ (۵) جس کا نام محمد اور کنیت ابوبکر تھی جو ۴۵۱ھ قمری میں پیدا ہوا اور جس نے ۵۲۰ھ میں وفات پائی' اپنی کتاب میں مختصر نام کے ساتھ لکھتا ہے "امام جعفر صادقؑ دس سال کی عمر میں اپنے والد کے درس میں جانے لگے" اور یہ روایت عقلی نظر آتی ہے۔ اس سے پہلے امام محمد باقرؑ اپنے بیٹے کو گھر پر درس دیتے تھے لیکن وہ درس جس میں چند طلباء ہوتے اس میں آپؑ شریک نہیں ہوتے تھے۔

## مکتب تشیع کا نجات دہندہ

باوجودیکہ حضرت علی ابن ابی طالبؑ نے اپنی زندگی کے دوران علم کو پھیلانے کی غرض سے کافی کوششیں کیں لیکن لوگ علم کے حصول کی طرف زیادہ راغب نہیں ہوئے جس کی ایک وجہ خشک طرز تعلیم بھی تھا۔ اس ضمن میں دیکھیں گے کہ مسلمان حصول علم کی طرف اس وقت تک راغب نہیں ہوئے جب تک امام صادقؑ نے طرز تعلیم نہ بدلا۔ امام محمد باقرؑ مدینہ کی اسی مسجد میں درس دیتے تھے جسے حضرت محمد ﷺ اور ان کے صحابہ نے ہجرت کے بعد مدینہ میں بنایا تھا اور خلفائے اسلامی کے دور میں اس میں توسیع کی گئی' جو کچھ امام محمد باقرؑ کے ہاں پڑھایا جاتا تھا وہ تاریخ کے کچھ حصے 'علم نحو اور علم رجال کے کچھ حصے اور خصوصاً "ادب یعنی شعر (جس میں نثر شامل نہ ہوتی تھی) پر مشتمل ہوتا تھا عربوں کے ادب میں امام جعفر صادقؑ کے زمانے تک نثر کا وجود نہیں تھا۔ ماسوائے اس کے کہ علی ابن ابی طالبؑ نے اپنی زندگی میں جو کچھ لکھا۔

جو طلباء امام محمد باقرؑ کے درس میں حاضر ہوتے تھے ان کے پاس کتابیں نہیں ہوتی تھیں' اور امام محمد باقرؑ بھی بغیر کتاب کے پڑھاتے تھے۔ اس مدرسے کے جو طلباء ذہین ہوتے تھے جو کچھ امام باقرؑ کہتے

یاد کر لیتے اور جو ذہین نہیں ہوتے تھے وہ استاد کے درس کو مختصراً" تختی پر لکھ لیتے اور پھر گھر جا کر بڑی محنت سے کاغذ پر منتقل کر لیتے وہ تختی اس لئے استعمال کرتے تھے کہ کاغذ ان دنوں بہت مہنگا ہوتا تھا اور وہ اس قدر کاغذ استعمال نہیں کر سکتے تھے جبکہ تختی پر لکھا ہوا مٹ سکتا تھا اس طرح تختی دوبارہ استعمال میں لائی جا سکتی تھی۔شاید آج کتاب کے بغیر تعلیم ہمیں عجیب لگے لیکن پہلے زمانے میں مشرق و مغرب میں استاد کتاب کے بغیر تعلیم دیتے تھے اور ان کے شاگرد استاد کے درس کو یاد کر لیتے۔اور اگر اپنے حافظے پر اعتماد نہ ہوتا تو گھر جا کر لکھ لیتے تھے۔ آج بھی ایسے استاد موجود ہیں جو کتاب کے بغیر پڑھاتے ہیں۔ جو علوم محمد باقرؑ مسجد مدینہ میں پڑھاتے تھے وسیع نہیں ہوتے تھے صرف ادب (Literature) وسیع ہوا تھا۔ تاریخ کی تعلیم بھی اتنی ہی تھی جتنی قرآن اور تورات میں مذکور ہے اور چونکہ ابھی یونانی کتابوں کا سریانی سے عربی میں ترجمہ نہیں ہوا تھا اس لئے یورپ کی تاریخ (History of Europe) بھی نہیں پڑھائی جاتی تھی۔

امام جعفر صادقؑ ایک ذہین طالب علم تھے اس لئے آسانی سے والد گرامی کے درس کو یاد کر لیتے تھے۔ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ محمد باقرؑ اس لئے باقر کہلائے کہ انہوں نے علم کی کھیتی کو چیرا کیونکہ باقر کے لفظی معنی چیرنے والے اور کھولنے والے کے ہیں۔جہاں تک ہمارا خیال ہے یہ لقب یا صفت امام باقرؑ کو اس وقت ملی جب آپ نے دیگر علوم کے ساتھ ساتھ علم جغرافیہ اور دیگر یورپی علوم کا اضافہ کیا۔اس وقت امام جعفر صادقؑ کی عمر اندازاً" پندرہ یا بیس سال تھی۔بعض کا خیال ہے کہ علم جغرافیہ سریانی کتابوں سے عرب میں آیا اور جب عرب مصر گئے تو بطلیموس کے جغرافیہ سے واقف ہوئے اور جغرافیہ کی تعلیم کا آغاز امام جعفر صادقؑ کے درس سے ہوا۔

بطلیموس نے جغرافیہ کے علاوہ ہیئت کے بارے میں بھی بحث کی ہے۔ چونکہ امام جعفر صادقؑ ستارہ شناسی (علم نجوم) میں بھی ماہر تھے اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ علم نجوم کو اپنے والد گرامی سے بطلیموس کی کتاب سے پڑھا ہوگا۔لیکن آج ہم جانتے ہیں کہ عرب بطلیموس کے جغرافیہ و ہیئت کے جاننے سے پہلے بھی ستاروں کو پہچانتے تھے اور ان کے لئے انہوں نے مخصوص نام بھی گھڑے ہوئے تھے۔ اس بارے میں ہمیں کوئی علم نہیں کہ یہ نام کس موقع پر گھڑے گئے تھے اور ان کے گھڑنے والا کون تھا ؟ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ جب کوئی عرب بدو مصر گیا ہوگا تو قبطیوں سے ملا ہوگا اور ان کی مدد سے اس نے بطلیموس کی کتاب تک رسائی حاصل کی ہوگی اور وہاں سے اس نے ستاروں کی شناخت کرنے کے بعد ان کے نام بھی رکھے ہوں گے۔ لہٰذا بطلیموس کی کتاب نے صرف علم نجوم (جو امام جعفر صادقؑ اپنے والد سے پڑھتے تھے) کو سیکھنے میں مدد دی ہوگی' نہ یہ کہ انہیں

علم نجوم سکھایا ہوگا۔ امام محمد باقرؑ نے جغرافیہ اور تمام مصری علوم کا مدرسہ کے دوسرے علوم پر اضافہ کیا اور اس بارے میں ہمارے پاس کوئی تاریخی سند نہیں کہ انہوں نے تمام مغربی علوم کو دوسرے علوم کے ساتھ پڑھایا۔ لیکن ہم دو قرینوں کی بناء پر یہ بات کہتے ہیں۔

پہلا یہ کہ امام محمد باقرؑ نے یقیناً" علم جغرافیہ اور ہیئت کی تدریس کا مدرسے میں آغاز کیا ہوگا ورنہ ہرگز شیعہ انہیں "باقر" کا لقب نہ دیتے اور زیادہ احتمال یہی ہے کہ انہوں نے دوسرے مغربی علوم کو بھی مدرسہ میں داخل کیا ہوگا جبھی تو وہ "باقر" کہلائے۔دوسرا قرینہ یہ ہے کہ جس وقت امام جعفر صادقؑ نے تدریس شروع کی تو آپؑ جغرافیہ' ہیئت' فلسفہ اور فزکس بھی پڑھاتے تھے جبکہ یہ بات تحقیق شدہ ہے کہ جس وقت امام جعفر صادقؑ نے پڑھانا شروع کیا تو اس وقت تک مغربی (یونانی) فلسفہ و فزکس ابھی تک سریانی سے عربی میں ترجمہ نہیں ہوئے تھے اور مترجمین نے صرف ترجمہ کرنے کا آغاز ہی کیا تھا اور بعض فلسفی اصطلاحات کو ابھی سمجھ نہیں پائے تھے۔

اس بناء پر ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ نے مغربی علوم کو اپنے پدر بزرگوار سے سیکھا اور جب ان علوم میں ملکہ حاصل کرلیا تو ان میں اضافہ بھی کیا اور اگر امام جعفر صادقؑ اپنے پدر گرامی سے ان علوم کو جن کا ابھی سریانی سے عربی میں ترجمہ نہیں ہوا تھا' نہ سیکھتے تو ہرگز نہ پڑھا سکتے تھے۔

شیعہ اس بارے میں یہ کہتے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ کا علم لدنی تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہر ایک کا باطنی شعور اس کے ظاہری شعور کے برعکس تمام انسانی اور دنیوی علوم کا خزانہ ہے اور آج کے علوم بھی اس نظریہ کو مثبت قرار دیتے ہیں کیونکہ آہستہ آہستہ بیالوجی (Biology) کے مطالعے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ ہمارے بدن کے خلیوں (Cells) کا ہر مجموعہ تمام ان معلومات کو جو اسے تخلیق کے آغاز سے آج تک جاننا چاہئیں وہ جانتا ہے۔ شیعوں کے عقیدہ کے مطابق جب ایک انسان پیغمبر یا امام بنا کر بھیجا جاتا ہے تو اس کے ظاہری اور باطنی شعور کے درمیان کے تمام پردے اٹھ جاتے ہیں اور امام یا پیغمبر باطنی شعور کی معلومات کی بناء پر تمام انسانی اور غیر انسانی معلومات سے استفادہ کرتا ہے۔

شیعہ' محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رسول مبعوث ہونے کی بھی اسی طرح وضاحت کرتے ہیں کہ آپؐ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے اور ان کے پاس علم نہ تھا اور غار حرا میں مبعوث ہونے کی رات کو' جب جبرائیل ان پر نازل ہوئے تو کہا "پڑھو" ۔ پیغمبرؐ نے جواب دیا میں نہیں پڑھ سکتا (٦)۔
جبرائیل نے دوبارہ زور دے کر کہا۔ "پڑھو" اور فوراً وہ پردے جو ان کے ظاہری اور باطنی

شعور کے درمیان حائل تھے' اٹھ گئے اور فقط ایک لمحے میں نہ صرف یہ کہ محمد بن عبداللہ ﷺ خواندہ ہوگئے بلکہ تمام انسانی علوم سے واقف ہوگئے۔ شیعہ باطنی شعور کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہر کوئی ایک عام باطنی اور ایک بیکراں باطنی شعور کا مالک ہے۔ عام افراد سوتے میں عام باطنی شعور سے وابستہ ہوتے ہیں اور جو کچھ وہ خواب میں دیکھتے ہیں وہ ان کے اور ان کے عام باطنی شعور کے رابطے کی نسبت ہوتا ہے اور کبھی عام افراد کا جاگنے کی حالت میں اپنے عام باطنی شعور سے رابطہ قائم ہو جاتا ہے اور جو کچھ وہ دیکھتے ہیں وہ عام باطنی شعور کی وجہ سے دیکھتے ہیں۔ لیکن صرف امام کا بیکراں باطنی شعور جس میں تمام انسانی اور عالمی علوم پوشیدہ ہیں' سے رابطہ قائم ہوتا ہے اور بعثت کی رات کو صرف ایک لمحہ میں اپنے بیکراں باطنی شعور سے مربوط ہوگئے تھے اور اس عقیدہ کی بنیاد پر علوم امام جعفر صادقؑ کو علم لدنی مانا جاتا ہے۔ یعنی جو ان کے باطنی شعور بیکراں کے خزانے میں موجود تھا۔ شیعوں کا یہ مذہبی عقیدہ اپنی جگہ قابل احترام ہے لیکن ایک غیرجانبدار مورخ اس عقیدہ پر ایمان نہیں لاتا' وہ تاریخی سند مانگتا ہے یا کہا جاسکتا ہے کہ وہ مادی سند تلاش کرتا ہے تاکہ وہ سمجھ سکے کہ کس طرح امام جعفر صادقؑ جو درس دینے تک عرب سے باہر نہیں گئے تھے (اگرچہ نصف عمر کے بعد کئی مرتبہ دوردراز سفر پر گئے) کس طرح انہوں نے فلسفہ اور مغربی فزکس پڑھائی جبکہ اس وقت تک کسی بھی مشہور عرب استاد نے ان علوم کو نہیں پڑھایا تھا۔ پس ہم اندازاً" یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح علم ہیئت و جغرافیہ قبطیوں کے ذریعہ عربوں تک پہنچا اور امام محمد باقرؑ کے درس میں پڑھایا گیا اسی طرح فلسفہ اور مغربی فزکس بھی امام محمد باقرؑ کے حلقہ درس میں شامل ہوئی اور بعد میں اپنی ذاتی تحقیق (ریسرچ) کی بناء پر اس میں خاطرخواہ اضافہ کیا۔

۸۶ھ میں امام جعفر صادقؑ کی عمر صرف تین سال تھی' اسی دوران عبدالملک بن مروان اموی خلیفہ نے دنیا کو وداع کہا اور اس کا بیٹا ولید بن عبدالملک خلیفہ بنا۔ اس نئے خلیفہ نے اپنے پہلے حکم میں ہی ہشام بن اسمٰعیل حاکم مدینہ کو معزول کیا اور اس کی جگہ عمربن عبدالعزیز کو حاکم مدینہ مقرر کیا جو اس وقت چوبیس سالہ خوبصورت نوجوان تھا۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ اموی خلفاء جن کی کرسی خلافت دمشق میں تھی پہلے شامی بادشاہوں کی تقلید کرتے تھے اور انہی کی طرح شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ سے رہتے تھے اور مصر کا حاکم جو اموی خلیفہ کی طرف سے مقرر کیا جاتا تھا۔ دارالحکومت میں ایک دربار سجاتا اور شان و شوکت سے زندگی گذارتا تھا۔

ہشام بن اسمٰعیل (سابق حاکم مدینہ) اموی خلیفہ کی مانند دمشق میں زندگی گزارتا تھا مگر جب عمر بن عبدالعزیز مدینہ میں آئے تو نہایت انکساری سے مسجد امام محمد باقرؑ کا دیدار کرنے گئے اور کہا کہ مجھے

معلوم تھا کہ آپ درس میں مشغول ہیں اور بہتر یہی ہوتا کہ جب آپ درس سے فراغت پاتے تو میں حاضر خدمت ہوتا مگر شوق زیارت کے باعث صبر نہ کر سکا۔ بندہ جب تک اس شہر میں مقیم ہے آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہے۔

یہاں اس نکتہ کی وضاحت ضروری ہے کہ علی ابن ابی طالبؑ کی اولاد اموی خلفا کے زمانے میں مدینے سے باہر کہیں بھی نہیں رہ سکتی تھی اور اگر یہ لوگ کسی اور جگہ زندگی بسر کرنا چاہتے تو نہ صرف یہ کہ اموی حاکم کا نشانہ بنتے بلکہ ان کی زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔

امام زین العابدین (ع) اسی لئے مدینے میں پڑھاتے تھے کہ کسی دوسرے شہر میں درس کے لئے نہیں جا سکتے تھے چونکہ شہر مدینہ مدینتہ النبیؐ کے نام سے مشہور تھا اور ان کا گھر بھی وہیں تھا لوگ ان کا احترام کرتے تھے۔ اموی خلفا میں اتنی جرات نہیں تھی کہ انہیں وہاں تکلیف پہنچائیں یا ان کے درس میں رکاوٹ ڈالیں۔ یہ اس لئے عرض کیا ہے کہ اس بات پر حیرانگی نہ ہو کہ یہ حضرات اموی حاکم ھشام بن اسمٰعیل کی موجودگی میں کس طرح مدینے میں پڑھاتے رہے۔ ۸۸ھ میں ولید بن عبدالملک نے اپنی خلافت کے تیسرے سال مسجد مدینہ کی توسیع کا ارادہ کیا۔ پیغمبرؐ اسلام اور ان کے صحابہ کی طرف سے اس مسجد کو بنانے کی تاریخ مشہور ہے اور یہاں بلڈنگ کی تشریح کا تذکرہ ضروری نہیں۔

اس مسجد کو اس سے پہلے بھی ایک بار وسعت دی گئی تھی اور پیغمبرؐ اسلام کی تمام ازواج کے گھر جو اسی میں تھے بھی سلامت رکھے گئے۔ مگر بعض بیبیوں نے آنحضرتؐ کی وفات کے بعد خلفائے اربعہ کی معقول امداد سے حجروں سے باہر گھر لے لئے تھے اور ان حجروں کو خیرباد کہہ کر دوسرے مکانوں میں رہائش پذیر ہو گئیں۔

۸۸ھ میں پیغمبرؐ اسلام کی آخری زوجہ جو مسجد کے احاطے میں قیام پذیر تھیں یا تو وہاں سے کسی دوسری جگہ چلی گئی تھیں یا اس دنیا سے ہی رخصت ہوگئی تھیں کیونکہ مسجد کی توسیع میں اور کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ اس لئے اموی خلیفہ نے حاکم مدینہ کو حکم دیا کہ پیغمبرؐ کی تمام ازواج کے گھروں کو مسمار کر کے مسجد کو چالیس ہزار مربع گز تک وسعت دی جائے۔ طول دو سو گز اور عرض بھی دو سو گز ہو ۔ اس ضمن میں اردگرد کے مکانات بھی خرید لئے جائیں۔ عمر بن عبدالعزیز نے ایرانی معمار کو جو مسجد کی توسیع کا ناظم تھا کہا کہ میں امام محمد باقرؑ کا جو مسجد میں درس دیتے ہیں بیحد احترام کرتا ہوں لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ تمہارے مزدور اس طرح کام کریں کہ ان کے درس میں خلل واقع نہ ہو۔ جب مسجد مدینہ کی نئے سرے سے بنیادیں رکھی جا رہی تھیں تو امام جعفر صادقؑ پانچ برس کے تھے۔ (اگر ان کی

تاریخ پیدائش کو ۸۰ھ مان لیا جائے تو اس وقت ان کی عمر آٹھ سال تھی) جب انہوں نے اپنے والد گرامی سے کہا کہ میں اس مسجد کی تعمیر میں شرکت کرنا چاہتا ہوں۔ تو ان کے والد گرامی نے فرمایا بیٹا تم ابھی چھوٹے ہو اس لئے تعمیراتی کام میں حصہ نہیں لے سکتے۔ لیکن بعد میں امام محمد باقرؑ راضی ہوگئے کہ ان کا بیٹا مسجد کے کام میں حصہ لے۔ بعض کہتے ہیں کہ مسجد کی تعمیر میں امام جعفر صادقؑ کی شرکت یوں تھی جیسے عموماً" بچے تعمیر مکان کے دوران مٹی گارے سے کھیلنے کا شوق رکھتے ہیں' لیکن امام جعفر صادقؑ کا مسجد مدینہ کی تعمیر میں حصہ لینا کھیل کود سے قطعی مختلف تھا۔ وہ کمزور و ناتوان ہونے کے باوجود تعمیر میں مزدوروں کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ دیکھا گیا ہے کہ جب لڑکے آکر ان سے مستی روڈ پر کھیلنے کو کہتے تو وہ انکار کردیتے اور کہتے کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں مسجد میں کام کروں۔ البتہ درس پڑھنے اور مسجد میں کام کرنے کے علاوہ جب بھی فرصت ملتی امام جعفر صادقؑ مستی روڈ پر اپنے ہم عمر لڑکوں سے کھیلتے تھے۔

لڑکوں کے کھیل دنیا میں تقریباً" ایک ہی جیسے ہیں اور شاید ہی کوئی ایسا شہر ہو جہاں لڑکوں کے لئے کوئی مخصوص کھیل ہو۔ لیکن مدینہ میں لڑکوں کے لئے دو مخصوص کھیل تھے جو دوسرے ممالک میں ناپید تھے اور اگر وہ کسی اسلامی شہر میں کھیلے جاتے ہوں گے تو وہ مدینہ ہی سے لئے گئے ہوں گے۔

پہلا کھیل جس میں سیکھنے سکھانے کی طرف توجہ دلائی جاتی تھی اس طرح تھا کہ جعفر صادقؑ استاد کے طور پر بیٹھتے تھے اور دیگر لڑکے ان کے شاگرد بن جاتے۔ پھر آپ کہتے۔ وہ کون سا پھل ہے جو زمین پر یا درخت پر اگتا ہے اور اس کا رنگ مثال کے طور پر سرخ ہوتا ہے اور اس کا ذائقہ میٹھا یا ترش ہوتا ہے اور اس میوہ کے پکنے کے وقت یہ موسم (یا کوئی دوسرا موسم) ہوتا ہے۔

یہ مضامین جو ہم یہاں تحریر کر رہے ہیں مدینہ کے بچوں کی مقامی زبان اور اصطلاحات کی صورت میں زبان پر لائے جاتے تھے اور وہ بچے جو امام صادقؑ کے شاگرد ہوتے آپ انہیں سوچنے اور فکر کرنے کی طرف مائل کرتے تھے اور اگر ان میں سے کوئی ایسا ہوتا جو اس پھل کا نام بتا دیتا تو وہ شاگردی سے استادی کی جگہ حاصل کرلیتا اور امام جعفر صادقؑ کی جگہ بیٹھ جاتا۔اس دوران امام جعفر صادقؑ شاگردوں میں بیٹھ جاتے۔

لیکن دو تین منٹ بعد شاگردوں کے گروہ سے خارج ہوجاتے اور پھر استاد بن جاتے تھے۔ چونکہ ذہین تھے اس لئے جونہی استاد پھل کے کوائف بیان کرتا جعفر صادقؑ پھل کا نام بتا دیتے۔

امام جعفر صادقؑ کا شمار مدینہ کے اشراف میں ہوتا تھا اور اخلاقی مکتب میں ان کے استاد ان کے دادا امام زین العابدینؑ اور باپ محمد باقرؑ اور ماں (ام فروہ) تھیں۔ لیکن مستی روڈ پر رہنے والے

سارے لڑکے اشراف خاندانوں سے نہیں تھے۔ ان کے باپ امام محمد باقرؒ جیسے نہ تھے نہ مائیں ام فروہ جیسی۔ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ دو کنبوں کے درمیان اخلاقی ماحول کا فرق اگرچہ ہمسائے ہی کیوں نہ ہوں، بچوں کے اخلاق پر زبردست اثر ڈالتا ہے۔

امام جعفر صادقؒ کو سچ بولنا وراثت میں ملا تھا اور ان کی تربیت بھی ایسی ہوئی تھی کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتے تھے اگرچہ ان کے فائدے میں ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن ان کے ہمراہ کھیلنے والے بعض لڑکے جعفر صادقؒ کی طرح تربیت یافتہ نہیں تھے اور اخلاقی تزکیہ میں بھی ان کی مانند نہیں تھے۔ وہ جھوٹ بولتے تھے اور جب استاد بن جاتے تو پھل کے اوصاف بیان کرتے اور جعفر صادقؒ اس پھل کا نام لیتے اور استاد اس غرض سے کہ اس کا مرتبہ ہاتھ سے نہ جائے جھوٹ بولتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ پھل نہیں ہے اور دوسرا پھل ہے۔ جعفر صادقؒ جب یہ جان لیتے کہ وہ لڑکا جھوٹ بول رہا ہے، بہت غمگین ہو جاتے اور چونکہ جھگڑا کرنا ان کا شیوہ نہیں تھا، کبھی کبھار یہ سوچ کر کہ ان کا حق جھوٹ بول کر پامال کیا جا رہا ہے، رونے لگتے اور کھیل چھوڑ کر دور ہٹ جاتے اور لڑکے بظاہر ننھے جعفر کی طرف توجہ کئے بغیر کھیل جاری رکھتے لیکن انہیں جلد ہی معلوم ہو جاتا تھا کہ ان کے کھیل میں مزہ نہیں ہے کیونکہ ان میں کوئی بھی جعفرؒ کی مانند ذہین نہیں تھا کہ کھیل جوش و خروش سے جاری رہتا اور اس طرح وہ جعفرؒ کے پاس جانے پر مجبور ہو جاتے اور ان سے معافی چاہنے کے ساتھ ساتھ دوبارہ کھیل میں شریک ہونے کی درخواست کرتے تاکہ کھیل میں دلچسپی پیدا ہو اور جعفرؒ کہتے کہ وہ اس شرط پر کھیلنے کو تیار ہیں کہ کوئی بھی جھوٹ نہ بولے۔ لڑکے اس بات کو مان لیتے۔

دوسرا کھیل جو مدینے کے ساتھ مخصوص ہے اور اگر کسی دوسرے عرب شہر میں رائج ہو بھی تو وہ مدینے سے ہی وہاں گیا ہو گا۔ اس کی ترتیب اس طرح تھی کہ ایک استاد اور چند شاگرد چن لئے جاتے اور استاد کوئی کلمہ زبان پر لاتا تھا۔ مثلاً" وہ کہتا تھا "الشراعیہ" جس کے معنی لمبی گردن والی اونٹنی کے ہیں۔ شاگرد بھی کلمہ الشراعیہ کو زبان پر لاتا تھا اور اس کے بعد شاگرد اسی کلمہ الشراعیہ کی بغیر رکے ہوئے تکرار کرتا اور استاد اس شاگرد کو غلط فہمی کا شکار کرنے کے لئے مسلسل اسی "الشراعیہ" کے وزن پر کلمات ادا کرتا مثلاً" کہتا الدراعیہ، الزراعیہ وغیرہ۔ اس میں ضروری نہیں کہ سارے کلمات بامعنی ہوں۔ مہمل الفاظ بھی استعمال ہوتے تھے۔ یہاں شاگرد مجبوراً" رکے اور غلطی کئے بغیر الشراعیہ کی تکرار کرتا تھا اور اگر ایک بار اس سے غلطی ہو جاتی اور کوئی دوسرا کلمہ زبان پر لاتا تو وہ کھیل سے خارج ہو جاتا اور استاد دوسرے شاگردوں کے ساتھ کھیل کا آغاز کرتا۔

لیکن اب استاد دوسرا کلمہ منتخب کرتا اور پھر اسی ترتیب سے بامعنی یا بے معنی الفاظ کی تکرار

کرتا، تاکہ شاگرد کو غلط فہمی کا شکار کرے۔ امام جعفر صادقؑ ان دو مخصوص مدنی کھیلوں جن میں بیٹھنا اور بولنا ضروری ہوتا تھا کے علاوہ تمام ایسے کھیلوں میں بھی جن میں دوڑنا ضروری تھا، شرکت کرتے تھے۔

۹۰ھ میں چیچک جیسی متعدی بیماری کی وباء مدینے میں پھوٹ پڑی اور کچھ بچے اس میں مبتلاء ہوگئے۔امام جعفر صادقؑ اس وقت سات یا دس سال کے تھے (یعنی اگر ان کی ولادت ۸۰ھ یا ۸۳ھ مان لی جائے) اور دس یا سات سال کے بچے بڑے لڑکوں کی نسبت کم اس بیماری میں مبتلا ہوئے ہیں۔ ام فروہ اپنے سارے بچوں (جعفرؑ سمیت) کو لے کر مدینہ سے چلی گئیں تاکہ اس متعدی بیماری سے ان کے بیٹے بچ سکیں۔ چونکہ ابھی ان کے کسی بیٹے کو یہ بیماری لاحق نہیں ہوئی تھی اس لئے اب چیچک والے شہر سے دور جانا ضروری تھا تاکہ ان کے بچے اس میں مبتلا نہ ہوں اور وہاں جائیں جہاں یہ بیماری نہ ہو۔

ام فروہ اپنے بیٹوں کے ہمراہ مدینہ کے ایک تفریحی مقام طسفہ (۷) چلی گئیں، جیسا کہ ہم جانتے ہیں بعض دیہاتوں کے نام ان چیزوں یا پیداوار کے نام پر رکھے ہوتے ہیں جو ان دیہاتوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ اسی طرح طسفہ میں بھی ایک پودے کے پتوں سے ایک نہایت عمدہ قسم کی بوریا بنائی جاتی تھی جسے طسفہ کہا جاتا تھا اور اسی وجہ سے اس گاؤں کا نام طسفہ پڑ گیا۔ اب بھی اس گاؤں کی جگہ موجود ہے لیکن پہلی اور دوسری صدی ہجری کی مانند آباد نہیں ہے

اگرچہ مدینہ ایک صحرا میں واقع ہے لیکن اس کے اطراف میں صحت افزا مقامات بھی ہیں۔ مدینہ کے بڑے لوگ گرمیوں میں وہاں جاتے ہیں۔ ام فروہ جب طسفہ میں رہ رہی تھیں تو انہیں اطمینان تھا کہ ان کے بیٹے اب چیچک میں مبتلا نہیں ہوں گے۔ لیکن وہ اس سے غافل تھیں کہ چیچک کی خطرناک بیماری ان پر حملہ آور ہو چکی ہے۔ جب وہ بیمار ہوئیں تو چیچک کے تمام مریضوں کی طرح انہیں بھی علم نہ تھا کہ وہ اس میں مبتلا ہو گئی ہیں۔ حتیٰ کہ چیچک کا پہلا نشان ان کے جسم پر ظاہر ہوا۔ چونکہ وہ ایک پڑھی لکھی خاتون تھیں جب انہیں علم ہوا کہ وہ اس مہلک بیماری میں مبتلا ہو گئی ہیں تو انہوں نے اپنی فکر کی بجائے بچوں کی فکر کی اور کہا کہ جلدی میرے بچوں کو طسفہ سے دور ایسی جگہ لے جائیں جہاں چیچک کی بیماری نہ ہو۔ اس طرح جعفر صادقؑ اور دوسرے سارے بیٹوں کو طسفہ سے دور ایک دوسرے گاؤں لے جایا گیا۔ مدینہ میں امام محمد باقرؑ کو اطلاع ملی کہ ان کی زوجہ چیچک میں مبتلا ہو گئی ہیں جو ایک مہلک مرض ہے۔ امام محمد باقرؑ نے درس پڑھانا چھوڑ کر پہلے روضہ نبویؐ پر حاضری دی (جو اسی مسجد مدینہ کے اندر واقع تھا) اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روح سے التجا کی کہ

ان کی زوجہ کو شفا عنایت فرمائیں

جب ام فروہ نے اپنے شوہر کو دیکھا تو کہا آپ یہاں کیوں آئے ہیں ؟ شاید آپ کو یہ نہیں بتایا گیا کہ میں چیچک میں مبتلا ہوں اور چیچک کے مریض کی عیادت نہیں کرنی چاہئے ؟ یہ ایک چھوت کی بیماری ہے اور مریض سے عیادت کرنے والے کو لگ سکتی ہے۔ امام محمد باقرؑ نے فرمایا۔ میں نے پیغمبر اسلامؐ کی روح سے درخواست کی ہے کہ آپ کو شفا دے اور چونکہ روح کے اثرات پر میرا ایمان ہے اس لئے مجھے علم ہے کہ تو بھی شفا پائے گی اور میں بھی اس بیماری میں مبتلا نہیں ہوں گا۔

جس طرح امام محمد باقرؑ نے فرمایا تھا اسی طرح ام فروہ کو اس بیماری سے نجات مل گئی اور وہ خود بھی اس بیماری میں مبتلا نہ ہوئے۔ اس خاتون کا تندرست ہو جانا معجزے سے کم نہ تھا کیونکہ چیچک کی بیماری پہلے تو بڑے آدمی پر بہت کم حملہ آور ہوتی ہے اور اگر حملہ آور ہو جائے تو مریض کا صحتیاب ہونا بعید ہوتا ہے۔ شیعوں کا عقیدہ ہے' چونکہ محمد باقرؑ امام تھے اور ہر امام کے پاس لامحدود طاقت اور علم ہوتا ہے لہٰذا جب وہ ام فروہ کے سرہانے پہنچے تو انہوں نے اپنی امامت کے علم اور طاقت کے ساتھ ام فروہ کو شفا دی۔ لیکن ایک غیر جانبدار مورخ اس بات پر یقین نہیں رکھتا۔ حالانکہ یہ بات صحیح ہے کہ اس وقت طبیب چیچک کا علاج کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے تھے۔ اس لحاظ سے ام فروہ کا تندرست ہو جانا ایک منفرد واقعہ شمار کیا جاتا ہے۔ تندرست ہونے کے بعد ام فروہ مدینہ واپس چلی آئیں۔ لیکن چونکہ ابھی تک چیچک کی بیماری مدینہ میں موجود تھی لہٰذا انہوں نے بیٹوں کو شہر نہیں بلایا۔

اسی سال ۹۰ھ میں اور ایک دوسری روایت کے مطابق ایک سال بعد امام جعفر صادقؑ نے اپنے والد گرامی کے حلقہ درس میں حاضری دینا شروع کی۔

اس بات پر تمام مورخین کا اتفاق ہے کہ امام جعفر صادقؑ دس سال کی عمر میں اپنے والد کے حلقہ درس میں حاضر ہوئے۔ امام محمد باقرؑ کا حلقہ درس ایک شاندار مدرسہ تھا اور جو لوگ یہاں آتے وہ اس زمانے کے علوم کو سیکھتے تھے۔ لہٰذا امام جعفر صادقؑ کی تعلیم کا آغاز دس سال کی عمر میں ہوا اور یہ بات کسی ذہین لڑکے کے بارے میں حیرت انگیز نہ تھی۔ مغربی دنیا کی چند ایسی مشہور شخصیتوں کے نام لئے جاسکتے ہیں جنہوں نے دس سال کی عمر میں یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کی۔

جب امام جعفر صادقؑ اپنے والد گرامی کے حلقہ درس میں شامل ہوئے تو پہلی مرتبہ امام محمد باقرؑ نے بطلیموس کا جغرافیہ پڑھانا شروع کیا اور پہلے دن ہی جعفر صادقؑ نے بطلیموس کی کتاب المجسطی کو پڑھا۔ (یاد رہے کہ یہ کتاب علم ہیئت اور جغرافیہ کے بارے میں ہے)۔

آپ نے پہلے ہی دن پہلی مرتبہ اپنے والد سے سنا کہ زمین گول ہے۔ کیونکہ بطلیموس نے جو دوسری صدی عیسوی میں زندہ تھا' اپنی کتاب المجستی میں لکھا ہے کہ زمین گول ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کوپر نیک نجومی کے زمانے ہی سے جو ۱۴۷۳ء میں پیدا ہوا اور ۱۵۴۳ء میں فوت ہوا لوگ زمین کے گول ہونے کے قائل تھے۔

اس صورت میں جبکہ تمام مصری سائنسدان جانتے تھے کہ زمین گول ہے کوپر نیک جو ابھی جوانی کے مرحلے میں داخل ہوا تھا اور اس نے ابھی زمین کے گول ہونے اور سورج کے گرد چکر لگانے کا نظریہ پیش نہیں کیا تھا۔ کرسٹوفر کولمبس زمین کے کروی ہونے کی تصدیق کے پیش نظر مشرق کی جانب جہاں خوردنی دواؤں کے جزیرے تھے چل پڑا تاکہ مغرب کے راستے وہاں تک پہنچے۔ ابھی تک کرسٹوفر کولمبس نے اپنی مشہور کتاب (جس میں لکھا ہے کہ زمین اور دوسرے سیارے آفتاب کے گرد گھومتے ہیں) لاطینی زبان میں شائع نہیں کی تھی کہ مالان (ایک پرتگالی) جو سپین کے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا' اس نے اپنی کشتیوں کو سیوِل کی بندرگاہ سے سمندری راستے پر ڈال دیا اور اس حساری زمین کا ایک مکمل چکر کاٹا۔ اس کے ساتھی تین سال بعد ہسپانیہ واپس آگئے جبکہ وہ فلپائن کے جزائر میں وہاں کے مقامی باشندوں کے ہاتھوں قتل ہوا اور پہلی بار زمین کے گول ہونے کو ثابت کیا۔ اس طرح پہلی بار تصدیق ہوئی کہ زمین گول ہے۔ کوپر نیک سے پہلے زمین کا گول ہونا ثابت تھا لیکن بطلیموس نے المجستی میں لکھا تھا کہ زمین دنیا کا مرکز ہے اور سورج' چاند' ستارے اور سیارے سب زمین کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ لیکن کوپر نیک نے کہا کہ زمین دنیا کا مرکز نہیں ہے بلکہ سورج دنیا کا مرکز ہے اور زمین اور دوسرے سیارے سورج کے گرد چکر لگا رہے ہیں۔ ۹۱ھ میں جب امام جعفر صادقؑ اپنے والد کے حلقہ درس میں شریک تھے تو ان کو دو نئے واقعات پیش آئے جو ان کے لئے خاصی اہمیت کے حامل تھے۔

پہلا واقعہ یہ تھا کہ امام محمد باقرؑ کے مریدوں اور شاگردوں میں سے ایک جب اپنے وطن مصر سے واپس آیا تو اپنے ساتھ لکڑی اور مٹی سے بنایا ہوا جغرافیائی کرہ لایا۔ کیونکہ مصر میں مٹی سے بہت سی چیزیں تیار کی جاتی تھیں۔ مثلاً مجسمے وغیرہ اور مصر کے باہر رہنے والے لوگ ان اشیاء کو بطور تحفہ لے جاتے تھے۔ یہ خاصی مہنگی فروخت ہوتی تھیں۔ مٹی کا وہ جغرافیائی کرہ جو محمد بن فتی مصر سے امام محمد باقرؑ کے لئے بطور سوغات لایا تھا ایک ایسے گول ستون کی مانند تھا جس پر کسی کرہ کو رکھتے ہوں گے۔ یہ گول ستون زمین شمار کی جاتی تھی اور جو کرہ تھا وہ آسمان تھا اور اس کرہ آسمانی پر ستارے اس طرح لگائے گئے تھے جیسے بطلیموس نے دوسری صدی عیسوی میں اظہار خیال کیا تھا۔ یا اس کا خیال

تھا۔ بطلیموس نے آسمانی ستاروں کے لئے جو اس زمانے میں دیکھے جاتے تھے اڑتالیس تصاویر کو مد نظر رکھا جیسا کہ ہم نے کہا ہے یہ تصاویر اس کی اختراع نہیں تھیں بلکہ اس سے پہلے کے نجومیوں نے انہیں ایجاد کیا تھا البتہ بطلیموس نے انہیں ایک مکمل شکل دی تھی اس کے کہنے کے مطابق دنیا میں ثابت ستاروں کی تعداد اڑتالیس تھی اور بطلیموس نے اس بڑے آسمانی کرہ پر ہر مجموعے کی شکل بنائی اور ہر ایک کا نام مصری زبان میں لکھا۔

اس آسمانی کرہ میں ستاروں کے بارہ مجموعے حمل سے لے کر حوت یعنی برہ سے ماہی تک کمربند کی مانند اس کرہ کا احاطہ کئے ہوئے تھے اور سورج کو بھی کرہ کے اسی حصہ میں دکھایا گیا تھا تاکہ یہ ظاہر کیا جائے کہ سورج سال میں ایک مرتبہ آسمان میں اس کمربندی کے علاقے سے گزرتا ہے۔ سورج کے علاوہ چاند اور دیگر سیارے بھی آسمانی کرہ میں نظر آتے تھے اور سیارے بھی سورج اور چاند کی طرح زمین کے اردگرد گھومتے تھے۔

مختصر یہ کہ اس آسمانی کرہ میں دنیا کا مرکز زمین تھا اور سورج' چاند اور ستارے زمین کے اردگرد حرکت کرتے دکھائے گئے تھے۔ یہ پہلا کرہ آسمانی تھا جو آسمان کے متعلق امام صادقؑ نے دیکھا تھا اور ابھی آپ کی عمر گیارہ سال سے زیادہ نہیں تھی (اگر آپ کی تاریخ ولادت ۸۰ھ مان لی جائے) کہ آپ نے اس کرہ اور بطلیموس کے جغرافیہ کے بارے میں اظہار خیال فرمایا اور کہا اگر سورج سال میں ایک بار کرہ زمین کے اردگرد چکر لگاتا ہے اور اس کی گردش کا راستہ بارہ برج اور ان میں ہر برج کا تیس رات دن قیام ہے تو پھر ہمیں ہر وقت سورج دکھائی دینا چاہیے۔

گیارہ سالہ بچے کا اظہار خیال نہایت ماہرانہ تھا اور جو آدمی یہ کرہ سوغات لے کر آیا تھا اس نے جواباً "کہا' بطلیموس کہتا ہے کہ سورج کی حرکات دو قسم کی ہیں' ایک حرکت بروج کے احاطے میں ہے اور سورج سال میں ایک بارہ برجوں سے گزرتا ہے اور زمین کے اردگرد چکر لگاتا ہے اور سورج کی دوسری حرکت کرہ زمین کے اردگرد ہے ہر رات دن میں ایک دفعہ زمین کے گرد چکر لگاتا ہے اور نتیجہ" ہم ہر صبح اسے طلوع ہوتے ہوئے اور ہر شام کو غروب ہوتے دیکھتے ہیں۔ اس شخص کی وضاحت کے بعد امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ممکن ہے یہ دونوں حرکات ایک ساتھ ہوں کیونکہ سورج جب بروج کے احاطے میں گردش میں مشغول ہوتا ہے کس طرح چھوڑ کر زمین کے گرد چکر لگا سکتا ہے۔

سوغات لانے والے نے کہا' سورج رات کو بروج کے احاطے کو ترک کرتا ہے تاکہ زمین کے گرد چکر لگائے اور صبح کے وقت زمین کے مشرق سے طلوع کر سکے۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا اس طرح تو سورج صرف دن ہی کو بارہ میں سے کسی ایک برج میں ہوتا ہے اور راتوں کو وہاں نہیں ہوتا کیوں کہ آپ کے بقول رات کو اسے چاہیے کہ وہ جگہ چھوڑ دے اور زمین کے گرد چکر لگائے تاکہ صبح زمین کے مشرق سے طلوع کر سکے اگر ایسا ہے تو رات کو سورج ہمیں کیوں دکھائی نہیں دیتا شاید اپنے چہرے پر پردہ ڈال دیتا ہے تاکہ دکھائی نہ دے۔؟

جس وقت امام جعفر صادقؑ نے اس آسمانی کرہ کو دیکھا تھا۔ بطلیموس کی موت کو پانچ سو ساٹھ (۵۶۰) سال ہو گئے تھے اور ابھی تک کسی فرد میں اتنی ہمت پیدا نہیں ہوئی تھی کہ وہ اس آسمانی کرہ کے بارے میں اظہار خیال کرے اور پوچھے کہ کس طرح ممکن ہے کہ سورج بقول بطلیموس ہر برج میں تیس دن سفر کرتا ہے اور زمین کے گرد بھی چکر کاٹتا ہے۔ ہر روز و شب میں ایک مرتبہ اپنے ٹھکانے اور راستے کو بدلتا ہے تاکہ زمین کے گرد چکر لگائے؟ ان پانچ سو ساٹھ سالوں میں کسی کو یہ خیال نہ آیا کہ بطلیموس کی ہیئت پر تنقید کرے اور کہے کہ سورج کی زمین کے اردگرد گردش جو وہ بروج کے احاطے میں رہ کر کرے عقلی لحاظ سے قابل قبول نہیں ہے۔

کسی نے بھی بطلیموس کی کتاب المجستی کو پڑھتے ہوئے ان پانچ سو سالوں میں کوشش نہیں کی کہ اپنی عقل کو استعمال کرے۔ جب علم نجوم کے بارے میں بطلیموس کا بھی کوئی نظریہ نہیں تھا کہ ہم کہیں اسے بلا چون و چرا قبول کرلیا جانا چاہئے تھا۔ البتہ پہلے زمانے میں دو باتیں سائنس دانوں پر تنقید سے روکتی تھیں۔ پہلی یہ کہ استاد کا احترام ملحوظ خاطر رکھا جاتا تھا چنانچہ جو کچھ استاد نے کہا وہی صحیح ہے اور اس پر تنقید نہیں کی جا سکتی اور دوسری بات پرانے لوگوں کی سستی تھی اس سے ہماری مراد عام لوگوں کی ذہنی سستی ہے کیوں کہ پرانے وقتوں میں عام لوگوں سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ علمی مسائل کے بارے میں اظہار خیال کریں گے۔ اس کی وجہ ترویج علم کے وسائل کی محدودیت تھی اور صرف وہ لوگ جو مشرق و مغرب کے مدارس میں علم حاصل کرتے تھے انہیں ہی علم سے دلچسپی تھی اور ان علمی مدارس کے باہر سے کوئی آدمی علم کے بارے میں اپنے شوق کا اظہار کرتا تو وہ بھی ان مدارس کے علماء کے رابطے کی وجہ سے علم سے لگاؤ پیدا کرلیتا تھا۔

ابھی یہ صورت حال کم وبیش موجود تھی کہ چھپائی کی صنعت ایجاد ہوئی اور مغرب میں علم کو یونیورسٹی کی حدود سے نکال کر عام آدمی کی رسائی تک پہنچا دیا گیا۔ لیکن مشرق میں اس وقت تک علم مدارس سے باہر نہیں نکلا تھا۔

بہرحال مشرق کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں کسی کو بطلیموس نجومی کا نظریہ عقلی لحاظ سے قابل قبول نہیں ہے۔

اس کے بعد اس ہونہار طالب علم نے بطلیموس کے نظام نجوم کے بارے میں سوچنا شروع کیا کہ اس نظام میں کون سی خرابی ہے ؟ اور ایسا کیوں ہوتا ہے کہ سورج بارہ برجوں میں زمین کے اردگرد بھی گھومتا ہے اور اسی طرح ہر روز زمین کے مشرق سے طلوع اور مغرب میں غروب ہوتا ہے۔

جب امام جعفر صادقؑ اپنے والد گرامی کے حلقہ درس میں ہر روز حاضر ہوتے تو ان کی نظر کرہ آسمان پر پڑتی اور وہ بطلیموس نجومی کے نظام میں پائے جانے والے نقص کا اعادہ کرتے لیکن ان کے والد یہ کہہ کر خاموش کر دیتے کہ بطلیموس نے غلطی نہیں کی یہ فطری بات ہے۔ چنانچہ وہ گیارہ سالہ بیٹا نہ صرف یہ کہ باپ کے احترام میں

خاموش ہو جاتا اور اپنی تنقید کو مزید آگے نہ بڑھاتا بلکہ وہ لوگ جو اس حلقہ درس میں حاضر ہوتے تھے ان سے بھی کوئی مدد حاصل نہیں کر سکتا تھا کیونکہ وہ بھی معتقد تھے کہ بطلیوس نے غلطی نہیں کی اور سورج اس کے بتائے ہوئے نظام کے مطابق زمین کے اردگرد چکر لگاتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے کہا امام محمد باقرؑ کے حلقہ درس میں اس طرح جدت آئی کہ شروع میں وہاں جغرافیہ اور ہیئت ہی پڑھائی جاتی تھی لیکن بعد میں علم ہندسہ کی تعلیم شروع ہوئی۔

اس سے پہلے کہ یونان کی تاریخ ترتیب دی جاتی اور ہم جانتے ہیں کہ یونانی لوگوں نے دن و رات کے تبدیل ہونے کے بارے میں کیا نظریہ پیش کیا تھا؟ یونانی دستاویزات سے پتہ چلتا ہے کہ یونانی ہزاروں کی تعداد سورج کے وجود کے قائل تھے اور ان کا خیال تھا کہ جو سورج صبح طلوع اور شام کو غروب ہوتا ہے وہ ایک ایسی جگہ جاتا یا گرتا ہے جس کے بارے میں کچھ علم نہیں ہو سکتا اور جو سورج دوسرے دن مشرق سے طلوع ہوتا ہے وہ پہلے دن والا سورج نہیں ہوتا گویا اس طرح قدیم یونانیوں کے عقیدہ کے مطابق ہر دن ایک نیا سورج طلوع ہوتا ہے اور وہ پہلے دن والا سورج نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں وہ یہ بھی عقیدہ رکھتے تھے کہ زاؤس (خداؤں کا خدا) جسے لاطینی میں (Jupitor) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اس کے پاس بہت زیادہ آگ یا روشنی کے چراغ ہیں اور ہر صبح اس آگ یا چراغوں میں سے ایک کو وہ آسمان کی طرف بھیجتا ہے تاکہ زمین کو روشن اور گرم رکھے اور جس وقت آگ ختم ہو کر راکھ بن جاتی ہے یا چراغ میں تیل نہیں رہتا تو وہ غروب ہو جاتا ہے اور خاموش چراغ وہاں گرتے ہیں جہاں تک کسی کی رسائی نہیں۔

کیا زاؤس خداؤں کا خدا جو ہر دن ایک سورج کو آسمان پر بھیجتا تھا بجھے ہوئے چراغوں سے استفادہ کرتا تھا اور ان کا تیل بدلتا تھا تاکہ دوبارہ انہیں آسمان پر بھیجے؟ جب کہ اس سوال کے جواب میں بعض کا عقیدہ تھا کہ زاؤس بجھے ہوئے چراغوں سے استفادہ کرتا ہے اور بعض کا یہ عقیدہ تھا کہ استفادہ نہیں کرتا۔ بہر حال اپنے عقائد سے قدیم یونانیوں نے ستاروں کے مسائل کو اپنے لئے آسان بنا دیا تھا اور وہ ہر چیز کی وضاحت زاؤس کے فیصلوں اور کاموں سے کرتے تھے۔

پانچویں صدی قبل از مسیح جو یونانی دانشوروں کا عہد ہے اس دوران یونانی علماء نے اس طرف توجہ کی کہ دن رات کے فرق کی وجہ معلوم کریں جو کوئی قدیم یونان سے واقف ہے وہ اس بات کو بخوبی جانتا ہے کہ قدیم یونانی دانشوروں میں سے بہت کم ایسے تھے جنہوں نے دن اور رات کے فرق کی وجہ معلوم کرنے کی طرف توجہ دی۔

ان دانشوروں میں سے تین مشہور ہیں یعنی سقراط' افلاطون اور ارسطو' وہ دوسرے علوم کے مقابلے میں علم الاجتماع سے زیادہ لگاؤ رکھتے ارسطو جس نے فزکس اور ہوا کے بارے میں بھی لکھا ہے وہ بھی علم الاجتماع سے کافی دلچسپی رکھتا تھا اور اس کا مستائی فلسفہ علم اجتماع سے ملتا جلتا ہے (مستی کے معنی ہیں راہ چلنا چونکہ ارسطو چلتے

ہوئے پڑھاتا تھا) جن چند لوگوں نے دن و رات کے فرق کی وجہ کو معلوم کرنے کی جانب توجہ کی ان میں سے ایک اقلیدس بھی تھا جس کا شمار نہ تو انجینئرز میں اور نہ ہی نجومیوں (ماہرین فلکیات) میں ہوتا تھا بطلیموس سے ۳۵۰ سال پہلے اسکندریہ میں رہتا تھا' مشرق کے حوالے سے اقلیدس کا خیال تھا کہ یہ کہانی کہ زاؤس ہر دن ایک گولہ آگ یا چراغ آسمان پر بھیجتا ہے اور چراغ آسمان کو عبور کرنے کے بعد بجھ جاتا ہے درست نہیں ہو سکتی۔ اس نے کہا کہ وہ سورج جو دوسرے دن طلوع ہوتا ہے وہی سورج ہوتا ہے جو پہلے دن طلوع ہوتا ہے اور ایک دن بعد مشرق سے طلوع ہونے کی وجہ یہ ہے کہ تیسری صدی قبل مسیح ایک ایسی صدی تھی جس میں یونان اور اسکندریہ میں علم نے ترقی کی لیکن اس میں اتنی جرات نہیں ہوئی کہ وہ دن و رات کے وجود میں آنے کے سبب کو اپنی زندگی میں بیان کر سکے۔ وہ ارسطو کے ایک صدی بعد اس دنیا میں آیا اور اس سے قبل ہی یونانی دانشوروں نے علم کو قبول کرنے کے لئے اذہان کو آمادہ کر لیا تھا اور اسی دور میں جس میں اقلیدس رہتا تھا پیرون نام کا ایک آدمی جس نے یونان میں نہ صرف یہ کہ ارسطو اور افلاطون کے نظریات کی مخالفت کی بلکہ یونانی خداؤں یعنی یونان کے سرکاری مذہب کی بھی مخالفت کی اور کہا کہ یونانی خدا محض ایک افسانہ ہیں۔

لیکن پیرون جو ۲۷۰ قبل مسیح میں فوت ہوا اور اپنے نظریہ کو کھلم کھلا بیان کر سکتا تھا وہ اسکندریہ میں نہیں رہتا تھا بلکہ یونان اور اپنز میں رہتا تھا اس زمانے میں یونان اپنزیا خود مختار ریاستوں پر مشتمل تھا۔

اقلیدس اسکندریہ میں بطالیہ سلسلہ کے پہلے یونانی بادشاہ کے دور میں ہو گزرا ہے اور اسکندریہ مقدونی کے سرداروں میں سے ایک بطلیموس نامی سردار تھا جو کہتا تھا علم ہر جگہ میں رائج ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیے۔ لیکن وہ خداؤں کے متعلق کوئی بات نہ کہتا تھا اور بطلیموس اول کی علم پروری کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے ایسا کتاب خانہ قائم کیا جس نے اسکندریہ میں اس قدر اہمیت اختیار کر لی کہ صدیوں بعد بھی جب مورخین کتب خانے کا نام لیتے تھے تو ان کی مراد کتب خانہ اسکندریہ ہوتا تھا۔

## درس باقریہؑ میں حاضری

بطلیموس اول نے علم کو مذہبی مباحث میں نہیں پڑنے دیا اور جہاں کہیں علم کا مذہبی مباحث کے ساتھ ٹکراؤ ہوتا تھا وہ رک جانے کا حکم دیتا تھا۔ اسی وجہ سے اقلیدس میں اتنی جرات پیدا نہ ہوئی کہ زاؤس ہر صبح ایک چراغ یا آگ کے گولے کو آسمان کی طرف بھیجتا ہے کے نظریئے کا اظہار کرتا اور اس کی جگہ یہ صحیح نظریہ بیان کرتا کہ سورج زمین کے گرد چکر لگاتا ہے۔ تاہم اقلیدس نے اس نظریے کا اظہار کیا اور اس کی موت کے بعد اس کی تحریروں میں یہ نظریہ ملا مگر باور کیا جاتا ہے کہ بطلیموس جغرافیہ دان سلسلہ بطالیہ کے بطلیموس مصری

بادشاہوں میں سے نہیں تھا لٰہذا یہ غلط فہمی پیدا نہیں ہونی چاہئے کہ جو اقلیدس ایک صدی بعد آیا وہ مصری تھا اور علمی کتاب خانہ کے دستر خوان سے فیض یاب ہوتا رہا۔ اس بناء پر ہم یہ قیاس آرائی کر سکتے ہیں کہ اس نے اس نظریے کو کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے اقلیدس سے لیا ہوگا۔

پیرون جو یونان میں یونانی خداؤں کو ایک افسانہ سمجھتا تھا اس نے رات و دن کے وجود میں آنے کے سبب کے بارے میں کچھ نہیں کہا البتہ یونان کی علمی تاریخ میں وہ پہلا آدمی ہے جو شکی مشہور ہوا جس نے تمام نظریات کو کھوکھلا کیا اور خود کوئی نظریہ پیش نہیں کیا۔

پیرون ہر قسم کے عقیدے اور مذہب کے خلاف تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کوئی بھی ایسی علامت یا حتمی ماخذ نہیں ہے جو حقیقت کی پہچان میں ہماری مدد کر سکے اور اگر ہم ایک موضوع کے متعلق ایک نظریہ پیش کرتے ہیں تو اسی کا مخالف نظریہ بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ یہاں پیرون کی مراد فلسفی نظریات ہیں نہ کہ ریاضی کے نظریات (Theories) کیونکہ ریاضی کے نظریات کی نفی عقلی نقطہ نگاہ سے ناممکن ہے۔ ہر سال لاکھوں لوگ پکے ہوئے سیب زمین پر گرتے دیکھتے ہیں لیکن تاریخ کے آغاز سے ساتویں صدی عیسوی تک صرف ایک آدمی نے اس پر غور کیا کہ سیب زمین پر کیوں گرتا ہے جبکہ چاند و ستارے زمین پر نہیں گرتے اور اس شخص نے اس غور و فکر کے نتیجے میں قوت کشش کا قانون

Law of the Gravitational Force

دریافت کیا۔ ہزاروں سائنسدانوں نے دنیا کے مشرق اور مغرب میں آٹھویں صدی عیسوی کے آغاز تک بطلیموس کے آفتاب کی زمین کے ارد گرد حرکت کا مطالعہ کیا لیکن کسی نے بھی اپنے آپ سے یہ نہ پوچھا کہ سورج جو بروج کے احاطہ میں واقع ہے اور وہاں سے زمین کے ارد گرد چکر لگاتا ہے آخر وہ کس طرح ہر رات دن میں ایک بار اس احاطے کو چھوڑ کر زمین کے اطراف میں گردش کرنا شروع کر دیتا ہے جس کے نتیجے میں رات دن وجود میں آتے ہیں۔

اسکندریہ جو مصر میں واقع ہے جب وہاں سلسلہ بطالیہ کے پہلے بادشاہ نے کتابخانہ بنوایا۔ اس زمانے سے لے کر کتاب خانے کے عربوں کے ہاتھوں جلائے جانے اور ویران کرنے تک یعنی تقریباً" نو سو سال تک دنیا کا علمی مرکز تھا اور جن سائنس دانوں نے اسکندریہ کے علمی مکتب سے کسب فیض کیا بہت مشہور ہو گزرے ہیں اور اس مکتب میں چند فلسفیانہ نظریئے بھی وجود میں آئے جو کافی شہرت کے حامل ہیں۔

مگر حیرانگی اس بات پر ہے کہ وہ سائنسدان اور مفکرین جو اسکندریہ کے علمی مکتب سے فیض یاب ہوئے انہیں بھی یہ خیال نہ آیا کہ کس طرح سورج جو بارہ برجوں میں زمین کے اطراف میں گردش کرتا ہے کیسے دن رات میں ایک بار وہ جگہ چھوڑ کر زمین کا چکر لگانا شروع کر دیتا ہے ؟ اور ایک چھوٹے سے عرب لڑکے نے

ایک چھوٹے سے شہر مدینہ میں آٹھویں صدی عیسوی کے شروع میں جب کہ یہ شہر دارالخلافہ تھا نہ اسے مرکزیت حاصل تھی اس مسئلے پر غور کیا۔

اس گیارہ سالہ بچے کی عقل کو اس علمی مسئلہ کی مناسبت سے مکتب اسکندریہ کے تمام سائنس دانوں اور ساری دنیا کے علماء کی عقل پر برتری حاصل تھی۔

امام جعفر صادقؑ اس وقت کمسنی کے باعث اجتماعی سوچ نہیں رکھتے ہوں گے اور ان پر اقتصادی بوجھ بھی نہ ہوگا کیوں کہ وہ کفالت کی ذمہ داری سے مبرا تھے۔ لیکن علمی و عقلی لحاظ سے خاصے سمجھدار تھے اور علوم یا علم ہیئت سے ایسے نکات بھی سمجھ سکتے تھے جن کو سمجھنے سے عام انسان قاصر تھے دوسرے لوگوں کی علمی سوچ امام جعفر صادقؑ کی فکر سے اس قدر پست تھی کہ جب آپ نے کہا کہ زمین کے گرد سورج کی گردش قابل قبول نہیں ہے تو انہوں نے اس پر غور نہ کیا۔

تمام دانشمند لوگوں کے ساتھ اسی طرح ہوتا ہے جس طرح امام جعفر صادقؑ کے ساتھ ہوا۔ معاشرے کے دوسرے افراد ان کے عمیق نظریات اور عقلی قوت کو نہ سمجھ سکے۔

عام لوگ بلند خیالات اور گہری نظر رکھنے والوں کی مانند اپنے ماحول کا جائزہ نہیں لے سکتے اور وہ عقل کو صرف ضروریات زندگی کے حصول میں صرف کرتے ہیں۔ اسی لئے عقل مند لوگوں کے نظریات انہیں بے وقعت معلوم ہوتے ہیں اور بعض اوقات تو عاقل انسانوں کو دیوانہ خیال کیا جاتا ہے۔ آج نظام شمسی کی جانب انسان کی ساری پروازیں نیوٹن کے کشش ثقل کے قانون کی بنیاد پر ہیں اور تمام وہ انسان جنہوں نے چاند پر قدم رکھا وہ نیوٹن (۱۰) کے احسان مند ہیں جس نے کشش ثقل کا قانون دریافت کیا۔

لیکن نیوٹن کے دور میں کشش ثقل کے قانون کی دریافت جو بے شک کائنات کے بارے میں بنی نوع انسان کے وضع کئے گئے قوانین میں سے اب تک سب سے بڑا قانون ہے۔ جب کہ عام آدمی کی نظر میں اس کی ذرہ بھر وقعت نہ تھی۔

لندن نیوز (London News) جو انگلستان میں چھپنے والا سب سے پہلا ہفت روزہ تھا نہ صرف یہ کہ اس ہفت روزہ نے قوت تجاذب کے قانون کی خبر نہ چھاپی بلکہ اس کے چند سال بعد تک یہ عظیم علمی ایجاد کسی انگریزی اخبار میں نہ چھپی اور اخبارات کے ایڈیٹر صاحبان کی نظر میں ڈاکہ زنی یا قتل کی خبر اس خبر سے زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی تھی کیوں کہ ڈاکہ زنی یا قتل کی خبر کا تعلق لوگوں کی اور خود ایڈیٹر صاحبان کی روزمرہ زندگی سے ہوتا تھا۔

صرف چند سائنس دانوں کو علم تھا کہ نیوٹن نے یہ قانون ایجاد کر لیا ہے اور حسد کی وجہ سے انہوں نے نہ چاہا کہ اس قانون کی دریافت لوگوں تک پہنچے یہاں تک کہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے حسد میں کمی

آئی اور انہوں نے نیوٹن کی قدردانی کے طور پر اسے "سر" کا خطاب دیا۔
ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ اگر سترھویں صدی عیسوی میں لوگوں نے نیوٹن جیسے عظیم انسان کی ایجاد کی طرف توجہ نہیں دی تو اس پر ہمیں حیران نہیں ہونا چاہئے کہ آٹھویں صدی عیسوی کے آغاز میں امام جعفر صادقؑ کے علمی مطالب کی جانب کیوں توجہ نہیں دی گئی۔ لیکن انگلستان کے کوچہ و بازار کے عام لوگوں اور امام محمد باقرؑ کے حلقہ درس میں حاضر ہونے والوں میں فرق موجود تھا۔ لندن کے عام لوگوں اور انگلستان کے عام شہریوں کے لئے علمی مسائل بے وقعت تھے لیکن وہ لوگ جو محمد باقرؑ کے حلقہ درس میں حاضر ہوتے تھے ان کا شمار اہل علم میں ہوتا تھا۔ انہیں امام جعفر صادقؑ کے مطالب کے بارے میں بے اعتنائی نہیں برتنی چاہئے تھی۔
اگر اس وقت تک خود انہیں یہ سمجھ نہیں آیا تھا کہ زمین کے اطراف میں سورج کی گردش اس ترتیب سے ناممکن ہے تو جب امام جعفر صادقؑ نے ان کو آگاہ کر دیا کہ اس موجودہ ترتیب کے ساتھ سورج کی زمین کے اطراف میں گردش قابل قبول نہیں ہے تو انہیں امام جعفر صادقؑ کی وضاحت کو قبول کر کے اس نظریہ کو رد کر دینا چاہئے تھا اور دن رات کی تبدیلی کے لئے کوئی اور وجہ تلاش کرنی چاہئے تھی لیکن ان کی علمی سوچ اس قدر محدود تھی کہ انہوں نے ایک گھنٹہ تک بھی امام جعفر صادقؑ کے ساتھ اس مسئلے پر تبادلہ خیال نہ کیا۔
امام محمد باقرؑ کے شاگردوں میں امام جعفر صادقؑ کی علمی استعداد بلند ہونے کے باوجود محض کمسن ہونے کے باعث کسی نے ان کی طرف توجہ نہ دی۔ امام محمد باقرؑ کے شاگردوں نے اس گیارہ سالہ لڑکے کی گفتگو کو بچپن کی گفتگو کا ایک حصہ سمجھا۔
جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں ' بچے جب بچپن کے ابتدائی سال گزار کر ساتویں یا آٹھویں سال میں ہوتے ہیں تو ان کی قوت حس میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ ہر چیز کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں اور والدین سے ہمیشہ چیزوں کے اسباب اور حالات کے متعلق خصوصی سوالات کرتے رہتے ہیں اور بعض بچے تو اس طرح لگاتار سوال کرتے ہیں کہ ان کے والدین تنگ آجاتے ہیں۔ عمر کے اس مرحلہ میں بچہ چاہتا ہے کہ وہ بالغ لوگوں سے زیادہ ہر چیز کے بارے میں جانے اور تمام چیزوں اور حالات کے اسباب معلوم کرے۔ اگر والدین نے اس بچے کو مطمئن کر لیا تو وہ خاموش ہو جاتا ہے اور مزید سوالات نہیں کرتا۔
امام جعفر صادقؑ کے منطقی بیانات ان کے والد گرامی کے شاگردوں کی نظر میں بچگانہ سوالات ہوتے تھے جو وسوسوں کی پیداوار ہیں اور اس کے بعد ہر مرتبہ امام جعفر صادقؑ جب سورج کی زمین کے گرد عدم گردش کا مسئلہ پیش کرتے تو وہ اپنے والد کے شاگردوں کی عدم توجہی کا شکار ہو جاتے۔
آپ کہتے اس کرہ آسمانی میں بتایا گیا ہے کہ سورج زمین کے اطراف میں ایک دائرہ میں جس میں بارہ بروج ہیں گردش کر رہا ہے اور اگر اس بات کو مان لیں کہ سورج زمین کے ارد گرد دن و رات میں ایک دفعہ چکر لگاتا

ہے تو لازمی ہے کہ ایک سال وہ زمین کے اطراف میں بروج کے احاطہ میں گردش نہ کرے اور میں یہ کہتا ہوں کہ ان دو میں سے ایک حرکت عقلی لحاظ سے قابل قبول نہیں ہے۔

سورج اگر سال میں ایک بار بروج کے احاطہ میں زمین کے ارد گرد چکر لگاتا ہے تو صاف ظاہر ہے کہ دن ورات میں ایک دفعہ زمین کے ارد گرد چکر نہیں لگاسکتا اور جب بھی دن و رات میں ایک دفعہ زمین کے اطراف میں چکر لگائے تو لازمی بات ہے کہ سال میں ایک بار بروج کے احاطے میں زمین کے اطراف میں چکر نہیں لگا سکتا۔

یہ منطقی نظریہ جسے آج ہر خاص و عام قبول کرتا ہے امام محمد باقرؑ کے حلقہ درس میں حاضر ہونے والے شاگردوں کے لئے قابل قبول نہ تھا اور وہ اسے طفلانہ خیال سمجھتے تھے۔ لیکن اگر کوئی بالغ اور کامل انسان بھی اس نظریہ کو پیش کرتا تو پھر بھی یہ محال تھا کہ وہ اسے قبول کر لیتے۔ کیونکہ کوپر نیک پولینڈی نے جب سولہویں صدی میں امام جعفر صادقؑ کے یہی الفاظ دہرائے تو کسی نے اس کے قول کو قبول نہ کیا۔

اگر کوپر نیک فرانس یا جرمنی یا اسپانیا میں سے کسی ملک میں ہوتا تو وہ عقیدہ کے بارے میں تفتیش کرنے والی اس تنظیم کے ہاتھوں یقیناً" گرفتار ہو جاتا جس تنظیم کا سربراہ نور کماوا نامی ایک بے رحم اور متعصب شخص تھا وہ معمولی باتوں پر بھی عیسائیوں کو جیل بھیج دیتا تھا اور انہیں شکنجہ دیتا تھا تاکہ وہ اعتراف جرم کریں اور اس کے بعد انہیں سزا دیتا تھا۔

لیکن پولینڈ کا ملک اس تنظیم کی دسترس سے باہر تھا اسی لئے جب کوپر نیک نے کہا کہ زمین اور دوسرے سیارے سورج کے گرد گردش کرتے ہیں تو اسے کسی نے کچھ نہ کہا (۱)۔

یہ وہی تنظیم ہے جس نے گیلیلو کو توبہ و استغفار پر مجبور کیا تھا جو کہتا تھا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ گیلیلو وہ پہلا انسان ہے جس نے کہا تھا کہ زمین سورج کے ارد گرد گھومتی ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ کوپر نیک ہے گیلیلو نے اپنی Telescope ایجاد کرنے کے ساتھ یہ کہا تھا کہ میں کوپر نیک کی تائید کرتا ہوں۔ اس نے کہا کہ نجومی مشاہدات اور ٹیلی سکوپ نے مجھ پر ثابت کر دیا ہے کہ کوپر نیک کا نظریہ درست ہے اور زمین اور سیارات سورج کے گرد گھومتے ہیں۔

لیکن وہ یہ بات بھول گیا تھا کہ وہ ایک ایسے ملک میں رہ رہا ہے جہاں عقیدہ کی تفتیشی تنظیم کا اقتدار ہے اور اگر چند سیاسی لوگ اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے اس کی سفارش نہ کرتے تو وہ زندہ آگ میں ڈال دیا جاتا۔ اس کے باوجود کہ سیاسی وڈیروں نے اس کی سفارش بھی کر دی تھی پھر بھی اسے کہا گیا کہ زمین کی گردش کے بارے میں اپنے الفاظ واپس لے۔

اور گیلیلو کا توبہ نامہ بھی یہ ثابت کرتا ہے کہ اس نے خود یہ نظریہ اختراع نہیں کیا تھا بلکہ کوپر نیک کی نقل کی تھی۔

# امام باقرؑ اور ولید کی ملاقات

اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ ۹۱ھ میں (جب پہلا آسمانی کرہ مصر سے مدینہ لا کر امام محمد باقرؑ کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا) اس کیفیت سے زیادہ آزاد علمی حالت قرون وسطیٰ میں یورپی یونیورسٹیوں میں تھی بلکہ قرون اول اور دوم علمی احیاء کے ادوار تھے۔ چونکہ امام جعفر صادقؑ نے اس سال سورج کی زمین کے گرد گردش پر تنقید کی اور کہا جاتا ہے کہ یورپی یونیورسٹیوں کے طلباء علمی احیاء کی پہلی اور دوسری صدی میں سورج کی زمین کے گرد گردش کے نظریے پر تنقید نہ کر سکے' صحیح نہیں ہے۔ مجموعی طور پر اسلام میں علمی نظریات کے بارے میں یورپ کی نسبت اظہار خیال کی زیادہ آزادی تھی۔ اگرچہ یہ علمی نظریات مذہب سے بھی مربوط ہوتے تھے اور حتیٰ کہ نظریاتی نقطہ نگاہ سے عباسیوں کا دور حکومت ظالم ترین دور شمار ہوتا ہے پھر بھی اس دور میں ایک اسلامی دانشمند یورپ کی نسبت زیادہ آزادی سے اظہار خیال کر سکتا تھا۔

بعض نظریاتی مباحث کے بارے میں عباسی خلفاء کی سختی مثلاً" قرآن کے مسئلہ قدمت اور حدوث کے بارے میں اظہار خیال پر ان کی پابندی اس لئے تھی کہ انہیں اپنی حکومت کے کھو جانے کا ڈر ہوتا تھا۔ مگر ہر اس علمی بحث پر پابندی نہ تھی جس سے وہ نہیں ڈرتے تھے اور انہیں اندیشہ نہ ہوتا تھا کہ وہ علمی بحث انہیں نقصان پہنچائے گی۔ اس کے بارے میں انہوں نے علماء کو اظہار خیال کی آزادی دی ہوئی تھی۔ جو کچھ امام جعفر صادقؑ نے زمین اور سورج کے بارے میں فرمایا تھا (اور اعلانیہ زبان پر لائے تھے) اگر یورپ میں زبان پر لاتے تو اس کا فوری نتیجہ یہ ہوتا کہ آپ کو کافر قرار دے کر آپ کا بائیکاٹ کر دیا جاتا۔ اگر کوئی تیرھویں صدی کے آغاز کے بعد ایسا اظہار خیال کرتا تو کافر قرار دینے کے علاوہ اسے آگ میں بھی ڈالتے اور اگر تیرھویں صدی سے پہلے اس نظریہ کو یورپ میں پیش کرتا تو مذہبی علماء کی کمیٹی ورون کے وضع کردہ قانون کے مطابق جو ۱۱۸۳ء میں بنایا گیا تھا اس کا سرتن سے جدا کر دیا جاتا۔ عیسائی پوپ جرجیس نہم نے ۱۲۳۳ء میں عقیدے کی کمیٹی تشکیل دی تھی' اس کے بعد مرتد مصنفین کو جلانے کا کام شروع ہو گیا تھا۔ اور یہ تنظیم (ایکز لیبوں) خصوصاً" یونیورسٹیوں میں پوچھ گچھ کرتی تھی۔ اس استاد کی شامت آجاتی تھی جو کسی پیریڈ میں ایسا تنقیدی درس پڑھا دیتا جو رواج کے خلاف ہوتا اور اس طالب علم کی بھی شامت آجاتی جو درس کے دوران رواج کے خلاف تنقیدی سوال اٹھاتا وہ پھر بغیر کسی حیل و حجت کے اسے گرفتار کر لیتے اور اس تنظیم والے اس کو کسی ایک جیل میں بھیج دیتے حتیٰ کہ اس کی باری آنے پر اسے سزا دی جاتی۔ یہ تنظیم ۱۸۰۸ء میں نپولین اول بادشاہ فرانس نے

ختم کی اور جب نپولین کی حکومت ختم ہوئی تو دوبارہ یہ تنظیم ۱۸۱۴ء میں سپین میں تشکیل دے دی گئی اور ۱۸۳۴ء تک قائم رہی۔ لیکن اس کے بعد اس کی تشکیل نہیں ہوئی (۱۲)۔

یورپ کی علمی جہالت اور اسی زمانے میں اسلامی ممالک کی علمی ترقی کا اصل سبب یہ تھا کہ یورپ میں اہل علم حضرات کو علمی نظریات کے اظہار کی آزادی نہ تھی جب کہ اسلامی ممالک میں علمی نظریات کے اظہار خیال کی مکمل آزادی تھی۔ اس کے باوجود کہ مشرق سے علم کی روشنی یورپ تک پہنچ رہی تھی لیکن یہ روشنی اتنی نہ تھی کہ ایک مختصر عرصہ تک یورپ کی تاریکی پر غلبہ پا لیتی۔ یورپ میں اس قدر علمی تاریکی چھائی ہوئی تھی کہ مشرق کی روشنی صرف اس کے کچھ حصے یعنی صرف علم طب کو منور کر سکی اور یورپ میں طب کا ماہر کوئی بھی ایسا شخص نہ تھا جس نے ارجوزہ ابن سینا کا نام لاطینی زبان میں نہ سنا ہو لیکن مشرق کی سرزمین سے ادب و ہیئت وارد کرنے کی اجازت نہ تھی کیونکہ مشرق کی سرزمین میں مسلمان شعراء ایسے شعر پڑھتے تھے جنہیں عقیدے کے بارے میں تفتیش کرنے والی تنظیم یورپی ممالک میں چھپنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی کیونکہ اس طرح یورپی شعراء بھی ان کی تقلید کرنے لگتے۔ یہ اشعار یورپی قوموں کو بیدار کرتے تھے مشرقی علماء کا وفد بھی یورپ نہ گیا کیونکہ عقائد کی تفتیش کرنے والی تنظیم نہیں چاہتی تھی کہ یورپی یونیورسٹیاں مشرقی علماء کے وفد سے معلومات حاصل کریں۔(۱۳)

جیسا کہ ہم نے کہا ۹۱ھ میں امام جعفر صادقؑ کو دو نئے واقعات پیش آئے۔ پہلا واقعہ یہ تھا کہ ان کے والد گرامی کو آسمانی کرہ پیش کیا گیا اور پہلی مرتبہ امام جعفر صادقؑ نے ایک آسمانی کرہ دیکھا اور ہم نے دیکھا کہ اس کا نتیجہ کیا نکلا ؟

دوسرا واقعہ یہ تھا کہ ولید بن عبدالملک اموی خلیفہ دارالحکومت دمشق سے چلا اور چند شہروں کا معائنہ کرنے کے بعد مدینہ پہنچا۔ وہ یورپی شان وشوکت' چھوٹے روم 'بیزانس کے بادشاہ کی مانند سفر کرتا تھا اور اس کے ہمراہ خلیفہ کے درباری لوگوں کے بھی چند دستے ہوتے تھے تاکہ خلیفہ کے آرام اور خاطر تواضع میں ذرا بھی فرق نہ آئے۔ عمر بن عبدالعزیز حاکم مدینہ تقریباً" ایک سو اسی (۱۸۰) کلو میٹر تک اس کے استقبال کے لئے گیا اور استقبال سے پہلے خلیفہ کے قیام کے لئے ایک بہترین گھر منتخب کیا گیا اور چونکہ اسے علم تھا کہ ایک وفد بھی خلیفہ کے ہمراہ ہوگا تو ان کی مہمان نوازی کے لئے بھی گھروں کا تعین کیا گیا۔

خلیفہ مدینہ میں داخل ہوا اور اطلاع عام دی گئی کہ کل عام ملاقات کا دن ہے۔ جو کوئی بھی ولید بن عبدالملک سے ملنے جائے گا۔ بادشاہ اس سے ملاقات کرے گا۔

عمر بن عبدالعزیز جانتا تھا کہ امام محمد باقرؑ ولید بن عبدالملک کی ملاقات کے لئے نہیں جائیں گے اور ممکن ہے اس وجہ سے امام محمد باقرؑ زیر عتاب آجائیں لہٰذا وہ امام محمد باقرؑ کے پاس گیا اور ان سے کہا۔ کیا آپ

ولید سے ملنے جائیں گے ؟ امام محمد باقرؑ نے نفی میں جواب دیا۔ عمر بن عبدالعزیز نے یہ نہ پوچھا کہ کیوں اسے ملنے نہیں جاتے ؟ کیونکہ یہ سوال اتنا ضروری نہ تھا اور حاکم مدینہ جانتا تھا کہ امام محمد باقرؑ ولید کو خلیفہ نہیں سمجھتے کجا یہ کہ وہ اسے ملنے جاتے۔ عمر بن عبدالعزیز نے کہا اس شہر کی آپسے اتنی نسبت ہے کہ اسے آپ کا گھر کہا جا سکتا ہے اور گویا ولید بن عبدالملک آپ کے گھر آیا ہے کچھ بھی ہو آخر وہ ایک مسلمان ہے اور اگر فرض کریں ایک کافر آپ کے گھر بطور مہمان آئے تو کیا آپ اس کا احترام نہیں کریں گے ؟

امام محمد باقرؑ نے فرمایا ایک مہمان کے میرے گھر آنے اور ولید کے آنے میں فرق ہے۔ ولید نے اپنے آپ کو خلیفہ قرار دیا ہے وہ گھر کے مالک کی مانند اس شہر میں آیا ہے۔ عمر بن عبدالعزیز نے کہا مجھے علم ہے آپ کیوں اس سے ملنے نہیں جاتے۔ آپ کا خیال ہے کہ جب آپ ولید سے ملنے جائیں گے تو لوگوں کے ذہن میں یہ بات آئے گی کہ آپ نے ولید کی بیعت کر لی ہے۔

امام محمد باقرؑ نے حاکم مدینہ کی تصدیق کی۔ عمر بن عبدالعزیز نے کہا آپ کے اجداد میں سے ایک نے میں یہ نہیں کہتا کہ اپنی رضامندی سے بلکہ مسلمانوں کی مصلحت کے پیش نظر ایک اموی خلیفہ سے صلح کی اور کسی نے بھی نہ کہا کہ انہوں نے اس خلیفہ کی بیعت کر لی تھی اور آپ بھی ولید سے ملنے جائیں گے تو کوئی یہ نہیں کہے گا کہ آپ نے اس کی بیعت کر لی ہے۔ محمد باقرؑ نے فرمایا میں اس سے ملنے کے لئے نہ جانے کو ترجیح دیتا ہوں۔ عمر بن عبدالعزیز نے کہا اگر آپ اسے دیکھنے نہیں جائیں گے تو پتہ ہے میرے لئے کیا مصیبت کھڑی ہوگی ؟ حاکم مدینہ نے کہا ولید کو یہ علم ہے کہ میں آپؑ اور آپ کے خاندان کا عقیدت مند ہوں اور آپ سے عرض کر دوں کہ ولید کے پاس اطلاعات حاصل کرنے کے لئے ایک خفیہ مشینری ہے۔ یہ مشینری معاویہ کے زمانے سے چلی آ رہی ہے اور جو کوئی بھی اموی خلیفہ آیا اس نے اس مشینری سے فائدہ اٹھایا۔ اس مشینری کے افسروں نے ضرور خلیفہ کو بتایا ہوگا کہ میں آپ کا عقیدت مند ہوں اور اگر آپ ولید سے ملنے نہیں جائیں گے تو وہ مجھ پر غضبناک ہوگا اور کہے گا اگر تم اس کے ساتھ عقیدت مندی کا اظہار نہ کرتے تو ہرگز وہ اتنا مغرور نہ ہوتا کہ آج وہ مجھے ملنے بھی نہ آتا اور اس طرح وہ مجھے مدینہ کی گورنری سے معزول کر دے گا۔

امام محمد باقرؑ نے جواب دیا میں مغرور نہیں ہوں۔ صرف جی نہیں چاہتا کہ میں ولید سے ملاقات کرنے جاؤں لیکن تمہاری ان باتوں کے بعد میں راضی ہوں اور کل اس سے مل لوں گا۔ عمر بن عبدالعزیز خوش ہوا اور کہا کیا میں خلیفہ کو جا کر بتا سکتا ہوں کہ آپ اس سے کل ملنے جائیں گے ؟

امام محمد باقرؑ نے جواب دیا ہاں ! دوسرے دن امام محمد باقرؑ ولید سے ملاقات کرنے چلے گئے۔ جس وقت آپ داخل ہوئے ولید اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اپنے برابر بٹھایا۔ عرب ان لوگوں کا بے حد احترام کرتے تھے جو بلاواسطہ کسی بڑے قبیلے کے سربراہ ہوتے تھے اور اسی طرح امام محمد باقرؑ نہ صرف یہ کہ اپنے قبیلے کے سربراہ تھے بلکہ ولید

کی نظروں میں ایک عظیم عالم بھی تھے۔ اموی خلیفہ ان کے علمی مقام کی وجہ سے بھی ان کا احترام کرتا تھا۔ بنی امیہ کی نسل کے اکثر خلفاء اگرچہ باطن میں علم سے لگاؤ نہیں رکھتے تھے مگر پھر بھی ظاہری طور وہ علماء سے اپنی عقیدت مندی کا اظہار کرتے تھے۔

اس دن امام محمد باقرؑ اور اموی خلیفہ کے درمیان عام مسائل کے علاوہ کسی خاص مسئلہ پر گفتگو نہ ہوئی۔ اگر دو آدمیوں کے گفتگو کرنے کے لئے کوئی خاص موضوع نہ ہو یا وہ کسی مصلحت کے تحت آپس میں گفتگو نہ کرنا چاہتے ہوں تو وہ روزمرہ کے عام مسائل کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں اور عموماً ان کی گفتگو آب و ہوا اور زرعی پیداوار کے متعلق ہوتی ہے۔

ولید بن عبدالملک نے چاہا کہ کوئی بات کرے تو اس نے بات کا آغاز مدینہ کی زرعی پیداوار سے کیا چونکہ اس سال بارش بروقت ہوئی تھی مدینہ کے کسانوں کو علم تھا کہ اچھی پیداوار ہو گی للذا امام محمد باقرؑ نے بھی یہی جواب دیا۔

ولید نے امام محمد باقرؑ سے ان کی جائیداد کے بارے میں سوال کیا کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ معلوم کرے کہ وہ کتنی جائیداد کے مالک ہیں۔ انہوں نے جواباً فرمایا' ان کی ملکیت ایک قطعہ اراضی ہے جو محض ان کے کنبہ کی کفالت کرتا ہے۔ اس سے اضافی پیداوار نہیں ہوتی جسے فروخت کیا جا سکے۔

ولید نے کہا اگر آپ چاہتے ہوں تو جس جگہ بھی آپ کہتے ہیں مدینہ میں یا اس کے باہر آپ کو اتنی جائیداد الاٹ کر دیتا ہوں جو آپ کے لئے بھی کافی ہو اور بعد میں آپ کی آئندہ نسل بھی اس سے مستفید ہو۔

امام محمد باقرؑ نے فرمایا اگر میرے بیٹے زندہ رہے تو وہ کام کریں گے اور اپنی روزی خود پیدا کریں گے اور میرے خاندان کے لئے یہ قطعہ اراضی کافی ہے اگرچہ اس سے کوئی زیادہ پیداوار نہیں ہوتی مگر میرے زیر کفالت افراد بھوکے نہیں رہتے۔ امام محمد باقرؑ نے اس گفت و شنید کے بعد ولید کو خداحافظ کہا اور اٹھ کر چلے گئے۔

اموی خلیفہ کا مدینے آنے کا بڑا مقصد یہ تھا کہ وہ یہ دیکھے کہ اس کے مسجد نبویؐ میں توسیع کے حکم پر کس طرح عمل ہوا ہے؟ اس موقع پر امام محمد باقرؑ روزمرہ کے مطابق مسجد میں درس پڑھانے میں مشغول تھے (کیونکہ صرف جمعہ کے دن تعطیل ہوتی تھی) اور امام جعفر صادقؑ بھی اپنے باپ کے درس میں حاضر تھے۔ جب خلیفہ مسجد میں داخل ہوا تو اس نے اس کی توسیع پر اطمینان کا اظہار کیا اور پھر مسجد کے اس حصہ کی طرف چلا جس پر چھت پڑی ہوئی تھی اور جہاں اس وقت امام محمد باقرؑ درس پڑھا رہے تھے۔ سلسلہ درس ولید کے آنے پر منقطع ہو گیا لیکن اس نے امام محمد باقرؑ سے عرض کی کہ درس دینا جاری رکھیں اتفاق سے اس دن جغرافیہ پڑھایا جا رہا تھا اور ولید کو اس جغرافیہ کے بارے میں مطلق علم نہ تھا۔ وہ استاد کی باتوں کو غور سے سنتا رہا اور آخر کار اپنی حیرت کو نہ چھپا سکا۔ اس نے امام محمد باقرؑ سے پوچھا یہ علم جو آپ پڑھا رہے ہیں کونسا علم ہے ؟

امام نے فرمایا یہ جغرافیہ اور ہیئت ہے۔ ولید نے کہا یہ علم کس بارے میں بحث کرتا ہے ؟ محمد باقرؑ نے فرمایا یہ زمین اور آسمانی ستاروں کے بارے میں بحث کرتا ہے۔ ولید جس نے اس وقت تک امام جعفر صادقؑ کو نہیں دیکھا تھا جس وقت اس کی نظر ان پر پڑی تو حاکم مدینہ سے پوچھا یہ لڑکا یہاں کیا کرتا ہے ؟

عمر بن عبدالعزیز نے کہا کہ وہ امام محمد باقرؑ کے فرزند ہیں اور دوسرے طالب علموں کی مانند یہاں درس پڑھتے ہیں- ولید نے کہا یہ بچہ کس طرح اس حلقہ درس سے استفادہ کرتا ہے ؟ حاکم مدینہ نے کہا۔ اس لڑکے کی علم حاصل کرنے کی استعداد ان تمام طالب علموں سے زیادہ ہے جو اس حلقہ درس میں شریک ہوتے ہیں- ولید نے امام جعفر صادقؑ کو اپنے پاس بلایا' جب آپ قریب تشریف لائے تو ولید نے انہیں نہایت غور سے دیکھنے کے بعد کہا یہ تو ابھی بچہ ہے یہ کس طرح یہاں پڑھتا ہے ؟ عمر بن عبدالعزیز نے کہا بہتر یہ ہے کہ خلیفہ اس کا امتحان لے تاکہ اس کی سمجھ میں یہ بات آئے کہ یہ بچہ علماء میں سے ہے- خلیفہ نے امام سے پوچھا آپ کا نام کیا ہے ؟ آپ نے جواب دیا میرا نام جعفر ہے۔ خلیفہ نے پوچھا' جعفر کیا تم جانتے ہو کہ صاحب المنطق کون تھا ؟ امام جعفر صادقؑ نے فوراً" جواب دیا ارسطو' اور یہ لقب اس کے شاگردوں نے اس کو دیا تھا۔ خلیفہ نے پوچھا کیا تم بتا سکتے ہو کہ صاحب المعز کون تھا ؟ امام جعفر صادق نے فوراً" جواب دیا- یہ کسی انسان کا نام نہیں بلکہ ستاروں کے ایک گروہ کا نام ہے جو "ممسک الاعنہ" بھی کہلاتا ہے- (۱۴)

خلیفہ نے جو پہلے ہی حیرت زدہ ہو گیا تھا پوچھا کیا تمہیں معلوم ہے صاحب السواک کون تھا ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا صاحب السواک عبداللہ بن مسعود کو کہا جاتا ہے جس کا کام میرے جد بزرگوار رسول اللہ ﷺ کی خدمات کا کچھ حصہ انجام دینا تھا۔(۱۵)

ولید بن عبدالملک نے چند دفعہ مرحبا کہا اور امام محمد باقرؑ سے مخاطب ہو کر بولا۔ آپ کا یہ بچہ دنیا کے عظیم ترین دانشمندوں میں سے ایک ہوگا۔

ولید بن عبدالملک کا خیال امام جعفر صادقؑ کے بارے میں درست ثابت ہوا اور وہ نہ صرف قابل دانشمند بلکہ اپنے زمانہ کے قابل ترین دانشمند کہلائے اور صاحب بن عباد جو ۳۸۵ھ میں "رے" میں فوت ہوا جسے اصفہان میں دفن کیا گیا' نے کہا کہ بعد از رسول اسلام ﷺ امام جعفر صادقؑ سے بڑا دانشمند کوئی نہیں گزرا اور یہ نظریہ صاحب بن عباد کا ہے جس کے علم و فضل میں کسی کو شک و شبہ نہیں اور یہاں یہ بات اہم ہے کہ ایسا اتفاق کم ہوتا ہے کہ ایک عالم دوسرے عالم کو اپنے آپ سے افضل قرار دے۔

صاحب بن عباد میں دو شبہات پائے جاتے ہیں جن کی درستی ہونی چاہئے۔ پہلی یہ کہ اسے عرب خیال کیا جاتا ہے حالانکہ وہ ایرانی الاصل ہے اور طالقان یا قزوین میں پیدا ہوا ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی اور بعد میں "رے" گیا اور مزید تعلیم جاری رکھی- ہمارا مقصد یہاں صاحب بن عباد کی زندگی کے حالات بیان کرنا نہیں کیونکہ

وہ ایک مشہور سیاستدان اور دانشمند انسان ہو گزرا ہے بلکہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ اس کے بارے میں دو شبہات کی درستی کی جائے۔ چونکہ صاحب بن عباد نے اپنی کتابیں عربی میں لکھیں اور قدیم زمانے میں ایرانی دانشمند اپنی کتابیں عربی میں لکھتے تھے۔ صاحب بن عباد فارسی کا ماہر تھا کیونکہ وہ آل بویہ شہنشاہوں کی وزارت سنبھالنے کے علاوہ شعر بھی کہتا تھا جو کوئی بھی اس کے شعر پڑھے وہ بخوبی اس بات کو درک کر سکتا ہے کہ صاحب بن عباد فارسی زبان پر پوری دسترس رکھتا تھا۔

اس کے متعلق دوسری غلط فہمی یہ ہے کہ کہا جاتا ہے وہ سنی العقیدہ مسلمان تھا جبکہ وہ یقیناً" شیعہ تھا اور اس کے شیعہ ہونے کی دلیل علی ابن ابی طالبؑ کے خاندان' امام موسیٰ کاظمؑ اور علی بن موسیٰ رضاؑ سے اس کی عقیدت تھی اور ان سب سے زیادہ وہ امام جعفر صادقؑ سے عقیدت رکھتا تھا۔ اس دلیل کے علاوہ اس کا شیعہ ہونا قرینے سے بھی ثابت ہے۔ حالانکہ دلائل دینے کے بعد قرینے سے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ کسی عنوان کو ثابت کرنے کے لئے دلیل قرینے سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔

جیسا کہ ہم کہتے ہیں قرینے سے پتہ چلتا ہے صاحب بن عباد شیعہ تھا' وہ قرینہ یہ ہے کہ وہ آل بویہ بادشاہوں کا وزیر تھا اور آل بویہ سلسلہ کے بادشاہ شیعہ المذہب تھے اور کسی حد تک آل بویہ کے دور میں شیعہ مذہب کے پھیلنے کی بنا پر صاحب بن عباد کا شیعہ ہونا ثابت ہے اور وہ ایرانی محققین جنہوں نے صاحب بن عباد کو جعفر صادقؑ کے عقیدت مندوں میں شمار کیا ہے اور شیعہ اثناء عشری سمجھا ہے ان میں سے ان لوگوں کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

۱۔ محمد بن علی بن حسین بن موسیٰ بن بابویہ قمی جو شیخ صدوق کے لقب سے معروف ہوئے اور جو شیعوں کی چار بڑی کلاسیکل کتابوں میں سے ایک "من لایحضرہ الفقیہ" کے مصنف ہیں اور ان کا نظریہ اس لئے بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہے کہ وہ موصوف کے ہمعصر تھے۔ انہوں نے موصوف کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ شیخ صدوق مبالغہ گو نہیں تھے اور خصوصاً" مذہب کے معاملے میں ان جیسا انسان حقیقت کے خلاف نہیں لکھتا۔

۲۔ شیخ بہائی عاملی جو صفوی دور کے مایہ ناز عالم تھے' انہوں نے واضح طور پر صاحب بن عباد کو شیعہ اثناعشری کہا ہے۔

۳۔ علامہ مجلسی جو صفوی دور کے عالم اور مشہور کتاب بحارالانوار کے مصنف ہیں وہ بھی صاحب بن عباد کے شیعہ ہونے کے قائل ہیں۔

۴۔ مذکورہ بالا تینوں اشخاص چونکہ شیعوں کے نزدیک نہایت قابل احترام ہیں اسی لئے ہم نے یہاں ان کا ذکر کیا ہے ورنہ بہت سے مورخین اور محققین ایسے ہیں جنہوں نے صاحب بن عباد کو شیعہ گردانا ہے۔

اور ان اشعار کا ذکر بھی کیا ہے جو اس نے علی ابن ابی طالبؑ اور دوسرے آئمہؑ کی مدح میں کہے۔ ان

اشعار کو پڑھنے والا آسانی سے یہ بات سمجھ لیتا ہے کہ شیعہ کے علاوہ کوئی دوسرا شخص اس قسم کے اشعار نہیں کہہ سکتا۔

ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے صاحب بن عباد کو سنی العقیدہ کہا ہے۔جس نے بہت زور دے کر کہا وہ ابو حیان توحیدی ہے جو صاحب بن عباد کا ہم عصر تھا اور عربی زبان میں شعر کہتا تھا ایک عرصے تک صاحب بن عباد کے گھر میں بطور مہمان بھی رہا۔ اس کے لئے کتابت کے فرائض انجام دیتا تھا لیکن آل بویہ بادشاہوں کے سینئر وزیر سے دوسرے شعراء کی مانند کوئی بڑا انعام حاصل نہ کرسکا۔ ابو حیان توحیدی کتابت کے ذریعے بغداد میں روزی کماتا تھا پھر اس نے اس جگہ کو چھوڑا اور "رے" چلا گیا تاکہ صاحب بن عباد کے نعمت کدہ سے فائدہ اٹھائے سینئر وزیر نے اسے اپنے گھر میں جگہ دی اور ایک کتاب اس کے حوالے کی تاکہ وہ اس سے نقل کر کے ایک دوسری کتاب تیار کرے۔

دو ہفتے بعد ابو حیان توحیدی نے صاحب بن عباد کو خط لکھا اور کہا اگر میں کتابت ہی کے ذریعے روزی کمانا چاہتا تو مجھے یہاں "رے" آنے کی کیا ضرورت تھی میں تو بغداد میں بھی یہ کام کر رہا تھا میں اس لئے یہاں آیا ہوں کہ تمہارے نعمت کدہ سے استفادہ کروں اور کتابت کے ذریعے کمانے پر مجبور نہ ہو جاؤں۔

صاحب بن عباد خط پاکر ناراض ہوگیا کیونکہ اس نے ابو حیان توحیدی کے خط کو کفران نعمت سمجھا اور اپنے ملازمین کو حکم دیا اس شاعر کو گھر سے نکال دیں جبکہ اوسطاً تقریباً پانسو آدمی صاحب بن عباد کے گھر میں کھانا کھاتے تھے۔ اس کے بعد ابو حیان جب تک زندہ رہا صاحب بن عباد کی زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی اس کی برائی بیان کرتا رہا اور اس کی ہجو کہتا رہا لیکن اس شخص کی صاحب بن عباد کے بارے میں یہ ہرزہ سرائی کسی اہمیت کی حامل نہیں' البتہ صاحب بن عباد نے جو کچھ امام جعفر صادقؑ کے بارے میں کہا ہے وہ خاصی اہمیت کا حامل ہے۔

کیونکہ وہ ایک فاضل محقق اور اہل مطالعہ انسان تھا "رے" میں اس کی لائبریری ایک لاکھ سے زیادہ کتابوں پر مشتمل تھی جو خاصی اہم تھی۔ جس زمانے میں صاحب بن عباد وزیر تھا آل بویہ سلاطین کے علاوہ عباسی خلفاء' فاطمی خلفاء' ساسانی بادشاہوں اور غزنوی بادشاہوں کا دور تھا۔ صاحب بن عباد ان میں کچھ کے دربار سے وابستہ رہا لیکن دوسروں کی سیاست سے بھی آگاہ تھا۔

اگر ہم یہ بتانا چاہیں کہ صاحب بن عباد اپنی وزارت اور زندگی کے دوران کتنے ہم عصر بادشاہوں اور خلفاء کے ساتھ رہا تو ہمیں پچاس سے زیادہ بادشاہوں اور خلفاء کا ذکر کرنا پڑے گا لہٰذا یہاں ہم صرف ان امراء اور سلاطین کا نام پیش کر رہے ہیں جو آل بویہ سلسلہ سے تھے اور صاحب بن عباد ان کا وزیر رہا۔ شرف الدولہ' بہاالدولہ' صمصام الدولہ' موید الدولہ' عضد الدولہ' معزالدولہ' رکن الدولہ اور عماد الدولہ۔

ایک انسان جو اتنے زیادہ بادشاہوں اور خلفاء کے ہمراہ رہا ہو یا ان سے وابستہ رہا ہو وہ سیاسی میدان میں کتنا ماہر ہو جاتا ہے اور جو شخص ہر وقت دانشوروں اور ادیبوں کے ساتھ رہا ہو وہ کس قدر علم و فضل میں بلند پایہ ہو جاتا ہے اسی طرح صاحب بن عباد بھی تھا۔ ایک ایسے شخص نے امام جعفر صادقؑ کو پیغمبر اسلامؐ کے بعد اس وقت تک کا سب سے بڑا اسلامی دانشمند کہا ہے۔

امام محمد باقرؑ کے حلقہ درس میں علم طب کی تدریس کے بارے میں دو مثبت اور منفی روایات ملتی ہیں بعض کہتے ہیں کہ وہاں علم طب کی تدریس ہوتی تھی اور بعض نے وہاں علم طب پڑھائے جانے کا انکار کیا ہے لیکن تردید کی گنجائش نہیں ہے کیونکہ جب امام جعفر صادقؑ نے خود درس پڑھانا شروع کیا تو وہ علم طب پڑھاتے تھے ان کے علمی نظریات نے طب پر کافی اثر ڈالا' اور دوسری و تیسری صدی ہجری کے اطباء صاحبان نے ان کے علمی و طبی نظریات سے استفادہ کیا۔ امام جعفر صادقؑ کے طبی نظریات میں سے ایک نظریہ یہ تھا کہ بعض اوقات ظاہری جسمانی علامتوں سے پتہ چلتا ہے کہ بیمار فوت ہو گیا ہے حالانکہ وہ زندہ ہوتا ہے اور اگر ذرہ سی خراش اس کے جسم پر لگائی جائے تاکہ تھوڑا سا خون اس کے جسم سے جاری ہو خصوصاً اس کے ہاتھ کی دو انگلیوں کے درمیان خراش لگائی جائے تو شاید وہ زندہ ہو جائے۔ یہ نظریہ دوسری صدی ہجری میں مورخین کے نزدیک سچا ثابت ہوا ہے یہ تجربہ خلیفہ عباسی ہارون الرشید کے چچا زاد بھائی پر کیا گیا تھا جسے کچھ مورخین نے ذکر کیا ہے تفصیل طلب ہے یہاں مختصراً" قارئین کی نظر سے گزار رہے ہیں۔ ہارون الرشید دوپہر کے کھانے پر بیٹھا تھا اسے اطلاع دی گئی کہ اس کا طبیب بختیشوع آگیا ہے جرائیل بختیشوع نے کہا میں اس لئے آیا ہوں تاکہ تمہیں اطلاع دوں کہ تمہارے چچا زاد بھائی ابراہیم بن صالح کی حالت خراب ہے اور آج رات وہ چل بسے گا اور جس وقت میں تمہارے چچازاد بھائی کے گھر سے نکل رہا تھا تو ابن بہلہ (ہندوستانی) داخل ہو رہا تھا ہارون الرشید نے کہا میں نے دو مرتبہ بلوایا لیکن تم نہیں تھے لہٰذا ابن بہلہ (ہندوستانی طبیب) کو چچا زاد بھائی کی عیادت کے لئے بھیج دیا۔

ابن بہلہ ایک ہندوستانی ڈاکٹر تھا اور بختیشوع کا رقیب تھا اس کی خواہش تھی کہ ہارون الرشید کے ہاں وہی مقام حاصل کرے جو بختیشوع کا ہے لیکن اسے کامیابی نہیں ہو رہی تھی جب ہارون الرشید نے بختیشوع کی زبانی سنا کہ اس کا چچا زاد آج رات چل بسے گا تو اس قدر غمگین ہوا کہ مزید کھانا نہ کھا سکا اور حکم دیا کہ دستر خوان اٹھا لیا جائے۔ ایک گھنٹے بعد ابن بہلہ' ہندوستانی ڈاکٹر داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ خلیفہ بہت پریشان ہے' پوچھا پریشانی کا سبب کیا ہے ؟ خلیفہ نے کہا بختیشوع ابھی یہاں آیا تھا اور اس نے بتایا ہے کہ میرا چچا زاد بھائی آج رات چل بسے گا۔ ابن بہلہ ہندوستانی نے کہا میں نے تمہارے چچا زاد کا نہایت غور سے معائنہ کیا ہے اور تجھے اطمینان دلاتا ہوں کہ وہ نہیں مرے گا۔

ہارون الرشید نے کہا۔ اے ابن بہلہ' بختیشوع ایک ایسا ڈاکٹر ہے جسے ڈاکٹری وراثت میں ملی ہے اور علم

طب میں عقل مند اور حاذق طبیب ہے۔ کسی بیمار کے بارے میں اس کی رائے آخری ہوتی ہے۔ ابن بہلہ نے کہا اے امیرالمومنین اگرچہ مجھے ڈاکٹری وراثت میں نہیں ملی پھر بھی میں آپ سے یہ کہتا ہوں کہ آپ کا چچا زاد بھائی نہیں مرے گا اس کا علاج معالجہ ہوگا۔ ہارون الرشید نے کہا اگر میرا چچا زاد بھائی آج رات مرجائے تو تیرا کیا حشر کروں ؟ ابن بہلہ نے کہا اگر آپ کا چچا زاد بھائی آج رات مرجائے تو آپ کو حق حاصل ہے کہ میرا سارا مال اور غلاموں کو ضبط کر لیں اور میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اپنی تمام بیویوں کو تین طلاقیں دوں گا۔ درباریوں نے دیکھا کہ ابن بہلہ کی بات نے اچھا اثر کیا اور عباسی خلیفہ جس نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لئے تھے دوبارہ حکم دیا کہ اس کے لئے کھانا لائیں جب کھانا دوبارہ آیا تو خلیفہ نے چند لقمے کھانے کے بعد شراب منگوائی اور دو جام پئے کیونکہ وہ چچا زاد کے زندہ بچ جانے کی خبر سے خوش تھا۔

اچانک ایک قاصد خلیفہ کے محل میں داخل ہوا اور خبر دی کہ ابراہیم بن صالح بادشاہ کا چچا زاد بھائی فوت ہو گیا ہے۔ جس وقت بختیشوع نے خلیفہ سے کہا تھا اس کے تھوڑی دیر بعد وہ اس دنیا سے کوچ کر گیا تھا۔

جب ہارون الرشید نے اپنے چچا زاد بھائی کی موت کی خبر سنی تو گریبان چاک کر کے کہا' افسوس میں نے چچازاد کی موت کے موقع پر شراب پی اور خوشی منائی۔

درباریوں نے اسے تسلی دی اور اطمینان دلایا' چونکہ اس وقت وہ نشے کی حالت میں تھا اسے جلد ہی نیند آگئی اور صبح تک سوتا رہا۔

اس دن ہارون الرشید نے ماتمی لباس پہنا اور ابراہیم صالح کے گھر گیا' اس زمانے کے رواج کے مطابق مردے کو غسل دیئے اور اس کے بدن پر کافور ملنے کے بعد اسے کفن پہنا چکے تھے ابن بہلہ مردے کو غسل دینے کے موقع پر وہیں موجود تھا اور مردے کو نہایت غور سے دیکھ رہا تھا اور جب ہارون الرشید وہاں پہنچا وہ اس کے قریب ہو گیا جونہی خلیفہ کی نظر اس ڈاکٹر پر پڑی اسے جھڑکا۔ کیا تجھے یاد ہے کل تو نے کیا عہد کیا تھا ؟

ابن بہلہ نے کہا۔ ہاں امیرالمومنین' لیکن آپ مالک ہیں میرے غلاموں کو مجھ سے نہ چھینئے۔ عباسی خلیفہ نے جواباً" کہا مجھے جھوٹے سے نفرت ہے اور میں اسے معاف نہیں کرتا۔

ابن بہلہ نے کہا اے امیرالمومنین میں آپ سے بخشش نہیں چاہتا' جو میں نے کہا کہ آپ مالک ہیں آپ میرے غلاموں کو مجھ سے نہ چھینئے اس لئے کہ اگر آپ ایسا کریں گے تو جلد بازی کریں گے کیونکہ آپ کا چچا زاد زندہ ہو گا۔

خلیفہ نے پوچھا کیا مردہ کبھی زندہ ہوا ہے ؟

ابن بہلہ نے جواب دیا۔ جو مکمل طور پر نہ مرا ہو زندہ ہوتا ہے اور چونکہ آپ کا چچا زاد بھائی مکمل طور پر نہیں مرا اس لئے دوبارہ زندہ ہو گا لیکن اگر وہ کفن میں اپنے آپ کو نیم برہنہ دیکھے گا اور کافور کی بو سونگھے گا تو

خوف سے مر جائے گا۔ آپ حکم دیں کہ کفن کو اس سے دور ہٹائیں اسے غسل دیں اور عام لباس پہنا کر بستر پر لٹا دیں تاکہ میں اسے زندہ کروں۔ ہارون الرشید نے حکم دیا کہ اسی ترتیب سے عمل کریں اور ابراہیم بن صالح کو بستر پر لٹا دیں۔ اب ابن بہلہ نے ہاتھ میں تیز دھار والا چاقو لیا اور بائیں ہاتھ کی دو انگلیوں کے درمیان زخم لگایا جس سے خون جاری ہو گیا۔ ہارون الرشید نے جو مردے کے بستر کے پاس ہی کھڑا تھا دیکھا کہ خون جاری ہونے کے بعد مردے نے حرکت کی اور پھر آنکھ کھول کر ہارون الرشید کو پہچان کر دھیمی آواز میں کہا۔ اے میرے چچا زاد خدا آپ کو اجر عنایت فرمائے کہ آپ میری عیادت کے لئے آئے ہیں۔

بہر حال ہم یہ بیان کر رہے تھے کہ اگرچہ ہمیں اس بارے میں کچھ علم نہیں کہ امام محمد باقرؑ نے علم طب پڑھایا یا نہیں ؟ اور ان کے بیٹے نے ان کے حلقہ درس سے علم کو حاصل کیا یا نہیں ؟ لیکن اس امر میں بھی تردید کی گنجائش نہیں ہے کہ خود امام جعفر صادقؑ نے علم طب پڑھایا ہے اور اس علم میں ایسی چیزیں لائے ہیں جن سے پہلے مشرقی ڈاکٹر ناواقف تھے اور مشرق سے ہماری مراد عرب نہیں ہے کیونکہ عرب میں طب نہیں تھی بلکہ یہ اسلام کے بعد دوسری جگہوں سے عرب میں آیا۔

اگر ہم یہ بات مان لیں کہ امام جعفر صادقؑ نے علم طب اپنے والد گرامی کے حضور میں پڑھی تھی تو یہ بات ضروری ہے کہ ان کے والد نے ضرور کسی جگہ سے اس علم کو سیکھا ہو گا اور یہ ہمیں معلوم نہیں کہ انہوں نے کہاں سے سیکھا ؟ (عقیدۃ" علم امام وہبی ہوتا ہے)۔

کیا جس طرح علم جغرافیہ اور علم ہندسہ قبطیوں کے ذریعے مصر سے مدینہ آیا یا امام محمد باقرؑ کے حلقہ درس میں شامل ہوا اسی طرح کہا جا سکتا ہے کہ علم طب بھی آپ کے درس میں شامل ہوا۔ امام جعفر صادقؑ نے علم طب کو ایرانیوں سے لیا چونکہ اتفاق سے طب جعفری میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن میں ایرانی رنگ جھلکتا ہے اس لئے یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے علم طب کو شاید ایرانیوں سے سیکھا ہے یا اس علم کا کچھ حصہ ایرانیوں سے اور کچھ حصہ قبطیوں سے اخذ کیا ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ قدیم علم طب کسی ایک قوم سے مختص نہیں رہا بلکہ مصری، یونانی اور ایرانی اس علم کی تکمیل میں شریک رہے ہیں اور وہ قوم جو قدیم علم طب کو حاصل کرتی تھی وہ اس علم میں تمام قوموں کی کاوشوں سے بہرہ مند ہوتی تھی۔ قدیم اقوام میں عرب ایک ایسی قوم تھے جنہوں نے علم طب کی توسیع میں کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دیا تھا اور عربوں میں طب عام نہ تھی اور جہاں تک ہمیں علم ہے عرب میں اس علم کو پڑھانے والا کوئی فرد نہ تھا تاکہ لوگ اس سے فیض یاب ہوتے۔ وہ پہلا انسان جس نے علم طب پڑھانا شروع کیا وہ امام جعفر صادقؑ یا ان کے والد گرامی امام محمد باقرؑ تھے۔ اسلام سے پہلے عرب بیمار ہوتے تو انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ یا تو وہ بچ جاتے یا مر جاتے تھے (گویا باقاعدہ طور پر علم طب کا رواج عربوں میں نہ تھا لیکن طلوع اسلام کے ساتھ ہی اس علمی شعبہ کی جانب عہد نبویؐ میں ہی

خصوصی توجہ دی جانے لگی تھی)۔

بدو عرب بہت کم بیمار ہوتے تھے۔ ان کی غذا اونٹنی کا دودھ ہوتا تھا کیونکہ اونٹنی کا دودھ جسم کو ضروری غذائی مواد مہیا کرتا ہے اور اس کے ساتھ نامناسب غذا سے بدن میں رطوبت بھی نہیں پیدا ہوتی جیسا کہ آج ہمیں معلوم ہے بعض دائمی امراض میں سے کچھ ایسی ہیں جن کی وجہ سے موت واقع ہو جاتی ہے۔ غذائی رطوبت جو بدن میں ہوتی ہے یوریا (Urea) اور یورک ایسڈ (Uric Acid) اسی رطوبت کا ایک حصہ ہیں۔

قدیم حکمت میں یوریا کو "صفرائی سودا" اور یورک ایسڈ کو "بلغمی سودا" کہا گیا ہے۔

عرب بدو جس کی غذا اونٹ کا دودھ ہوتی تھی اس کے بدن میں رطوبت پیدا نہیں ہوتی تھی اور تمام عمر مصفی ہوا میں سانس لیتا تھا۔ عرب بدو جن بیماریوں سے بچپن میں مرتے تھے وہ جراثیموں سے پھیلنے والی بیماریاں (Infectious Diseases) ہوتی تھیں اور عرب میں بچوں کی بیماریاں کافی زیادہ تھیں جس کی وجہ سے شرح اموات اتنی بلند تھی کہ کرنل لارنس نے اپنی کتاب "عقل کے سات ستون" میں لکھا ہے کہ جزیرہ عرب میں اٹھارویں صدی کے اواخر تک کی آبادی اور اسی علاقے میں صدر اسلام کے زمانے کی آبادی میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ اس دور میں جب اسلام کافی پھیل چکا تھا۔ جزیرہ عرب کے بعض علاقوں میں آبادی کافی کم ہو چکی تھی۔

بہر صورت اگر عرب بدو بچپن میں امراض سے بچ جاتا اور کبھی بیمار نہ ہوتا تو اس کی عمر کافی لمبی ہوتی تھی، البتہ شہری عرب بیمار ہوتے تھے لیکن وہ ڈاکٹر سے رجوع نہیں کرتے تھے اور آج ہمیں معلوم ہے کہ ان کے بیمار ہونے کی وجہ ایک غذا ہوتی تھی جو بدن میں رطوبت پیدا کرتی تھی۔

آج یہ بات قابل قبول نہیں ہے کہ کوئی بیمار ہو تو اس کے علاج کے لئے کسی ڈاکٹر کو نہ بلائیں یا اسے طبیب کے پاس نہ لے جائیں۔

لیکن عرب میں ایسا ہوتا تھا کہ نہ تو بیمار ڈاکٹر کے پاس جاتا نہ ہی کوئی اور اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاتا اور نہ ڈاکٹر اس کے معائنہ کے لئے آتا۔

علم طب کے عام قواعد تک ہر آدمی کی رسائی ہوتی تھی اور جو لوگ اسے سیکھنا یا سکھانا چاہتے تو وہ ایسا کر سکتے تھے۔

لیکن بعض باتیں جو طب جعفری میں ملتی ہیں وہ اس سے پہلے نہیں تھیں اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے وہ قواعد خود اخذ کئے ہیں۔

جیسا کہ ہمیں معلوم ہے امام جعفر صادقؑ کا پیشہ طب نہیں تھا کہ ان قواعد کو مطب کے دوران اخذ کرتے۔ لہٰذا خیال کیا جاتا ہے کہ ان قواعد کو کہیں سے سیکھا ہے اور اگر آپ نے ان قواعد کو والد کے حلقہ درس سے سیکھا ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کے والد نے ان قواعد کو کہاں سے سیکھا تھا ؟

جیسا کہ ہم نے کہا' جعفری طب میں بعض چیزیں ایسی ملتی ہیں جن سے ایرانی رنگ جھلکتا ہے اور اگر ہم اس بات کو تسلیم نہ کریں کہ امام جعفر صادقؑ نے طب کو ایرانیوں سے سیکھا تب بھی یہ بات ماننا پڑے گی کہ اس کا کچھ حصہ ایرانیوں سے ان تک پہنچا ہے۔

ساسانیوں کے دور میں علم طب کے لحاظ سے ایرانی تربیت یافتہ قوموں میں شمار ہوتے تھے' اس زمانے میں علم طب کا شوق اور استعداد رکھنے والا ہر آدمی یہ علم نہیں سیکھ سکتا تھا اس لئے ساسانیوں کے دور میں لوگوں کے ہر طبقے کی مخصوص ذمہ داریاں ہوتی تھیں اور ہر طبقہ کے لوگ دوسرے طبقہ کے لوگوں کے فرائض میں مداخلت نہیں کر سکتے تھے اور ایک طبقہ سے دوسرے طبقہ میں جانا بہت مشکل ہی نہیں بلکہ ایک ناممکن بات تھی لیکن مذہبی رہنما اور منشی لوگ ڈاکٹر بن سکتے تھے۔

ساسانیوں کے دور میں مانی کی تحریک کے برپا ہونے کی وجوہات میں سے ایک وجہ یہی لوگوں کی طبقاتی تقسیم اور ایک طبقہ کو دوسرے طبقے میں جانے کی ممانعت تھی۔ مانی کا کہنا تھا کہ تمام لوگوں کو تعلیم حاصل کرنے کی اجازت ہونی چاہئے اور ساسانی بادشاہوں کا اس طرح لوگوں کو طبقات میں تقسیم کر کے تعلیم سے محروم رکھنا ظلم کے مترادف ہے اور بعض بادشاہ تو اس قدر ظلم کرتے تھے کہ کوئی دیہاتی طبقے کا آدمی اگر اپنے بیٹے کو تعلیم دلوانے پر توجہ دیتا تو اس کے قتل سے بھی دریغ نہ کیا جاتا۔

مانی اور اس کے پیروکاروں کے قتل کا سلسلہ شروع ہوا تو اس کے پیروکاروں میں سے بعض نے ایران سے چین کی طرف ہجرت کی اور تورخان کے علاقے میں جو چین کے شمال مغرب (ترکستان) میں واقع ہے سکونت اختیار کر لی اور وہاں ایک پرکشش ایرانی تمدن کی بنیاد ڈالی یہاں مانی کی تعلیمات کے مطابق مرد و عورتیں تعلیم حاصل کرنے لگے اور انہیں علم طب بھی سکھایا جانے لگا۔

تور خان کی طرف ہجرت کے بعد ایرانیوں نے ترکستان کے علاقے میں بھی اپنی زبان اور خط کو محفوظ رکھا اور جو کچھ وہ پڑھتے پڑھاتے وہ فارسی زبان اور رسم الخط میں ہوتا تھا یعنی پہلوی ساسانی رسم الخط ہوتا تھا۔

مانی کے پیروکار ایرانی تور خان میں علم طب ایران سے لے کر گئے تھے' انہوں نے خود اس علم کو ایجاد نہیں کیا تھا۔

اگرچہ علم طب جو ایران میں سکھایا جاتا تھا اس کی کوئی کتاب اب باقی نہیں ہے لیکن وہ تاریخی دستاویزات جو تورخان سے ملی ہیں ان سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ علم طب جو اس ایرانی معاشرے میں جس میں ایرانی رسم الخط اور زبان محفوظ تھی کیسا تھا؟ ان دستاویزات کی بنا یہ کہا جا سکتا ہے کہ علم طب ساسانیوں کے دور میں ایران میں رائج تھا اور ایرانی معاشرہ جو تور خان میں قائم تھا وہ ایرانی علم طب کو سیکھتا اور سکھاتا تھا۔ مانی کے دور کی زبان اور خط دونوں تور خان کے علاقے میں محفوظ رہے اور ایرانی وہاں پر اصلی پہلوی خط لکھتے تھے جبکہ

ایران میں پہلوی خط ہزاوارش میں تبدیل ہو گیا اور ہزاوارش کو آرامی لکھنے والوں نے پہلوی زبان میں تبدیل کر دیا اور ہزاوارش اس طرح تھی کہ اگر آرامی مصنفین آرامی میں کوئی کلمہ لکھتے تو اسے پہلوی زبان میں پڑھتے تھے۔ مثال کے طور پر آرامی زبان میں "اس" کو "کتل" کہتے تھے اور آرامی کاتب پہلوی ساسانی زبان میں "کتل" لکھتے تھے اور "اس" پڑھتے تھے اس تلفظ کی بنا پر پہلوی ساسانی زبان کا کچھ حصہ مستقل طور پر اسی ترتیب میں بند ہو گیا اور بعد کی نسلیں رسم الخط سے ان کلمات کے معنی سمجھیں۔

لیکن رسم الخط کا یہ بڑا نقص ان ایرانیوں کے خط میں جو تورخان میں رہتے تھے پیدا نہ ہوا اور وہ آرامی کاتبین کی طرز ٹھونسے جانے سے محفوظ رہے۔

یہ ہم پر ثابت ہو گیا کہ ایک ایرانی معاشرہ جو تورخان میں وطن سے دور آباد تھا اور اس نے اپنی زبان اور خط کو محفوظ کیا ہوا تھا اور اس کے پاس علم طب کی کتاب بھی تھی اور اسی سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایران میں بھی طب کی کتابیں ہوں گی۔

عقل اس بات کو تسلیم نہیں کرتی کہ گندی شاہ پور جتنی وسعت کے حامل علاقہ میں تو علم طب پڑھایا جاتا ہو لیکن ایران میں علم طب کی کتابیں نہ پائی جاتی ہوں۔

جیسا کہ ہم نے کہا امام محمد باقرؑ کے حلقہ درس میں شاگرد اپنی تختیوں پر سبق لکھ لیتے اور اس کے بعد اسے کاغذ پر اتار لیتے تھے اسی طرح بعید نہیں ہے کہ گندی شاہ پور میں بھی جہاں ایک میڈیکل کالج اور ہسپتال بھی تھا اسی طرح کی تدریس ہوتی ہو لیکن جب آپریشنز کئے جاتے تھے تو طالب علم لکھنے سے زیادہ دیکھنے پر توجہ دیتے تھے۔

یہ بات سب کو معلوم ہے کہ یونانی حکماء کی کتابوں کا ایک حصہ ان کے شاگردوں نے لکھا وہ اس طرح کہ حکماء لیکچر دیتے اور شاگرد ان کے لیکچرز کو تختی پر لکھ لیتے اور بعد میں اسے کاغذ پر محفوظ کر لیتے تھے۔

شاید ساسانیوں کے دور میں بھی طبی کتابیں اسی طرح لکھی جاتی تھیں کیونکہ پرانے دانشمندوں میں جن لوگوں نے ایک یا کئی کتابیں لکھی ہیں بہت کم ہیں۔

شعراء اس لئے کہ ان کے اشعار مقبولیت عام کا درجہ حاصل کر لیتے تھے ان کا ذوق بڑھتا جاتا تھا اور وہ زیادہ سے زیادہ شعر کہتے تھے ان کے اشعار سے ایک دیوان تشکیل پاجاتا تھا لیکن دانشمند اور ان کے شاگرد جو ان کے حلقہ درس میں شریک ہوتے تھے ان میں کوئی ذوق و شوق نہیں پیدا ہوتا تھا' ان کی اقتصادی حالت بھی اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ اپنی عمر کے ایک حصے کو ایک یا کئی کتابیں لکھنے پر صرف کر دیں۔

دانشمندوں نے اس وقت اپنی عمر کے کچھ حصے کو کتابیں تصنیف کرنے پر صرف کیا جب ان میں دو طرح کے شوق پیدا ہوئے ایک علم میں توسیع اور نئے مدارس کو معرض وجود میں لانے کا شوق' .جس کی وجہ سے دانشمندوں نے پڑھانے پر توجہ دی اور ان کا حقیقی کام تدریس قرار پایا اور اسی تدریس کی وجہ سے ہی کسی ایک

دانشمند کو ایسی فرصت ملی کہ وہ کتابیں لکھنے کے لئے کچھ زیادہ وقت نکال سکے۔ جب کہ دوسرا شوق وہ تھا جو سلاطین اور امرا نے دانشمندوں میں پیدا کیا اور جس کے نتیجہ میں کتابیں لکھی جانے لگیں۔

بہر حال قدیم دانشمندوں کی کتب کا ایک حصہ ان کے شاگردوں کے وہ رشحات قلم ہیں جو انہوں نے اپنے لئے جمع کئے تھے اور ان کی موت کے بعد دوسرے لوگوں نے ان سے فائدہ اٹھایا۔

کتابیں لکھنے میں سلاطین اور امراء کی سرپرستی کافی موثر رہی ہے اور اگر ساسانی سلسلہ کا بانی اردشیر اور اس کا بیٹا شاہپور اول نہ ہوتا تو "اوستا" ہرگز ساسانیوں کے زمانے میں تدوین نہ ہوتی۔ تاریخ کہتی ہے کہ اوستا کو "تنثر" دانشمند اور ایرانی موجد نے جمع کیا ہے لیکن اگر اردشیر انہیں شوق نہ دلاتا اور ان کی مالی امداد نہ کرتا تو یہ کتاب جس کا شیرازہ اشکانیوں کے دور حکومت میں بکھر گیا اور اس کا کچھ حصہ مکمل طور پر ختم ہوگیا تھا ہرگز جمع نہ ہو سکتی۔ اسی طرح ھخامنشی سلسلے کا بادشاہ داریوش اول اگر اسی اوستا کو مغربی زبان سے پہلوی ھخامنشی میں ترجمہ کرنے کا شوق نہ دلاتا تو یہ کتاب ہرگز ترجمہ نہ ہو سکتی (اگر یہ روایت صحیح ہے کہ اوستا کا پہلا متن مغربی زبان میں تھا)۔

جو کچھ ہم نے کہا ہے اس کا لب لباب یہ ہے کہ اگر ایک ایرانی مہاجر معاشرہ "تورخان" جیسے دور افتادہ علاقے میں رہ کر اپنی زبان اور خط کی حفاظت نیز علم طب کی تدریس اسی زبان اور خط میں کر سکتا ہے تو پھر بعید از قیاس ہے کہ خود ایران میں علم طب کی کتابیں ناپید ہوں۔ اس زمانے میں ایران میں علم طب کی موجودگی پر شک وشبہ نہیں کیا جا سکتا بلکہ شک اس بارے میں ہو سکتا ہے کہ کیا طبی کتابیں ایران میں تھیں یا نہیں ؟ تو اس ضمن میں احتمال قوی یہ ہے کہ اس زمانے میں ایران میں طبی کتب موجود تھیں جو اب ناپید ہیں۔ ساسانی پہلوی دور کے متن جو اس وقت چھپے ہیں ان کی تعداد ایک سو پچاس کے قریب ہے ان میں بعض کتابیں اور کچھ کتابچے اور چند قطعات تو شامل ہیں البتہ علم طب کے بارے میں ان میں کچھ بھی نہیں ہے

علم طب کا کتب کی صورت میں وجود نہ پایا جانا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ایران میں سرے سے علمی کتابیں ہی نہیں تھیں تاکہ امام جعفر صادقؑ ان سے فائدہ اٹھاتے

پروفیسر ایڈورڈ براؤن (Edward Brown) ہندوستان کے چند پارسی دانشمندوں کے نظرئے کی بنیاد پر کہتا ہے کہ عربوں کے ایران پر تسلط کے کچھ عرصہ بعد تک ایرانیوں کی علمی کتب میں سے کچھ جن میں علم طب اور علم نباتیات (Botany) کی کتابیں شامل ہیں باقی تھیں اور ان سے استفادہ کیا جاتا تھا۔

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ ایران علاج معالجہ کے لحاظ سے نباتات کے مراکز میں سے ایک تھا اور طبی جڑی بوٹیوں کا ایک حصہ ایرانیوں نے دنیا کے لوگوں کو متعارف کرایا۔ اور اصولاً" وہاں ان جڑی بوٹیوں کے بارے میں کتابیں بھی موجود ہونا چاہیں۔ ہمارا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم کہیں کہ امام جعفر صادقؑ نے ایرانی کتابوں سے استفادہ کیا ہو گا تو یہ بات نہ تو عقل سے بعید ہے اور نہ ہی اس میں مبالغہ آرائی ہے۔

# نظریہ عناصر اربعہ پر تنقید جعفریہ

امام محمد باقرؑ کے حلقہ درس جو علوم پڑھائے جاتے تھے ان میں ایک علم فزکس بھی تھا۔ اگرچہ امام جعفر صادقؑ کے طبی علوم کے بارے میں ہمیں تفصیلاً" علم نہیں ہے لیکن اس کے عوض میں ان کے فزکس کے مبانی یعنی فزکس کے مضمون کے بارے میں ان کی معلومات سے نسل در نسل تفصیلاً" مطلع ہیں۔

امام محمد باقرؑ کے درس میں ارسطو کی فزکس پڑھائی جاتی تھی اور کسی پر یہ بات پوشیدہ نہیں کہ ارسطو کی فزکس چند علوم پر مشتمل تھی۔ آج کوئی بھی سائنسدان حیوانیات (Zoology)، نباتیات (Botany) اور جیالوجی (Geology) کو فزکس کا حصہ شمار نہیں کرتا کیونکہ ان میں سے ہر ایک علم ایک جداگانہ علم ہے لیکن ارسطو کی فزکس میں ان علوم پر بحث کی گئی ہے۔ اسی طرح جس طرح میکانیات (Mechanics) بھی ارسطو کی فزکس میں داخل ہے۔ اگر ہم فزکس کو علم الاشیاء سمجھیں تو ارسطو کو یہ حق دیا جانا چاہئے کہ مذکورہ موضوعات کو اپنی فزکس میں لائے کیونکہ یہ ساری بحث علم الاشیاء میں شامل ہے۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ ارسطو کی فزکس بھی اسی راستے امام محمد باقرؑ کے حلقہ درس تک پہنچی جس راستے جغرافیہ اور ہندسہ کے علوم ان کے درس میں شامل ہوئے یعنی مصری قبطیوں کے ذریعے امام محمد باقرؑ کے حلقہ درس میں شامل ہوئے۔

فرید وجدی دائرۃ المعارف جیسی مشہور عربی کتاب کا مولف لکھتا ہے کہ علم طب مکتب اسکندریہ کے ذریعے امام جعفر صادقؑ تک پہنچا لیکن یہ بات درست نہیں کیونکہ جس وقت امام جعفر صادقؑ تحصیل علم میں مشغول تھے اسکندریہ کا علمی مدرسہ موجود ہی نہیں تھا کہ علم طب وہاں سے آپ تک پہنچتا۔

اسکندریہ کا علمی مکتب اس کتاب خانہ سے مربوط تھا جو عربوں کے مصر پر قبضے کے بعد تباہ ہوگیا تھا۔ شاید وہ لوگ جنہوں نے اسکندریہ کے کتاب خانے کی کتابوں سے اپنے لئے نسخے تیار کئے ہوئے تھے ان کے پاس اس کتاب خانے کی کتابوں کے نسخے باقی تھے۔ لیکن اسکندریہ کا علمی مکتب کتاب خانے کے خاتمے کے ساتھ ہی ختم ہوگیا۔ لیکن وہ لوگ جنہوں نے اسکندریہ کے علمی مکتب میں پرورش پائی تھی انہوں نے اس مکتب کے نظریات کو خصوصاً" اس تھیوری کو جسے جدید افلاطونوں کا فلسفہ کہا جاتا ہے اسے اپنے شاگردوں یا مریدوں کو سکھایا اور ان کے بعد نسل در نسل ہم تک پہنچی۔

اس بات کا امکان ہے کہ وہ کتاب یا کتابیں جن کی نقول کتاب خانہ (اسکندریہ) کی کتابوں سے تیار کی گئی تھیں مصر سے امام جعفر صادقؑ تک پہنچی ہوں۔

شاید فرید وجدی کی اسکندریہ کے مکتب سے مراد وہ مرکزی کتاب خانہ اسکندریہ نہ ہو بلکہ اس کے کہنے کا مطلب یہ ہو کہ وہ کتاب یا کتابیں جو اسکندریہ کے مکتب کی یادگار شمار کی جاتی تھیں امام جعفر صادقؑ تک پہنچیں۔
المختصر امام جعفر صادقؑ اپنے والد گرامی کے حلقہ درس میں فزکس سے واقف ہوئے اور جس طرح علم جغرافیہ میں سورج کے زمین کے گرد چکر لگانے پر تنقید کی اسی طرح ارسطو کی فزکس کے کچھ حصوں پر بھی تنقید کی ہوگی۔ جبکہ اس وقت آپ کی عمر بارہ سال بھی نہیں تھی۔ ایک دن جب وہ اپنے والد گرامی کے حلقہ درس میں ارسطو کی فزکس پڑھنے کے دوران فزکس کے اس حصے تک پہنچے کہ دنیا چار عناصر پر مشتمل ہے یعنی خاک' پانی' ہوا اور آگ تو امام جعفر صادقؑ نے تنقید کرتے ہوئے کہا کہ ارسطو جیسے انسان نے اس پر غور کیوں نہیں کیا کہ خاک ایک عنصر نہیں ہے بلکہ اس خاک میں متعدد عناصر پائے جاتے ہیں اور زمین میں پائی جانے والی ہر دھات ایک علیحدہ عنصر شمار ہوتی ہے ؟

ارسطو کے زمانے سے امام جعفر صادقؑ کے زمانے تک تقریباً ہزار سال سے زائد کا عرصہ ہے اور اس طویل مدت میں جیسا کہ ارسطو نے کہا تھا کہ چار عناصر علم الاشیاء شمار ہوتے تھے اور کوئی ایسا شخص نہیں تھا جو اسے تسلیم نہ کرتا ہو۔ اسی لئے کسی نے اس کی مخالفت نہیں کی۔ مگر ہزار سال کے بعد ایک لڑکا پیدا ہوا جو ابھی بارہ سال کا نہیں ہوا تھا کہ اس نے کہا کہ یہ خاک ایک عنصر نہیں بلکہ کئی عناصر کا مجموعہ ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے یورپ کے اٹھارہویں صدی عیسوی کے علماء سے ہزار سال پہلے ہی یہ کہہ دیا تھا کہ ہوا ایک عنصر نہیں ہے بلکہ چند عناصر کا مجموعہ ہے۔ یاد رہے کہ اٹھارہویں صدی عیسوی کے سائنس دانوں نے ہوا کے اجزاء کو دریافت کرنے کے بعد انہیں علیحدہ علیحدہ کیا ہے۔

اگر کافی غور و خوض کے بعد سائنس دان یہ بات قبول کر لیتے ہیں کہ خاک ایک عنصر نہیں ہے بلکہ چند عناصر کا مجموعہ ہے پھر بھی ہوا کے ایک عنصر ہونے پر کسی کو اعتراض نہ ہوتا۔ ارسطو کے بعد قابل ترین فزکس دان بھی نہیں جانتے تھے کہ ہوا ایک عنصر نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اٹھارویں صدی عیسوی میں جو علمی لحاظ سے تابناک صدیوں میں سے ایک صدی شمار ہوتی ہے لاووازیہ کے فرانسیسی سائنس دانوں کے زمانے تک اگرچہ چند علماء ہوا کو ایک بڑا عنصر سمجھتے تھے مگر انہیں بھی یہ خیال نہیں آیا کہ ہوا چند عناصر کا مرکب ہے۔ مگر جب بعد میں لووازیہ نے آکسیجن کو ہوا میں شامل دوسری گیسوں سے علیحدہ کیا اور بتایا کہ آکسیجن سانس لینے اور جلانے میں کتنی موثر ہے' تب اس بات کو اکثر علماء نے قبول کیا کہ ہوا غیر مرکب یا عنصر نہیں ہے بلکہ چند گیسوں پر مشتمل ہے اور ۱۷۹۲ء میں سرلووازیہ اور سارگیوٹن کا سر تن سے جدا کر دیا گیا اور اور یہ بابائے جدید کیمیا اگر زندہ رہتا تو شاید مزید دریافتیں کرتا۔ لیکن افسوس کہ اسے دوسرے جہان بھیج دیا گیا۔
امام جعفر صادقؑ نے ایک ہزار ایک سو سال پہلے یہ جان لیا تھا کہ ہوا ایک عنصر نہیں۔ اگرچہ شیعوں کا

عقیدہ یہ ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے یہ اور دوسرے علمی حقائق، علم لدنی یعنی امامت کے ذریعے استنباط کر لئے تھے تاہم مورخ کہتا ہے کہ اگر یہ استنباط اور دوسرے علمی استنباط امام جعفر صادقؑ کے علم امامت کی وجہ سے تھے تو وہ مادے کے توانائی میں تبدیل ہونے کے اس قانون کو جسے آئن شٹائن نے اس صدی میں دریافت کیا تھا بھی بیان فرماتے کیونکہ ان کے پاس علم امامت تھا۔ وہ ہر چیز کو جانتے تھے اور کوئی بھی علمی قانون ان سے پوشیدہ نہیں لیکن علمی قوانین کا ایک حصہ چونکہ اٹھارویں، انیسویں اور بیسویں صدی میں دریافت ہوا ہے اور امام جعفر صادقؑ نے ان کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ اس لئے اس بات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے علم بشری کے ذریعے یہ معلوم کیا تھا کہ خاک و ہوا وسیع و عریض عناصر کا مجموعہ ہیں۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ ہوا میں چند ایسے اجزا ہوتے ہیں، جن کی موجودگی سانس لینے کے لئے اشد ضروری ہے۔ جب لاوازیہ نے آکسیجن کو ہوا میں شامل دوسری گیسوں سے جدا کیا اور بتایا کہ جو چیز جانداروں کے زندہ رہنے کے لئے ضروری ہے وہ آکسیجن ہے تو سائنس دانوں نے ہوا میں شامل دوسری گیسوں کو زندگی کے لئے بے فائدہ جانا اور یہ نظریہ امام صادقؑ کے نظریئے کے خلاف ہے جنہوں نے فرمایا تھا کہ ہوا کے تمام اجزاء سانس لینے کے لئے ضروری ہیں۔

لیکن انیسویں صدی کے نصف میں سائنس دانوں نے سانس لینے کے لحاظ سے آکسیجن کے بارے میں اپنے نظریئے کی تصحیح کی کیونکہ یہ تسلیم کر لیا کہ اگرچہ آکسیجن جانداروں کی زندگی کے لئے لازمی ہے اور ہوا کی دوسری تمام گیسوں کے درمیان تنہا گیس ہے جو خون کو بدن میں صاف کرتی ہے لیکن جاندار خالص آکسیجن میں زیادہ عرصہ کے لئے سانس نہیں لے سکتے کیونکہ ان کے نظام تنفس کے خلیات کی آکسیڈیشن شروع ہو جاتی ہے یعنی وہ آکسیجن کے ساتھ مل کر مرکب بنا دیتے ہیں اور سادہ لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ نظام تنفس کے خلیات جلنے لگتے ہیں۔

آکسیجن خود نہیں جلتی بلکہ جلنے میں مدد دیتی ہے اور ایسے جسم کے ساتھ جو جلنے کے قابل ہوتا ہے جب عمل کرتی ہے تو وہ جسم جلنے لگتا ہے اور جب کبھی انسان یا جانوروں کے پھیپھڑوں کے خلیات ایک مدت تک خالص آکسیجن میں سانس لیتے ہیں تو چونکہ گیسوں کا ان کے ساتھ Reaction ہوتا ہے اس لئے پھیپھڑوں کے خلیات جلنے لگتے ہیں اور کوئی انسان یا جانور جس کے پھیپھڑے جل جائیں مر جاتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ آکسیجن کے ہمراہ دوسری گیسیں بھی انسان یا جانوروں کے پھیپھڑوں میں داخل ہوں تاکہ جانداروں کے پھیپھڑے خالص آکسیجن میں سانس لینے کی وجہ سے جلنے نہ پائیں۔ جب علماء نے آکسیجن کے متعلق سانس لینے کے لحاظ سے اپنے نظریہ کی تصحیح کی تو پتہ چلا کہ امام جعفر صادقؑ کا نظریہ صحیح ہے اور تمام گیسیں جو ہوا میں بہت کم مقدار میں پائی جاتی ہیں سانس لینے میں مفید ہیں۔ مثال کے طور پر اوزون گیس (Ozone) کو لے لیں جس کی کیمیائی

خصوصیات آکسیجن کی مانند ہیں اور اس کا ہر مالیکول آکسیجن کے تین ایٹموں سے مل کر بنتا ہے۔ اگرچہ ظاہراً وہ عمل تنفس میں اتنی اہم نہیں لیکن جب آکسیجن خون سے ملتی ہے تو اسے اس دوران واپس باہر نہیں نکلنے دیتی۔ یہی وجہ ہے کہ امام جعفر صادقؑ کے نظریہ کی کہ "ہوا کے تمام اجزاء عمل تنفس کے لئے ضروری ہیں" انیسویں صدی کے وسط سے لے کر آج تک تائید کی جا رہی ہے۔

ہوا میں موجود گیسوں میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ آکسیجن کو تہہ میں نہیں بیٹھنے دیتیں۔ اگر اس طرح ہوتا تو آکسیجن سطح زمین سے ایک بلندی کی حد تک چھائی رہتی۔ اور دوسری گیسیں جو ہوا میں پائی جاتی ہیں آکسیجن سے اوپر ہوتیں جس کے نتیجہ میں تمام جانوروں کا نظام تنفس جل کر راکھ ہوجاتا اور جانداروں کی نسل نابود ہوجاتی۔ دوسرے یہ کہ پودے پیدا نہ ہوتے' کیونکہ پودے کے زندہ رہنے کے لئے اگرچہ دوسرے جانداروں کی مانند آکسیجن ضروری ہوتی ہے لیکن اسے کاربن ڈائی آکسائیڈ کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور اگر آکسیجن کچھ بلندی تک زمین کو ڈھک لیتی تو اس کاربن کی سطح کی زمین تک رسائی نہ ہوسکتی جس کی وجہ سے حیوانی اور جماداتی زندگی باقی نہ رہتی۔

امام جعفر صادقؑ وہ پہلے انسان ہیں جنہوں نے عناصر اربعہ کے اس عقیدے کو جو ایک ہزار سال کی مدت تک غیر متزلزل سمجھا جاتا تھا قابل اصلاح قرار دیا وہ بھی اس وقت جب وہ نوجوان تھے' بلکہ لڑکے شمار ہوتے تھے۔ لیکن ہوا کے بارے میں نظریئے کو وہ اس وقت زبان پر لائے جب وہ بالغ ہوچکے تھے اور انہوں نے درس پڑھانا شروع کردیا تھا۔

آج ہمیں یہ عام سا موضوع لگتا ہے کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ ہماری آج کی دنیا میں دو سو کے قریب عناصر دریافت ہوچکے ہیں۔ لیکن ساتویں صدی عیسوی اور پہلی صدی ہجری میں یہ ایک بڑا انقلابی نظریہ تھا اور اس زمانے میں انسانی عقل اس بات کو قبول نہیں کرسکتی تھی کہ ہوا ایک وسیع عنصر نہیں ہے۔ یہاں ہم ایک بار پھر یہ کہنا چاہیں گے کہ اس زمانے میں اور اس کے بعد کے زمانوں میں اٹھارویں صدی عیسوی تک اس علمی و انقلابی عقیدے کے علاوہ تمام باتیں جو امام جعفر صادقؑ نے بیان فرمائی تھیں اور جن کا ذکر آگے آئے گا انہیں اہل یورپ میں برداشت کرنے کی گنجائش نہ تھی۔

لیکن مشرقی ممالک میں حتیٰ کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شہر مدینہ میں بھی اس طرح کے علمی نظریات کو زبان پر لایا جاسکتا تھا۔ کیونکہ وہاں اس پر کوئی کفر کا فتویٰ نہیں لگاتا تھا۔ اگر دین اسلام میں کوئی یہ کہتا کہ ہوا وسیع نہیں ہے تو اسے کافر قرار نہیں دیتے تھے۔ لیکن بعض قدیم ادیان میں ایسا کہنا' کہنے والے کے کفر کی دلیل شمار ہوتی تھی۔ کیونکہ ان ادیان کے پیروکار ہوا کی طہارت کا عقیدہ رکھتے تھے اور اس طہارت کو ہوا کے وسیع ہونے کی وجہ سے سمجھتے تھے۔ جس طرح پانی کا مطہر ہونا بھی ان مذاہب کے پیروکاروں کی نظر میں اس کے

وسیع ہونے کی بناء پر ہے۔

جب ہم کیمیا کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ لکھا ہوا پاتے ہیں کہ ایک انگریز جوزف پرسلے نے جو ۱۷۳۳ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۰۴ء میں فوت ہوا' آکسیجن گیس دریافت کی۔ لیکن وہ اس کی خصوصیات کو نہ پہچان سکا۔ جس نے اس گیس کے خواص کو پہچانا وہ لاووازیہ تھا۔ علم کیمیا کی تاریخ میں اس طرح بتایا گیا ہے کہ آکسیجن کا نام بھی پرسلے نے رکھا تھا جبکہ آکسیجن کا مفہوم پرسلے سے پہلے موجود تھا۔ آکسیجن یونانی کلمہ ہے جو دو اجزا سے مل کر بنایا گیا ہے۔ دوسرے جزو کے معنی پیدا کرنے والا اور پہلے جزو کے معنی ترشی کے ہیں۔ اس لئے آکسیجن کو ترشی پیدا کرنے والی گیس کہتے ہیں۔ آکسیجن کا نام شاید انگریز پرسلے نے رکھا ہوگا (مگر ہمیں یقین نہیں ہے کہ واقعاً" اسی نے یہ نام رکھا ہے) لیکن "ترشی پیدا کرنے والا مفہوم" پہلے سے موجود تھا۔ ہمیں پرسلے کی خدمات سے سرمو انحراف نہیں ہے اور ہماری اس سے مراد یہ نہیں کہ پرسلے کو حقیر بنا کر پیش کریں یا اس پادری کو جس نے مذہبی لباس اتار کر لیبارٹری میں کام کیا اور آکسیجن کو دریافت کیا۔ اس کے باوجود کہ وہ ایک قابل ترین انسان تھا اس نے کبھی اپنی دریافت پر فخر نہیں کیا۔ اگر وہ سیاست میں حصہ نہ لیتا تو وہ آکسیجن کے بارے میں اپنی تحقیق کو جاری رکھ سکتا تھا۔ پھر اسے سمجھ آتی کہ اس نے کتنی بڑی دریافت کی ہے' لیکن سیاست نے اسے لیبارٹری سے دور کردیا' وہ انگلستان میں فرانسیسی انقلابیوں کی حمایت میں اٹھ کھڑا ہوا اور لوگ اس سے اس قدر نفرت کرنے لگے کہ اس کا اپنے ملک میں جینا دوبھر ہوگیا۔ مجبوراً" اس نے امریکہ ہجرت کی اور وہاں قیام کے دوران آکسیجن کے علاوہ کئی دوسرے موضوعات پر چند کتابیں لکھیں۔ وہ انسان جس نے سب سے پہلے ترشی پیدا کرنے والی آکسیجن کو پہچانا وہ امام جعفر صادقؑ تھے۔ ہم ہرگز یہ بات نہیں کہتے کہ انہوں نے والد گرامی کے حلقہ درس میں اس موضوع کو سمجھا ہوگا کیونکہ ہم بتا چکے ہیں کہ انہوں نے جب پڑھانا شروع کیا تھا کہ ہوا ایک وسیع عنصر نہیں ہے اور اس امر کا قوی احتمال ہے کہ اسی موقع پر انہوں نے یہ نتیجہ بھی اخذ کرلیا ہو کہ آکسیجن ترشی پیدا کرنے والی گیس ہے تاکہ اس کی مماثل چیز پیدا نہ ہو۔ ہمارا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگرچہ ترشی پیدا کرنے والی گیس کا نام امام جعفر صادقؑ کے منہ سے نہیں نکلا لیکن انہوں نے اپنے حلقہ درس میں فرمایا کہ ہوا چند اجزاء پر مشتمل ہے اور ہوا کے اجزاء میں سے یہی وہ جزو ہے جو جلنے والی چیزوں کے جلنے میں مدد دیتا ہے۔ یہ نہ ہو تو وہ ہرگز نہ جلیں۔ امام جعفر صادقؑ نے اس موضوع کی مزید وضاحت کرتے ہوئے اپنے درس میں فرمایا تھا کہ "ہوا کا وہ جزو جو اجسام کے جلنے میں مدد دیتا ہے اگر ہوا سے جدا ہوجائے اور خالص حالت میں ہاتھ آئے تو وہ اجسام کو جلانے میں اتنا زبردست ہے کہ اس سے لوہا بھی جلایا جا سکتا ہے۔ اس بنا پر یہ کہنا بجا ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے پرسلے اور لاووازیہ سے ہزار سال پہلے ہی آکسیجن کی تعریف کردی تھی مگر صرف اس کا نام آکسیجن یا مولد الحموضہ (ترشی پیدا کرنے والی) نہیں رکھا تھا۔ پرسلے نے جب آکسیجن دریافت کی تو اس کی

سمجھ میں نہ آیا کہ لوہے کو کیسے جلایا جائے جبکہ لادوازیہ جس نے آکسیجن کے کچھ خواص لیبارٹری میں جان لئے تھے، وہ بھی یہ نہ سمجھ سکا کہ وہ گیس لوہے کو جلانے والی ہے یا نہیں، لیکن امام جعفر صادقؑ ہزار سال پہلے ہی اس بات سے آگاہ تھے۔

آج ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اگر لوہے کے ایک ٹکڑے کو اتنا گرم کیا جائے کہ وہ سرخ ہوجائے اور پھر اسے خالص آکسیجن میں ڈبو دیں تو وہ روشن شعلے کے ساتھ جلنے لگتا ہے بالکل اسی طرح جیسے گھی یا تیل کے چراغوں میں ان کے فتیلے کو گھی یا تیل میں بھگو دیتے تھے اور اس کی روشنی میں ساری رات بسر کرتے تھے، ایک ایسا چراغ بھی بنایا جا سکتا ہے جس کا فتیلہ لوہے کا ہو اور وہ مائع آکسیجن میں ڈبو دیا جائے۔ اگر فتیلے کو اس طرح جلائیں کہ سرخ ہوجائے تو وہ نہایت چمکدار روشنی کے ساتھ رات کو روشن رکھے گا۔

روایت ہے کہ ایک دن امام جعفر صادقؑ کے والد گرامی امام محمد باقرؑ نے اپنے درس میں کہا کہ پانی جو آگ بجھا دیتا ہے علم کے ذریعے اس سے آگ بھی جلائی جا سکتی ہے۔ اگرچہ اس بات سے کوئی شاعرانہ تعبیر نہیں لی گئی مگر یہ بات اس وقت بے معنی نظر آئی تھی اور ایک عرصہ تک جن لوگوں نے بھی یہ روایت سنی انہوں نے سمجھا کہ امام محمد باقرؑ کوئی شاعرانہ تعبیر زبان پر لائے تھے۔ لیکن اٹھارویں صدی کے بعد یہ ثابت ہوگیا کہ علم کی مدد سے پانی سے بھی آگ جلائی جا سکتی ہے اور وہ بھی ایک ایسی آگ جو کوئلے یا لکڑی کی آگ سے زیادہ گرم ہو۔ کیونکہ ہائیڈروجن جس کے پانی میں دو حصے ہوتے ہیں آکسیجن کے ساتھ ۲۶۶۳ ڈگری تک پہنچتی ہے اور آکسیجن کے ذریعے ہائیڈروجن کے جلنے کے عمل کو آکسیڈروجن کہتے ہیں اور یہ صنعتوں میں دھاتوں کو پگھلانے یا دھاتوں کے ٹکڑوں میں سوراخ کرنے کے کام آتی ہے۔

ہمیں یہ تو معلوم ہے کہ امام محمد باقرؑ نے فرمایا تھا کہ علم کی مدد سے پانی سے آگ جلائی جا سکتی ہے لیکن ہم یہ نہیں جانتے کہ انہوں نے ہائیڈروجن کو دریافت کیا تھا یا نہیں ؟ علاوہ ازیں ہمارے پاس اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے کہ ان کے بیٹے امام جعفر صادقؑ نے خالصتاً" ہائیڈروجن کو دریافت کیا تھا۔ اسی طرح ہمارے پاس کوئی ایسا دستاویزی ثبوت بھی نہیں جس کی بناء پر ہم یہ کہہ سکیں کہ امام جعفر صادقؑ نے آکسیجن کو دریافت کیا تھا۔

مگر اس کے ساتھ ساتھ بغیر کسی شک و تردد کے ہم کہہ سکتے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ نے آکسیجن کو خالصتاً" دریافت کیا اور ہمارے پاس اس کی دلیل ان کے کیمیائی کارنامے ہیں۔

امام جعفر صادقؑ کے کیمیائی کارناموں کا کچھ حصہ آکسیجن کی مدد سے انجام پایا ہے اور اس عنصر کی مداخلت کے بغیر امام جعفر صادقؑ ان کارناموں کو انجام نہیں دے سکتے تھے لہٰذا انہوں نے آکسیجن کو دریافت کیا لیکن خالصتاً" نہیں بلکہ دوسرے عناصر کے مرکبات کی شکل میں ملی ہوئی۔ یہاں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ انہوں نے

کوئی تھیوری پیش نہیں کی۔ انہوں نے جو نتائج حاصل کئےان سے دو فارمولے بنائے۔ پہلا یہ کہ ہوا کا ایک جزو ایسا ہے جو دوسرے اجزا کی نسبت زیادہ اہمیت کا حامل ہے اور یہی جزو زندگی کے لئے نہایت اہم ہے۔ دوسرا یہی وہ جزو ہے جس کی وجہ سے وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ چیزوں کی شکل میں تبدیلی آتی ہے یا وہ باسی ہوجاتی ہیں۔ یہ بات ہمیں ہمیشہ یاد رکھنی چاہئے کیونکہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے آکسیجن کو دریافت کرکے کتنی باریک بینی کا ثبوت دیا۔

جس کے بعد فرانسیسی لاوواز یہ نے پرسلے انگریز کے بعد آکسیجن کے بارے میں تحقیق کی اور اس کے تحقیق کام کا کھوج لگایا۔ سائنس دان اس بات کے قائل ہوگئے کہ اجسام میں تبدیلی جو وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ آتی ہے آکسیجن کی وجہ سے آتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک فرانسیسی "پاستور" نے جب خلیہ دریافت کیا تو اس نے کہا کہ بعض چیزوں کا باسی ہوجانا آکسیجن کی وجہ سے نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے جراثیموں کی وجہ سے ہے (مثلاً غذا وغیرہ جو وقت کے ساتھ ساتھ باسی ہوجاتی ہے) اور یہ چھوٹے چھوٹے جراثیم مردہ جانداروں کے جسم اور غذا پر حملہ کرکے اسے باسی کردیتے ہیں۔

لیکن پاستور کو غور کرنا چاہئے تھا کہ جو چیز ان جراثیموں کو زندہ رکھنے کا سبب ہے وہ آکسیجن ہے کیونکہ آکسیجن کے بغیر ان کی زندگی ناممکن ہے۔ لہٰذا جیسا کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ آکسیجن اشیاء میں تبدیلی لانے کا موثر ذریعہ ہے بلکہ بعض اوقات دھاتوں سے براہ راست مل کر ایک مرکب وجود میں لاتی ہے اور اس عمل کو کیمیا کی اصطلاح میں آکسیڈیشن (Oxidation) کہتے ہیں۔ اتنا گہرا اظہار نظر امام جعفر صادقؑ کی طرف سے بغیر عملی تجربات کے ناممکن تھا۔ اگرچہ امام جعفر صادقؑ کا زمانہ ایسا تھا کہ وہ آکسیجن کی پہچان پر مزید تحقیق نہیں کرسکے لیکن انہوں نے اندازہ لگالیا تھا کہ ہوا کا وہ جزو جو زندہ رہنے کے لئے اشد ضروری ہے اور چیزوں کی اصلی حالت میں تبدیلی لاتا ہے وہ بھاری بھی ہے۔ انسان کو ابھی مزید ایک ہزار سال لاوواز یہ کے دنیا میں آنے تک صبر کرنا تھا جس نے کہا کہ وزن کے لحاظ سے ہر ۹ کلوگرام پانی میں آٹھ کلوگرام آکسیجن ہوتی ہے۔ لیکن حجم کے لحاظ سے ہائیڈروجن، آکسیجن کی نسبت دوگنا زیادہ ہوتی ہے۔ گو لاوواز یہ آکسیجن کو پہچاننے میں اس قدر آگے نکل گیا تھا کہ اس نے آکسیجن کو مائع میں تبدیل کرنے کے بارے میں تحقیق شروع کردی مگر وہ اسے مائع میں تبدیل نہ کرسکا کیونکہ دو چیزیں اس کے آڑے آگئی تھیں۔

پہلی یہ کہ اس کے دور میں جو اٹھارویں صدی عیسوی کا آخری دور تھا صنعت اور ٹیکنالوجی نے اس قدر ترقی نہیں کی تھی کہ وہ محقق انسان اپنے مقصد کو حاصل کرسکے۔ دوسری یہ کہ اس سے پہلے کہ وہ مزید تحقیق کرتا اسے ماردیا گیا۔

اس کے بعد ایک عرصہ تک سائنس دان کہتے رہے کہ آکسیجن کو مائع میں تبدیل نہیں کیا جاسکتا حتیٰ کہ

ٹیکنالوجی نے اتنی ترقی کرلی کہ وہ چیزوں کو کافی حد تک سرد کرنے میں کامیاب ہوگئی لیکن انیسویں صدی عیسوی تک وہ آکسیجن کو صنعتی استعمال کے لئے بڑے پیمانے پر مائع حالت میں تیار نہیں کرسکے۔

بیسویں صدی عیسوی میں زیادہ سرد درجہ وجود میں لانے کی ٹیکنیک انیسویں صدی کی نسبت زیادہ کامیاب ہوئی اور صفر سے نیچے ۱۸۳ درجہ تک آکسیجن کو (بغیر زیادہ دباؤ کے نہایت ہی کم دباؤ کے ذریعے) ٹھنڈا کرنے میں کامیابی حاصل کرلی گئی۔

آج آکسیجن کو صنعتی پیمانے پر تیار کیا اور استعمال میں لایا جا رہا ہے۔ ۱۸۳ درجہ صفر سے نیچے کی سردی کو کم سرد نہیں سمجھنا چاہئے کیونکہ صرف ۹۰ درجے کا یہ مطلق صفر درجے سے کافی فاصلہ ہے اور یہ مطلق صفر درجہ ۲۷۳ء۱۶ (منفی دوسو بہتر اعشاریہ ایک چھ درجے) سے نیچے کا درجہ ہے اور اتنے کم درجہ حرارت پر سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ مادے کی اندرونی حرکت ساکن ہوجاتی ہے۔

امام جعفر صادقؑ کا زمانہ سائنسی نقطہ نگاہ سے ایسا زمانہ نہ تھا کہ امام جعفر صادقؑ سائنس کے بارے میں مزید پیشرفت کرتے لیکن جہاں تک آکسیجن کی پہچان کا تعلق ہے وہ اس لحاظ سے سب سائنسدانوں پر سبقت لے گئے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ فزکس کے اس حصے میں وہ اپنے معاصروں سے ہزار سال آگے تھے۔ بعض روایات میں ملتا ہے کہ امام جعفر صادقؑ کے شاگردوں نے ان کے بعد کہا کہ ہوا یا آکسیجن کو مائع میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جو کچھ امام جعفر صادقؑ کے شاگردوں نے کہا وہ ایک عام نظریہ ہے۔ قدیم زمانوں سے حتیٰ کہ ارسطو سے بھی پہلے یہ معلوم کرلیا گیا تھا کہ بخارات کو مائع میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن وہ گیسوں کو مائع میں تبدیل کرنے کا وسیلہ نہ رکھتے تھے۔ یہ ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ قدیم زمانے سے ہی آج کے علوم کا کچھ حصہ تھیوری (Theory) کی شکل میں پیش کیا جا چکا تھا۔ کمی صرف اس بات کی تھی کہ اس زمانے میں وسائل موجود نہیں تھے جس کی وجہ سے ان تھیوریز کو عملی جامہ پہنانا مشکل تھا۔ یونانی دِھوکریت نے حضرت عیسیٰؑ کی ولادت سے پانچ سو سال پہلے ایٹمی نظریئے (Atomic Theory) کو جس طرح آج ہمارے پاس موجود ہے اسی طرح پیش کیا اور کہا کہ مادہ ایٹموں سے مل کر بنتا ہے اور ہر ایٹم کے اندر تیز حرکات پائی جاتی ہیں۔ اگر ہم الیکٹرون، پروٹون، نیوٹرون اور ایٹم کے دوسرے تمام حصوں کے ناموں کو درمیان میں نہ لائیں، کیونکہ ان کا تعلق انیسویں صدی عیسوی سے ہے تو ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ دِھوکریت کی ایٹمی تھیوری اور موجودہ ایٹمی تھیوری میں ذرہ برابر فرق نہیں ہے۔

البتہ بنی نوع انسان نے اس ایٹمی توانائی سے کافی دیر بعد فائدہ اٹھایا اور اگر دوسری جنگ عظیم پیش نہ آتی اور جرمن سائنس دان ایٹمی توانائی سے فائدہ اٹھانے کے بارے میں غور و فکر نہ کرتے اور امریکہ جرمنی کے

ترقی کر جانے کے خوف سے ایٹمی توانائی سے فائدہ نہ اٹھاتا تو شاید اس صدی کے آخر تک بھی ایٹمی توانائی بروئے کار نہ لائی جاتی۔

اگرچہ امام جعفر صادقؑ کے شاگردوں نے ہوا یا آکسیجن کو مائع میں تبدیل کرنے کے امکانات کے بارے میں جو کچھ کہا وہ پہلے سے موجود تھا۔ لیکن خود امام جعفر صادقؑ نے جو کچھ آکسیجن کے متعلق کہا ہے وہ تھیوری کی حدود سے تجاوز کرتا ہے اور اسی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ آکسیجن کی پہچان کے بارے میں عملی مرحلہ میں داخل ہو چکے تھے۔

## امام جعفر صادقؑ بانی مکتب عرفان

کچھ مسلمان عرفاء اور مورخین کا کہنا ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے اپنے والدگرامی امام محمد باقرؑ کے حلقہ درس میں عرفان کی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔

"تذکرۃ الاولیاء" کا مصنف شیخ فرید الدین عطار اسی گروہ کے لوگوں میں سے ہے جبکہ پہلی صدی ہجری میں عرفان کا وجود ہی نہ تھا۔ اور اگر تھا بھی تو اس نے مکتب کی شکل اختیار نہیں کی تھی۔ اگرچہ ممکن ہے کہ عرفانی نظریات اس زمانے میں موجود ہوں اور بعض اسلامی مفکرین نے انہیں زبانی کلامی بیان بھی کیا ہو' تاہم یہ مسلمہ امر ہے کہ پہلی صدی ہجری میں کوئی ایسا عرفانی مکتب (School of thought) موجود نہ تھا جس میں خاص طور پر عرفان کی اقسام پر بحث کی جائے اور ایک پیر یا مرشد یا غوث ایسا پایا جاتا ہو جو اپنے مریدوں کو اردگرد جمع کرے اور انہیں عرفان کی تعلیم دے۔ دوسرا یہ کہ عرفان افکار کی تجلی کی ایک قسم ہے جس میں کلاس کی مانند نہیں پڑھا جاتا۔ اور مرشد یا قطب اپنے مریدوں کو درس نہیں دیتا بلکہ ان سے عمل چاہتا ہے اور کہتے ہیں کہ درس عشق کو قلم' کاغذ اور نوٹ بک کے ذریعے نہیں سیکھا جاسکتا۔

بشوئی اوراق اگر ہم درس مائی۔ کہ درس عشق در دفتر نباشد

عرفان دوسری صدی میں وجود میں آیا تھا۔ اسی زمانے میں وہ مکتب کی صورت اختیار کر گیا۔ حالانکہ اس سے قبل مکتب نہ تھا۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے اگرچہ تذکرۃ الاولیاء چند مشہور کتابوں میں سے ایک ہے اور بعض فضلاء کے نزدیک اسلامی دنیا کی معتبر کتابوں میں شمار ہوتی ہے لیکن اس کتاب میں بعض ایسی باتیں بیان کی گئی ہیں جن کے غلط ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ مثلاً" یہ بات کہ بایزید بسطامی جو ایک مشہور عارف ہو گزرا ہے اس نے امام جعفر صادقؑ کے حضور میں زانوئے ادب تہہ کیا تھا یعنی وہ ان کا شاگرد رہا تھا اور اس نے امام جعفر صادقؑ سے ہی عرفان بھی سیکھا تھا۔ تذکرۃ الاولیاء کے مطابق جب وہ دیگر علوم کی تحصیل کے بعد عرفان کی دولت

سے مالامال ہوگیا تو اس نے عارف کامل بننے کے لئے ضروری سمجھا کہ دنیا کے بڑے عرفاء کی خدمت میں پہنچے۔ لہٰذا وہ بسطام سے نکل پڑا اور تیس سال تک بھوک برداشت کرنے اور دوسری تکالیف اٹھانے کے بعد دنیا کے بڑے عرفاء کی خدمت میں حاضر ہوا۔

اس دوران اس نے ایک سو تیرہ عرفاء کا قرب حاصل کیا جن میں سب سے آخری امام جعفر صادقؑ تھے۔ بایزید بسطامی ہر روز امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور ان کی تمام باتوں خصوصاً" ان کے نصائح کو پوری دلجمعی کے ساتھ سنتا۔ ایک دن امام جعفر صادقؑ نے اسے کہا۔ "اے بایزید' وہ کتاب جو تمہارے سر کے اوپر طاق میں ہے مجھے لاکر دو" ۔ بایزید نے کہا۔ آپ کس طاق کے بارے میں فرماتے ہیں ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔ ایک زمانہ ہوگیا ہے کہ تم یہاں آئے ہو اور ابھی تک تم نے طاق نہیں دیکھا ؟ بایزید نے کہا۔ میں نے آپ کے علاوہ یہاں کسی کو نہیں دیکھا کیونکہ صرف آپ کو دیکھنے کے لئے آتا ہوں۔ امام جعفر صادقؑ نے یہ بات سن کر فرمایا۔ اے بایزید ! تمہاری تعلیم کا عرصہ پورا ہوگیا ہے اور اب تم بسطام واپس جا سکتے ہو۔ وہاں جاکر لوگوں کو تعلیم دو۔ بایزید اپنی جگہ سے اٹھا اور واپس بسطام پہنچ کر لوگوں کو وعظ و نصیحت کرنے میں مشغول ہوگیا۔ شاید تذکرۃ الاولیاء کے مصنف نے اس روایت کو درست سمجھ کر لکھا ہے لیکن بائیوکرونولوجی (Biochronology) یعنی واقعہ کا تاریخ کے لحاظ سے درست ہونے کے اصول کی رو سے یہ روایت صحیح نہیں ہے اور اگر تذکرۃ الاولیاء کے مصنف نے اسے خود نہیں گھڑا تو یقیناً" کسی ایسے مصنف کی جعلی روایت ہے جس نے اسے بغیر تحقیق کے نقل کیا ہے' کیونکہ امام جعفر صادقؑ دوسری صدی ہجری کے پہلے نصف میں پڑھاتے تھے اور ان کی تاریخ وفات بھی ۱۴۸ھ ہے جبکہ بایزید بسطامی تیسری صدی ہجری میں گزرے ہیں اور ان کی تاریخ وفات ۲۶۱ھ لکھی گئی ہے۔ بایزید بسطامی کی تاریخ وفات کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ تیسری صدی ہجری میں ہو گزرے ہوں اور اسی وجہ سے وہ امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوسکتے تھے لیکن عرفانی تعلیمات کی امام جعفر صادقؑ کے دروس میں موجودگی سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا۔

امام جعفر صادقؑ کے دروس میں عرفان کے وجود سے ان کی روحانی شخصیت ہمارے لئے پرکشش بن جاتی ہے جو ہمیں بتاتی ہے کہ ذوق کے لحاظ سے آپ گوناگوں تجلیات کے مالک تھے۔ وہ عرفان جس کی دوسری صدی ہجری میں مشرق سے ابتداء ہوئی اور جو اب تک موجود ہے وہ ایک ایسی چیز ہے جو تخیل فکر اور اپنے آپ میں گم ہونے کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔

اگرچہ عرفان کے اثرات عارف پر اثرانداز ہوتے ہیں اور اسے خوش اخلاق و مہربان بنا دیتے ہیں لیکن خود عرفان ایک ایسا روحانی خلیہ ہے جس کا مادی اور سائنسی علوم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایسی صورت میں جبکہ امام جعفر صادقؑ ایک سائنسدان تھے اور مسلمانوں میں پہلے انسان تھے جنہوں نے تھیوری کو عملی صورت دی اور کسی

بھی فزکس اور کیمیا کے نظریہ کو جب تک پرکھ نہ لیا' قبول نہیں کیا۔ اس طرح انہوں نے Test کے ذریعہ کسی بھی نظریہ کے درست ہونے پر یقین کیا۔ آج کے فزکس دان یا کیمیادان جن میں سے ایک امام جعفر صادقؑ بھی تھے' کو عرفان سے کوئی دلچسپی نہ ہونا چاہئے تھے کیونکہ فزکس اور کیمیا کے تجربات کے ذریعے اسے نہیں سمجھایا جاسکتا بلکہ عرفان اپنے نفس کو کنٹرول کرنے کی بڑی مشق کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ امام جعفر صادقؑ جو مسلمانوں میں پہلے فزکس دان اور کیمیا دان تھے اصولاً" انہیں عرفان سے رغبت نہیں ہونا چاہئے تھی۔ لیکن وہ اس قدر عرفان سے دلچسپی رکھتے تھے کہ زمخشری جو ایک مشہور عالم تھا اس نے اپنی کتاب "ربیع الابرار" میں امام جعفر صادقؑ کے علمی درجے کی غیر معمولی توصیف کرنے کے بعد آپ کو عرفان میں حد کمال تک لکھا ہے۔

تذکرۃ الاولیاء کا مصنف "عطار" جو خود مشہور عارف ہے امام جعفر صادقؑ کو عرفان کی ابتدا کرنے والوں میں سے قرار دیتا ہے۔ اگرچہ "تذکرۃ الاولیاء" کی بعض روایات تاریخی لحاظ سے مرتب نہیں تاہم کتاب کا مصنف تصنیف کے جذبے سے سرشار اور عرفاء کا عاشق تھا۔ لہٰذا اس نے بعض کے بارے میں نادانستہ طور پر مبالغے سے کام لیا ہے۔ حالانکہ اگر وہ غور کرتا تو ہرگز مبالغے سے کام نہ لیتا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مبالغے سے کلام کی وقعت کم ہوجاتی ہے اور اگر تاریخ میں مبالغے سے کام لیا جائے تو اسے تاریخ نہیں کہا جائے گا۔ جو قلم زمخشری کے ہاتھ میں تھا ہم اسے ایک مورخ کا قلم کہہ سکتے ہیں اور جو قلم تذکرۃ الاولیاء کے مصنف کے ہاتھ میں تھا اسے ہم صرف ایک عاشق کا قلم شمار کرسکتے ہیں۔

بہرحال اسلامی عرفاء اور مورخین میں سے بعض کا عقیدہ ہے کہ امام جعفر صادقؑ اسلامی دنیا کے پہلے عارف یا پہلے عرفاء میں سے ایک ہیں۔ اگر ایسا ہے تو کیا امام جعفر صادقؑ جیسا عارف ایسے طلباء کو جو مسلمان نہ تھے اپنے درس میں بیٹھنے اور درس حاصل کرنے کی اجازت دے سکتا ہے ؟ کیونکہ چند کتابیں اس بات کی گواہ ہیں کہ کچھ ایسے طلباء بھی امام جعفر صادقؑ کے درس میں شریک ہوتے تھے جو صابئ تھے (۱۷)۔ صابئین ایک ایسی قوم تھے جن کا مذہب یہودی اور عیسائی مذہب کی درمیانی صورت تھی' کچھ توحید پرست شمار ہوتے تھے اور کچھ صابئین مشرک بھی تھے۔ جب اسلام پھیلا تو وہ گروہ جو مشرک تھا اپنے آپ کو توحید پرست کہلانے لگا تاکہ مسلمانوں کے ہمراہ زندگی گزار سکے کیونکہ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے مسلمان ان فرقوں کے لوگوں کو جو توحید پرست ہوتے تھے اہل کتاب کہتے تھے۔ ان کو کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچاتے تھے۔ صابئین کی سکونت حران میں تھی جو جنوبی بین النہرین کے مغرب میں واقع ہے۔ قدیم یورپی تاریخ میں جس کا نام "کارہ" ہے صابئین کا وہ گروہ جو موحد تھا ان کے ہاں رواج تھا کہ بچے کو پیدائش کے بعد اسے غسل دیتے اور پھر اس کا نام رکھتے تھے۔ ان کی اصطلاح میں اس عمل کو عمید کہا جاتا ہے۔

بعض یورپی محقق جن کا نظریہ دائرۃ المعارف الاسلامی کتاب میں منعکس (۱۸) ہوا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ

صابی' صبع سے مشتق ہے (یعنی صاد' باء' عین) جس کے معنی پانی میں غوطہ لگانا یا غسل کرنا ہے۔ کیونکہ صابی پادری کے پیروکار' نومولود کو عمید کے دوران پانی میں غوطہ دیتے تھے اس لئے وہ صابی کہلانے لگے۔ زمانے کے ساتھ ساتھ لفظ صابی سے عین گرگیا اور اس کی موجودہ شکل بن گئی۔

وہی یورپی محققین کہتے ہیں کہ صابئین' یحیٰؑ کو جو معمد (یعنی غسل دینے والا) کے نام سے مشہور ہے اپنا پیغمبر جانتے ہیں۔

تذکرۃ الاولیاء کا مصنف (۱۹) کہتا ہے کہ تمام فرقے امام جعفر صادقؑ کے درس میں حاضر ہوتے تھے۔

شیخ ابوالحسن خرقانی (۲۰) کہتا ہے کہ مسلمان اور کافر امام جعفر صادقؑ کے درس میں حاضر ہوکر ان کے علم و فضل کے دسترخوان سے بہرہ مند ہوتے تھے۔

ہمیں نہیں معلوم کہ کس طرح امام جعفر صادقؑ جیسے عارف انسان غیر مسلم طلباء کو اپنے درس میں حاضر ہونے کی اجازت دے سکتے تھے۔ چونکہ وہ ایک وسیع النظر انسان تھے اور علم کو سب کے لئے چاہتے تھے اس لئے ممکن ہے کہ انہوں نے اس امر کی اجازت دے دی ہو کہ جو کوئی بھی علم دوست ہو ان کے حلقہ درس میں حاضر ہوسکتا تھا اگرچہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو اور یہ بات قابل قبول بھی ہے۔ امام جعفر صادقؑ کے شاگردوں میں سے بعض ایسے بھی تھے جو صابئ تھے اور بعض یورپی محققین جن کے نظریات دائرۃ المعارف الاسلامی میں ثبت ہیں' نے لکھا ہے کہ جابر بن حیان جو امام جعفر صادقؑ کے مشہور شاگردوں میں سے ایک تھا وہ صابئ قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ صابئ طلباء جو امام جعفر صادقؑ کے حلقہ درس میں حاضر ہوتے تھے نہایت ذی فہم ہوتے تھے اور تحصیل علم کے لئے کافی تکالیف اٹھاتے تھے۔ انہوں نے علمی میدان میں خاصی پیشرفت کی' گویا امام جعفر صادقؑ کا حلقہ درس ان کے لئے ایک ایسی یونیورسٹی بن گیا جس نے صابئ لوگوں کے لئے علم و ثقافت کی بنیاد فراہم کردی۔

جب ہم صابئ قوم کی امام جعفر صادقؑ سے پہلے اور بعد کے دور کی تاریخ کا موازنہ کرتے ہیں تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہ موازنہ گویا ظلمت کے ساتھ نور کا موازنہ ہے۔

امام جعفر صادقؑ سے پہلے صابی ایک بدوی اور پسماندہ قوم تھے جن کی معلومات بدوؤں کی معلومات سے زیادہ نہیں ہوتی تھیں۔ حتیٰ کہ وہ صابی جو موحد شمار ہوتے تھے ان کی معلومات بھی صحرانشین قبائل سے زیادہ نہیں ہوتی تھیں۔ لیکن امام جعفر صادقؑ کے دور کے بعد صابئ قوم ایک ثقافت کی وارث بن گئی اور اس قوم میں اتنے قابل سائنسدان پیدا ہوئے جنہوں نے طب' فزکس' کیمیا اور انجینیرنگ میں ساری دنیا میں نام پیدا کیا اور آج ہم ان کے نام دائرۃ المعارف جیسی کتابوں میں پڑھتے ہیں۔

امام جعفر صادقؑ کی یونیورسٹی کے طفیل نہ صرف یہ کہ پسماندہ قوم صابی ایک متمدن قوم بن گئی بلکہ امام جعفر صادقؑ کی یونیورسٹی اسی صابی قوم کے باقی رہنے کا موجب بھی بنی اس لئے کہ جو قوم اپنے آپ کو نہیں

پہچانتی اوراپنی تاریخ سے مطلع نہیں ہوتی' اگرچہ اس قوم میں قابل لوگ ہوں لیکن ان کی اپنی ثقافت نہ ہو تو وہ قوم مٹ جاتی ہے۔ مگر وہ قوم جو تاریخ رکھتی ہو اور اپنے آپ کو پہچانتی ہو اور اس میں قابل افراد بھی پائے جاتے ہوں اور اس کے ساتھ وہ اپنی ثقافت بھی رکھتی ہو تو وہ قوم نہیں مٹتی جس طرح صابئی نہیں مٹے اور ابھی تک باقی ہیں۔ اگرچہ ان کی تعداد پہلے کی مانند نہیں ہے لیکن ابھی تک ان کا کچھ حصہ اپنے قدیم رہائشی قطعات پر زندگی بسر کررہا ہے۔

شیخ ابوالحسن خرقانی بھی زمخشری اور عطار نیشاپوری کی مانند امام جعفر صادقؑ کا بہت احترام کرتے ہیں اور انہیں اسلامی دنیا میں عرفاء کا پیشوا سمجھتے ہیں۔ شیخ ابوالحسن خرقانی کو ایک تاریخی محقق بھی تسلیم کرسکتے ہیں کیونکہ انہوں نے عرفان کی بنیاد کے بارے میں تحقیق کی اور اس بات کا کھوج لگایا کہ عرفان اسلام سے قبل بھی مشرق میں موجود تھا۔ لیکن وہ اسلام سے قبل ایران میں عرفان کی جڑوں کو نہیں ڈھونڈ سکے کیونکہ شیخ ابوالحسن خرقانی نے زردشت مذہب کے بارے میں زیادہ تحقیق نہیں کی۔ انہیں ایران میں عرفان کی بنیادیں تلاش کرنے کے لئے زردشتی مذہب کو مدنظر رکھنا چاہئے تھا۔

آج ہمیں معلوم ہے کہ عرفان اسلام سے پہلے ایران میں چند بنیادوں پر استوار تھا اور ان میں سے دو بنیادیں دوسروں سے زیادہ اہمیت کی حامل تھیں۔ ایک وہ عرفان جو زردشتی مذہب سے وجود میں آیااور دوسرا وہ عرفان جو مکتب اسکندریہ سے ایران میں پہنچا۔

شیخ ابوالحسن خرقانی زردشتی مذہب کی بنیاد کے بارے میں زیادہ تحقیق نہیں کرسکے کیونکہ انہوں نے اس مذہب کو درخور اعتنا نہیں سمجھا جبکہ چوتھی صدی کے دوسرے نصف حصے اور پانچویں صدی ہجری کے پہلے نصف حصے کے دوران جو شیخ خرقانی کی زندگی کا حصہ ہے۔ اگرچہ ایران کے بعض خطوں کے لوگ پہلوی ساسانی زبان میں گفتگو کرتے تھے لیکن وہ مسلمان تھے اور کچھ لوگ جو پہلوی زبان میں گفتگو کرتے تھے اور شیخ کی پیدائش کی جگہ کے نزدیک رہتے تھے ان کے بارے میں یہ کہنا محال ہے کہ شیخ نے انہیں نہ دیکھا ہو اور ان کی زبان نہ سنی ہو۔ اسی طرح وہ یہودیوں اور عیسائیوں کے مذہب کو اچھی طرح جانتے تھے لیکن زردشتی مذہب کی ماہیت سے مطلع نہیں تھے۔ بہرحال اسلام سے قبل عرفان کے بارے میں ان کی تحقیق قابل توجہ ہے۔

فرانسیسی مستشرقین کی وسیع تحقیقات جو سترہویں صدی عیسوی سے لے کر موجودہ دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ہندوستان کی قدیم کتابوں کا ترجمہ اور خاص طور پر ادویہ کی کتابیں ثابت کرتی ہیں کہ قدیم ادوار میں ہندوستان اور ایران کے درمیان گہرے فکری اور ثقافتی روابط تھے اور ہر دو ممالک کی ثقافت پر ان روابط کا گہرا اثر تھا۔ سترہویں صدی عیسوی کے بعد یورپی مستشرقین نے معلوم کیا کہ زردشتی مذہب میں ہندی افکار بھی پائے جاتے ہیں۔ اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ زردشتی عرفان نسبتاً" کچھ زیادہ ہی ہندی افکار سے ملتا جلتا ہے۔

البتہ زردشتی مذہب (۴۱) اور ہندوؤں کا مذہب دو مختلف چیزیں ہیں۔ زردشتی مذہب میں دو خداؤں (۴۲) اور ہندوؤں میں تین دیوتاؤں کا وجود ان دونوں میں فرق ڈالتا ہے۔ زردشت مذہب والوں نے جب ہندوؤں کے افکار کو جان لیا تو وہ جہاں بھی ہوتے ہندوؤں کے تین کے تصور سے پرہیز کرتے۔ انہوں نے اپنے مذہب کی بنیاد دو کے تصور پر رکھی کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ دنیا کی بنیاد اضداد پر رکھی گئی ہے اور ہر چیز کے دو قطب یعنی مثبت اور منفی ہیں۔

اگر شیخ ابوالحسن خرقانی اسلام سے قبل کے ادوار کے زردشتی اور مکتب اسکندریہ کے عرفان میں فرق کر سکتے تو وہ آسانی سے سمجھ سکتے تھے کہ زردشتی عرفان تین کے تصور سے وجود میں آیا ہے۔ لیکن وہ عرفان جس کی بنیاد امام جعفر صادقؑ نے رکھی وہ توحیدی عرفان ہے اور اس میں دو یا تین کا ذرا بھی تصور نہیں پایا جاتا اور گہرائی میں گئے بغیر ہی یہ عرفان انسان کو تزکیہ نفس اور روح کی بالیدگی کی جانب لے جاتا ہے۔ یہ اس قدر بلند ہے کہ نہ تو امام جعفر صادقؑ کے زمانے میں اور نہ ان کے بعد عام لوگوں کی اس تک رسائی ہو سکی ہے۔ اگرچہ بعد کے ادوار میں عرفان چند مکاتب کا حامل بن گیا لیکن اس کے باوجود بھی جس عرفان کی امام جعفر صادقؑ نے بنیاد ڈالی تھی وہ عام لوگوں کی دسترس سے باہر ہے۔

امام جعفر صادقؑ کا عرفان نہ تو ہندوؤں اور عیسائیوں جیسا تین خداؤں کا تصور رکھتا ہے' نہ ہی زردشتیوں کی مانند دو خداؤں کے تصور پر مبنی ہے اور نہ بعد کے ادوار میں وجود میں آنے والے عرفان میں جو مبالغہ آرائی کی کیفیت رونما ہوئی اس سے دوچار ہے۔

بعد میں جب عرفانی مکاتب وجود میں آئے تو ان مکاتب کے بعض بانیوں نے عرفانی فکر میں اس قدر مبالغہ سے کام لیا کہ ان پر کفر کے فتوے لگائے گئے اور یہ بھی دیکھا گیا کہ ان کی مبالغہ آرائی کے نتیجے میں ان کے پیروکار تک بھی ان سے منحرف ہو گئے۔ بعض عرفاء تو اپنے آپ کو خدا کے برابر سمجھنے لگے۔ زمخشری (۴۳) کی ان سے نفرت بیجا نہیں تھی البتہ زمخشری' امام جعفر صادقؑ اور ان کے پیروکاروں کے علاوہ دوسرے عرفاء سے بھی نفرت کرتا تھا۔ مرتضیٰ فرہنگ (۴۴) جو ایران کے دانشوروں میں سے ایک ہے' کا کہنا ہے کہ بعض کا عرفان میں نے ایک ایسے پتھر سے زیادہ نہیں پایا جو کسی کو نقصان پہنچا سکے۔ لیکن خود مرتضیٰ فرہنگ بھی عرفانی ذوق رکھتا تھا۔ اس نے اپنی بعض تصانیف میں عرفان کا دفاع بھی کیا ہے لیکن امام جعفر صادقؑ کا عرفان مبالغے سے مبرا ہے اور نہ صرف یہ کہ شیعہ مذہب کے عرفاء نے اس کی پیروی کی بلکہ اہل سنت والجماعت کے عرفاء کے ایک گروہ نے بھی امام جعفر صادقؑ سے عرفان کا درس حاصل کیا حتیٰ کہ امام جعفر صادقؑ کے زمانہ کے دو سو سال گزر جانے کے بعد عباسی خلفاء کے مرکز بغداد میں سنی المذہب' امام جعفر صادقؑ کی پیروی کرتے تھے۔ اسلام میں عرفان کا یہ بانی ایک عباسی خلیفہ کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔

امام جعفر صادقؑ کا عرفان، خداوند تعالیٰ پر توکل اور اس کے احکامات کی پیروی ہے۔ آپ نے اس کے ساتھ ساتھ دنیوی امور میں بھی غفلت نہیں برتی تاکہ زندگی کا نظم و ضبط تعطل کا شکار نہ ہو۔ "عطار نیشاپوری" تذکرۃ الاولیاء میں لکھتا ہے کہ بایزید بسطامی تیس سال تک بڑے بڑے عرفاء کے حضور میں حاضری کے لئے بیابانوں میں ٹھوکریں کھاتا اور بھوک برداشت کرتا رہا۔ آخرکار وہ امام جعفر صادقؑ کے حضور میں حاضر ہوا۔ اسے اس بات کا علم نہیں تھا کہ امام جعفر صادقؑ بایزید کے ترک دنیا پر اور تیس سال بیابان میں بھوک برداشت کرنے پر خوش نہیں ہیں۔ یہاں اس امر کی وضاحت لازمی ہے کہ اگر بایزید بسطامی کی امام جعفر صادقؑ کے حضور میں حاضر ہونے کی روایت صحیح ہے تو عرفان کے بانی نے اسے ضرور تنبیہہ کی ہوگی اور کہا ہوگا کہ اس نے کیوں تیس سال بیابانوں میں زندگی بسر کی اور بیوی بچوں کے بارے میں اپنے فرائض سے غافل رہا ہے؟ کیونکہ امام جعفر صادقؑ کا عرفان دنیا کے ترک کرنے کے حق میں نہیں بلکہ اس عرفان کے مطابق ہر ایک کو چاہئے کہ اپنے دنیوی امور کو اخروی امور کے ساتھ منظم کرے۔ امام جعفر صادقؑ کے عرفان میں متعدد مکاتب کے بانیوں کے قول کے برعکس خداوند تعالیٰ تک رسائی کا کوئی مسئلہ نہیں۔ امام جعفر صادقؑ نہیں کہتے کہ آدمی خدا تک پہنچے گا مگر اتنا جتنا قرآن نے کہا ہے۔ قرآن میں کہا گیا ہے کہ انسان خدا کی طرف سے آیا ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جائے گا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسان (العیاذ باللہ) خدا بن جائے گا۔ کیونکہ انسان مخلوق ہے اور یہ ہمیشہ مخلوق ہی رہے گا۔ یہ ہرگز خالق نہیں بن سکتا۔ لیکن چونکہ مرنے کے بعد خالق کی طرف رجوع کرتا ہے اس لئے اس کے قریب ہو جاتا ہے۔

امام جعفر صادقؑ کے بعد عرفانی مکاتب نے انا للہ و انا الیہ راجعون سے یہ مراد لیا ہے کہ آدمی مرنے کے بعد خدا سے وابستہ ہوجاتا ہے اور خدا بن جاتا ہے۔ لیکن اس ضمن میں غور طلب یہ امر ہے کہ وہ زندگی کے دوران خدا کیوں نہیں بن سکتا؟ مرنے کے بعد آدمی کے خدا بن جانے کے عقیدے سے یہ نظریہ پیدا ہوا کہ چونکہ آدمی خدا بن کر زندہ جاوید اور تمام چیزوں سے آگاہ ہوجاتا ہے لہٰذا اس دنیا کے حالات کو اچھی طرح دیکھ سکتا ہے۔ وہ اپنے قرابتداروں کو دیکھتا اور ان کی مشکلات کو حل کرسکتا ہے۔ مرنے کے بعد زندگی کا عقیدہ صرف مسلمانوں میں ہی نہیں بلکہ یہ عقیدہ تمام قدیم مذاہب میں پایا جاتا ہے۔ ہم گزشتہ مذاہب میں سے دو مذاہب کے علاوہ کسی تیسرے مذہب کو نہیں پاتے جس میں مرنے کے بعد زندگی کا تصور نہ ہو۔ حتیٰ کہ وہ مذاہب جن میں مردے کو جلایا جاتا ہے اور پھر اس کے باقیات کو دریا میں بہا دیتے ہیں۔ ان کا بھی عقیدہ ہے کہ وہ مردہ دوسری دنیا میں زندہ ہے۔ صرف مانوی مذہب اور باطنی فرقہ جو اسماعیلی فرقے کی ایک شاخ ہے ان دو کا عقیدہ یہی ہے کہ مرنے کے بعد آدمی ہمیشہ کے لئے ختم ہوجاتا ہے۔ اسی لئے ان دونوں فرقوں کے پیروکار آخرت پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔

لیکن حسن بن صباح کے بعد باطنی فرقے کے پیشوا متوجہ ہوئے کہ ان کے پیروکاروں کو مرنے کے بعد معاد کی زندگی کے علاوہ جزا اور سزا کا بھی معتقد ہونا چاہئے۔ ان دونوں فرقوں کے علاوہ تمام ادیان میں وحدانی یا باطنی پولیس کا وجود موجود ہے اور وہ معاد کے قائل ہیں۔ ان میں سے بعض میں مثلاً" قدیم مصر میں یہ عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد انسان کے اعمال کی جزا و سزا ملنا شروع ہو جاتی ہے اور بعض میں ان کی زندگی کی موت اور اس دوسری دنیا میں اعمال کی جزا و سزا میں فاصلہ پایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وحشی قبائل میں بھی مرنے کے بعد کی زندگی کا عقیدہ موجود ہے اور وہ بھی اس بات کو ماننے کو تیار نہیں ہیں کہ انسان مرنے کے بعد دوبارہ زندہ نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر لای وینک اسٹون جو دریائے نیل کے منابع کا دریافت کرنے والا ہے اور جس نے انیسویں صدی عیسوی میں اپنے سیاحت نامے اور انکشافات کے مجموعے کو انگلستان کی شاہی حکومت کی جغرافیہ کی تنظیم کو "تحفتاً" پیش کیا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ جتنا عرصہ مرکزی افریقہ میں رہا اس دوران وہ ہر قبیلہ میں گیا اور اس نے مشاہدہ کیا کہ قبائل کے لوگ اپنے مردہ اجداد کی زندگی کے معتقد ہیں اور ان میں بعض قبیلے امور زندگی میں اپنے مردہ اجداد کے ارادہ کو موثر سمجھتے ہیں۔ افریقہ کے قبائل میں سے کچھ ایسے ہیں جن کے لئے وہاں کے جادوگر ان کے آباء و اجداد کے نظریئے اور ارادے کو متعین کرتے ہیں۔ جو کچھ لای وینک اسٹون نے مرکزی افریقہ میں دیکھا اور سنا اور اسی طرح دوسرے لوگوں نے دوسرے علاقوں میں مشاہدہ کیا جس سے انہوں نے نتیجہ اخذ کیا کہ کوئی قبیلہ جتنا پسماندہ ہوگا اس کا عقیدہ مرنے کے بعد کی زندگی کے بارے میں اتنا ہی پختہ ہوگا۔ تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جو قومیں ترقی یافتہ اور متمدن ہیں ان میں موت کے بعد کی زندگی کا نظریہ نہیں پایا جاتا۔ بلکہ آج ایک امریکی اور فرانسیسی بھی موت کے بعد کی زندگی کا قائل ہے۔ لیکن اس کا عقیدہ سیاہ فام سے مختلف ہے۔ سیاہ فام اس بات کا قائل ہے کہ موت کے بعد کی زندگی اور اس دنیا کی زندگی میں ذرا بھی فرق نہیں ہوگا۔ جبکہ ایک امریکی اور فرانسیسی یہ گمان رکھتا ہے کہ موت کے بعد کی زندگی میں بھی وہ اسی طرح غذا کھائے گا، لباس پہنے گا اور پکچر دیکھنے کے لئے سینما جائے گا۔ اسی لئے بعض مفکرین کہتے ہیں کہ موت کے بعد زندگی کا عقیدہ انسان کے فطری عقائد میں سے ایک ہے۔ اگرچہ بیالوجی (Biology) کے مظاہر اور اعضائے انسانی کے ٹائم ٹیبل کے نظام سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ مثلاً" جیسا کہ بھوک اور پیاس جانداروں کی زندگی کا خاصہ ہے۔

بہرکیف چونکہ موت کے بعد زندگی کا عقیدہ قدیم ترین ادوار میں بھی موجود تھا اور شاید یہ عقیدہ اسلام سے نسل در نسل انسانوں تک پہنچتا رہا اور آخرکار اتنا پختہ ہوگیا کہ انسانی فطرت کا حصہ بن گیا اور صرف وہ آدمی جو معاشرے میں نہ رہا ہو اور متمدن یا وحشی تہذیب کے عقائد اس تک نہ پہنچے ہوں۔ اس عقیدے سے مبرا ہو

سکتا ہے.....ہوسکتا ہے کہ تمام مذاہب جو موت کے بعد زندگی کے معتقد ہیں ان میں معاد کی بنیاد اسی فطری عقیدے پر رکھی گئی ہے۔ ہر وہ مذہب جس میں معاد پر اعتقاد پایا جاتا ہے اس نے اس فطری عقیدے سے فائدہ اٹھا کر انسانوں میں وجدانی یا باطنی پولیس پیدا کی ہے۔ قدیم مصر میں یہ عقیدہ تھا کہ اگر کوئی شخص دوسرے کا مال چوری کرے گا تو دوسری دنیا (مغربی دنیا) (۲۵) میں وہ ہمیشہ کے لئے تاریکی میں زندگی بسر کرے گا اور سورج کی روشنی اس تک نہیں پہنچے گی حتیٰ کہ وہ ایک چراغ سے بھی فائدہ نہیں اٹھا سکے گا۔

زردشتی مذہب میں عقیدہ تھا کہ دوسری دنیا میں چنوند (بروزن دربند) ایک پل ہے۔ جو گنہگار ہوگا وہ اس پل پر سے نہیں گزر سکے گا اور وہیں گر جائے گا۔ مشرق کے عرفانی مکتب فکر نے مسلمانوں کے موت کے بعد کی زندگی کے فطری اور مذہبی عقیدہ سے فائدہ اٹھایا اور اس کے ذریعے اپنے پیروکاروں کی روح کی پرورش کے لئے راستہ ہموار کیا اسی لئے انہیں اس بات کی ضرورت پیش نہ آئی کہ وہ اپنے پیروکاروں کی روح کی پرورش کی ابتداء میں ایک عرصہ صرف کریں۔ پھر کہیں جا کر ان کے پیروکار اس بات کو سمجھیں کہ آدمی موت کے بعد زندہ رہتا ہے اور انہیں ایسے کاموں کی طرف شوق دلائیں جن کی وجہ سے وہ مرنے کے بعد اعلیٰ مقام پر فائز ہو سکیں۔ یہ کام عرفان کی پہلی سیڑھی تھی۔ لیکن عرفاء دوسری صدی ہجری کے خاتمہ پر اس سے بلند مرتبے تک پہنچ گئے اور عرفان کی بنیاد اس پر رکھی کہ انسان اسی دنیا میں بلند ترین مرتبے تک پہنچ جاتا ہے اور جو چیز اس فکر کو وجود میں لائی وہ موت کے بعد زندگی کا عقیدہ تھا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر مسلمان یا دوسری اقوام موت کے بعد زندگی کی معتقد نہ ہوتیں تو عرفان وجود میں نہ آتا۔ اس لئے کہ عرفان کے وجود میں آنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ عارفوں نے کہا ہے کہ یہ انسان جو مرنے کے بعد شک و تردد کے بغیر زندہ رہتا ہے اس کی موت لباس کی تبدیلی کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ پھر کیوں نہ انسان اسی دنیا میں روح کی تکمیل کے اعلیٰ ترین مرتبے تک نہ پہنچے اور اپنے آپ کو ملکوت تک نہ پہنچائے چہ جائیکہ وہ صبر کرے تاکہ موت کے بعد کامل انسان کے اعلیٰ مرتبے تک فائز ہو۔

عرفان کے متعدد مکاتب فکر کا آخری ہدف یہ رہا ہے کہ انسان اسی دنیا کی زندگی میں اپنے آپ کو ملکوت تک پہنچائے اور جب ہم عرفان کے مفہوم کی وضاحت کرتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ عرفان کا مقصد یہ ہے کہ انسان اسی دنیا میں اور موت سے پہلے اپنے آپ کو خدائی مرتبے تک پہنچائے۔ لیکن امام جعفر صادقؑ کے عرفان میں یہ موضوع نہیں پایا جاتا۔ اور انہوں نے یہ نہیں کہا کہ انسان کو اس دنیوی زندگی میں خدائی کے مرحلے تک پہنچ جانا چاہئے۔ یہ عقیدہ امام جعفر صادقؑ کے بعد کے عرفانی مکاتب فکر کی پیداوار ہے اور وہ دو چیزیں جو عرفانی مکاتب فکر میں اس عقیدہ کو وجود میں لائیں ان میں سے ایک یہ ہے آدمی موت کے بعد بھی زندہ رہے گا جبکہ دوسرا امر وحدت الوجود کا نظریہ ہے۔

وحدت الوجود کا نظریہ امام جعفر صادقؑ کے بعد مشرق میں دو بڑے عرفانی مکاتب فکر کی بنیاد بنا۔ اس میں کوئی

شک نہیں کہ یہ نظریہ مشرق کی پیداوار ہے اور ہندوستان و ایران سے اٹھا اور پھر مشرق سے یورپ گیا (۲۵)۔ وہاں اس نظریہ کے بہت سے حامی پیدا ہوئے۔ تاہم امام جعفر صادقؑ وحدت الوجود پر یقین نہیں رکھتے تھے اور مخلوق کو خالق سے جدا سمجھتے تھے۔ جو لوگ وحدت الوجود کے حامی تھے وہ کہتے تھے کہ خدا اور جو کچھ اس نے خلق کیا ہے اس میں کوئی فرق نہیں' مگر یہ کہ صرف حالت کا فرق ہے۔ یعنی شکل و لباس وغیرہ کا تفاوت ہے۔ عام جامد اشیاء' درخت اور دوسرے جاندار' یہی خدا ہے۔ کیونکہ شروع میں خدا کے علاوہ کچھ نہ تھا اور چونکہ جہان کا آغاز و انجام نہیں ہے' یہ چیزیں بھی خدا کے بغیر وجود میں نہیں آسکتیں اور چونکہ خدا کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں تھی اور نہ ہے۔ لہٰذا جمادات' درختوں اور جانوروں کا خمیر خدا نے اپنی ذات سے اٹھایا ہے۔ پس اسی لئے خداوند عالم اور جو کچھ اس نے پیدا کیا ہے ماہیت کے لحاظ سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

## شیعیت کو نابودی سے بچانے کے لئے امام جعفر صادقؑ کا اقدام

عیسائی مذہب میں تفرقہ اندازی جو ناسوت (۲۷) اور لاہوت کی پیداوار ہے وہ اتوس پہاڑ پر واقع عیسائی راہبوں کی (بلحاظ مذہب) خانقاہوں کی حالت کشمکش ہے۔

یونان میں سالونیک نام کی ایک ریاست ہے اور سالونیک کے مشرق میں تین جزیرے ہیں۔ ان میں جو جزیرہ مشرق کی سمت میں ہے اس کا نام کوہ اتوس یا جزیرہ اتوس ہے۔ اس کوہ اتوس پر مختلف مراتب کی خانقاہیں ہیں۔ پہلے درجے (۲۸) میں بیس' دوسرے میں بارہ' تیسرے میں ۲۰۴ اور چوتھے میں ۳۶۵ خانقاہیں ہیں۔

قدیم زمانوں سے یہ کوہ ایتھس ان آرتھوڈکسی عیسائیوں کی پناہ گاہ رہا ہے جو ترک دنیا کرکے ساری عمر عبادت میں مشغول رہنا چاہتے تھے۔ کوہ اتوس کی تمام خانقاہیں آتھوڈکسی مذہب کی ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد جب روس میں بالشویکی حکومت برسراقتدار آئی تو کوہ اتوس کی خانقاہوں کے سارے عطیات کو زبردستی ضبط کرلیا گیا۔ یاد رہے کہ مشرقی یورپ کے تمام ممالک میں یہ خانقاہیں عطیات کی حامل تھیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد مشرقی حکومتوں میں تبدیلی آئی اور ان ممالک میں کوہ اتوس کے عطیات بھی قومی ملکیت قرار دے دیئے گئے۔ آج کوہ اتوس کے عطیات وہی ہیں جو یونان اور ترکی کے یورپی حصے میں ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد یہ وقف شدہ املاک روس میں بسنے والے راہبوں کے ہاتھوں سے چلی گئی تھیں۔ پھر بھی ان خانقاہوں کی اتنی آمدن تھی کہ تقریباً" پندرہ ہزار راہب اس پر گزربسر کرتے تھے اور تقریباً" پندرہ سو خدمت گزار جو راہبوں کے لباس اور جوتے وغیرہ سیتے' غذا تیار کرتے اور ان کے لباس دھوتے اس آمدن پر گزربسر کرتے تھے۔

لیکن آج کوہ ایتھس کی یہ خانقاہیں ان وسائل سے محروم ہیں اور راہبوں کی تعداد بھی بہت کم ہے۔ کوہ اتوس کے خواص میں سے ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ عورت کا وہاں پر وجود نہیں ہے۔ دراصل عورت کوہ اتوس کی خانقاہوں میں گئی ہی نہیں اور کسی بھی دستاویز کی رو سے عورت' جوان ہو یا بوڑھی ان خانقاہوں میں نہیں جا سکتی۔ اگر کوئی راہب عالم نزع میں ہو اور اس کی بوڑھی ماں چاہے کہ آخری لحات میں اپنے بیٹے کو دیکھے تو اسے بھی ہرگز ان خانقاہوں میں جانے کی اجازت نہیں ملتی۔ وہ اپنے بیٹے کا تابوت صرف خانقاہ کے باہر سے دیکھ سکتی ہے جس میں اس کا جسد خاکی پڑا ہوتا ہے۔

دوسری جنگ عظیم تک کوہ ایتھس کی خانقاہوں میں بسنے والے راہبوں کا معیار زندگی (گھریلو اثاثے اور لباس وغیرہ کے لحاظ سے) پہلے صدی عیسوی کے لوگوں سے ملتا جلتا تھا اور دوسری جنگ عظیم کے بعد راہبوں کی زندگی میں جو بڑی تبدیلی رونما ہوئی وہ تبدیلی' خانقاہوں کا برقی رو کے ذریعے روشن ہونا تھا۔ جبکہ مزید لباس کی حالت یا گھریلو اثاثے کے لحاظ سے خانقاہوں میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ اگر ان خانقاہوں کے راہب' باہر کی دنیا سے باخبر ہوتے اور اپنے زمانے کے واقعات کی تاریخ رقم کرتے تو آج سب سے حقیقی تاریخ کوہ اتوس کی خانقاہوں میں ملتی۔ ان خانقاہوں کے قیام کو چودہ صدیاں ہو چکی ہیں لیکن ابھی تک بیرونی دنیا کے بارے میں وہاں ایک چھوٹی سی کتاب بھی نہیں ملتی اور آج باوجودیکہ ان خانقاہوں کو بجلی کے نظام سے متصل کردیا گیا ہے پھر بھی ان تمام خانقاہوں میں ٹیلیویژن اور دوسرے برقی آلات تو کیا ایک ریڈیو بھی نہیں ہے۔ اگرچہ کوہ ایتھس پر واقع درجہ اول کی بیس خانقاہوں میں سے سترہ خانقاہیں ایک ہی درجے کی ہیں پھر بھی وہ ایک خانقاہ میں تبدیل نہیں ہو سکیں کیونکہ ناسوت اور لاہوت کے لحاظ سے ان میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کوہ اتوس پر دو یونانی خانقاہیں ایسی نہیں ملتیں جن کے راہب حضرت عیسیٰ کی بشری ماہیت اور خدائی ماہیت کے بارے میں باہمی اتفاق رائے رکھتے ہوں۔

یہ اختلاف جس طرح کوہ ایتھس کی درجہ اول کی خانقاہوں میں پایا جاتا ہے اسی طرح اس پہاڑ کے درجہ دوم کی بارہ خانقاہوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ چونکہ چودہ صدیاں گزر جانے کے باوجود ان خانقاہوں کا بیرونی دنیا کے ساتھ رابطہ نہیں ہے لہٰذا فرانسیسی ٹیلیویژن کے ۱۹۶۹ء کے معلومات عامہ کے مقابلے میں جن دانشوروں نے شرکت کی وہ کوہ اتوس کے درجہ اول کی پانچ خانقاہوں کے نام بھی نہیں بتا سکے چہ جائیکہ وہ درجہ اول و دوم کی تمام خانقاہوں کے نام بتاتے۔

کوہ ایتھس پر پہلی آرتھوڈکس خانقاہ چھٹی صدی عیسوی میں وجود میں آئی۔ یہ ایک یونانی خانقاہ تھی جس کے راہبوں نے اسے تعمیر کیا۔ انہوں نے اس خیال سے اس جگہ کو منتخب کیا کہ یہ ایک سنگلاخ پہاڑ تھا جو گہری وادیوں پر مشتمل دریا کے قریب اور آبادیوں سے دور تھا۔ یہ مقام ان لوگوں کے رہنے سہنے کے لئے انتہائی

مناسب تھا جو ساری عمر انسانوں سے دور رہنا اور عبادت کے سوا کوئی دوسرا کام نہ کرنا چاہتے ہوں۔ اس کے بعد تمام آرتھوڈکسی مذاہب کی خانقاہیں اسی کوہ اتوس پر بنی شروع ہوئیں اور درجہ اول کی بیسویں خانقاہ روسی آرتھوڈکسی فرقہ کے راہبوں نے اٹھارہویں صدی عیسوی میں بنائی۔ آج جبکہ پہلی خانقاہ کو تعمیر ہوئے چودہ صدیاں گزر چکی ہیں' ان خانقاہوں میں حضرت عیسیٰؑ کی ناسوتی اور لاہوتی فطرت کے بارے میں اختلاف جوں کا توں ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جس وقت سلطان محمد دوم ملقب بہ فاتح نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا تو اس شہر کے راہب بجائے اس کے کہ شہر کے دفاع کے اقدامات عمل میں لاتے' حضرت عیسیٰؑ کی ناسوتی اور لاہوتی ماہیت کے بارے میں بحث کررہے تھے۔ بعض لوگوں نے اس روایت کو مذاق قرار دیا اور کہا ہے کہ عقل اس بات کو تسلیم نہیں کرتی کہ قسطنطنیہ کے کلیسا کے راہب شہر پر حملے کے خطرے کو نظرانداز کرکے حضرت عیسیٰؑ کی ناسوتی اور لاہوتی ماہیت کے بارے میں بحث میں مبتلا ہوں۔ لیکن اس روایت کو جھوٹا اس لئے قرار نہیں دیا جاسکا کہ آرتھوڈکسی کلیسا میں حضرت عیسیٰؑ کی لاہوتی اور ناسوتی فطرت کے بارے میں مسلسل بحث ہوتی ہے لہٰذا یہ بعید نہیں کہ جب سلطان محمد نے چند ماہ کے لئے قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا تھا تو شہر کے راہب اسی موضوع پر تبادلہ خیالات کر رہے ہوں گے۔

جو کچھ ہم نے کوہ ایتھس کی خانقاہوں کے بارے میں کہا' اس سے ہمارا مقصد عیسائیت میں حضرت عیسیٰؑ کے ناسوت اور لاہوت ہونے کے بارے میں اختلاف کی تائید کرنے کے علاوہ یہ بھی واضح کرنا ہے کہ شیعہ مذہب کو زوال سے بچانے کے لئے امام جعفر صادقؒ نے کون سا قدم اٹھایا؟ دوسری صدی ہجری کے پہلے پچاس سالوں میں مسلمانوں میں رہبانیت کی جانب میلان پیدا ہوا۔ دوسری صدی ہجری کا پہلا نصف اور دوسرا نصف وہ زمانہ ہے جس میں مسلمانوں میں بہت سے فرقوں نے جنم لیا اور تیسری صدی تک یہ عمل جاری رہا۔ دوسری صدی ہجری کے پہلے اور دوسرے نصف عرصے میں جنم لینے والے فرقوں کا ایک گروہ رہبانیت کی طرف مائل تھا۔ ان فرقوں کے بانیوں کا عقیدہ تھا کہ آدمی معمول کی زندگی کو ترک کرکے اپنی تمام عمر گوشہ تنہائی میں گزار دے۔

انہوں نے انسان کے فرائض کو مختلف اقسام کے اعتکاف میں متعین کردیا تھا۔ ان میں سے بعض کہتے تھے کہ جب انسان اعتکاف میں بیٹھے تو اسے چاہئے کہ تمام اوقات نماز کی ادائیگی میں مشغول رہے کیونکہ اسلام میں نماز سے بڑھ کر کوئی عبادت نہیں۔ بعض کا عقیدہ تھا کہ روزہ نماز سے افضل ہے لہٰذا جو کوئی اعتکاف میں بیٹھے اسے ساری عمر روزہ سے رہنا چاہئے۔

ان سے ذرا ماڈرن فرقے کے بعض بانیوں کا کہنا تھا کہ انسان جب معتکف ہوجائے تو اسے صرف اللہ تعالیٰ کے بارے میں غوروفکر کرنا چاہئے کیونکہ سب سے افضل عبادت اللہ تعالیٰ کے بارے میں غوروفکر ہے۔ یہ سب

فرقے نہ صرف رہبانیت کا شوق دلاتے تھے بلکہ اس امر کی تاکید بھی کرتے تھے۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی اپنے پیروکاروں کی معاش کے بارے میں فکرمند نہ تھا کیونکہ ان کا خیال یہ تھا کہ جو لوگ معتکف ہوں گے ان کی معاش کا بندوبست اوقاف کے کے ذریعے کیا جائے گا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ عیسائیت کی خانقاہوں کی مثال ان کے مدنظر تھی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ وہ خانقاہیں اوقاف کی حامل ہیں لہٰذا ہمارے جو لوگ معتکف ہوں گے ان کے لئے اوقاف سے بندوبست ہوجائے گا۔ شیعہ بھی دوسرے اسلامی فرقوں کی مانند رہبانیت کی طرف مائل ہوئے۔ خصوصاً" وہ لوگ جن کی فطرت میں رہبانیت ہوتی ہے اور وہ زندگی میں کام نہیں کرنا چاہتے۔ ان کے لئے ترک دنیا کا یہی بہانہ کافی تھا۔

امام جعفر صادقؑ نے شیعوں اور دوسرے مسلمانوں کی رہبانیت کی شدید مخالفت کی۔ امام جعفر صادقؑ کو علم تھا کہ اگر رہبانیت کا نظریہ شیعہ میں مضبوط ہوگیا تو یہ فرقہ نابود ہوجائے گا۔ خاص طور پر اس زمانے میں بنوامیہ کی حکومتیں بھی شیعوں کی مخالف تھیں اور کبھی تو وہ اپنی مخالفت کا برملا اظہار بھی کردیتی تھیں۔ ایسی صورت میں ہم اندازہ لگاسکتے ہیں کہ شیعوں کی غفلت ان کے لئے کس قدر خطرناک ثابت ہوسکتی تھی؟

بنوامیہ چاہتے تھے کہ شیعہ دنیا کو ترک کرکے معتکف ہوجائیں۔ اس طرح وہ بیرونی دنیا سے اپنا رابطہ منقطع کرلیں تاکہ باہر سے کوئی ان سے رابطہ نہ رکھے اور وہ تبلیغ کے ذریعے شیعہ مذہب کو نہ پھیلا سکیں۔ بنوامیہ جانتے تھے کہ شیعہ جب دنیا سے ہاتھ دھولیں گے اور تمام عمر ایک عبادت گاہ میں گزاریں گے تو کچھ عرصے بعد خودبخود ختم ہوجائیں گے۔

خانقاہ" کلیسا کی مانند نہیں ہوتی۔ اس میں کلیسا کی مانند مذہبی تبلیغ کے وسائل بھی مہیا نہیں ہوتے۔ کلیسا مذہبی سرگرمیوں کا مرکز ہوتا ہے اور کلیسا کے نام پر جہاں کوئی مرکزی مذہبی تنظیم وجود میں آتی ہے تو اس کا واضح مقصد مذہب کا فروغ ہوتا ہے۔ جو افراد کسی مذہب کے مرکزی انسٹی ٹیوٹ میں کام کرتے ہی وہ ان رضاکاروں کی مانند ہوتے ہیں جو مذہب کو تقویت پہنچانے اور اس کے فروغ کے لئے جنگ لڑتے ہیں۔ چونکہ جو شخص کسی مقصد کے لئے جدوجہد کرتا ہے اسے اس کا نتیجہ ملتا ہے۔ لہٰذا یہ لوگ جو مذہب کے لئے جنگ لڑتے ہیں انہیں بھی ان کی مساعی کا پھل ملتا ہے۔ لیکن جو شخص خانقاہ میں گوشہ نشین ہوجاتا ہے وہ شکست خوردہ ہوتا ہے اور جنگ و جہاد کو ایک طرف رکھ دیتا ہے۔

اگرچہ خانقاہ میں گوشہ نشینی کی وجوہات مختلف ہوسکتی ہیں لیکن یہ بات عیاں ہے کہ جو کوئی خانقاہ میں چلاگیا وہ اب مجاہد نہیں رہا۔ وہ جہاد کو ترک کرکے ساری عمر کے لئے ایک ہی ڈھنگ کی زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ چونکہ امام جعفر صادقؑ جانتے تھے کہ اگر اس مذہب کے کچھ لوگوں کو کسی خانقاہ میں عبادت کے لئے معتکف کیا جائے تو جس طرح یہ مذہب کے لئے ہرگز سودمند نہیں ہوگا اسی طرح اس سے مذہبی اشاعت بھی رک جائے گی۔

انہیں اس بات کا بخوبی علم تھا کہ اگر شیعوں نے اعتکاف کے مراکز کی جانب رخ کرلیا اور وہاں گوشہ نشین ہوکر اپنی تمام عمر نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے میں صرف کرنے لگے تو شیعہ مذہب جسے بنوامیہ کی دشمنی کا سامنا ہے نابود ہوجائے گا۔ اگر بنوامیہ شیعوں کی مخالفت نہ بھی کرتے اور شیعہ آبادیوں سے دور افتادہ علاقوں میں معتکف ہوجاتے تو چونکہ مذہب کی اشاعت و تبلیغ کے لئے کوئی بھی مجاہد باقی نہ رہتا اس لئے یہ مذہب خودبخود ختم ہوجاتا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اعتکاف کی فکر اور خانقاہ میں بسر کرنے کا رجحان صرف عیسائیوں میں پیدا ہوا ہے اس لئے اس سے پہلے دنیا سے ہاتھ دھوکر ساری عمر عبادت گاہ میں گزارنے کا تصور نہیں ملتا۔ عیسائیت سے پہلے دوسرے مذاہب میں عبادت گاہیں موجود تھیں اور ان میں سے ہرایک میں متعلقہ مذہب کے پیروکار لوگ بھی رہتے تھے۔ ان عبادت گاہوں کے اوقاف بھی ہوتے تھے جس طرح قدیم مصر میں زرعی جائیدادوں کا بڑا حصہ عبادت گاہ کی ملکیت ہوتا تھا۔

لیکن اس عبادت گاہ میں رہنے والے تارک الدنیا شمار نہیں ہوتے تھے بلکہ انہیں خدام مذہب کہا جاتا۔ دیکھا گیا ہے کہ وہ اپنے مذہب کی طرفداری میں جنگ لڑتے اور قتل ہوجاتے تھے۔ اعتکاف میں بیٹھنے اور دنیا سے ہاتھ دھونے کی فکر دراصل ہندوانہ فکر ہے۔ قدیم ہندوستان میں یہ رواج تھا کہ جب کسی کے بیٹے جوان ہوجاتے تو باپ اپنے کنبے کی کفالت سے دستبردار ہوتے ہوئے معاشرے سے الگ تھلگ ہوکر جنگل کی راہ لیتا تھا اور اپنی باقی ماندہ زندگی کو تنہائی میں وہیں گزار کر اس جہان فانی سے کوچ کرجاتا تھا۔ یہی سوچ عیسائیت میں داخل ہوئی۔ رومی حکومت کے عیسائیوں پر مظالم شاید اس سوچ کو تقویت دینے کا سبب بنے۔ اس طرح چند عیسائی گروہوں نے اس دنیا سے ہاتھ دھوکر خانقاہوں میں زندگی گزر بسر کرنے کی ٹھانی اور بعض کا خیال ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کا بھی اثر ہے کیونکہ ان تعلیمات میں اس دنیا سے زیادہ اخروی دنیا کی جانب توجہ دلائی گئی ہے۔ اس زمانے یعنی دوسری صدی ہجری کے آغاز میں مسلمانوں نے نہ صرف اس رہبانیت کی طرف توجہ دی جس کی امام جعفر صادقؑ نے سختی سے مخالفت کی تھی بلکہ عیسائیت کی ایک اور رسم بھی جسے بپتسمہ (Baptism) یا غسل دینا کہا جاتا ہے کی طرف بھی متوجہ ہوگئے۔ چونکہ مسلمانوں کا اس زمانے میں صرف آرتھوڈکسی مذہب کے پیروکاروں سے رابطہ تھا جو غسل دینے کی اس رسم کو اس طرح ادا کرتے تھے جس طرح اس مذہب کے پیروکار ادا کرتے تھے یعنی بچے کی پیدائش کے بیسویں اور چالیسویں دن کے درمیانی عرصے میں اسے مسجد لے جاکر ننگا کرکے طشت میں بٹھا دیتے اور پھر طشت کو پانی سے بھر دیتے تھے۔ پھر بچے کو اس طرح بٹھاتے تھے کہ اس کا چہرہ مشرق کی طرف ہوتا اور ایک مرد اور ایک عورت بچے کے دونوں جانب دائیں اور بائیں ہوجاتے اور مرد کو سوتیلا باپ اور عورت کو سوتیلی ماں قرار دیا جاتا۔ پھر وہ بچے کا جو نام تجویز کرنا چاہتے اسے زبان پر لاتے۔ جو آدمی مسجد کا متولی ہوتا تھا وہ اس وقت بپتسمہ کے مراسم میں عیسائیوں کے روحانی پیشوا کی مانند فرائض بجا لاتا اور اس کے نام کو

باآواز بلند پکار کر کہتا۔ "کیا تو محمدؐ پر ایمان لایا ہے ؟ "۔ وہ شخص جو بچے کا سوتیلا باپ ہوتا تھا بچے کی طرف سے جواب دیتا (کیونکہ بچہ بولنے سے قاصر ہوتا) اور کہتا۔ "میں ایمان لایا ہوں"۔ دوسری مرتبہ پھر مسجد کا متولی بچے کا نام زبان پر لاتا اور کہتا۔ "کیا تو محمدؐ پر ایمان لایا ہے ؟ "۔ اس دفعہ سوتیلی ماں جواباً" کہتی۔ "میں ایمان لائی ہوں"۔ پھر وہی متولی خوشبودار تیل کے چھوٹے سے برتن سے تیل اپنی انگلی پر لگاتا اور بچے کی پیشانی اور دو رخساروں پر ملتا۔ اسی طرح دوبارہ انگلی کو تیل میں ڈبو کر اس کے سینے اور پیٹھ پر ملتا۔ پھر اپنے دو ہاتھوں سے بچے کو پیٹھ سے پکڑ کر اوپر اٹھانے کے بعد پانی میں ڈبوتا اور فوراً" باہر نکالتا تاکہ پانی اسے ضرر نہ پہنچائے۔ یہ عمل دو مرتبہ دہراتا۔ اس کے بعد وہ سوتیلا باپ اور سوتیلی ماں بچے کو سفید لباس زیب تن کرواتے اور اس طرح پسمہ کی یہ رسومات ختم ہوجاتیں۔

اس قسم کی رسومات آرتھوڈکسی مذہب میں رائج تھیں اور کیتھولک ان رسومات کے دوران لاطینی زبان میں دعائیں پڑھتے اور بچے کو صرف سینے تک پانی میں ڈبوتے جبکہ بچے کی گردن اور سر کو پانی سے باہر رکھتے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہے کہ مسلمانوں کا اس وقت تک کیتھولک فرقے کے ساتھ رابطہ نہ تھا اور صرف آرتھوڈکس سے رابطہ رکھتے تھے۔ صاف ظاہر ہے کہ عمید کی رسومات آرتھوڈکس کی مانند انجام دیتے تھے۔ امام جعفر صادقؑ نے جس طرح رہبانیت کی شدید مخالفت کی اسی طرح پسمہ کی بھی مخالفت کی۔ ہمیں معلوم ہے کہ وہ عیسائیت کی تاریخ سے بخوبی واقف تھے۔ انہیں علم تھا کہ پسمہ کی رسم کس طرح عیسائیت میں داخل ہوئی۔

امام جعفر صادقؑ مسلمانوں سے فرماتے تھے کہ آج آرتھوڈکسی عیسائیوں کو بھی علم نہیں کہ پسمہ کے دوران بچے کا رخ مشرق کی طرف کیوں موڑتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ عیسائی مذہب نے شروع میں انطاکیہ میں کافی طاقت پکڑ لی تھی اور حضرت عیسیٰؑ کے پیروکار اس جگہ پسمہ کے دوران بچے کا رخ مشرق کی جانب رکھتے تھے کیونکہ بیت المقدس' انطاکیہ کے مشرق میں واقع ہے۔ آج ایران کے عیسائی بھی بچے کا رخ مشرق کی جانب رکھتے ہیں حالانکہ بیت المقدس ایران کے مغرب میں واقع ہے۔ امام جعفر صادقؑ شیعوں اور دوسرے اسلامی فرقوں سے فرماتے تھے' میں نہیں سمجھتا کہ پسمہ کے دوران بچے پر تیل ملنے کی رسم جو عیسائیوں میں رائج ہے' دوسری قوموں سے عیسائیت میں داخل ہوئی ہے کیونکہ ہم مسلمانوں میں بھی بعض ایسی رسومات ہیں جو دوسرے مذاہب سے اسلام میں داخل ہوئی ہیں۔ لیکن پیغمبر اسلام ﷺ نے انہیں اس طرح اسلامی قوانین کے مطابق ڈھالا ہے کہ وہ اب غیراسلامی نہیں رہیں۔ البتہ پسمہ کی رسم اپنی اس حالت میں جیسا کہ بعض مسلمان اسے انجام دیتے ہیں' عیسائی رسم ہے اور ایک مسلمان کو عیسائی مذہب کے قوانین پر عمل نہیں کرنا چاہئے۔ اگرچہ قرآن میں حضرت عیسیٰؑ کا کئی مقامات پر احتراماً" ذکر کیا گیا ہے لیکن عیسائیت کے قوانین پر عمل کرنا مسلمان کے لئے جائز نہیں۔

اگرچہ بچے کو نہلانا پاکیزگی کے لئے ضروری ہے لیکن عیسائیوں کے طریقے پر نہیں بلکہ میں تمام مسلمانوں کو ایسا کرنے سے پرہیز کرنے کی تلقین کرتا ہوں اور جو کوئی میرے منع کرنے کے باوجود اس فعل کی تکرار کرے تو میں اسے حقیقی مسلمان نہیں سمجھوں گا اگرچہ وہ اصول دین سے منحرف نہیں ہوا۔ لیکن ایک عیسائی رسم کی پیروی سے ظاہر ہے کہ دین اسلام کے بارے میں اس کا عقیدہ پختہ نہیں ہے اور اس کا یہ تکرار مسلمانوں کے درمیان تفرقہ بازی کا موجب بنے گا جس طرح عیساؤں کے درمیان تفرقے کا سبب بنا ہے۔ جب امام جعفر صادقؑ سے سوال کیا گیا کہ کیا آج مسلمانوں کے درمیان اختلاف نہیں پایا جاتا ؟ آپ نے فرمایا۔ مسلمانوں کے درمیان پیغمبراسلام ﷺ کی ماہیت کے بارے میں اختلاف نہیں پایا جاتا۔ مسلمانوں کے درمیان پیشوائی کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے جبکہ مسلمانوں کے درمیان توحید اور نبوت کے بارے میں مکمل اتفاق و ہم آہنگی ہے اور عیسائیوں میں دو کلیساؤں کے دو ایسے فرقے نہیں پائے جاتے جن میں حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں ایک جیسا عقیدہ پایا جاتا ہو۔ عیسائیوں کے بعض فرقے دوسرے فرقے کے پیروکاروں کو مرتد اور واجب القتل سمجھتے ہیں۔ جس طرح انطاکیہ کے عیسائی فرقے اور حبشہ کے عیسائی فرقے کا عقیدہ ہے کہ نستوری فرقہ والے مرتد اور واجب القتل ہیں۔

جو لوگ امام جعفر صادقؑ کے حضور میں درس پڑھتے تھے وہ نستوری فرقہ کے عقیدہ سے بے خبر تھے۔ امام جعفر صادقؑ نے اپنے شاگردوں سے کہا کہ ہمارے پیغمبرؐ کی ہجرت سے ایک سو نوے سال پہلے اور ۴۲۹ء میں قسطنطنیہ کے عیسائی اسقف نے جس کا نام نستوریس تھا' نے کہا کہ حضرت عیسیٰؑ ماہیت اور فطرت کے لحاظ سے ایک انسان ہے اور اس میں خدائی ماہیت کا ذرا بھی اثر نہیں ہے لیکن خدا اس میں اس طرح رہتا ہے جس طرح ایک مسافر کسی سرائے میں ٹھہرتا ہے یا مومن کلیسا میں ٹھہرتا ہے۔ یہ نظریہ چند ہی روز میں قسطنطنیہ میں عام ہو گیا اور پھر وہاں سے اطراف کے علاقوں میں پھیل گیا۔

اسکندریہ اور انطاکیہ کے عیسائی فرقے جو حضرت عیسیٰؑ کو انسانی فطرت اور خدائی فطرت کا خمیر سمجھتے تھے نہ صرف یہ کہ انہوں نے نستوریس کے نظریہ کو رد کیا بلکہ انہوں نے فتویٰ دیا کہ نستوریس اور اس کے پیروکار مرتد اور واجب القتل ہیں۔

نستوریس کا نظریہ جس کے تحت وہ حضرت عیسیٰؑ کو مکمل انسان کے طور پر انسانی ماہیت اور فطرت کا حامل قرار دیتا ہے البتہ صرف یہ کہتا ہے کہ ان کا جسم خدا کا مکان ہے (۲۹)۔ (یہ نظریہ) کافی مقبول ہوا اور آج اس فرقہ کے پیروکاروں کو نستوری کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس فرقے کے پیروکار تمام عیسائی فرقوں کی نظر میں (چاہے وہ جو حضرت عیسیٰؑ کو خدا سمجھتے ہیں یا وہ جن کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کا خمیر دونوں فطرتوں یعنی خدائی اور انسانی فطرت سے ہے) مرتد ہیں۔

امام جعفر صادقؑ نے شاگردوں کی معلومات میں اضافے کے لئے فرمایا کہ حبشہ کے عیسائی خدا اور حضرت عیسیٰؑ کی وحدت کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ اگرچہ حضرت عیسیٰؑ انسانی ڈھانچے کا حامل ہے لیکن اس کا انسانی ڈھانچہ الوہیت میں فنا ہے۔ اس بات کو ثابت کرنے اور مخاطب کو سمجھانے کے لئے وہ مختلف مثالیں بھی دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کا انسانی ڈھانچہ ذات باری کے مقابلے میں ایسا ہے جس طرح موم کا ایک ذرہ بہت وسیع اور پھیلی ہوئی آگ کے اندر ہو اور موم کا ذرہ اس آگ میں اسی طرح فنا ہوجاتا ہے جس طرح پانی کا قطرہ دریا میں فنا ہوجاتا ہے۔

ایک تیسری چیز جو دوسری صدی کے پہلے پچاس سالوں کے دوران (یعنی امام جعفر صادقؑ کے تدریس کے زمانے میں) بعض مسلمانوں کی رسومات میں شامل ہوگئی' وہ تجرد یعنی کنواری زندگی تھی۔ مسلمان مرد عیسائی پادریوں کی تقلید میں شادی نہیں کرتے تھے اور شادی نہ کرنے کو تزکیہ نفس کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ اس دور سے پہلے مسلمان صرف عیسائی آرتھوڈکسی فرقوں کو پہچانتے تھے اور عیسائی کیتھولکی فرقوں سے ان کا رابطہ نہ تھا۔ اس زمانے میں دین اسلام کے پھیلنے کی وجہ سے مسلمانوں کے روابط کیتھولک فرقوں سے بھی استوار ہوگئے۔ انہوں نے دیکھا کہ ان فرقوں میں نہ صرف وہ مرد راہب جو خانقاہوں میں رہ رہے ہیں شادی نہیں کرتے بلکہ پادری بھی جو کلیساؤں میں خدمت میں مشغول ہیں شادی بیاہ سے اجتناب کرتے ہیں۔ عیسائی آرتھوڈکسی فرقے جن سے مسلمانوں کا رابطہ تھا انطاکیہ اور اسکندریہ کے فرقوں کی مانند پادریوں کی شادی کو جائز سمجھتے تھے۔

بعض عیسائی آرتھوڈکسی فرقوں نے پادریوں کے لئے شادی بیاہ ممنوع قرار دے دیا تھا لیکن مسلمان ان سے واقف نہ تھے۔ جب اسلام اتنا پھیل چکا کہ مسلمانوں کے روابط عیسائی کیتھولکی فرقوں یا عیسائی لاطینی فرقے سے استوار ہوئے تو انہوں نے مشاہدہ کیا کہ کیتھولک عیسائی پادری شادی بیاہ نہیں کرتے اور ساری زندگی مجرد رہ کر گزار دیتے ہیں۔ اس بات کا ان پر کافی اثر ہوا اور بعض مسلمانوں نے کنوارے رہنے کو ترجیح دی۔ خاص طور پر یہ کہ جب وہ کنوارے زندگی بسر کرتے تھے تو خاندان کی معاشی کفالت سے بھی بچ جاتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ شادی کیتھولکی پادریوں پر حرام نہیں تھی یعنی اگر کوئی کیتھولکی پادری شادی کرتا تو وہ حرام عمل کا مرتکب نہیں ہوتا تھا (۳۰)۔

کسی دور میں بھی نہ ہی کسی پوپ کی طرف سے اور نہ ہی کیتھولکی پادریوں کی کسی عالمی کمیٹی کی طرف سے (کمیٹی کے ممبران عیسائی مذہب کے پیشوا ہوتے ہیں اور وہ باہم مل کر فیصلہ کرتے ہیں) پادریوں پر شادی بیاہ کے حرام ہونے کا فتویٰ صادر کیا گیا تھا لیکن کیتھولکی پادری کا کنوارہ رہنا دو دلیلوں کی بنا پر اس کا کمال شمار ہوتا تھا۔ پہلی دلیل یہ کہ لوگ کہتے تھے وہ حضرت عیسیٰؑ کا خدمت گزار ہے اس لئے اس کی روش کی پیروی کرتا ہے کیونکہ حضرت عیسیٰؑ نے شادی نہیں کی۔ دوسری دلیل یہ کہ وہ کہتے تھے' جب پادری فارغ البال ہوگا تو وہ اپنی

تمام جسمانی اور روحانی توانائیوں کو کلیسا کی خدمت کرنے اور کیتھولک مذہب کے فروغ کے لئے وقف کردے گا۔

کیتھولک پادریوں کی طرف سے شادی کے حرام نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ حالیہ چند سالوں کے دوران کیتھولکی پادریوں نے واٹیکن (کیتھولک مذہب کے مرکز) سے شادی کرنے کی اجازت لی تھی اور اگر پادری کے لئے شادی کرنا حرام ہوتا تو واٹیکن ہرگز شادی کرنے کی اجازت نہ دیتا اور کوئی کیتھولک پادری ایک حرام کام کے ارتکاب کے لئے کیتھولک مذہب کے مرکز سے اجازت نہ لیتا کیونکہ اگر اس کی درخواست قبول نہ کی جاتی تو اسے پشیمانی ہوتی۔

بہرحال بعض مسلمان مرد کیتھولک پادریوں کی تقلید میں شادی بیاہ سے پرہیز کرتے تھے۔ امام جعفر صادقؑ نے اس تقلید کی مخالفت کی اور فرمایا کہ مرد کا شادی بیاہ سے پرہیز اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی ہے اور اس سے انسان کو روحانی نقصانات ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کنوارہ پن مسلمانوں کے معاشرے کے لئے خطرناک ہے کیونکہ اس سے مسلمانوں کی تعداد کم رہ جاتی ہے جبکہ کفار کی تعداد دن بدن بڑھتی ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے مسلمانوں سے کہا کہ اگر کنواری زندگی ضروری ہوتی یا اس کا کچھ فائدہ ہوتا تو پیغمبر اسلام ﷺ کنوارے ہوتے۔ چونکہ پیغمبر اسلام ﷺ نے شادی کی ہے اس لئے ہر مسلمان مرد کو شادی کرنا چاہئے تاکہ وہ ان معنوی نقصانات سے جو کنوارے پن سے وجود میں آتے ہیں بچ سکے اور افزائش نسل کے ذریعے اسلامی معاشرے کی خدمت بجا لائے۔

مردوں کے کنوارے رہنے کی امام جعفر صادقؑ نے اس قدر شدید مخالفت کی کہ کنوارے رہنے کی یہ تحریک (قریب تھا کہ اسلام میں اس کی جڑیں مضبوط ہو جائیں) اس قدر ضعیف ہوئی کہ تقریباً" ختم ہوگئی۔ پھر بھی اس کا بچا کھچا اثر چوتھی اور پانچویں صدی ہجری کے دوران دیکھا گیا ہے کہ مردوں کے ایک گروہ نے تمام عمر شادی نہیں کی جن میں سے مشہور افراد کو ہم جانتے ہیں۔

انیسویں صدی تک یہ بات معلوم نہیں ہوئی تھی کہ امام جعفر صادقؑ کی طرف سے کنوارے پن کی مخالفت انسان کی مزاجی اور اعصابی مصلحتوں کی بنا پر تھی۔ قدیم لوگ جانتے تھے کنوارہ پن معنوی لحاظ سے مرد کے لئے مضر ہے لیکن انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ انسانی بیالوجی اور اعصاب کے لحاظ سے یہ کس قدر نقصان دہ ہے ؟

دوسرا یہ کہ پرانے وقتوں میں جب کنوارپن کی بات ہوتی تو صرف مرد کے کنوارے پن کو مدنظر رکھا جاتا، عورت کے کنوارے پن کی طرف توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ گویا عورت کا کنوارہ ہونا کنوارے پن میں شمار نہیں ہوتا تھا۔ جبکہ موجودہ زمانے میں جب ہم کنوارپن کی بات کرتے ہیں ہمارے پیش نظر مرد و عورت دونوں کا کنوارپن ہوتا ہے۔ انیسویں صدی عیسوی کے بعد آہستہ آہستہ معلوم ہوا کہ کنوارپن مرد اور عورت دونوں میں

نہ صرف یہ کہ اعصاب کی شکست و ریخت کا باعث بنتا ہے بلکہ اس سے بدن کے دوسرے فرائض میں بھی خلل واقع ہوتا ہے جس سے اعصاب کے علاوہ جسمانی صحت بھی متاثر ہوتی ہے۔

## بابائے دور علوم جدیدہ

ہم نے دیکھا ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے اپنے والد گرامی کے حلقہ درس میں سورج کے گرد حرکت پر اس حالت میں جب کہ وہ بارہ برجوں سے عبور کر رہا ہوتا ہے تنقید کی اور کہا کہ اس طرح کی حرکت کو عقل تسلیم نہیں کرتی اور عنقریب آگے آئے گا کہ والد کے بعد امام جعفر صادقؑ نے اپنا مستقل حلقہ درس قائم کیا۔ علم نجوم کے بارے میں انہوں نے ایسے نظریات پیش کئے کہ اگر انہیں تمام علوم جدیدہ کا پیشوا نہ بھی کہا جائے تو بھی کم از کم وہ علم نجوم کے پیشوا ضرور ہیں۔ جدید علمی زمانے سے ہماری مراد وہ زمانہ ہے جس میں یورپ میں علمی روشنی پھیلی۔ اس زمانے کا آغاز سلطان محمد فاتح کے ہاتھوں قسطنطنیہ کے سقوط سے شمار کیا جاتا ہے۔ یہ مصدقہ امر ہے کہ اسلامی دنیا جدید علوم کو قبول کرنے کے لئے یورپ کی نسبت زیادہ آمادہ تھی اور اسلام نے اپنی اشاعت کے ابتدائی زمانے میں علمی حقائق کو تسلیم کرلیا تھا۔ جبکہ یورپ پندرہویں صدی عیسوی میں جب قسطنطنیہ کا سقوط ہوا اور اس کے بعد سولہویں صدی اور یہاں تک کہ سترہویں صدی عیسوی میں بھی علمی حقائق کو سننے کا متحمل نہیں ہوا تھا۔ وہ حقائق جنہیں یورپ کم و بیش سننے کا متحمل نہیں تھا ان میں قابل تحمل نجومی حقائق بھی شامل تھے۔

اگر یورپ میں کوئی کسی عنصر یعنی پانی، مٹی یا آگ کے بارے میں ایسی بات کرتا جو رسم و رواج کے خلاف ہوتی تو کہنے والا خطرے سے دوچار نہیں ہوتا تھا لیکن اگر نجوم کے متعلق کوئی ایسی بات کرتا جو رواج کے برعکس ہوتی تو وہ خطرے سے دوچار ہوجاتا اور مرتد ہونے کی وجہ سے یا تو قید کردیا جاتا یا قتل ہو جاتا۔ یونان اور قدیم روم میں نجومی حقائق کے متعلق لوگ کافی حساس تھے۔ قدیم یونان علم کی سرزمین بھی کہلاتی تھی جیسا کہ پلینی (۳۱) لکھتا ہے۔ آناگزاگور (۳۲) اس نے اصرار کیا ہے کہ ایرانی علم نجوم کو یونان میں پڑھایا جائے، اسی وجہ سے اس پر یونان سے غداری کرنے کا الزام لگایا گیا اور پھر اسے جلاوطن کر دیا گیا۔

خیال کیا جاتا ہے کہ قومیں حتیٰ کہ یونانی قوم بھی علم نجوم کے حقائق جاننے کے بارے میں اس لئے حساس تھی کہ انہوں نے ستاروں کی حرکات کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور اس میں تردد کی کوئی گنجائش نہ تھی کہ جو کچھ وہ دیکھ رہے ہیں وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ چونکہ نجوم کی حرکات کو تمام لوگ محسوس کرسکتے تھے یہی وجہ ہے کہ کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ ان حرکات میں حقیقت نہیں ہے۔

کئی دفعہ ایسا ہوا کہ مشرق اور مغرب میں علمی مسائل کے متعلق ایسی باتیں کی گئیں جو اس زمانے کے رسم و رواج کے خلاف تھیں مثلاً" حرکت کے بارے میں یعنی یہ کہ حرکت پہلے وجود میں آئی یا دنیا ؟ یا پہلے دنیا وجود میں آئی اور پھر حرکت وجود میں آئی۔ غرضیکہ بہت سی ایسی باتیں کی گئیں جو اس زمانے کے رسم و رواج کے خلاف تھیں۔ اس طرح کبھی روح اور جسم پر بحث کی گئی کہ پہلے روح وجود میں آئی اور بعد میں جسم یا یہ کہ پہلے جسم پیدا کیا گیا اور بعد میں روح پیدا کی گئی۔ اس طرح بہت سی باتیں اس زمانے کے طور طریقے کے خلاف کی گئیں۔ لیکن چونکہ روح یا جسم کے بارے میں لوگوں نے نہ تو کچھ دیکھا تھا اور نہ ہی محسوس کیا تھا اس لئے ان مسائل پر بحث و مباحثہ کرنے والوں پر کفر و ارتداد کے فتوے نہیں لگائے جاتے تھے ماسوائے اصول دین مثلاً" توحید یا نبوت کی مخالفت کرنے والوں کے۔ آناگزیمن یونانی دانشور اور فلسفی جو ساتویں صدی قبل مسیح میں ہوگزرا ہے' ہمیں اس کی زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں' اس نے کہا ہے کہ سورج آگ کا گولہ ہے' یہ زمین سے بہت بڑا ہے اور اس کے چھوٹا نظر آنے کی وجہ اس کی دوری ہے۔ اگر یہ زمین سے بڑا نہ ہوتا اور اس کی حرارت زیادہ نہ ہوتی تو یہ ساری زمین کو روشن نہ کرسکتا اور اس طرح ہم اس کی حرارت سے مستفید نہ ہوسکتے۔

یہ بات ایسے فلسفی نے کہی ہے جو ساتویں صدی قبل مسیح میں ہوگزرا ہے جب کہ آج ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ سورج اس قدر گرم ہے جتنی گیسیں ہوتی ہیں۔ جب یہ نظریہ یونان سے بابل پہنچا تو وہاں اس کے بیان کرنے والوں پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا کیونکہ وہاں کے مذہبی عقیدے کے مطابق سورج بابل کے بڑے بت (یعنی بابل کے بڑے خدا) کا چراغ تھا اور وہ اس چراغ کو ہر صبح جلاتا اور شام کو بجھا دیتا تھا جبکہ آناگزیمن کا نظریہ ان کے عقیدہ کے بالکل خلاف تھا۔

آناگزیمینڈر نے دنیا کی خلقت کے بارے میں کہا تھا کہ ہوا تمام موجوات کی مبداء ہے اور ہر شے ہوا سے بنی ہے۔ اب جو کوئی سورج کے بارے میں آناگزیمن کے نظریئے کو قبول کرتا کافر ہوجاتا اور پھر وہ نہ تو بابل کے بڑے خدا کی عبادت گاہ کی طرف جا سکتا تھا اور نہ اسے سرکاری ملازمت ملتی تھی۔

اومسیڈ (۳۳) اپنی کتاب "عیسیٰ تاریخی نقطہ نگاہ سے" میں لکھتا ہے کہ بابل میں دو آدمیوں نے آناگزیمن کے نظریئے کو تسلیم کیا تو انہیں نہ صرف یہ کہ سرکاری ملازمت سے معزول کیا گیا بلکہ وہاں ان کے لئے زندگی اس قدر مشکل ہوگئی کہ مجبوراً" انہیں بابل چھوڑنا پڑا۔ یونان کے ایک اور فلسفی آناگز۔یمنڈر نے بھی دنیا کی خلقت کے بارے میں ایسا ہی نظریہ پیش کیا جو دنیا کی پیدائش کے بارے میں بابل والوں کے رسمی عقیدے کے خلاف تھا۔

آناگز۔یمنڈر ۶۱۱ قبل مسیح میں پیدا ہوا اور ۵۴۷ قبل مسیح میں فوت ہوا۔ اس نے کائنات کے بارے میں اس

طرح اظہار خیال کیا۔ "ابتدا میں کائنات ایک لامتناہی اور لامحدود چیز تھی جس کی کسی خوبی کو بیان کرتے ہوئے تعریف نہیں کی جا سکتی۔ اس چیز کے بہت سے حصے جن کی تعریف بیان سے باہر ہے آپس میں اکٹھے ہوئے جس کے نتیجہ میں ستارہ وجود میں آیا اور پھر اسی ستارہ سے اجسام وجود میں آئے"۔

آناگز۔یمینڈر نے کہا۔ "مذکورہ ناقابل تعریف چیز ایک حد تک اکٹھی تھی لیکن جب اس کا کچھ حصہ ڈھیر کی صورت میں اکٹھا ہوا تو اس سے درخت' حیوان اور انسان پیدا ہوئے۔ جب اس سے بھی کم اکٹھی ہوئی تو اس سے پانی اور ہوا وجود میں آئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جو کچھ اس یونانی فلسفی نے چھٹی صدی قبل مسیح میں کائنات کے متعلق کہا تھا وہی ہم آج چھبیس صدیاں گزر جانے کے بعد بھی کہہ رہے ہیں۔

ہمارے اس دور کے قابل ترین طبیعیات دان کہتے ہیں کہ سب سے پہلے ہائیڈروجن کا وجود تھا۔ لیکن جب پوچھا جاتا ہے کہ ہائیڈروجن کس طرح وجود میں آئی تو جواباً" وہی آناگز۔منڈر کا نظریہ دہراتے ہیں اور ہمیں سمجھا نہیں سکتے کہ وہ پہلی لامحدود اور لامتناہی چیز جس سے ہائیڈروجن وجود میں آئی وہ کیا تھی ؟ اندازا" وہ ناقابل تعریف چیز جس سے ہائیڈروجن وجود میں آئی ابھی تک موجود ہے۔ اگر وہ ہماری کہکشاں (سورج اور نظام شمسی جس کا ایک حصہ ہے) میں نہ ملے تو دوسری کہکشاؤں میں مل جائے گی۔ آج علم فزکس اور آسٹروفزکس (ستاروں کو پہچاننے کا طبیعیاتی علم) کی تمام تر ترقی کے باوجود ابھی تک سائنسدان طبیعی لحاظ سے دنیا کے مبداء یا منبع کی پہچان میں چھٹی صدی قبل مسیح کے یونانی فلسفہ سے آگے نہیں بڑھ سکے۔

ہائیڈروجن کا ایٹم' تمام عناصر کے ایٹموں سے ہلکا ہے۔ یہ ایک الیکٹران اور ایک پروٹان پر مشتمل ہے' الیکٹران پروٹان کے ارد گرد گردش کر رہا ہے۔ ابھی تک کوئی ایسا طبیعیاتی نظریہ پیش نہیں کیا گیا جس کی رو سے یہ ثابت کیا جا سکے کہ پہلے الیکٹران وجود میں آیا یا پروٹان یا یہ دونوں ایک ساتھ وجود میں آئے (پروٹان پر مثبت چارج اور الیکٹران پر منفی چارج ہوتا ہے) ممکن ہے یہ دونوں پہلے ناقابل وصف چیز سے وجود میں آئے ہوں۔

انیسویں صدی عیسوی سے آج تک اس بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ صرف تھیوری ہے اور ہم دنیا کے مبداء کی پہچان کے لحاظ سے آناگز۔منڈر کے زمانے کے لوگوں سے زیادہ معلومات نہیں رکھتے۔ آناگز۔منڈر کا نظریہ یونانی فلسفی آناگزیمینڈر کے نظریہ کی مانند بابل میں پہنچا اور ایک گروہ نے اسے قبول کر لیا لیکن آناگز۔منڈر کے نظریہ کو قبول کرنے کی پاداش میں کسی پر کفر کا فتویٰ نہ لگا اور نہ ہی کوئی ملازمت سے برخاست کیا گیا۔ بابل کے باشندوں کے پاس ایسی کوئی دلیل نہ تھی جس کی بنا پر وہ آناگز۔منڈر کے نظریئے کو باطل ثابت کرتے اور ان میں سے کسی نے نہیں دیکھا کہ دنیا کس طرح وجود میں آئی۔

لیکن وہی لوگ ہر صبح مشاہدہ کرتے تھے کہ سورج طلوع ہوتا ہے اور اسی طرح ہر شام نظارہ کرتے تھے کہ سورج غروب ہو جاتا ہے۔ وہ آناگز۔منڈر کے اس نظریہ کو کہ "سورج ایک گرم وجود ہے اور زمین سے بڑا

ہے" قبول نہیں کرسکتے تھے۔ وہ سورج کے ہر صبح اور شام طلوع اور غروب ہونے کا مشاہدہ کرتے اور اس پر یقین رکھتے تھے کہ بابل کا بڑا خدا اسے طلوع اور غروب کرتا ہے۔ اگر یونانی فلسفی کے بقول کوئی اور جسم زمین سے بڑا ہوتا تو طلوع اور غروب نہ کرسکتا۔

لیکن آناگزاگور اس کو جو ایرانی علم پڑھانے کی پاداش میں یونان سے جلاوطن ہوا اس کی غلطی کا سورج سے تعلق نہیں تھا بلکہ وہ چاہتا تھا کہ ایرانی کیلنڈر کو یونان میں عام کرے اور وہی کیلنڈر جس میں سال کو ۳۶۵ دنوں پر مشتمل قرار دیا گیا ہے۔ اس کیلنڈر کے کچھ مہینوں کے نام کتبہ بے ستون (۳۴) میں لکھے گئے ہیں اور ایران میں ھخامنشی عہد کے بعد ایسا مفصل کتبہ آج تک نہیں لکھا گیا۔ یونانیوں نے ایرانی کیلنڈر کو اختیار نہ کیا اور اپنے ہی کیلنڈر کو ترجیح دی۔ (ایران کی مدون تاریخ سے پہلے ہی معلوم ہوگیا تھا کہ سال ۳۶۵ دن کا ہوتا ہے)۔

موجودہ تاریخی اسناد بتاتی ہیں کہ قدیم مصری دوہزار سال قبل مسیح میں جانتے تھے کہ ایک سال میں ۳۶۵ دن ہوتے ہیں۔ ہمیں اس بارے میں علم نہیں ہے کہ شروع میں بابلی لوگوں نے اس موضوع پر توجہ دی یا مصریوں نے اور شاید جس طرح بعض صاحبان نظر نے کہا ہے کہ علم نجوم' ہیئت اور دوسرے علوم ایک دانشمند قوم سے دوسری قدیم قوموں تک پہنچے اور پھر وہ قوم ایک فطری المیئے کے نتیجہ میں مٹ گئی۔

بہرحال دوسری صدی ہجری کے پہلے پچاس سالوں میں امام جعفر صادقؑ نے پڑھانا شروع کیا۔ اس زمانے میں سورج کے متعلق بنی نوع انسان کی معلومات جن کا پہلے ذکر ہوچکا ہے نہایت محدود تھیں۔ اگر اسلامی دنیا کے باہر کوئی شخص ان معلومات کے خلاف اپنے نظریئے کا اظہار کرتا تو اسے مرتد قرار دے دیا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ زمین گردش کر رہی ہے اور دن رات اسی گردش کی بنا پر وجود میں آتے ہیں تو کسی نے آپ پر الزام نہیں لگایا۔ گزشتہ ابواب میں ہم نے دیکھا کہ یونانیوں کو زمین کی گردش کا خیال اقلیدس کے کہنے پر آیا۔ لیکن اقلیدس کو اس بات کا علم نہ تھا کہ زمین اپنے اردگرد گھومتی ہے۔ بلکہ اس نے کہا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جس میں لوگ اپنے مشاہدات اور محسوسات کے خلاف کسی چیز کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتے تھے۔ ایسے زمانے میں تین سو سال پہلے اقلیدس کا یہ نظریہ پیش کرنا اس کی ذکاوت کی دلیل ہے۔

انسان کم از کم ہزار سال قبل مسیح میں یہ بات جانتا تھا کہ زمین گول ہے۔ خصوصاً" مصری جانتے تھے کہ زمین گول ہے۔ مصریوں کے بعد عربوں کو پتہ چلا کہ زمین گول ہے اور ایک عرب جغرافیہ دان الاولسی جس نے پانچویں صدی ہجری میں جغرافیائی نقشے تیار کئے اسے علم تھا کہ زمین گول ہے۔ لیکن یہ بات بہت کم افراد کے علم میں تھی کہ یہ گول زمین سورج کے اردگرد چکر لگاتی ہے۔ صرف غیر معمولی ذہین انسان ہی کسی وسیلے اور ذریعے کے بغیر اس حقیقت کا ادراک کرسکتا تھا جس کے بارے میں اس سے قبل لوگوں کا خیال اس کے برعکس ہو۔

# زمین کے متعلق امام جعفر صادقؑ کا نظریہ

جیسا کہ ہم نے ذکر کیا کہ قدیم ادوار سے انسان کو یہ معلوم تھا کہ زمین گول ہے۔ وہ تمام پرتگالی اور ہسپانوی بحری سیاح جنہوں نے پندرہویں صدی کے دوسرے نصف حصے اور سولہویں صدی کے عرصے کے دوران نئے علاقے دریافت کرنے کے لئے سمندر کی راہ اختیار کی وہ یہ بات جانتے تھے کہ زمین گول ہے۔ یہاں اس بات کا تذکرہ بیجا نہ ہوگا کہ پندرہویں صدی کا دوسرا نصف حصہ اور سولہویں صدی کا سارا عرصہ ہماری موجودہ صدی کی نسبت (جس میں انسان نے چاند پر قدم رکھا) سے زیادہ قابل غور تھا۔ کیونکہ اگر ہم واسکوڈے گاما (پرتگالی) کے وفد کی سیاحت کا حال (جنہوں نے ہندوستان دریافت کیا تھا) پڑھیں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ اس وفد کے ہر فرد کا سفرنامہ خلائی مہم اپالو کی نسبت زیادہ دلچسپ ہے۔

اگر ہم ماجیلان (۳۵) کے وفد کا سفرنامہ پڑھیں تو ہم پر آشکارہ ہوگا کہ اس وفد کے ۲۶۸ افراد جو تین سال تک زمین کے اردگرد چکر لگاتے رہے کن کن مصائب و مشکلات کا شکار ہوئے اور صرف اٹھارہ افراد ان میں سے واپس لوٹے۔ یہاں سے ہم پر یہ حقیقت روشن ہوتی ہے کہ "اپالو خلائی مہم" کا سفر واقعات کے لحاظ سے خاصا بے رنگ ہے۔ واسکوڈے گاما (ہندوستان کا دریافت کرنے والا)' کرسٹوفر کولمبس (امریکہ دریافت کرنے والا) اور ماجیلان (پہلا انسان جو کرہ ارض کے اردگرد چکر لگانے نکلا) یہ سب جانتے تھے کہ زمین گول ہے۔ یہ تینوں صرف مادی مفادات کے لئے عازم سفر ہوئے تھے۔ یہ تین اشخاص جن کی فراست کے ہم ہرگز منکر نہیں ہوسکتے' اس یقین کے ساتھ کہ زمین گول ہے کیا یہ بات جانتے تھے کہ زمین اپنے اردگرد بھی حرکت کر رہی ہے ؟ یہاں تک کہ ہمیں یہ بھی معلوم نہ ہوسکا کہ گیلیلیو (اٹالین) بھی زمین کے اپنے اردگرد گردش سے آگاہ تھا یا نہیں ؟ گیلیلیو ایک منجم' ریاضی دان اور طبیعیات دان ہونے کے علاوہ بعض علوم میں پیشرفت بھی اسی کے بنائے ہوئے قوانین کی مرہون منت ہے اور جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ اس کی وفات امریکہ کی دریافت کے ڈیڑھ سو سال بعد ہوئی۔ لیکن اکثریت کا خیال ہے کہ گیلیلیو بھی نہیں جانتا تھا کہ زمین اپنے مدار کے اردگرد گردش کر رہی ہے اور عقیدہ کی تفتیش کرنے والی تنظیم (ایکریشن) نے اسے توبہ اور استغفار کرنے پر اس لئے مجبور کیا تھا کہ اس نے کہا تھا کہ زمین سورج کے اردگرد چکر لگاتی ہے۔

ماجیلان کے ستاون سال بعد ایک انگریز سمندری سیاح (فرانسس ڈریک) نے ماجیلان کی مانند مادی مفاد کے لئے زمین کے اردگرد چکر لگائے۔ اس کا یہ سفر ۱۵۷۷ء سے ۱۵۸۰ء تک کے عرصہ پر محیط ہے۔ جس زمانے میں وہ انگریز بحری سیاح سفر پر نکلا' زمین کا گول ہونا اس قدر مسلم ہوگیا تھا کہ عام آدمی بھی یہ جانتا تھا کہ زمین

گول ہے۔ لیکن انگریز بحری سیاح زمین کی اپنے اردگرد گردش سے مطلع نہ تھا۔ وہ سورج کے طلوع اور غروب ہونے کا سبب سورج کی زمین کے گرد حرکت کو قرار دیتا تھا' حالانکہ اپنے زمانے کا سائنسدان بھی شمار ہوتا تھا۔

زمین کی اپنے محور کے گرد گردش کے مسئلے کو تسلیم کرنا لوگوں کے لئے اس قدر مشکل تھا کہ ہنری پوانکارے (فرانسیسی) بھی زمین کی اپنے محور کے گرد گردش کے مسئلے کو مضحکہ خیز سمجھتا تھا۔ ہنری پوانکارے ۱۹۱۲ء میں اٹھاون سال کی عمر میں فوت ہوا۔ وہ اپنے دور کا بہت بڑا ریاضی دان تھا اور جیسا کہ اس کی تاریخ وفات گواہ ہے' اس نے بیسویں صدی عیسوی کے آغاز کا زمانہ بھی دیکھ لیا تھا۔ بہرحال یہ سائنسدان مذاقاً" کہتا ہے کہ مجھے یقین نہیں ہے کہ زمین اپنے محور کے گرد گردش کرتی ہے۔ جب ہنری پوانکارے جیسا سائنسدان جو بیسویں صدی کے آغاز تک زندہ رہا' اگرچہ مذاقاً" سہی لیکن زمین کے اپنے محور کے گرد گردش کے بارے میں متردد ہو تو صاف ظاہر ہے کہ دوسری صدی ہجری کے پہلے پچاس سالہ دور کے لوگ زمین کے اپنے محور کے گرد گردش کے نظریئے کو قبول نہیں کر سکتے تھے۔

زمین کی اپنے محور کے گرد گردش اس وقت تک مشاہدہ میں نہیں آئی جب تک انسان نے چاند پر قدم نہیں رکھا اور پھر وہاں سے انسان نے زمین کو نہیں دیکھ لیا۔ خلانوردی کے پہلے سالوں میں خلاباز زمین کی گردش کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکے کیونکہ ان پہلے سالوں کے دوران خلابازوں کے پاس مستقل مرکز نہ تھا بلکہ وہ ایسی خلائی کشتیوں میں سوار ہوتے تھے جو ہر نوے منٹ میں یا کچھ زیادہ عرصہ میں زمین کے اردگرد چکر لگا سکتی تھیں اور خلاباز جو اس دوران خود تیزی کے ساتھ زمین کے اردگرد چکر لگا رہے ہوتے تھے جس کی وجہ سے وہ زمین کی حرکت کو معلوم نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن جب چاند کے احاطے میں پہنچے اور وہاں سے زمین کی تصویریں لیں تو معلوم ہوا کہ زمین آہستہ آہستہ اپنے اردگرد چکر لگا رہی ہے۔ اس دن ثابت ہوا کہ زمین آہستہ آہستہ اپنے مدار کے اردگرد چکر لگاتی ہے۔

آج ہمیں معلوم ہے کہ نظام شمسی میں ایسا کوئی سیارہ نہیں جو اپنے اردگرد چکر نہ لگا رہا ہو اور نظام شمسی کے تمام سیاروں کی اپنے اردگرد حرکت طبیعی قوانین کے عین مطابق ہے۔ سورج جو نظام شمسی کا مرکز اور نظام شمسی کو چلانے والا ہے وہ بھی اپنے اردگرد گردش کر رہا ہے۔ سورج کی اپنے اردگرد حرکت خط استوا میں ۲۵ دن و رات میں مکمل ہوتی ہے۔

نظام شمسی میں جس قانون کی رو سے سیارے سورج کے اردگرد گھومتے ہیں اسی قانون کی رو سے وہ سیارے اپنے اردگرد بھی گھومتے ہیں۔ جب اٹلی کے باشندے گیلیلو نے اپنی ایجاد کردہ دوربین کی مدد سے سیاروں کو دیکھا تو اسے معلوم ہوا کہ سیارے اپنے اردگرد گھومتے ہیں۔ اگر اس پر غور کیا جائے کہ جب گیلیلو یہ باتیں اچھی طرح جانتا تھا کہ زمین نظام شمسی کے دوسرے سیاروں کی مانند سورج کے اردگرد چکر لگاتی ہے تو اسے ضرور

یہ خیال آیا ہو گا کہ زمین دوسرے سیاروں کی مانند اپنے اردگرد بھی چکر لگاتی ہے لیکن اس کے اس خیال کا اس کے آثار میں کہیں پتہ نہیں چلتا۔ وہ سائنسدان جس نے عقیدے کی تفتیش کرنے والی تنظیم کے خوف سے زمین کی سورج کے اردگرد گردش کا انکار کیا تھا اس نے اسی تنظیم کے خوف سے زمین کی اپنے اردگرد گردش کا اعتراف نہیں کیا کیونکہ اگر توبہ استغفار کے بعد وہ زمین کی حرکت کے متعلق کوئی بات کرتا (یعنی اس مرتبہ خود زمین کی اپنے اردگرد گردش کے متعلق) تو کوئی بھی اسے زندہ جلائے جانے سے نجات نہ دلا سکتا تھا کیونکہ عقیدے کی تفتیش کرنے والی تنظیم کے اصول کے مطابق اس کی بدنیتی ثابت ہوجاتی۔

گیلیلو نے نہ صرف یہ کہ اپنی زندگی میں زمین کی اپنے اردگرد گردش کے متعلق کوئی بات نہیں کی بلکہ اس نے اپنی تصانیف میں بھی کوئی ایسی تحریر نہیں چھوڑی جس کی مدد سے پتہ چلتا کہ اس نے زمین کی اپنے اردگرد گردش کا سراغ لگایا ہو۔

سولھویں صدی عیسوی میں ڈنمارک میں ایک دوسرا ماہر فلک ہوگزرا ہے جو زمین کی سورج کے اطراف میں گردش کا قائل تھا۔ اس کا نام تیخوبراہہ یا تیکوبراہہ تھا۔ تیکوبراہہ کا شمار ڈنمارک کے اشراف میں ہوتا تھا اور کوپرنیک کے برعکس (جو فقرو فاقہ کی زندگی گزارتا تھا) وہ بڑے جاہ و حشم کی زندگی گزارتا اور اپنے محل میں شاندار دعوتوں کا اہتمام کرتا تھا۔

تیکوبراہہ ۱۶۰۱ء میں فوت ہوا۔ اس کی ستاروں کی تحقیق سے کپلر (جرمن) کو اچھا خاصہ فائدہ پہنچا اور تیکوبراہہ کے بغیر کپلر (جرمن نژاد) سیاروں کے گرد حرکت کے بارے میں اپنے تین قوانین کو ہرگز وضع نہ کرسکتا تھا۔ یاد رہے کہ زمین ان سیاروں میں سے ایک ہے۔

خلاصہ یہ کہ تیکوبراہہ زمین کی اپنے اردگرد حرکت کا سراغ نہیں لگا سکا۔ اگر وہ سراغ لگا لیتا تو جس طرح اس نے زمین کی سورج کے گرد حرکت کا پتہ دیا تھا اسی طرح وہ زمین کی اپنے اردگرد حرکت کی بھی کھلم کھلا تائید کرتا۔

تیکوبراہہ ایک ایسے ملک میں رہتا تھا جہاں عقیدے کی تفتیش کرنے والی تنظیم کا عمل دخل نہ تھا اور اگر وہ زمین کی اپنے اردگرد حرکت کا سراغ لگالیتا تو بغیر کسی خوف و خطرے کے اس کا اظہار کرسکتا تھا۔

کوپرنیک (پولینڈی) اور کپلر (جرمن نژاد) بھی چونکہ عقیدے کی تفتیش کرنے والی تنظیم کی دسترس سے باہر رہتے تھے اس لئے وہ سورج کے اردگرد زمین کی حرکت کا کھلم کھلا اظہار کرسکے۔ اس زمانے میں جب عقیدہ کی تفتیش کرنے والی تنظیم سورج کے اردگرد زمین کی گردش کے نظریہ کے اظہار کی راہ میں سخت رکاوٹ بنی ہوئی تھی' پرہیزگاری کے خلاف اعلانیہ طور پر کتابیں چھپ کر لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ چکی تھیں اور مذکورہ تنظیم نے ان کتابوں پر پابندی نہیں لگائی اور نہ ہی ان کے مصنفین سے چھیڑ چھاڑ کی۔

کپلر (جرمن) جو ۱۹۳۰ء میں فوت ہوا اس نے سیاروں کی حرکت کے متعلق قوانین وضع کئے جس کی وجہ سے اسے نہ صرف اس دور میں سراہا گیا بلکہ آج بھی جو کوئی اس کے تین قوانین پڑھتا ہے اس کی تعریف کرتا ہے۔ اس کے قوانین میں سے ایک قانون یہ ہے کہ زمین سمیت تمام سیاروں کا سورج کے اردگرد گھومنے کا مدار گول نہیں بلکہ بیضوی شکل (۳۶) کا ہے۔ جبکہ کوپرنیک کا خیال تھا کہ یہ راستہ گول ہے اور سورج دو بیضوی کروں میں سے ایک میں واقع ہے۔

اگرچہ کپلر کے تین میں سے ہر ایک قانون کے متعلق بحث اس بات کی متقاضی ہے کہ اب ہم فلکیات کے بارے میں بحث کریں لیکن یہ جانتے ہوئے کہ قارئین اس سے اکتا جائیں گے ہم اسے نظرانداز کر رہے ہیں۔ اس صدی کے دوسرے نصف حصے میں اتنے خلائی سیارے آسمان پر جاچکے ہیں کہ اب یہ معمول بن گیا ہے۔ پہلے قانون کی حقیقت کہ (ہر سیارے کا مدار جس میں وہ سورج کے گرد گھومتا ہے بیضوی ہوتا ہے)۔ اس طرح ثابت ہوچکا ہے کہ جو راکٹ خلا میں بھیجے گئے ہیں انہوں نے بیضوی مدار طے کیا ہے۔ وہ عظیم سائنسدان جس نے فلکیات کے تین قوانین وضع کرکے اپنی ذہانت کا ثبوت فراہم کیا وہ زمین کی حرکت کا سراغ نہ لگا سکا۔ لیکن امام جعفر صادقؒ نے اس سے بارہ صدیاں پہلے ہی معلوم کرلیا تھا کہ زمین اپنے اردگرد گھومتی ہے اور دن اور رات کا باری باری آنا سورج کی زمین کے گرد گردش کی وجہ سے نہیں بلکہ خود زمین کی اپنے گرد گردش کی وجہ سے ہے۔ اس طرح زمین کا نصف حصہ ہمیشہ تاریک اور آدھا حصہ ہمیشہ روشن ہوتا ہے۔

قدیم زمانے کے لوگ جو زمین کے گول ہونے پر یقین رکھتے تھے انہیں معلوم تھا کہ زمین کا آدھا حصہ ہمیشہ تاریک اور آدھا حصہ روشن رہتا ہے۔ لیکن ان کا خیال تھا کہ ایسا سورج کے زمین کے اردگرد چکر لگانے کی وجہ سے ہے۔ یہ کیسے ہوا کہ امام جعفر صادقؒ نے بارہ صدیاں پہلے ہی جان لیا تھا کہ زمین اپنے محور کے اردگرد گھومتی ہے جس کے نتیجہ میں دن رات وجود میں آتے ہیں ؟

پندرہویں، سولہویں اور سترہویں صدی کے سائنسدان جن میں سے چند کا ذکر اس سے پہلے ہوچکا ہے اور جنہوں نے ستاروں کے میکانکی قوانین کا ایک حصہ دریافت کیا تھا۔ وہ یہ جان نہ سکے تھے کہ زمین اپنے محور کے اردگرد گھومتی ہے تو کیسے ؟ امام جعفر صادقؒ نے مدینہ جیسے علمی مرکز سے دورافتادہ شہر میں رہ کر یہ معلوم کرلیا کہ زمین اپنے محور کے اردگرد گھومتی ہے۔

اس دور میں علمی مراکز قسطنطنیہ، انطاکیہ اور گندی شاہ پور میں تھے اور ابھی تک بغداد کو اس قدر اہمیت حاصل نہ تھی کہ وہ مرکز بن سکتا۔ ان مذکورہ مراکز میں سے بھی کوئی یہ معلوم نہ کرسکا تھا کہ زمین اپنے محور کے اردگرد گھومتی ہے اور اسی گردش کے نتیجہ میں دن رات وجود میں آتے ہیں۔

امام جعفر صادقؒ جو اس علمی حقیقت کو سمجھ گئے تھے ان کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ کیا وہ ستاروں کے

میکانکی قوانین سے بھی آگاہ تھے اور قوت جاذبہ (Gravitational Force) سے بھی آگاہی رکھتے تھے یعنی مرکز کی طرف مائل اور گریز کرنے والی قوتوں سے آشنا تھے یا نہیں ؟ (یاد رہے کہ مرکز کی طرف مائل کرنے والی قوت وہ قوت ہے جس کی وجہ سے سیارے اپنے محور کے اردگرد گھومتے ہیں) تو اس ضمن میں ہم یہ بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ چونکہ ان قوتوں کے جانے بغیر کوئی بھی انسان زمین کی اپنے محور کے اردگرد گردش کے متعلق آگاہی حاصل نہیں کرسکتا اس لئے لامحالہ ماننا پڑتا ہے کہ امام جعفر صادقؒ اس بارے میں بھی مکمل آگاہی رکھتے تھے۔

# تخلیق کائنات اور جعفری نظریہ

اگر یہ کہیں کہ امام جعفر صادقؒ کا زمین کی گردش کے بارے میں نظریہ ایک اتفاقی بات تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے بعض اوقات بعض لوگ اندازاً کوئی بات کہہ دیتے ہیں لیکن بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اندازہ صحیح تھا۔ تو یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں ان کے بعد کئی صدیوں تک کوئی بھی ان کی مانند اندازہ نہ لگا سکا کہ زمین اپنے اردگرد گھومتی ہے ؟

امام جعفر صادقؒ نے ستاروں کے میکانکی قوانین کے وجود کے بارے میں اس طرح توجہ دی تھی کہ انہوں نے زمین کی اپنے اردگرد حرکت کو بھی ان قوانین سے اخذ کرلیا تھا اور اگر وہ قوانین کے وجود کی طرف توجہ نہ دیتے تو وہ ہرگز زمین کی اپنے اردگرد گردش کو اخذ نہ کرسکتے کیونکہ زمین کی اپنے محور کے گرد گردش کو قیاس آرائی سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس کے لئے علت سے معلول کی جانب متوجہ ہونا پڑتا ہے۔ لیکن اس شخص نے جس علت کی بنا پر زمین کی اپنے اردگرد گردش کی طرف توجہ دی اس کے متعلق اس نے کوئی بات نہیں کہی۔

اس صورت میں جبکہ اس نے فزکس کے مسائل کے بارے میں ایسی باتیں کہی ہیں جو اس دنیا کے وجود میں آنے کے ضمن میں پیش کئے گئے موجودہ نظریات سے زیادہ مختلف نہیں ہیں اور جب اس زمانے کا ایک طبیعیات دان دنیا کی پیدائش کے بارے میں امام جعفر صادقؒ کی تھیوری پڑھتا ہے تو وہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ ان کی تھیوری موجودہ زمانے کی تھیوری کے مطابق ہے۔ دنیا کی تخلیق کے بارے میں اب تک جو کچھ کہا گیا ہے وہ محض تھیوری ہے یعنی ابھی تک اس بارے میں کوئی ایسا قانون وضع نہیں ہوا جس سے ثابت ہو کہ سائنسدان کسی حتمی نتیجے تک پہنچ چکے ہیں۔

دنیا کی تخلیق کے متعلق امام جعفر صادقؒ نے بھی صرف تھیوری پیش کی ہے جو کہ مروجہ علمی قانون کے زمرے میں نہیں آتی کہ اسے ناقابل تردید حقیقت کے طور پر قبول کیا جا سکے۔ لیکن ان کی تھیوری کو یہ برتری ضرور حاصل ہے اس لئے کہ انہوں نے بارہ صدیاں پہلے جو تھیوری پیش کی تھی وہ موجودہ تھیوری سے مطابقت

رکھتی ہے۔

امام جعفر صادقؑ نے دنیا کی تخلیق کے بارے میں اس طرح اظہار خیال فرمایا کہ دنیا ایک چھوٹے سے ذرے سے وجود میں آئی اور وہ بھی دو متضاد قطبین سے مل کر بنا ہے اور اس طرح مادہ وجود میں آیا۔ پھر مادہ کی مختلف اقسام بن گئیں۔ یہ اقسام مادے میں ذرات کی زیادتی یا کمی کا نتیجہ ہیں۔ اس تھیوری اور آج کی ایٹمی تھیوری (Atomic Theory) میں جو دنیا کی تخلیق کے متعلق ہے ذرا بھی فرق نہیں پایا جاتا اور یہ متضاد دو قطب ایٹم میں دو متضاد چارج یعنی مثبت اور منفی ہیں اور یہی دو چارج ایٹم کی ساخت کا سبب ہیں جبکہ ایٹم سے مادہ وجود میں آیا ہے۔ عناصر کے درمیان جو فرق پایا جاتا ہے وہ عناصر کے ایٹم کے اندر موجود چیزوں کی کمی یا زیادتی کے سبب پایا جاتا ہے۔

گزشتہ صفحات میں ہم بتا چکے ہیں کہ قدیم یونان کے چند فلسفی جو چھٹی اور پانچویں صدی قبل مسیح میں ہوگزرے ہیں انہوں نے دنیا کی تخلیق کے بارے میں ایٹمی نظریہ پیش کیا تھا۔

یہاں یہ بعید نہیں کہ امام جعفر صادقؑ ان یونانی فلاسفہ کے کائنات کی پیدائش کے متعلق نظریہ سے مطلع ہوں اور آپ نے اپنی تھیوری کو ان کے نظریات کی روشنی میں پیش کیا ہو۔

اس بات کا قوی امکان ہے کہ امام جعفر صادقؑ قدیم یونانی فلسفیوں کے نظریئے سے مطلع نہ ہوں' یہ نظریات بھی اسی طرح مدینہ پہنچے ہوں جس طرح جغرافیہ اور علم ہندسہ کی تھیوریز مدینہ میں پہنچی ہیں یعنی قبطی فرقے کے مصری دانشوروں کے ذریعے۔ ہم یہ گمان کرسکتے ہیں چونکہ امام جعفر صادقؑ تخلیق کے بارے میں قدیم یونانی سائنسدانوں کے نظریات سے جو آپ سے بارہ یا تیرہ صدیاں پہلے ہو گزرے ہیں مطلع تھے۔ اسی لئے آپ نے ان کے نظریات کو مکمل کیا اور کائنات کی تخلیق کے متعلق ایک ایسا نظریہ پیش کیا جو آج سائنسدانوں کے لئے قابل قبول ہے اور اب تک کوئی بھی ان سے بہتر نظریہ پیش نہیں کرسکا۔ اس نظریہ میں دو متضاد قطب' سب سے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ اس سے پہلے یونانی فلسفیوں اور اسکندریہ کے سائنسدانوں نے اس بات کا سراغ لگالیا تھا کہ کائنات میں اضداد کا وجود ہے اور ان میں سے بعض کا کہنا تھا کہ ہرچیز کو اس کی ضد سے پہچاننا چاہئے۔ لیکن امام جعفر صادقؑ کی تھیوری ایک ایسی تھیوری ہے جس میں متضاد چیزوں کا ذکر نہایت صراحت سے کیا گیا ہے۔ آپ کے نظریہ میں ایسی صراحت ہے جو نہ تو یونان کے قدیم فلاسفروں کے نظریہ میں پائی جاتی ہے اور نہ اسکندریہ کے علمی مکتب کے سائنسدانوں کے نظریہ میں ملتی ہے۔

یونان اور اسکندریہ کے سائنسدانوں نے متضاد چیزوں کے بارے میں ایسے نظریات پیش کئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے فرار کی راہ باقی رکھی ہے یعنی اگر انہیں یہ معلوم ہو کہ انہوں نے غلطی کی ہے تو وہ اپنے الفاظ واپس لے سکیں۔ یہاں یہ بات عیاں ہے کہ انہوں نے اپنے نظریات اس لئے اس شکل میں پیش کئے

ہیں کہ وہ ان نظریات سے مطمئن نہیں تھے لیکن امام جعفر صادقؑ نے اپنے نظریہ کو صریحاً" اور کسی قید و شرط کے بغیر بیان کیا ہے۔ ان کی تھیوری میں اگر اور لیکن کا وجود نہیں ملتا۔ ان کے نظریئے کی صراحت ثابت کرتی ہے کہ وہ اس بارے میں مطمئن تھے کہ انہوں نے غلطی نہیں کی اور نہ ہی اپنی واپسی کی راہ باقی چھوڑی ہے۔

شیعہ کہتے ہیں کہ جتنی باتیں بھی امام جعفر صادقؑ نے دنیا کے وجود میں آنے اور ستاروں' فزکس' عناصر کیمیا' ریاضیات اور دوسری چیزوں کے بارے میں کہی ہیں' اپنے علم امامت یعنی علم لدنی کی رو سے کہی ہیں۔ جبکہ ایک مورخ امام جعفر صادقؑ کے علم کو علم لدنی نہیں سمجھتا۔ دوسرے یہ کہ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ بظاہر امام جعفر صادقؑ نے پڑھانے سے پہلے خود تعلیم حاصل کی تھی اور اپنے والد گرامی کے درس میں حاضر ہوتے تھے۔

# شیعی ثقافت کی ترویج

امام جعفر صادقؑ نے شیعہ مکتب فکر کی دو طریقوں سے خدمت کی۔ پہلا بنیادی طریقہ یہ تھا کہ شیعوں کے ایک گروہ کو تعلیم دے کر عالم و فاضل بنا دیا۔ یہ بات شیعہ ثقافت کے وجود میں آنے کا سبب ہے۔ شیعہ ثقافت کے وجود میں آنے سے شیعہ مکتب فکر کو تقویت پہنچانے میں کافی مدد ملی اور ہمارا خیال ہے کہ یہ نکتہ کسی توضیح کا محتاج نہیں ہوسکتا کہ ہر معاشرے میں ثقافت ہی اس معاشرے کو مستحکم بناتی ہے اور بعض معاشرے یونان کی مانند اس لئے آج تک باقی ہیں کہ ان کی ثقافت پرکشش ہے ورنہ ان کا شیرازہ بکھرتا جاتا اور ان کے آثار تک آثار تک باقی نہ رہتے۔ امام جعفر صادقؑ سے پہلے کے شیعوں کے دو امام ہو گزرے ہیں جن میں سے ایک امام محمد باقرؑ ہیں جو امام جعفر صادقؑ کے والد گرامی ہیں۔

لیکن یہ دو امام شیعی ثقافت کو وجود میں نہیں لا سکے اور ان کا علم امام جعفر صادقؑ کی مانند نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ انہوں نے شیعہ مکتب کے لئے ثقافت کو وجود میں لانا ضروری نہیں سمجھا۔ امام جعفر صادقؑ نے اپنی پوری کوشش کی کہ شیعہ مکتب ایک روحانی اساس پر استوار ہو تاکہ ایک کے جانے اور دوسرے کے آنے پر یہ مکتب ختم نہ ہو جائے۔

پہلے ہی دن جب امام جعفر صادقؑ نے پڑھانا شروع کیا تو وہ جانتے تھے کہ ان کا مقصد کیا ہے؟ شیعی ثقافت کو وجود میں لانے کا مسئلہ ان کے لئے کوئی ایسا مسئلہ نہ تھا جو بتدریج ان کی سمجھ میں آیا ہو۔ وہ جانتے تھے کہ شیعہ مکتب کو بچانے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ شیعہ مکتب اپنی ثقافت کا حامل ہو۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نہ صرف یہ کہ علمی فہم و فراست رکھتے تھے بلکہ سیاسی بصیرت سے بھی مالامال تھے اور یہ بات جانتے تھے شیعہ مکتب کی تقویت کے لئے ایک ثقافت کا موجود ہونا اس سے کہیں بہتر ہے کہ شیعہ مکتب کے لئے ایک مضبوط فوج تیار کی جائے۔ چونکہ ممکن ہے کہ ایک مضبوط فوج اپنے مقابلے میں زیادہ مضبوط فوج کے ہاتھوں مغلوب ہوجائے لیکن ایک شاندار اور مالامال ثقافت کبھی بھی ختم نہیں ہوتی۔

آپ نے محسوس کیا کہ ثقافت جتنی جلدی فروغ پائے اتنا ہی بہتر ہے اس لئے کہ وہ اسلامی مکاتب فکر کی جن کی ابھی تک کوئی ثقافت نہیں ان کے مقابلے میں شیعی مکتب نہ صرف یہ کہ آگے نکل جائے گا بلکہ اپنی سبقت کی حفاظت بھی کر سکے گا۔

جس زمانے میں امام جعفر صادقؑ شیعہ ثقافت کی ترویج کی طرف متوجہ ہوئے تھے اس وقت تک تو کسی بھی دوسرے اسلامی فرقے کے بانی کو یہ خیال نہیں آیا تھا کہ اس فرقے کی بھی کوئی ثقافت ہونی چاہئے۔ صرف امام جعفر صادقؑ کو یہ احساس ہوا۔

بعد میں آنے والے واقعات نے نشاندہی کی کہ امام جعفر صادقؑ کا نظریہ درست تھا کیونکہ بارہویں امام کے بعد اگرچہ شیعوں کا کوئی اور ایسا مرکز نہیں تھا جس کے گرد وہ جمع ہوتے۔ پھر بھی شیعہ مکتب باقی رہا باوجود اس کے کہ کلیسا کی مانند شیعوں کی کوئی ایسی وسیع تنظیم بھی نہیں تھی جس کا کوئی مستقل روحانی مرکز ہو اور آج جبکہ امام جعفر صادقؑ کے زمانے کو ساڑھے بارہ سو سال گزر چکے ہیں ابھی تک شیعہ مکتب کا کوئی کلیسا یعنی ایسی مرکزی روحانی تنظیم نہیں ہے جو وسیع بنیادوں پر مکتب کو پھیلائے مگر پھر بھی ساڑھے بارہ سو سال گزر جانے کے باوجود اس ثقافت کے طفیل جو امام جعفر صادقؑ شیعہ مکتب کے لئے وجود میں لائے' شیعہ مکتب باقی ہے اور اس بات کے آثار موجود ہیں کہ آئندہ بھی باقی رہے گا۔

یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ امام جعفر صادقؑ کے بعد جو علماء آئے انہوں نے شیعی ثقافت (۳۹) کو فروغ دیا لیکن امام جعفر صادقؑ نے نہ صرف یہ کہ شیعی ثقافت کی عمارت کا پہلا پتھر رکھا بلکہ اس کا ڈھانچہ بھی خود تیار کیا تھا۔

امام جعفر صادقؑ نے شیعی ثقافت کی ترویج کے ساتھ ساتھ شیعہ علماء کو اس کی اہمیت کی جانب بھی متوجہ کیا اور انہیں سمجھایا کہ ہماری ثقافت ہی ہمارے مکتب کی بقاء کی ضمانت دے سکتی ہے۔ لہٰذا ہر شیعہ عالم کو چاہئے کہ وہ اپنی ثقافت کو فروغ دے۔ اگر اس میں کسی چیز کا اضافہ نہ کر سکے تو کم از کم جو کچھ اس تک پہنچا ہے اس کی حفاظت کرے اور اسے لوگوں کے درمیان رائج کرے۔ ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ یہ اہتمام تو صرف شیعہ مکتب کے لئے مخصوص نہیں بلکہ تمام مذاہب کے روحانی پیشواؤں نے ایسا اہتمام کیا ہے توجواب میں عرض ہے کہ دوسرے مذاہب میں روحانی پیشواؤں کا اہتمام مذہبی رسومات تک محدود ہے۔ نہ یہ کہ اس مذہب کی ثقافت کو فروغ دینے تک یونان کے کوہ آتوس پر پہلی آرتھوڈکسی خانقاہ کو تقریباً" پندرہ سو سال ہو چکے ہیں کہ ابھی تک اس خانقاہ مین دوسری خانقاہوں کی طرح وہی کچھ پڑھا اور تلاوت کیا جاتا ہے لیکن شیعہ ثقافت مجموعی اعتبار سے مسلسل فروغ پا رہی ہے۔ اگرچہ بعض ادوار میں اس میں کوئی خاص پیشرفت نہیں ہوئی لیکن جمود کے دور کے بعد وہ نہایت تیزی سے اپنی راہ پر گامزن رہی ہے۔ ہر دوراندیش شیعہ عالم یہ کوشش کرتا رہا ہے کہ شیعی ثقافت میں

کچھ نہ کچھ اضافہ کرے۔ مگر دوسری طرف یہ حال ہے کہ اگر دوسری صدی عیسوی کو انطاکیہ کے آرتھوڈکسی کلیسا کا عظیم الشان دور قرار دیں تو اس زمانے سے لے کر آج تک تقریباً" اٹھارہ سو سال بنتے ہیں اور آرتھوڈکسی مذہب کو قدامت کے اعتبار سے اصل عیسوی مذہب بھی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ان اٹھارہ صدیوں میں آرتھوڈکسی ثقافت میں کسی نے بھی کوئی اضافہ نہیں کیا۔

آج آرتھوڈکسی مذہب کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ وہی ہے جو اٹھارہ صدیاں پہلے انطاکیہ میں اس کے پاس تھا۔ اگرچہ چند مرتبہ آرتھوڈکسی مذہب کی عالمی مشاورتی کمیٹیاں تشکیل دی گئیں اور ساری دنیا سے اسقف حضرات نے ان کمیٹیوں کے اجلاس میں شرکت کی لیکن یہ کمیٹیاں جدید قوانین کو وضع کرنے میں ناکام رہیں اور آرتھوڈکسی ثقافت میں ذرا بھی اضافہ نہ ہوسکا۔ ڈملیل روپس فرانسیسی محقق و مورخ ہے جس نے چند سال پہلے اس دنیا سے کوچ کیا۔ اگرچہ وہ ایک مذہبی رہنما نہ تھا پھر بھی اس نے مسیحیت کی تاریخ کے متعلق کتابیں لکھیں اور کیتھولک مذہب کی ثقافت میں خاطرخواہ اضافہ کیا۔ اس کی کتابیں اتنی ہردلعزیز ہیں کہ کیتھولکی ممالک مثلاً" فرانس، اٹلی اور سپین میں شاید ہی کوئی ایسا گھر ہو جس میں اس کی کتابوں کی کم از کم ایک جلد موجود نہ ہو، ماسوا اس گھر کے جس کے رہنے والے غیر کیتھولک ہوں۔ فرانسیسیوں کے گھروں میں ان کتابوں کے متن فرانسیسی میں اور اٹالین گھروں میں اطالوی زبان میں اور اسپین کےلوگوں کے گھروں ہسپانوی زبان میں ان کتابوں کے متن ملتے ہیں۔

ارنسٹ رنان مشہور فرانسیسی فلسفی جو انیسویں صدی عیسوی میں ہوگزرا ہے اور جس کی "عیسیٰ" نامی کتاب کا شمار دنیا کی بڑی کتابوں میں ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ مذہبی رہنما نہ تھا کیونکہ اسے فلسفی سمجھا جاتا تھا اور اسی لئے کیتھولکی کلیسا کے پیشوا اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھتے تھے مگر پھر بھی اس نے ایک کتاب لکھ کر کیتھولکی مذہب کی ثقافت میں گرانبہا اضافہ کیا۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ آرتھوڈکسی مذہب اور کیتھولکی مذہب دونوں کلیسا سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ دونوں مذہب دولتمند بھی تھے۔

اگرچہ آرتھوڈکسی کلیسا دولتمند نہیں لیکن کیتھولکی کلیسا موجودہ زمانے میں دنیا کا امیرترین انسٹی ٹیوٹ ہے اور کیتھولکی کلیسا (جس کا مرکز روم، واٹیکن ہے) کی کم از کم دولت تخمیناً" ایک لاکھ ملین ڈالر بتائی جاتی ہے۔ دنیا میں کوئی بینک یا انسٹی ٹیوٹ ایسا نہیں ہے جس کے پاس اتنا سرمایہ ہو۔

گزشتہ عصر میں بھی کیتھولکی کلیسا (جس کا مرکز روم تھا) اسی طرح دولتمند تھا چنانچہ وہ دولت کے ذریعے کیتھولکی مذہب کی ثقافت کو فروغ دینے کے لئے اقدامات کرسکتا تھا لیکن اس نے ہزار سال کے دوران اس ضمن میں کوئی قدم نہیں اٹھایا۔

ادھر شیعوں کی نہ تو کوئی مرکزی تنظیم تھی اور نہ ہی ان کے روحانی پیشوا شیعی ثقافت کے فروغ کے لئے

بھی مالی لحاظ سے مستحکم پوزیشن رکھتے تھے کیونکہ ان میں سے بعض کی تنگدستی کافی مشہور ہے۔ پھر بھی وہ شیعی ثقافت کو پر آشوب ادوار کے علاوہ بھی فروغ دینے میں کامیاب رہے۔

آج جب بیسویں صدی عیسوی کا زمانہ ہے اگرچہ اس ضمن میں کام شروع ہوچکا ہے لیکن اس سے پہلے دو بڑے مذاہب یعنی آرتھوڈکسی اور کیتھولکی مذہب والوں نے اپنے مذہب کی توسیع کے لئے کوئی کام نہیں کیا بلکہ ان دو مذاہب کے روحانی پیشواؤں کا مقصد یہ رہا تھا کہ وہ مذہبی رسومات کی حفاظت کریں۔ گویا وہ بدعت کے خوف سے مذہبی ثقافت میں توسیع سے بچتے رہے۔ حالانکہ مذہبی ثقافت میں ضروری توسیع بدعت نہیں اس لئے کہ پندرھویں صدی سے لے کر آج تک کیتھولک مذہب کی ثقافت کو فروغ دلانے کے لئے جو اقدامات کئے گے ہیں کو ان سے کسی قسم کی کوئی بدعت وجود میں نہیں آئی۔

ایک ہزار سال تک کیتھولکی پیشواؤں کی یہ فطرت بنی رہی کہ انہوں نے مذہبی ثقافت کی توسیع کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا اور وہ اپنی فطرت کو نہیں بدل سکے جس طرح آرتھوڈکسی پیشوا اپنی فطرت کو تبدیل نہیں کرسکے۔

جدید عصر جو کیتھولکی مذہب کی ثقافت میں پندرھویں صدی عیسوی سے شروع ہوا ہے' ساتویں صدی عیسوی اور دوسری صدی عیسوی میں امام جعفر صادقؑ کی طرف سے شیعہ مذہب میں اس کا آغاز ہوا۔ امام جعفر صادقؑ اس کوشش میں کامیاب ہوئے کہ وہ شیعہ مفکرین اور دانشوروں کے ذہن میں یہ بات ڈالیں کہ جو کوئی جس حد تک شیعی ثقافت میں توسیع کرسکتا ہے کرے' کیونکہ شیعہ مکتب کی بقا کی ضامن صرف اس کی ثقافت ہے۔ امام جعفر صادقؑ کے زمانے میں شیعوں کی حالت یہ تھی کہ وہ طاقت کے بل بوتے پر اثر و رسوخ پیدا نہیں کرسکے تھے۔ عرب میں اور اس کے باہر شیعہ چھوٹے چھوٹے قبیلوں میں رہتے تھے اور بعض جگہوں پر وہ نہایت محدود تعداد میں تھے۔ ان میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ اموی حکمرانوں پر غالب آئیں اسی لئے امام جعفر صادقؑ نے جب دیکھا کہ شیعوں کے پاس سیاسی طاقت نہیں ہے اور حالات بھی ایسے ہیں کہ وہ جلد سیاسی قوت نہیں پکڑ سکتے۔ لہٰذا شیعہ مکتب کی توسیع اور لوگوں کو اس کی طرف راغب کرنے کا ایک ہی راستہ تھا یعنی ثقافت کو تقویت پہنچانا اور آئیڈیالوجی (Idealogy) کی بنیادیں مضبوط کرنا۔ چونکہ ابھی تک کسی اسلامی فرقے نے اپنی مذہبی ثقافت کو فروغ دینے اور نظریاتی بنیاد کو استوار کرنے کی طرف توجہ نہیں دی تھی لہٰذا وہ جو دوسروں پر سبقت لے جاتا وہ اپنی ترقی کو محفوظ کرلیتا۔

امام جعفر صادقؑ شیعہ مکتب کے لئے کلیسا تو نہ بنا سکے کیونکہ عرب تنظیم تشکیل دینے کا ذوق نہیں رکھتے تھے۔ البتہ اس کے بدلے میں انہوں نے اس مذہب کے لئے ایک اکیڈمی ضرور بنا دی۔ عیسائی جنہوں نے کلیسا بنایا تھا انہوں نے تنظیم بنانے کا ذوق رومیوں سے حاصل کیا تھا' اس لئے کہ قدیم رومی قوانین وضع کرنے اور

تنظیم تشکیل دینے کا ذوق رکھتے تھے۔ چنانچہ دو کلیسا یعنی آرتھوڈکسی اور کیتھولک' قدیم روم کی تنظیم کی روح سے ہی وجود میں آئے تھے۔

جس ثقافت کی بنیاد امام جعفر صادقؑ نے شیعہ مذہب کے لئے رکھی وہ ایک ایسی اکیڈمی میں تبدیل ہوگئی جس میں آزادانہ طور پر علمی مسائل اور خصوصاً" آئیڈیالوجی و نظریاتی موضوعات پر گفتگو ہوتی تھی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ کوئی بھی ایسا اسلامی فرقہ نہیں جس میں شیعہ مکتب کی ثقافت کی مانند آزادی بحث ہو اور اس ثقافت کو امام جعفر صادقؑ وجود میں لائے تھے۔

اکیڈمی' ایتھنز کے نزدیک ایک باغ تھا جہاں افلاطون پڑھاتا تھا اور اس کے بعد اس کے شاگرد اس باغ میں مطالعہ کرتے تھے۔ یہ باغ (اکیڈمی) ہزار سال تک تحقیق کی بنیاد پر ۳۸۷ ق م سے ۵۹۲ عیسوی تک یعنی ۹۷۹ سال تک علمی مطالعات کا مرکز تھا۔ لیکن جس وقت بیزانس کا شہنشاہ ژوس ٹی ٹین یہاں پر قابض ہوا تو اس نے اس علمی مرکز کی حیثیت ختم کردی۔ یہی وہ ژوس ٹی ٹین تھا جس نے کلیسا یا صوفیہ استنبول میں بنوایا جو اب تک مسجد کی شکل میں موجود ہے۔ اس نے شہریت کے قوانین کا ایک کتابی مجموعہ بھی تیار کیا تھا جو آج بھی "ژوس ٹی ٹین کوڈ" کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ اس اکیڈمی میں چونکہ ایسے دروس پڑھائے جاتے تھے جو ژوس ٹی ٹین کے عقیدے سے متصادم ہوتے تھے اس لئے اس نے یہ علمی مرکز بند کردیا تھا۔

# شیعی ثقافت کی اہمیت اور آزادی

امام جعفر صادقؑ شیعہ مکتب کے لئے جس ثقافت کو سامنے لائے وہ اس زمانے کی دوسری مذہبی ثقافتوں کی نسبت اس لحاظ سے ممتاز حیثیت کی حامل تھی کہ اس میں بحث کی آزادی تھی اور اسی وجہ سے اس ثقافت میں توسیع ہوئی اور اسے فروغ حاصل ہوا۔

گزشتہ صفحات میں ہم نے ذکر کیا کہ کیتھولک مذہب کی ثقافت تقریباً" ایک ہزار سال تک جمود کا شکار رہی۔ اسی لئے آج کے آرتھوڈکسی مذہب کی ثقافت اور دوسری صدی عیسوی میں انطاکیہ میں اس مذہب کی جو ثقافت تھی ان کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

لیکن شیعہ مکتب کو امام جعفر صادقؑ نے ایسے خطوط پر استوار کیا کہ ابھی دوسری صدی ہجری اختتام کو نہیں پہنچی تھی کہ اس میں توسیع ہوگئی تھی۔

شیعی ثقافت کا دامن نہ صرف یہ کہ خود وسیع ہوتا گیا بلکہ تمام اسلامی فرقوں کے لئے مباحثات میں کسی حد تک آزادی کے قائل ہونے کی بناء پر ایک مثالی نمونہ ثابت ہوئی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مذہب کے بارے میں بحث کی آزادی' اسکندریہ کے علمی مکتب میں شروع ہوئی' جبکہ ایسا نہیں ہے۔ اس لئے کہ اگرچہ اسکندریہ کے علمی مکتب میں فلسفہ کے بعد علم نجوم' فزکس' کیمیا' طب' فارمیسی اور کسی حد تک میکانکس کے بارے میں توجہ یا رغبت کا اظہار کیا جاتا تھا لیکن مذہب کے بارے میں دلچسپی اور آزادی کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔

اگرچہ اسکندریہ کے علمی مکتب کے سائنسدانوں کا ایک گروہ یہودی یا عیسائی تھا لیکن انہوں نے مسائل کو کبھی علمی مباحث میں داخل نہیں کیا۔ چونکہ اسکندریہ کا علمی مکتب سیکولر شمار ہوتا تھا لہٰذا یہ علمی مکتب مذہبی بحثوں میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔

ہمیں معلوم ہے کہ اسکندریہ کے علمی مکتب کا آغاز اسکندریہ کی لائبریری سے ہوا۔ ہمیں یہ بھی پتہ ہے کہ اسکندریہ کا کتابخانہ بطلیموس اول یعنی مصر کے بادشاہ نے قائم کیا۔ یہ بادشاہ ۲۵۸ قبل مسیح میں فوت ہوا۔ یہاں اس بات کا تفصیلاً" ذکر ضروری نہیں ہے کہ سلسلہ بطالیہ کے بادشاہوں نے ۱۵۰ سال مصر پر حکومت کی۔ ان کا پہلا بادشاہ بطلیموس اول تھا جو یونانی الاصل تھا اور یہ بادشاہ یونان کے خداؤں کی پرستش کرتا تھا۔

لیکن مصر کے بادشاہ ہونے کے باوجود ان کا مذہبی عقیدہ اسکندریہ کے علمی مکتب کی بحثوں کا موضوع نہ بنا۔ وہ پہلا دانشور جو اسکندریہ کے علمی مکتب سے باہر آیا اس کا نام شکاک تھا جو پیرون کے نام سے مشہور ہوا۔ گو پیرون مستقل طور پر اسکندریہ کا باسی نہیں تھا لیکن اس علمی مکتب کے تربیت یافتہ لوگوں میں سے ضرور تھا۔ اس مکتب نے اسے متاثر بھی کیا اور اسے شکی المزاج بھی بنا دیا۔ اسی لئے اس نے کہا تھا کہ جس طرح یہ امر محال ہے کہ ایک نظریہ پیش کیا جائے اور اس کو کسی دوسرے نظریہ کے ذریعے مسترد نہ کیا جاسکے' اسی طرح یہ کہنا بھی محال ہے کہ دنیا میں کہیں سچائی کا بھی کوئی وجود ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اسکندریہ کے مکتب نے پیرون کو جس نے ۲۷۰ قبل مسیح میں نوے سال کی عمر میں اس جہان فانی کو الوداع کہا' شکی المزاج نہیں بنایا بلکہ شک و شبہ کا مادہ شروع ہی سے پیرون کے اندر موجود تھا۔ چنانچہ اسکندریہ کےاس مکتب میں علمی بحث کی آزادی کی وجہ سے اس کے شک و شبہ کو تقویت ملی۔ یہاں تک کہ پیرون مکمل طور پر حقیقت کے وجود کا منکر ہوگیا۔ اگر مصر کے سلسلہ بطالیہ کے بادشاہوں کا دین اسکندریہ کے مکتب میں داخل ہوتا تو پیرون اتنی دیدہ دلیری سے ہر حقیقت پر شک کا اظہار نہ کرسکتا۔ چونکہ بطالیہ بادشاہوں کے مذہب میں یونانی خداؤں کا وجود ایک ایسی حقیقت تھا جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی۔ اس مقام پر ہمارا مقصد پیرون کے فلسفہ پر بحث کرنا نہیں کیونکہ اس طرح ہم اپنے اصلی مقصد سے ہٹ جائیں گے۔ بلکہ ہمارے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اسکندریہ کے علمی مکتب میں مذہبی بحث نہیں ہوتی تھی کیونکہ وہ مکتب علمی بحثوں کے لحاظ سے سیکولر تھا۔

بحث کی آزادی اس وقت شروع ہوئی جب امام جعفر صادقؑ نے شیعی ثقافت کی مذہبی مسائل میں بنیاد رکھی۔ اس ثقافت میں مذہبی بحثیں' عام علمی مباحث میں داخل ہوئیں اور صدیوں بعد نوبت یہاں تک پہنچی کہ شیعہ مذہب کے دانشور اس مذہب کو علمی قوانین کے ذریعے ثابت کرنے لگے۔

شیعہ مکتب کی اس ابتدا کا اثر دوسرے مذاہب پر بھی پڑا اور وہ بھی اپنے مذاہب کو علمی دلائل کے ذریعے ثابت کرنے لگے۔ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت موسیٰؑ کے مذاہب کی طرح جب دین اسلام آیا تو اس نے کسی دوسری چیز پر تکیہ کئے بغیر علمی دلائل کے ذریعے اپنی حقانیت کو ثابت کرنے کا آغاز کیا۔ آج جبکہ دین موسیٰؑ کو تیس صدیاں' دین عیسیٰؑ کو بیس صدیاں اور اسلام کو چودہ سو سال گزر چکے ہیں' اہل بصیرت گروہ کا عقیدہ ہے کہ دین کا علمی استدلال سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس کا تعلق قلب و نظر سے ہے نہ کہ علم سے۔

تمام آرتھوڈکس مذہبی پیشوا اس نظریہ کے حامی ہیں اور کیتھولکی مذہبی پیشواؤں کی اکثریت دین کو علم سے جدا کرنے کی قائل ہے۔ البتہ اس مفہوم میں نہیں کہ دین ایک ایسا نظریہ نہیں جسے علم کے ذریعے ثابت نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس مفہوم میں کہ جب بھی احکام دین عام استدلال سے ثابت نہ ہوں تو یہ دین کے ناقص ہونے کی دلیل نہیں ہوگا۔ کیونکہ عیسائی مذہب کا سرچشمہ عشق ہے نہ کہ علم۔ دوسرے الفاظ میں اس مذہب کا سرچشمہ عشق ہے نہ کہ عقل۔ اسی وجہ سے عیسائی مذہب کے مدارس جن کو انگریزی میں سیمری (۴۰) اور فرانسیسی میں سیمیر کہا جاتا ہے ان میں علوم نہیں پڑھائے جاتے تھے کیونکہ دین کا سرچشمہ علم نہیں۔

قرون وسطیٰ میں کلاسیکل مذہبی دروس کے علاوہ عیسائی فقہ کو بھی مذکورہ مدارس کے دروس میں قانون (۴۱) کے نام پر داخل کیا گیا اور ابھی تک عیسائی مذہب کے مدارس میں خصوصاً کیتھولک مذہب کے مدارس میں قانون پڑھایا جاتا ہے۔

لہذا عیسائی مذہب کے مدارس میں جو دوسرا علم پڑھایا جاتا ہے وہ علم قانون یا قانون مذہبی ہے۔ قرون وسطیٰ کے دوران فزکس' کیمسٹری' نجوم' حساب' ہندسہ' طب اور میکانکس عیسائی مذہب کے مدارس میں نہیں پڑھائے جاتے تھے۔ نیز فلسفہ بھی نہیں پڑھایا جاتا تھا کیونکہ فلسفہ پڑھانے کو عیسائی مذہب کے مدارس میں سودمند نہیں سمجھا جاتا تھا۔

شیعہ ثقافت جسے امام جعفر صادقؑ نے رائج کیا' ایسا پہلا مکتب ہے جس میں مذکورہ بالا علوم پڑھائے جاتے تھے۔ امام جعفر صادقؑ خود ان علوم کو پڑھاتے تھے۔ علاوہ ازیں فلسفہ کی تدریس سے بھی پہلوتہی نہیں کی جاتی تھی۔ جس فلسفہ کی امام جعفر صادقؑ تدریس کرتے تھے وہ اس کلاسیکل فلسفہ کی اطلاعات پر مشتمل تھا جو اس وقت تک مدینہ تک پہنچ چکی تھیں۔

جس زمانے میں امام جعفر صادقؑ فلسفہ پڑھاتے تھے اس زمانے تک یونانی حکماء کی کتابوں کا سریانی زبان سے

عربی زبان میں بامحاورہ ترجمہ (۴۲) نہیں ہوا تھا۔
باور کیا جاتا ہے کہ یونانی حکماء کے فلسفیانہ نظریات بھی مصر کے راستے بعض قبطی دانشوروں کے ذریعے جو ابھی اسکندریہ کے آزاد بحث والے مکتب کے پیرو تھے' مدینہ میں امام جعفر صادقؑ تک پہنچے۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ وہ بظاہر مکتب اسکندریہ کے آزاد بحث کرنے والے مکتب کے پیروکار تھے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ تمام قبطی مذہبی پیشوا فلسفے میں دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ یہ لوگ آرتھوڈکس عیسائی مذہب کے پیروکار تھے اور اسی مذہب کی پیروی کرتے ہوئے فلسفہ کو مضر خیال کرتے تھے۔ بہرکیف قبطی علماء کی تعداد جو فلسفے سے دلچسپی رکھتی تھی کچھ زیادہ نہ تھی اور ان کی توصیف کے ساتھ ہم اندازاً" کہہ سکتے ہیں کہ فلسفہ ان کی وساطت سے مدینے پہنچا۔ اسلام میں امام جعفر صادقؑ سے پہلے کسی استاد نے بھی فلسفے کو اپنے دروس میں باقاعدہ داخل نہیں کیا۔ جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعد میں فلسفہ شیعہ میں اور دوسرے اسلامی فرقوں کے مدارس کے درسی مواد میں شامل ہوگیا۔ اس کی ابتدا کا سہرا امام جعفر صادقؑ کے سر ہے۔
امام جعفر صادقؑ کے دروس فلسفیانہ مباحث' سقراط' افلاطون اور ارسطو کے فلسفیانہ نظریات پر مشتمل تھے۔ چونکہ امام جعفر صادقؑ فلسفے کی تدریس کے بانی تھے لہذا آپ کے بعد آنے والے ادوار میں شیعہ مدارس میں فلسفے کی تدریس کا رواج پڑ گیا۔ سارے اسلامی فرقوں میں فلسفہ پڑھایا جاتا تھا لیکن اتنا عام نہیں تھا۔ یہی بات ثابت کرتی ہے کہ فلسفہ شیعی ثقافت سے خاص تعلق رکھتا ہے۔ آج بھی شیعی ثقافت کے علاوہ دوسرے اسلامی فرقوں میں فلسفہ پر توجہ نہیں دی جاتی بلکہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ مذہب پر اثرانداز نہیں ہوتا۔ گزشتہ صفحات میں ہم نے اشارہ کیا ہے کہ امام جعفر صادقؑ عرفان بھی پڑھاتے تھے۔ آپ کا عرفان' مشرق کے عرفان اور مکتب اسکندریہ کے عرفان سے متعلق تھا لیکن آپ ان دونوں مکاتب سے ایک جدید عرفانی مکتب وجود میں لائے جسے آپ کے پیروکار جعفری عرفان کا نام دیتے ہیں۔ جعفری عرفان اور مشرقی یا مکتب اسکندریہ کے عرفان میں یہ فرق ہے کہ جعفری عرفان میں دنیاوی امور کے ساتھ ساتھ اخلاقی امور اور تزکیہ نفس کی مانند اہم امور پر بھی توجہ دی جاتی ہے۔
امام جعفر صادقؑ نے اپنے عرفان میں صرف اخروی امور پر اکتفا نہیں کیا بلکہ دنیاوی امور کے ساتھ اخلاق و تزکیہ نفس پر بھی توجہ دی۔ گویا انہوں نے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ جو کوئی دنیوی امور' اخلاق و تزکیہ نفس کے میدان میں جدوجہد کرے گا اسے آخرت میں اس کی اچھی جزا ملے گی اس لئے کہ اس دنیا کی زندگی ایک کھیتی کے مانند ہے کہ جو کچھ یہاں بوئیں گے دوسری دنیا میں وہی کاٹیں گے۔ جنہوں نے اس دنیا میں اپنے دنیوی اور اخلاقی فرائض ادا کئے ہیں انہیں دوسری دنیا میں اپنے متعلق خوف و خطر نہیں ہونا چاہئے اور انہیں اس بارے میں فکر نہیں کرنا چاہئے کہ انہوں نے آخرت کے لئے توشہ مہیا نہیں کیا۔ جعفری عرفان میں دوسرے

مکاتب فکر کی مانند نہ تو مبالغہ آرائی ہے اور نہ ہی خالق و مخلوق کی وحدت پائی جاتی ہے۔ آپ کے عرفان میں اگر انسان نیکوکار ہوگا تو خدا کے قریب ہوجائے گا لیکن اس سے ملحق نہیں ہوگا کیونکہ مخلوق خالق سے ملحق نہیں ہوسکتی۔ اس بات کا امکان ہے کہ مخلوق اور خالق کے درمیان فاصلہ کم ہو جائے لیکن یہ فاصلہ مکمل طور پر ختم نہیں ہوسکتا۔ (۴۳)

امام جعفر صادقؑ کے حلقہ دروس میں آزادانہ اظہار خیال کیا جاتا تھا' یہاں تک کہ ہر شاگرد استاد کے نظریئے کو مسترد بھی کرسکتا تھا۔امام جعفر صادقؑ نے اپنا نظریہ شاگردوں پر ٹھونسا نہیں بلکہ انہیں آزادی تھی کہ استاد کے نظریئے کو قبول کریں یا مسترد کریں۔

امام جعفر صادقؑ کے درس کا اثر تھا کہ شاگرد آپ کے نظریئے کو قبول کرلیتے تھے۔ جو لوگ امام جعفر صادقؑ کے حلقہ درس میں حاضر ہوتے تھے انہیں علم تھا کہ مادی لحاظ سے ان کا درس سودمند نہیں بلکہ شہرمدینہ کے باہر ایک عرصہ تک اگر کوئی شخص اپنے آپ کو امام جعفر صادقؑ کے مریدوں میں سے ظاہر کرتا تو ممکن تھا کہ اس کی جان خطرے میں پڑ جائے کیونکہ اموی حکام امام جعفر صادقؑ کے مریدوں کو مخاصمانہ نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اگرچہ انہیں معلوم تھا کہ ان میں اس دور میں دشمنی کرنے کی جرات نہیں لیکن پھر بھی ان کا خیال تھا کہ یہ لوگ پہلی فرصت میں اپنی دشمنی کو ظاہر کردیں گے۔

جو لوگ امام جعفر صادقؑ کے حلقہ درس میں شریک ہوتے تھے انہیں بخوبی علم تھا کہ وہ کسی عہدے پر فائز نہیں ہوسکتے تھے کیونکہ امام جعفر صادقؑ اموی حکام و خلیفہ کی مانند دنیوی منصب پر براجمان نہیں تھے کہ اپنے مریدوں اور شاگردوں کو کوئی رتبہ دیتے۔ وہ لوگ جانتے تھے کہ جب امام جعفر صادقؑ خود مال و متاع نہیں رکھتے تو وہ دوسروں کو کیسے نوازیں گے ؟

جو چیز امام جعفر صادقؑ کے شاگردوں کو ان کے درس کی طرف کھینچ لاتی تھی وہ آپ کی قوت کلام اور آپ کی گفتگو پر ایقان تھا۔ چونکہ امام جعفر صادقؑ جو کچھ فرماتے تھے اس پر ان کا ایمان ہوتا تھا اس لئے آپ کے کلمات آپ کے شاگردوں پر اثر کرتے تھے۔

امام جعفر صادقؑ جو کچھ کہتے تھے اس پر ان کا ایمان تھا لہٰذا اپنی زندگی میں سولہویں صدی عیسوی کے بعد کی صورتحال سے جسے ایتھوپیا (۴۴) سے موسوم کیا جاتا ہے' میں دخل نہیں دیا۔

آپ نے اپنے شاگردوں کو ہرگز ایک ایسی آئیڈیل حکومت کے قیام کی جانب راغب نہیں کیا جسے عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکتا تھا۔ جس زمانے میں آپ کے والد گرامی درس دیتے تھے' وہ شاگرد جو امام محمد باقرؑ سے حلقہ درس میں حاضر ہوتے تھے وہ دنیوی منصب تک پہنچنے اور قاضی بننے کے امیدوار ہوتے تھے۔

چونکہ ولید بن عبدالملک اموی خلیفہ نے اس بات سے اتفاق کیا تھا کہ جو لوگ آج کی اصطلاح میں فارغ

التحصیل ہوں گے ان میں سے چند لوگوں کو جج منتخب کیا جائے گا۔
لیکن جو لوگ امام جعفر صادقؑ کے حلقہ درس میں شریک ہوتے تھے وہ اس بات کے امیدوار نہیں ہوتے تھے اور صرف معرفت کے حصول کے لئے علم حاصل کرتے تھے۔
عربوں کے مصر میں داخل ہونے اور مکتب اسکندریہ کے خاتمے سے پہلے مکتب اسکندریہ (۴۵) اور مکتب امام جعفر صادقؑ دونوں میں اظہار خیال کی آزادی ہوتی تھی لیکن ان دونوں مکاتب میں یہ فرق تھا کہ مکتب اسکندریہ میں مذہبی بحث درمیان میں نہیں لائی جاتی تھی جبکہ امام جعفر صادقؑ کے درس میں مذہب پر بحث ہوتی تھی اور شاگردوں کو اس بات کی اجازت تھی کہ وہ استاد کے مذہبی نظریات پر بھی تنقید کریں۔
اس آزادی بحث کا اثر تھا کہ شیعی ثقافت طاقتور اور وسیع ہوتی گئی۔ اس لئے کہ اس میں زبردستی نہیں تھی اور جو شخص اسے قبول کرتا وہ صدق دل سے قبول کرتا تھا۔ چونکہ اس ثقافت میں جبرو اکراہ نہیں تھا اس لئے جو کوئی اسے قبول کرتا وہ مادی مفاد یا شان و شوکت کے لئے نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں سے مذہب شیعہ کا گرویدہ ہونے کے باعث اسے قبول کرتا تھا۔
مشرقی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ صفوی دور سے پہلے مشرق میں کوئی شیعہ سلطنت نہیں تھی۔ اگرچہ آل بویہ سلاطین نے شیعہ مذہب کو پھیلانے کے لئے اقدامات کئے لیکن انہوں نے جبرو اکراہ سے کام نہیں لیا بلکہ شیعی ثقافت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جس میں کربلا کے اکسٹھ ہجری کے واقعات کا ذکر بھی ہوتا تھا' اس مذہب کی تبلیغ و اشاعت کرتے تھے۔
آل بویہ کے شیعہ سلاطین کی کوئی مستقل حکومت دیکھنے میں نہیں آئی البتہ اس کے بعد صفویوں نے مضبوط حکومت کی بنیاد ڈالی۔
بہرکیف شیعہ مذہب' مشرقی ممالک میں ان ادوار کی حکومتوں کی مخالفت کے باوجود ترقی کرتا رہا اگرچہ اس کی ترقی اتنی تیز نہیں تھی پھر بھی چونکہ ایک مضبوط اور وسیع ثقافت کا حامل تھا لہٰذا سینکڑوں سال تک سلاطین اور حکام کی دشمنی کے مقابلے میں پائیدار رہا حالانکہ حکومت و طاقت نہ ہونے کے علاوہ اس کے پاس مادی وسائل کی بھی کمی تھی۔ بعض اقوام ایسی گزری ہیں جو صدیوں تک بغیر حکومت کے زندہ رہیں حالانکہ ان کے ساتھ مسلسل دشمنی کا برتاؤ کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ قومیں مادی وسائل رکھتی تھیں مثلاً" قرون وسطیٰ کے یہودی جن سے نہ صرف عام لوگ بلکہ حکام حتیٰ کہ بعض سلاطین بھی ان سے قرض لیتے تھے۔ اور چونکہ مادی لحاظ سے وہ ان کے محتاج ہوتے تھے لہٰذا انہیں آزار نہیں پہنچاتے تھے اور قرون وسطیٰ میں یورپ کے بعض شہروں کے محلوں میں یہودی الگ زندگی گزارتے تھے۔
امام جعفر صادقؑ کے ہزار سال بعد جب خطہ یورپ نے قرون وسطیٰ کی تاریکیوں سے نجات پائی اور اس خطے

کے لوگوں کے نظریات میں جلا آئی تو پھر بھی لاطینی یورپ کے ممالک مثلاً" فرانس' اٹلی' سپین اور پرتگال میں یہ حالت تھی کہ جب کوئی شخص کیتھولکی مذہب کی فروعات پر تنقید کرتا تو اسے انتہائی سخت سزا دی جاتی تھی چہ جائیکہ وہ مذہب کے اصول پر تنقید کرتا۔ برونوایک اٹالین پادری تھا۔اس شخص کو ۱۶۰۰ء میں اس لئے جلا ڈالا گیا کہ یہ اصول و فروع کے لحاظ سے کیتھولکی مذہب سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ برونو نے کہا تھا کہ عقل آ جانے کے بعد دنیا اور زندگی کے بارے میں انسان وہ عقیدہ اپنالیتا ہے جو عقل و فہم کے مطابق ہو۔

یہی سادہ اور آسان فہم عقیدہ اسے زندہ جلانے کا باعث بنا جس وقت برونو کو جلایا گیا اس کی عمر باون سال تھی اور جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا اس وقت سے اسے مرتد قرار دینے اور جیل بھیجنے تک وہ بغیر کسی مبالغے کے محتاجوں کی مدد اور بیواؤں کی دستگیری اور بیماروں کے علاج معالجے کی طرف توجہ دیتا رہا۔

جیسا کہ چیونٹی کی سب سے بڑی خوشی اور لذت یہ ہے کہ اپنی غذا دوسری کو دے دیتی ہے اور خود بھوکی رہتی ہے۔

جیور دانو برونو کو بھی اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالنے اور دوسروں کو آرام پہنچانے میں خوشی محسوس ہوتی تھی۔ جس دن برونو ڈومیکی مذہبی فرقے کا روحانی پیشوا بنا اس وقت سے جیل جانے تک ایک بھی دن ایسا نہیں گزرا کہ کوئی حاجت مند اس کے ہاں آیا ہو اور برونو نے اسے ناامید واپس بھیج دیا ہو۔ وہ جہاں رہتا اس کا گھر ہمیشہ کھلا رہتا یہاں تک کہ راتوں کو بھی اس کے گھر کا دروازہ کھلا رہتا اور جب کبھی کوئی حاجت مند رات کو اس کے گھر آتا برونو نیند سے بیدار ہو کر اپنی استطاعت کے مطابق اس کی حاجت روائی کرتا۔

وکٹر ہیوگو اپنی کتاب "لے میزرابل" میں "بین ونو" نامی ایک نیک عیسائی کی زبانی برونو کی توصیف کے ضمن میں لکھتا ہے کہ جس دن برونو کو ایک بڑے میدان میں جلانے کے لئے لایا جارہا تھا تمام مسلح افواج جس قدر بھی لائی جا سکتی تھیں میدان میں جمع کی گئیں تاکہ تماشائیوں اور برونو کے درمیان فاصلہ رکھا جاسکے' وکٹر آگے چل کر مزید لکھتا ہے کہ جونہی برونو کو لائے اور اسے تیر کا نشانہ بنایا گیا تو تمام تماشائی دھاڑیں مار مار کر رونے لگے ادھر جلاد جس کے پاس جلتی ہوئی مشعل تھی اس نے اسے جیل سے لکڑی کے انبار کے نزدیک کردیا تاکہ لکڑی کا انبار فوراً" آگ پکڑ سکے اور وہ شخص جس نے اپنی زندگی محتاجوں اور دردمندوں کی خدمت کے لئے وقف کر دی تھی دردناک آہوں اور سسکیوں کے درمیان دم توڑ گیا اور اس کے گوشت کی بو فضا میں پھیل گئی۔ اس کی ساری عمر کی نیکوکاری اسے دردناک موت سے نہ بچا سکی۔

اگرچہ آج ہمارے خیال کے مطابق برونو نے جو کچھ کہا وہ منطقی اور قابل قبول ہے لیکن سولہویں صدی عیسوی کے آخر میں عقیدے کی تفتیش کرنے والی تنظیم نے برونو کے اظہار خیال کو عیسیٰؑ کی ذہانت کی مخالفت قرار دیا اور اس کا فیصلہ اس طرح دیا کہ ہر عیسائی کو بالغ و عاقل ہونے کے بعد دنیا کے متعلق "عہد عتیق اور عہد

جدید" (دو کتابوں) کے مطابق عمل کرنا چاہئے نہ کہ اپنی عقل وفہم کے مطابق اور چونکہ برونو نے کہا ہے کہ آدمی اپنی عقل وفہم کے مطابق دنیاوی فیصلے کرتا ہے لہٰذا وہ مرتد ہے اور اس کے ارتداد کی وجہ شیطان کا اس کے جسم میں حلول کر جانا ہے پس اسے جلانا چاہئے تاکہ شیطان اس کے جسم سے خارج ہو۔

لیکن شیعہ ثقافت میں مختلف مسائل کے متعلق اس قدر آزادی سے بحث کی جاتی ہے کہ تیسری صدی ہجری کے پہلے دور میں ابن راوندی جیسا انسان اسلامی دنیا میں نمودار ہوا۔

## ابن راوندی کا تعارف و کردار

احمد بن یحیٰی بن اسحاق راوندی جو کاشان اور اصفہان کے درمیان قصبہ راوند کا رہنے والا تھا۔ راوند ایک بڑا قصبہ تھا جس میں ایک مدرسہ بھی تھا اور احمد بن یحیٰی المعروف بہ ابن راوندی نے اس قصبے میں ابتدائی تعلیم پائی اور مزید تحصیل علم کے لئے رے (شہر) کا رخ کیا اس کا رے کی طرف جانا اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ ابھی تک اصفہان جو بعد میں مشرق کے دارالعلوموں میں سے ایک قرار پایا اس وقت علمی حیثیت کا حامل نہیں تھا وگرنہ ابن راوندی اصفہان جاتا جو اس کے زیادہ نزدیک پڑتا تھا اور اس زمانے میں جبکہ موجودہ زمانے کی مانند رابطے کے تیز رفتار ذرائع نہیں تھے ایک طالب علم کے لئے مکتب کا نزدیک ہونا خاصی اہمیت رکھتا تھا۔

بہرکیف ابن راوندی تحصیل علم کے لئے رے گیا اور وہاں حصول علم میں ایسی کامیابی حاصل کی کہ اس نے تمام استادوں کو حیرت میں ڈال دیا اس کے استاد اس کی تعریف کرنے لگے ہمیں افسوس ہے کہ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس نے رے کے کس مدرسے میں تعلیم حاصل کی اور وہاں اس کے استاد کون تھے؟ اس نے انیس یا بیس سال کی عمر میں اپنے زمانے کے تمام علوم سیکھ لئے اور کوئی ایسا علم باقی نہ رہا جس سے وہ آگاہ نہ ہوتا۔ وہ واجبات دینی پر بھی بھرپور توجہ دیتا تھا اس نے اپنی پہلی کتاب رے میں تعلیم کے دوران "الابتدا والاعادہ" کے نام سے لکھی اس کتاب میں وہ اپنی دوسری کتاب جسے اس نے الاسماء والاحکام کے نام سے موسوم کیا اس نے اپنے کٹر مسلمان ہونے کی نشاندہی کی ہے لیکن ان کے بعد ایسی کتب لکھیں جن میں اس نے نہ صرف فروع دین اسلام کو تنقید کا نشانہ بنایا بلکہ اصول دین پر بھی حملہ کیا۔

اس نے شروع میں شیعوں کے آئمہ جن میں امام جعفر صادقؑ بھی ہیں (جو اس کی پیدائش سے پچاس سال پہلے اس جہان فانی سے کوچ کر گئے تھے) سے بھی عقیدت کا اظہار کیا لیکن نہ صرف اس نے شیعیت سے انکار کیا بلکہ اسلام کے اصولوں کی مخالفت کی بنیاد بھی ڈالی اور یکے بعد دیگرے توحید کی مخالفت میں چند کتب لکھیں جن میں اس نے کوشش کی ہے کہ خالق کی وحدت کا انکار کرے اور توحید کو دین میں متزلزل کر دے اپنی کتابوں

میں اس نے اس طرح دکھایا ہے کہ خداوند تعالٰی کی صفات اس کی ذات سے جدا ہیں۔

تمام توحیدی مذاہب جن میں اسلام بھی شامل ہے اس بات کے معتقد ہیں کہ ہر وہ شخص جو مومن ہے خداوند تعالٰی کی صفات کو اس کی ذات سے جدا نہیں سمجھتا۔

ہر وہ شخص جو وحدت خداوندی کا قائل ہے اسے خداوند تعالٰی کی صفات کو اس کی ذات کا جزو جاننا چاہیے یعنی خداوند تعالٰی کا علم اس کی ذات سے جدا نہیں ہے اور دونوں ایک ساتھ وجود میں آئے ہیں یہ اس صورت میں ہے کہ جب ہم فرض کریں کہ خداوند تعالٰی وجود میں آیا اور ایک موحد ایسا فرض نہیں کرتا کیونکہ ہر توحید پرست کے عقیدے کے مطابق خداوند تعالٰی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

توحید پرست سوچ بھی نہیں سکتا کہ خداوند تعالٰی وجود میں آیا ہے کیونکہ اگر وہ ایسا خیال کرے تو لامحالہ اس کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو گا کہ وہ کب وجود میں آیا ؟ اور کس نے اسے پیدا کیا ؟ ایک توحید پرست خداوند تعالٰی کے بارے میں اس طرح خیال کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا اس کی صفت اس کی ذات سے جدا نہیں ہے یعنی ہر وہ صفت جو خدا میں پائی جاتی ہے اس کے ساتھ ہی وجود میں آئی ہے (اگر موحد یہ فرض کرے کہ خدا وجود میں آیا ہے)۔

ابن راوندی نے توحید کو جو دین اسلام کی پہلی اصل ہے متزلزل کرنے کے لئے کہا خدا جس وقت وجود میں آیا عالم نہیں تھا اور وجود میں آنے کے بعد خدا نے علم کو اپنے لئے پیدا کیا۔

ابن راوندی کا یہ کہنا اس بات کی نشان دہی ہے کہ ابن راوندی نے صفات خدا کو اس کی غیر ذات قرار دیا ہے جس کے نتیجہ میں وہ مشرک ہو گیا تھا کیونکہ جو شخص خدا کی صفات کو اس کی ذات سے جدا سمجھے مشرک ہے۔ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے ابن راوندی امام جعفر صادقؑ کی وفات کے نصف صدی بعد پیدا ہوا اس وقت امام جعفر صادقؑ موجود نہ تھے تاکہ اسے جواب دیتے البتہ دوسری نسل کے شاگرد جو اس وقت زندہ تھے اور آپ کے حلقہ درس میں حاضر ہو چکے تھے انہوں نے ابن راوندی کو جواب دیا کہ اگر خداوند تعالٰی دانا نہ ہوتا تو اسے کیسے معلوم ہوتا کہ وہ اپنے علم کو وجود میں لائے۔ کیا یہی بات خدا کی دانائی پر دلالت کے لئے کافی نہیں ہے کہ اس نے درک کر لیا کہ اسے دانا بننا چاہیے ؟

چونکہ ایک نادان وجود کو اس بات کا علم نہیں ہو سکتا کہ اسے دانائی کی ضرورت ہے اور کسی وجود کا دانا بننے کے لئے کوشش کرنا بھی اس کی دانائی کی دلیل ہے۔

ابن راوندی نے نہ صرف علم کی صفت کو خدا سے جدا جانا بلکہ کہا کہ خدا کی دوسری صفات بھی اس سے جدا ہیں۔

ابن راوندی کے بقول خدا میں وہ تمام صفات جن کو اس سے نسبت دی جاتی ہے موجود نہ تھیں اور بعد

میں جب خدا وجود میں آیا تو اس نے صفات کو پیدا کیا اگر ابن راوندی قرون وسطٰی میں یورپ میں یہ بات زبان پر لاتا تو اسے موت کی سزا دی جاتی۔ اسے آگ میں جلایا جاتا یا دوسرے طریقے سے اسے ہلاک کر دیا جاتا۔

لیکن تیسری صدی کے پہلے پچاس سالوں کے دوران کسی نے بھی نہ تو اسے اذیت پہنچائی نہ ہی اس کی کتابوں کو دریا برد کیا اور نہ ہی انہیں جلایا بلکہ صرف اس کو جواب دیتے رہے۔

جو ثقافت امام جعفر صادقؑ وجود میں لائے وہ آزاد بحث کی اس قدر شیدائی تھی کہ راوندی کی تکفیر اس نے ان سنی کر دی اور اسے فلسفیانہ بحثوں کا حصہ شمار کیا اور کسی نے بھی اس کے مرتد ہونے پر اسے گرفتار نہیں کیا اور نہ اس کی مذمت کر کے اسے کیفر کردار تک پہنچایا۔

خدائی صفات کو اس کی ذات سے جدا ماننے کے بعد ابن راوندی ایک مرتبہ توحید کا بھی منکر ہوا۔ جب اس شخص نے خدا کا انکار کیا اور کہا کہ خدا نہیں ہے تو اس کے کافر اور مرتد ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ رہی۔ اسلام کے مطابق کوئی انسان اگر مرتد ہو جائے تو وہ واجب القتل ہوتا ہے بہرکیف ان تمام باتوں کے باوجود کسی نے ابن راوندی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی البتہ اس کے سوالوں کے جواب دیتے رہے۔

تیسری صدی ہجری کے پہلے پچاس سالوں کے دوران بغداد نسبتاً" جدید شہر بن چکا تھا اس کی تعمیر کو ایک صدی سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ وہ عالم اسلام کی ثقافت و علم کا مرکز بن گیا تھا۔ کوئی ایسا دن نہ گزرتا تھا کہ بغداد میں ایک جدید کتاب مکمل نہ ہوتی ہو یا دوسری جگہوں سے کوئی دانشور آکر کتاب کی تقریب رونمائی نہ کراتا ہو۔ لوگوں میں کتب بینی کا اس قدر شوق تھا کہ تقریباً" ہزار کاتب بغداد میں کتابیں لکھنے کے لئے بیٹھے ہوئے تھے۔ لوگوں کو کتابیں پڑھنے کا اتنا شوق تھا جب کہ کتابوں کے مصنفین اپنی کتابوں کی زیادہ کاپیاں لوگوں کے ہاتھوں فروخت کرنے سے قاصر تھے۔

لہٰذا اپنی کتابوں کو کاتبوں کے حوالے کر دیتے اور جب ایک کاتب کو کوئی کتاب موصول ہوتی۔ تو چونکہ وہ قلیل عرصے میں اسے نہ لکھ سکتا تھا لہٰذا اسے کاتبوں کے گروہ میں تقسیم کر دیتا۔

مثال کے طور پر اگر ایک کتاب کے پانچ سو صفحات ہوتے تو اسے پانچ کاتبوں کے درمیان تقسیم کرنے سے ہر ایک کے حصے میں ایک سو صفحات آتے یا اسی دن دس کاتبوں کے درمیان تقسیم کرنے سے ہر کاتب کو پچاس صفحات لکھنے پڑتے تاکہ جتنی جلدی ممکن ہو کتاب مکمل ہو جائے۔

اتفاق سے کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی کتاب کی مانگ اس قدر زیادہ ہوتی کہ اس کتاب کی پچاس سو کاپیاں تیار کرنا پڑتیں اس صورت میں پانچ سو کاتبوں میں تقسیم کر دیتے اور ہر ایک کے حصے میں پانچ صفحات آتے اس طرح ہر کاتب پچاس یا سو کاپیاں تیار کرتا جونہی یہ کاپیاں تیار ہوتی جاتیں تو انہیں کاتبوں سے لے کر اکٹھا کرتے اور کتابوں کی شکل دیتے جاتے اور پھر خریداروں کو فروخت کر دیتے۔ یوں ان لکھنے والوں کا طبقہ بغداد میں وجود

میں آگیا تھا اس طبقے کو "مصنف الورق" کہا جاتا تھا چونکہ کاتبوں کو وراق کہا جاتا تھا تیسری صدی ہجری میں بغداد میں وراق کا اطلاق کاتب پر ہوتا تھا اور چوتھی صدی ہجری میں اس اصطلاح کا اطلاق جلدیں بنانے والوں پر ہونے لگا کیونکہ کتابوں کو لکھنے کے بعد دوبارہ اکٹھا کیا جاتا تھا اور انہیں کتابی شکل دیتے تھے شاید ہمارا خیال ہو کہ یہ لوگ خلفاء بنی عباسی کے دارالحکومت میں تنگ دستی کی زندگی بسر کر رہے ہوں گے کیونکہ آج کل کے معاشرے میں کوئی بھی کاتب اگر فقط اس فن پر اکتفا کرے گا تو اس کی معاشی حالت اچھی نہیں ہو سکتی فرانسیسی میں ایسے شخص کو طنزاً "گرات پاپے" یعنی کاغذ خراش کہا جاتا ہے اور انگریزی میں اسکریچ کہا جاتا ہے جس کا مفہوم بھی کاغذ خراش ہے۔

یورپ میں نویں صدی عیسوی میں ان کاتبوں کے علاوہ ایک اور طبقہ وجود میں آیا جس کا کام موسیقی کی دھنیں لکھنا ہوتا تھا۔

ژان۔ژاک روسو مشہور فرانسیسی مصنف نے ایک عرصے تک اسی کام کو ذریعہ معاش بنائے رکھا اسے ہر صفحے کے عوض تین شاہی (سکے کا نام) ملتے تھے جو اس زمانے میں معقول رقم ہوتی تھی کتابیں لکھنے والے کاتب' روسو کے زمانے میں آسودہ حال نہیں تھے چونکہ چھاپہ خانے قائم تھے اور کاتبوں کو کام کرنے کا موقع بہت کم میسر آتا (البتہ صرف وہ کاتب جن کا خط اچھا ہوتا) کیونکہ بعض کاتبوں کا خط واجبی سا ہوتا تھا اس کے بعد کچھ عرصے بعد موسیقی کی دھنوں کو بھی چھاپا جانے لگا۔

موجودہ زمانے میں یورپ اور امریکہ میں کوئی بھی کتب نویسی کو ذریعہ معاش نہیں بنا سکتا کیونکہ اب کتابوں اور موسیقی کی دھنوں کی چھپائی ہوتی ہے۔

اور دوسرا یہ کہ کاغذ خراش کا جو مفہوم فرانسیسی اور انگریزی میں ہے امریکہ اور سارے یورپ میں موجود نہیں ہے۔ لیکن کاغذ خراش کی ایک دوسری قسم جو قدیم زمانے میں ناپید تھی پائی جاتی ہے وہ گیسٹ رائٹر ہے یعنی قابل رحم اور نفرت انگیز مصنف گیسٹ رائٹر وہ شخص جو کتاب لکھتا ہے اور دوسرا اسے اپنے نام اور پتے کے ساتھ شائع کرواتا ہے گیسٹ رائیٹر جس کے انگریزی میں لفظی معنی قابل نفرت اور قابل رحم مصنف ہیں وہ شخص جو کتاب لکھتا اور تکلیف اٹھاتا ہے تاکہ دوسرا اسے اپنے نام سے شائع کروائے تو وہ مصنف انگریزی رسم و رواج کے مطابق حیرت انگیز کام کرتا ہے لیکن دوسری طرف وہی شخص قابل رحم ہوتا ہے کیونکہ اگر وہ تنگدست نہ ہوتا تو ہرگز یہ کام نہ کرتا۔

فرانسیسی ایسے مصنف کے لئے انگریزوں کی مانند سخت الفاظ استعمال نہیں کرتے بلکہ قدرے ملائمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایسے مصنف کے لئے نیگر یعنی سیاہ فام کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

نیگر کی اصطلاح فرانسیسی میں سیاہ فام غلاموں اور کنیزوں کے لئے مخصوص ہے اور اگر کوئی شخص اس لئے

کتاب لکھے تاکہ دوسرے کے نام سے شائع ہو تو وہ ایک طرح سے اپنی تذلیل کرتا ہے لہذا فرانسیسی اسے بھی نیگر کہتے ہیں۔ قدیم زمانے میں کوئی بھی اس لئے کتاب نہیں لکھتا تھا کہ دوسرا اسے اپنے نام سے شائع کروائے اور یہ کہ تمام کتابیں ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں۔ بغداد تیسری صدی ہجری کے پہلے نصف عرصے میں علم کا مرکز بن گیا تھا اور جو کاتب کتابیں لکھنے پر مامور ہوتے تھے وہ معاشرے کا محترم طبقہ شمار کئے جاتے تھے۔ جب بغداد میں کہا جاتا کہ فلاں شخص وراق ہے یعنی وہ کتابوں کی کاپیاں تیار کرتا ہے تو لامحالہ ان لوگوں کے ذہن میں ایک محترم شخص کا خیال آتا تھا اور بغداد میں وراقوں کا احترام عربوں کی فطری صفات میں سے تھا جو وہ ایک لکھنے والے کے لئے بجالاتے تھے۔

مکتوب یعنی لکھا ہوا عربوں کی نظر میں نہ صرف محترم ہوتا بلکہ مقدس بھی سمجھا جاتا تھا کہا جاتا ہے کہ مکتوب اس لئے عربوں کے ہاں قابل احترام ہے کہ ان کی مذہبی کتاب قرآن بھی مکتوب ہے۔ لیکن قبل از اسلام عربوں کے پاس کوئی کتاب نہیں تھی عرب کا ایک بدو بھی مکتوب کا احترام کرتا تھا۔

عرب کے بدو مکتوب کو اپنے ماحول اور تصورات سے مافوق الفطرت چیز خیال کرتے تھے اور مکتوب کا اس قدر احترام کرتے کہ ان کے خیال میں ان کے خدا بھی مکتوب کے زیر اثر ہیں اور ان کے خداؤں (جن میں سے بعض کے مجسمے کعبہ میں موجود تھے جبکہ بعض کے موجود نہیں تھے) کی تقدیر کا تعین بھی المکتوب کرتا جیسا کہ ہمیں معلوم ہے مشہور بدو عربی قبیلے ایک خدا یا چند خداؤں کو جن کے مجسمے کعبے میں لٹکے ہوتے یا مجسمے نہ ہوتے پوجا کرتے تھے۔ اور قبل از اسلام ان قبیلوں کے درمیان جنگ کا اصلی سبب وہ اختلاف ہوتا تھا جو خداؤں کی پرستش کی بنیاد پر پایا جاتا تھا اور یہ جنگیں اس قدر طویل ہوتی تھیں کہ عام قبائل تھک جاتے اسی لئے انہوں نے آپس میں طے کیا کہ سال کے چار مہینوں کا احترام کرتے ہوئے اس دوران جنگ بندی کی جائے تاکہ دوسرے کام سرانجام دے سکیں۔

لیکن اس کے باوجود کہ ہر قبیلہ ایک یا چند خداؤں کی پرستش کرتا تھا جو دوسرے قبیلوں کے خداؤں سے مختلف ہوتے تھے پھر بھی عرب کے قبائل المکتوب کے احترام کے قائل تھے۔

اسلام کی آمد کے بعد جن لوگوں نے قرآن کی تفسیر کی انہوں نے المکتوب کا اطلاق ان چیزوں پر کیا جو ازلی و ابدی لوح پر لکھی ہوئی ہیں۔

لیکن قبل از اسلام جب کہ ابھی قرآن نازل نہیں ہوا تھا ایک بدو عرب ازلی اور ابدی لوح کا وہ تصور نہیں رکھتا تھا جو قرآن کے بعض مفسرین نے بیان کیا ہے۔ بہرکیف اس کا عقیدہ تھا کہ المکتوب ایک ایسی عظیم چیز ہے کہ خدا بھی اس کے زیر اثر ہیں اسی لئے بدو عرب المکتوب کا احترام کرتے تھے۔ بدو عرب ناخواندہ تھے لیکن جب کبھی کاف یا لام کا حرف سنتے تو اسے احترام سے زبان پر لاتے اور قسم کھانا چونکہ ان کا تکیہ کلام ہوتا تھا عربستان

کے صحرا نشین شاید دن میں دس بار سے زیادہ قسم کھاتے تھے وہ کبھی حروف تہجی کی بھی قسم کھاتے حالانکہ وہ ناخواندہ ہوتے تھے' انہیں اس بارے میں کچھ علم نہیں ہوتا تھا کہ کاف یا لام کی شکل کیسی ہے ؟ جو وراق بغداد میں کتابت کے ذریعے اپنی معاش کا سامان فراہم کرتے تھے وہ عربوں کے المکتوب کے متعلق اس فطری اور اجتماعی روایتی عقیدے سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ وہ خصوصاً" ایسی کتاب لکھتے جو عربوں کی نظر میں دوسری تحریروں کی نسبت زیادہ اچھی (۴۶)۔

آج اس زمانے کو گیارہ صدیاں اور اسلام کو آئے ہوئے چودہ سو سال ہو چکے ہیں عرب ممالک میں خصوصاً" مصر میں کتابیں اور اخبار کثرت سے چھاپے جاتے ہیں بعض اخبارات ایسے بھی ہیں جن کے ایک شمارے کی جمعہ کے دن کی تعداد پانچ لاکھ نسخہ ہے۔

کتابوں' رسالوں اور اخبارات کی کثرت اشاعت کے سبب عرب ممالک میں المکتوب کا احترام ختم ہو جانا چاہیے تھا لیکن ابھی تک تمام عرب ممالک میں المکتوب محترم ہے کیونکہ مذہبی اور علمی کتابیں مکتوب ہی تو ہیں اور دوسرا یہ کہ عرب ممالک میں المکتوب سے مراد لوح ازلی وابدی پر لکھی ہوئی عبارت ہے اور عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ جو کچھ مکتوب یعنی لکھا ہوا ہے وہ ہو کر رہے گا آدمی اس میں ردوبدل نہیں کر سکتا۔

تیسری صدی ہجری کے پہلے پچاس سالوں میں وراقوں نے عباسی خلفاء کی کتابوں کے متعلق توجہ سے بھی فائدہ اٹھایا۔ کوئی ایسا مصنف نہیں ہوتا تھا (اگرچہ درمیانے درجے کی کتاب لکھتا) اور عباسی خلفاء اس کی قدر دانی نہ کرتے اور ان کی معقول امداد سے بہرہ مند نہ ہوتا جو کوئی خلیفہ کی مدد سے بہرہ مند ہوتا اسے اتنا سرمایہ ہاتھ لگتا کہ ساری عمر آسودہ حالی میں گزار سکتا تھا۔

ایسے زمانے کو اگر مصنفین اور وراقوں کا سنہری دور کہا جائے تو مبالغہ نہ ہو گا' ابن راوندی نے بغداد میں قدم رکھا۔ دو چیزوں نے اس آدمی کو بغداد جانے پر مائل کیا ایک جیسا کہ ہم نے ذکر کیا بغداد علمی مرکز بنتا جا رہا تھا اور ابن راوندی جیسے شخص نے محسوس کر لیا تھا کہ اسے بغداد جا کر دانائی کے اس مرکز سے تحصیل علم کرنا چاہیے۔ دوسرا یہ کہ اس بات کا قوی امکان ہے کہ عباسی خلیفہ کی طرف سے مالی اعانت کی امید میں اس نے بغداد کا رخ کیا۔ ابن راوندی جب بغداد پہنچا تو گمنام نہ تھا بلکہ اس کی دو کتابیں الابتدا والاعادہ اور الاسماء والاحکام کے ناموں سے بغداد کے علمی مرکز میں پہلے سے پہنچ چکی تھیں۔ ہم بتا چکے ہیں کہ ان کتابوں میں اس نے اپنے آپ کو ایک کٹر مسلمان ظاہر کیا تھا۔ بہرکیف اس کی شہرت بغداد میں اتنی نہیں تھی جتنی اراک (ایران کے ایک شہر) میں تھی اور خود اسے بھی اس بات کا بخوبی علم تھا۔

لہذا بغداد کوچ کرنے سے قبل اس نے بغداد کے فضلا میں سے ایک شخص عباس صروم کے لئے اپنے جاننے والے کا پیغام بھی ساتھ لے لیا تاکہ جب خلفائے عباسیہ کے دارالحکومت میں داخل ہو تو کوئی رہنمائی کرنے والا

بھی ہو۔ بغداد میں داخل ہونے کے بعد اس نے مسافر خانے میں قیام کیا۔ بغداد جو خلفائے عباسیہ کا دارالحکومت تھا ابھی چوتھی اور پانچویں صدی ہجری کی مانند پر شکوہ نہیں ہوا تھا ابن راوندی کو عباس صروم کے ڈھونڈنے میں چند دن لگے اور اگر وہ چوتھی صدی ہجری کے اواخر میں بغداد آتا تو جب تک اس کے ہمراہ اس کا صحیح پتہ نہ ہوتا تو شائد وہ چند مہینوں میں بھی اسے تلاش نہ کر سکتا۔ کیونکہ چوتھی صدی ہجری میں بغداد اتنا پھیل گیا تھا کہ قافلے والے شہر کے طول کا دجلہ کے کسی ایک ساحل کے ساتھ ساتھ ایک دن میں چکر نہیں لگا سکتے تھے۔

جب ابن راوندی عباس صروم سے ملا تو اس نے اپنی کتاب جو الفرند (۴۷) کے نام سے موسوم ہے اسے دکھائی اور کہا میرے پاس اس کتاب کا صرف ایک نسخہ ہے اس لئے میں اس کے مزید نسخے تیار کروانا چاہتا ہوں۔ عباس صروم نے کتاب کا ایک حصہ پڑھنے کے بعد حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "اے ابوالحسن (ابن راوندی کی کنیت) یہ کتاب جو تم نے تحریر کی ہے کیا کسی کی نظروں سے گزری ہے ؟" ابن راوندی نے کہا "ایران کے شہر اراک میں اس کتاب کے کئی نسخے تیار کئے گئے ہیں اور بہت سے لوگ اسے پڑھ چکے ہیں"۔

عباس صروم نے حیران کن لہجے میں کہا نجانے تم آج تک کیسے زندہ ہو ؟

ابن راوندی نے کہا کیا تم اس لئے حیران ہو کہ میں آج تک زندہ ہوں؟

صروم نے جواب دیا اس لئے کہ تو نے جو کچھ اس کتاب میں لکھا ہے کفر ہے اور جو مسلمان ایسے کلمات لکھے یا زبان پر لائے وہ کافر ہو جاتا ہے۔

ابن راوندی نے کہا یہ کلمات کفر نہیں بلکہ حقائق ہیں۔ صروم نے اسے تاکید کی کہ ایسی بات زبان پر نہ لاؤ تم نے اس کتاب میں دین اسلام کے اصول یعنی توحید' نبوت اور معاد کا انکار کیا ہے۔ ابن راوندی نے کہا آپ کا خیال درست نہیں اگر آپ میری کتاب کو غور سے پڑھیں تو سمجھ جائیں گے کہ میں نے توحید کا انکار نہیں کیا۔ میرا مقصد خدا پرستی کو اس خلوص کے ساتھ پہچاننا ہے جس کے وہ لائق ہے اور میں ہر قسم کے خرافات سے ہٹ کر خدا پرستی کا قائل ہوں۔

اس کے بعد ابن راوندی نے صروم سے ایک خوشخط کاتب جس کو وہ جانتا ہو کا اتہ پتہ پوچھا تاکہ وہ اس کی نقل تیار کروا کر خلیفہ کی خدمت میں پیش کر سکے۔

صروم نے کہا میں تمہیں متنبہ کرتا ہوں کہ اس کام کو چھوڑ دو کیونکہ ممکن ہے یہ کام تمہارے لئے خطرناک ثابت ہو۔ ابن راوندی بولا "میں نے سنا ہے خلیفہ روشن خیال انسان ہے اور کتابوں کی قدر و منزلت جانتا ہے۔ جونہی وہ اس کتاب کو دیکھے گا مجھے معقول انعام دے گا اور میں حج کے سفر پر روانہ ہو جاؤں گا"۔ صروم نے کہا میں تجھے مطلب بصری (کاتب) سے ملواتا ہوں پھر تو جانے اور تیرا کام' اور جب کتاب تیار ہو جائے تو خود جا کر خلیفہ کے حضور پیش کر دینا اور مجھے درمیان میں نہ لانا۔ ابن راوندی نے پوچھا کیا تم میری کتاب کو خلیفہ کی

خدمت میں پیش کرنے سے خائف ہو ؟صروم بولا "ہاں" ابن راوندی نے کہا "مرد کو بہادر ہونا چاہیے"۔ صروم بولا' میں بہادر نہیں ہوں۔ ابن راوندی نے کہا "اگر مرد میں بعض اچھی صفات نہ پائی جائیں تو کوئی حرج نہیں لیکن شجاعت کی صفت مرد میں ہونا ضروری ہے کیونکہ یہ مرد کی ذاتی صفت ہے اور یہ شہد میں مٹھاس کی مانند ہے کیا شہد میں شرینی نہ پائی جائے تو اسے شہد کہا جا سکتا ہے ؟" صروم جو ابن راوندی کی اس بحث و تکرار سے تنگ آ چکا تھا کہنے لگا اگر تو بغداد میں پردیسی نہ ہوتا تو میں تمہیں کہہ دیتا کہ میرے گھر میں قدم نہ رکھنا۔ ابن راوندی اس کی اس بات پر سخت ناراض ہوا وہ جب صروم کے گھر سے نکلا تو اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ پھر کبھی بھی اس کے گھر کا رخ نہیں کرے گا حالانکہ پہلے وہ اس سے کچھ رقم عاریتاً" حاصل کرنے کی آس لگائے ہوئے تھا۔

اسی دن ابن راوندی نے مطلب بصری کا پتہ ادھر ادھر سے حاصل کیا اور آخر کار اسے ڈھونڈھ نکالا۔ چونکہ معاش کی فکر کتاب کو خلیفہ کی خدمت میں پیش کرنے سے زیادہ اہم تھی اس لئے مطلب بصری سے درخواست کی کہ وہ اس کے لئے کوئی کام تلاش کرے۔ مطلب بصری نے اسے بٹھایا اور اس کے ہاتھ میں کاغذ کا ٹکڑا پکڑاتے ہوئے کہا لکھو تاکہ میں تمہارا خط دیکھوں۔ ابن راوندی کا خط مطلب بصری کو پسند نہ آیا۔ اس نے کہا تمہارا خط اچھا نہیں ہے لیکن میرے پاس بعض کتابیں ہیں جنہیں مجھے لکھنے کی فرصت نہیں لہٰذا میں انہیں تمہارے حوالے کرتا ہوں مگر یہ بات یاد رکھنا کہ تمہاری مزدوری ایک خوش خط کاتب کے برابر نہیں ہو گی۔ ابن راوندی بولا مجھے اتنی ہی مزدوری چاہئے جس سے میری گزر بسر ہو سکے اس سے زیادہ کی مجھے لالچ نہیں۔

مطلب بصری نے اسے ایک کتاب دی تاکہ وہ اس کی نقل تیار کرے اور اسے کہا کہ تمہیں کتاب کے صفحات کی مناسبت سے معاوضہ دیا جائے گا۔

تیسری صدی ہجری کے پہلے پچاس سالوں میں جب ابن راوندی بغداد میں وارد ہوا تو اس زمانے میں اسلام میں فلسفہ اجاگر ہو رہا تھا۔ اور عربی مترجم فلسفے کی کتب کو سریانی زبان سے عربی میں ڈھال رہے تھے' جونہی کوئی کتاب ترجمہ ہو جاتی کاتبوں کے ہاں پہنچ جاتی تاکہ وہ اس کی فروخت کے لئے مزید نسخے تیار کریں۔ مطلب بصری فن کتابت میں کمال کا ماہر تھا وہ نہ صرف کتابت میں اسپیشلسٹ Specialist تھا بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ آج کے ناشروں جیسا کام بھی کرتا تھا۔ وہ اس طرح کہ مصنف سے کتاب خرید لیتا اور اسے کہتا کہ اس کی کتاب کے دس یا بیس نسخے بیچ ڈالے گا اور باقی دس یا بیس نسخوں پر اس کا کوئی حق نہیں۔ چونکہ بغداد میں کتابیں زیادہ مقدار میں لکھی جاتی تھیں ایک خواندہ شخص اگر کاتب بننا چاہتا تو وہ اگرچہ ابن راوندی کی مانند پردیسی ہی کیوں نہ ہوتا عباسی خلیفہ کے دارالحکومت میں بھوکا نہ رہتا۔

ابن راوندی نے مطلب بصری کو خدا حافظ کہنے سے قبل اس سے کتاب تحریر کرنے کے لئے کچھ کاغذ لئے

اس زمانے کا دستور یہ تھا کہ کاغذ کو صاحب کتاب یا وہ کاتب جو دوسروں کی نسبت بڑا شمار کیا جاتا تھا کاتب کے حوالے کرتا تاکہ کتاب ایک قسم کے کاغذ پر لکھی جائے اور کتاب کے صفحات بھی ایک ہی سائز کے ہوں۔

یاد رہے کہ کتاب کو موجودہ شکل میں لکھنے کی ابتدا کتابخانہ اسکندریہ سے ہوئی پھر وہاں سے بغداد منتقل ہوئی اور کتاب کے رواج کا سبب بنی۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ کتاب کو رواج دینے کی ضرورت نے اسکندریہ کے کتابخانے میں کتب کو موجودہ شکل میں تبدیل کر دیا ورنہ پہلی کتابیں بہت ضخیم ہوتی تھیں اور جب تک ان کو تقسیم در تقسیم نہ کیا جاتا ان سے نسخے تیار کرنا کاتبوں کے بس کا کام نہیں ہوتا تھا۔

جس طرح ہمیں معلوم نہیں کہ حساب کے چار عملوں کے قواعد کا موجد کون ہے اسی طرح ہمیں اس بارے میں کوئی علم نہیں کہ وہ پہلا شخص جسے اسکندریہ کے کتب خانے میں کتاب کو علیحدہ علیحدہ اوراق پر لکھ کر پھر انہیں آپس میں یکجا کر کے کتابی شکل دینے کا خیال آیا' کون تھا؟

جو کوئی تھا گوتمبرگ سے صدیوں پہلے علیحدہ علیحدہ صفحات پر کتاب لکھنے کے ذریعے کتاب کو رواج دینے کا سبب بنا اس نے دعویٰ بھی نہیں کیا کیونکہ اگر دعویٰ کرتا تو شاید اس کا نام باقی رہتا جس طرح گوتمبرگ نے دعویٰ کیا کہ اس کی ایجاد سے اسٹرابرگ میں ناخواندہ کوئی نہ رہے گا۔(۴۸) آج ہم اسے پہچانتے ہیں۔ ابن راوندی جس مسافر خانے میں قیام پذیر تھا وہی اس کا گھر اور ٹھکانہ تھا۔ اس نے وہیں پر کتابوں کی کاپیاں یا نسخے تیار کرنے شروع کئے۔ جب کتاب کا مقدمہ لکھنے کے بعد اس نے متن لکھنا شروع کیا تو مؤلف کا کہا اسے پسند نہ آیا اور مولف کی غلطی کو آشکارا کرنے کے لئے کتاب کے حاشیے میں مولف کے نظریے کو مسترد کرتے ہوئے اپنا نظریہ رقم کر دیا۔

اس دن رات گئے تک کئی مرتبہ ابن راوندی نے نہایت وضاحت کے ساتھ مولف کا کہا مسترد کیا اور کتاب کے صفحات کے حاشیے پر نوٹ لکھا۔

دوسری صبح وہ ان صفحات کو لے کر اجرت طلب کرنے کی غرض سے مطلب بصری کے ہاں پہنچا۔ مطلب بصری نہایت غور سے ان صفحات کو دیکھتا رہا تاکہ یہ جان سکے کہ اس نے صفائی سے لکھا ہے یا نہیں؟ تو اس نے اس دوران چند صفحات کے حاشیوں میں اصل متن سے اضافی عبارت لکھی ہوئی پائی۔ وہ اس اضافی عبارت کو دیکھنے پر نہایت متحیرانہ لہجے میں استفسار کرنے لگا "میں نے اس عبارت کو اصل کتاب کے صفحات کے حاشیوں میں نہیں پایا"۔

ابن راوندی بولا' یہ عبارت میں نے لکھی ہے مطلب بصری نے پوچھا تم نے کس لئے لکھی ہے؟ ابن راوندی نے جواب دیا اس لئے کہ کتب کے مولف نے غلطی کی ہے اور میں نے اس کی غلطی کی نشاندہی کرنا ضروری سمجھا تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ صحیح نظریہ کونسا ہے؟

کہا جاتا ہے کہ مولفین کی بدبختی کا آغاز اس دن سے ہوا جب دانشور لوگ مجبوراً" کاتب بنے اور نسخے یا کاپیاں تیار کرنے لگے۔ جب تک کاتب اہل دانش نہیں تھے اور وہ کسی کتاب کے بارے میں نہیں جان سکتے تھے کہ اس کے متن میں جو کچھ رقم ہے صحیح ہے یا نہیں؟ وہ جو کچھ دیکھتے وہی لکھ دیتے اور خود اظہار خیال نہیں کرتے تھے۔ لیکن جس دن سے دانشور کاتب بننے شروع ہوئے اسی دن سے مولفین کی بدبختی کے دور کا آغاز ہوا۔ کیونکہ وہ مولفین کے غلط نظریے کو مسترد کرتے ہوئے کتاب کے حاشیے میں صحیح سمت کی نشاندہی کر دیتے تھے۔

بغداد میں تیسری صدی ہجری کے دوران اگر کوئی دانشور کاتب بنتا ہے تو بھی نہایت محدود عرصے کے لئے۔ اگر کوئی اجنبی دانشور بغداد میں وارد ہوتا اور کسی سے اس کی آشنائی نہ ہوتی یا ابن راوندی کی مانند اس کا میزبان اس کی آؤ بھگت نہ کرتا تو مجبوراً" اسے کتابت کرنا پڑتی۔

لیکن ایک دانشور کی کتابت کی مدت محدود ہوتی تھی اور جونہی اس کی پہچان ہو جاتی اس کا ذریعہ معاش فراہم ہو جاتا تو وہ کتابت کو ترک کر دیتا چونکہ خلیفہ اور بزرگان شہر' علم کی قدر و منزلت سے آگاہ تھے وہ ایک عالم سے نہایت عزت واحترام کے ساتھ پیش آتے تھے۔

چوتھی صدی ہجری میں اگر بغداد میں ایک عالم کتابت کرنے کا محتاج ہوتا تو ایک طویل مدت تک وہ کتابت نہ کرتا۔ یا خلیفہ اسے انعام وغیرہ سے نوازتا اور وہ نہایت آرام سے بغداد یا کسی دوسری جگہ زندگی بسر کرتا۔ لیکن پانچویں صدی سے خلفائے عباسی کی علم سے بے اعتنائی کے نتیجے میں عالموں کا بازار بے رونق ہو گیا تھا۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ابن راوندی پہلا کاتب ہے جس نے ایسی کتاب پر حاشیہ لکھا جو اسے نقل اتارنے کے لئے دی گئی تھی۔

لیکن مطلب بصری نے پہلی مرتبہ ایک ایسے کاتب کے ساتھ کام کیا جس نے کتاب پر حاشیہ رقم کیا۔ جن کاتبوں کے ساتھ ابھی تک مطلب بصری کا واسطہ پڑ چکا تھا وہ اہل علم نہیں تھے کہ کتاب کے مفاہیم کو مسترد کرتے ہوئے صفحات کے حاشیہ میں اپنا نظریہ رقم کرتے۔

اسی لئے جو کچھ صفحات کے حاشیے میں مطلب بصری کی نظر سے گزرا اس پر وہ سخت متعجب ہوا اور ابن راوندی نے کہا تو نے اپنا کام خود بڑھا لیا ہے اور اگر میرے لئے کام کرکے اپنا معاوضہ طلب کرنا چاہتے ہو تو ان صفحات کو حاشیہ لکھے بغیر دوبارہ لکھو اور اسکے بعد بھی اس کتاب کے صفحات میں اور ہر اس کتاب کے صفحات میں جو تمہیں بعد میں دی جائے کچھ بھی نہ لکھو۔

ابن راوندی جو آج وراق سے کچھ رقم حاصل کرنے کی امید میں آیا تھا' ناچار خالی ہاتھ لوٹا کیونکہ وہ عباس صروم کے ہاں بھی مستعار لینے کیلئے نہیں جا سکتا تھا۔

اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ مزید ایک دن و رات بھوک برداشت کرے اور جہاں تک ہو سکے لکھے تاکہ مطلب بصری سے زیادہ سے زیادہ رقم حاصل کر سکے۔ اس دن ابن راوندی رات گئے تک لکھتا رہا تاریکی چھا جانے کے بعد اس نے مسافر خانے کے مالک سے اس وعدے پر چراغ لیا کہ دوسرے دن وہ تیل کی قیمت ادا کرے گا۔ چونکہ وہ بھوک سے سو نہیں سکتا تھا اس لئے وہ لکھتا رہا حتیٰ کہ چراغ خود بجھ گیا۔

صبح ہوتے ہی وہ اپنے لکھے ہوئے اوراق لئے مطلب بصری کے ہاں پہنچا اور چند سکے اس سے مزدوری لی۔ اس کے بعد ہر شب و روز وہ کتابت کرتا اور دوسرے دن وراق کی خدمت میں پیش کر کے اپنی مزدوری لے لیتا۔

جب ابن راوندی عباس صروم کے گھر سے چلا تھا تو عباس صروم کو یقین ہو چکا تھا کہ وہ اپنی کتاب براہ راست یا بالواسطہ طور پر خلیفہ کی خدمت میں پہنچائے گا۔

جیسا کہ ہم نے دیکھا، عباس صروم اس کتاب کے مشاہدے سے متنفر ہوا جس کے نتیجے میں ابن راوندی نے فیصلہ کیا کہ آئندہ کبھی بھی اس کے گھر کا رخ نہیں کرے گا۔ عباس صروم باطنی طور پر خوش ہوا کہ اسے ایک مرتد کے فتنے سے نجات ملی اور اگر یہ شخص کوئی بڑی مصیبت لایا تو اس پر اس کا اثر نہیں پڑے گا۔

لیکن ایک دن بعد اسے دوست کی وصیت یاد آئی۔ اس وصیت میں کہا گیا تھا کہ عباس صروم سے جہاں تک ہو سکے ابن راوندی کی مدد کرے۔ اگر وصیت لکھنے والا جان لیتا کہ صروم نے ابن راوندی سے ایسا سلوک کیا تھا کہ وہ شخص غضب کے عالم میں اس کے گھر سے چلا گیا تھا، تو وہ ضرور رنجیدہ ہوتا اور صروم، سے کہتا، تجھے کم از کم اتنا شعور تھا کہ ایک ایسے انسان کو جو اجنبی اور حال ہی میں بغداد میں وارد ہوا ہے اور شہر میں اس کا آشنا بھی کوئی نہیں، دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے لئے چھوڑ دینا شرافت نہیں۔

اس کے باوجود کہ عباس صروم ابن راوندی سے خفا ہو کر چلے جانے سے سخت پشیمان ہوا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ابن راوندی کا ٹھکانہ کون کون سی سرائے میں ہے۔ وہ اسے واپس اپنے گھر لانے کیلئے اس کے پیچھے نہیں گیا کیونکہ وہ اس کے کام کے انجام سے خاصا ہراساں تھا اسے ڈر تھا کہ کہیں اس کا وبال اس کے سر پر نہ آ پڑے۔

عباس صروم اس بات سے پوری طرح آگاہ تھا کہ اگر ابن راوندی کی کتاب خلیفہ تک پہنچ گئی اور اس نے اس کے کچھ صفحات پڑھے یا کسی اور سے پڑھوائے تو فوراً" اس شخص کے قتل کا حکم صادر کرے گا اور اگر وہ اس کا میزبان بنا اور اس کی کتاب کو منظر عام پر لایا تو خلیفہ ضرور اسے بھی سزا کا حقدار ٹھہرائے گا اور اگر قتل نہ بھی کیا تو دوسرے ذرائع سے آزار پہنچائے گا۔ اس کے بعد اسے خیال آیا کہ جونہی یہ کتاب خلیفہ کی نظروں سے گزرے گی تو وہ اس شخص کی گرفتاری کا حکم دے گا اور قتل کرنے سے قبل اس سے پوچھیں گے کہ

دار الحکومت میں وارد ہونے کے بعد اس نے کیا کام کیا ؟ اس کے دوست کون کون لوگ ہیں ؟ اور وہ یقیناً" اس کا نام زبان پر لائے گا کیونکہ اس شہر میں وہ کسی دوسرے کو نہیں جانتا تھا۔ پس اس بنا پر اگر ابن راوندی اس کے گھر قدم نہ بھی رکھے تو بھی وہ اس کے کفر کے خطرے سے محفوظ نہیں۔

عباس صروم معتصم باللہ کی خلافت کے زمانے میں خلیفہ کا ہم مشرب تھااور خلیفہ کے ہم مشرب لوگوں کا انتخاب ان لوگوں سے ہوتا تھا جن کی ظاہری حالت پر کشش ہوتی تھی۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں معتصم ۲۲۷ھ میں فوت ہوا اور اکثر عباسی خلفاء کی مانند جوانی میں اس دار فانی سے کوچ کر گیا اور اسی سال الواثق عباسی تخت خلافت پر متمکن ہوا۔ اس نے عباس صروم کو خواندہ ہونے کی وجہ سے کاتب کی آسامی پر فائز کیا اور عباس جو اس وقت آج کی اصطلاح میں چپڑاسی تھا' ورکرز کی صف میں شامل ہو گیا۔ جب عباس صروم کاتب ہو گیا تو اس نے خلیفہ کے تمام ان درباریوں کی خوشامد شروع کر دی جن کے متعلق اس کا خیال تھا کہ ایک دن بڑے مرتبے پر فائز ہوں گے۔ عباس صروم جن لوگوں کی خوشامد کرتا تھا متوکل بھی ان میں سے ایک تھا۔ الواثق خلافت کے پانچ سال اور نو ماہ کے بعد ۲۳۲ھ میں اس جہان فانی سے کوچ کر گیا اور متوکل اس کی جگہ خلیفہ بنا۔ اس نے عباس صروم سے آشنائی کی وجہ سے اس کا مرتبہ اس قدر بلند کر دیا کہ اس کا شمار درباری امرا میں ہونے لگا۔ ابن راوندی ۲۳۶ھ میں متوکل عباسی کی خلافت کے زمانے میں بغداد میں وارد ہوا۔

۲۳۶ھ کا سال شیعوں کی عزاداری کا سال ہے اس سال متوکل نے حکم دیا کہ شیعوں کے تیسرے امام حسین ابن علیؑ کی قبر مسمار کر دی جائے کیونکہ لوگ دور دراز سے امام حسینؑ کی قبر کی زیارت کرنے آتے تھے جس کی وجہ سے متوکل حسد کی آگ میں جلتا تھا۔

اگر چہ متوکل فاضل اور ادب پرور خلیفہ ہونے کے ساتھ ساتھ ملکی معاملات میں عدل و انصاف کا خیال رکھتا تھا' تاہم شیعوں کے ہاں وہ بہت بدنام ہے اور شیعوں کے نزدیک وہ دوسرے تمام عباسی خلفاء سے زیادہ ناپسندیدہ ہے حالانکہ ان میں سے بعض نے شیعوں کے آئمہؑ کو بھی شہید کیا ہے۔ شیعوں کا کہنا ہے کہ وہ تمام عباسی خلفاء کی نسبت گھٹیا ترین خلیفہ تھا کیونکہ اس نے ایک شہید امام پر حملہ کیا اور ایک ایسے انسان کی قبر کو مسمار کیا جو اپنا دفاع نہیں کر سکتا تھا۔ (۴۹)

متوکل چونکہ امام حسینؑ سے بغض رکھتا تھا اس لئے وہ شیعوں کا بھی دشمن تھا۔ خلیفہ کے دار الحکومت میں بسنے والے شیعہ کوشش کرتے تھے کہ اپنے آپ کو شیعہ ظاہر نہ کریں۔ متوکل اپنے دو پیشرووں واثق اور معتصم کی مانند بہت شراب پیتا تھا۔ عباس صروم نے پیشن گوئی کی تھی کہ اس کی عمر پہلے دو خلفاء کی مانند کم ہوگی اس لئے متوکل کے بعد جن لوگوں کے خلیفہ بننے کا امکان تھا اس نے ان کی خوشامد کرنا شروع کردی انہیں تحائف وغیرہ بھیجنے لگا۔ لیکن جب تک متوکل خلیفہ تھا عباس صروم کو اپنا رتبہ دربار میں محفوظ رکھنا تھا اس لئے وہ ابن

راوندی کے کفر سے آلودہ ہو کر اپنے عہدے کو داؤ پر نہیں لگا سکتا تھا' خاص طور پر اس لئے کہ وہ اصفہانی شخص شیعہ بھی شمار ہوتا تھا۔اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ ابن راوندی نے بظاہر اپنی کتاب میں توحید اور نبوت ہی کا نہ صرف انکار کیا بلکہ یہ بھی دکھایا ہے کہ وہ کسی توحیدی مذہب کا قائل نہیں ہے۔ لیکن چونکہ وہ اصفہان سے آیا تھا اور اس کے بعد جب مشہور ہو گیا تو لوگوں نے اسے شیعہ سمجھ لیا۔ اگر عباس صروم ابن راوندی کے ساتھ اپنے تعلقات کا راز فاش کر دیتا تو وہ خلیفہ کے غیض و غضب کا نشانہ بنتا۔اور اگر وہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیتا اور اس کی کوئی مدد نہ کرتا تو بھی اچھی بات نہیں تھی کیونکہ اس کے دوست نے اس کی سرپرستی کی سفارش کی تھی۔ آخر کار اس کے ذہن میں خیال آیا کہ ابن راوندی کو خلیفہ کے ہاں مرگی کے مریض کے طور پر متعارف کرایا جائے۔ اسے مرگی کا مریض بنانے کے دو فائدے تھے ایک یہ تو کہ اگر خلیفہ جان لیتا کہ ابن راوندی' عباس صروم کے گھر گیا تھاتو وہ عباس صروم پر غضبناک نہ ہوتا اور عباس کہہ سکتا تھا کہ جونہی اس پر مرگی کا حملہ ہوا' اس نے اسے گھر سے نکال باہر کیا تھا اسے مرگی کا مریض ثابت کرنے کا دوسرا فائدہ یہ تھا کہ اگر خلیفہ ابن راوندی کی کتاب دیکھ لیتا تو اس کے قتل کا حکم صادر نہ کرتا کیونکہ اسلامی شریعت میں مرگی کا مریض جو کچھ لکھے یا کہے اس سے باز پرس نہیں کی جاتی۔ عباس صروم اپنی پہلی فرصت میں ابن راوندی کا نام خلیفہ تک پہنچانا چاہتا تھا کہ وہ مرگی کا مریض ہے لیکن چند دنوں تک اسے فرصت نہ مل سکی۔

وہ اور خلیفہ کے تمام درباری اس بات سے آگاہ تھے کہ صبح کے وقت خلیفہ سے بات چیت نہیں کرنی چاہئے کیونکہ دن اور رات میں کسی شرابی کے لئے بد ترین لمحات صبح کا وقت ہوتا ہے۔ چونکہ ہر شرابی صبح کے وقت سو کر اٹھنے کے بعد نشے کا احساس کرتا ہے اور اس قدر سستی محسوس کرتا ہے کہ کسی کے ساتھ بات بھی نہیں کر سکتا۔ جب کہ اس کے برعکس جو کوئی شراب کا عادی نہیں ہوتا صبح کا وقت اس کے لئے دن و رات میں سب سے اچھا وقت ہوتا ہے اور چونکہ انسان رات کے وقت آرام کرتا ہے اس لئے صبح اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ کام کا آغاز کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے یہی وجہ تھی کہ صبح کے وقت کوئی بھی متوکل سے بات چیت نہیں کرتا تھا اور کبھی کبھار وہ شراب کے نشے میں اس قدر مدہوش ہوتا تھا کہ ظہر سے قبل اس کے لئے شراب کا دسترخوان بچھاتے تھے۔ اس طرح وہ دوبارہ شراب پی کر رات کی شراب کا نشہ کافور کرتا اور ظہر کے بعد سو جاتا تھا اور جب عصر کے وقت سو کر اٹھتا تو کام کرنے کے قابل ہوتا اور اسی وقت وہ مملکت کے امور نمٹاتا یا پھر جن لوگوں سے ملاقات کرنا چاہتا ان سے ملاقات کرتا تھا۔

علماء کو وہ عصر کے وقت ملتا لیکن شعراء کو رات کے وقت جبکہ متوکل شراب خوری میں مشغول ہوتا شعراء اس کے حضور میں حاضر ہوتے تھے۔ متوکل جیسا کہ کہا گیا ہے اہل علم و ادب اور نیک خو انسان تھا لیکن شراب خوری کی وجہ سے اس کی عمر کا ایک حصہ برباد ہو گیا تھا۔

اس دوران جب کہ عباس صروم متوکل سے ابن راوندی کے متعلق بات کرنے کے لئے کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا' ابن راوندی جس مسافر خانے میں قیام پذیر تھا' وہاں مطلب بصری وراق کے لئے کتاب کے نسخے یا کاپیاں تیار کر رہا تھا۔ وہ روزانہ جو کچھ لکھتا وراق کے پاس لے جاتا اور اپنی مزدوری پاتا۔ مزدوری حاصل کرنے کے چند دنوں بعد ابن راوندی کی معاشی حالت اس وقت کی نسبت کہیں بہتر ہو گئی کہ جب وہ شروع شروع میں بغداد میں آیا تھا۔ لیکن روحانی طور پر وہ کافی رنجیدہ ہوا کیونکہ اس نے دیکھا کہ اسے جو کتاب دی گئی ہے اس میں غلطیاں ہیں اور وہ ان غلطیوں کی اصلاح نہیں کر سکتا اسے اس بات کی اجازت نہیں کہ اپنا نظریہ کتاب کے حاشیے پر لکھے۔

یہ اصفہانی شخص تیسری صدی ہجری کے پہلے پچاس سالوں کے دوران معروف شخصیت ہو گزرا ہے اگرچہ اس کی عمر زیادہ طولانی نہ تھی اور تقریباً" چالیس سال تھی پھر بھی اس نے اپنے پیچھے ایسی یادگاریں باقی چھوڑی ہیں جو اس کے ہم عصر جن کی عمر ستریا اسی سال تھی نہیں چھوڑ سکے۔

ابن راوندی پہلی صدی ہجری کے تمام متداولہ علوم سے واقف تھا چونکہ اس زمانے کے علوم آج کی مانند پھیلے ہوئے نہیں تھے اور ایک شخص اپنے زمانے کے متداولہ علوم کو سیکھ سکتا تھا جب کہ آج کے دور میں انسان صرف ایک ہی علم کا احاطہ کر سکتا ہے۔

پہلی صدی ہجری کے دوران مشرق میں ایسے انسان پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے اپنے زمانے کے تمام علوم ازبر کر لئے تھے لیکن ان میں بہت کم ایسے گزرے ہیں جنھوں نے اپنے معاصرین کے مقابلے میں مافوق الفطرت استعداد کا مظاہرہ کیا ہو یا انہوں نے ایسی چیزوں کے متعلق غور و فکر کیا ہو جو ان کے ہم عصر لوگوں کی عقل سے باہر تھیں ان میں سے ایک ابن راوندی بھی تھا جسے ریاضی اور طب جیسے علوم پر دسترس حاصل تھی۔ ابن راوندی وہ پہلا انسان ہے جس نے کہا کہ ہمارا بدن تمام عمر ایسے دشمنوں میں گھرا ہوتا ہے جو ہمیں ختم کرنا چاہتے ہیں لیکن اس جسم کے اندر ایسی چیزیں پیدا ہو جاتی ہیں جو ان دشمنوں کو دور کرتی ہیں اور انہیں ہم پر قابو پانے نہیں دیتیں۔ یہ نظریہ اس قدر توجہ طلب ہے کہ نہ صرف یہ کہ قدیم زمانے میں کسی نے اس کے متعلق نہیں سوچا بلکہ بیسویں صدی کے شروع میں بھی ڈاکٹروں نے اس موضوع کے بارے میں غور و فکر نہیں کیا انہیں اس بات کا علم نہ تھا کہ ہمارا جسم خود بخود ایسی چیزیں وجود میں لاتا ہے کہ دشمن جو ہمارے ارد گرد موجود ہیں اور مسلسل ہم پر حملے کرتے ہیں یہ چیزیں ان کے خلاف ہمارا دفاع کرتی ہیں۔ اس صدی کے آغاز میں ڈاکٹروں نے صرف سفید جسموں WBC کو جو ہمارے خون میں پائے جاتے ہیں دفاع کا واحد ذریعہ قرار دیا ہے اور جس چیز سے ہمارا بدن دشمنوں کو دور بھگانے کے لئے احاطہ کرتا ہے اس کے متعلق انہیں کوئی اطلاع نہ تھی یہاں تک کہ ۱۹۳۰ء عیسوی تک بھی ڈاکٹر اس نظریئے سے واقف نہ تھے۔

لہذا کیا یہ عجب بات نہیں کہ ابن راوندی کو مرگی کا مریض قرار دینے کے بعد اس کے اسی نظرئے کو اس کے مرگی کے مریض ہونے کی سند کے طور پر پیش کیا گیا تیسری صدی ہجری کے پہلے پچاس سالوں کے دوران علم طب وہی تھا جو بقراط سے مشرق اور مغرب تک پہنچا ہے اس علم میں علم طب کی اساس آدمی کی چار فطرتوں پر رکھی گئی ہے۔ اور ان چار فطرتوں کا توازن صحت کی ضمانت ہے اور اگر یہ توازن برقرار نہ رہے تو انسان بیمار پڑ جاتا ہے اور اگر اس توازن کا بگاڑ شدت اختیار کر جائے تو انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

بس اسی لئے ہر قسم کی بیماری خود انسان کے اندر پائی جاتی ہے باہر سے اس کا تعلق نہیں البتہ بعض ایسے محرکات جو بیماری کا باعث بن سکتے ہیں مثلاً" سردی گرمی اور اس طرح کی ماحول کی دوسری تبدیلیاں وغیرہ۔ کوئی بھی عقلمند انسان اس زمانے میں اس بات کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا کہ ہمارا جسم ساری عمر دشمنوں کے حملوں کا نشانہ بنا رہتا ہے۔ یہ نظریہ انیسویں صدی میں پاسچر نے پیش کیا اور جب تک سفید جسیموں کو دریافت نہ کر لیا گیا تو یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ آیا جسم میں مدافعت(Resistance) کرنے والی کوئی اور چیز بھی ہے یا نہیں؟

۱۹۴۰ء کے بعد مدافعین(Resisters) کی دریافت آہستہ آہستہ توجہ طلب بنی۔ بہر کیف ڈاکٹروں نے ۱۹۵۰ عیسوی میں ہی یقین کر لیا تھا کہ ہمارے بدن میں جسیموں کے علاوہ بھی مدافعت کرنے والے خلیات ہیں جنہیں انٹی باڈیز (۵۰) (Anti bodies) کا نام دیا جاتا ہے یا فرانسیسی میں انٹی کور کہا جاتا ہے اور ان کا کام یہ ہے کہ بیماری کے جراثیم جب ہمارے جسم پر حملہ کرتے ہیں خصوصاً"کسی دوسرے جسم کے جراثیم' تو یہ انہیں ختم کرتے ہیں۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنے کے لئے کہ انٹی باڈیز انگریزی یا انٹی کور فرانسیسی کے وجود کا نظریہ کس قدر جدید ہے۔ یہ بھی بتاتے چلیں کہ ۱۹۵۰ء کے بعد بھی اس دفاعی وسیلہ کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ڈاکٹر علاج معالجے میں اس پر کم توجہ دیتے تھے یہاں تک کہ ڈاکٹر رابرٹ ایلین گڈ امریکی نے جو سرطان کا سپیشلسٹ تھا' ثابت کیا کہ اگر ہمارا بدن انٹی باڈیز یا انٹی کور نہ بنائے تو تمام انسان سرطان کا شکار ہو جائیں کیونکہ ہر مرد و عورت کے جسم میں بچپن سے لے کر زندگی کے آخری دن تک ہر دن دس سے لے کر ایک ہزار تک سرطانی جراثیم پیدا ہوتے ہیں اور اگر دفاع کا یہ وسیلہ نہ ہو تو سرطانی جراثیم بہت تیزی سے نشوونما پاتے ہیں اور ان کی تعداد کئی ملین تک پہنچ جاتی ہے۔

لیکن چونکہ یہ دفاعی وسیلہ ان کے جسم میں موجود ہے اس لئے جونہی سرطانی خلیہ cell (۵۱) وجود میں آتا ہے اس دفاعی وسیلہ کے ذریعہ وہ ختم ہو جاتا ہے اور اسے دو حصوں میں تقسیم ہونے کی مہلت نہیں ملتی۔ جس سے جراثیموں کی افزائش نسل رک جاتی ہے۔ ڈاکٹر رابرٹ گڈ کہتا ہے بوڑھوں کا جوانوں کی نسبت سرطان میں زیادہ مبتلا ہونے کا سبب یہ ہے کہ ان کے جسم میں جوانوں کے مقابلے میں کم انٹی باڈیز پیدا ہوتے ہیں اور یہ دفاعی وسیلہ سرطانی خلیوں کو جسم میں افزائش نسل سے روک نہیں سکتا۔

ڈاکٹر رابرٹ کے بقول جو کوئی عموماً" سرطان کی بیماری میں مبتلا ہوتا ہے اس کے جسم میں انٹی باڈیز کافی مقدار میں نہیں بنتے۔ جو ڈاکٹر سرطان کے بیمار کا علاج کرنا چاہے تو اسے پہلے اس دفاعی وسیلے کو بیمار شخص کے جسم میں پہلے سے زیادہ مقدار میں انٹی باڈیز پیدا کر کے تقویت پہنچانی چاہئے۔

کیا حیرت کی بات نہیں کہ ایک عالم نے ساڑھے گیارہ سو سال پہلے ایک ایسا طبی راز پا لیا تھا کہ بیسویں صدی عیسوی کے ڈاکٹر اس صدی کے پہلے چالیس سالوں کے دوران اس کا مطالعہ کرنے اور اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کے لئے تیار نہ تھے ؟

جو کچھ ابن راوندی نے ایک ہزار ایک سو پچاس سال پہلے کہا تمام دنیا کے ڈاکٹر اس پر متفق ہیں اور ہر میڈیکل کالج میں اس نظریہ کو تسلیم کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ آدمی ساری عمر خطرناک دشمنوں کے نرغے میں رہتا ہے جنھوں نے اس کو ختم کرنے کی ٹھانی ہوئی ہے' یہ مائیکروب وائرس اور سرطانی خلیوں جیسے خلئے ہیں۔

ابن راوندی نے طب کے متعلق ایک دوسرا نظریہ بھی پیش کیا جس کے طرفدار آج موجود ہیں۔ وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی لاعلاج بیماری میں مبتلا ہو اور ڈاکٹر دواؤں سے اس کا علاج نہ کر سکیں تو اسے چاہیے کہ وہ اسے ایک دوسری بیماری میں مبتلا کریں تو پہلی بیماری ختم ہو جائے گی اور موت کا خطرہ ٹل جائے گا۔ ڈاکٹر جب پہلی بیماری کا علاج کر لے تو پھر وہ دوائی سے دوسری بیماری کا علاج بھی کر سکتا ہے۔

یہ نظریہ بھی تیسری صدی ہجری کے پہلے پچاس سالوں کے دوران ابن راوندی کی جنونی یادگاروں میں شمار کیا جاتا ہے' ڈاکٹر صاحبان نے مدتوں بعد اس پر غور کیا تو انہیں معلوم ہوا کہ جو کوئی کسی لا علاج مرض میں مبتلا ہوتا ہے اگر وہ کسی دوسری بیماری میں مبتلا ہو جائے تو اس کی پہلی بیماری آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہے۔

کئی تجربات سے ابن راوندی کے اس نظریہ کی تصدیق ہو چکی ہے لیکن یہ تجربات اتفاقاً" سامنے آتے ہیں۔ مثلاً" اتفاق سے ایسا ہوا کہ کوئی شخص کسی لاعلاج بیماری میں مبتلا تھا تو اسی دوران وہ ایک دوسری بیماری میں مبتلا ہو گیا اور اس طرح موت کا خطرہ ٹل گیا۔

لیکن ڈاکٹر کسی بیمار کا معالجہ کرنے کے لئے اس میں جدید بیماری نہیں پیدا کر سکے۔ انیسویں صدی عیسوی میں عملی طور پر اس قسم کا علاج کیا گیا' کیونکہ مائیکروب اور ٹاکسین (Toxin) (۵۴) کی دریافت کے بعد ڈاکٹروں نے مائیکروب یا ٹاکسین کو جسم میں داخل کرنے سے جسم میں بیماری پیدا کی اور انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں ایک امریکی ڈاکٹر ولیم کالی (William Cal) نے جو سرجن بھی تھا سرطانی مریضوں کے علاج کے لئے' ابن راوندی کے نظریہ کی پیروی کی جس کے بارے میں ہم نے ذکر کیا کہ صدیوں بعد اس نظریہ کی تائید کی گئی۔

ولیم کالی پہلے ٹاکسین کو سرطانی مریضوں کے جسم میں داخل کر کے انہیں بیماری میں مبتلا کرتا اور جب وہ جدید بیماری میں مبتلا ہو جاتے تو سرطان کی علامتیں آہستہ آہستہ ختم ہونے لگتیں حتیٰ کہ سرطان مکمل طور پر ختم ہو

جاتا۔ اس طرح ڈاکٹر ولیم کالی نے دو سو سے زیادہ سرطانی مریضوں کو موت کے چنگل سے چھڑایا' یہ وہ لوگ تھے کہ اگر انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو ایک سال کے بعد سرطان کی بیماری سے مر جاتے لیکن ولیم کالی کے علاج معالجے کی وجہ سے انہوں نے طبعی عمر گزاری۔ انہوں نے زندگی کی اکثر بہاریں دیکھیں حالانکہ وہ چالیس یا پینتالیس سال کی عمر میں سرطان کی بیماری میں مبتلا ہو چکے تھے۔ ان میں سے جو جلدی فوت ہوئے تھے وہ بھی چار یا پانچ سال تک زندہ رہے تھے۔ بہر کیف ولیم کالی کے طرز علاج نے بتا دیا کہ ابن راوندی کا نظریہ معتبر ہے اور اگر ایک لاعلاج مریض کا علاج نہ کیا جائے اور اسے کسی دوسری بیماری میں مبتلا کیا جائے تو یہ بات مریض کی طول عمر کا باعث ہوگی لیکن ولیم کالی کے بعد ڈاکٹروں نے اس کی روش کو نہیں اپنایا اس لئے کہ ان کا خیال تھا کہ پہلی بیماری کا دوسری بیماری کو مریض کے جسم میں داخل کرنے کے ذریعے معالجہ کرنا ایک چھوٹی خرابی کے ذریعے کرنا ہے اور ڈاکٹر صاحبان کا نظریہ ہے کہ اگر دوسری بیماری معمولی ہو تو وہ پہلی بیماری سے نجات نہیں دلا سکتی۔

پس مریض کے جسم میں ایک غیر معمولی بیماری پیدا کرنا ہوگی تاکہ پہلی بیماری ختم ہو اور اس وقت دوسری بیماری سے مریض کی موت واقع ہو جائے گی۔

مختصر یہ کہ ڈاکٹر ولیم کالی کے بعد اس کا طریقہ علاج ترک کر دیا گیا اور دوبارہ سرطان کی بیماری ایک لاعلاج بیماری بن گئی۔ حتیٰ کہ ڈاکٹر رابرٹ ایلن گڈ امریکی جو ابھی بقید حیات ہے' آج کل وہ سرطانی مریضوں کا علاج ابن راوندی کے نظریہ کی اساس پر کرتا ہے۔ وہ ان مریضوں میں تپ دق (Tuberculosis) کی بیماری پیدا کرتا ہے اس کے بقول اس بیماری کو پیدا کرنے کے نتیجے میں انٹی باڈیز جو سرطان کے خلاف جسم کا دفاع کرتی ہیں زیادہ فعال ہو جاتی ہیں اور جونہی تپ دق کا مرض اجاگر ہوتا ہے سرطان کی بیماری کے خلیات بتدریج جسم سے ختم ہوتے جاتے ہیں یہاں تک کہ کروڑوں خلیوں میں سے بدن میں پچاس یا چالیس ہزار خلیوں سے زیادہ باقی نہیں رہتے۔

رابرٹ ایلن گڈ کے طرز علاج کو سمجھنے کے لئے میڈیکل کی ایک کتاب لکھنے کی ضرورت ہے کہ یہ ڈاکٹر جو احتمال ہے کہ مستقبل میں سرطان کے مریضوں کا مکمل طور پر معالجہ کر سکے گا' کیسے مریضوں کا علاج کرتا اور سرطانی خلیوں کی تعداد کم کر کے پچاس ہزار تک پہنچا دیتا ہے۔

لیکن اس علاج کی بنیاد ابن راوندی کے نظریہ پر ہی ہے اور یہ قابل ڈاکٹر اپنے مریضوں کے جسم میں تپ دق پیدا کر کے ان کے سرطان Cancer کو اس طرح کم کرتا ہے کہ مریض اپنی امید سے زیادہ زندہ رہتا ہے اور اس طرح کا علاج چھوٹی خرابی کو کسی بڑی خرابی کے ذریعے دور کرنا نہیں کیونکہ تپ دق کا مرض آج کل قابل علاج ہے جب کہ سرطان کی بیماری لاعلاج ہے۔

# کیا ابن راوندی کیمیادان تھا ؟

ابن راوندی، جیسا کہ اس سے پہلے ذکر کیا گیا ہے، طب میں معقول نظریات رکھتا تھا۔ چونکہ امام جعفر صادقؑ کی دوسری یا تیسری نسل کے شاگردوں میں سے تھا اس لئے کیمیا سے بھی واقف تھا اور جیسا کہ کہا جاتا ہے، کیمیادان شمار ہوتا تھا۔

جب قدیم کیمیادانوں کی بات ہو رہی ہو تو یہ گمان نہیں کرنا چاہئے کہ وہ سونا یا چاندی بنانے کا کام کرتے تھے۔ قدیم کیمیادان آج کے کیمیادانوں کی مانند عناصر کی ترکیب اور تجزیہ میں لگے رہتے تھے اور ان میں سے کوئی بھی سونا یا چاندی بنانے کا قصد نہ رکھتا تھا۔ لیکن ان کے مقلدین اور وہ لوگ جو علم اور معلومات نہیں رکھتے تھے جب انہوں نے ایک کیمیادان کے کاموں کو دیکھا تو انہوں نے گمان کرلیا کہ اس کا کام سونا بنانا ہے اور پھر وہ بھی سونا بنانے کی طرف متوجہ ہوگئے۔ ایک مدت گزرنے اور سرمایہ صرف کرنے کےبعد جب وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکے تو انہوں نے ایسا کام شروع کردیا جس سے ان کو اپنی گزر اوقات کے لئے باقاعدہ ذریعہ معاش مل گیا۔

کیمیادانوں نے ایسی چیزیں بنائیں جن کی صنعتی لحاظ سے قدروقیمت سونے سے بھی زیادہ تھی لیکن کوئی بھی کیمیادان آج تک سونا نہیں بنا سکا۔ یورپ کے کیمیادانوں میں سے ایک کیمیادان جس کا نام نیکولا فلامل ہے اس نے قرون وسطیٰ میں کیمیاگری کے متعلق ایک کتاب لکھی تھی۔

یہ شخص جو چودھویں صدی عیسوی کے دوسرے پچاس سالوں کے دوران ہو گزرا ہےاس نے ابن راوندی کے مرنے کے ۶۱۰ سال بعد اس کے بقول سونا بنایا۔ موصوف اپنی کتاب میں یوں رقمطراز ہے کہ میں نے بتاریخ ۱۷ جنوری ۱۳۸۲ء کو سفید چونے کو شراب کے جوہر یعنی الکحل کے ساتھ شیشے کے ایک دیگچے میں دھیمی آنچ پر رکھا اور جب کسی حد تک ابلا تو اس کا رنگ پہلے سیاہ اور پھر برف کی مانند سفید (لیکن دھندلا) ہوگیا۔ اس کے بعد سخت ہوگیا اور زرد رنگ کی صورت اختیار کرگیا۔ میں نے اسے ایک ایسے دیگچے میں ڈال دیا جس میں پارہ تھا۔ جب پارہ گرم ہوا تو جو کچھ میں نے اس میں ڈالا تھا حل ہونے کے بعد ایک غیرشفاف زرد رنگ کا سنہری سیال وجود میں آیا۔ پھر میں نے اس دیگچے کو چولہے سے اتار لیا تاکہ ٹھنڈا ہوجائے اور اس کے ٹھنڈا ہونے کے بعد اسے ایک پیالے میں ڈالا جس میں پارا تھا۔ جب دوبارہ گرم کیا تو سب کچھ پارے میں حل ہوگیا۔ اسے جب ٹھنڈا کرکے میں نے دیکھا تو وہ سب کچھ سونا بن چکا تھا اور سونا بھی ایسا کہ عام سونے سے زیادہ نرم اور چمکدار تھا۔ یہ جو کچھ میں نے عرض کیا حقیقت ہے۔

شاید نیکولا فلامل نے اس سارے طریقہ کار کی تکمیل کے بعد زرد رنگ کی کوئی چیز حاصل کرلی ہو لیکن جو کچھ

اس نے دیگچے میں دیکھا تھا وہ سونا نہیں تھا۔ آج بھی اگر کوئی اس تجربے کی حالتوں کو جانچنا چاہے تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ اس طرح سونا نہیں بنتا۔ کیونکہ پارہ ایک مائع دھات ہے اور آگ پر رکھنے سے یہ جلد ہی بخارات بن کر اڑ جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ابن راوندی کیمیادان تھا وہ سونا بناتا تھا۔ لیکن یہ بات درست نہیں اس لئے کہ اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر بغداد میں داخل ہونے کے بعد سے اسے مطلب بصری کی کتابوں کے نسخے قلیل مزدوری کے عوض تیار کرنے کی کیا ضرورت تھی ؟

ابن راوندی اصفہانی جو تیسری صدی ہجری کے پہلے پچاس سالوں میں ہو گزرا ہے اسے ہالینڈ کے ارازم یا اراسموس (۵۳) کی شبیہہ قرار دیا گیا ہے جو سولہویں صدی عیسوی میں ہو گزرا ہے۔ حالانکہ ان دونوں کو ایک دوسرے کی شبیہہ نہیں قرار دیا جاسکتا۔ ارازم یا اراسموس جسے لوگ "دیوانگی کی مدح" اور "امال" جیسی کتابوں کے مصنف کے طور پر جانتے ہیں' ایک دیندار آدمی تھا۔ جبکہ ابن راوندی نے خود اپنی کتاب "الفرند" میں اپنے بے دین ہونے کا اعتراف کیا ہے۔

اگرچہ ارازم کو مرتد ٹھہرایا گیا تاہم عیسائی علماء نے اس پر کوئی الزام نہیں لگایا۔ ہالینڈی ارازم پر تہمت لگانے کی وجہ یہ تھی کہ اس نے عیسائیوں کی مذہبی کتب کے یونانی متن کا براہ راست ترجمہ کیا اور بغیر کسی تبدیلی کے عیسائیوں کی خدمت میں عہد قدیم اور عہد جدید سمیت عیسائی مذہب کی کتب پیش کریں۔ ارازم سے پہلے عیسائیوں کی مذہبی کتب جن میں عہد قدیم اور عہد جدید شامل تھیں' وولگات کہلاتی تھیں۔

وولگات لاطینی زبان میں تھیں۔ ان میں غلطیوں کے ساتھ ساتھ اضداد بھی پائی جاتی تھیں۔ ارازم نے قدیم عیسائی مذہبی کتابوں کا متن جو قدیم یونانی زبان میں تھا' حاصل کیا اور اسے ترجمہ کیا۔ چونکہ گوتنبرگ نے چھاپہ خانہ ایجاد کرلیا تھا لہٰذا ارازم نے عہد عتیق اور عہد جدید کو چھپوایا اور جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ عہد جدید میں چار اقسام کی انجیل شامل ہے۔ جب ارازم کا ترجمہ کتابی شکل میں عیسائیوں کے ہاتھ لگا تو وہ حیران اور مسرور بھی ہوئے کیونکہ اس میں اضداد یا تناقصات نہیں تھے اور وہ بے مقصد و بے معنی نکات سے بھی مبرا تھی۔ ان چار اقسام کی انجیل کے سابقہ متن میں مصنفین کی شخصیت کا اچھی طرح احساس نہیں ہوتا تھا جبکہ جدید متن میں جو ارازم ہالینڈی نے ترجمہ کیا ہے' ان چار انجیلوں کے مصنفین کی شخصیت کا بخوبی احساس ہوتا تھا اور قاری یہ سمجھتا تھا کہ ان چار انجیلوں کے مصنفین میں سے کوئی معلم اور وزارت تعلیم میں مبصر رہا ہوگا اور دوسرا کوئی ماہر قانون رہا ہوگا وغیرہ وغیرہ۔

اس بناء پر عہد عتیق اور عہد جدید کا ترجمہ جو یونانی متن سے ارازم نے کیا' دین عیسائیت کی ایک بڑی خدمت تھی۔ اسی لئے عیسائی بادشاہ ارازم پر مہربان ہوئے اور انہوں نے اسے تحفے تحائف بھیجے اور بوڈن کی

مشہور یونیورسٹی جو بلجیم میں واقع ہے اور گزشتہ ادوار میں جس کا شمار یورپ کی بڑی یونیورسٹیوں میں ہوتا تھا' اس کی طرف سے تدریس کی ایک کرسی اراسم کی خدمت میں پیش کی گئی۔ پھر کیا وجہ ہوئی کہ عیسائیت کے اتنے بڑے خادم کو مرتد ہونے کا الزام دیا گیا ؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اراسم بے معنی اور بے مفہوم مذہبی کتب کے مطالب کو واضح نہ کرتا اور اصل یونانی متن کے ترجمے کے ساتھ ساتھ غلطیوں کی تصیح نہ کرتا تو پروٹسٹنٹ مذہب وجود میں نہ آتا۔ اگرچہ اراسم نے پروٹسٹنٹ مذہب کی ایجاد میں ذرا بھی حصہ نہیں لیا لیکن اس کا ترجمہ پروٹسٹنٹ مذہب کو وجود میں لانے کا باعث ضرور بنا۔ اس لئے کہ اراسم کے ترجمے کی تقسیم کے بعد ایک گمنام مذہبی شخص (جسے آج سب لوتھر کے نام سے جانتے ہیں) اراسم کا ترجمہ پڑھنے کے بعد اس قدر محظوظ ہوا کہ اس نے عہد جدید یعنی چار انجیلوں کے اراسم کے ترجمہ کو جرمن زبان میں ترجمہ کرنے کا فیصلہ کرلیا تاکہ جرمن لوگ بھی انجیل پڑھیں اور اسے سمجھیں۔ لوتھر کو چار انجیلوں کے جدید ترجمہ کو پڑھنے سے قبل اس بات کا خیال نہیں آیا تھا کہ عیسائی مذہب میں ایک جدت وجود میں لائے مگر اراسم کا ترجمہ پڑھنے سے اس کے ذہن میں ایسا کرنے کی سوچ ابھری۔

بہرحال لوتھر نے اراسم کو جو خط لکھا ہے اس کے مطابق لوتھر نے اراسم کے عیسائی مذہب کو اصلاحی فکر سے جلا بخشی اور اس طرح پروٹسٹنٹ تحریک وجود میں آئی۔

جب لوتھر نے اراسم کے ترجمہ کو مدنظر رکھتے ہوئے چار انجیلوں کا جرمن زبان میں ترجمہ کیا اور پروٹسٹنٹ تحریک وجود میں لایا تو بعض کٹر مذہبی لوگوں نے اسے بدعتی قرار دیا اور بعض نے اسے مرتد سمجھا اور تہمت لگائی کہ اس نے عیسائی مومنین کے درمیان تفرقہ ڈالنے کے لئے اپنے علم کو عہد عتیق اور عہد جدید کے ترجمہ کے لئے استعمال کیا ہے۔

لیکن روشن خیال مذہبی پیشواؤں نے اس تہمت کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ چنانچہ آورین ششم نے جو کیتھولک مذہب کا پوپ اور سربراہ تھا اراسم کو خط لکھا اور کہا کہ مجھے اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ تم عہد عتیق اور عہد جدید کے ترجمہ کے ذریعے عیسائیت کی خدمت کرنا چاہتے تھے' لیکن اگر تم چاہتے ہو کہ دوسرے لوگ تم پر لگائی گئی تہمت کو غلط سمجھیں تو پروٹسٹنٹ مذہب کے متعلق اپنے نظریات کا علی الاعلان اظہار کرو۔

اگرچہ اراسم' لوتھر اور جدید مذہب کے دوسرے پیروکاروں سے کشمکش مول نہیں لینا چاہتا تھا لیکن جب پوپ کا خط ملا تو اس نے کتابی صورت میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "میں عیسائیت کے متعلق لوتھر اور اس کے مریدوں کے نظریات کو تسلیم نہیں کرتا"۔

باوجودیکہ اراسم نے اپنی کتاب میں لوتھر اور اس کے مریدوں کے نظریات کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے مگر

پھر بھی اس بیسویں صدی میں ابھی تک بعض ایسے لوگ موجود ہیں جن کے بقول اراسم نے پروٹسٹنٹ مذہب کا بیج بویا اور اس کے ترجمے نے لوتھر کو پروٹسٹنٹ تحریک وجود میں لانے کی طرف متوجہ کیا تھا۔

اس ساری بحث سے ہمارا مقصد یہ بتانا تھا کہ ابن راوندی کو اراسم سے تشبیہ دینا درست نہیں کیونکہ پہلا بے دین اور دوسرا دیندار تھا۔ یہاں تک کہ اگر ہم فرض کریں کہ اراسم عہد عتیق اور عہد جدید کے قدیم یونانی متن کے ترجمے کر کے کیتھولک مذہب میں تفرقہ اندازی کرنا چاہتا تھا تب بھی ان دونوں کو ایک دوسرے سے تشبیہ نہیں دی جاسکتی۔

ایک دن ابن راوندی کتاب کے رقم شدہ صفحات کو مطلب بصری کے ہاں لے کر پہنچا تاکہ اس سے اپنا معاوضہ حاصل کرے تو اس نے مطلب بصری کے پاس ایک شخص کو موجود پایا۔ جب اس کتاب کے صفحات مطلب بصری کے ہاتھوں میں پہنچے تو اس شخص نے ان پر ایک نظر ڈالی تو ایک صفحے کے مطالب اسے جانے پہچانے لگے۔ اس نے وراق سے کہا گویا یہ میری کتاب ہے۔ مطلب بصری نے کہا ہاں آپ ہی کی کتاب ہے' میں نے اس کے نسخے (کاپیاں) تیار کرنے کے لئے ابوالحسن (ابن راوندی) کو دی تھی۔ اس شخص نے ابن راوندی پر ایک نگاہ ڈالی اور پوچھا۔ کہاں کے باسی ہو ؟

ابن راوندی نے اپنا وطن بتایا۔ اس شخص نے ابن راوندی کے خط پر ایک سرسری نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔ تم خوش خط نہیں ہو۔ مطلب بصری نے کتاب کے مولف کو باور کرانے کے لئے کہ ابن راوندی ایک عام سا کاتب ہے کہا' یہ اس کتاب کی کاپیاں تیار کر رہا ہے جو میں نے تم سے خریدی ہے ؟

مولف کتاب نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔ اگر ایسا ہے تو پھر کوئی حرج نہیں' ایک خراب خط آدمی بھی میری کتاب کی کاپیاں تیار کر سکتا ہے۔ جب ابن راوندی نے دیکھا کہ اس کو حقارت کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے تو چونکہ اس نے مولف کا نام کتاب میں دیکھا تھا پوچھا۔ کیا صمصام کوفی تم ہی ہو ؟ اس شخص نے کہا۔ ہاں ! ابن راوندی بولا۔ تمہاری کتاب میں غلط سلط مطالب کی بھرمار ہے۔ صمصام کوفی نے پوچھا۔ تم کون ہوتے ہو جو میری کتاب کے مطالب کے بارے میں اظہار خیال کرو ؟ ابن راوندی نے کہا۔ میں نے خوشخطی سیکھنے کے لئے علم حاصل کیا لہٰذا میں کتاب کے مطالب کے کچھ حصے کی غلطیوں کی نشاندہی کر سکتا ہوں۔

صمصام کوفی نے کہا۔ ان میں ایک غلط مطلب مجھے بتاؤ ؟ ابن راوندی نے جواب دیا۔ ان میں سے ایک غلطی وہ ہے جو اس حصے میں موجود ہے جس سے میں نے کل دن اور رات میں نسخہ تیار کیا ہے۔ پھر اس نے وہ صفحات جو مطلب بصری کو دیئے تھے اس سے واپس لے کر ایک صفحہ صمصام کوفی کے ہاتھ میں تھمایا اور کہا' پڑھو۔ صمصام کوفی نے اسے پڑھا اور کہا۔ یہ مفہوم تمہیں کیوں غلط لگا ؟ ابن راوندی نے کہا۔ اس لئے کہ تم نے اس صفحے میں لکھا ہے کہ آدمی اپنے کام میں خودمختار نہیں اور اگر آدمی اپنے کام میں خودمختار نہ ہو تو وہ کیسے

جزا یا سزا کا مستوجب ہے ؟ صمصام کوفی نے کہا۔ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا' تم کیا کہنا چاہتے ہو ؟ ابن راوندی بولا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر میں اپنے کام میں خودمختار نہیں ہوں اور جو کچھ میں انجام دوں وہ کسی دوسرے کے اختیار میں ہو تو اس کی سزا یا جزا مجھے کیوں ملتی ہے ؟

اس دوران ایک دوسرا مولف آیا۔ جونہی وہ صمصام کوفی اور ابن راوندی کی بحث سے مطلع ہوا تو اس بحث میں شامل ہوگیا' اس طرح یہ بحث مباحثہ طول کھینچ گیا۔ اس بحث کا موضوع ایک نہ ختم ہونے والا موضوع ہے کیونکہ جس دن سے فلسفہ وجود میں آیا اس دن سے لے کر آج تک جو لوگ انسان کے خودمختار ہونے اور انسان کے خودمختار نہ ہونے کے قائل ہیں ان کے درمیان اتفاق رائے نہیں ہوسکا اور جب تک فلسفہ باقی ہے جبرو اختیار کے ان طرفداروں کے درمیان شاید یہ بحث جاری رہے گی۔ اس بناء پر ہم اس مقام پر اس پرانی بحث کو جو ابن راوندی اور اس کے مخالفین کے درمیان ہوئی نہیں دہرائیں گے کیونکہ سب جانتے ہیں کہ اس بحث کا نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلتا۔

بہرحال اس مباحثے سے جان گئے کہ معلومات کے لحاظ سے ابن راوندی کو دوسروں پر برتری حاصل ہے۔ وہ یونانی حکماء کو جانتا ہے اور جبرو اختیار کے بارے میں ان کے نظریات سے بھی بخوبی آگاہ ہے۔ مطلب بصری اگرچہ ایک وراق تھا لیکن چونکہ اس نے عمر کا کافی حصہ کتابوں کے نسخے تیار کرنے میں گزارااس بات کو سمجھتا تھا کہ ابن راوندی ان دو مولفین کے مقابلے میں علم و دانش کے لحاظ سے برتر ہے اور ابن راوندی محض کاتب ہونے کے باوجود دوسرے دو افراد سے بہتر سوجھ بوجھ رکھتا ہے اور نہایت قوی دلائل پیش کرتا ہے۔ وہ اس کے دلائل کو رد نہیں کرسکتے۔

جس دن ابن راوندی نے پہلی بار مطلب بصری کی دی ہوئی کتاب کے حاشیہ پر وضاحت لکھی تھی اس دن مطلب بصری نے اس حاشئے کا مطالعہ نہیں کیا تھا اس لئے وہ ابن راوندی کی قابلیت کا اندازہ نہیں کرپایا تھا۔ لیکن اس دن جب اس نے سنا کہ ابن راوندی کیا کہتا ہے تو اس کی علمی برتری اس پر آشکار ہوگئی کیونکہ جو لوگ کتابوں کے نسخے تیار کرنے میں عمر صرف کردیتے تھے وہ کتاب شناس ہونے کے علاوہ علماء کی وقعت سے بھی آگاہ ہوجاتے تھے۔ آج چونکہ کتابوں کے نسخے کوئی نہیں تیار کرتا بلکہ کتابیں یا تو چھپتی ہیں یا ان کی فوٹوکاپی کی جاتی ہے اس لئے ایسے افراد نہیں ملتے۔ بہرکیف آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو کتاب کے ساتھ ایک عمر گزارتے ہیں تو آخرکار وہ عالم شناس اور کتاب شناس کا درجہ حاصل کرلیتے ہیں چاہے وہ پرانی کتابیں بیچنے والے ہی کیوں نہ ہوں۔

اس بحث میں صمصام کوفی' ابن راوندی کے سامنے نہ ٹھہر سکا اور کسی کام کا بہانہ کرکے وہاں سے چلتا بنا۔ اس طرح دوسرے مولف نے بھی صمصام کوفی کے جانے کے بعد فرار ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔ ان دونوں کے جانے کے بعد مطلب بصری نے ابن راوندی سے کہا تم اصفہان میں کیا کرتے تھے ؟ ابن راوندی نے کہامیں

وہاں مدرس تھا۔ مطلب بصری نے کہا۔ میں جانتا ہوں تو ایک عالم ہے اور میں اس شرط کے ساتھ تمہاری مدد کر سکتا ہوں کہ جب تیرے حالات سدھر جائیں گے تو مجھے فراموش نہیں کرے گا' چونکہ میں نے چند ایسے اشخاص کی بغداد میں آنے کے بعد مدد کی جن کا یہاں جاننے والا کوئی نہ تھا لیکن جب وہ اونچے مقامات پر فائز ہوئے تو مجھے بھول گئے' جب کبھی میں ان کے ہاں جاتا تھا وہ مجھے درخور اعتنا نہیں گردانتے تھے' جب وہ میری کوئی مدد کرنا چاہتے تو صرف مجھے کتاب دے دیتے تاکہ میں اس کی کاپی کروں۔ ابن راوندی نے اپنا اظہارخیال کرتے ہوئے بتایا' میں وہ انسان نہیں ہوں کہ کوئی مشکل اوقات میں میری مدد کرے اور جب میرے حالات سدھر جائیں تو میں اسے بھول جاؤں۔

مطلب بصری کہنے لگا سبھی یہ وعدہ کرتے ہیں مگر اس پر عمل کم ہی کرتے ہیں اور جونہی تنگدستی فراخ دستی میں' جھونپڑی محل میں اور فقیرانہ لباس شاہانہ لباس میں تبدیل ہوتا ہے تو اس بات کو فراموش کر دیتے ہیں کہ تنگدستی کے وقت انہوں نے دوسروں کے ساتھ کیا وعدہ کیا تھا ؟ اور اگر سابقہ محسنوں میں سے کوئی ان کے گھر کا رخ کرے تو دربان کہتا ہے کہ میرا صاحب تجھے نہیں جانتا۔ اگر وہ گھر کے مالک سے ملنے پر اصرار کرے تو غلام گھر سے باہر آکر اس کی ایسی مرمت کرتے ہیں کہ اسے چھٹی کا دودھ یاد آجاتا ہے۔

ابن راوندی نے کہا۔ اے مطلب بصری اگر کوئی کسی کے ساتھ نیکی کرنا چاہے تو وہ اس کی اس قدر اتمام حجت نہیں کرتا کہ اسے اطمینان ہوجائے کہ اس کی نیکی کا بدلہ چکا دے گا۔ میں تم سے کوئی غیرمعمولی مدد نہیں چاہتا اور یہ تمہاری مرضی ہے کہ میری اعانت کرو یا نہ کرو ! مطلب بصری نے کہا۔ اس کے باوجود کہ مجھے یقین نہیں ہے کہ تم میری نیکی کا صلہ چکا دوگے میں تمہیں ایک عالم سمجھ کر تمہاری مدد کرتا ہوں' تم ایک کتاب چاہے وہ جھوٹی ہی کیوں نہ ہو کسی دلچسپ موضوع پر لکھو۔ بہتر یہ ہے کہ وہ فلسفہ کے متعلق ہو تاکہ میں اپنے سارے وسائل بروئے کار لاتے ہوئے خلیفہ کی خدمت میں پیش کروں۔ اس طرح خلیفہ تمہاری طرف متوجہ ہوگا اور تمہیں انعام و اکرام سے نوازے گا۔ اس کے ساتھ تمہیں ایسے کام پر لگائے گا کہ پھر تمہیں معاش کے بارے میں کوئی فکر نہ رہے گی۔ لیکن جب تک تم خلیفہ کی خدمت میں کتاب پیش نہیں کروگے' اس کی خدمت میں رسائی نہیں حاصل کرسکتے۔

ابن راوندی بولا۔ میرے پاس ایک کتاب لکھی ہوئی تیار ہے' تم اسے اپنے وسائل کو بروئے کار لاکر خلیفہ کی خدمت میں پیش کرسکتے ہو۔ مطلب بصری نے پوچھا۔ کیا تمہاری کتاب کا موضوع فلسفہ ہے ؟ ابن راوندی نے اثبات میں جواب دیا۔ اس کے بعد جب ابن راوندی اپنا معاوضہ حاصل کرکے جانے لگا تو مطلب بصری کو ایک بات یاد آئی اور اس نے پوچھا۔ کیا تمہارے پاس کتاب کا صرف ایک ہی نسخہ ہے ؟ ابن راوندی نے کہا ہاں۔ مطلب بصری کہنے لگا۔ اس سے قبل کہ میں تمہاری کتاب کو خلیفہ تک پہنچاؤں تم اس کا ایک اور

نسخہ تیار کرلو کیونکہ جو نسخہ تم خلیفہ کی خدمت میں پیش کروگے وہ اگر اسے پسند آیا تو وہ اس کی لائبریری میں جمع ہو جائے گا اور وہ تمہیں پھر واپس نہیں ملے گا۔ ابن راوندی نے کہا اس بات کو چھوڑیئے کیونکہ کتاب کا مسودہ میرے پاس موجود ہے' اگر خلیفہ نے میری کتاب خرید لی تو میں اس سے دوسرا نسخہ تیار کرلوں گا۔

ابن راوندی کی کتاب "الفرند" فلسفہ کے متعلق تھی لیکن ایسے فلسفے کے متعلق کہ کتاب کے بعض ابواب میں تاریخ اور جغرافیہ سے بھی مدد لی گئی تھی۔

آج یہ کتاب موجود نہیں ہے لیکن اس کے کچھ اقتباسات مغربی مسلمان علماء کی کتابوں میں ملتے ہیں جن سے اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ یہ خاصی دلچسپ کتاب شمار کی جاتی تھی۔

دوسرے دن ابن راوندی نے اپنی کتاب مطلب بصری کو دی اور دوسری کتاب کا وہ حصہ جو مزید نسخے تیار کرنے کے لئے اسے ملا تھا اس نے وہ بھی مطلب بصری کی خدمت میں حاضر کرکے اپنا معاوضہ حاصل کیا۔ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں جب ابن راوندی نے اپنی کتاب الفرند عباس صروم کی خدمت میں پیش کی تو اس شخص نے حیرانگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس کتاب کی تصنیف اور اس کے دوسرے لوگوں تک پہنچنے کے بعد تم کیسے زندہ ہو ؟ عباس صروم کو اس بات کا حق تھا کہ وہ ابن راوندی کے زندہ رہ جانے پر حیرت کا اظہار کرے۔ چونکہ امام جعفر صادقؑ نے شیعہ مکتب میں آزادی بحث کا آغاز کردیا تھا اس لئے ابن راوندی کو اس بات کا احساس نہ تھا کہ شیعی ثقافت جس کی بنیاد امام جعفر صادقؑ نے رکھی تھی اور جسے انہوں نے وسعت بخشی تھی اس میں کسی شخص کو روایتی طریقوں کے خلاف بات کرنے کے جرم میں واجب القتل قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔ بیشک اس آزادی بحث سے شیعی ثقافت کی جڑیں مضبوط ہوئیں۔

ابن راوندی کا عباس صروم سے رجوع کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اس کے ذریعے خلیفہ کے دربار تک رسائی حاصل کرکے خلیفہ سے بہرہ مند ہو۔ جس وقت عباس صروم نے اسے اپنے ہاں سے نکال دیا تو ابن راوندی نے اس کے اس عمل کو عباس صروم کے حسد پر محمول کیا۔ اگر ابن راوندی اس بات کا قائل ہوجاتا کہ واقعی عباس صروم نے اس سے حقیقت بیان کی ہے اور اس کی جان خطرے میں ہے تو وہ اپنی کتاب کو ہرگز خلیفہ تک پہنچانے کے لئے مطلب بصری کے حوالے نہ کرتا۔ علمی حسد ہر زمانے میں رہا ہے بلکہ بعض ادوار میں تو اس قدر زیادہ رہا ہے کہ استاد سکھانے میں لیت و لعل سے کام لیتے تھے اور اپنا سارا علم اپنے شاگردوں کو نہیں سکھاتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو وہ علم میں پیشرفت کرکے استاد کی جگہ لے لیں۔ خاص طور پر جب کوئی عالم خلیفہ یا کسی اور حاکم کے دربار سے وابستہ ہوجاتا تھا اس کا علمی حسد بہت بڑھ جاتا تھا۔ اگر حاسد میں طاقت ہوتی تو وہ محسود کو سرے سے مٹا دیتا تھا تاکہ خلیفہ کے دربار یا کسی دوسرے دربار میں وہ مقبول نہ ہوسکے۔ گزشتہ ادوار میں کوئی بھی شخص استاد پر یہ تنقید نہیں کرتا تھا کہ کیوں اس نے اپنے علم کا فلاں حصہ اپنے شاگردوں کو نہیں سکھایا۔

اگر کوئی اس کی بھلائی کے لئے زبان کھولتا اور استاد سے اس بارے میں پوچھتا تو وہ اعتراض کرنے والے کو خاموش کرنے کے لئے دوٹوک الفاظ میں وضاحت کردیتا اور کہتا کہ میں نے اس لئے نہیں سکھایا کہ میرے شاگرد نااہل تھے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میرا علم نااہل ہاتھوں میں پہنچے۔ اس وضاحت کو سب قبول کرلیتے تھے۔

ابن راوندی کو اس میں کوئی شک نہ تھا کہ عباس صروم کا خلیفہ سے متعارف کرانے کے ضمن میں اس کی مدد سے پہلوتہی کرنے کی وجہ حسد تھا اور چونکہ اس نے مطلب بصری کو حاسد نہیں پایا تھا لہٰذا اس نے کتاب اس کے حوالے کردی تاکہ وہ اسے خلیفہ کی خدمت میں پیش کرے۔

ہمیں نہیں معلوم کہ مطلب بصری نے کس ذریعے سے ابن راوندی کی کتاب خلیفہ کی خدمت میں پہنچائی چونکہ تاریخ اس بارے میں خاموش ہے۔ اس زمانے کے تمام دوسرے کاتبوں کی مانند مطلب بصری نے بھی ابن راوندی کی کتاب خود نہیں پڑھی تھی اور اگر وہ اسے پڑھتا اور سمجھتا کہ ابن راوندی نے اپنی کتاب میں کیا لکھا ہے تو وہ اسے عباسی خلیفہ کے دربار میں پہنچانے سے گریز کرتا کیونکہ اس کتاب نے جس طرح ابن راوندی کو مشکل میں ڈالا تھا ممکن تھا کہ مطلب بصری کو بھی اسی طرح کسی مصیبت میں مبتلا کردیتی۔

چونکہ مطلب بصری جیسا شخص جو معروف کاتب تھا اور چند دوسرے کاتب بھی اس کی وساطت سے بادشاہ کے درباری علماء کی کتابوں کے نسخے تیار کرتے تھے لہٰذا خلیفہ کے درباری علماء کے ایک گروہ سے اس کی جان پہچان تھی اور زیادہ احتمال یہی ہے کہ اس نے انہی میں سے کسی کی وساطت سے ابن راوندی کی کتاب خلیفہ کی خدمت میں پیش کی۔

جس وقت یہ کتاب خلیفہ کے ہاتھوں میں پہنچی اس وقت تک عباس کو فرصت مل چکی تھی کہ وہ خلیفہ سے کہے کہ ابن راوندی مرگی کا مریض ہے۔ متوکل نے ان لوگوں کی مانند کتاب کو درمیان سے کھولا جو کسی کتاب کو پڑھنا نہیں چاہتے بلکہ صرف چند جملے پڑھ کر یہ اندازہ لگانا چاہتے ہیں کہ کتاب میں کیا لکھا ہے۔ جب وہ کچھ سطریں پڑھ چکا تو کتاب میں اس کی دلچسپی بڑھ گئی۔ جس چیز نے خلیفہ کی توجہ کو مرکوز کیا تھا وہ کاشمر میں ایک درخت کا تذکرہ تھا جسے زردشتی نہایت محترم شمار کرتے تھے اور اس کے بارے میں وہ معتقد تھے کہ اسے زردشت نے کاشت کیا ہے۔ جب متوکل نے کاشمر کے اس درخت کا تذکرہ آخر تک پڑھا تو غضب میں آگیا (۵۴)۔

جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ ابن راوندی نے تاریخی اور جغرافیائی مباحث کو اپنی کتاب میں فلسفیانہ نتائج حاصل کرنے کے لئے رقم کیا اور سرو کے اس درخت کے بارے میں بحث سے اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ درخت ذات باری تعالیٰ کی طرف متوجہ کرنے کا سبب بنا اور نہ صرف زردشتی اس کی پوجا کرتے تھے بلکہ مسلمان بھی اس سرو کی پرستش کرتے تھے۔

جب متوکل کو کاشمر میں سرو کے اس درخت کے متعلق علم ہوا تو وہ غضبناک ہوگیا اور کہنے لگا مجھے ہرگز اس

بات کا علم نہ تھا کہ میری قلمروئے خلافت میں کسی درخت کی پوجا ہوتی ہے۔ میرا زردشتیوں سے کوئی تعلق نہیں' وہ جسے چاہیں اس کی پوجا کریں لیکن میں ہرگز برداشت نہیں کرسکتا کہ کاشمر کے مسلمان کسی درخت کو اپنا معبود جانیں اور اس کی پوجا کریں۔ اگر یہ درخت اس طرح پایا جاتا ہے جس طرح اس کتاب میں اس کا تذکرہ ہوا ہے تو اسے اکھاڑ پھینکا جائے اور اگر اس بات کا امکان ہو کہ اس کی جڑیں ہری ہوجائیں گی اور ایک مرتبہ پھر یہ درخت بن جائے گا تو اس کی جڑوں کو بھی اکھاڑ کر پھینکیں تاکہ دوبارہ ہرا نہ ہوسکے۔ اس لحاظ سے ابن راوندی پہلا شخص تھا جس نے متوکل کو یہ درخت اکھاڑنے کی فکر دلائی۔ متوکل نے طاہر بن عبداللہ بن طاہر والی خراسان کو اس درخت کے متعلق اطلاع دی' طاہر بن عبداللہ بن طاہر متوکل کے مقربین میں تھا اور متوکل کی زندگی کے آخری ایام تک اس کا وفادار رہا۔

اس حاکم خراسان نے عربوں کے تسلط کے بعد پہلی ایرانی بادشاہت قائم کی۔ چونکہ طاہر بن عبداللہ بن طاہر نے خراسان کی حکومت کا کچھ حصہ یعقوب لیث کے حوالے کردیا تھا اسی کے نتیجہ میں بادشاہت کے لئے راہ ہموار ہوئی۔ البتہ یہ بحث ہمارے موضوع سے میل نہیں کھاتی۔

جونہی طاہر بن عبداللہ بن طاہر کو خلیفہ کا یہ خط موصول ہوا اس نے درخت کے بارے میں تحقیق کی تو پتہ چلا کہ وہ درخت کاشمر میں موجود ہے اور زردشتی و مسلمان دونوں اس کا احترام کرتے ہیں۔ اس نے خلیفہ کو لکھ بھیجا کہ ایسا درخت موجود ہے جسے لوگ قابل احترام گردانتے ہیں لیکن کوئی بھی اس کی پوجا نہیں کرتا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ حاکم خراسان کی اس درخت کے بارے میں رپورٹ سے بادشاہ مطمئن ہوگیا اور درخت اکھاڑنے سے باز رہا۔

کیونکہ اگر قزوینی کی تالیف آثار البلاد کو سند مانا جائے تو جس وقت کاشمر کے سرو کے اس درخت کے ٹکڑے خلیفہ کے دارالحکومت میں بھیجے گئے تو متوکل اپنے بیٹے مستنصر کے ہاتھوں قتل ہوچکا تھا۔ یاد رہے کہ ابن راوندی ۲۳۶ھ میں بغداد میں وارد ہوا جبکہ متوکل اپنے بیٹے کے ہاتھوں ۲۴۷ھ میں قتل ہوا۔ ان دو تاریخوں کے درمیان گیارہ سال کا عرصہ ہے۔ ابن راوندی کی کتاب قاعدے کی رو سے ۲۳۶ھ میں یا اس کے ایک سال بعد خلیفہ کے ہاتھوں میں پہنچی ہوگی اور کاشمر کے درخت کو ۲۴۷ھ میں اس سے ایک سال قبل ۲۴۶ھ میں اکھاڑا گیا ہوگا۔

تحقیق کی رو سے ہمیں معلوم نہیں کہ کاشمر کا درخت کس تاریخ کو اکھاڑا گیا۔ لیکن اسلامی تواریخ سے پتہ چلتا ہے کہ جس وقت اس درخت کی لکڑی دارالحکومت بغداد میں پہنچی متوکل زندہ نہ تھا۔ گویا یہ درخت متوکل کے قتل کے سال یا اس سے ایک سال پہلے اکھاڑا گیا ہوگا۔ مسلمان مورخین کے بقول وہ درخت اس قدر بڑا تھا کہ اس کی شاخیں ایک وسیع رقبے کا احاطہ کئے ہوئے تھیں۔ اس کی شاخیں پانچ سو گز لمبی اور اتنی ہی چوڑی

تھیں۔ (۵۵)

اگرچہ بعض مسلمان مورخین کے بقول ہزاروں پرندے پورا سال اس درخت پر گھونسلے بنائے رکھتے تھے مگر چونکہ پرندے مخصوص موسم میں گھونسلے بناتے اور انڈے دیتے ہیں لہٰذا پرندوں کے سارا سال گھونسلے بنائے رکھنے والی روایت صحت کے اعتبار سے مشکوک ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ زمین کے نصف خشک حصے میں (جس میں کاشمر بھی شامل ہے) خشکی کے پرندے صرف موسم بہار میں گھونسلے بناتے اور انڈے دیتے ہیں۔

اگر مسلمان مورخین کسی شہر کے بارے میں ایسی بات کہتے مثلاً" یہ کہ کاشمر اتنا بڑا شہر تھا تو بات بنتی تھی لیکن اتنے بڑے درخت کے وجود کو عقل تسلیم نہیں کرتی جیسا کہ اس ضمن میں بعض مسلمان مورخین نے یہاں تک مبالغے سے کام لیا ہے کہ ایک فوج اس درخت کے سائے میں استراحت کرتی تھی۔

نامعلوم راویوں کے حوالے سے اس درخت کے متعلق اور بھی کئی روایات مشہور ہیں۔ ان میں سے ایک روایت یہ ہے کہ جب متوکل نے والی خراسان کو اس درخت کے اکھاڑنے کا حکم صادر کیا تو اس کے درباری جادوگر نے اسے منع کرتے ہوئے کہا کہ جس دن یہ درخت اکھاڑا جائے گا تمہاری زندگی ختم ہوجائے گی اور ویسا ہی ہوا۔ یعنی جونہی وہ درخت اکھاڑا گیا متوکل اپنے بیٹے کے ہاتھوں قتل ہوگیا اور اس کی عمر نے وفا نہ کی کہ وہ کاشمر کے سرو کے اس درخت کو جسے بغداد لایا گیا دیکھ سکتا۔ یہ روایت قابل قبول نہیں کیونکہ عباسی خلفاء کے ہاں جادوگر نہیں ہوتے تھے اور نہ ہی وہ جادوگری کے معتقد تھے اور اگر جادوگر ہوتے بھی تو ایسی بات منہ سے نہیں نکال سکتے تھے کیونکہ کسی جادوگر کی یہ جرات نہ ہوتی تھی کہ وہ عباسی خلفاء کو جن کی اکثریت شرابی تھی کہہ سکتے کہ تمہاری زندگی کا چراغ گل ہو جائے گا۔

متوکل وہ خوش قسمت خلیفہ تھا کہ شرابی ہونے کے باوجود اس کی عمر دوسرے عباسی خلفاء سے زیادہ تھی۔ وہ چالیس سال سے زیادہ عرصے تک زندہ رہا اور اگر قتل نہ ہوتا تو شاید پچاس کے قریب بہاریں دیکھتا۔ عباسی خلفاء کی اکثریت شراب خوری میں افراط برتنے کی بناء پر جوانی ہی میں موت کے گھاٹ اتر گئی تھی۔

جادوگری چوتھی صدی ہجری کے بعد عباسیوں کے دربار میں داخل ہوئی۔ بہرکیف کوئی بھی خلیفہ جادوگری کا معتقد نہ تھا البتہ کبھی کبھی دل بہلانے کے لئے جادوگر سے رجوع کرتے تھے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ جس وقت زردشتی مذہب کے پیشوا الحراق (۵۶) نے سنا کہ متوکل نے کاشمر کے سرو کے درخت کو اکھاڑنے کا حکم دیا ہے تو اس نے کہا کہ یہ شخص قتل ہوجائے گا اور اس کی نسل برباد ہوجائے گی۔ یہ روایت بھی غلط ہے اس لئے کہ زردشتی مذہب کے پیشوا کا نام الحراق ہے یہ بعید از قیاس ہے کیونکہ یہ ایک عربی نام ہے۔ علاوہ ازیں اگرچہ متوکل قتل ہوا لیکن اس کی نسل برباد نہیں ہوئی اور مزید چار سو سال تک عباسیوں کی خلافت قائم رہی۔ ان میں سے بعض روایات مجہول ہیں اور بعض قابل اعتماد نہیں جو بات قابل قبول ہے وہ یہ ہے کہ اگر ابن راوندی کی

کتاب متوکل کے ہاتھوں میں نہ پہنچتی تو کاشمر (۵۷) میں سرو کا درخت نہ کاٹا جاتا۔ اس درخت کے محل وقوع کے بارے میں اختلافی روایات ملتی ہیں۔

## متوکل اور ابن راوندی

جس دن متوکل نے ابن راوندی کی کتاب کھول کر اس میں کاشمر میں سرو کے درخت کا تذکرہ پڑھا' عباس صروم خلیفہ کے حضور میں حاضر تھا بولا۔ اے امیرالمومنین' اس کتاب کا مصنف مرگی کا مریض ہے۔ متوکل نے کہا۔ میں اس کتاب میں اس کے مرگی کا مریض ہونے کی کوئی علامت نہیں پاتا اور جو کچھ کتاب میں لکھا ہوا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شخص جنرل نالج رکھتا ہے۔

عباس صروم بولا' اگر امیرالمومنین کتاب کے دوسرے حصوں کا مطالعہ کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ شخص مرگی کا مریض ہے اور اس کے بیانات کو درخور اعتناء نہیں سمجھنا چاہئے۔ لیکن اس دن خلیفہ نے کتاب کے کافی حصے کا مطالعہ کرلیا تھا اور وہ مزید اسے پڑھنے کی سکت نہیں رکھتا تھا لہٰذا اس نے شراب پینے کو ترجیح دی۔ آخرکار عباس صروم نے متوکل کے ذہن میں یہ بات ڈال دی کہ ابن راوندی مرگی کا مریض ہے تاکہ اگر ابن راوندی (جو بغداد آچکا تھا) اس کے دربار سے منسلک ہوجائے تو عباس صروم کو اس سے کوئی خطرہ نہ ہو۔

جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ اکثر عباسی خلفاء کی روش ایسی تھی کہ وہ طرح طرح کے حرام کاموں کا ارتکاب کرتے تھے لیکن اگر کوئی دوسرا ان کاموں کا مرتکب ہوتا تو اس پر حد جاری کرتے یا اسے قتل کر دیتے تھے اور اپنے اعمال سے یہ ظاہر کرتے تھے کہ خلیفہ پر اسلامی تعزیرات لاگو نہیں ہوتیں اور وہ ان تعزیرات سے بے نیاز ہیں۔

عباسی خلفاء خواہشات کی پیروی کرنے میں اس قدر بیباک تھے کہ فسق و فجور میں مبتلا ہونے میں کوئی عار نہیں محسوس کرتے تھے اور اپنے آپ کو عوام و خواص سے اس قدر برتر جانتے تھے کہ حرام کاموں کا علی الاعلان ارتکاب کرتے تھے۔ لوگ انہیں دیکھتے رہتے تھے لیکن ان پر اعتراض نہیں کرسکتے تھے کیونکہ ایک طرف تو لوگ ان سے خوف کھاتے تھے اور دوسرے وہ اعمال کا اتنی مرتبہ تکرار کرتے کہ لوگ اسے ایک معمولی بات شمار کرتے تھے۔ لوگ نہ تو ان کے اعمال سے متحیر ہوتے اور نہ ہی متنفر ہوتے تھے۔ کچھ دنوں بعد خلیفہ کو ابن راوندی کی کتاب کھولنے کا خیال آیا اور ایک ایسی چیز پر نگاہ پڑی کہ اسے پڑھتے ہی وہ طیش میں آکر بولا۔ کیا اس کتاب کا مصنف اسی شہر میں ہے ؟ جس شخص کی وساطت سے یہ کتاب خلیفہ تک پہنچی اس نے کہا' ہاں۔

متوکل نے کہا۔ کیا تم اسے جانتے ہو ؟ اس شخص نے کہا' میں اسے نہیں جانتا۔ خلیفہ نے سوال کیا۔

اگر تم اسے نہیں جانتے تو کیسے اس سے کتاب لے کر میرے پاس لائے ہو ؟ اس شخص نے جواب دیا۔ میں نے یہ کتاب اس شخص سے نہیں لی بلکہ کاتب مطلب بصری سے لی ہے' اس نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ اس کتاب کو خلیفہ کی خدمت میں پہنچا دوں کیونکہ اس کتاب کا مصنف جو ایک تنگدست انسان ہے شاید خلیفہ کی توجہ اس کی جانب مبذول ہوجائے اور خلیفہ اس کی کچھ مدد کرے۔

خلیفہ نے سوال کیا۔ کیا تو نے یہ کتاب پڑھی ہے ؟ اس شخص نے کہا' نہیں اے امیرالمومنین' کیونکہ اس کے مصنف سے میرے ذاتی تعلقات نہ تھے کہ میں اس کی تحریر کو پڑھتا اور محض مطلب بصری کی درخواست پر آپ کے لئے لایا ہوں۔ خلیفہ نے کہا۔ مطلب بصری کو حاضر کرو۔

وہ شخص جس وقت مطلب بصری کو لانے کے لئے آیا تو اسے خیال آیا کہ اسے مطلب بصری کو نہیں بتانا چاہئے کہ خلیفہ اس کی کتاب پڑھنے سے غضبناک ہوا ہے کیونکہ اس صورت میں وہ شہر چھوڑ کر بھاگ نکلے گا۔ لہٰذا اس نے مطلب بصری سے کہا۔ خلیفہ کو تمہاری کتاب پسند آئی ہے اور اس نے تمہیں یاد کیا ہے۔ مطلب بصری خوشی خوشی چل پڑا کیونکہ جب اس نے سنا کہ خلیفہ نے کتاب پسند کی ہے تو اسے یقین ہوگیا کہ اسے انعام واکرام سے نوازنا چاہتا ہے۔

کاتب کو یہ خیال نہ آیا کہ خلیفہ نے کتاب کے مصنف کو کیوں نہیں بلایا ؟ چونکہ خلیفہ کا انعام مصنف کو ملنا چاہئے تھا نہ کہ اسے' وہ اس بات سے خوش تھا کہ خلیفہ کا انعام اس کے ذریعے ابن راوندی کو ملے گا۔ ایسی صورت میں یہ فطری امر ہے کہ ابن راوندی انعام کا کچھ حصہ قدردانی کے طور پر اسے دے دے گا۔ کاتب جب خلیفہ کے حضور میں آیا تو خلیفہ نے سوال کیا۔ تو نے یہ کتاب پڑھی تھی یا نہیں ؟ خلیفہ کے سوالیہ لہجے سے مترشح تھا کہ خیر نہیں۔ کاتب نے صاف کہہ دیا کہ اس نے کتاب نہیں پڑھی۔ خلیفہ نے پھر پوچھا۔ تم نے یہ کتاب پڑھے بغیر کیوں بھیجی ہے ؟ اور اس کے بھیجنے سے تمہارا کیا مقصد تھا ؟ مطلب بصری کہنے لگا۔ اس کتاب کا مصنف ایک اصفہانی ہے جو اس شہر میں حال ہی میں وارد ہوا ہے۔ وہ میرے لئے کتابت کرتا ہے' چونکہ وہ تنگدست ہے لہٰذا اس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اس کی کتاب کو خلیفہ کی خدمت میں پیش کروں کہ شاید امیرالمومنین کے بندہ پرور دسترخوان سے اس کی مراد بر آئے۔ متوکل نے کہا' چونکہ تم ایک کاتب ہو اور تم نے اس کتاب کا مطالعہ نہیں کیا لہٰذا میں اس شرط پر تمہیں چھوڑتا ہوں کہ کتاب کے مصنف کو میرے حضور میں حاضر کرو۔ مطلب بصری جب خلیفہ کے دربار سے باہر نکلنے لگا تو جس شخص کو اس نے کتاب دی تھی اسے کہنے لگا۔ تم نے مجھے کیوں نہیں کہا کہ خلیفہ غضبناک ہوا ہے' تم نے مجھے فریب کیوں دیا ؟

مطلب بصری نے اس شخص کے کہنے سے تجربہ حاصل کیا اور جب وہ ابن راوندی کے مسافرخانے کی طرف جا رہا تھا تو اپنے آپ سے کہنے لگا۔ میں اسے یہ نہیں بتاؤں گا کہ خلیفہ ناراض ہوا ہے بلکہ میں اسے خلیفہ کی

طرف سے انعام و اکرام کے حصول کا یقین دلاؤں گا تاکہ وہ آنے پر مائل ہوسکے اور پس و پیش نہ کرے۔

یہاں پر اس بات کا ذکر زائد از بحث ہے کہ ابن راوندی مسافرخانے میں بیٹھا کتابت میں مشغول تھا جب اسے اطلاع دی گئی کہ بادشاہ نے اس کی کتاب پسند کی ہے اور اسے دربار میں طلب کیا ہے تاکہ انعام و اکرام سے نوازے تو وہ بہت خوش ہوا لیکن جونہی وہ چلنے کے لئے اٹھا پریشانی کے آثار اس کے ماتھے پر نمایاں تھے۔ اس نے ایک سرد آہ بھری۔ مطلب بصری نے پوچھا تمہیں کیا ہوا ہے ؟ وہ اصفہانی شخص بولا۔ میں اس پرانے لباس اور پھٹے ہوئے جوتوں کے ساتھ کس طرح خلیفہ کی خدمت میں جاؤں ؟ مطلب بصری نے جواب دیا۔ تم خلیفہ کے دربار میں جانے سے پہلے جوتے اتار لینا اور پھر کوئی بھی تمہارے پھٹے پرانے جوتے نہیں دیکھ سکے گا۔

ابن راوندی نے کہا۔ میں اپنے پرانے لباس کو تو اپنے جسم سے جدا نہیں کرسکتا۔ خلیفہ اور اس کے حواری اسے ضرور دیکھ لیں گے۔ مطلب بصری کہنے لگا۔ تمہارا پرانا لباس تمہارے عالم ہونے کی سند ہے کیونکہ حقیقی علماء تنگدست ہوتے ہیں اس لئے نیا لباس نہیں خرید سکتے۔

دوسرا یہ کہ اگر میں خلیفہ سے کہتا کہ اصفہان کا امیرترین زمیندار آیا ہے اور آپ کے حضور میں حاضر ہونا چاہتا ہے تو کیا تمہیں اس بات کا حق تھا کہ اپنے پرانے لباس کا رونا روتے اور نادم ہوتے ؟ لیکن میں نے خلیفہ سے کہا ہے کہ تم ایک تنگدست انسان ہو اور اسے علم ہے کہ تم سرائے میں رہتے ہو اور کتابوں کے نسخے تیار کرکے گزربسر کرتے ہو۔ خلیفہ کے دربار میں کوئی تمہارے پرانے لباس پر اظہار تعجب کرے گا اور نہ ہی تمہیں حقارت کی نظر سے دیکھے گا۔ اس حوصلہ افزائی کے بعد ابن راوندی مطلب بصری کے ہمراہ خلیفہ کے محل کی جانب چل پڑا۔

جیسا کہ ہم نے کہا' خلیفہ رات کو شراب پیتا تھا اور دوپہر تک شراب میں مدہوش رہتا تھا۔ وہ شرابی جو پچاس ساٹھ سال تک لگاتار راتوں کو شراب پیتے ہیں اکثر دوپہر تک شراب کے نشے میں مخمور رہتے ہیں البتہ اس کا انحصار گزشتہ رات کی شراب پر ہوتا ہے۔ اگر وہ کم پئیں گے تو کم خمار آئے گا جبکہ زیادہ پینے کی صورت میں زیادہ خمار ہوگا۔

خلیفہ نے اس رات بہت تھوڑی شراب پی تھی لہٰذا اس دن شراب کا نشہ کم تھا کیونکہ اگر شراب کا خمار زیادہ ہوتا تو وہ ابن راوندی کی کتاب کو ہرگز نہ کھول سکتا۔ ابن راوندی خلیفہ کے حضور میں آیا اور سلام کے بعد باادب کھڑا ہوگیا۔ خلیفہ نے سامنے پڑی ہوئی کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس اصفہانی شخص سے پوچھا۔ کیا یہ کتاب تم نے لکھی ہے ؟ ابن راوندی بولا۔ ہاں اے امیرالمومنین۔ خلیفہ نے کہا۔ اگر مجھے یہ نہ بتاتے کہ تم مرگی کے مریض ہو تو میں ابھی جلاد کو بلا کر تمہارا سرتن سے جدا کردیتا۔ راوندی کا رنگ اڑگیا' اس کے زانو کانپنے لگے' وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر خوف کے عالم میں اس کی زبان گنگ ہوگئی۔

خلیفہ بولا' ، تمہاری کتاب تمہارے ہاتھوں میں دیتا ہوں کہ تم خود پڑھو اور سارے سنیں کہ تم نے اس کتاب میں کیا لکھا ہے ؟ تاکہ تمہارے واجب القتل ہونے میں کسی کو شک و شبہ نہ ہو۔ کتاب ابن راوندی کے ہاتھ میں دی گئی تاکہ اس نے جو کچھ اس صفحہ میں لکھا ہے اسے پڑھے۔ ابن راوندی نے جو کچھ لکھا تھا پڑھنے لگا تو حاضرین مجلس میں سے بعض فرط وحشت سے کانپنے لگے کیونکہ ایسے الفاظ کسی کی زبان سے ادا نہیں ہوئے تھے۔

اصفہانی شخص خاموش ہوا تو متوکل بولا۔ دوبارہ پڑھو۔ اس طرح راوندی نے دوبارہ پڑھنا شروع کیا۔ جو بحث وہ پڑھ رہا تھا اس کا تعلق خداوند تعالیٰ سے تھا۔ جب وہ بحث پڑھ چکا تو خلیفہ بولا۔ لوگو ! تم نے سنا یہ کہتا ہے کہ انسانی زندگی میں سب سے بڑا افسانہ خداوند تعالیٰ پر ایمان ہے اور انسان اس افسانے میں مگن ہوگیا ہے' انسان اسے نسل در نسل منتقل کرتا چلا آرہا ہے۔ اس کے بعد خلیفہ نے سوال کیا۔ کیا تمہاری یہ کتاب کسی نے پڑھی ہے ؟ ابن راوندی نے اثبات میں جواب دیا۔ خلیفہ نے وہی بات کہی جو عباس صروم نے کہی تھی اور تعجب کرنے لگا کہ اس کتاب کو لوگوں نے پڑھا تھا لیکن ابن راوندی کو قتل نہیں کیا۔ عباس صروم کی مانند متوکل بھی اس بات سے آگاہ نہ تھا کہ امام جعفر صادقؑ کی ایجاد کردہ ثقافت میں ہر طرح کی بحث کی آزادی ہے۔ اس میں یہ تھا کہ کسی کو بھی محض اس وجہ سے ظلم کا نشانہ نہیں بنانا چاہئے کہ وہ مخالف مذہبی بحث کرتا ہے۔

امام جعفر صادقؑ کے ثقافتی مکتب کے پیروکار ابن راوندی کے بغداد کے سفر کرنے سے پہلے اسے ان باتوں کا جواب دے چکے تھے اور یہ بات بھی خلیفہ پر مخفی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ کسی نے بھی ابن راوندی کو جواب نہیں دیا۔

بعض کا خیال ہے کہ کتاب ''الفرند'' (ابن راوندی کی تصنیف) خلیفہ کے ہاتھوں میں پہنچنے سے قبل عراق اور ایران کے مرکزی علاقوں میں کسی کے ہاتھوں میں نہیں پہنچی تھی کیونکہ پرانے وقتوں میں دستور تھا کہ جو کوئی اپنی کتاب خلیفہ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا اسے اس کی تازگی کو محفوظ رکھنے کے لئے کسی دوسرے کے ہاتھوں میں نہیں دیتا تھا۔ شاید ایسا ہی ہوا ہو اور کتاب ''الفرند'' کو خلیفہ سے قبل کسی نے نہ دیکھا ہو۔ لیکن جو کچھ ابن راوندی نے اس کتاب میں لکھا اس میں کوئی نئی بات نہیں تھی کیونکہ ان مطالب کو وہ دوسری کتابوں میں لکھ چکا تھا اور امام جعفر صادقؑ کی مذہبی ثقافت کے پیروکار اسے جواب دے چکے تھے۔ بہرحال اس بارے میں تحقیق نہیں ہوئی کہ خلیفہ کے ہاتھوں میں پہنچنے سے پہلے عوام نے یہ کتاب پڑھی تھی یا نہیں ؟ لیکن جو نظریات ابن راوندی نے کتاب الفرند میں درج کئے تھے وہ اس کی دوسری کتابوں میں بھی پائے جاتے تھے اور اسے ان کا جواب مل چکا تھا۔

خلیفہ نے اس کے بعد اس اصفہانی شخص سے پوچھا۔ تم خدا کے وجود کے قطعی منکر ہو اور تم نے لکھا ہے

کہ خدا پر ایمان بنی نوع انسان کا سب سے بڑا افسانہ ہے جو ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچتا ہے' تمہارا کائنات کی خلقت کے بارے میں کیا خیال ہے کہ یہ کائنات کیسے وجود میں آئی ہے ؟ یہ بات کیسے ممکن ہے کہ مخلوق' خالق کے بغیر ہی وجود میں آجائے ؟

ابن راوندی خاموش ہوگیا اور خلیفہ بولا۔ میرا جواب دو' تم جو خدا کے وجود کا انکار کرتے ہو' کس چیز کا جواب اثبات میں دیتے ہو ؟ اور کیا کوئی انکار کرے تو اسے اثبات نہیں کرنا چاہئے ؟ پھر بھی ابن راوندی خاموش رہا۔ خلیفہ بولا۔ اگر میرے سوال کا جواب نہیں دیتے تو میں حکم دوں گا کہ تمہیں کوڑے لگا کر بات کرنے پر مجبور کیا جائے۔ ابن راوندی نے کہا۔ اے امیرالمومنین میں خدا کا منکر نہیں ہوں۔

خلیفہ بولا۔ تم نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ انسانی زندگی کا سب سے بڑاافسانہ مبداء (پروردگار) کے بارے میں ہے تو کیا یہ جملہ جو تمہاری زبان سے ادا ہوا ہے جسے سب نے سنا ہے یہ خدا کا انکار نہیں ؟ ابن راوندی نے کہا۔ مجھے اس جملے کی اصلاح کرنا چاہئے' مجھے لکھنا چاہئے کہ نوع بشر کی زندگی کا سب سے بڑا افسانہ مبداء (باری تعالیٰ) کے متعلق تصور ہے۔

خلیفہ نے پوچھا۔ تمہارے اس قول کا کیا مطلب ہے ؟ ابن راوندی نے جواب دیا۔ میرے قول کا مطلب یہ ہے کہ بنی نوع انسان نے مبداء (خالق) کے متعلق جو تصورات قائم کئے ہیں وہ افسانے کی صورت اختیار کرگئے ہیں۔ انسانی زندگی میں یہ سب سے بڑا افسانہ ہے کیونکہ آدمی مبداء (خالق کائنات) کو پہچان سکتا ہے اور نہ اس کے اوصاف کا ادراک کرسکتا ہے۔

اس نے عباس صروم سے مخاطب ہو کر کہا۔ یہ وہ شخص ہے جس کے بارے میں تمہارا کہنا ہے کہ مرگی کا مریض ہے۔ کیا مرگی کا مریض اس طرح گفتگو کرسکتا ہے ؟

پھر ابن راوندی سے مخاطب ہوکر کہا۔ میں تمہاری اس بات کو قبول کرتا ہوں۔خادم کو حکم دیا کہ قلم اور سیاہی لا۔ غرضیکہ قلم اور سیاہی لائی گئی اور خلیفہ نےابن راوندی کو حکم دیا کہ اپنی کتاب کی اصلاح کرے۔ اس شخص نے اپنی تحریر کی اس طرح اصلاح کی کہ انسانی زندگی کا سب سے بڑا افسانہ خالق کائنات سے نسبت کا تصور ہے اور پھر خلیفہ کو دکھایا۔ خلیفہ بولا۔ تم اعتراف کرتے ہو کہ تمہارا خدا پر ایمان ہے اور اسے خالق کائنات اور کائنات کا نظام چلانے والا سمجھتے ہو۔

خلیفہ نے کتاب لی اور اس کے دوسرے حصے پر نگاہ ڈالی جو نبوت کے بارے میں تھا۔ ابن راوندی نے اپنی کتاب میں نبوت سے انکار کیا تھا اور جعفری مذہب کے ثقافتی پیروکاروں نے اس حصے کا جواب بھی اسے دے دیا تھامگر متوکل ان کے جوابات سے آگاہ نہ تھا۔ عباسی خلیفہ نے نبوت کے متعلق اقتباس بھی مصنف کو پڑھنے کے لئے دیا۔ اس نے اسے اتنی بلند آواز سے پڑھاکہ حاضرین مجلس نے اچھی طرح سن لیا۔ ابن راوندی نے اپنی

بحث سے جو نتیجہ نکلا تھا وہ منفی پہلو کا حامل تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ نبوت کا حقیقی اور صحیح معنوں میں کوئی وجود نہیں ہے۔ چونکہ اگر خالق کائنات خدا ہی ہے جیسا کہ لوگوں کا عقیدہ ہے تو وہ مجبور نہیں ہے کہ لوگوں کی ہدایت کے لئے ایک شخص کا انتخاب کرے اور اسے اپنا رسول بنا کر بھیجے بلکہ جس طرح درخت' جانور اور انسان خود بخود ترقی کرتے ہیں اور درخت پھل دیتے ہیں اسی طرح انسان بھی خود بخود ہدایت حاصل کرتے ہیں۔

ابن راوندی نے اپنے لکھے ہوئے مواد کے اثبات کے لئے پودوں اور جانوروں کی مثالیں بھی دی ہوئی تھیں اور لکھا تھا کہ جس طرح گندم کا پودا بغیر کسی نبی کے بڑا ہوتا ہے اور پھل دیتا ہے اگر خالق کائنات چاہتا تو انسان کی بھی گندم کے پودے اور کھجور کے درخت کی مانند رشد کرتا اور بغیر نبی کے پھل لاتا۔

جب وہ سب کچھ پڑھ چکا تو متوکل نے کہا۔ تیری یہ تحریر ثابت کرتی ہے کہ تو انبیاء کا منکر ہے کیونکہ تیرا قول ہے حقیقی معنوں میں انبیاء کا وجود نہیں ہے یعنی خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے نہیں بلکہ انہوں نے خود نبوت کا دعوی کیا ہے۔ ابن راوندی خاموش رہا۔ خلیفہ بولا۔ بول' ورنہ میں حکم دوں گا کہ تمہیں زبردستی بولنے پر مجبور کیا جائے۔ اس سے پہلے کہ ابن راوندی اپنی کتاب خلیفہ کی خدمت میں پیش کرتا' جعفری ثقافت کے پیروکاروں کے ایک گروہ نے نبوت کے متعلق اسے جواب بھی دے دیا تھا۔

انہوں نے لکھا تھا کہ ابن راوندی نے پودوں' جانوروں اور انسان کی تربیت کو ایک جیسا فرض کیا ہے اور جب دیکھتا ہے کہ پودے اور حیوان خود بخود تربیت پاتے اور پھل لاتے ہیں تو اسے خیال آتا ہے کہ آدمی بھی خود بخود پرورش پاتا اور درجہ کمال تک پہنچتا ہے۔ نباتات اور حیوانات دنیا میں ایسے بھی ہیں جو بغیر پرورش پھل نہیں لاتے اور ختم ہوجاتے ہیں اور انسانی دنیا میں تو پرورش واجبات میں سے ہے بلکہ پیدائش کے دن سے لے کر عمر کے آخری دن تک انسان تربیت کا محتاج ہے۔

انسانی زندگی' پودوں اور جانوروں کے مقابلے میں اپنی مخصوص نوعیت کی حامل ہے' جس کا تقاضا ہے کہ انسان کی اجتماعی تربیت کی جائے۔ انبیاء اس تربیت کے ذمہ دار ہیں۔ انسانی معاشروں میں انبیاء کے بغیر کوئی ایسا اجتماعی ڈسپلن' جس سے تمام انسان بہرہ مند ہوں وجود میں آنا محال ہے اور اگر کوئی ڈسپلن وجود میں آ ہی جائے تو وہ استحصالی ڈسپلن ہوگا۔ اس میں جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا قانون رائج ہوگا۔ اس صورت میں انسانی معاشرے کی اصلاح کا بیڑا اٹھانے کے لئے انبیاء کا وجود ناگزیر ہے تاکہ انسان کی اجتماعی زندگی میں عدل و انصاف قائم ہو۔

ابن راوندی نے جعفری ثقافتی مکتب کے علماء کے نظریات (جو انہوں نے اس کے نظریہ نبوت کی رد میں پیش کئے تھے) کو فراموش نہیں کیا تھا اور جب اس نے اپنے آپ کو خطرے میں گھرا ہوا پایا تو اس نے اپنی جان بچانے کے لئے ان اقوال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ اے امیرالمومنین' میں نے جو کچھ نبوت کے متعلق

اس کتاب میں درج کیا ہے وہ تمام موجودات کے متعلق ایک حکم کلی کی حیثیت رکھتا ہے۔ متوکل نے پوچھا۔ تمہارا کیا مطلب ہے ؟ ابن راوندی نے جواب دیا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ خالق کائنات انسان کو بھی پودوں اور جانوروں کی مانند خلق کرسکتا تھا تاکہ انہیں تربیت کے لئے انبیاء کی حاجت نہ ہوتی۔

خلیفہ نے کہا۔ اے شخص اگر تیرے کہنے سے مراد یہ تھا تو تُو نے نبوت کا انکار کیوں کیا ہے ؟ تم اپنی کتاب میں لکھ سکتے تھے کہ پودوں اور جانوروں کو نبی کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ان دو طبقات کی زندگی خاص اصول و ضوابط کے تحت رواں دواں ہے جبکہ انسان انبیاء کے بغیر کبھی بھی ہدایت نہیں پا سکتا اور کیا تمہیں اس بات کا اعتراف ہے کہ اپنی کتاب میں تم نے نبوت کا انکار کیا ہے ؟ ابن راوندی نے کہا۔ میں نے ایک کلی حکم صادر کیا ہے اور نبوت کا انکار نہیں کیا۔

خلیفہ بولا۔ تم نے نبوت کا انکار کیا ہے۔ اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں اور دیگر تمام حاضرین نے سنا ہے کہ تمہارے کہنے سے مراد نبوت کاانکار ہے۔ تمہاری سزا قتل ہے۔ اگر تم اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی عبارت سے توبہ کرو تو تمہاری جان بخشی ہوسکتی ہے ورنہ میں ابھی حکم دیتا ہوں کہ تمہارا سر تن سے جدا کردیا جائے۔

ابن راوندی اپنی جان بچانے کی خاطر توبہ کرنے پر مجبور ہوگیا۔ اس نے اعتراف کیا کہ نبوت پر اس کا ایمان ہے۔ خلیفہ بولا۔ اسے دوبارہ قلم اور روشنائی دی جائے تاکہ یہ اپنی کتاب کی اصلاح کرے۔ ابن راوندی نے لکھا۔ انسان کو اپنی وضع قطع کی بناء پر پودوں اور جانوروں کے برعکس پیغمبر کی احتیاج ہے اور پیغمبر کے بغیر یہ ہدایت اور سیدھی راہ نہیں پا سکتا۔

جعفری ثقافتی مکتب کے علماء نے توحید اور نبوت کے متعلق ابن راوندی کے نظریات رد کئے تھے لیکن وہ اسے اپنی تحریر کی اصلاح پر مجبور نہیں کرسکے تھے کیونکہ ان کا کام زبردستی قائل کرنا نہ تھا۔ لیکن متوکل چونکہ طاقتور تھا اس لئے اس نے ابن راوندی کو توحید و نبوت کے بارے میں اپنی عبارت کی اصلاح پر مجبور کیا۔ اس طرح اس کی کتاب ایسی شکل و صورت اختیار کرگئی کہ جو اسے پڑھتا یہ گمان کرتا کہ مصنف توحید و نبوت کا معتقد ہے۔

ابن راوندی نے جس طرح اپنی کتاب میں توحید و نبوت کا انکار کیا اسی طرح اس نے قیامت کا بھی انکار کرتے ہوئے اسے ایک افسانہ تصور کیا تھا۔خلیفہ بولا۔ جو کوئی توحید و نبوت پر ایمان لائے اسے آخرت پر بھی ایمان لانا چاہئے کیونکہ خداوندتعالیٰ اور پیغمبروں کا فرمان ہے کہ قیامت آئے گی۔ پس تمہارے لئے یہ ضروری ہے کہ اگر تم توحید و نبوت پر ایمان لائے ہو تو قیامت کو بھی قبول کرو۔ بصورت دیگر تمہارا سر قلم کردیا جائے گا۔

ابن راوندی خلیفہ کے فرمان کے مطابق اپنی کتاب کی اصلاح کرچکا تو اس نے یہ کتاب دوبارہ خلیفہ کی

خدمت میں پیش کی۔ اب متوکل نے کتاب کے دوسرے حصے پر تنقید کرتے ہوئے کہا۔ تم نے بنی نوع انسان کے فطری طور پر تباہ کار ہونے کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس میں صحت نہیں ہے۔ ابن راوندی نے اپنی کتاب میں لکھا تھا کہ بنی نوع بشر کا ہر فرد اپنی ذات میں تباہ کار یا تخریب کار ہے کیونکہ کوئی بھی ایسا انسان نہیں ملتا جو اپنے دل میں کم از کم ایک انسان کی موت کا خواہشمند نہ ہو اور بعض انسان تو ہزاروں افراد کی موت کے خواہشمند ہوتے ہیں۔

ابن راوندی نے اپنی کتاب میں لکھا تھا کہ جس کا کوئی دشمن ہوتا ہے وہ اس دشمن کی موت چاہتا ہے اور جو کوئی کسی دوسرے کے ساتھ حسد کرتا ہے اسی طرح وہ بھی اپنے محسود کی موت کا آرزومند ہوتا ہے۔ اور ہر ملازم شخص باطن میں دوسرے ملازم کی موت کا آرزومند ہوتا ہے تاکہ اس کے رقیب کی موت سے اس کے لئے راستہ صاف ہوجائے۔ اور ہر جوان بیٹا اپنے باپ کی موت کا خواہشمند ہوتا ہے تاکہ اس کی میراث پر قبضہ جمائے اور ہر نائب اپنے سینئر کی موت چاہتا ہے تاکہ اس کی موت کے بعد وہ اس کی جگہ لے اور ہر مقروض قرض خواہ کی موت کا طالب ہوتا ہے تاکہ وہ قرض دینے سے بچ جائے۔ اس تباہ کارانہ فطرت کے ساتھ ساتھ انسانوں میں شدید خودپرستی بھی پائی جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جو کوئی دوسرے کی موت کی خبر سنتا ہے باطن میں خوش ہوتا ہے کہ دوسرا مرگیا اور وہ زندہ ہے اور کوئی بھی ایسا انسان نہیں جو مرنے کے لئے تیار ہو۔ اس کے باوجود کہ وہ معاشرے میں دوستوں اور عزیزوں کو یکے بعد دیگرے مرتے دیکھتا ہے اپنے آپ کو موت سے محفوظ خیال کرتا ہے۔ وہ گمان کرتا ہے کہ وہ مرنے سے مستثنیٰ ہے اور عزرائیل ہرگز اس کے گھر میں داخل نہیں ہوگا۔

متوکل نے ابن راوندی سے کہا۔ تو نے اس کتاب میں تمام انسانوں کو بلا امتیاز مساوی طور پر فطرتاً" تباہی پھیلانے والے قرار دیا ہے۔ میں اس بات کی تصدیق کرتا ہوں کہ بعض لوگ اندرونی طور پر دوسروں کی موت کے خواہاں ہوتے ہیں لیکن سب لوگ ایک جیسے نہیں ہیں۔ ماں اور باپ کا جی نہیں چاہتا کہ ان کا بیٹا مرے اور اگر اتفاقاً" ایسا ہوجائے تو وہ ساری عمر بیٹے کی موت سے غمگین رہتے ہیں۔ تم کس طرح والدین کو دوسرے لوگوں کی مانند فطری تباہ کار قرار دے سکتے ہو۔ ابن راوندی نے کہا۔ وہی ماں باپ جو اپنے بیٹے کی موت کا صدمہ برداشت نہیں کرسکتے اگر ان کا بیٹا مرجائے تو ساری عمر اس کے غم میں ماتم کرتے ہیں۔ لیکن کسی اور شخص کی موت کے خواہشمند ہوتے ہیں اور میں نہایت جرات سے کہتا ہوں کہ خلیفہ کے حضور میں بیٹھے ہوئے تمام حاضرین دل کی گہرائیوں میں کم از کم ایک شخص کی موت کے خواہشمند ہیں اور ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں جو اس بات سے مبرا ہو۔

جب ابن راوندی کفر کے فتوے کے خوف سے بچ نکلا اور اسے یقین ہوگیا کہ اس کے لئے مزید کوئی خطرہ نہیں تو اس میں خلیفہ سے بیباکی سے بات کرنے جرات پیدا ہوگئی۔ خلیفہ بولا۔ میں اس دوران جبکہ تم سے

مخاطب ہوں کسی کی بھی موت کا خواہشمند نہیں ہوں۔ ابن راوندی نے کہا۔ اے امیرالمومنین میں یہ نہیں کہتا کہ ہر کوئی زندگی کے شروع سے آخر تک مسلسل دوسروں کی موت کا خواہشمند ہوتا ہے بلکہ میں کہتا ہوں کہ ہر کوئی زندگی میں کم ازکم ایک آدمی کی موت کا خواہشمند ہوتا ہے۔ ممکن ہے اس کے بعد کئی سالوں تک کسی دوسرے کی موت کا خواہشمند نہ ہو۔ لیکن محال ہے کہ کوئی ایسا شخص پایا جائے جو اپنی زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ دوسرے کی موت کا خواہاں نہ ہوا ہو۔ خلیفہ خاموش ہوگیا اور پھر ابن راوندی کی کتاب کے دوسرے حصے کی طرف متوجہ ہوا جو دہر کے متعلق تھا اور کہا۔ تم نے اسی کتاب میں لکھا ہے کہ کائنات کا وجود نہیں اور ہم ہیں کہ کائنات کو اپنے لئے خود وجود میں لاتے ہیں۔ عباسی خلیفہ اور اصفہانی مصنف کے مکالمے کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے یہاں پر اس بات کی وضاحت کرنا ضروری ہے کہ قدیم مشرقی مصنفین کی اصطلاح میں طبیعت یا فطرت کو کائنات کا نام دیا جاتا تھا۔

جیسا کہ ہم کہتے ہیں کہ بنی نوع انسان فطرت میں زندگی گزار رہا ہے اور قدیم مشرق والے کہتے ہیں کہ انسان کائنات میں زندگی گزار رہا ہے۔ آج ہم کہتے ہیں کہ فطرت ہمارا احاطہ کئے ہوئے ہے جبکہ قدیم مشرق والے کہتے ہیں کہ دہر نوع انسانی کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ بعض لوگوں کا یہ تصور غلط ہے کہ کائنات زمان یا مکان کے معنوں میں مستعمل ہے اور نہ ہی یہ جہان کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جبکہ طبیعت یا فطرت ایک ہی چیز کے نام ہیں۔

متوکل کہنے لگا۔ تم اپنی کتاب میں کائنات کی مانند واضح اور آشکارا چیزوں کے منکر ہوئے ہو' تمہارا کہنا ہے کہ کائنات کا اپنا کوئی وجود نہیں اور یہ ہم ہیں کہ کائنات کو وجود میں لاتے ہیں۔ جیسا کہ تم نے ایک مرتبہ خود بھی سن لیا ۔ مجھے کہا گیا کہ تو مرگی کا مریض ہے لیکن جب میں نے تم سے بات چیت کی تو پتہ چلا کہ تم تو بہت عقلمند انسان ہو۔ لیکن اب جبکہ میں تمہاری کتاب کے کائنات کے متعلق باب کو دیکھتا ہوں تو مجھے گمان ہوتا ہے کہ کہیں تمہارے متعلق مرگی کا مریض ہونے کی افواہ درست تو نہیں ؟ میرا خیال ہے کہ یہ افواہ بے بنیاد نہیں ہے کیونکہ تم نے لکھا ہے کہ کائنات کا وجود نہیں ہے کیونکہ ایک عاقل انسان جو عالم ہونے کا دعویٰ بھی کرے کائنات جیسی چیز کا جو خداوند تعالیٰ کے بعد سے بڑی چیز ہے' انکار نہیں کرسکتا۔ ابن راوندی بولا۔ اے امیرالمومنین کائنات کا وجود ہمارے ذہنی تصور کی اختراع ہے نہ کہ حقیقی صورت میں پایا جاتا ہے۔ خلیفہ نے کہا۔ اپنی بات کی وضاحت کرو۔ وہ اصفہانی شخص بولا' میرا مطلب یہ ہے کہ ہمارے حواس کائنات کو جس صورت میں درک کرتے ہیں اس کی اصلی صورت نہیں جس طرح ایک مادرزاد نابینا مختلف رنگوں میں امتیاز نہیں کرسکتا' اس کے سامنے رنگوں کی کتنی ہی تعریف کیوں نہ کی جائے وہ زرد اور سبز رنگ کی شناخت نہیں کرسکے گا۔ اگر ہم آدمؑ کے بیٹے اس دنیا میں مادرزاد نابینا آتے اور کوئی چیز دیکھ یا سن نہ سکتے تو کائنات کے متعلق ہمارا تصور ہمارے

موجودہ تصور سے قطعی مختلف ہوتا۔ میں اپنی کتاب میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ کائنات اپنی ذات میں اس صورت میں نہیں جس میں اسے ہم دیکھتے ہیں یا اس کی آوازیں ہوا یا دریا کی موجوں یا آسمانی بجلی کی مانند سنتے ہیں۔ یہ ہماری آنکھیں اور کان ہیں جو کائنات کو اس موجودہ صورت میں دیکھتے اور سنتے ہیں۔

میں نے یہ لکھا ہے اور میرا عقیدہ بھی ہے کہ کائنات اس صورت میں نہیں ہے جس میں ہم اس کا تصور کرتے ہیں۔ یہ صرف ہماری اختراع ہے۔ ہماری آنکھ کا ڈھیلا جو محدب ہے اگر مقعد ہوتا تو کائنات کو دوسری صورت میں دیکھتا۔ خلیفہ بولا۔ اگر کائنات کو دوسری شکل و صورت میں بھی دیکھتے تو بھی اس کے وجود کا انکار نہیں کرسکتے تھے۔ پس کسی اور شکل و صورت میں بھی اس کا مشاہدہ ناگزیر تھا۔ اگر ہم مادرزاد اندھے بھی ہوتے توبھی کائنات کا احساس کرتے اور ہمارا یہ احساس اس بات کا ثبوت ہے کہ کائنات کا وجود ہے' جبکہ تم نے اپنی کتاب میں اس کے وجود کا انکار کیا ہے۔ ابن راوندی نے کہا۔ اے امیرالمومنین اگر کوئی شخص کائنات کے بارے میں میرے اقتباس کو غور سے پڑھے تو معلوم ہوگا کہ میں نے کائنات کا انکار نہیں کیا بلکہ میں نے کہا ہے بنی نوع انسان میں سے ہر ایک نے کائنات کا اپنا اپنا تصور اپنا رکھا ہے۔ متوکل نے اظہار خیال کیا۔ تو نے ابھی مجھے کہا تھا کہ کائنات کا کوئی مستقل اور ذاتی وجود نہیں ہے اور اب تم خود اس بات کا انکار کر رہے ہو۔

ابن راوندی نے اظہار خیال کیا۔ میں یہ کہتا ہوں کہ کائنات کوئی ایسی شے نہیں کہ تمام بنی نوع انسان اسے ایک ہی صورت میں دیکھیں اور اس سے ایک ہی آواز سنیں۔

متوکل نے کہا۔ اگر اس صفت کے ساتھ ہر شخص دنیا کے آغاز سے آج تک اور آج سے دنیا کے خاتمے تک کائنات کو ایک ہی صورت میں دیکھے۔ البتہ جو آواز وہ سنے وہ دوسری آواز سے مختلف ہو تو پھر بھی کوئی چیز موجود ہے ورنہ لوگ اسے مختلف شکلوں میں نہ دیکھتے۔

آخرکار خلیفہ نے اس اصفہانی شخص سے اپنی تحریر کی اس طرح اصلاح کروائی کہ کائنات مستقلاً اور ذاتہ موجود ہے لیکن اس بات کا امکان ہے کہ ہر شخص اسے منفرد شکل میں دیکھے۔ اس کے بعد خلیفہ نے راوندی کی کتاب کے ایک دوسرے حصے کے بارے میں بحث کی اور کہا۔ مجھے معلوم ہے کہ تو نے موت کے متعلق فیثاغورث کے قول کا تکرار کیا ہے اور کہا ہے کہ جب میں ہوں تو موت نہیں اور جب موت آئے گی تو میں نہیں ہوں گا' لہٰذا موت سے میرا کوئی ایسا تعلق نہیں کہ میں اس کا سبب تلاش کروں اور تحقیق کروں کہ موت کیا ہے ؟

ابن راوندی نے محسوس کیا کہ خلیفہ ایک ایسے مرحلے میں داخل ہوگیا ہے جو اس کے لئے خطرناک ثابت ہوسکتا ہے' ممکن ہے وہ اسے الٹا لٹکا دے۔ خلیفہ نے اظہار خیال کیا کہ یہ نظریہ جو تم نے بیان کیا ہے ایک مشرک کا نظریہ ہے اور تمہیں کسی مشرک کے نظریہ کو اپنے نظریہ کی بنیاد نہیں قرار دینا چاہئے۔ مجھے معلوم ہے کہ

کچھ عرصہ سے یونانیوں کے نظریات ہماری کتابوں میں رقم ہو رہے ہیں لیکن وہ نظریات اقوال کی نقل ہیں۔ انہیں کسی نظریہ کی بنیاد قرار نہیں دینا چاہئے۔ البتہ فقط اس صورت میں کہ وہ ہمارے مذہبی قوانین سے مطابقت رکھتے ہوں۔

ابن راوندی اسی طرح خاموش رہا۔ خلیفہ بولا۔ تم ایک مسلمان ہو' تم نے تسلیم کرلیا ہے کہ توحید و نبوت اور معاد کے قائل ہو۔ تم کیسے کہتے ہو کہ تمہارا موت سے کوئی تعلق نہیں اور اس کے بارے میں تحقیق نہیں کرنا چاہئے ؟ شاید تو نہیں جانتا کہ ایک مسلمان اگر موت سے بے تعلق ہو اور اس کے بارے میں تحقیق سے گریز کرے تو اس کا ایمان سالم نہیں رہتا کیونکہ معاد جو اصول دین میں سے ہے اس کا تعلق موت کے بعد کی زندگی سے ہے۔

ابن راوندی نے کہا۔ اے امیرالمومنین میں نے اپنی کتاب میں مذہب کی رو سے موت کے متعلق اظہار خیال نہیں کیا بلکہ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے ایک فلسفیانہ نظریہ ہے۔ خلیفہ بولا۔ فیثاغورث چونکہ مشرک تھا اس لئے اس پر کوئی قدغن نہیں کہ اس نے موت سے لاتعلقی کا اظہار کیوں کیا ؟ لیکن تمہیں ہرگز نہیں لکھنا چاہئے تھا کہ تمہیں موت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ تمہیں تو اس بارے میں تحقیق کرنا چاہئے۔ ابن راوندی نے جواب دیا۔ موت ایک ایسی چیز ہے جس کے بارے میں تحقیق نہیں ہو سکتی۔ متوکل کہنے لگا۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے ؟ ابن راوندی نے سوال کیا۔ اے امیرالمومنین ایسا کونسا طریقہ ہے جس کے ذریعے موت کے بارے میں تحقیق ممکن ہے ؟ جس دن سے انسان خلق ہوا ہے اس دن سے لے کر آج تک اس نے کوشش کی ہے کہ موت کا راز جانے لیکن ابھی تک اسے کوئی ایسا ذریعہ ہاتھ نہیں لگا جو موت کا راز جاننے کا سبب بنے۔ متوکل نے کہا۔ موت کا راز اس طرح معلوم کیا جا سکتا ہے کہ وہ کون سا توازن ہے جس کی وجہ سے زندگی رواں دواں رہتی ہے اور کون سا عدم توازن ہے جو موت کا باعث بنتا ہے۔ ابن راوندی خلیفہ کی باتوں سے حیران رہ گیا کیونکہ جو کچھ متوکل نے کہا وہ صرف ایک عالم ہی کہہ سکتا تھا اور ابن راوندی کو خلیفہ کی زبان سے ایسی گفتگو کی توقع نہیں تھی۔ اس کے بعد ابن راوندی نے کہا۔ اے امیرالمومنین اس راستے کو ڈھونڈنا ڈاکٹروں کا کام ہے اور انہیں یہ سمجھنا چاہئے کہ جو توازن زندگی کو جاری رکھنے کا ضامن ہے وہ کس قسم کا توازن ہے ؟ اور وہ عدم توازن جو موت کا باعث بنتا ہے وہ کون سا عدم توازن ہے ؟ متوکل نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا۔ ہر وہ عالم اس راستے میں تحقیق کرسکتا ہے اور نہ صرف ڈاکٹروں پر موت کا راز افشاء کرنے کا انحصار ہے بلکہ علمائے دین بھی موت کا راز معلوم کرسکتے ہیں۔ ابن راوندی نے پوچھا۔ کس ذریعے سے ؟

خلیفہ نے جواب دیا۔ قرآنی آیات میں گہرے غورو فکر کے ذریعے سے۔ ابن راوندی نے کہا۔ اے امیرالمومنین قرآنی آیات میں صرف چند مواقع پر موت کے بارے میں ذکر ہوا ہے لیکن وہ بھی اس صورت میں

نہیں کہ محض آیات قرآنی کو پڑھنے سے موت کا راز حاصل ہوجائے۔ متوکل نے کہا۔ میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ محض قرآنی آیات کی تلاوت سے موت کا راز معلوم کیا جا سکتا ہے بلکہ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان آیات قرآنی کی گہرائی میں جاکر موت کا راز پا سکتا ہے۔ متوکل کے قول سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے کے مسلمان اس بات کے معتقد تھے کہ آیات قرآنی ظاہری معنوں کے علاوہ باطنی معنوں کی بھی حامل ہیں۔ ہر کوئی ان کے معنی تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ ان معنی کو جاننے کے لئے قرآنی علم کا سمجھنا ضروری ہے۔ ایک روایت کے مطابق یہ نظریہ دوسری صدی ہجری کے شروع میں وجود میں آیا' پھر تیسری اور چوتھی صدی میں اور اس کے بعد آنے والی صدیوں کے دوران اسلامی ممالک میں فروغ پانے کے ساتھ ساتھ مضبوط تر ہوتا چلا گیا اور مسلمانوں کے روحانی علماء نے یقین کرلیا کہ قرآن ظاہری معنوں کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ باطنی معنی بھی رکھتا ہے۔

قرآنی تفاسیر کا سرچشمہ بھی یہی نظریہ ہے' لیکن مفسرین قرآن شاذ و نادر ہی ان آیات کے باطنی معنوں تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ اس بات پر ایمان لانا کہ آیات قرآنی باطنی معنوں کی حامل ہیں' ایک شیعہ عقیدہ ہے' جبکہ تمام اسلامی فرقے اس بات کے معتقد ہیں اور ان کا بھی ایمان ہے کہ چونکہ قرآن کلام الٰہی ہے لہٰذا ظاہری معنوں کے ساتھ ساتھ باطنی معنی بھی ہوں گے' اس عقیدہ کی بنیاد یہ نظریہ پایا جاتا ہے کہ جو مسلمان قرآنی آیات کے باطنی معنی جانتا ہو وہ علم اور روحانی طاقت کے لحاظ سے پیغمبرؐ اسلام کے برابر ہوگا۔ البتہ چونکہ پیغمبرؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا لہٰذا وہ نبی نہیں ہو سکتا اور شیعہ معتقد ہیں کہ جو کوئی قرآنی آیات کے باطنی معنی جانتا ہو وہ علم اور روحانی طاقت کے لحاظ سے ائمہؑ کی مانند ہوگا (۵۸)۔

## موت کا مسئلہ' ابن راوندی کی نظر میں

ابن راوندی اپنی کتاب میں موت کا راز فاش نہ کر سکا اور جیسا کہ ہمارے مطالعے میں یہ بات آئی ہے اس نے عباسی خلیفہ المتوکل سے کہا' موت کا راز کسی طرح سے افشا نہیں ہو سکتا۔ لیکن اپنی کتاب میں موت کے بارے میں ایسے نظریات پیش کئے جو شائد آج کسی کی نظر میں کسی خاص اہمیت کے حامل نہ ہوں لیکن ساڑھے گیارہ سو سال پہلے پر کشش نظریات تھے۔ ان میں اس نے کہا ہے کہ کوئی بھی یہ بات نہیں سمجھ سکتا کہ اس کی موت کیسے واقع ہوتی ہے ؟

جب تک وہ موت کو خود نہ آزمائے اسے درک کرنے پر قادر نہیں ہو سکتا۔ دوسروں کی موت کے مشاہدے سے انسان اپنی موت کے لئے کچھ نہیں سیکھ سکتا اور جب تک انسان موت کو اپنے اوپر نہ آزمائے اس وقت تک

اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آسکتی کہ موت کیسے ہوتی ہے ؟ ابن راوندی کا موت کے بارے میں دوسرا نظریہ یہ ہے کہ کوئی بھی اپنے آپ کو مردہ نہیں سمجھ سکتااور انسان جب تک زندہ ہے اس کے لئے محال ہے کہ وہ اپنے آپ کو مردہ گردانے اس لئے کہ اگر اسے علم ہو کہ مردہ ہے تو یہ بات اسکی دلیل ہے کہ وہ زندہ ہے اگر زندہ نہ ہوتا تو اسے مرنے کا علم کہاں سے ہوتا ؟

موت کے متعلق ابن راوندی کا تیسرا نظریہ اس عرصے کے بارے میں ہے جب انسان مردہ ہوتا ہے اور زندہ نہیں ہوتا۔ ابن راوندی کہتا ہے کہ کسی مردے کواس بات کا علم نہیں ہوتا کہ وہ مردہ ہے اس نظریے کے متعلق اس نے ویسی ہی دلیل دی ہے جو دوسرے نظریے کے ضمن میں پیش کی گئی ہے۔ وہ کہتا ہے اگر مردہ یہ جان لے کہ وہ مردہ ہے تو اس صورت میں وہ مردہ نہیں ہو گا بلکہ زندہ ہو گا۔

ابن راوندی کہتا ہے مردہ میں اپنے آپ کو پہچاننے کا شعور نہیں ہوتا کیونکہ شعور زندہ لوگوں کی واضح صفات میں سے ایک ہے اور اگر مردہ اپنے آپ کو پہچان لے اور اس بات سے آگاہ ہو جائے کہ وہ مردہ ہے تو اس صورت میں وہ زندہ شمار ہوگا نہ کہ مردہ اس وجہ سے عام عقیدہ کے خلاف وہ یہ نہیں دیکھ سکتا کہ اس کے رشتہ دار اس کے سرہانے کھڑے رو رہے ہیں کیونکہ اگر انہیں دیکھ لے اور ان کی گریہ و زاری سن لے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ زندہ ہے اور اگر مردہ ہوتا تو ہرگز نہ جان سکتا کہ مردہ ہے وہ نہ ہی اپنے ارد گرد کھڑے لوگوں کو دیکھ سکتا ہے اور نہ ان کے رونے کی آواز سن سکتا ہے۔

ابن راوندی نے موت کے متعلق چوتھا نظریہ یہ پیش کیا کہ کوئی بھی مردہ اپنے آپ کو مرنے سے پہلے نہیں پہچان سکتا۔ اس کے بقول' اگر فرض کریں ابو الحسن مرجائے (ابوالحسن' ابن راوندی کی کنیت تھی) پھر اسے قبر میں رکھ کر دفن کر دیں تو اسے اس بات کا شعور نہیں ہوگا کہ وہ مرنے سے پہلے ابوالحسن تھا' کیونکہ اگر جان لے کہ مرنے سے پہلے ابوالحسن کے نام سے پکارا جاتا تھا' تو ضرور اس کو اپنی شناخت کا شعور ہوگا اور جو کوئی باشعور ہے مردہ نہیں کہلا سکتا۔

موت کے بارے میں ابن راوندی کا پانچواں نظریہ یہ ہے کہ مندرجہ بالا چار نظریات اس بات سے اخذ کئے گئے ہیں کہ آدمی اپنے آپ کو اس بات کا قائل نہیں کر سکتا کہ وہ ایک دن مرے گا اور اس دنیا سے اٹھ جائے گا۔

انسان گمان کرتا ہے کہ وہ ہرگز نہیں مرے گا اور جب اسے قبر میں ڈالیں گے تو زندہ ہو جائے گا البتہ وہاں اس کی زندگی کی کیفیت اس دنیا سے مختلف ہوگی۔ نیند ان اسباب میں سے ہے جو اس عقیدہ کی تقویت کا باعث بنے ہیں' انسان گمان کرتا ہے کہ جس طرح وہ اس نیند سے بیدار ہو جاتا ہے اسی طرح وہ موت کی نیند بعد بھی بیدار ہو جائے گا انسان جو مناظر خواب میں دیکھتا ہے وہ اس کے اس عقیدے کو مزید تقویت پہنچاتے ہیں کہ حقیقی

موت کا وجود نہیں کتاب الفرند کے مصنف کے بقول انسان خواب میں اپنے آپ کو مردہ دیکھتا ہے تو وہ عین زندہ ہوتا ہے یا اس کے اپنے عزیز و اقارب اپنے آپ کو مردہ دیکھتے ہیں تو وہ عین زندہ ہوتے ہیں۔ انسان گمان کرتا ہے کہ موت کے بعد بھی اس طرح کی کیفیت ہوگی۔ جب وہ مرجائے گا تو اپنے آپ کو زندہ پائے گا اور اپنی شناخت کر سکے گا۔

ابن راوندی کے مطابق انسان اس پر غور نہیں کرتا کہ مرنے کے بعد اس کے تمام جسمانی اعضاء نابود ہو جائیں گے' کیونکہ ان جسمانی اعضاء ہی کی وجہ سے انسان سوتا ہے اور پھر خواب میں اپنے آپ کو مردہ اور زندہ دیکھتا ہے۔ خواب میں ان طرح طرح کے مناظر کو دیکھنا انسانی جسم کے اعضاء کی وجہ سے ممکن ہے۔ اگر یہ جسمانی اعضاء نہ ہوں تو انسان سو ہی نہیں سکتا کہ وہ خواب دیکھے۔ ابن راوندی کو علم تھا کہ قدیم مصر میں میتوں کو مومیائی کر دیتے تھے کیونکہ اس کا کہنا ہے کہ ان کا گمان ہوتا تھا کہ اگر انسانی ڈھانچہ باقی رہے تو انسان مرنے کے بعد بھی زندہ رہے گا اور اپنی پہچان کر سکے گا۔ جس طرح وہ سونے کے دوران خواب میں اپنی شناخت کر سکتا ہے لیکن ابن راوندی کے بقول مصر والے جس مردے کو مومیائی کرتے تھے وہ دل کے بغیر ہوتا تھا۔ کیونکہ اسے مومیانے سے پہلے بدن کے تمام اندرونی اعضاء باہر نکال کر دور پھینک دیتے تھے۔ پس یہ کیسے قابل قبول ہے کہ جس مردے کا دل نہ ہو وہ اپنی پہچان کر سکتا ہے' کیونکہ ابن راوندی کا خیال تھا انسان جو مناظر خواب میں دیکھتا ہے ان کا تعلق دل سے ہے۔ انسان اپنے آپ کو دل کے احاطے میں دیکھتا ہے اور پہچانتا ہے اور بطور کلی جس طرح یہ قدیم لوگ روحانی احساسات کا سرچشمہ دل کو سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا۔ کہ جو مناظر خواب میں نظر آتے ہیں ان کا وجود دل میں ہوتا ہے جیسا کہ ہم نے ملاحظہ کیا موت کے بارے میں ابن راوندی کے نظریات اس کے اپنے زمانے یعنی تیسری صدی کے اوائل میں قابل توجہ تھے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ ابن راوندی نے خلیفہ کے حکم سے مجبور ہو کر اپنی اس تمام تحریر کی اصلاح کی جس میں اس نے توحید' نبوت اور قیامت کا انکار کیا تھا گویا اس نے اپنی تحریر واپس لے لی۔ اس کے علاوہ ابن راوندی کی کتاب میں ایک اور عنوان بھی تھا۔ جس کی وجہ سے عباسی خلیفہ کے دارالحکومت میں اس پر کفر کا فتویٰ لگا۔ عباسی خلیفہ کے دارالحکومت میں کفر کے فتوے کی بات ہم اس لئے کرتے ہیں کہ وہ علاقے جہاں جعفری مذہبی ثقافت رائج تھی' کسی نے اس دلیل کی بنا پر کفر کا فتویٰ نہیں لگایا بلکہ جن علاقوں میں علماء' جعفری مذہبی ثقافت سے روشناس تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ یہ عنوان' دین کی تقویت کا باعث ہے۔

# دین علمی ترقی سے متصادم نہیں

جو کچھ ابن راوندی نے اپنی کتاب میں لکھا اس کا خلاصہ یہ تھا۔ کہ دین کو بہانہ بنا کر علمی ترقی میں رکاوٹ نہ ڈالی جائے اور یہ موضوع اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اس کی تربیت جعفر صادقؑ کے ثقافتی مکتب میں ہوئی تھی امام جعفر صادق علیہ السلام کے حلقہ درس میں اس زمانے کے تمام علوم پڑھائے جاتے تھے ان میں سے بعض کی تدریس پہلی مرتبہ ایک اسلامی مکتب میں شروع ہوئی تھی۔ چونکہ امام جعفر صادق علیہ السلام کا عقیدہ تھا کہ علوم میں جتنی ترقی ہوگی اتنی ہی وہ دین کی تقویت کا باعث ہونگے امام جعفر صادقؑ کے حلقہ درس میں فلسفہ پڑھایا جاتا تھا جبکہ بعض مسلمان اساتذہ فلسفہ کی تدریس سے سخت پرہیز کرتے تھے اور معتقد تھے کہ فلسفہ کی تدریس مومنین کے عقیدہ کو بگاڑنے کا باعث بنتی ہے۔ فلسفہ کے علاوہ امام جعفر صادقؑ کے حلقہ درس میں فزکس' کیمیا' طب' جغرافیہ' ہیئت' حساب اور جیومیٹری بھی دینی علوم کے علاوہ پڑھائی جاتی تھیں۔ ابن راوندی جس نے اس ثقافتی مرکز میں تربیت پائی تھی لکھا کہ دین علمی ترقی کی راہ میں حائل نہیں ہوتا اور اس بنا پر وہ عباسی خلیفہ کے دارالحکومت میں خلیفہ کے غضب کا نشانہ بنا اور جب اس نے خلیفہ کی تنقید کو قبول کر کے اپنی کتاب کی اصلاح کر لی۔ تو متوکل نے اسے اچھے خاصے انعام سے نوازا لیکن عباسیوں کے دارالحکومت کے علماء نے اس کی کتاب کے سارے حصوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے اسے منکر دین قرار دیا انہوں نے کہا۔ جو توحید و نبوت و قیامت کا منکر ہے کس زبان سے کہتا ہے کہ دین کو علمی ترقی کی راہ میں حائل نہیں ہونا چاہئے یہ بات تو اسے زیب دیتی ہے جو دین دار ہو۔ جدید علوم کی تواریخ میں درج ہے کہ رابرٹ ہوک وہ پہلا شخص تھا جس نے تین سو سال پہلے لندن کے علمی اجتماع کے بانیوں میں سے ایک بانی فرد کی حیثیت سے پہلے اجلاس میں اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہمارے مذہب کو علمی تحقیقات کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننا چاہئے لیکن اس موضوع کی بنیاد حضرت امام جعفر صادقؑ نے دوسری صدی ہجری کے اوائل میں رکھی تھی اور ابن راوندی جو جعفری ثقافتی مکتب کا تربیت یافتہ تھا اس نے تیسری صدی ہجری کے اوائل میں اپنی کتاب میں اسے لکھا جسے عباسیوں کے دارالحکومت میں ناپسند کیا گیا دوسری صدی ہجری کے پہلے پچاس سالوں کے دوران اسلامی ممالک میں یکے بعد دیگرے اسلامی فرقے وجود میں آ رہے تھے جن میں سے اکثر ترک دنیا کی طرف مائل تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسا عیسائیوں کی خانقاؤں کے زیر اثر ہو رہا تھا جن میں پادری حضرات زندگی بسر کر رہے تھے لیکن امام جعفر صادقؑ جو ترک دنیا کے مخالف تھے اور کہتے تھے کسی مسلمان کو اپنی زندگی گوشہ تنہائی میں الگ تھلگ رہ کر فضول ضائع نہیں کرنی چاہئے۔ ابن راوندی نے جعفریؑ ثقافتی مکتب کا تربیت یافتہ ہونے کی وجہ سے اپنی کتاب

میں ان اسلامی فرقوں کو جو گوشہ نشینی و ترک دنیا کی طرف مائل تھے سخت تنقید کا نشانہ بنایا اور یہ موضوع عباسیوں کے دارالحکومت میں ان مذہبی فرقوں کی نہ صرف ناراضگی کا باعث بنا بلکہ وہ اس پر غضبناک بھی ہوئے (۵۹)

ان کے غیض و غضب کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ابن راوندی کو کافر و مرتد قرار دیا۔ اور کہا اس جیسے شخص کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان کی مذہبی روش کے بارے میں اظہار خیال کرے گوشہ نشینی سے منع کرے اسلامی مذہبی فرقوں میں ایک طرح کا اعتکاف قابل تحسین ہے یہ اعتکاف روح کی پاکیزگی اور اعلیٰ مراتب تک پہنچنے کے لئے آمادہ کرنے کی خاطر انجام دیا جاتا ہے اگرچہ اس طرح کے اعتکاف کی امام جعفر صادقؑ نے بھی اجازت دی تھی لیکن اس اعتکاف اور گروہی صورت میں گوشہ نشینی میں امتیاز رکھا ہے۔ مسلمانوں کے ایک گروہ کی طرف سے دنیاوی فرائض سے بچنے کی خاطر گوشہ نشینی اختیار کرنا امام جعفر صادق علیہ السلام کے نزدیک قابل تحسین نہ تھا کیونکہ جب مسلمان دنیا سے ہاتھ کھینچ لیں گے ایک دوسرے کی تقلید میں کام کاج سے اجتناب برتنے لگیں گے اور اپنی معاشی ضروریات دوسروں کی وساطت سے پوری کرنے لگیں گے تو اسلامی معاشرہ ضعیف اور مفلس ہو جائیگا اور اس طرح مسلمان دوسری قوتوں کے زیر نگیں ہو جائیں گے۔

جس اعتکاف کو امام جعفر صادقؑ نے قابل تحسین قرار دیا وہ اعتکاف پیغمبرؐ اسلام کے غار حرا میں اعتکاف کی مانند تھا کیونکہ یہ اعتکاف پاکیزگی روح اور اعلیٰ مدارج کے حصول کے لئے تھا اس کے ساتھ ساتھ پیغمبرؐ اسلام نے اپنا کام کاج بھی نہیں چھوڑا' وہ گوشہ تنہائی میں نہیں بیٹھے اور نہ ہی اپنی معاشی ذمہ داریاں دوسروں کے سپرد کیں۔ آپ کام کرتے اور صرف ان دنوں میں جنہیں ہم آج رخصت کے دن کہتے ہیں غار حرا میں گزارتے تھے وہاں پر وہ اپنے آپ میں گم ہو جاتے اور کوشش کرتے کہ اپنے آپ کو روحانی لحاظ سے مزید بہتر بنائیں اور اپنے اندر نئی نئی نیک خصوصیات پیدا کریں۔ لیکن بعض اسلامی فرقوں نے تنہائی اور دنیا سے ہاتھ دھونے کو اپنا پیشہ بنا لیا' جب ان سے کہا جاتا کہ گوشہ نشینی کیوں اختیار کر رہے ہو اور زندگی کے جہاد میں ہمارے ہم قدم بن کر کیوں نہیں چلتے؟ تو اس کے جواب میں وہ کہتے تھے کہ پیغمبرؐ اسلام نے بھی گوشہ نشینی اختیار کی تھی۔ اگر اعتکاف انہیں پسند نہ تھا تو آپؐ غار حرا میں کیوں معتکف ہوتے تھے ؟ یہ لوگ اس بات سے غافل ہیں کہ پیغمبرؐ اسلام کے غار حرا میں اعتکاف اور ان بعض اسلامی فرقوں کے اعتکاف میں بڑا فرق تھا۔

تیسری صدی ہجری کے پہلے پچاس سالوں کے دوران جب ابن راوندی بغداد میں تھا تو تقریباً" نوے اسلامی فرقے پائے جاتے تھے جن کی اکثریت گوشہ نشینی اور ترک دنیا کو بہت بڑی عبادت خیال کرتی تھی ان کا گمان تھا کہ انسان کو تمام عمر دنیا سے ہاتھ دھو کر کونے میں بیٹھ جانا چاہیے۔ صاف ظاہر ہے اس صورت میں ان کی معاشی ضروریات امیر لوگ پوری کرتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کو فرداً" فرداً" مالی امداد نہیں پہنچا سکتے تھے لہذا

ایسے اداروں کا قیام عمل میں آیا جو خانقاہوں سے مشابہ تھے اور ان اداروں میں سے ہر ایک اس ماہانہ رقم سے چلتا تھا جو اس زمانے کے حاکم یا امراء لوگ اس ادارے کو دیتے تھے جبکہ بعض عیسائی خانقاہوں کے رہائشی کھیتی باڑی کا کام بھی کرتے تھے (۶۱)۔

یہ ادارے جن میں لوگ زندگی بسر کرتے تھے انہیں اس مقام کی مناسبت سے بیت، خانہ، سرایا، تکیہ کہا جاتا تھا۔ (۶۲) کبھی بھی یہ دیکھنے میں نہیں آیا کہ ان اداروں کے مکینوں نے کوئی پیداواری کام کیا ہو حتیٰ کہ انہیں انگور کی بیل کاشت کرتے ہوئے بھی نہیں دیکھا گیا (۶۳) ان اداروں کے بعض مکین زاہد تھے وہ چاہتے تھے کہ زندگی کے ہنگاموں سے دور رہ کر عبادت کی جائے لیکن ان میں زیادہ تعداد بدقماش لوگوں کی تھی۔ کیونکہ ان اداروں میں رہائش اختیار کرنے کے لئے اتنا کہنا کافی ہوتا تھا کہ میں نے دنیا سے ہاتھ دھو لئے ہیں اور گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے۔ اس طرح ہر کوئی ان اداروں میں رہ کر اپنی معاشی ضروریات یہاں سے پوری کر سکتا تھا۔ (۶۴) ان اداروں کے اکثر مکین عام خواندہ لوگ تھے اور یہ بات بعید نہیں کہ انہی کی وساطت سے اداروں میں تالیاں، گھنٹیاں اور دوسرے آلات موسیقی بجنے کی راہ ہموار ہوئی ہو۔ ان گھروں کے بعض مکین اپنی مذہبی رسومات کے دوران تالیاں، گھنٹیاں اور سنج (تھالی نما آلہ موسیقی) بجاتے تھے۔ گھنٹیاں بجانے کی رسم یقیناً" انہوں نے مارونی گرجوں سے لی ہے۔ مارونی عیسائی فرقوں میں سے ایک ہے۔ مارونی عیسائیوں کے گرجے ماسوائے لبنان کے کہیں اور موجود نہیں ہیں۔ اس فرقے کے پیروکار پہلے آرتھوڈکسی تھے۔ اس کے بعد روم کے کلیسا سے وابستہ ہو کر کیتھولک قرار پائے لیکن رومی کلیسائی لاطینی زبان ان کے درمیان رائج نہیں بلکہ آرامی زبان ان کی مذہبی زبان کہلاتی ہے جو حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں مشرق قریب کی بین الاقوامی زبان کا درجہ رکھتی تھی۔ اس کے باوجود مارونیوں کی زبان آرامی ہے انہیں اس زبان پر کاملاً" عبور نہیں اور ان کی تمام مذہبی کتب عربی میں لکھی جاتی ہیں۔ چونکہ ان کا رسم الخط عربی ہے لہٰذا دائیں سے بائیں طرف پڑھا اور لکھا جاتا ہے۔ یہ لوگ مذہبی رسومات کے دوران گرجے میں تالیاں، موسیقی کے آلات اور گھنٹیاں بجاتے ہیں۔ مارونی عیسائیوں نے نہ صرف عربی رسم الخط مسلمانوں سے لیا ہے بلکہ وضو کا طریقہ بھی مسلمانوں سے سیکھا ہے۔ مارونی عیسائیوں کے پادری حضرات مذہبی رسومات کا آغاز کرنے سے پہلے وضو کرتے ہیں جب کہ کسی بھی عیسائی فرقے میں مذہبی رسومات سے قبل وضو کرنا رائج نہیں۔ ابن راوندی نے جتنے بھی متنازعہ مطالب اپنی کتاب الفرند میں لکھے ہیں مثلاً" تصوف اختیار کرنے والے فرقوں کی مخالفت وغیرہ، ان میں سے کوئی بھی اس کے دشمن پیدا کرنے کا باعث نہیں تھا۔

یہاں پر اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ تیسری صدی ہجری کے اوائل میں وہ تمام اسلامی فرقے جو گوشہ نشینی کی ترغیب دیتے تھے اہل تصوف نہ تھے۔ ہم نے ان کا یکجا نام لیتے ہوئے انہیں اہل تصوف کہا ہے۔

یہاں پر ہمارا یہ ارادہ نہیں ہے کہ ہم تصوف کی ماہیت پر غور و فکر کریں اور کہیں کہ کیا تصوف کے مقاصد میں سے ایک مقصد گوشہ نشینی اور ترک دنیا بھی ہے یا نہیں ؟

یہاں اہل تصوف سے وہ لوگ مراد لئے ہیں جنہوں نے ترک دنیا اور گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی خواہ ان کے افکار صوفیانہ تھے یا نہ تھے؟

جیسا کہ ہم نے مشاہدہ کیا' ابن راوندی کے توحید و نبوت سے انکار نے خلیفہ کو اس کا دشمن بنا دیا تھا اور اس اصفہانی مصنف نے محض قتل ہونے سے بچنے کے لئے مجبوراً" اپنی کتاب کے کچھ حصوں میں تبدیلی کی تھی۔ لیکن عام لوگ توحید و نبوت کے انکار کی بنا پر ابن راوندی کے مخالف نہیں ہوئے۔ اگرچہ اسے کافر سمجھتے تھے مگر اس کے ساتھ خصوصی عداوت نہیں رکھتے تھے لیکن صوفی فرقوں کی مخالفت نے ان فرقوں کی اکثریت کو ابن راوندی کا خونی دشمن بنا دیا تھا۔ کیونکہ ابن راوندی ان کے ذریعہ معاش کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی کتاب میں لکھا تھا کہ ان فرقوں کے پیروکار بیکار اور تن پرور لوگ ہیں جو کسانوں کی مانند کھیتی باڑی کرنے مزدوروں کی طرح صنعتی کام کرنے اور اس طرح کے دوسرے مشقت طلب کام انجام دینے سے گریزاں ہیں یا علماء کی مانند علم حاصل کرنے اور لوگوں کو اس عالم سے فیض یاب کرنے سے گریزاں کرنے والے اور مفت خورے ہیں۔

اس نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ان تمام گھروں کو جن میں ان فرقوں کے لوگ مقیم ہیں خالی کر دینا چاہیے اور وہ تمام اثاثہ جو ان کے گھروں کے لئے مختص ہے بیت المال میں منتقل کر کے اس سے تمام مسلمانوں کو فائدہ اٹھانے کا موقع دینا چاہیے۔

ابن راوندی نے جو کچھ اپنی کتاب میں صوفی کے فرقوں کے بارے میں لکھا اس میں ان فرقوں کے پیروکاروں کی بھوک سے مرنے کی مذمت کی گئی تھی۔ تصوف کے ان گھروں میں رہائش پذیر لوگوں کی اکثریت چونکہ ساری عمر یہاں بسر کر چکی تھی لہٰذا اگر انہیں یہاں سے نکال دیا جاتا تو زندہ رہنے کے لئے بھیک مانگنے کے علاوہ ان کے پاس کوئی چارہ کار نہ تھا۔ ان گھروں میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو معمر اور متقی ہونے کی بنا پر مسلمانوں میں احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ اس لئے بالفرض اگر ان لوگوں کو ان گھروں سے نکال باہر کیا جاتا اور اس سے منسلک اوقاف کو بیت المال میں منتقل کر دیا جاتا تو لوگ ان افراد کو بھی بے گھر اور بھوکا نہ چھوڑتے۔ البتہ ان میں سے وہ لوگ جو عالم تھے نہ زاہد' لوگ انہیں در خور اعتنا نہیں سمجھتے تھے یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے اپنی روزی کو خطرے میں پڑتے دیکھا تو ابن راوندی کو نہ صرف کافر بلکہ مفسد فی الارض کا لقب دے دیا ۔ گویا ابن راوندی پہلا شخص ہے جو مسلمانوں میں اس لقب سے نوازا گیا۔

تصوف کے ان گھروں میں ایسے پیر بھی تھے جن کے کئی مرید تھے۔ ان مریدوں نے ابن راوندی کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ جب اس نے اپنی جان خطرے میں دیکھی تو عباس صروم کے ہاں پناہ لے لی۔ جیسا کہ ہم نے ذکر

کیا عباس صروم نے جونہی ابن راوندی کی کتاب دیکھی تو ایک کافر سے دوستی کے الزام سے بچنے کی خاطر اسے اپنے گھر سے نکال دیا۔ لیکن جب ابن راوندی اپنی کتاب کی اصلاح کر چکا تو عباس صروم کے اس سے گریز کرنے کا سبب ختم ہو گیا اور چونکہ خلیفہ نے ابن راوندی کو معقول انعام اور معاوضہ عطا کر دیا تھا لہٰذا عباس صروم کے لئے اسے اپنے گھر میں رکھنے میں کوئی قباحت نہ تھی۔ ابن راوندی عباس صروم کے گھر چند دن مقیم رہا۔ جو لوگ اسے قتل کرنا چاہتے تھے جب انہیں پتہ چلا کہ وہ عباس صروم کے گھر میں قیام پذیر ہے تو انہوں نے عباس صروم کو جو اس وقت خلیفہ کے دربار سے گھر واپس آ رہا تھا راستے میں روک کر کہا تم نے ایک کافر' مفسد فی الارض اور واجب القتل کو اپنے گھر میں ٹھہرایا ہوا ہے اور اسے پناہ دی ہے۔ اگر تم اسے گھر سے نہیں نکالو گے تو ہم تمہارے گھر پر دھاوا بول دیں گے۔ عباس صروم بولا' مجھے کل تک کی مہلت دو۔

جو لوگ ابن راوندی کو قتل کرنا چاہتے تھے کہنے لگے ابھی اسے گھر سے کیوں نہیں نکالتے؟ عباس صروم نے کہا' اس لئے کہ وہ میرا مہمان ہے اور ابھی دوپہر کے کھانے کا وقت ہے کیا اگر آپ کے کسی مہمان کے سامنے کھانے چنے ہوئے ہوں تو اسے دستر خوان سے اٹھا سکتے ہیں؟ انہوں نے کہا نہیں البتہ یہ شخص کافر' مرتد اور واجب القتل ہے لہٰذا تم ہرگز اسے مہمان تصور نہ کرو اسے ابھی گھر سے نکالو تاکہ ہم اسے تمہارے گھر کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں۔

جب عباس صروم نے دیکھا کہ وہ سب ابن راوندی کو قتل کرنے پر تلے ہوئے ہیں ان سب کے پاس خنجر اور تلواریں ہیں اس نے ان کا غصہ فرو کرنے کے لئے کہا کہ میرا مہمان ہونے کے علاوہ یہ شخص خلیفہ کا منظور نظر بھی ہے اور اس سے انعام بھی حاصل کر چکا ہے۔ اس کے قتل کے بعد خلیفہ تمہیں سزا دے گا۔ انہوں نے کہا ہم ہر طرح کی سزا کے لئے تیار ہیں' ہم نے ارادہ کر لیا ہے کہ اس کافر کو قتل کر کے رہیں گے اگرچہ اس کے بعد خلیفہ ہمارے سر تن سے جدا کر دے۔ جب عباس صروم نے محسوس کیا کہ وہ خلیفہ کے غضب سے بھی نہیں ڈرتے تو اس نے ان سے کہا کہ براہ مہربانی مجھے کل تک مہلت دیں میں کل اسے اپنے گھر سے نکال دوں گا۔ عباس صروم سے پوچھا گیا کہ کل کس وقت اسے گھر سے نکالے گا؟ بولا' جونہی سورج طلوع ہو گا میں اسے اپنے گھر سے نکل جانے کے لئے کہوں گا انہوں نے پوچھا اگر وہ تمہارے گھر سے نہ نکلنا چاہے تو تم کیا کرو گے؟

عباس صروم نے کہا میں ملازموں سے کہوں گا کہ اسے زبردستی نکال دیں انہوں نے کہا ہم کل سورج طلوع ہونے کے ساتھ ہی یہاں حاضر ہو جائیں گے امید ہے تو اپنا وعدہ وفا کرے گا۔ عباس صروم کا ارادہ تھا کہ عصر کے وقت جا کر خلیفہ سے ابن راوندی کی حمایت کے لئے درخواست کرے لیکن عصر کے وقت اسے خلیفہ سے ملنے کا موقع نہ مل سکا جب کہ دوسری صبح اس نے خلیفہ سے دیر سے ملاقات کرنا تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ لوگ جو ابن راوندی کے گھر سے نکلنے کے منتظر ہیں درندوں کی مانند اپنے شکار پر تلواروں اور خنجروں سے ٹوٹ پڑیں

اور اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں۔ ممکن تھا عباس صروم جو خلیفہ کا درباری تھا گھر کی حفاظت کے لئے اپنے گھر کے باہر پہرہ دار مقرر کر دیتا لیکن اس نے ایسا اس لئے بھی نہیں کیا کہ وہ جان چکا تھا کہ لوگ ابن راوندی کی موجودگی سے باخبر ہیں لہٰذا وہ یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ لوگ اسے اس کا کٹر حامی سمجھیں۔ چونکہ عام لوگ ابن راوندی سے سخت متنفر تھے اور اسے مرتد کافر سے بھی برا خیال کرتے تھے کیونکہ وہ صوفی فرقہ کو رزق سے محروم کر دینا چاہتا تھا۔ اگر عباس صروم واقعی اس کی حمایت کرتا تو نہ صرف یہ کہ وہ اس سے بھی متنفر ہو جاتے بلکہ قریب تھا کہ اسے قتل بھی کر دیتے۔ عباس صروم کا آبائی شہر بھی دارالحکومت تھا اسے علم تھا کہ اس نے ساری زندگی اسی شہر میں بسر کرنا ہے چونکہ وہ خلیفہ کا درباری تھا لہٰذا وہ کہیں اور سکونت اختیار کرنے سے معذور تھا۔

لیکن ابن راوندی ایک اصفہانی شخص تھا جس دن وہ بغداد سے روانہ ہوا تو عباس نے اس لئے سنجیدگی سے اس کی حمایت نہیں کی کہ اگر وہ ایسا کرتا تو شہر کے لوگ اس کی مخالفت پر کمر بستہ ہو جاتے۔ جب عباس صروم نے ابن راوندی کے دشمنوں سے ایک رات کی مہلت مانگی تو اس نے سوچا کہ ابن راوندی کو اس رات ایک خادم کی رہنمائی میں شہر سے باہر ایک باغ میں بھیج دے گا لیکن پھر اس نے یہ ارادہ ترک کر لیا چونکہ جو لوگ ابن راوندی کو قتل کرنا چاہتے تھے' آخر کار انہیں پتہ چل ہی جاتا کہ عباس صروم نے ابن راوندی کو اپنے باغ میں پناہ دی تھی اس طرح وہ خود اس کے بھی جانی دشمن بن جاتے اس صورت میں وہ اسے قتل یا زخمی کر دیتے۔ عرب مہمان نوازی کا یہ تقاضا تھا کہ جب عباس صروم نے ابن راوندی کو پناہ دی تھی تو اس کی حمایت کرے اور اسے دشمنوں کے سپرد نہ کرے لیکن جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے عباس صروم ہرگز لوگوں سے دشمنی مول لینا نہیں چاہتا تھا کہ اگر وہ سنجیدگی سے ابن راوندی کی مدد کرے گا تو لوگوں کی دشمنی کا موجب ہوگا یہی وجہ تھی کہ اس نے ابن راوندی کو راتوں رات گھر سے نکال دینے کا فیصلہ کیا۔ جب رات کا کھانا کھا چکے تو عباس صروم نے ابن راوندی سے کہا اے ابوالحسن' جیسا کہ تمہیں معلوم ہے مجھ سے جہاں تک ہو سکا میں نے اپنے گھر میں تمہاری حفاظت کی ہے اس کے بعد میں تمہارے دشمنوں کے خطرے سے تمہیں نہیں بچا سکوں گا۔

اگر آج رات تمہارے دشمن تمہیں قتل کرنے کے لئے حملہ نہ کریں تو صبح طلوع آفتاب کے وقت ضرور حملہ کر کے تمہیں قتل کر دیں گے۔ میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا اگر میں نے مزاحمت کی تو مجھے بھی قتل کر ڈالیں گے۔ اگر میرے قتل سے تمہاری جان بچ سکے تو میں حاضر ہوں تاکہ تم دشمنوں کے چنگل سے نجات پاؤ لیکن مجھے علم ہے کہ میرے قتل پر ان کی پیاس نہیں بجھے گی بلکہ ان کی پیاس تمہارے ہی قتل سے بجھے گی۔ اب تمہاری نجات اسی میں ہے کہ تم اس شہر سے بھاگ جاؤ' بصورت دیگر تمہارا قتل یقینی ہے۔ دیکھو! ابھی اٹھو اور اپنی راہ لو جب تم شہر کے مشرق میں واقع صیدلہ گاؤں میں پہنچو گے تو وہاں سے ایک کارواں "رے" کی طرف جاتا ہے اس کاروان میں شامل ہو جانا اگر کل وہ کارواں عازم سفر نہ ہوا تو پرسوں تک وہیں

انتظار کر لینا۔

اس زمانے میں عباسی خلیفہ کے دارالحکومت میں مشرق کی جانب سفر کرنے والا ہر کارواں رے کے نام سے پکارا جاتا تھا کیونکہ یہ رے سے گزرتا تھا اگرچہ اس کارواں کی آخری منزل خراسان تھی۔ عباس صروم کو علم تھا کہ ابن راوندی ضرور اسے کہے گا کہ خلیفہ سے مدد کی درخواست کیوں نہیں کرتے ؟ بالکل ایسا ہی ہوا کتاب الفرند کے مصنف نے یہی سوال پوچھا جس کے جواب میں عباس صروم نے کہا تمہارے خلاف خلیفہ کے کان بھرے ہوئے ہیں کیونکہ تم نے صوفی فرقوں کی مخالفت کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان سے متعلقہ تمام گھروں کو خالی کروانا چاہئے اور اوقاف کا سرمایہ وغیرہ گھروں سے بیت المال میں منتقل کر دینا چاہئے۔ اگر تمہیں علم نہیں تھا تو اب جان لو کہ یہ صوفی فرقے خلیفہ کے منظور نظر ہیں ان میں سے بعض فرقوں کے پیروکاروں کے لئے وہ خود تحائف بھیجتا ہے۔ اب اگر میں خلیفہ سے تیری جان بچانے کی درخواست کروں گا تو بھی تمہاری زندگی بچتی نظر نہیں آتی کیونکہ اگر متوکل نے تمہیں ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لئے ان کے حوالے نہ کیا تو وہ خود تمہارے قتل کا حکم صادر کرے گا۔

ابن راوندی نے کہا' جس وقت خلیفہ نے میری کتاب ملاحظہ کی تھی صوفی فرقوں کے بارے میں میری تحریر پر کوئی قدغن نہیں لگائی تھی اور تمہارے بقول اگر وہ صوفی فرقوں کا طرفدار ہے تو اس نے مجھے اپنی تحریر میں تبدیلی کرنے کے لئے کیوں نہیں کہا۔

عباس صروم بولا تمہارا کیا خیال ہے کہ خلیفہ نے تمہاری ساری کتاب پڑھی ہے ؟ کیا جب خلیفہ کو کتاب دی جاتی ہے تو وہ ساری کتاب پڑھتا ہے وہ ایک ایسا انسان ہے جو مشرقین و مغربین کا نظام چلاتا ہے پس ایسا شخص کیسے ایک کتاب کا ایک ایک صفحہ پڑھ سکتا ہے؟

عباس صروم نے متوکل کی شراب نوشی کے بارے میں کچھ نہ کہا کیونکہ ایک ایسا شخص جو رات کو شراب پئے وہ صبح شراب کے نشے میں دھت' کس طرح کتاب پڑھ سکتا اور اس کی ہر ایک بحث پر اظہار خیال کر سکتا ہے۔ متوکل صرف اس وقت کتاب پڑھتا تھا جب وہ کم نشے کی حالت میں ہوتا کیونکہ زیادہ نشہ کتاب پڑھنے میں رکاوٹ بنتا ہے۔ کوئی بھی ایسا باخبر انسان نہ تھا جسے متوکل کی شراب خوری کا علم نہ ہوتا۔ لیکن عباس صروم نہیں چاہتا تھا کہ اس موضوع کو ابن راوندی اس کی زبان سے سنے ایسا نہ ہو کہ وہ ایک دن کہے' عباس صروم نے خلیفہ پر شراب نوشی کی تہمت لگائی ہے۔

اسی لئے اس نے اسلامی ممالک کے امور کے انتظام و انصرام کا مسئلہ پیش کیا اور کہا کہ وہ شخص جو اتنا مصروف ہو کسی کتاب کو صفحہ بہ صفحہ کیسے پڑھ سکتا ہے ؟ اس کے بعد کہنے لگا اگر فرض کیا خلیفہ نے صوفی فرقوں کے متعلق تمہاری کتاب کا اقتباس پڑھ بھی لیا اور اس پر کوئی قدغن نہیں لگائی تو اس کا مطلب ہرگز یہ

نہیں کہ خلیفہ تم پر غضب ناک نہیں ہوا کیونکہ جس وقت تم نے کتاب خلیفہ کے سپرد کی تھی یہاں پر کوئی تمہاری کتاب کے مواد سے مطلع نہ تھا لیکن جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ تم نے صوفی فرقوں کے بارے میں کیسا مواد لکھا ہے تو لوگ مشتعل ہو گئے۔ متوکل خود بھی صوفی فرقوں کو پسند کرتا ہے لہذا ہرگز ان کے مقابلے میں تمہاری حمایت نہیں کرے گا۔

ابن راوندی نے پوچھا ایک مرتبہ پہلے بھی تم مجھے گھر سے نکال باہر کر چکے ہو کیا دوبارہ یہی چاہتے ہو اور اس طرح تم مجھے میرے دشمنوں کے حوالے کرنا چاہتے ہو ؟ عباس صروم نے کہا' اگر میں تمہیں تمہارے دشمنوں کے حوالے کرنا چاہتا تو تمہیں کہتا کہ یہیں رہو اور جب صبح تمہارے دشمن آتے تو دروازہ کھول دیتا تاکہ وہ تجھے قتل کر ڈالیں۔ یا یہ کہ نوکروں سے کہتا کہ تجھے زبردستی گھر سے نکال کر تمہارے دشمنوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں وہ آج بھی تمہیں قتل کرنے کے لئے حملہ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن میں نے ان سے کل تک کی مہلت طلب کی ہے یہ مہلت صرف تمہاری نجات کی خاطر مانگی ہے۔ تمہاری نجات اس میں ہے کہ تم آج رات اس شہر سے باہر نکل جاؤ کل جب تمہارے دشمن آئیں گے تو میں ان سے یہ کہوں گا کہ تم فلاں طرف گئے ہو۔ کل صبح تم صیدلہ پہنچ جاؤ گے جونہی وہاں پہنچو' رے کے قافلے کے ہمراہ وہاں سے چل پڑنا۔ اگر قافلہ اس دن نہ جائے تو ایک دن وہیں ٹھہر کر دوسرے دن عازم سفر ہو جانا۔ دیکھو ! اگر تم صیدلہ میں ایک دن قیام کرو تو اپنا نام کسی پر آشکارا نہ کرنا۔ بلکہ کوئی دوسرا فرضی نام رکھ لینا۔ غور سے سنو ! اگر وہاں بھی کسی کو تم پر شک گزرا تو تمہاری خیر نہیں۔

عباس صروم نے الفرند کے مصنف کو اس قدر تاکید کی کہ وہ اسی رات شہر سے باہر نکلنے پر آمادہ ہوگیا۔ ابن راوندی کو امید تھی کہ عباس اسے شہر سے نکلنے کے لئے اپنی سواری کا جانور دے دے گا۔ لیکن عباس صروم نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا اس کے پاس کوئی جانور نہیں اور نہ وہ رات کو کسی دوسرے سے لے کر دے سکتا ہے البتہ شہر سے نکلنے کے بعد دیہاتیوں کے جانور مل جائیں تو وہ انہیں معمولی سا کرایہ دے کر ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

ابن راوندی نے اپنے ضروری سامان میں سے جس قدر وہ اٹھا سکتا تھا اٹھایا اور شہر سے باہر نکل گیا۔ جب کچھ فاصلہ طے کر چکا تو تھکاوٹ محسوس کرنے لگا حالانکہ اس کا سامان اتنا بھاری نہ تھا۔ بلکہ وہ دارالحکومت میں زندگی بسر کرنے اور خلیفہ کا انعام یافتہ ہونے کی بنا پر سہل پسند ہو گیا تھا۔ ابن راوندی ان مشرقی علماء میں سے تھا جو کھیتی باڑی بھی کرتے اور علم بھی حاصل کرتے تھے پھر جب وہ عالم بن جاتے تو دوسروں کو پڑھاتے۔ یہ علماء پیدل چلنے سے نہیں گھبراتے تھے اور تمام دن کھیتوں میں کام کرتے' ذرا بھی نہیں تھکتے تھے۔ لیکن جب کچھ عرصے کے لئے سخت کام کو ترک کر دیتے خاص طور پر اس وقت جب ان کی مالی حالت بہتر ہو جاتی تو وہ اچھا کھانا

کھاتے اور زیادہ آرام کرتے اس لئے وہ آرام طلب ہو جاتے تھے۔

اس طرح ابن راوندی جب کچھ دیر پیدل سفر کر چکا تو اس کے لئے مزید چلنا دوبھر ہو گیا وہ اس امید پر راستے کے کنارے بیٹھ گیا کہ کوئی گدھا گاڑی آئے اور اس کے ذریعے بقیہ فاصلہ طے کر کے صیدلہ پہنچ جائے۔

جب وہ شہر سے نکلا تو آدھی رات کا وقت تھا ابھی اس نے کچھ ہی سفر طے کیا تھا کہ اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ اس نے اپنا سامان سر کے نیچے رکھا اور پاؤں پھیلا کر سو گیا۔ تھکاوٹ کی وجہ سے اس پر ایسی نیند غالب آئی کہ وہ ان جانوروں کی گھنٹیوں کی آواز بھی نہ سن سکا جو پھل اور سبزیاں لے کر اس راستے سے دارالحکومت جاتے تھے۔ بغداد کے مشرق میں واقع دیہاتوں کو دجلہ سے نکالی گئی دو نہریں سیراب کرتی ہیں۔ ان دیہاتوں کی سبزی اور پھل کافی حد تک بغداد کی ضرورت پوری کرتے ہیں۔

سورج کی تمازت نے ابن راوندی کو جگا دیا۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا کہ اس قدر کیوں سویا' اسے تو اس وقت صیدلہ میں ہونا چاہیے تھا۔ آخر اپنے آپ کو کوستا ہوا اٹھا سامان اپنے کندھے پر لادا اور مشرق کی طرف جہاں اس کے خیال کے مطابق صیدلہ واقع تھا چل پڑا۔ سورج کافی بلندی پر آگیا تھا لو چل رہی تھی ابن راوندی جو رات کی تھکاوٹ سے نالاں تھا اب سورج کی تمازت سے شاکی تھا لیکن اب پیدل چلنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ پسینے میں شرابور چلتا رہا یہاں تک کہ پیچھے جانوروں کی گھنٹیوں کی آواز سنائی دی جس پر وہ رک گیا۔ اس نے دیکھا کہ کچھ دیہاتی گدھوں پر سوار انہیں ہانکتے چلے آ رہے ہیں ان میں سے ہر کوئی ایک گدھے پر سوار تھا۔ جونہی انہوں نے ابن راوندی کو دیکھا حیرانگی سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ اس اصفہانی شخص نے کہا آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں ؟ ابن راوندی نے سوچا کہ شہر کی مضافاتی بستیوں کے مقیم ہوں گے جو شاید شہر چلے گئے تھے اور اب واپس گاؤں آ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک بولا' ہم صیدلہ کے باسی ہیں اور وہیں جا رہے ہیں۔ ابن راوندی نے کہا اپنا ایک گدھا مجھے کرایہ پر دو میں اس کے بدلے آپ کو کرایہ کے علاوہ دعائے خیر بھی دوں گا۔ دیہاتیوں نے ایک دوسرے سے نظریں ملائیں پھر وہ جس نے کہا تھا کہ ہم صیدلہ کے رہنے والے ہیں۔ اس کی وضع قطع سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے دوسروں پر برتری حاصل ہے اور دوسرے اس کے تابع ہیں۔ وہ گدھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا سوار ہو جاؤ۔ ایک دوسرے دیہاتی سوار نے سوار ہونے اور گدھے پر سامان لادنے میں ابن راوندی کی مدد کی پھر یہ لوگ چل پڑے ابن راوندی خوش تھا کہ اسے سواری میسر آگئی ہے اور وہ آسانی سے صیدلہ پہنچ جائے گا۔

راستے میں کافی نشیب و فراز تھے۔ کبھی اوپر چڑھنا ہوتا تو کبھی نیچے اترنا پڑتا۔ راستے میں جونہی چڑھائی آئی تو دیہاتیوں میں سے ایک پیچھے دیکھتے ہوئے بولا' کچھ سوار اس طرف آ رہے ہیں۔ دیہاتیوں کا سردار اپنا گدھا ابن راوندی کے نزدیک لایا اور ابن راوندی کی سرخ دستار اتار کر ایک تھیلے میں چھپا دی اور اپنی دیہاتی ٹوپی اس

کے سر پر رکھ دی۔ ابن راوندی اس کام سے متحیر ہو کر پوچھنے لگا' تم نے میرے سر سے میری ٹوپی اتار کر عربی ٹوپی میرے سر پر کیوں رکھ دی ہے ؟ دیہاتی نے کہا' خاموش رہو اور اگر کسی نے کوئی بات پوچھی تو تم نہ بولنا بلکہ میں اسے جواب دوں گا۔ جب سوار نزدیک آئے تو پتہ چلا کہ فوجی نہیں ہیں۔ وہ دیہاتی جو دوسروں سے قد آور نظر آرہا تھا کہنے لگا' تمہاری قسمت تیرا ساتھ دے رہی ہے۔ ابن راوندی بولا۔ وہ کیسے ؟ دیہاتی نے کہا۔ یہ لوگ خلیفہ کے سپاہی نہیں ہیں۔ ابن راوندی نے کہا۔ اس سے قسمت کا کیا تعلق ہے ؟ دیہاتی بولا۔ چونکہ یہ لوگ خلیفہ کے سپاہی نہیں ہیں لہٰذا نہ تو تجھے یہاں گرفتار کرسکتے ہیں اور نہ ہی قتل کرسکتے ہیں۔

اصفہانی بولا۔ آخر مجھے کیوں گرفتار یا قتل کریں گے ؟ دیہاتی کہنے لگا۔ اپنے آپ کو فریب نہ دو' کیا تم وہی اصفہانی نہیں ہو جس کی تلاش میں سارا شہر سرگرداں ہے' وہ لوگ تجھے قتل کرنا چاہتے ہیں۔ جب ہم شہر سے آرہے تھے تو ہم نے دیکھا کہ سب تمہارے بارے میں محو گفتگو تھے۔

اس وقت تک ابن راوندی کو گمان نہ تھا کہ دیہاتیوں نے اسے پہچان لیا ہے۔ دیہاتی نے کہا۔ اگر تم زبان نہیں کھولوگے تو تمہارے لئے کوئی خطرہ نہیں۔ سوار نزدیک آتے گئے۔ خوف کے مارے ابن راوندی پر کپکپی طاری تھی۔ دیہاتی نے محسوس کیا کہ ابن راوندی گھبرا رہا ہے تو اس نے کہا۔ چونکہ یہ خلیفہ کے سپاہی نہیں لہٰذا گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں' یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ابن راوندی کانپتے ہوئے بولا۔ مجھے یہاں نقصان نہ پہنچ سکنے کی کیا وجہ ہے ؟ دیہاتی بولا۔ اس لئے کہ یہ خلیفہ کے سپاہی نہیں اور خلیفہ کے سپاہیوں کے علاوہ کوئی شخص کسی کو شاہراہ عام پر نقصان نہیں پہنچا سکتا اور نہ ہی حملہ کرسکتا ہے۔ اگر ایسا کرے گا تو اس کا دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹ دیا جائے گا اور وہ شاہراہ عام سے باہر لے جا کر بھی ایسا کرے گا تو بھی اسے یہی سزا ملے گی۔ ابن راوندی نے کہا۔ میں نے سنا تھا کہ راہزنوں کا دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹتے ہیں لیکن یہ تو راہزن نہیں ہیں۔

دیہاتی بولا۔ جو کوئی بھی ہوں چونکہ سرقہ بالجبر کے ملزم ہوں گے لہٰذا ان پر یہی الزام لگا کر انہیں سزا دی جائے گی۔ اس کی شہادت کے لئے اس کی گواہی کافی ہے جس پر حملہ ہوا۔ بس وہ اتنا کہہ دے کہ یہ لوگ میرے سفر کے مال و متاع کو زبردستی چھیننا چاہتے تھے۔ اگر حملہ آور سو آدمی بھی ہوں تو بھی انہیں دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹنے کی سزا ضرور ملے گی۔

سوار مزید نزدیک آگئے۔ ابن راوندی نے دیکھا کہ وہ پانچ آدمی ہیں۔ جس وقت وہ دیہاتیوں کے قریب پہنچے تو ان میں سے ایک نے پوچھا' کیا تم نے سرخ ٹوپی پہنے کسی سوار یا پیدل شخص کو نہیں دیکھا جس کے چہرے سے ابلیس کا کفر آشکارا ہو۔ دیہاتی ہنستے ہوئے بولا ہم نے سرخ دستار دیکھی نہ کفر ابلیس۔ سوار جو رک گئے تھے آپس میں باتیں کرنے لگے ان میں سے ایک بولا وہ کل رات اس شہر سے باہر نکلا ہوگا اس لئے ضرور اب تک

صیدلہ پہنچ گیا ہوگا۔ دوسرا بولا' ہمیں صیدلہ جانا چاہئے تاکہ وہاں پہنچ کر اسے جہنم رسید کریں اگر اس کافر کو یہاں پاتے تو بھی اسے قتل نہ کر سکتے تھے۔

سواروں میں سے ایک بولا اگر صیدلہ سے چلا گیا ہو تو پھر کیا کریں گے ؟

دوسرے نے اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا' صیدلہ پہنچ جانے کے بعد تفتیش کریں گے آیا وہاں ہے یا نہیں؟ اور اگر وہاں سے کوچ کر گیا ہو تو اس کا پیچھا کریں گے اور آخر کار اسے کسی نہ کسی جگہ جالیں گے کیونکہ وہ ضرور کھانے پینے اور سونے کے لئے کسی دیہات میں رکا ہوگا۔

اس گفتگو کے بعد سوار تیزی سے آگے نکل گئے اور دیہاتی نے ابن راوندی سے مخاطب ہو کر کہا' میں یہ گمان نہیں کرتا کہ خلیفہ سے تمہاری عداوت ہو؟

اصفہانی بولا' میری کیا مجال ہے کہ میں خلیفہ سے جو مشرقین اور مغربین کا حاکم ہے دشمنی کروں۔ دیہاتی کہنے لگا میں نے اس لئے کہا ہے کہ خلیفہ کے سپاہی تمہاری جستجو میں لگے ہوئے ہیں۔

پھر کہنے لگا اے عجمی شخص ! یہ تم نے کونسا کام کیا ہے کہ تمام شہر تمہارے خون کا پیاسا ہے' آج شہر میں تمہارے علاوہ کوئی دوسرا موضوع گفتگو بھی نہیں یوں لگتا ہے جیسے تم نے ہر شہری کی ماں' باپ اور بچوں کو قتل کیا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ سب تمہارے خون کے پیاسے ہیں۔ ابن راوندی نے جواب دیا خدا کی قسم میں نے کسی شہری کو تکلیف نہیں پہنچائی۔ دیہاتی نے اظہار خیال کیا اگر تو نے ان لوگوں کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی تو یہ تیرے دشمن کیسے بن گئے ہیں ؟ ہم دیہاتیوں کامقولہ ہے کہ کوئی دشمنی کسی وجہ کے بغیر نہیں ہوتی۔ ابن راوندی نے کہا یہ قول ایک شخص کی دشمنی کے بارے میں ہے نہ کہ ایک گروہ یا پارٹی کے متعلق۔ میرے ساتھ لوگوں کی دشمنی بے سبب ہے یہ محض اشتعال انگیزی ہے جس کی وجہ سے لوگ مشتعل ہو کر میرے پیچھے پڑ گئے ہیں اور مجھ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ ایک بے گناہ کو قتل کرنے کے بعد ایک دوسرے سے پوچھیں کہ اس کا قصور کیا تھا ؟

دیہاتی شخص جہاندیدہ تھا' کہنے لگا لوگوں کی اشتعال انگیزی بھی کسی وجہ سے ہوگی تم نے ضرور کوئی ایسا قدم اٹھایا ہے جس سے شہری مشتعل ہوئے ہیں۔ جب ابن راوندی جان گیا کہ دیہاتی شخص عقلمند ہے تو کہنے لگا میرا قصور یہ ہے کہ میں نے ایک کتاب لکھی ہے۔

جب اس دیہاتی نے سنا کہ اس عجمی نے کتاب لکھی ہے تو اسے احترام کی نگاہوں سے دیکھنے لگا چونکہ کتاب لکھنا کسی کے پڑھے لکھے ہونے کی علامت ہوتی ہے اور بین النہرین کے شمال اور جزیرہ کے لوگ پڑھے لکھے طبقے کا احترام کرتے تھے۔

دیہاتی شخص بولا' تم پڑھے لکھے انسان ہو اور کتاب بھی لکھ چکے ہو تو پھر لوگ تمہارے دشمن کیوں بن گئے

ہیں ؟ ابن راوندی نے جواب دیا شہر کے تمام لوگ میرے دشمن نہیں بلکہ ان میں سے ایک طبقہ میرا مخالف ہے۔

دیہاتی شخص نے پوچھا یہ کون لوگ ہیں ؟ ابن راوندی نے جواب دیا صرف صوفی فرقوں کے پیروکار میرے دشمن ہوگئے ہیں۔ دیہاتی کہنے لگا ان میں سے ایک فرقہ ہمارے گاؤں میں بھی ہے وہ لوگ اس قدر مہربان ہیں کہ کسی چیونٹی کو بھی ضرر نہیں پہنچاتے تم نے اپنی کتاب میں کیا لکھا ہے جس کی وجہ سے یہ لوگ تیرے جانی دشمن بن گئے ہیں ؟

ابن راوندی نے اس دیہاتی کے فہم و ادراک کے لحاظ سے اپنی کتابی تحریر کی وضاحت کی۔ دیہاتی بولا اب پتہ چلا کہ شہری لوگ تمہارے دشمن کیوں بن گئے ہیں کیونکہ تمام لوگ تصوف کے کسی نہ کسی فرقے کے پیروکار ہیں اور ہم لوگ سبحانیہ فرقے کے پیروکار ہیں یہ ہمارے گاؤں کے علاوہ جزیرہ میں بھی خاصا مقبول ہے اور جب تم اپنی کتاب صوفی فرقوں کی نابودی کے بارے میں تحریر کر رہے تھے تو تمہیں پہلے فکر کرنی چاہئے تھی کہ جب یہ فرقے تمہارے دشمن بن جائیں گے تو سارے لوگ تمہارے دشمن بن جائیں گے کیونکہ ہر ایک کسی نہ کسی فرقے سے وابستہ ہے۔ ابن راوندی نے اعتراف کیا کہ اپنی کتاب لکھنے سے قبل اسے یہ خیال نہیں آیا اور کہنے لگا" اس کا یہ ارادہ نہ تھا کہ زاہد اور متقی اشخاص کو ہدف تنقید بنائے بلکہ اس کی مراد وہ لوگ تھے جو کام کی نسبت اوقاف کے گھروں میں رہنے کو ترجیح دیں حالانکہ وہ زاہد و متقی بھی نہیں ہوتے۔

دیہاتی شخص کہنے لگا کیا تو جانتا ہے کہ میں نے تمہاری دستار تمہارے سر سے کیوں اتاری اور اپنی عربی ٹوپی تمہارے سر پر کیوں رکھ دی ہے ؟ ابن راوندی نے کہا صاف ظاہر ہے تم نہیں چاہتے کہ جو سوار آرہے ہیں وہ مجھے پہچانیں۔ دیہاتی بولا آخر میں کیوں نہیں چاہتا کہ جو سوار آرہے ہیں وہ تجھے نہ پہچانیں ؟

ابن راوندی نے کہا میں جانتا ہوں کہ تم مجھے قتل ہونے سے بچانا چاہتے ہو۔ دیہاتی نے اپنا اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ اگر وہ تجھے قتل کرتے تو مجھے کوئی نقصان اٹھانا پڑتا ؟

ابن راوندی نے منفی جواب دیا دیہاتی نے کہا میں نے یہ دستار اس لئے تمہارے سر سے نہیں اتاری کہ تم قتل ہونے سے بچ جاؤ گے بلکہ اسے اتار کر یہ عربی ٹوپی تمہارے سر پر رکھی ہے تاکہ اس خدمت کے بدلے میں تجھ سے بدلہ یا پاداش حاصل کروں۔ ابن راوندی نے پوچھا تم مجھ سے کیا پاداش لوگے ؟

دیہاتی نے جواب دیا کچھ نقد رقم لینا چاہتا تھا لیکن جب مجھے پتہ چلا کہ تم نے کتاب لکھی ہے اور مجھے علم ہوا کہ تم پڑھے لکھے بھی ہو اور چونکہ ہم پڑھے لکھے لوگوں کا احترام کرتے ہیں لہٰذا میں نے اپنا معاوضہ حاصل کرنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا لیکن جب تم نے بتایا کہ اپنی کتاب میں صوفی فرقوں سے معاندانہ رویہ اپنایا ہے تو میرا خیال بدل گیا اب میں تم سے معاوضہ لینا چاہتا ہوں۔ ابن راوندی بولا تم نے میری خدمت کی ہے میں

تمہیں معاوضے کی ادائیگی کے لئے رضامند ہوں۔ دیہاتی کہنے لگا' اگر تم صوفی فرقوں کے ساتھ معاندانہ رویہ اختیار نہ کرتے تو میں ہرگز تم سے معاوضہ نہ لیتا لیکن چونکہ تم نے ان فرقوں سے اظہار خصومت کیا ہے لہذا میں تم سے ضرور معاوضہ لوں گا۔ ابن راوندی نے کہا میں اپنی بساط کے مطابق تمہیں معاوضہ دوں گا۔

دیہاتی نے کہا یہ گھڑسوار گاؤں میں پہنچنے کے بعد تجھے تلاش کریں گے اور دیہاتیوں سے معلوم کریں گے کہ انہوں نے تمہیں دیکھا ہے یا نہیں ؟

جب تم پہنچو گے تو لوگ تمہیں پہچان جائیں گے اور تمہیں ان گھڑسواروں کے حوالے کر دیں گے پھر تمہیں قتل کر دیں گے۔ چونکہ ہمارے دیہات میں سبحانیہ فرقہ قابل احترام سمجھا جاتا ہے۔ ابن راوندی کہنے لگا اگر تم اور تمہارے ساتھی میرا تعارف نہ کرائیں تو کوئی بھی مجھے نہیں پہچان سکے گا اور میں صیدلہ میں بھی قیام نہیں کروں گا۔ بلکہ کاروان کے ہمراہ چل پڑوں گا۔

دیہاتی شخص بولا جو کاروان آج حرکت کر چکا ہے تم اس تک نہیں پہنچ سکتے لہذا تم کل کے کاروان کے ہمراہ چلے جانا' لیکن میں تمہیں اپنے گھر میں ہرگز نہیں ٹھہرا سکتا کیونکہ اگر میں ایسا کروں گا تو یہ لوگ جو میرے ساتھ ہیں تم سے رقم بٹورنے کے خواہشمند ہوں گے اور اگر ان میں سے ہر ایک کو رقم دو گے تو تمہارا خرچ بڑھ جائے گا اور اگر نہیں دو گے تو میں خفا ہو جاؤں گا۔

اس کے علاوہ چونکہ تم نے صوفی فرقوں سے دشمنی برتی ہے اور میں ایک صوفی فرقے سبحانیہ کا پیروکار ہوں میرا جی نہیں چاہتا کہ تجھے اپنے گھر ٹھہراؤں اور یہ خطرہ بھی ہے کہ وہ لوگ تمہاری دشمنی سے باخبر ہو کر تمہیں قتل کر ڈالیں۔

ابن راوندی نے پوچھا پس میں کیا کروں ؟ کیسے رے کے کاروان کے ہمراہ عازم سفر ہو سکتا ہوں ؟ دیہاتی شخص بولا ہمارے دیہات میں داخل نہ ہونا اور صیدلہ سے دور نکل کر راستے کے کنارے آج اور کل کا دن گزارنا۔ اور کل جونہی رے کا کاروان راستے سے گذرے اس میں شامل ہو جانا۔

ابن راوندی کہنے لگا چونکہ میرے پاس سامان ہے لہذا میں پیدل سفر نہیں کر سکتا اگر یہ سامان نہ ہوتا تو پیدل چلنے میں کوئی مضائقہ نہ تھا دوسرا یہ کہ راستے میں کوئی کسی کو کرائے پر جانور بھی نہیں دیتا۔

دیہاتی بولا کیا تم اس گدھے کو خریدنا چاہتے ہو جس پر سوار ہو۔ ابن راوندی نے کہا اگر مناسب دام لگاؤ تو خرید لوں گا۔ دیہاتی نے سوچا موقعے کو غنیمت سمجھ کر اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائے اور اپنے جانور کی زیادہ سے زیادہ قیمت لگائے اس نے اتنی قیمت متعین کی جسے ابن راوندی نے زیادہ گردانا اور کہنے لگا تم نے میری مجبوری سے فائدہ اٹھا کر گدھے کی قیمت زیادہ لگائی ہے۔

دیہاتی بولا اچھا ایسا کرتے ہیں صیدلہ پہنچنے سے قبل کسی راہگیر سے اس گدھے کی قیمت متعین کروائیں

گے پھر اس نے جتنی کہی تم اس سے دس زیادہ دے دینا ابن راوندی نے اظہار خیال کیا دس زیادہ کیوں؟ دیہاتی بولا کیونکہ میں نے ایک مرتبہ تمہیں موت سے نجات دی ہے اور اب دوسری مرتبہ تمہاری جان بچانا چاہتا ہوں۔ اگر تم اس گدھے کو نہیں خریدو گے تو تمہیں راستے میں پڑاؤ ڈالنا پڑے گا یہاں تک کہ رے کے کاروان سے جا ملو لیکن یہ گدھا تمہارے ساتھ ہوا تو کاروان کا انتظار کئے بغیر چل پڑو گے اور رے کا کاروان خود بخود تم سے آ ملے گا۔

ابن راوندی نے کہا ایک راہگیر کسی گدھے کی ظاہری حالت سے قیمت متعین نہیں کر سکتا۔ اسے گدھے کو ہر لحاظ سے دیکھنا چاہئے اور دوسرا یہ کہ اگر گدھے کا خریدار جان لے کہ چوری کا گدھا اس کو بیچا گیا تو وہ تین دن تک سودا منسوخ کر سکتا ہے؟ دیہاتی کہنے لگا یقین کرو یہ گدھا جس پر تم سوار ہو چوری کا نہیں' کیونکہ میں اسے پہلے سے بیچنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ آخر کار ابن راوندی نے مجبوراً" گدھا خرید لیا اور جونہی وہ صیدلہ کے نزدیک گیا ان دیہاتیوں سے جدا ہونا چاہتا تھا تو دیہاتی شخص بولا کیا میرا معاوضہ بھول گئے ہو؟ دے کر جانا۔

ابن راوندی نے کہا چونکہ میں نے تمہارا گدھا خریدا تھا لہٰذا میرا خیال تھا کہ تم مزید رقم کا مطالبہ نہیں کرو گے۔ دیہاتی بولا گدھے کی خریداری کا ارادہ کرنے سے قبل تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہیں معاوضہ دوں گا تو اب اپنا وعدہ وفا کرو۔ ابن راوندی نے مجبوراً" کچھ رقم اس دیہاتی کو دی اور پھر دیہاتیوں سے علیحدہ ہو گیا لیکن دیہاتی نے اسے آواز دی اور کہا میں نے عربی ٹوپی تمہیں واپس کی ہے اس کا معاوضہ تو دینا بھول گئے ہو؟ ابن راوندی نے جو اس شخص کی لالچ سے غضبناک ہو رہا تھا مجبوراً" وہ معاوضہ بھی ادا کیا ابن راوندی کی سوانح حیات کو اس سے زیادہ بیان نہیں کرتے کہ دیہاتی شخص کے گدھے نے اسے موت سے نجات دلائی چونکہ اس کے پاس گدھا تھا لہٰذا راستے میں قیام کئے بغیر چلتا رہا یہاں تک کہ کاروان آکر اس سے مل گیا' اور وہ دشمنوں کے چنگل سے بچ نکلا اس نے سنا تھا کہ سوار اس کے پیچھے آ رہے ہیں لہٰذا اس نے دوسرے راستے سے سفر اختیار کر کے جان بچائی۔

## امام جعفر صادقؑ کے ہاں ادب کی تعریف

ہم نے ابن راوندی کی سوانح حیات کی معمولی سی ایک جھلک دکھائی تاکہ پتہ چلے کہ جس مذہبی ثقافت کی بنیاد امام جعفر صادقؑ نے رکھی تھی اس میں کس قدر بحث کی آزادی تھی اور ہر کسی کو اظہار خیال کی کھلی چھٹی تھی۔ یہی ابن راوندی ایران کے علاقے اراک اور امام جعفر صادقؑ کے مذہبی ثقافتی مکتب میں جو چاہتا سو لکھتا لیکن عباسی خلیفہ کے دارالحکومت میں اپنی تحریروں کے نتیجے میں دو مرتبہ موت سے بال بال بچا ایک مرتبہ خلیفہ

کے ہاتھوں اور دوسری بار لوگوں کے ہجوم کے قہر و غضب سے بچ نکلا اگر عباس صروم اس کی مدد نہ کرتا تو اس کا قتل یقینی تھا۔

امام جعفر صادقؑ کی مذہبی ثقافت کی قوت کا راز اس میں تھا کہ اس کے چار ارکان میں سے صرف ایک رکن مذہبی باقی تین ارکان ادب، علم اور عرفان تھے دنیا کی تاریخ میں یہ کہیں نہیں ملتا کہ کسی مذہب کے مکتب میں علم و ادب کو اتنی اہمیت حاصل ہوئی ہو، جتنی اہمیت اسے امام جعفر صادقؑ کی مذہبی ثقافت میں حاصل ہوئی۔

امام جعفر صادقؑ کی مذہبی ثقافت میں علم و ادب کو اس قدر اہمیت حاصل تھی کہ محقق اپنے آپ سے پوچھتا ہے کہ مذہبی ثقافت میں ادب کی اہمیت زیادہ تھی یا مذہب کی؟ اور کیا علم کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی یا مذہب کو؟ امام جعفر صادقؑ اس بات سے آگاہ تھے اور کہا کرتے تھے کہ ایک مومن چونکہ مستقین کے ایمان کا حامل ہوتا ہے پس اسے علم و ادب سے روشناس ہونا چاہئے۔ آپ کہا کرتے تھے ایک عام شخص کا ایمان سطحی اور بے بنیاد ہے چونکہ وہ ایک عام انسان ہوتا ہے لہٰذا وہ اس بات سے آگاہ نہیں ہو سکتا کہ کس پر ایمان لایا ہے اور کس کے لئے ایمان لایا ہے؟ اس کے ایمان کی بنیاد مضبوط نہیں ہوتی اس لئے اس کے خاتمے کا امکان ہوتا ہے۔

لیکن وہ مومن جو علم و ادب سے بہرہ مند ہو اس کا ایمان مرتے دم تک متزلزل نہیں ہوگا کیونکہ وہ ان باتوں سے آگاہ ہے کہ کس لئے اور کس پر ایمان لایا ہے؟

امام جعفر صادقؑ یہ دکھانے کے لئے کہ علم و ادب کس طرح ایمان کی جڑوں کو گہرا اور مضبوط کرتے ہیں دوسرے مذاہب کی مثال بھی دیتے تھے اور کہا کرتے تھے جب اسلام پھیل گیا اور جزیرہ عرب سے دوسرے ممالک تک پہنچا تو ان ممالک کے عام لوگوں نے اسلام کو جلدی قبول کر لیا لیکن جو لوگ علم و ادب سے آگاہ تھے انہوں نے اسلام کو جلدی قبول نہیں کیا بلکہ ایک مدت گزر جانے کے بعد جب ان پر ثابت ہو گیا کہ اسلام دنیا اور آخرت کا دین ہے تو تب انہوں نے اسے قبول کیا۔

امام جعفر صادقؑ نے ادب کی ایسی تعریف کی ہے جس کے بارے میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ ادب کی اس سے اچھی تعریف بھی کی گئی ہوگی، انہوں نے فرمایا ادب ایک لباس سے عبارت ہے جو تحریر یا تقریر کو پہناتے ہیں تاکہ اس میں سننے اور پڑھنے والے کے لئے کشش پیدا ہو۔ یہاں پر توجہ طلب بات یہ ہے کہ امام جعفر صادقؑ یہ نہیں فرماتے کہ تحریر یا تقریر اس لباس کے بغیر قابل توجہ نہیں۔ آپ اس لباس کے بغیر بھی تقریروں اور تحریروں کو پر کشش سمجھتے ہیں لیکن آپ کے فرمانے کا مقصد یہ ہے کہ ادب کے ذریعے تحریروں اور تقریروں کو مزید پر کشش لباس پہنایا جاتا ہے۔

کیا امام جعفر صادقؑ کی وفات سے لے کر اب تک اس ساڑھے بارہ سو سال کے عرصے میں اب تک کسی

نے ادب کی اتنی مختصر، جامع اور منطقی تعریف کی ہے؟

امام جعفر صادقؑ کا ادب کے متعلق دوسرا نظریہ یہ کہتا ہے کہ ادب ممکن ہے علم نہ ہو لیکن علم کا وجود ادب کے بغیر محال ہے علم و ادب کے رابطے کے متعلق یہ بھی ایک جامع اور مختصر تعریف ہے اور جیسا کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ہے ہر علم میں ادب ہے لیکن ممکن ہے ہر ادب میں علم نہ ہو۔ ہمیں اس بارے میں کوئی علم نہیں کہ امام جعفر صادقؑ علم سے زیادہ شغف رکھتے تھے یا ادب سے زیادہ لگاؤ رکھتے تھے۔ آپ کے خیال میں شعر کی قدرو منزلت زیادہ تھی یا علم طبیعات (Physics) کی؟ بعض ایسے لوگ ہو گزرے ہیں جو علم و ادب دونوں سے برابر دلچسپی رکھتے تھے لیکن ایسے لوگوں کا شمار صرف انگلیوں پر کیا جا سکتا ہے کیونکہ انسانوں کی اکثریت کی استعداد اتنی ہی ہے کہ یا تو وہ علم سے لگاؤ رکھتے ہوں گے یا ان کی دلچسپی ادب سے ہو گی۔ جو لوگ ادب سے شغف رکھتے ہیں وہ علم کو غم و غصے کا موجب اور مادی مقاصد کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ جس کا مقصد محض ریا کاری اور لہو و لعب ہے اور علم کی جانب رجوع کرنے والے کی نسبت اپنے آپ کو زیادہ باذوق اور خوش مزاج شمار کرتے ہیں۔

جو لوگ علمی استعداد کے حامل ہوتے ہیں وہ ادب کو بچگانہ کام یا خیالی پلاؤ پکانے والے انسانوں کا خاصہ سمجھتے ہیں اور ان کی نظر میں ادب سے لگاؤ کسی سنجیدہ اور سلجھے ہوئے انسان کا کام نہیں کاروباری طبقے کی نظر میں ادب محض زندگی کو فضول بسر کرنے کا نام ہے حتیٰ کہ یہ طبقہ ادیبوں کی عقل سلیم کو بھی شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اگر ادب کے متوالوں میں عقل سلیم ہوتی تو وہ ہرگز ایسے فضول کام میں زندگی نہ گنواتے۔ اس طبقے کو چھوڑئے کیونکہ یہ نہ صرف ادب کا قائل نہیں بلکہ جب علم نے صنعت کو فروغ دیا اور صنعت نے مادی ترقی میں مدد دی تب کہیں جاکر یہ طبقہ علم کی اہمیت کا قائل ہوا یعنی اٹھارویں صدی عیسوی کے آغاز سے جب کاروباری طبقے نے محسوس کیا کہ صنعتیں مادی ترقی میں مدد و معاون ہیں تب انہوں نے صنعتوں کی طرف توجہ دی۔

لیکن امام جعفر صادقؑ ان نادر روزگار افراد میں سے تھے جو علم و ادب دونوں کے متوالے تھے امام جعفر صادقؑ کی تدریس کے مقام کے اوپر یہ بیت رقم تھا۔

لیس الیتیم قدمات والدہ      ان الیتیم یتیم العلم والادب

یعنی یتیم وہ نہیں جس کا باپ فوت ہو گیا ہو بلکہ یتیم وہ ہے جو علم و ادب سے بے بہرہ ہے۔ عربوں میں امام جعفر صادقؑ کی مذہبی ثقافت کے وجود میں آنے سے پہلے ادب کا اطلاق صرف شعر پر ہوتا تھا جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں دور جاہلیت میں عربوں میں نثری ادب کا وجود نہ تھا اور پہلی صدی ہجری میں عربوں کے نثری ادب کے آثار محدود ہیں ان آثار میں حضرت علیؑ کی نہج البلاغہ خاصی اہمیت کی حامل ہے۔ امام جعفر صادقؑ کو دوسری صدی ہجری

کے پہلے پچاس سالوں کے دوران نثری ادب کا شوق پیدا ہوا چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ نثری ادب کو وجود میں لانے والے امام جعفر صادق تھے۔

کہتے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے عرب قوم میں ادبی انعام کا رواج ڈالا۔ اگر ادبی انعام سے مراد یہ ہے کہ شاعر یا مصنف کو کوئی چیز عطا کی جائے تو یہ روایت صحیح نہیں ہے کیونکہ شعراء کو نوازنے کی رسم جزیرۃ العرب میں قدیم زمانے سے جاری تھی اور اسلام کے بعد بھی یہ رسم جاری رہی اور جب کوئی شعر پڑھتا اور اسے اشراف کے پاس لے جاتا تو اسے انعام سے نوازا جاتا تھا۔ لیکن وہ لوگ جو نثری ادب میں اضافہ کرتے تھے انہیں صلہ دینے کا رواج تھا نہ ہی عرب قوم نثری عبارات کو ادب کا جزو شمار کرتی تھی۔ چہ جائیکہ ادیب کو نثری عبارات کا صلہ ملتا۔ ایک روایت کے مطابق نثری یادگار اور انعام و اکرام عطا کرنے کی ابتدا امام جعفر صادقؑ سے ہوئی۔

اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ امام جعفر صادقؑ نے ادبی نثر کے انعام کا تعین کیا البتہ یہ بات مشکوک ہے کہ سب سے پہلے انہوں نے نثری ادیبوں کو انعام عطا کرنے کا رواج شروع کیا یا ان کے والد بزرگوار امام محمد باقرؑ نے اس کام کی ابتدا کی۔ شروع شروع میں ادبی انعام دینے کے لئے تین ججوں کی کمیٹی تشکیل دی گئی ایک امام جعفر صادقؑ اور دوسرے ان کے دو شاگرد۔

اس کے بعد یہ کمیٹی پانچ ممبروں پر مشتمل ہو گئی اور اگر ان میں سے تین افراد ایک مصنف کو انعام کا حقدار قرار دیتے تو پھر مصنف انعام کا حقدار ٹھہرتا تھا۔ امام جعفر صادقؑ کی طرف سے جس محرک نے نثری ادب کی توسیع میں مدد دی وہ یہ تھا کہ انہوں نے کسی مصنف کو کسی خاص موضوع پر لکھنے کے لئے مجبور نہیں کیا اور ہر ایک اپنے ذوق کے مطابق لکھنے کے لئے آزاد تھا اور جو کچھ لکھتا اسے امام جعفر صادقؑ کے سپرد کرتا اور آپ اسے انعام کے لئے ججوں کے پینل کے سامنے پیش کر دیتے اور ججوں میں سے تین جج مصنف کو انعام کا حقدار قرار دیتے تو انعام اس کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔ امام جعفر صادقؑ نے کھلے دل سے ہر قسم کی نظم و شعر کو ادب میں شامل کیا۔ امام جعفر صادقؑ کی نظر میں ادیب فقط وہ نہیں ہوتا تھا جو شعر پڑھتا یا فی البدیہہ اشعار کے ذریعے اظہار خیال کرتا یا تقریر لکھتا اور پھر اسے پڑھتا تھا بلکہ ہر وہ شخص جو کسی بھی موضوع پر نظم یا نثر میں اظہار خیال کرتا امام جعفر صادقؑ کے نظریے کے مطابق ادب کی تعریف کے لحاظ سے دلچسپ ہوتا تو اس شخص کو ادیب شمار کیا جاتا وہ ادب کو نہ صرف مذہبی ثقافت کے لحاظ سے ضروری گردانتے بلکہ انسانی وقار کی بلندی اور انسان میں اچھی صفات کے فروغ کے لئے بھی ادب کو لازمی خیال کرتے تھے۔

آپ جانتے تھے کہ ایک ایسا معاشرہ جس کے افراد ادیب اور عالم ہوں اس میں دوسروں کے حقوق کی پامالی کم دیکھنے میں آتی ہے۔ اور اگر سب علم و ادب سے آشنا ہو جائیں تو تمام طبقوں کے باہمی تعلقات خوشگوار ہو

جاتے ہیں۔ امام جعفر صادقؑ کی نظر میں مذہبی ثقافت جس کے چار رکن یعنی مذہب، ادب، علم و عرفان ہیں۔ شیعہ مذہب کی تقویت و بقا کیلئے بہت مفید اور موثر تھے۔ امام جعفر صادقؑ نے شیعہ مذہب کے لئے سینٹ پیٹر کی مانند کوئی بڑی عمارت تعمیر نہیں کی لیکن جو ثقافت وہ وجود میں لائے ہیں وہ سینٹ پیٹر سے زیادہ دائمی ہے کیونکہ ایک مذہبی عمارت کو تباہ کیا جا سکتا ہے جیسا کہ سینٹ پیٹر کے پہلے کلیسا کو تباہ کر دیا گیا تھا امام جعفر صادقؑ کی مذہبی ثقافت کو کوئی ختم نہیں کر سکا۔

سینٹ پیٹر کا پہلا کلیسا عیسائی روم کے پہلے بادشاہ قسطنطین نے ۳۲۶ء میں بنانا شروع کیا جو چند سالوں کے بعد تکمیل کو پہنچا تھا۔ یہ کلیسا ماڈرن دور تک باقی رہا اس وقت جب ژول دوم' عیسائی مذہب کے رہنما کے حکم سے اس کلیسا کو گرا دیا گیا اور جدید کلیسا کی تعمیر شروع کی گئی جو سینٹ پیٹر کے نام سے روم میں واقع ہے۔ اگر امام جعفر صادقؑ مذہب شیعہ کے لئے ایک پرشکوہ عمارت تعمیر کرواتے تو ممکن تھا ایک ایسا آدمی پیدا ہوتا جو اس مذہب سے مخالفت کی بنا پر اس عمارت کو گرا دیتا اور آج اس کا نام و نشان نہ ہوتا لیکن امام جعفر صادقؑ نے شیعہ مذہبی ثقافت کی بنیاد کو اس طرح مستحکم اور مضبوط کیا کہ وہ ہمیشہ کے لئے باقی رہے اور اسے کوئی بھی تباہ نہ کر سکے کوئی اس کا نام ونشان نہ مٹا سکے۔ آپ نے ثقافت کے چار ارکان کو جن کا ذکر اوپر آیا ہے تقویت پہنچائی خصوصاً" تین ارکان مذہب و ادب و علم کے لئے کافی کوشش کی۔ آپ نے اس کے لئے اس قدر جدوجہد کی کہ دوسری صدی ہجری کے پہلے پچاس سالوں میں جو آپ کا تعلیم دینے کا زمانہ تھا اسلامی دنیا میں علم و ادب کی توسیع کا آغاز ہوا۔ اگرچہ آپ تنہا علم و ادب کے محرک نہیں بنے لیکن آپ نے سب سے پہلے اس راہ میں قدم رکھا اور دوسروں نے اس کی پیروی کی۔ امام جعفر صادقؑ علم و ادب کی توسیع اور علماء و ادیبوں کو شوق دلانے کے لئے قدم آگے نہ بڑھاتے تو دوسری صدی کے دوسرے پچاس سالوں کے دوران اور پھر تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے سارے عرصے میں جو بڑی ادبی و علمی تحریک وجود میں آئی ہرگز وجود میں نہ آسکتی وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ عباسی خلفاء نے علم و ادب کی ترویج میں سبقت حاصل کی وہ در حقیقت غلط فہمی کا شکار ہیں۔

اس لئے کہ پہلے عباسی خلفاء کا مقصد اپنی حکومت کی بنیادیں مضبوط کرنے کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا اور ان کے بعد جو خلفاء آئے وہ زیادہ تر نفسانی خواہشات کے غلام تھے وہ کسی حد تک ہی علم و ادب کی طرف راغب ہوئے جیسا کہ ہم نے متوکل کے بارے میں مختصرا" ذکر کیا ہے۔

تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں علم و ادب کی جانب عباسی خلفاء کی توجہ کو اس زمانے کے رسم و رواج کی ضرورت تو سمجھا جا سکتا ہے لیکن اسے باقاعدہ مقصد قرار نہیں دیا جا سکتا اس لئے کہ سینتیس (۳۷) عباسی خلفاء جنہوں نے مجموعاً" پانچ سو سال سے زیادہ عرصہ حکومت کی ان میں سے صرف چند ہی علم و ادب کی طرف مائل ہوئے تھے جبکہ باقی مادی لذتوں کے حصول کی فکر میں لگے رہے۔

بہر کیف اس بات سے انکار نہیں کرنا چاہئے کہ انہی چند خلفاء کی علم و ادب سے دلچسپی علم و ادب کے فروغ کا باعث بنی۔ اگرچہ ہمیں معلوم ہے کہ انہوں نے اس زمانے کی روش کے مطابق علم و ادب سے دلچسپی کا اظہار کیا چونکہ بیت المال ان کے تصرف میں تھا اور اس کے علاوہ وہ قیمتی تحائف بھی وصول کرتے تھے جو لگاتار ان کے لئے عوام بھیجتے تھے۔ وہ شعراء' خطیبوں' مصنفین اور علماء کو بڑے بڑے انعامات سے نواز سکتے تھے اور یہ انعامات دوسروں کو علم و ادب کی تحصیل کی طرف مائل کرتے تھے تاکہ وہ بھی خلیفہ کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرا سکیں اور بڑے بڑے انعامات حاصل کر سکیں۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ "شعر" کہنا جاہلیت کے زمانے میں عربی بدو قبائل کے سرداروں کی عادت تھی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس فطرت ثانیہ کی ابتدا خود عربوں نے کی تھی۔ انہوں نے اسے کسی اور قوم سے حاصل نہیں کیا تھا۔ کبھی کبھار ایسا ہوتا تھا کہ قبیلے کا سردار شاعرانہ ذوق کا حامل نہ ہوتا یا اشعار کا مفہوم نہ سمجھتا تو بھی رسم و رواج کے مطابق وہ شاعر کے کلام کو ضرور سنتا تھا۔ شوپنہاور کے بقول چونکہ عرب بدووں کے قبائل کے سردار جب بیکار اور نکمے پن سے تنگ آ جاتے تھے تو اپنا وقت شاعروں کے نغمے سننے پر صرف کرتے تھے۔

شوپنہاور' عرب بدو قبائل کے اشعار سننے کو نہ صرف ان کی بیکاری پر محمول کرتا ہے بلکہ اس کے بقول ہر وہ کام جو انسان حصول معاش کے علاوہ انجام دیتا ہے وہ بیکاری میں شامل ہے مثلاً" کھیلیں' تفریحات' مہمان نوازیاں وغیرہ کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو فضول کاموں میں لگانا چاہتا ہے اس جرمن فلسفی نے اپنے کمرے میں اپنے سر کے اوپر ایک کتبہ نصب کیا ہوا تھا جس پر کندہ تھا کہ وہ انسان جو تمہیں دوپہر یا شام کے کھانے کی دعوت دے تمہارا سب سے بڑا دشمن ہے کیونکہ وہ تمہیں کام نہیں کرنے دیتا۔

جب شاعر قبیلے کے سردار کے سامنے اپنے اشعار پڑھتا تو وہ اسے انعام و اکرام سے نوازتا اور ادب کا تقاضا یہ تھا کہ شاعر اپنے اشعار میں قبیلے کے سردار کی شان میں چند بیت ضرور شامل کر دیتا تھا۔

لیکن اس کی شان کے بیان کی ایک حد معین تھی اور اس طرح دور جاہلیت کے شعراء مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیتے تھے اور اپنے آپ کو قبیلہ کے سردار کے مقابلے میں پست ظاہر نہیں کرتے تھے۔ ان کی مدح میں ایسا شکریہ ہوتا تھا جو ایک مہمان' میزبان کی مہمان نوازی پر ادا کرتا ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ شعراء جو شاعروں کے اجتماع میں شعر پڑھتے تھے لوگوں سے رقم بٹورتے تھے' جبکہ ایسا ہرگز نہیں۔

دور جاہلیت میں عربی شعراء اپنی عزت و وقار کا خاص پاس رکھتے تھے وہ قبائل کے سرداروں سے جو انعام لیتے اسے ایک طرح کی مزدوری سمجھتے تھے۔ اس طرح قبیلے کے رئیس کو صرف اتنا ہی حق پہنچتا تھا جتنا شاعر اپنے شعروں میں ادا کر دیتا تھا شاعر یہ بات کہنے میں حق بجانب ہوتا تھا کہ اس نے قبیلہ کے سردار کی شان میں شعر

کہہ کر اس پر احسان کیا ہے لیکن سردار قبیلہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس نے شاعر کو نواز کر احسان کیا ہے۔ وہ لوگ جو شاعروں کے اجتماع میں شعر خوانی کرتے ان کا مقصد شہرت اور مقبولیت پانا ہوتا تھا' وہ لوگوں سے تحفے وغیرہ کے امیدوار نہیں ہوتے تھے۔

لیکن امام جعفر صادقؑ کے زمانے تک کسی دور میں ایسا اتفاق نہیں ہوا کہ جزیرہ عرب میں کسی شاعر نے شاعروں کے اجتماع میں سردار قبیلہ کے سامنے نثر کا کوئی قطعہ پیش کیا ہو وہ مضامین جو شعر کے قالب میں نہیں ڈھلتے عربوں کی نظر میں ادب کا حصہ نہیں سمجھے جاتے تھے۔

حتیٰ کہ قرآن نازل ہوا اور قرآن کی نثر عرب بدوؤں کا پہلا نثری سرمایہ قرار پائی لیکن عرب قوم چونکہ قرآن کو ایک معجزہ خیال کرتی تھی لہٰذا وہ اسے ادب سے بالاتر شے خیال کرتی تھی اس کے باوجود کہ قرآن نے عربوں کو اس بات کی نشاندہی کی تھی کہ نثر بھی ادبی سرمایہ قرار پا سکتی ہے پہلی صدی ہجری میں ماسوائے حضرت علیؑ اور آپ کے پوتے امام زین العابدینؑ اور امام محمد باقرؑ کے کسی نے بھی ادبی نثر پر توجہ نہیں دی اور نہ ہی کوئی کتاب لکھی۔

امام جعفر صادقؑ کے زمانے تک جو لوگ کتاب لکھنا چاہتے ان کا خیال تھا کہ انہیں اپنے افکار کو شعری قالب میں ڈھالنا چاہیے اور چونکہ شعر اوزان اور بحروں کا محتاج ہوتا ہے اور شاعر قافیے کی رعایت کرتا تھا لہٰذا وہ لوگ آزادی سے اپنا مافی الضمیر بیان نہیں کر سکتے تھے۔

امام جعفر صادقؑ نے ادبی نثر کی توسیع کی مدد سے ان اسلامی مفکرین کے افکار کو پر عطا کئے جو اس وقت تک شعر کی بحروں میں قید تھے اور اس کے بعد جو کتاب لکھنا چاہتا نثر سے کام لیتا اور اس کے ساتھ ساتھ اسلامی ادب میں شعر کی اہمیت پر بھی کوئی اثر نہ پڑتا۔

امام جعفر صادقؑ کا فرمان جو انہوں نے اپنے بیٹھنے کی جگہ اپنے سر کے اوپر کندہ کروایا ہوا تھا کس قدر شاندار ہے "یتیم وہ نہیں جس کا باپ نہ ہو بلکہ یتیم وہ ہے جو علم و ادب سے بے بہرہ ہو"

## "سائنس" بنظر امام صادقؑ

اب جبکہ ہم یہ جان چکے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ نے ادب کی کس طرح تعریف کی' دیکھنا یہ ہے کہ انہوں نے سائنس کو کس پیرائے میں بیان کیا اور آپ کی نظر میں کونسے علم کو دوسرے علم پر ترجیح حاصل تھی۔ علم سے ان کی مراد سائنس ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے علم کی اس طرح تعریف کی کہ ہر چیز جو آدمی کو کچھ سکھائے علم ہے۔ آپ کا عقیدہ تھا کہ احکام دین کے نفاذ کے بعد ایک مسلمان کے لئے علم سے بڑھ کر کوئی چیز ضروری نہیں

ہے۔ امام جعفر صادقؑ کی مذہبی ثقافت میں عرفان چوتھا رکن ہے اگرچہ آپ عرفان کو واجبات میں سے نہیں سمجھتے لیکن علم و ادب کو واجبات کا جزو سمجھتے ہیں اور یہ بات واضح ہے کہ یہ دینی واجبات میں سے نہیں بلکہ یہ مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے واجبات میں شمار ہوتا ہے۔

امام جعفر صادقؑ اس بات سے آگاہ تھے کہ علم و ادب نہ صرف یہ کہ شیعہ مذہب کی ثقافت کی تقویت کا باعث بنیں گے بلکہ اس سے دوسری قوموں میں مسلمانوں کی تقویت کا باعث بھی ہوں گے۔ اسلامی دنیا میں علم وادب نے اس قدر ترقی کی کہ چوتھی صدی ہجری اسلامی دنیا میں علم وادب کا سنہری دور کہلایا اور یورپ والوں نے اسلامی علم سے کافی فائدہ اٹھایا۔ جب امام جعفر صادقؑ سے سوال کیا گیا کہ متعدد علوم میں سے کون سے علم کو دوسروں پر ترجیح حاصل ہے ؟ آپ نے فرمایا کوئی علم دوسرے علوم پر قابل ترجیح نہیں البتہ علوم سے استفادہ کرنے کے موارد میں فرق پایا جاتا ہے جس کے نتیجے میں انسان کے لئے لازم ہے کہ بعض علوم کی تحصیل میں جلدی کرے اور زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے اور آج کے دور (عہد امام جعفرصادقؑ) میں دو علوم سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہئے ایک علم دین اور دوسرا علم طب۔

امام جعفرصادقؑ کی علم دین سے زیادہ تر مراد فقہ تھی اور آپ کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ آپ کے زمانے میں علم قانون اور طب سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے۔ آپ نے فرمایا ایک دن ایسا آئے گا جب انسان ان علوم سے فائدہ اٹھائے گا جن سے فی الحال عملی طور پر کوئی فائدہ نہیں اٹھارہا اور یہ بات محال ہے کہ علم انسان کے لئے سود مند نہ ہو۔ مختصر یہ کہ انسان زمانے کی مناسبت سے علوم سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ امام جعفر صادقؑ کا عقیدہ تھا کہ انسان نے دنیا میں اپنی زندگی کے طویل عرصے میں صرف ایک مختصر عرصے کو علم کے لئے مخصوص کیا ہے اور زیادہ تر علوم سے دور رہا ہے اور جن دو چیزوں نے انسان کو علوم سے دور رکھا ہے ان میں پہلی چیز مربی اور استاد کا نہ ہونا جو اسے علوم حاصل کرنے کا شوق دلائے جب کہ دوسری چیز انسان کی کاہلی ہے چونکہ علم کا سیکھنا تکلیف کے بغیر ناممکن ہے لہٰذا انسان فطرتاً" سہل پسند ہونے کی بنا پر علم سے دور بھاگتا ہے۔

اگر فرض کیا جائے کہ اس دنیا میں بنی نوع انسان نے دس ہزار سال گزارے ہیں تو انسان نے اس طویل عمر میں صرف ایک سو سال تحصیل علم کی طرف توجہ دی ہے اور اگر اس عرصے سے زیادہ علوم کی تحصیل پر صرف کرتا تو آج کچھ علوم کے عملی فوائد سے بہرہ مند ہوتا۔

یہاں اس نکتے کی طرف توجہ بے محل نہیں کہ پہلے زمانے کے سکالرز نے عبرانیوں کے کیلنڈر سے حساب لگا کر اس دنیا کی عمر ۴۸۰۰ سال متعین کی تھی لیکن اب سکالرز نے اپنا خیال تبدیل کر لیا کیونکہ پہلے دنیا وجود میں آئی اور پھر انسان کی خلقت ہوئی۔

لیکن امام جعفر صادقؑ نے اس کی مثال دینا چاہی تو فرمایا فرض کیا انسان نے اس دنیا میں دس ہزار سال

زندگی بسر کی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ دنیا اور نوع بشر کی خلقت کے بارے میں عبرانیوں کے کیلنڈر سے متفق نہیں تھے۔

اگرچہ ایک مثال، دلیل شمار نہیں کی جا سکتی لیکن مثال دینا اس کے تعین کرنے کے مترادف ہے اور اگر امام جعفر صادقؑ کا اس بات پر یقین ہوتا کہ بنی نوع انسان کی عمر ۴۸۰۰ سال سے زیادہ ہے تو آپ ہرگز دس ہزار سال عمر کے بارے میں گفتگو نہ کرتے بلکہ اس سے کم عمر کی مثال لاتے مثلاً" تین ہزار سال کی مثال دیتے ہم یقیناً" کہہ سکتے ہیں کہ زمین کی خلقت کے بارے میں امام جعفر صادقؑ کی معلومات اپنے ہم عصروں سے زیادہ تھیں کیونکہ بعض اوقات ان کی گفتگو سے پتہ چلتا تھا کہ تخلیق کے آغاز کی کیفیت سے مطلع ہیں ایک دفعہ اپنے شاگردوں سے فرمایا۔ یہ بڑے بڑے پتھر جو آپ پہاڑوں پر دیکھ رہے ہیں شروع میں مائع حالت میں تھے اور بعد میں یہ مائع ٹھنڈا ہو کر موجودہ صورت اختیار کر گیا۔

اس نظریے کی اہمیت کو ثابت کرنے کے لئے (جو ساڑھے بارہ سو سال پہلے پیش کیا گیا تھا) اتنا کہنا کافی ہے کہ فرانس کے انقلاب کے آغاز اور اٹھارہویں صدی عیسوی کے اختتام تک یورپ کے سکالرز اس بارے میں تذبذب کا شکار تھے کہ آیا زمین شروع میں ایک مائع سیارہ تھی یا نہیں؟ اور اس سے ایک صدی پہلے پورے یورپ کا کوئی ایسا سکالر نہ تھا جو یہ کہتا کہ شاید زمین شروع میں ایک مائع سیارہ تھی اس زمانے میں یہ تصور پایا جاتا تھا کہ زمین آج جس حالت میں دکھائی دیتی ہے پہلے بھی اسی شکل میں موجود تھی۔

جو کچھ امام جعفر صادقؑ نے بنی نوع انسان کی تحصیل علوم کے سلسلے میں کوشش کا ذکر کیا ہے حقیقت کے عین مطابق ہے اور آج انسانوں کا مطالعہ کرنے والے سکالرز کا کہنا ہے کہ جس زمانے سے انسان نے دو پاؤں پر چلنا شروع کیا ہے اسے پانچ ہزار سال یا چار ہزار سال ہوئے ہیں۔اس سے پہلے ہمیں یہ توقع نہیں کرنی چاہئے کہ انسان نے علوم کی طرف توجہ دی ہوگی کیونکہ چار ہاتھ اور پاؤں سے چلنے والے انسان کے لئے یہ بات محال تھی کہ تحصیل علم کے لئے آلہ تیار کرتا اور پھر صنعت سازی کرتا تاکہ اس کے ذریعے وہ علوم تک رسائی حاصل کرتا۔

لیکن اگر انسان پانچ ہزار سال یا چار ہزار سال بعد بھی جبکہ وہ دو پاؤں پر چلتا رہا تھا اور اس کے دو ہاتھ کام کرنے کے لئے آزاد تھے، آلہ بنا سکتا تھا اور اس کے لاکھ سال بعد جبکہ انسان نے آگ سے استفادہ کرنا شروع کیا اور اگر اس کے بعد کے صرف ایک لاکھ سال کے دوران ہی علوم سے دلچسپی دکھاتا تو آج انسانی زندگی کے تمام مسائل اور شاید موت کا معمہ بھی حل ہو جاتا۔

لیکن ان لاکھوں سالوں کے دوران مجموعی اعتبار سے انسان نے صرف ایک ہزار پانچ سو سال ہی علوم کی طرف توجہ مبذول کی ہے اور اس مختصر عرصہ میں بھی انسان کی علوم کی طرف توجہ کبھی کم اور کبھی زیادہ رہی

ہے۔ ایک بات جو ہماری نظر میں ناقابل تردید ہے وہ یہ ہے کہ ڈکارٹ جسے فوت ہوئے تین صدیاں بیت گئی ہیں وہ پہلا شخص ہے جس نے علمی تحقیق کی بنیاد ڈالی اور کہا کہ علمی حقیقت کو جاننے کے لئے جسم کو چھوٹے حصوں میں تقسیم کرنا چاہیے اور اس کے بعد اسے مزید چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے اتنے چھوٹے حصے بنانے چاہیں کہ جو چیز حاصل ہو مزید اس کی تقسیم نہ ہو سکے۔ پھر اس چھوٹے سے جسم کی تحقیق کرنا چاہیے اور اس کی خصوصیات دریافت کرنا چاہئیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ فزکس اور کیمیا کے لحاظ سے اس کی حالت کیسی ہے ؟ اور اگر ایک جسم کے چھوٹے سے چھوٹے حصے کے خواص معلوم ہو جائیں تو اس پورے جسم کے خواص معلوم کرنا کوئی مشکل نہیں۔

عصر حاضر میں علمی ترقی کا بیشتر حصہ ڈکارٹ کے نظریئے کی پیداوار سمجھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اگر وہ یہ نظریہ پیش نہ کرتا تو علمی ترقی نہ ہوتی۔

یہاں اس بات سے آگاہی ضروری ہے کہ سترھویں صدی عیسوی کے بعد ٹیکنالوجی اور صنعتوں کی توسیع کی وجہ سے ڈکارٹ کا نظریہ کامیابی کی شاہراہ پر گامزن ہوا۔ ڈکارٹ نے ۲۲ صدیاں پہلے یونانی فلسفی ذیم قراطیس نے یہ نظریہ پیش کیا لیکن امام جعفر صادقؑ نے ذیم قراطیس کے نظریے کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ اشیاء کے خواص ہم اس وقت معلوم کر سکتے ہیں جب ہم کسی چیز کے چھوٹے سے ٹکڑے پر تحقیق کریں اور اس کے خواص سے ہم پورے جسم کے خواص تک پہنچ سکتے ہیں۔

جس طرح ہم دنیا کے سمندروں کے پانی پر تحقیق نہیں کر سکتے لیکن سمندر کے ایک قطرے سے سارے سمندر کے خواص معلوم کر سکتے ہیں۔ اگر صنعتی ترقی نہ ہوتی اور سائنس دانوں کو اجسام کے چھوٹے سے چھوٹے حصوں میں تقسیم کرنے کے ذرائع میسر نہ آتے تو ذیم قراطیس اور امام جعفر صادقؑ کے قول کی مانند ڈکارٹ کا قول بھی تھیوری کی حد تک محدود رہتا۔

اگر آج جب ہم سیکنڈ کا کروڑواں حصہ یا ایک ملی میٹر کا کروڑواں حصہ معلوم کر سکتے ہیں تو یہ صرف صنعتی ترقی کا کمال ہے۔

ذیم قراطیس کے زمانے میں ایٹم ایک ناقابل تقسیم ذرہ تھا لیکن آج وہ تقسیم در تقسیم ہو چکا ہے۔ امام جعفر صادقؑ سے پوچھے جانے والے سوالوں میں سے ایک سوال یہ تھا کہ دانائے مطلق کون ہے اور کس وقت آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ سب کچھ سیکھ چکا ہے ؟

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا اس سوال کے دو حصے ہیں ایک یہ کہ دانائے مطلق کون ہے اس کا جواب یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کوئی بھی دانائے مطلق نہیں کسی انسان کے لئے محال ہے کہ وہ دانائے مطلق ہو۔ کیونکہ علم اس قدر وسیع ہے کہ کوئی بھی انسان تمام علوم کو نہیں سیکھ سکتا اگرچہ اس کی عمر ہزاروں سال

کیوں نہ ہو اور اگر وہ اس تمام عمر کے دوران تحصیل علم میں مشغول رہے تو بھی انسان تمام علوم کا عالم نہیں بن سکتا۔ شاید ہزارہا سال زندگی کو تحصیل علم کے لئے وقف کرنے کے بعد اس دنیا کے علوم سے آگاہی حاصل کر لے لیکن اس دنیا کے علاوہ اور بھی جہان ہیں جہاں اس دنیا کے علوم بے وقعت ہیں۔ اگر کوئی شخص اس دنیا کے علوم سیکھنے کے بعد دوسرے جہانوں میں وارد ہو تو وہ جاہل ہے اسے اس دنیا کے علوم سیکھنے کے لئے شروع سے پڑھنا ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کوئی بھی دانائے مطلق نہیں کیونکہ انسان تمام حقیقتوں سے آگاہی حاصل نہیں کر سکتا۔ امام جعفر صادقؑ نے سوال کے دوسرے حصے کے جواب میں فرمایا۔ آپ نے یہ پوچھا ہے کہ انسان کس وقت علم سے بے نیاز ہو جاتا ہے اس کا جواب وہی ہے جو میں نے پہلے سوال کے جواب میں دیا کہ اگر انسان کی عمر ہزاروں سال ہو اور وہ مسلسل تحصیل علم میں مشغول رہے تو بھی وہ تمام علوم پر عبور نہیں حاصل کر سکتا۔ پس اسی بنا پر کوئی شخص یہ احساس نہیں کر سکتا کہ وہ علم سے بے نیاز ہے۔ ہاں البتہ جاہل یہ احساس کرتے ہیں کہ وہ علم سے بے نیاز ہیں۔ امام جعفر صادقؑ سے پوچھا گیا کہ دوسری دنیاؤں کے علم سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا یہ جہان جس میں ہم زندگی بسر کرتے ہیں' کے علاوہ اور جہان بھی ہیں جن میں سے اکثر اس جہان سے بڑے ہیں اور ان جہانوں میں ایسے علوم ہیں جو اس جہان کے علوم سے شاید مختلف ہیں۔ امام جعفر صادقؑ سے پوچھا گیا کہ دوسرے جہانوں کی تعداد کیا ہے ؟ آپ نے جواب دیا' خداوند تعالیٰ کے علاوہ کوئی بھی دوسرے جہانوں کی تعداد سے مطلع نہیں ہے۔ آپ سے پوچھا گیا کہ دوسرے جہانوں کے علوم میں کیا فرق ہے ؟ کیا وہاں کا علم سیکھا نہیں جا سکتا ؟ اور اگر سیکھا جا سکتا ہے تو کیسے ؟ مناسب ہے کہ وہ علوم اس دنیا کے علوم سے مختلف شمار کئے جائیں ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا' دوسرے جہانوں میں دو قسم کے علوم ہیں جن میں سے ایک قسم اس دنیا کے علوم کے مشابہ ہے اور اگر کوئی اس جہان سے ان جہانوں میں جائے تو ان علوم کو سیکھ سکتا ہے۔ لیکن ممکن ہے دوسرے جہانوں میں ایسے علوم پائے جائیں کہ اس دنیا کے لوگ انہیں درک کرنے پر قادر نہ ہوں۔ کیونکہ ان علوم کو اس دنیا کے لوگوں کی عقل نہیں سمجھ سکتی۔ امام جعفر صادقؑ کا یہ قول بعد میں آنے والی نسلوں کے علماء کے لئے ایک معمہ بنا رہا۔ بعض نے اسے قابل قبول نہیں سمجھا اور کہا کہ امام جعفر صادقؑ کا یہ کہنا بلاوجہ ہے۔ ان لوگوں میں سے ابن راوندی اصفہانی بھی ہے جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ اس نے کہا انسانی عقل ہر اس چیز کو درک کر سکتی ہے جسے علم کہتے ہیں چاہے اس دنیا کے علوم ہوں یا دوسرے جہانوں کے علوم ۔ لیکن امام جعفر صادقؑ کے شاگردوں نے آپ کے اس قول کو قبول کیا اور اس بات کے قائل ہو گئے کہ بعض دوسرے جہانوں میں ایسے علوم ہیں جن کی تحصیل انسانی بس کا روگ نہیں کیونکہ انسانی عقل ان علوم کو درک نہیں کر سکتی اس صدی میں آئن سٹائن کے نظریہ' نسبیت (Thoery of Relativity) نے فزکس میں ایک جدید اور بے مثال باب کا اضافہ کیا اور اس کے بعد (Anti matter) یا ضدمادہ کی تھیوری محض

تھیوری کی حدود سے تجاوز کرتے ہوئے علم کے مراحل میں داخل ہوئی اور سائنس دان اس حقیقت سے آشنا ہو گئے کہ ضد مادہ موجود ہے۔ امام جعفر صادقؑ کا یہ قول کہ بعض دوسرے جہانوں میں شائد ایسے علوم پائے جاتے ہیں جن کو سیکھنا انسانی دسترس سے باہر ہے سمجھ میں آتا ہے کیونکہ ضد مادہ کی دنیا میں ہمارے قوانین فزکس کے علاوہ دوسرے قوانین فزکس لاگو ہوتے ہیں اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ منطق اور استدلال کے وہ قوانین جنہیں وضع کرنے پر ہماری عقل قادر ہے دوسرے جہان میں یہ قابل اجراء نہیں ہیں۔ ضد مادہ ایک ایسی دنیا ہے جس میں الیکٹران پر مثبت اور منفی چارج ہے جبکہ ہماری دنیا میں ایٹم کے الیکٹران پر منفی اور پروٹان پر مثبت چارج ہے ایک ایسی دنیا جہاں الیکٹرانوں پر مثبت اور پروٹانوں میں منفی چارج ہو۔ نہ معلوم وہاں کون سے طبیعیاتی قوانین کی حکم فرمائی ہوگی۔ ہماری منطق اور استدلال میں کل جزو پر برتر ہے لیکن ممکن ہے کہ اس دنیا میں جزو کو کل پر برتری حاصل ہو اور ہماری سوچ اس موضوع کو سمجھنے اور قبول کرنے سے قاصر ہے۔ ہماری دنیا میں جب ہم کسی بھاری جسم کو پانی میں ڈالتے ہیں تو ارشمیدس کے قانون کے مطابق وہ پانی میں ہلکا ہو جاتا ہے لیکن اس دنیا میں ممکن ہے کوئی جسم اگر پانی یا کسی مائع میں ڈبویا جائے تو بھاری ہو جائے۔ اس دنیا میں پاسکل کے قانون کی رو سے اگر کسی برتن میں پڑے ہوئے مائع کے ایک نقطے پر دباؤ ڈالا جائے تو یہ دباؤ مائع کے تمام نقاط پر پڑے گا۔ اسی قانون کی مدد سے آمد و رفت کے ذرائع اور خاص طور پر بھاری ذرائع کو روکنے کے لئے بریکوں میں تیل استعمال ہوتا ہے کیونکہ جو بھی ڈرائیور اپنا پاؤں بریک کے پیڈل پر رکھتا ہے تو وہ بریک آئل پر تھوڑا دباؤ ڈالتا ہے اس کا یہی دباؤ سارے بریک آئل پر پڑتا ہے۔ پھر یہ دباؤ ہزار گنا زیادہ گاڑی کے پہیوں پر پڑتا ہے جس کی وجہ سے وہ ایک لمحے میں رک جاتی ہے۔

لیکن ممکن ہے فزکس کا یہ قانون ضد مادہ (Anti matter) دنیا میں موثر نہ ہو اور جو دباؤ مائع کے ایک نقطے پر ڈالا جائے تو اس بات کا امکان ہے کہ وہ اس جہان کے اجنبی طبیعاتی قوانین سے بتدریج سمجھوتہ کر لے۔ جس طرح چاند پر جانے والے خلابازوں کو یہاں بے وزن زندگی گزارنے کی تربیت دی جاتی ہے تاکہ جب وہ چاند پر پہنچیں تو بے وزن رہنا ان کی عادت بن چکی ہو۔ لیکن ضد مادہ دنیا میں جو چیز انسان کے لئے ناقابل قبول ہے وہ منطق اور استدلال کے قوانین کی مخالفت ہے۔

اگر انسان دوسری دنیا میں جزو کی کل پر برتری دیکھے اور مشاہدہ کرے کہ اس دنیا کے لوگ اعداد کی ضرب و تقسیم و تفریق و جمع کے قوانین کا لحاظ نہیں کرتے اور اگر محسوس کرے کہ اس دنیا میں پانی گرم کرنے سے جمتا ہے' سردی پانی کو بخارات میں تبدیل کرتی ہے جبکہ وہاں خلا بھی نہیں تو وہ انسان ان نئی باتوں کو سمجھنے سے قاصر ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں امام جعفر صادقؑ کا اس بات پر مبنی نظریہ کہ بعض ایسے جہان ہیں جن کے علوم کا حصول انسان کے بس کی بات نہیں قابل قبول دکھائی دیتا ہے۔ امام جعفر صادقؑ کے قول نے یونان میں علم

کے متعلق کی گئی قدیم فلسفیانہ بحث کو زندہ کر دیا۔ وہ بحث یہ تھی کہ کیا علم فی نفسہ (بذاتہ) وجود رکھتا ہے یا ہم جو کچھ اخذ کرتے ہیں۔ وہی ہے یعنی ایک دوسرے کی پیروی کا نام ہے یونان کے بعض فلاسفہ کا کہنا ہے کہ اکیلے علم کا وجود نہیں اور علم ایک ایسی چیز ہے جسے ہم اشیااور احوال سے درک کرتے ہیں اور اس کے قواعد معلوم کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مادرزاد نابینا رنگوں کے بارے میں کچھ نہیں جان سکتااور مادرزاد بہرہ علم موسیقی کو درک نہیں کر سکتا۔ ان کا کہنا ہے کہ صرف ایک یا دو حواس ظاہری تمام علوم کے حصول میں حائل نہیں ہو سکتے۔ بلکہ باطنی حواس میں کمی علوم کے ادراک میں رکاوٹ بنتی ہے اور ایک دیوانہ شخص کسی قسم کا علم حاصل نہیں کر سکتا۔ اگرچہ اس کے ظاہری حواس میں کوئی خرابی نہ ہو۔ اس گروہ کی مخالفت میں کچھ یونانی فلاسفہ نے کہا کہ اکیلا علم بھی موجود ہے۔ چاہے انسان اسے درک کرے یا نہ انہوں نے کہا وہ علم جو دنیا میں چار موسم وجود میں لاتا ہے چاہے انسان ان چار موسموں کو درک کرے یا نہ۔ اگر ایسا علم جو سورج و چاند کو زمین کے ارد گرد گھماتا ہے۔ موجود ہے خواہ آدمی آنکھیں رکھتے ہوں یعنی سورج اور چاند کو دیکھ سکیں یا مادرزاد اندھے ہوں اور سورج اور چاند کا مشاہدہ نہ کر سکیں۔ ڈیموکریٹس جس کا کہنا ہے کہ دنیا ایٹم سے بنی ہے اس کا عقیدہ تھا کہ علم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ علوم جنہیں سیکھا جا سکتا ہے اور دوسرے ایسے علوم جن کے قواعد اور تفصیلات کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ ان مجہول علوم میں ایک ایٹم کا علم ہے اور دوسرا خداؤں کے بارے میں ہے۔ ڈیموکریٹس کے ایک صدی بعد اس پر تنقید کی گئی اور کہا گیا کہ موصوف کا یہ کہنا کہ ایٹموں کا علم مجہول علم ہے اور آدمی اس کی تفصیلات کو نہیں جان سکتا اگر درست ہے تو پھر اس نے کس طرح یہ کہا تھا کہ دنیا ایٹموں سے بنی ہے۔ لیکن ڈیموکریٹس کے حواس ایٹموں کو نہیں دیکھ سکے اور اگر ان کی آواز ہے تو اسے نہیں سن سکے یہ ایسی چیزیں ہیں۔ جنہیں آدمی اپنی عقل سے ہی سمجھ سکتا ہے۔ نہ کہ حواس خمسہ کی مدد سے۔

اپنے استاد کے مخالفوں کو خاموش کرنے کے لیے ڈیموکریٹس کے مریدوں کے پاس ایک موثر ذریعہ بھی تھا۔ انہوں نے کہا جبکہ خداؤں کو نہ ظاہری حواس کے ذریعے دیکھا جا سکتا ہے اور نہ باطنی حواس کے ذریعے ان کا وجود معلوم کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح ہم باطنی حواس کے ذریعے اپنی بیماری کا پتہ لگاتے ہیں جبکہ ہم اسے دیکھتے ہیں نہ اس کی آواز سنتے ہیں۔ ڈیموکریٹس بھی اپنی عقل کے ذریعے اس بات تک پہنچا کہ دنیا ایٹموں سے وجود میں آئی ہے۔ اگر وہ ایٹموں کے علم کے قواعد اور تفصیلات کو نہیں سمجھ سکا تو اس پر تنقید نہیں کی جانی چاہئے۔ بہر حال ہماری مراد یہ ہے کہ یونانی فلاسفہ میں بھی ایسے لوگ موجود تھے جنہوں نے علم کی دو قسمیں بتائیں۔ ایک وہ علوم جنہیں انسان کی عقل درک کر سکتی ہے اور دوسرے وہ جنہیں درک کرنا انسان کی دسترس سے باہر ہے۔ اس ساری بحث سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ پہلے امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ علم لا محدود ہے۔ اور دوسرا ان کا عقیدہ تھا کہ وہ علوم جو دوسرے جہانوں میں پائے جاتے ہیں۔ انہیں اس عقل کے ذریعے جس سے انسان اس دنیا

کے علوم سے آگاہی حاصل کرتا ہے۔ ان جہانوں کے علوم کا ادراک نہیں کر سکتا اور آج جبکہ آئن سٹائن کے نظریہ سبتیت اور ضد مادہ کے نظریے جس کے بارے میں ہم نے کہا کہ تھیوری سے گزرنے کے بعد عملی مرحلہ میں داخل ہوگیا۔ ان دونوں نظریات کے ذریعے پتہ چلایا جا سکتا ہے کہ ساڑھے بارہ سو سال پہلے امام جعفر صادقؑ نے کس قدر صحیح نظریہ پیش کیا تھا۔ عباسی دور کے ایک مشہور مورخ ابن ابی الحدید جس نے امام جعفر صادقؑ کے بارے میں بہت کچھ رقم کیا اور وہ عباسیوں کی خلافت کے خاتمے کے ایک سال قبل ہلاکو خان کے ہاتھوں ٦۵۵ ہجری قمری میں ستر یا اکہتر سال کی عمر میں اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ اس کا نام عزالدین عبدالحمید بن محمد تھا۔ اس مورخ کا کہنا ہے' امام جعفر صادقؑ کی موت کے بعد ایک عرصے تک یعنی تقریباً" ڈیڑھ صدی یا دو صدی بعد تک عربستان بین النہرین' عراق' عجم' خراسان اور فارس میں جتنے استاد پڑھاتے تھے۔ امام جعفر صادقؑ کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے تھے کہ امام جعفر صادقؑ سے اس طرح حکایت کرتے ہیں۔ پھر یہی مورخ کہتا ہے کہ اہل سنت والجماعت کے فرقوں کے استاد بھی پڑھانے کے دوران امام جعفر صادقؑ کا قول نقل کرتے اور کہتے تھے کہ ان سے اس طرح مروی ہے۔ ایک دن ابن علقمی نے ابن الحدید سے پوچھا کہ گزشتہ مسلمانوں میں سب سے قابل عالم کون تھا؟ اس نے جواب دیا۔ امام جعفر صادقؑ چونکہ امام جعفر صادقؑ کو سب سے بڑا مسلمان عالم سمجھا جاتا ہے اس لئے محقق کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کی معلومات سے آگاہی حاصل کرے۔ شیعہ مورخین کی کتابوں میں امام جعفر صادقؑ کے علوم کی تعداد ایک سو سے پانچ سو تک درج ہے اور دوسرا یہ کہ بعض شیعہ مورخین نے امام جعفر صادقؑ کے معجزات کے علاوہ آپ کے علوم کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ امام جعفر صادقؑ کے معجزات کے بارے میں شیعہ مورخین کا عقیدہ اس بات کا موجب بنا کہ ان مورخین نے امام جعفر صادقؑ کی سوانح حیات کو آپ کے معجزوں تک ہی محدود رکھا بعض شیعہ مورخین نے اپنی کتابوں کے بیشتر صفحات میں انہی معجزات کی تشریح کی ہے۔ ان معجزات کی تعداد اور شیعہ مورخین کی کتابوں کے حوالے اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ کوئی ایسا دن نہیں گزرا کہ امام جعفر صادقؑ سے ایک معجزہ وقوع پذیر نہ ہوا ہو۔ امام جعفر صادقؑ کے معجزات کا ایک حصہ دور صفویہ کے مشہور عالم علامہ مجلسیؒ کی کتاب بحارالانوار میں درج ہے' لیکن جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ علامہ مجلسیؒ نے اپنی تحریر کو دوسرے ذرائع سے اقتباس کیا ہے۔ ایک شیعہ مولف جس نے امام جعفر صادقؑ کے معجزات کی تشریح کی اس نے مشہور کتاب من لا یحضرہ الفقیہ لکھی اور اس کا شمار بزرگ شیعہ علما میں ہوتا ہے ابو جعفر محمد (ابن بابویہ قمی) ہے' ابن بابویہ چوتھی صدی ہجری میں ہو گزرا ہے یعنی زمانے کے لحاظ سے وہ امام جعفر صادقؑ کے نزدیک تھا۔ امام جعفر صادقؑ کے معجزات کی شرح لکھنے کے علاوہ ابن بابویہ قمی نے عیون الاخبار الرضاؑ (امام علی رضاؑ کے معجزات کی شرح) کے نام سے بھی ایک کتاب لکھی ہے چونکہ شیعہ مورخین امام جعفر صادقؑ کی امامت کے قائل تھے لہٰذا انہوں نے آپ کے علوم کی تعداد پانچ سو لکھی ہے حالانکہ انہوں نے علوم کا

نام نہیں لیا۔

ایک تاریخی محقق کے لئے یہ بات قابل قبول نہیں کہ امام جعفر صادقؑ پانچ سو علوم پر دسترس رکھتے اور پڑھاتے تھے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ امام جعفر صادقؑ کے دور میں علوم کی تعداد آج کے دور سے کہیں کم تھی اور آج کی مانند نہ تو سائنسی ترقی ہوئی تھی اور نہ ہی صنعت و حرفت میں توسیع ہوئی تھی کہ ایک علم سے تھوڑی مدت میں دوسرے علوم جنم لیتے۔

مثال کے طور پر ایٹم کے بارے میں علم مختصر سی مدت یعنی ۱۹۴۰ء - ۱۹۸۰ء کے درمیان اس قدر وسیع ہوا ہے کہ آج ایک انسان اپنی ساری عمر بھی صرف کر دے تو ایٹمی مطالعہ میں تھیوری اور پریکٹیکل دونوں طرح سے ماہر نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ ایٹمی مطالعے کے نظریاتی پہلو کو لے تو وہ عملی لحاظ سے پیچھے رہ جائے گا اور اگر عملی پہلو لے تو نظریاتی پہلو پر عبور حاصل نہیں کر سکے گا۔

یہی مثال جنگ کے بارے میں بھی صادق آتی ہے۔ امریکہ میں جنگی ہوائی جہازوں کے بارے میں ایک جدید ٹیکنیک وضع کی گئی ہے جس کے مطابق پائلٹ کے بغیر بھی یہ جہاز اڑ سکیں گے۔ اس طرح جنگ کی یہ روش فضائی جنگوں کی ٹیکنیک کو تبدیل کر دے گی اور فضائی جنگوں میں ایک نئی ٹیکنیک وجود میں آئے گی لیکن پہلے زمانے میں ایسا ہرگز نہیں ہوتا تھا۔ یعنی علم و صنعت میں اتنی تیزی سے انقلاب برپا نہیں ہوا تھا۔ آج جب کہ اصولی اور فروعی علوم سمیت علوم کی کل تعداد ایک ہزار سے زیادہ نہیں ہے لیکن ساڑھے بارہ سو سال قبل علوم کی تعداد پانچ سو بھی نہ تھی۔

مگر شیعہ مورخین نے لکھا ہے کہ امام جعفر صادقؑ پانچ سو علوم کے ماہر تھے اور یہ سب پڑھاتے تھے۔ بظاہر اس کی دو وجوہات ہیں چونکہ شیعہ مورخین امام جعفر صادقؑ کو اپنا امام سمجھتے ہیں اور شیعہ عقائد کے مطابق ان کا ایمان ہے کہ امامؑ اس دنیا میں (نوع انسانی میں) دانائے مطلق ہے۔ یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ دانائے مطلق پیغمبرؐ اور اس کے بعد امامؑ ہے۔ وہ خداوند تعالیٰ کی دانائی کے بارے میں کسی حد کے قائل نہیں اور خداوند تعالیٰ کو دانائے مطلق سمجھتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اس کا علم اس کی ذات کی مانند لامحدود ہے اور علم خداوند تعالیٰ کی ذات سے جدا نہیں ہے کیونکہ خداوند تعالیٰ کا علم اکتسابی نہیں ہے۔ توحید پرست مسلمان خداوند تعالیٰ کے علم سمیت تمام صفات کو اس کی ذات کا جزو سمجھتے اور کہتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس کا آغاز و انجام نہیں ہے۔ اسی طرح اس کا علم بھی ہمیشہ سے ہے، ہمیشہ رہے گا اور ہرگز حدود کا پابند نہیں۔

# تاریخی تنقید پر تبصرہ امامؑ

شیکسپئر کے اشعار جو ادب کا حصہ ہیں جوں کے توں قبول کئے جاتے ہیں اور یہ ایک منقول علم ہے لیکن آج کا مورخ واٹرلو (Waterloo) کی جنگ کی شرح کو علم منقول نہیں سمجھتا بلکہ اسے سمجھنے کے لئے عقل استعمال کرتا ہے۔ جس طرح امام جعفر صادقؑ ساڑھے بارہ سو سال قبل تاریخ کے ادراک کے لئے عقل کو استعمال میں لائے تھے۔ لہٰذا تاریخی تنقید کے لحاظ سے کل اور آج کے مورخ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یونانی مورخ "ہیروڈوٹ" نے اپنی تاریخ (۶۴) کے مقدمے میں لکھا ہے کہ جو چیز میری سمجھ میں نہیں آتی اسے قبول نہیں کرتا۔ لیکن پھر بھی ہروڈوٹ کی تاریخ میں ایسے افسانے ملتے ہیں جو انسانی سمجھ سے باہر ہیں۔

امام جعفر صادقؑ وہ پہلے مسلمان ہیں جنہوں نے تاریخی روایات پر تنقیدی نگاہ ڈالی اور اس بات کی نشاندہی کی کہ تاریخی روایات کو تنقید اور گہرے غور و فکر کے بغیر قبول نہیں کرنا چاہئے' آپ ہی تھے جو تاریخ رقم کرنے میں ابن جریر طبری کے استاد اور مربی بنے اور اس بات کا سبب بنے کہ جس وقت جریر طبری نے تاریخ لکھنے کے لئے قلم ہاتھ میں لیا تو اس نے صرف وہی باتیں لکھیں جنہیں انسانی عقل قبول کرے اور ایسے افسانے لکھنے سے گریز کیا جو انسان کو غافل بناتے ہیں۔

امام جعفر صادقؑ سے قبل مشرق وسطیٰ میں تاریخ کے کچھ حصے افسانوں پر مشتمل تھے کیونکہ جو لوگ تاریخ پڑھتے یا سنتے تھے ایسے تاریخی افسانوں کو بھی قبول کرتے تھے۔

احتمال ہے کہ اسلام سے قبل ایران میں تاریخ موجود تھی اور ایسی تاریخی کتابیں پائی جاتی تھیں جن کا آج ایک صفحہ بھی ہاتھ نہیں آتا۔

ساسانیوں اور ہخامنشیوں کے دور کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم ایران میں لوگ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ واقعات لکھنے اور ریکارڈ کرنے کے ضمن میں افسانے کو تاریخ میں داخل نہیں کرنا چاہیے۔

ہخامنشیوں اور ساسانیوں کے دور سے ملنے والے کتبوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کتبوں میں افسانے کی ایک سطر بھی نہیں پائی جاتی اور واقعات کی نص ان میں درج ہے۔ علاوہ ازیں ان بادشاہوں کے مذہبی عقیدے کے آثار ان کتبوں میں ملتے ہیں جن کے حکم سے یہ کتبے لکھے گئے۔ اگر افسانے کو تاریخ میں مدغم نہ کرنے کا شعور قدیم ایران میں نہ پایا جاتا تو ہخامنشیوں اور ساسانیوں کے دور کے کسی ایک تاریخی کتبے میں افسانہ ضرور ملتا۔ یہ کہنا مناسب نہیں چونکہ یہ کتبے مختصر تھے لہٰذا افسانوں کو تاریخ میں شامل نہیں کیا گیا کیونکہ کتبہ بے ستون جو پہلے ہخامنشی بادشاہ داریوش کے زمانے میں لکھا گیا اور کتبہ نقش رستم جو پہلے ساسانی بادشاہ یعنی شاہ پور کے زمانے میں لکھا گیا چھوٹے چھوٹے کتابچوں پر مشتمل ہیں۔ اگر افسانے کو ان کتب میں شامل کرنا چاہتے تو آسان تھا لیکن تاریخ کے سوا کوئی دوسری چیز ان کتبوں میں نہیں لکھی بہرحال قبل از اسلام ایران میں ایسی تاریخی کتابیں نہیں

ملتیں جن سے پتہ چلے کہ افسانہ پایا جاتا تھا یا نہیں ؟ (۶۵)

دوسری صدی ہجری کے پہلے پچاس سال جو امام جعفر صادقؑ کا زمانہ شمار کیا جاتا ہے اس کے دوران افسانہ اور تاریخ کی آمیزش تھی۔ جس کا تذکرہ ہو چکا ہے دوسری صدی ہجری کے پہلے پچاس سالوں کے دوران اسلام میں کتابیں وجود میں آئیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب عربوں نے اپنے خیالات رقم کرنے کے لئے نثر کا استعمال کیا۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ عرب قوم میں اس تاریخ سے پہلے نثر کا وجود نہ تھا بلکہ ہماری مراد یہ ہے کہ نثر بہت کم تھی اور دوسری صدی ہجری کے پہلے پچاس سالوں میں نثر نے اس طرح ترقی کی جس طرح بہار کے موسم میں پودے ایک دم زمین سے اگتے ہیں۔ ان کتابوں میں سے اکثر ناپید ہیں۔ جنگوں، زلزلوں اور سیلابوں وغیرہ کے نتیجہ میں ان کا خاتمہ ہو چکا ہے لیکن ابن الندیم کاتب کی وساطت سے ہمیں ان کے اور ان کے لکھنے والوں کے نام معلوم ہیں۔ ان کتابوں میں تاریخی کتابیں بھی ہیں لیکن یہ تاریخیں افسانے سے مبرا ہیں۔

امام جعفر صادقؑ ان تمام کتابوں کی تاریخی اہمیت کے قائل نہ تھے جن کے بارے میں خیال کیا جاتا تھا کہ ان میں تاریخ کے ساتھ افسانے بھی مدغم ہیں۔ آپ فرماتے تھے کہ افسانہ گمراہ کرنے والا ہے اسے تاریخ میں جگہ نہیں دینی چاہئے۔

اس لحاظ سے امام جعفر صادقؑ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اسلام میں تاریخ پر تنقید کی اور ابن ابی الحدید کے بقول تاریخ کو صحیح معنوں میں تاریخ بنانے کی طرف توجہ دلائی۔

لفظ تاریخ جسے فرانسیسی میں ہیشوار کہا جاتا ہے پہلے پہل اس کا اطلاق، اس فرانسیسی لفظ ہیشوار پر نہ ہوتا تھا۔ قبل از اسلام عربوں میں کسی کتاب کا وجود نہ تھا کہ وہ اس کا نام تاریخ رکھتے۔ عرب تاریخی روایات کو اشعار کے قالب میں ڈھال لیتے پھر شعراء انہیں پڑھ کر سامعین کو محظوظ کرتے تھے۔ عربوں میں اسلام کے بعد کتاب لکھی گئی۔ اسی طرح تاریخی کتابیں بھی وجود میں آئیں جن کا عام نام تاریخ نہیں بلکہ روایت رکھا گیا اور کہا جاتا ہے کہ فارسی میں لکھی جانے والی تاریخ جس کا نام دساتیر ہے یہ بھی اسی زمانے میں لکھی گئی۔ یاد رہے کہ یہ کتاب دری فارسی میں لکھی گئی اور کیا دری فارسی اس وقت وسیع زبان تھی کہ دساتیر جیسی ضخیم کتاب اس زبان میں لکھی جاتی۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ محققین کا ایک گروہ دساتیر کو ایک جعلی تاریخ خیال کرتا ہے یاد رہے کہ یہ تاریخ صفوی دور میں ضبط تحریر میں لائی گئی ہے۔ (۶۶)

امام جعفر صادقؑ نے تاریخ اور افسانے کے حوالے سے جو تنقید کی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اسلام میں اجتماعی طور پر تاریخ کو سود مند بنا دیا ہے۔ آپ نے فرمایا جب افسانہ تاریخ میں مدغم ہو جاتا ہے تو پھر تاریخ کی وقعت باقی نہیں رہتی۔ تاریخ سے آگاہی اس لئے مفید ہے کہ آئندہ آنے والی نسلیں گزرے ہوئے واقعات سے سبق حاصل کرتی اور ایسے کاموں سے پرہیز کرتی ہیں جو ان کے لئے مضر ہیں۔

آج تاریخ کا سب سے بڑا فائدہ یہی سمجھا جاتا ہے کہ آئندہ آنے والی نسلیں گذشتہ واقعات سے سبق حاصل کریں اور ایسے اقدامات عمل میں نہ لائیں جو گزشتہ لوگوں کے خسارے کا باعث بنے تاکہ اسلاف کی طرح وہ نقصان اٹھانے سے بچ جائیں۔

فرائیڈ' آسٹریا کا مشہور فلسفی جو ماہر نفسیات بھی ہے اس بڑے تاریخی فائدے کو تسلیم کرتا ہے لیکن کہتا ہے کہ انسانی فطرت' تاریخ سے عبرت حاصل کرنے سے مانع ہوتی ہے۔ خصوصاً" انسان کی خود پسندی اس بات میں حائل ہوتی ہے۔ خود پسندی انسان کو تلقین کرتی ہے کہ جو کچھ اسلاف پر گزر چکی وہ اب اس پر نہیں گزرے گی کیونکہ وہ ایک دوسرے دور میں زندگی گزار رہا ہے اور وہ ان سے زیادہ عقلمند' ماہر یا قوی ہے۔ حتیٰ کہ اگر خود پسندی نہ ہو تو بھی فرائیڈ کے بقول کوئی دوسری انسانی فطرت تاریخ سے سبق حاصل کرنے میں رکاوٹ بنتی ہے بہر کیف جو کچھ امام جعفر صادقؑ نے افسانے کو تاریخ سے الگ کرنے کے لئے کہا اس کی وجہ سے تاریخی تنقید کی بنیاد پڑی اور علم تاریخ وجود میں آیا۔

گذشتہ صفحات میں ہم بتا چکے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ نے بعض علوم اپنے والد گرامی کے حلقہ درس میں زانوئے تلمذ طے کر کے حاصل کیے لیکن اکثر علوم جنہیں امام جعفر صادقؑ پڑھاتے تھے ان کی ذاتی سعی کا ماحصل تھے مثلاً" اس طرح کے مسائل کہ خاک مرکب نہیں اور ہوا بھی مرکب نہیں' یہ وہ معلومات تھیں جو خود امام جعفر صادقؑ کی اختراع ہیں' پھر انہیں آپ نے اپنے شاگردوں تک پہنچایا' پھر ہم نے دیکھا کہ آپ اسلام میں وہ واحد شخصیت ہیں جنہوں نے فرمایا کہ ہوا میں ایک ایسی چیز ہے جو جلنے میں مدد دیتی ہے اور اسی کی وجہ سے دھاتیں زنگ آلود ہوتی ہیں۔

ہم نے دیکھا کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا دوسرے جہانوں میں دو قسم کے علوم پائے جاتے ہیں ایک وہ علم جسے ہم اپنی عقل کے ذریعے سمجھ سکتے ہیں اور ایک وہ علم جسے شاید اس عقل کے ذریعے سمجھنا ناممکن ہے۔ یہ آپ ہی تھے جنہوں نے فرمایا کہ شاید دوسرے جہانوں کے علماء جنہیں ہم نہیں پہچان سکتے ہم سے رابطہ قائم کرنے کے خواہش مند ہوں لیکن چونکہ ہم ان کے علم سے واقف نہیں اور ان کی زبان نہیں جانتے لہٰذا ابھی تک ہمیں معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ ہم سے بات چیت کے خواہشمند ہیں۔ امام جعفر صادقؑ نے دوسرے جہانوں کے جن موجودات کا ذکر کیا وہ حقیقی معنوں میں موجود ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر جنوں کا تذکرہ آیا ہے اور یہاں تک کہا گیا ہے کہ ایک دن بنی نوع انسان اور تمام مخلوقات جو دکھائی نہیں دیتیں ایک جگہ اکٹھی ہوں گی۔ اس دن کو قرآن میں حشر کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

لیکن امام جعفر صادقؑ سے قبل اس دکھائی نہ دینے والی یا دوسری دنیا کی مخلوقات کے علوم کے بارے میں کسی نے غور نہیں کیا۔ اس بات کا امکان ہے کہ بنی نوع انسان سے رابطہ قائم کرنے کے خواہشمند ہوں لیکن

چونکہ انسان ان کی زبان سے ناآشنا ہے لہذا اسی وجہ سے ان کا رابطہ قائم نہ ہو سکا ہو۔ امام جعفر صادقؑ کے بعد انیسویں صدی عیسوی تک کسی نے اس موضوع کی طرف دھیان نہیں دیا' البتہ انیسویں صدی عیسوی میں ایک فرانسیسی کامیل فلاریون نے اس موضوع پر توجہ دی اور دوسرے سیاروں کی مخلوقات سے انسانی رابطے کے بارے میں مشاہدے کے بغیر نظریات پیش کئے کیونکہ ابھی تک سائنس نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ کامیل فلاریون عملی تجربہ کرتا۔

تجربے کی روسے پہلی مرتبہ ۱۹۲۰ء میں معلوم ہوا کہ دوسرے جہانوں کی مخلوقات ہماری زمینی مخلوقات سے رابطہ قائم کرنا چاہتی ہیں۔ اس سال اٹلی کے باشندے مارکونی نے بحریہ کے کمانڈر کینٹ میلو کی سربراہی میں منعقد کئے گئے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ میں اپنی کشتی کے وائرلیس سیٹ میں ایسی لہریں (Rays) پاتا ہوں جن پر مجھے کوئی شک نہیں کہ انہیں عقلمند عالم اور ماہر مخلوق' زمینی مخلوقات سے رابطہ قائم کرنے کے لئے بھیجتی ہوں گی۔ (٦٧)

مارکونی بھی اپنے تجربے کو آگے نہ بڑھا سکا کیونکہ ابھی ریڈیو ٹیلی سکوپ ایجاد نہیں ہوا تھا اور عام فلکی دوربین میں اتنی طاقت نہ تھی کہ شمسی نظام سے باہر کی دنیا کا مشاہدہ ہو سکتا اور اس پر طرہ یہ کہ عام فلکی دوربین ۱۹۲۰ء تک اتنی طاقتور نہ تھی اور ابھی تک کوہ پالومر (جو امریکہ میں واقع ہے) پر نصب رصدگاہ کی فلکی دوربین میں ایک بڑا عدسہ نصب نہیں کیا گیا تھا (٦٨) جس کا قطر ۵ میٹر ہے تاکہ ان کہکشاؤں کو جو زمین سے دور ہزاروں ملین نوری فاصلے پر واقع ہیں دیکھا جا سکے جس کے بعد اس فلکی دوربین نے کام شروع کیا تو معلوم ہوا کہ اس کے ذریعے دوسرے جہانوں کی مخلوقات سے رابطہ قائم نہیں کیا جا سکتا اگرچہ کوہ پالومر کی رصدگاہ کی یہ فلکی دوربین دو ہزار ملین میٹر فاصلے پر واقع کہکشاں کا ایک بڑے نقطے کی شکل میں آسمان پر مشاہدہ کرتی ہے لیکن ان کی وسعت اور عظمت کا کھوج نہیں لگا سکتی۔

## انسانی ڈھانچے کی ساخت اور جعفری نظریہ

امام جعفر صادقؑ نے سارے مسلمانوں کی مانند فرمایا تھا کہ انسان خاک کا پتلا ہے البتہ آپ کے فرمان اور دوسرے مسلمانوں کے اقوال میں یہ فرق تھا کہ آپ نے انسان کی خاک سے پیدائش کے بارے میں ایسی باتیں کہیں جو اس زمانے کے کسی مسلمان کو سمجھ نہ آسکیں۔ صدیوں بعد بھی کوئی مسلمان ایسا نہیں گزرا جس نے انسانی بدن کے ڈھانچے کے بارے میں امام جعفر صادقؑ کی طرح اظہار خیال کیا ہو اور اگر کسی نے کچھ کہا بھی ہے تو وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ آپ کے شاگردوں سے سنا ہے آپ نے فرمایا تمام وہ اشیا جو مٹی میں پائی جاتی ہیں انسانی

بدن میں موجود ہیں البتہ ان کی مقدار ایک جیسی نہیں ان میں سے بعض انسانی بدن میں زیادہ ہیں اور بعض بہت کم ہیں۔

وہ عناصر جو انسانی جسم میں پائے جاتے ہیں ان میں بھی مساوات نہیں ان میں سے بعض دوسروں کی نسبت بہت کم مقدار میں ہیں۔ آپ نے فرمایا انسانی بدن میں چار چیزیں زیادہ اور آٹھ چیزیں ان سے کم مقدار میں ہیں اور آٹھ عناصر ایسے ہیں جو بہت ہی کم مقدار میں ہیں۔ انسانی جسم کی عمارت کے بارے میں آپ کا یہ اظہار خیال کبھی کبھی انسان کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ جیسا شیعوں کا عقیدہ ہے کہ امام جعفر صادقؑ علم امامت کے حامل ہیں۔ اور اس نظریئے کو اپنے علم امامت کے ذریعے اخذ کیا ہے نہ کہ علم بشری کے ذریعے' کیونکہ ہماری عقل اس بات کو تسلیم نہیں کرتی کہ ساڑھے بارہ سو سال پہلے ایک عام عالم' انسان کے بارے میں اتنی معلومات رکھتا ہو لیکن کیا نابغہ روزگار شخصیات اور عام لوگوں میں یہ فرق نہیں ہے کہ ان کی عقل ایسی چیزیں اخذ کرنے پر قادر ہوتی ہے جن تک دوسرے لوگوں کو دسترس نہیں ہوتی اور ان کی آنکھ اسی علاقے میں ایسی چیزوں کا مشاہدہ کرتی ہے جو دوسروں کے لئے جہالت کی تاریکیاں ہوتی ہیں۔ اگر یہ امتیاز نہ پایا جائے تو پھر نابغہ روزگار افراد اور عام عقل رکھنے والے لوگوں میں کیا تمیز باقی رہ جاتی ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام اس لحاظ سے نابغہ روزگار تھے کہ آپ کی عقل نے ان چیزوں کا ادراک کیا جن پر دوسرے لوگ قادر نہ تھے آپ کی آنکھ نے ان چیزوں کو دیکھا جنہیں دوسرے لوگ نہ دیکھ سکے۔ بعض دانشوروں کا خیال ہے کہ تمام معلومات ہر شخص کے باطنی شعور میں موجود ہیں لیکن انسانوں کے ظاہری اور باطنی شعور کے درمیان ایک بڑا پردہ حائل ہے جو انسانوں کو ایک لامحدود عرصے تک ان کے باطنی شعور کا مطالعہ کرنے میں رکاوٹ بنتا ہے۔ اس طرح انسان باطنی شعور کی معلومات سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ نابغہ شخصیات اور عام لوگوں میں یہ فرق ہے کہ وہ ایک لامحدود عرصے تک اپنے باطنی شعور سے آگاہی رکھتے ہیں اور ان معلومات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ برگ سون (۶۹) کا کہنا ہے کہ ایک ایٹم جو کائنات کی تخلیق یا کرہ زمین کی تخلیق کے آغاز سے موجود ہے تمام کائنات کی معلومات رکھتا ہے اور اس طرح انسانی جسم کے خلیات اپنی تخلیق کے دن سے آج تک کی معلومات سے آگاہ ہیں ایک لامحدود عرصے میں باطنی شعور تک پہنچنے کو برگ سون (فرانسیسی) نے زندگی کے بارے میں کھوج لگانے کا نام دیا ہے اور ان کا کہنا ہے کہ نابغہ روزگار شخصیات عام لوگوں کی نسبت زیادہ تیزی سے زندگی کا کھوج لگالیتی ہیں اور اپنے بدن میں موجود حافظے کے خلیات (Memory cells) کی مدد سے معلومات حاصل کرلیتی ہیں۔

عموماً شیعوں کے عقیدے کے مطابق امام جعفر صادقؑ علم امامت سے بہرہ ور تھے یا عقلاء کے بقول اپنے باطنی شعور سے آگاہ تھے یا برگسن کے نظریئے کی بنا پر انہوں نے انسان کے بارے میں کھوج لگانے کی اپنی قوت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انسانی بدن کی ساخت کے متعلق ایسی باتیں کہی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اپنے زمانے

کے لوگوں اور آپ کے بعد آنے والے زمانوں کے لوگوں میں آپ انسانی بدن کے علم میں انفرادی حیثیت کے حامل تھے۔ آج ساڑھے بارہ سو سال بعد، امام جعفر صادقؑ کا نظریہ علمی لحاظ سے ثابت ہو چکا ہے جس کی صحت اور درستی میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں صرف یہ کہ آپ نے انسانی جسم کے مواد کا نام نہیں لیا۔

یاد رہے کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا جو کچھ زمین میں موجود ہے انسانی جسم میں بھی پایا جاتا ہے اب تک زمین سے ایک سو دو عناصر دریافت ہو چکے ہیں اور یہی عناصر انسانی جسم میں بھی موجود ہیں لیکن جسم میں ان میں سے بعض عناصر کی مقدار اس قدر کم ہے کہ ابھی تک اس مقدار کا تعین نہیں ہو سکا۔ امام جعفر صادقؑ صرف اس قول کہ جو کچھ انسانی جسم میں موجود ہے زمین میں بھی ہے کی بنا پر نابغہ روزگار شخصیت نہیں کہلا سکتے۔ کیونکہ جس کسی کا یہ عقیدہ ہو کہ انسان خاک سے تخلیق شدہ ہے وہ یہ بات آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ جو کچھ انسانی جسم میں ہے وہ زمین میں بھی ہے۔

لیکن آپ کے نابغہ ہونے کی دلیل آپ کا قول ہے کہ جو کچھ زمین میں ہے وہ انسانی جسم میں بھی ہے لیکن اس کا تناسب اس طرح ہے کہ چار حصے زیادہ مقدار میں اور آٹھ حصے ان سے کم مقدار میں اور پھر دوسرے آٹھ حصے پہلے آٹھ حصوں کی نسبت نہایت ہی کم مقدار میں پائے جاتے ہیں۔

جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ یہ نظریہ ثابت ہو چکا ہے۔

امام جعفر صادقؑ کے بقول آٹھ حصے جو انسانی جسم میں بہت کم مقدار میں ہیں وہ یہ عناصر ہیں 'مولیبڈن' 'سیلیسوم' 'فلورین' 'کوبالٹ' 'میگانیز' 'تانبا' 'آیوڈین اور زنک جبکہ آٹھ عناصر جو انسانی بدن میں پہلے آٹھ عناصر کی نسبت زیادہ پائے جاتے ہیں مندرجہ ذیل ہیں۔ میگنیشیم' سوڈیم' پوٹاشیم' فاسفورس' کلورین' سلفر اور لوہا

وہ چار عناصر جو انسانی بدن میں زیادہ مقدار میں پائے جاتے ہیں آکسیجن 'کاربن' ہائیڈروجن اور نائٹروجن ہیں انسانی جسم میں ان عناصر کی شناخت کوئی ایک دن یا دو دن کا کام نہ تھا بلکہ اس کام کا آغاز اٹھارویں صدی عیسوی میں پوسٹ مارٹم کے ذریعے ہوا اس کام کا سہرا دو قوموں ایک فرانسیسی اور دوسری آسٹرین Austrian کے سر ہے۔ دوسرے ممالک میں پوسٹ مارٹم نہیں کیا جاتا تھا مگر شاذو نادر جبکہ مشرقی ممالک میں تو پوسٹ مارٹم کا سرے سے رواج ہی نہ تھا اور یورپین ممالک میں آرتھوڈکسی 'کیتھولکی اور پروٹسٹنٹ فرقے' پوسٹ مارٹم کے سخت مخالف تھے۔

آسٹریا اور فرانس میں کلیسا کے حکم کی پرواہ کئے بغیر پوسٹ مارٹم کیا جاتا تھا۔ بہر کیف مارا کے زمانے تک فرانس میں پوسٹ مارٹم کا عام رواج نہ تھا اور تقریباً خفیہ تھا۔

"مارا" (۷۰) نے چند دوسرے سائنس دانوں کی مدد سے جن میں لاووازیہ بھی شامل تھا جس کا سر گیوٹین کے ہمراہ ۱۷۹۴ء میں قلم کر دیا گیا تھا اس نے بدن کے مختلف اعضاء کا تجزیہ کیا تاکہ یہ معلوم کرے کہ

انسان کون کون سے عناصر سے مل کر بنا ہے "مارا" کے بعد اس کے شاگردوں نے اس کی تحقیق جاری رکھی اور پوسٹ مارٹم کے ذریعے انسانی اعضاء کا تجزیہ کیا۔ یہ تجزیہ نہ صرف پوری انیسویں صدی کے دوران بلکہ بیسویں صدی تک جاری تھا اس دوران اس تحقیق میں کافی وسعت پیدا ہوئی۔

چونکہ اٹھارویں صدی عیسوی کے آغاز میں پوسٹ مارٹم صرف فرانس اور آسٹریا تک محدود تھا اس کے بعد دیگر یورپی ممالک اور دوسرے ممالک میں عام ہوا جبکہ آج ماسوائے چند ممالک کے جن میں میڈیکل کالج نہیں ہیں پوسٹ مارٹم عام ہے اور جہاں جہاں پوسٹ مارٹم عام ہے وہاں انسانی جسم جن جن عناصر سے مل کر بنا ہے ان کے بارے میں تحقیق ہوتی ہے۔ پوسٹ مارٹم سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ دو مختلف مراکز کے پوسٹ مارٹم سے حاصل ہونے والے نتائج آپس میں کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتے بلکہ معمولی فرق کے ساتھ دونوں کے عناصر کی نسبت امام جعفر صادقؑ کے قول کے عین مطابق ہوتی ہے بشرطیکہ دونوں پوسٹ مارٹم صحت مند انسانوں کے ہوں۔

مثال کے طور پر تمام ممالک میں ہر صحت مند مرد و عورت جس کے جسم کا وزن پینتالیس کلو گرام ہے۔ اس کے وزن میں ۸ ر ا کلو گرام کاربن ہوتی ہے۔ اور جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں کاربن ان چار عناصر میں سے ایک ہے جو ہمارے جسم میں زیادہ مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ اس طرح پینتالیس کلو گرام وزن کے آدمی میں ۴ ر ۵ کلو گرام ہائیڈروجن ہوتی ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص کسی ایسی دائمی بیماری میں مبتلا ہو جس سے اس کے بدن کے عضلات (Muscles) بھوک کی وجہ سے ٹوٹ پھوٹ رہے ہوں تو اس کے بدن میں ہائیڈروجن کی مقدار کم ہو جاتی ہے۔ بہرکیف تمام نسل انسانی چاہے وہ سفید فام یا سیاہ فام یا ریڈ انڈین یا دوسری مخلوط نسلوں کے انسان ہوں' ان میں آکسیجن' کاربن' ہائیڈروجن اور نائیٹروجن کی مقدار دوسرے عناصر سے زیادہ ہوتی ہے ان چار عناصر کے بعد دوسرے آٹھ عناصر جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے' کی مقدار مذکورہ چار عناصر سے کم ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے آٹھ عناصر کی مقدار بدن میں مزید کم ہوتی ہے یہ تناسب تمام صحت مند انسانوں میں برابر ہوتا ہے چاہے وہ قطبی علاقوں کے باسی ہوں یا استوائی علاقوں کے رہنے والے' بشرطیکہ جسم کا وزن اور عمر برابر ہو۔ ایک سو پچاس سال یا اس سے زیادہ کے تجربات اور ریسرچ نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ امام جعفر صادقؑ کے انسانی جسم کو تشکیل دینے والے عناصر کے بارے میں نظریہ کی صحت میں کوئی شک و شبہ نہیں۔

ابھی اس تحقیق کو جاری رکھنے کی ضرورت ہے کہ کیا انسانی بدن کے خلیے(چاہے مردہ ہوں یا زندہ ) میں وہ تمام اجزا پائے جاتے ہیں جو زمین میں موجود ہیں ۔

ابھی تک بعض عناصر عضلات ( Muscles ) یا ہڈیوں کے خلیوں میں نہیں ملے لیکن گمان کیا جاتا ہے کہ یہ

عناصر بدن میں موجود ہیں ابھی تک اس لئے دریافت نہیں ہوئے کہ ان کی مقدار کم ہونے کی وجہ سے لیبارٹریز ان کے وجود کا پتہ نہیں لگا سکیں۔

چونکہ چھوٹے چھوٹے اجسام میں پیشرفت ہو رہی ہے لہٰذا امید ہے کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ انسانی بدن کے تمام عناصر دریافت ہو جائیں گے اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ہر عنصر جسم میں کس مقدار میں موجود ہے اور اس کا کام کیا ہے اور اس کی مقدار میں کمی یا زیادتی سے جسم پر کیا اثر پڑتا ہے؟

# امام جعفر صادقؑ کا شاگرد ابراہیم بن طہمان اور ایک قانونی مسئلہ

امام جعفر صادقؑ کے شاگرد ابراہیم بن طہمان نے ایک نا اہل عباسی خلیفہ کی برطرفی کا تذکرہ کیا ہے۔ ابراہیم کے علاوہ امام جعفر صادقؑ کے شاگرد نے یہ مسئلہ نہیں اٹھایا۔

ابراہیم بن طہمان کے بقول ایک دن امام جعفر صادقؑ کے حضور میں یہ مسئلہ پیش کیا گیا کہ اسلامی فقہ میں کوئی ایسی شق ہے جس کی بنا پر نااہل خلیفہ کو خلافت سے ہٹایا جاسکتا ہے اور اگر کوئی ایسی شق نہیں تو کیا امام جعفر صادقؑ کی طرف سے یہ شق اسلامی فقہ میں داخل نہیں کی جانی چاہئے؟ ابن طہمان کی روایت نقل کرنے سے پہلے ہم یہ بات بتانا چاہیں گے کہ شیعہ اثناعشری فقہ میں امام کو برطرف کرنے کی شق موجود نہیں کیونکہ امام کی نااہلی کا مسئلہ ہرگز پیش نہیں آیا اور نہ آئے گا۔

شیعوں کے عقیدے کے مطابق امام خداوند تعالیٰ کی طرف سے منتخب ہوتا ہے اور معصوم ہوتا ہے۔ امام کی اہلیت میں کسی قسم کے شک و شبے کی گنجائش نہیں کیونکہ امام منصوص من اللہ ہوتا ہے اور جو شخص منصوص من اللہ ہوتا ہے وہ ہرگز اپنی اہلیت نہیں کھوتا اور خدا کی طرف سے متعین ہونے کی بنا پر معصوم بھی ہے اور ہرگز گناہ کا مرتکب نہیں ہوتا اگرچہ اس کا جسم عام انسانوں کی مانند ہوتا ہے لیکن چونکہ وہ مافوق الفطرت انسانی روح کا حامل ہوتا ہے لہٰذا اس سے گناہ سرزد نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ شیعہ اثناعشری فقہ میں کوئی ایسی شق نہیں جو امام کو برطرف کرنے کا موجب بنے اس لئے کہ ایسی شق کے صادر کرنے کا موقع ہی نہیں آسکتا۔ چونکہ شیعہ مذہب میں امام عدل و انصاف میں غلطی نہیں کرتا لہٰذا وہ بہترین قاضی ہے اور شیعوں کے اعتقاد کے مطابق وہ اس لئے غلطی نہیں کرتا کہ وہ عالم ہے اور عام انسانوں کی نسبت علم سے زیادہ آگاہ ہے' لہٰذا جب کوئی شخص امام کے پاس کسی کی شکایت لے کر عدل و انصاف کے لئے حاضر ہوتا اور جب مدعا علیہ کو بھی حاضر کیا جاتا تو امام کو علم امامت سے معلوم ہوتا . کہ شاکی حق پر ہے یا نہیں؟

امام غلطی کرتا ہے نہ گناہ اور چونکہ خداوند تعالیٰ کی طرف سے منتخب ہوتا ہے لہٰذا امامت کے لئے سب سے

مناسب انسان ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ شیعہ فقہ میں کوئی ایسی شق موجود نہیں جس میں امام کی امامت سے برطرفی کا ذکر ہو۔

شیعوں کے نزدیک عباسی خلیفہ خدا کا برگزیدہ نہ تھا اور جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ ان خلیفوں میں سے بعض گناہ کے مرتکب ہوتے تھے۔ وہ اعلانیہ گناہ بھی کرتے تھے۔ امام جعفر صادقؑ کے شاگرد ابن عثمان کے بقول امام جعفر صادقؑ کے شاگردوں نے غیر صالح خلیفہ کو برطرف کرنے کے بارے میں سوال اٹھایا اور کہا اگر اسلامی فقہ میں اس کے متعلق کوئی شق درج نہیں تو اب اسے فقہ میں شامل کیا جانا چاہئے۔ لیکن ابن عثمان کے بقول امام جعفر صادقؑ نے اپنے ان شاگردوں کا مشورہ نظرانداز کرتے ہوئے غیر صالح خلیفے کو برطرف کرنے سے متعلق اسلامی فقہ میں کوئی شق شامل نہیں کی۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے اپنے بعض شاگردوں کے اس مشورے کو کیوں قبول نہیں کیا۔ غیر صالح خلیفہ کی معزولی کے لئے اسلامی فقہ میں کوئی شق شامل کرنے پر توجہ کیوں نہیں دی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ نہیں چاہتے تھے کہ عباسی خلفاء کے خلاف اعلان جنگ کا آغاز کریں جس طرح امام حسن بن علیؑ نے معاویہ کے ساتھ جنگ نہیں کی اور ان کے بعد امام زین العابدینؑ اور امام محمد باقرؑ نے اموی اور عباسی خلفاء کے خلاف محاذ جنگ نہیں کھولا۔ اسی طرح امام جعفر صادقؑ بھی عباسی خلفاء کے ساتھ جنگ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اگر آپ مذکورہ شق کو فقہ میں داخل کرتے تو آپ کے اور عباسی خلفاء کے درمیان جنگ شروع ہو جاتی، امام جعفر صادقؑ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے درمیان برادر کشی کی جنگ لڑی جائے اس بات سے قطع نظر کہ شیعہ امام کو ایک کامل اور معصوم انسان سمجھتے ہیں۔ امام جعفر صادقؑ اس شق کو فقہ میں اس لئے شامل نہیں کرنا چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے درمیان برادر کشی کی جنگ کے لئے راہ ہموار نہ ہو۔ جیسا کہ تاریخ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ یونان کے سوا کسی دور اور کسی ملک کے آئین میں ۱۳۶۸ء تک کوئی ایسی شق موجود نہ تھی جو ایک غیر صالح حکمران کو معزول کرنے کا موجب بن سکتی۔ قدیم یونان کے بعض شہروں جن میں سے ہر ایک آزاد ملک تھا وہاں قانون کے مطابق ایک غیر صالح حکمران کو جلا وطن کیا جاتا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ ان ریاستوں میں جمہوری نظام حکومت تھا غیر صالح حکمران کو جلا وطن کرنے کے لئے قانون کی منظوری دینے والی پارلیمنٹ کی دو تہائی اکثریت اسے معزول اور جلاوطن کرتی تھی۔ قدیم روم کے قوانین میں جن میں کئی مرتبہ تبدیلی وجود میں لائی گئی ہمیں کسی حاکم کو سینٹ کی وساطت سے معزول کئے جانے کی مثال دکھائی نہیں دیتی۔ بعض اوقات سینیٹر قدیم روم میں حاکم وقت کی مخالفت کرتے تھے جن میں کاتون اصغر کا نام مشہور ہے جس نے قیصر روم کی سخت مخالفت کی اور آخر کار ۴۶ قبل مسیح میں خود کشی کر گیا لیکن کوئی ایسا مخصوص قانون نہیں بنا تھا جس کی مدد سے سینیٹر صاحبان حاکم کو برطرف کرتے (جیسا کہ امریکا کے آئین میں موجود ہے) عیسائی کیتھولک کلیسا کے انیس سو سالہ

دور میں کوئی ایک پوپ بھی ایسا نہیں گزرا جو کسی ایسے قانون کے ذریعے جو عیسائی کلیسا کی فقہ میں شامل ہو برطرف کیا گیا ہو۔ اب تک دو سو اسی پوپ کیتھولک کلیسا کے تخت پر متمکن رہ چکے ہیں اور انیس سو سال کے دوران کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا کہ ان میں سے کوئی ایک بھی عیسائیوں کی طرف سے کسی قانونی اقدام کے ذریعے معزول کیا گیا ہو۔ان میں سے بعض تو اپنے فرائض سے خود سبکدوش ہوئے تھے جبکہ بعض چودھویں صدی عیسوی میں دارالحکومت روم کو چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔

اس طرح انہوں نے آوین یون شہر میں' جو فرانس میں واقع ہے سکونت اختیار کی تھی ان کی کیتھولک کلیسا کی سربراہی سے علیحدگی یا آوین یون میں سکونت کی وجہ یورپ کے بعض بادشاہوں سے ان کی مخالفت تھی اور کیتھولک کلیسا کے قانونی اقدام کے نتیجے میں انہوں نے یہ قدم نہیں اٹھایا تھا۔ کیتھولک عیسائی پوپ کے بارے میں وہی عقیدہ رکھتے تھے۔ جو شیعہ اپنے آئمہ کے بارے میں رکھتے ہیں البتہ شیعہ اپنے آئمہ کے بارے میں وسیع تر عقیدہ رکھتے ہیں'کیونکہ شیعہ اپنے آئمہ کو عام انسان سے زیادہ افضل جانتے ہیں۔ کیتھولک عیسائیوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ جو کوئی ۲۷ کارڈینالوں کی طرف سے کیتھولک مذہب کا سربراہ منتخب ہوتا ہے ہر لحاظ سے اس مقام کے لئے موزوں ہوتا ہے اور گناہ کا ارتکاب نہیں کرتا مگر یہ کہ ماضی میں شیطان کے دھوکے میں آکر اس سے کوئی لغزش سرزد ہوئی ہو۔ کیتھولک کلیسا کی اصولی فقہ لکھنے والوں نے پوپ کو اپنے منصب سے برطرف کرنے والی شق کو نہ صرف یہ کہ اس عظیم مرتبے کی توہین قرار دیا بلکہ اسے عقل کے بھی خلاف شمار کیا ہے چونکہ ان کی عقل کے مطابق پوپ غیر صالح نہیں ہو سکتا کیونکہ ۲۷ خاص الخاص افراد پوپ کا چناؤ کرتے ہیں۔ یونان اور قدیم روم میں چونکہ آئین ساز پارلیمنٹ کے ممبران لوگوں کی طرف سے منتخب ہوتے ہیں لہذا اس بات کا امکان ہے کہ غیر صالح اور عوام کو فریب دینے والے افراد آگے آئیں اور آئین ساز اسمبلی کے ممبر بن جائیں لیکن کارڈینال جو پوپ کا چناؤ کرتے ہیں وہ عوام میں سے نہیں ہوتے کہ عوام کو فریب دینے والے افراد کے جال میں پھنسیں۔ دوسرا یہ کہ ایک پوپ کی موت اور دوسرے پوپ کے انتخاب میں کارڈینالوں کی طرف سے اتنی دیر نہیں کی جاتی کہ وہ کارڈینال جو حقیقی معنوں میں پوپ بننے کا اہل نہیں ہے' پراپیگنڈہ کے ذریعے پوپ بن جائے۔ جب کارڈینال جمع ہوتے ہیں تو تین چیزوں کو نئے پوپ کے انتخاب کا معیار قرار دیتے ہیں۔ تقویٰ ' علم اور جدوجہد۔ پوپ کا مقام ایسا ہے کہ اس مرتبے پر فائز ہونے والا شخص مصمم ارادے کا مالک ہوتا ہے تاکہ اپنے فرائض بخوبی انجام دے سکے۔ بعض کارڈینال ایسے ہوتے تھے جو پوپ کی خصوصیات کے حامل ہوتے تھے لیکن اپنی سست مزاجی کی بنا پر خود تقاضا کرتے تھے کہ انہیں کیتھولک مذہب کی رہبری سے معاف رکھا جائے۔ تجربات سے یہ بات ثابت ہے کہ کیتھولک قانون سازوں کا یہ نظریہ کہ ایک کلیسا کے قانون میں کوئی شق نہیں ہونی چاہئے جس کی وجہ سے ایک غیر صالح پوپ کو معزول کیا جا سکے' چونکہ ایک محدود دور میں ایک

مخصوص خاندان میں کیتھولکی کلیسا کی رہبری رہی ہے اور مشاہدے میں یہ بات آئی ہے کہ ان میں سے کوئی بھی غیر صالح پوپ نہ تھا بعض پوپ زیادہ مذہبی تعصب رکھتے تھے اور بعض کم' ان میں سے بعض زیادہ فراخ دل تھے اور بعض کم۔ پوپ حضرات کا ایک گروہ اول شب عبادت کرنے کو ترجیح دیتا تھا۔ جب کہ دوسرا گروہ آخر شب کو ترجیح دیتا تھا۔ ان میں سے ایک گروہ بیٹھ کر کتاب کا مطالعہ کرنے کو ترجیح دیتا تھا جبکہ بعض دوسرے چلتے ہوئے کتاب کا مطالعہ کرنے کو ترجیح دیتے تھے ان چھوٹی چھوٹی باتوں کے علاوہ خاص طور پر کسی ایک خاندان کے چند پوپ حضرات (مذہبی رہبروں) کو ایسا نہیں پایا گیا جو کیتھولکی مذہب کی رہبری کے لائق نہ ہوں۔ کسی مخصوص خاندان کے چند پوپ حضرات کے علاوہ دوسرے پوپوں کی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ وہ مال جمع کرنے کی فکر نہیں کرتے اور ان میں سے کوئی ایک بھی مادی لالچ نہیں رکھتا۔ جو کوشش و محنت دوسرے لوگ مال جمع کرنے میں کرتے ہیں وہ یہ لوگ کیتھولکی کلیسا کی بنیادیں مضبوط کرنے میں صرف کرتے ہیں۔ انہوں نے کیتھولکی کلیسا کی بنیادیں مضبوط کرنے میں اتنی تگ و دو کی کہ آج کلیسا دنیا کا امیر ترین انسٹی ٹیوٹ بن چکا ہے۔

اگر یہ پوپ عام لوگوں کی طرح شادی کرنے کے مجاز ہوتے اور پھر ان کی اولاد ہوتی تو وہ اس کے مستقبل کی فکر میں لگ جاتے' مگر چونکہ وہ اہل و عیال سے مبرا و منزہ ہوتے ہیں لہٰذا وہ کلیسا کی خوب خدمت کرتے ہیں (۱۷)

جیسا کہ ہم نے تذکرہ کیا ہے' کیتھولکی کلیسا کے رہبران صرف یورپ کے سلاطین سے مخالفت کے نتیجے میں ہی معزول ہوتے تھے حالانکہ یورپ کے سلاطین بھی انہیں برطرف کرنے کے مجاز نہ تھے کیونکہ کیتھولکی کلیسا کی فقہ میں کوئی ایسی بات نہ تھی کہ پوپوں کو برطرف کر سکتے۔ اسی لئے وہ پوپوں کو روم سے دور کر دیتے تھے' یورپ کے بعض سلاطین کی پوپوں کے ساتھ مخالفت کی دو وجوہات تھیں ایک ان کے اثر و رسوخ کو لوگوں میں پھیلنے سے روکنا اور دوسرا کیتھولکی کلیسا کی دولت کو اپنے ہاتھ میں لینا' کیونکہ قدیم زمانے میں کیتھولکی کلیسا کا شمار دنیا کے امیر ترین اداروں میں ہوتا تھا۔

قدیم یونان کی بعض جمہوریاؤں کو چھوڑ کر دوسرے علاقوں میں ایک غیر صالح حکمران کو برطرف کرنے کا قانون موجود تھا اور یہ قانون ۱۳۶۸ء میں انگلستان میں بنایا گیا اور پہلی مرتبہ Impeachment کا لفظ قانون میں داخل ہوا۔ یہ لفظ جیسا کہ ہم جانتے ہیں انگریزی زبان میں پہلے سے موجود تھا لیکن جن معنوں میں آج یہ انگلستان اور ریاست ہائے متحدہ امریکا کے آئین میں استعمال ہوتا ہے پہلے نہیں ہوتا تھا۔ جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہے کہ Impeachment کے معنی کسی پر شدید تنقید کے ہیں۔ یہاں تک کہ اسے الزام لگا کر برطرف کر دیا جائے لیکن جو قانون انگلستان میں بنا حکمران اس کی زد میں نہیں آتے تھے بلکہ صرف وہ لوگ جو اس کے ہمراہ کام کرتے تھے اور اس کے مشیر ہوتے تھے' جن لوگوں نے قانون وضع کیا ان کا عقیدہ تھا یا انہوں نے یہ ظاہر کیا کہ

ان کا عقیدہ ہے کہ حکمران ہرگز ایسا کام نہیں کرتا جو غلط اور قابل مواخذہ ہو اور چونکہ اس حاکم کے رفقا اور مشیر اسے غلط کام انجام دینے پر اکساتے ہیں لہٰذا انہیں Impeachment کی زد میں آنا چاہئے (۷۲)

# امام جعفر صادقؑ کے معجزات اور شیعہ عقائد کی ایک جھلک

چونکہ ہم امام جعفر صادقؑ کی سوانح حیات رقم کر رہے ہیں اس لئے اس ضمن میں ضروری ہے کہ آپ کے معجزات کے بارے میں شیعوں کا جو عقیدہ ہے' اسے بھی مختصراً" بیان کیا جائے۔ اگرچہ عام تاریخی نقطہ نگاہ سے یہ روایات قابل قبول نہیں لیکن منقول روایات کا جزو ضرور ہیں۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے' کوئی مورخ اور محقق اگر عقل عام کا مخالف نہ ہو تو وہ منقول روایات کو تسلیم نہیں کرتا۔ بہرکیف تحقیق کے حوالے سے ان کے معجزات کا مختصراً" ذکر کرنا ناگزیر ہے۔ ہم آپ کے معجزات کو اختصار کے ساتھ درج کر رہے ہیں تاکہ ایک یورپی قاری کو ایسے بیسیوں غیر معمولی واقعات کے بارے میں بھی آگہی حاصل ہو جنہیں عقل تسلیم نہیں کرتی (۷۳)۔ کیونکہ یورپی قاری چند واقعات کا مطالعہ کر ہی لیتا ہے جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ کی سوانح حیات کے ضمن میں ان کے دو یا تین معجزات کو پڑھتا ہے اور اگر عیسائی ہو تو ان معجزات پر یقین بھی کرتا ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کی سوانح حیات کی تخلیق پر کام کرنے والوں میں ایک فرانسکو گابریلی ہے جو روم یونیورسٹی کا پروفیسر اور حضرت محمد ﷺ کی سوانح حیات Biography کا مصنف ہے۔ یہ شخص کٹر عیسائی ہونے کے ناطے معتقد ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے لازاروس کو اس کی موت کے تین دن بعد زندہ کیا تھا (۷۴)۔

اسی لئے پیغمبر اسلام ﷺ کی سوانح حیات کا یہ مصنف شیعوں کے امام جعفر صادقؑ کے معجزات کے بارے میں تنقید نہیں کرتا (۷۵)۔ تمام قدیم مذاہب میں معجزے کا تصور ابد سے رہا ہے۔ اگر کوئی شخص معجزہ نہ دکھا سکتا ہو تو اسے پیغمبر نہیں سمجھا جاتا تھا۔ یعنی پیغمبر اور معجزے کو لازم و ملزوم خیال کیا جاتا تھا۔ اٹھارہویں صدی کے بعد جن لوگوں نے یورپ اور خصوصاً" امریکہ میں پیغمبری کا دعویٰ کیا ان سے کسی نے معجزہ طلب نہیں کیا۔ اس بناء پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اٹھارہویں صدی کے بعد پیغمبری کا دعویٰ کرنے والے لوگ سابق انبیاء کی نسبت زیادہ خوش قسمت تھے کیونکہ ان کی باتیں تو سنتے تھے لیکن ان سے کسی معجزے کی توقع نہیں رکھتے تھے۔ یہاں اس نکتے کو مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ معجزہ ان مذاہب میں عام ہوا جو مغربی ایشیا میں ظاہر ہوئے۔ جبکہ مشرقی اور جنوبی ایشیا میں معجزے نام کی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ قدیم ہندوستان' جاپان اور چین میں نمودار ہونے والے مذاہب میں معجزے کا کوئی وجود نہ تھا اور ان ادیان کے پیروکار اپنے پیغمبروں سے معجزے کی توقع نہیں رکھتے تھے یا یہ نہیں کہتے تھے کہ آپ معجزہ دکھائیں تو ہم آپ پر ایمان لائیں گے۔ ایک فرانسیسی شخص رینان یورپین

مفکرین میں سے وہ پہلا شخص تھا جس نے اس بات کی طرف دھیان دیا کہ مشرق اور جنوبی ایشیا کے مذاہب میں معجزے کا مسئلہ نہیں پایا جاتا تھا جبکہ مغربی ایشیا کے مذاہب میں یہ مسئلہ موجود ہے۔ رینان کا خیال ہے کہ مشرقی اور جنوبی ایشیا کے مذاہب کے پیروکار کے اپنے پیغمبروں سے معجزہ طلب نہ کرنے اور مغربی ایشیاء کے مذاہب کے پیروکاروں کی اپنے پیغمبروں سے معجزہ طلب کرنے کی وجہ معاشروں میں فرق ہے۔ چین' جاپان اور ہندوستان میں گھریلو اور قومی سطح پر تربیت ایسی ہوتی تھی کہ یہ لوگ اپنے رہنماؤں اور پیغمبروں کی بات سنتے تھے اور اپنے پیغمبروں کو برحق تسلیم کرنے کے لئے ان سے معجزے کی توقع نہیں رکھتے تھے۔

لیکن مغربی ایشیاء کی اقوام کی خاندانی یا قومی سطح پر ایسی تربیت نہیں ہوتی تھی اور یہ لوگ اپنے پیغمبروں کے پیغمبری رجحان کا اندازہ لگا کر ہی ان کی پیغمبری کو تسلیم کرتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ پیغمبر جنھوں نے مغربی ایشیاء میں ظہور کیا وہ معجزہ دکھانے پر مجبور تھے لیکن جاپان' چین اور قدیم ہندوستان میں لوگ پیغمبروں کے کلام اور وعظ و نصیحت سے ہی ان کی طرف کھنچے چلے جاتے تھے اور وہ پیغمبر جو جاپان' چین اور ہندوستان میں ظاہر ہوئے تھے آج ان کا کلام ہمیں معمولی نظر آتا ہے' جس کی وجہ یہ ہے کہ حالیہ زمانوں میں ثقافت کی توسیع کے نتیجے میں ہر جگہ لوگوں کی فکری سطح بلند ہو گئی ہے اور لوگوں کی سوچ پہلے سے زیادہ ترقی پا گئی ہے۔ ہندو مذہب کی کتاب "رگ وید" کے مطالب آج ہماری نظر میں معمولی ہیں صرف کتاب کا اسلوب سادہ ہے اور اسلاف کی لکھی ہوئی ہے ورنہ اس کتاب کا مضمون ہمارے لئے کسی خاص اہمیت کا حامل نہیں لیکن ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ ماکس میولر (ایک جرمن) کے بقول جو اس کتاب کا مترجم ہے سینکڑوں سال پہلے یا شاید اس سے بھی زیادہ عرصہ قبل یہ کتاب سینہ بہ سینہ منتقل ہوئی تھی اور قدیم ہندوستان کے روحانی پیشوا کتاب کے مضمون کو جو پچاسی ہزار الفاظ پر مشتمل ہے زبانی یاد کر کے اسے دوسروں کے لئے بیان کرتے تھے تاکہ وہ بھی حفظ کر سکیں۔ ہندوستان کے انسان کی چار ہزار سال پہلے کی معلومات اور سوچ کی سطح کچھ زیادہ بلند نہیں تھی۔ اسی لئے اس کتاب کے مضامین اس پر اثر کرتے تھے۔ لہٰذا یہ ضروری تھا کہ یہ کتاب جس قدر سادہ ہو بہتر ہے تاکہ سننے والوں پر اثر کرے۔ مثال کے طور پر صبح کے وقت سورج کے طلوع ہونے کی تعریف "رگ وید" میں اس قدر سادہ بیان کی گئی ہے کہ یوں لگتا ہے یہ مضمون پرائمری سکول کے بچوں کی کتابوں سے اقتباس کیا گیا ہے' اسی طرح دریا میں پانی کا چلنا اور درختوں کی شاخوں کا ہوا کے ہلنے سے حرکت کرنا اس قدر سادگی سے لکھے گئے ہیں کہ یوں لگتا ہے جیسے یہ مضامین کسی ابتدائی سکول کے بچوں کے لئے رقم کئے گئے ہیں اور بے شک اسی سادگی کے نتیجے میں اس کتاب نے کئی ہزار سال پہلے لوگوں کے ذہن پر اثر کیا اور آج ہم ان مضامین کو میکس میولر (۷۷) کے ترجمے کے ساتھ پڑھتے ہیں تو ہمیں اسے سمجھنے میں ذرا بھی دشواری پیش نہیں آتی۔ رینان کہتا ہے کہ جاپان' چین اور ہندوستان کے لوگ فطرت کے شاہکاروں پر گہری نظر رکھتے تھے۔ جبکہ مغربی ایشیاء کے لوگ اتنی گہری نظر

نہیں رکھتے اور اہل مناظر بھی نہیں تھے کہ نظارے کے ذریعے کوئی چیز کشف کرتے۔ وہ لوگ تو صرف مادی احساسات کے حامل تھے اس کے علاوہ کسی دوسری چیز سے واقف نہ تھے۔ (۷۸)

ایسے تواریخی شواہد موجود ہیں جن کے ذریعے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ عبرانی لوگ جن کے درمیان حضرت موسیٰؑ پیغمبر بنا کر بھیجے گئے اور فلسطینی لوگ جن میں دین عیسیٰؑ نے ظہور کیا اور اسی طرح جزیرہ عرب کے لوگ جہاں اسلام پھیلا، یہ تمام کے تمام مادی نقطہ نگاہ رکھتے تھے اور مادی جذبات سے بڑھ کر کسی چیز کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ان میں صرف اعراب ایسے تھے جنہیں ادب کے ساتھ لگاؤ تھا اور شعر پسند کرتے تھے اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ روحانی لحاظ سے بہت برتر تھے جبکہ دوسری اقوام کی سوچ کا دائرہ کھانے اور سونے تک محدود تھا۔ رینان کہتا ہے کہ مختلف قرائن جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اعراب کی فکری سطح عبرانیوں اور فلسطینیوں سے بلند تھی ان میں سے ایک قرینہ یہ ہے کہ قرآن میں علم کا تذکرہ کیا گیا ہے لیکن تمام عہد نامہ عتیق میں اس کے ضمیموں کے سوا علم کے بارے میں کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ بہرکیف قرآن میں نیکوکاروں کی پاداش کا وعدہ دوسرے جہاں میں کیا گیا ہے۔ جس میں انسان کو کھانے پینے کی اشیاء اور دوسری جسمانی لذتیں میسر آئیں گی کیونکہ عربی بدو کسی دوسرے صلے کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ جب قومیں اس قدر محدود مادی سوچ و فکر رکھتی ہوں تو ان کے لئے ایسے پیغمبر کا وجود ناگزیر ہے جو معجزہ دکھا سکے تاکہ لوگ اس کی طرف مائل ہوں لہٰذا اسی لئے جب موسیٰؑ اور عیسیٰؑ نے پیغمبری کا دعویٰ کیا تو انہیں اپنی پیغمبری ثابت کرنے کے لئے لوگوں کو معجزات دکھانے پڑے۔ لیکن پیغمبر اسلامؐ کو اس طرح کی کوئی مجبوری پیش نہیں آئی کیونکہ عربی بدوؤں نے کسی حد تک عالم روحانی سے آشنا ہونے کی وجہ سے محمدؐ سے معجزہ طلب نہیں کیا۔ آج ایک روشن خیال شیعہ امام جعفر صادقؑ سے معجزہ طلب نہیں کرتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ آپ کا سب سے بڑا معجزہ آپ کا علم ہے جو زہد و تقویٰ سے آراستہ ہے۔ (۷۹)

جیسا کہ ہمیں معلوم ہے رینان ایک عیسائی ہے لہٰذا ہم حضرت عیسیٰؑ کی دیانت کی نسبت اس کے مخلصانہ عقیدے پر کوئی شک نہیں کر سکتے۔ جس کی دلیل رینان کی وہ کتاب ہے جس میں اس نے حضرت عیسیٰؑ کی سوانح حیات کو مفصل پیرائے میں رقم کیا ہے۔ یہ کتاب اب بھی ویٹیکن میں موجود ہے اور ویٹیکن نے اپنی تمام مذہبی یونیورسٹیوں کو حکم نامہ جاری کیا کہ اس کتاب کو پڑھا کر اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا جائے۔ عیسائی کیتھولک کلیسا میں یہ بات کم ہی دیکھنے میں آئی ہے کہ عیسیٰ کی دیانت کے متعلق مذہبی رہنما کے علاوہ کسی اور شخص نے کوئی کتاب لکھی ہو جسے کیتھولک کلیسا کی تنظیم نے منظوری کے بعد اپنی مذہبی درسگاہوں میں اسے پڑھانے کی تاکید کی ہو۔

لہٰذا اس بنا پر ہم رینان کو اس بات کا ملزم نہیں ٹھہرا سکتے کہ اس نے اپنی مذہبی کتابوں کی اہمیت کو کم کرنے

کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ جو کچھ وہ کہتا ہے عہد عتیق کے بارے میں ہے اور عہد نامہ عتیق عبرانیوں کی کتاب ہے جب کہ عیسائیوں کی کتب صرف چار انجیلیں ہیں جن کا مجموعہ عہد نامہ جدید کہلاتا ہے۔ رینان کے بقول جب عبرانی علماء نے اس پر غور کیا کہ عہد عتیق میں کسی قسم کی علمی بحث موجود نہیں تھی تو انہوں نے مزید کتابیں لکھنے اور اس کو عہد عتیق میں شامل کرنے کی طرف توجہ کی۔ تاکہ علمی نقطہ نگاہ سے اس کی اہمیت میں اضافہ ہو۔ یہ کتابیں اصلی عہد نامہ عتیق جو پانچ کتابوں پر مشتمل ہے' کے علاوہ ہیں۔ رینان مشرقی اور جنوبی ایشیا کے مذاہب میں معجزے کے مسئلے کے بارے میں بحث کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ ایشیا کے مغربی مذاہب معجزے کے بغیر فروغ نہیں پا سکے تھے کیونکہ لوگوں کی فکری سطح اس قدر بلند نہ تھی کہ وہ صرف پیغمبر کا کلام سن کر اس کے گرویدہ ہو جاتے اور اس کے دین کو قبول کر لیتے۔

لیکن رینان اس موضوع کے بارے میں خاموش ہے کہ کیا مغربی ایشیا کے مذاہب لانے والے پیغمبر جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے معجزہ دکھا سکتے تھے یا نہیں ؟ وہ اس پر بھی غور نہیں کرتا کہ اعجاز کا عقلی اور منطقی لحاظ سے تجزیہ کرے۔ وہ اپنی خاموشی سے یہ ظاہر کرتا ہے کہ اعجاز کو بطور عبادت قبول کرنا چاہیے۔

لیکن قدیم زمانے میں' اسی سبب سے جس کا اوپر ذکر آیا ہے لوگ امام سے معجزے کی توقع رکھتے تھے اور بعض روایات کے مطابق امام جعفر صادقؑ نے بھی کئی معجزے دکھائے ہیں۔ ایسی ہی روایات کے ایک راوی ابن علبہ سے مروی ہے کہ ہم امام جعفر صادقؑ کے ہمراہ کوہ صفا کے سامنے کھڑے تھے ایک طرف سے خانہ کعبہ دکھائی دیتا تھا۔ ہم میں سے ایک شخص نے امام جعفر صادقؑ سے مخاطب ہو کر کہا کیا یہ درست ہے کہ آپ نے فرمایا ہے ایک مسلمان مومن اس خانہ کعبہ (خانہ کعبہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) سے بہتر ہے ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ہاں یہ بات درست ہے کیونکہ ایک مسلمان مومن کی خداوند تعالیٰ کے نزدیک اتنی قدر و منزلت ہے کہ اگر وہ اس پہاڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہے کہ اے پہاڑ میرے قریب آ ! تو یہ پہاڑ قریب آ جائے گا۔ جونہی آپ کے لب مبارک سے یہ الفاظ نکلے' ہم نے دیکھا کہ پہاڑ نے حرکت کی اور ہمارے قریب آگیا' امام جعفر صادقؑ نے پہاڑ سے مخاطب ہو کر کہا میں نہیں چاہتا تھا کہ تو نزدیک آئے۔ اس پر وہ پہاڑ ایک گرجدار آواز کے ساتھ واپس ہوا اور واپس اپنی جگہ پر کھڑا ہو کر پہلے کی طرح ساکن ہو گیا اس سے قبل کہ آپؑ کے تمام معجزات کا تذکرہ کریں (جن پر شیعوں کا ایمان ہے) تاکہ آپ کے معجزات کا شیعوں کی آنکھ کے دریچے سے تحلیل و تجزیہ کر سکیں' یہ بات بتاتے چلیں کہ امام جعفر صادقؑ مسلمان رہنماؤں میں سے وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مسلمانوں کو علم کے ذریعے خداوند تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنے کی جانب توجہ مبذول کروائی۔

آپ نے لوگوں کو خداوند تعالیٰ کی معرفت دلانے کے لئے نہ صرف احکام دین پر اکتفا کیا بلکہ علم سے روشناس کرانے کی ہر ممکن سعی کی تاکہ لوگ جس دنیا میں رہ رہے ہیں اس کے متعلق ان کی معلومات میں اضافہ

ہو اور دنیاوی حقائق کو جان کر اس بات کے قائل ہوں کہ کسی دانا نے اس دنیا کو پیدا کیا اور وہ اس دنیا کو مستقل قوانین کے ذریعے چلا رہا ہے۔ آپ جانتے تھے کہ ایک محدود اور نادان سوچ' ایک محدود اور نادان خدا کی ہی پوجا کر سکتی ہے اور جتنا ایک انسان کا ایمان مضبوط ہوگا' خدا کے بارے میں اس کا عقیدہ بھی اتنا ہی بلند اور مضبوط ہوگا۔ خدا کے بارے میں ایک دانشمند اور مفکر شخص کا عقیدہ ایک نادان سے کہیں زیادہ بلند اور مضبوط ہوتا ہے۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کا انکار کرتے ہیں یا وہ لوگ جنہیں اس بارے میں شک و شبہ ہے دونوں جاہل ہیں کیونکہ جو شخص عالم ہوگا محال ہے وہ خداوند تعالیٰ کے وجود کا قائل نہ ہو۔ کیونکہ علم محدود نہیں لہٰذا جتنا کسی کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اسے خدا کی پہچان اتنی زیادہ ہونے لگتی ہے' امام جعفر صادقؑ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کو نہ صرف بنی نوع انسان پہچانتے ہیں بلکہ کائنات کی تمام مخلوقات اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتی ہے۔ مختصر یہ کہ جس طرح ایک نادان اور دانا کی خدائی شناخت میں فرق ہے اسی طرح کائنات کی مختلف مخلوقات کی بھی خدائی پہچان میں فرق ہے۔ البتہ کائنات کا ہر گروہ خداوند تعالیٰ کے بارے میں مساوی معرفت رکھتا ہے۔

اس نظریہ کی بنیاد پر جانور اور حتیٰ کہ نباتات بھی خدا کی معرفت رکھتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ ان کا معیار معرفت توحید پرست انسانوں جیسا ہو۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا خداوند تعالیٰ کا انکار جہالت کی علامت ہے اور عالم ضرور خداوند تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہے اگرچہ وہ خالق کے لئے خدا کے علاوہ اور کسی نام کا انتخاب کرلیتا ہے اسی طرح جیسے امام جعفر صادقؑ نے درک کیا' دنیا کی مختلف اقوام نے خدا کے لئے جن ناموں کا انتخاب کیا یا کر رہے ہیں ان میں فرق ہے۔ لیکن انسان ہرگز خداوند تعالیٰ پر ایمان سے بری نہیں ہو سکتا حتیٰ کہ خداوند تعالیٰ کے وجود کے منکر بھی کسی ایسی دوسری چیز پر ایمان رکھتے ہیں جو ان کی نظر میں خدا ہوتی ہے۔ اگرچہ خود انہیں اس بات کا شعور نہ ہو۔ جولیس اشترایخر (۸۰) ایک معروف نازی اس بات پر فخر کرتا ہے کہ خداوند تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتا جبکہ وہ اس بات سے غافل ہے کہ وہ خدا کا معتقد ہے اور پرنیپ الاصل (نسلی برتری) اس کا خدا ہے۔ انسان جب پہلی مرتبہ آسمانی بجلی کی آواز سنتا ہے تو کانپتا ہے اور غار کی طرف دوڑتا ہے اور سورج' چاند و ستاروں کی پرستش کرتا ہے۔ جبکہ توحید پرست مذاہب کے ماننے والے خدائے واحد کی پرستش کرتے ہیں۔ جب سے یہ دنیا وجود میں آئی ہے اسی وقت سے لے کر آج تک مشرق و مغرب کے تمام مذاہب ایک لحاظ سے ایک دوسرے کی شبیہہ تھے اور ہیں اور یہ کہ تمام کے تمام ایک اصل کے معتقد ہیں۔ گزرے ہوئے زمانے یا آج کی دنیا میں خداوند تعالیٰ پر ایمان مادی شکل میں نہیں تھا اور نہ ہی ممکن ہے کہ خداوند تعالیٰ پر عقیدے سے بعض افراد کے مادی مفادات وابستہ

ہوں لیکن خود یہ عقیدہ اصل (خالص) ہے۔

اس حقیقت کو تسلیم کرنا چاہیے کہ جس طرح انسان دس لاکھ سال پہلے چار ہاتھ اور پاؤں سے چلتا تھا اور اس کی عمر میں وہ مرحلہ ہرگز نہیں آتا تھا کہ اس کے دانت خراب ہو جاتے اس وقت بھی اسے خدا پر عقیدے کی ضرورت تھی اور آج کا انسان جو چاند پر پہنچ چکا ہے اسے بھی خدا پر ایمان لانے کی ضرورت ہے۔ (۸۱)

المختصر یہ کہ ہر قوم کے لئے خدا مختلف قسم کا ہے۔ بعض قوموں میں لوگوں کے ہر گروہ یا ہر شخص کے لئے خدا کی قسم جداگانہ ہے لیکن کوئی بھی ایسا انسان نہیں جو خدا پر ایمان نہ رکھتا ہو اگرچہ مادہ پرستوں کی طرح اس کے خدا کی ابتدا ہے نہ انتہا۔ جب قوموں یا افراد کے عقیدے کے مطابق خداؤں کی اقسام میں فرق ہو تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ خدا کے ناموں میں بھی فرق ہو۔ خداوند تعالیٰ کا جدید ترین نام گریویڈ ہے یہ لفظ فرانسیسی زبان کے گراویۃ اور انگریزی کے لفظ گریویٹی (Gravity) سے لیا گیا ہے۔ یعنی قوت جاذبہ (Gravitational force) جس طرح الیکٹران کو برقی توانائی کا ایک ذرہ خیال کیا جاتا ہے اسی طرح گریو۔یین 'کو بھی کشش کی قوت کا ایک ذرہ مانا جاتا ہے اور جدید مذہبی فرقے (گریویٹی) کے حامیوں کا کہنا ہے کہ دنیا کا خدا جو اس کائنات کو پیدا کرنے والا اور اس کا محافظ ہے وہ گریو۔یین ہے۔ کیونکہ کائنات میں گریو۔یین سے زیادہ طاقتور اور تیز رفتار کوئی چیز نہیں اور گریو۔یین ایک سیکنڈ میں کائنات کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچتا ہے اور پھر واپس آتا ہے' جس کا فاصلہ بقول آئن شائن تین ہزار ملین نوری سال ہے۔ جبکہ آج معلوم ہو چکا ہے کہ یہ فاصلہ اس سے بھی زیادہ ہے جبکہ برقی مقناطیسی طاقت (Electro Magnetic force) یعنی ریڈیو و ٹیلی ویژن کی قوت اسی فاصلے کو چھ ہزار ملین نوری سال میں طے کرتی ہے' جو لوگ گریویٹی مذہب کے پیروکار ہیں ان کے لئے کائنات کا خالق اور اس کا نظام چلانے والا گریو۔یٹن Graviton ہے۔ اور وہ لوگ جو امام جعفر صادقؑ کے زمانے میں دہریئے تھے وہ دہر کو دنیا کا خالق اور نظام چلانے والا سمجھتے تھے وہ خدا کے دین اسلام پر ایمان نہیں لائے تھے یعنی اسلام کے اصول دین پر ان کا عقیدہ نہ تھا۔ وہ لوگ جو آج گریویٹی مذہب کے پیروکار ہیں وہ عیسائی مذہب کے خدا کی عبادت نہیں کرتے کیونکہ وہ تثلیث کے قائل نہیں ہیں۔ لیکن وہ دہریہ خدا پرست تھا جس طرح گریویٹی مذہب کا یہ پیروکار خدا پرست ہے۔ اگر ہم خدا کے لحاظ سے دہریے کے دہر پر عقیدے کا گریویٹی مذہب کے گریویٹن سے موازنہ کریں تو معلوم ہو گا کہ شناخت کے لحاظ سے گریوٹین کو خدا ماننے والا دہریے کی نسبت برتر ہے کیونکہ وہ اپنے خدا کو دہریے کے خدا کی نسبت بہتر سمجھتا ہے (۸۲) جو شخص آج گریوٹین کو خدا سمجھتا ہے اس کا عقیدہ ہے کہ گریویٹن کم از کم اس نظام شمسی میں سب سے طاقتور اور تیز رفتار قوت ہے۔
چونکہ آج تک تجربات سے یہ بات ثابت نہیں ہو سکی کہ قوت جاذبہ نظام شمسی سے باہر عمل کرتی ہے یا نہیں' یہ قوت ایک لمحے میں نظام شمسی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جا پہنچتی ہے اور پھر واپس لوٹ آتی

ہے اور کوئی چیز اس کا راستہ نہیں روک سکتی۔ یہ قوت سورج (جس کا درجہ ۲۰ ملین درجے سے بھی زیادہ ہے) کے سینے کو چیر کر اسی طرح پار چلی جاتی ہے جس طرح یہ ستارون کے درمیانی فاصلوں کو جہاں پر درجہ حرارت مطلق صفر ہوتا ہے عبور کرتی ہے کسی آلے کے ذریعے اس گریویٹیشن کا راستہ تو تبدیل کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے راستے میں رکاوٹ نہیں ڈالی جا سکتی۔ اور گریوٹین جس طرح لوہے کی دیوار سے گزرتی ہے اسی طرح شیشے کی دیوار بھی عبور کر لیتی ہے۔ گریویٹیشن انسانی خون کے ہر ذرے میں موجود ہے جس طرح سورج اور نظام شمسی کے دوسرے تمام کرہ جات میں موجود ہے۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ یہ قوت دوسرے نظام شمسی اور دوسری کہکشاؤں میں بھی پائی جاتی ہے۔ جو لوگ اس بات کے معتقد ہیں کہ گریویٹیشن خدا ہے وہ اس بات سے آگاہ ہیں چونکہ گریویٹیشن نہایت تیز رفتار ہے لہٰذا یہ دنیا کے ہر کونے میں موجود ہے اور کائنات کی مخلوقات پر اس کی حفاظت کا (کم از کم نظام شمسی پر) اتنا گہرا اثر ہے کہ اگر قوت جاذبہ Gravitational force ایک لمحے کے لئے معطل ہو جائے تو نہ صرف اجسام کے مالیکیول ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے بلکہ ہر مالیکیول کے اندر پائے جانے والے ایٹم (۸۴) بھی ایک دوسرے سے کٹ جائیں گے اور اس طرح الیکٹران بھی اپنے مرکز سے جدا ہو جائیں گے جس کے نتیجے میں وہ مادہ جو ٹھوس یا مائع یا گیس کی حالت میں موجود ہے فنا ہو جائے گا بلکہ سادہ الفاظ میں یوں کہیں کہ یہ دنیا جو موجودہ شکل میں نظر آ رہی ہے۔ کم از کم نظام شمسی میں باقی نہیں رہے گی۔ یہ کام صرف ایک سیکنڈ میں مکمل ہو جائے گا اور کوئی بھی المیہ اس کائنات میں اس سے بڑا نہیں کہ قوت تجاذب Gravitational Force ایک سیکنڈ کے لئے قطع ہو جائے کیونکہ جس لمحے یہ قوت قطع ہو گی اسی لمحے نہ صرف مادہ فنا ہو جائے گا بلکہ توانائی بھی فنا ہو جائے گی کیونکہ توانائی کی بقا کا انحصار قوت تجاذب پر ہے جن لوگوں کا گریویٹیشن کے خدا ہونے پر اعتقاد ہے انہیں اس بات کا علم ہے کہ مادہ قوت تجاذب کے بغیر باقی نہیں رہ سکتا جس طرح توانائی اس کے بغیر باقی رہ سکتی انہیں اس بات کا علم نہیں کہ گریویٹیشن کیا ہے؟ جس طرح انہیں اس بات کا بھی علم نہیں کہ برقی توانائی کیا ہے؟ لیکن چونکہ اس فرقے کا پیروکار برقی قوت سے فائدہ اٹھاتا ہے لہٰذا اس پر ایمان رکھتا ہے اسی طرح گریویٹیشن پر بھی ایمان رکھتا ہے جو لوگ گریویٹیشن کو خدا مانتے ہیں انہیں تجاذب کے قانون کا علم ہے جبکہ جو لوگ ساڑھے بارہ سو سال پہلے دہر کو خدا سمجھتے تھے وہ دہر کے قانون سے واقف نہ تھے۔ اور صرف جذبات کی حد تک آگاہی رکھتے تھے مثلاً "موسموں کی تبدیلی وغیرہ آج جو لوگ گریویٹیشن کو اس کائنات کا خالق اور نظام چلانے والا خیال کرتے ہیں انہیں اس بات کا بخوبی علم ہے کہ مادے اور توانائی کا راز گریویٹیشن میں ہے اور اگر کوئی یہ جاننا چاہے کہ مادہ اور توانائی Energy کیسے وجود میں آئے ہیں تو اسے سب سے پہلے گریویٹیشن کے بارے میں جاننا چاہئے کہ یہ کیا ہے؟ اور کیسے وجود میں آیا؟

اگر یہ راز معلوم ہو جائے تو مادہ اور توانائی کے وہ تمام راز جو پرانے زمانے میں جسم اور روح کہلاتے تھے

ظاہر ہو جائیں گے یونانی فلاسفہ نے حرکت پر روح کا اضافہ کیا اس کے بعد مادہ یا جسم کا راز ایک ہی ہو گیا۔ یہاں اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ گریویٹی مذہب کے پیروکاروں کے عقیدے کے مطابق گریویٹیشن خداوند ہے یا یہ کہ قوت تجاذب کائنات کی سب سے بڑی قوت ہے ممکن ہے فزکس کے لحاظ سے (نہ کہ مذہبی لحاظ سے) یہ بات حقیقت پر مبنی نہ ہو۔ سادہ الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ فزکس قوت تجاذب کو کائنات کی سب سے بڑی قوت سمجھتی ہے لیکن چونکہ بنی نوع انسان نظام شمسی سے باہر فزکس کے قوانین سے اچھی طرح مطلع نہیں ہے لہٰذا یقین سے یہ بات نہیں کہی جا سکتی کہ قوت تجاذب کائنات کی سب سے بڑی قوت ہے اور کائنات کو تخلیق کرنے والی واحد قوت شمار کی جاتی ہے اور دوسری تمام قوتیں اس قوت کی پیداوار ہیں شاید ایک دن انسان دوسرے نظام ہائے شمسی کے قوانین فزکس تک رسائی حاصل کرے اور یہ نتیجہ نکالے کہ قوت تجاذب کائنات کی فرعی قوتوں میں سے ایک ہے اور اصلی قوت کوئی اور ہے اور شاید اسی طرح ایک دن ایسا آئے کہ تمام قوانین فزکس بنی نوع انسان کو ایک منفی یا مثبت فلم (پکچر) نظر آنے لگیں جو آج ہمیں نظر نہیں آتے اور فزکس کا ہر قانون مضاعف ہے یعنی دو قوانین میں سے ہر ایک دوسرے قانون کا سایہ یا عکس شمار کیا جاتا ہے اور ہم اپنی دنیا میں ان دو میں سے ایک کو دیکھتے ہیں اور دوسرا جو شاید فلم کا اصلی نسخہ ہے نہیں دیکھ پاتے۔ اس بات کو ذہن میں لانا ضد مادہ کی تلاش ہے اور یہ وہ مادہ ہے جس کے ایٹموں میں الیکٹرانوں پر مثبت چارج اور پروٹانوں پر جو ایٹم کے اندر پائے جاتے ہیں منفی چارج ہے آج تک کسی کو یہ بات معلوم نہیں کہ جو عناصر ضد مادہ سے وجود میں آئے ہیں (اگر وجود میں آئے ہوں) وہ کون سے ہیں اور ان کے طبیعیاتی اور کیمیائی خواص کیا ہیں۔ چونکہ جب ضد مادہ کے ایٹم پر غور کیا گیا تو یہ سوال اٹھا کہ شاید ایک اور قسم کا ایٹم موجود ہو جس کے ایٹموں کی اقسام پر برقی بار کسی اور شکل میں ہو۔ اس کے باوجود کہ ہمارے نظام شمسی میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ قوت تجاذب دوسری قوتوں کی نسبت برتر ہے پھر بھی ہم یہ بات یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ کیا قوت تجاذب سب سے بڑی قوت اور اس کائنات کی اصل قوت ہے یا فرعی قوت ہے؟ گریویٹی مذہب کے پیروکار جو گریویٹیشن کو اس کائنات کا خدا مانتے ہیں۔ ان کی دانائی خدائی عقیدے کے لحاظ سے ان دہریوں کی نسبت زیادہ ہے جو امام جعفر صادقؑ کے زمانے میں پائے جاتے تھے اور دہر کو خدا سمجھتے تھے اگرچہ آخر میں معلوم ہوا کہ جو لوگ گریویٹی مذہب کے پیروکار ہیں۔ انہوں نے قدیم دہریوں کی مانند غلطی کی ہے اور خدا نہ تو گریویٹیشن ہے اور نہ دہر۔ جن لوگوں نے آج گریویٹیشن کو خدا مانا ہے انہوں نے قدیم دہریوں کی نسبت زیادہ جدوجہد کی ہے۔ شاید یہ کہا جائے کہ جو لوگ آج گریویٹی مذہب کے پیروکار ہیں۔ انہوں نے خدا کی معرفت حاصل کرنے کے لئے خود جدوجہد نہیں کی بلکہ دوسروں کی جدوجہد کی وجہ سے انہوں نے گریویٹیشن کو پہچانا ہے یعنی اہل علم حضرات نے اس ضمن میں تکلیف اٹھائی ہے اگرچہ وہ خود اس کو خدا نہیں سمجھتے لیکن اس سے گراویٹی مذہب کے پیروکاروں کے عقیدے میں کوئی فرق نہیں

پڑتا کیونکہ انسان یا تو اپنی جدوجہد سے خدا کو پہچانتا ہے یا دوسروں کی کوششوں کو بروئے کار لاتا ہے۔ محقق کا مطمح نظر یہ ہے کہ علم حاصل کرنا خدا کی معرفت حاصل کرنے میں مدد دیتا ہے اور آدمی اپنی محنت سے علم حاصل کرتا ہے یا پھر دوسروں سے کسب فیض کرتا ہے اور نوابغ روزگار شخصیتیں جو علم کو کشف کرتی ہیں ان کے علاوہ دوسرے تمام عام افراد دوسروں سے علم حاصل کرتے ہیں جس طرح امام جعفر صادقؑ اپنے زمانے میں ایک نابغہ شخصیت تھے اور شیعہ اور دوسرے اسلامی فرقوں کے پیروکار آپ سے علم حاصل کرتے تھے۔ امام جعفر صادقؑ نے شیعہ مذہب کی ثقافت کی بنیاد صرف ایمان پر نہیں رکھی بلکہ علم کو شیعہ مذہب کی ثقافت کا ایک طاقتور رکن قرار دیا۔ انہوں نے جس طرح شیعہ مذہب کی بقا کی بنیاد رکھی وہ ان کا ایمان تھا اور ان کے ایمان کی دلیل یہ ہے کہ زندگی کے آخری دن تک وہ درس و تدریس میں مشغول رہے اور وہ علوم جنہیں وہ جانتے تھے بلا معاوضہ دوسروں کو سکھاتے تھے۔ وہ نہ صرف یہ کہ مفت تعلیم دیتے تھے بلکہ اپنے مال سے ان شاگردوں میں سے ان افراد کی مالی مدد بھی کرتے تھے جنہیں اس کی ضرورت ہوتی تھی اور کسی شاگرد کو اس بات کا علم بھی نہ ہوتا تھا کہ آپ نے فلاں کی مالی مدد کی ہے۔ آپ اپنی رقم سے کتاب خریدتے تھے اور شاگردوں کے حوالے کر دیتے تھے اگر کتاب کا ایک نسخہ ہوتا اور یہ کتاب تمام شاگردوں نے پڑھنی ہوتی تو آپؑ چند کاتبوں کو معاوضہ دے کر مزید نسخوں کی صورت میں تیار کرا لیتے تھے اور جب ہم نے ابن راوندی کا تذکرہ کیا تو ہم نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ کاتب کس طرح ایک کتاب کے قلیل مدت میں کئی نسخے تیار کر لیتے تھے۔ چونکہ امام جعفر صادقؑ کے حلقہ درس میں ایسے علوم پڑھائے جاتے تھے جو اس سے پہلے مسلمانوں میں رائج نہ تھے اور دوسری قوموں نے ان علوم پر کتابیں لکھی تھیں۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ یہ کتابیں عربی میں ترجمہ کی جائیں تاکہ وہ طالب علم جو دوسری زبانوں سے آشنا نہیں ہیں ان کتابوں سے فائدہ اٹھا سکیں۔ یہ بات بعید نہیں ہے کہ دوسری زبانوں میں لکھی گئی کتابوں کے ترجمے کی عربی زبان میں تحریک دوسری صدی ہجری میں بغداد میں اپنے عروج کو پہنچی اور عباسی خلفاء کو بھی اس کا شوق پیدا ہوا بعض مترجمین جنہیں نہایت بے دردی سے قتل کیا گیا وہ امام جعفر صادقؑ کے حلقہ درس سے تعلق رکھتے تھے۔ (۸۴)

امام جعفر صادقؑ کے حلقہ درس میں علوم کے قوانین کو سمجھنے کے لئے تجربات بھی بروئے کار لائے جاتے تھے۔ ہمیں یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ اس عظیم سائنس دان کے حلقہ درس میں آج کی بڑی بڑی لیبارٹریز کی مانند کوئی لیبارٹری ہوگی اور وہاں پر فزکس اور کیمیا کے قوانین کو عملاً آزمایا جاتا ہوگا۔ امام جعفر صادقؑ کی لیبارٹری اس زمانے کے لحاظ سے موزوں تھی اور البتہ اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اس عظیم سائنس دان نے علوم میں نہ صرف تھیوری پر اکتفا کیا بلکہ حتی الامکان تجربہ بھی کیا ہم نے دیکھا کہ امام جعفر صادقؑ کو علم تھا کہ ہوا ایک عنصر نہیں ہے اور تجربے کے بغیر یہ بات سمجھنا بعید نظر آتا ہے۔ شیعہ امام جعفر صادقؑ کے تمام علوم پر

ایمان رکھتے تھے کیونکہ وہ امام جعفر صادقؑ کو امام مانتے ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ آپ علم امامت کے ذریعے تمام علوم سے آگاہ تھے اور اسی بنا پر امام جعفر صادقؑ کا کوئی معجزہ شیعوں کے لئے اجنبی نہیں ہے اور وہ تمام معجزات جو شیعہ مورخین نے امام جعفر صادقؑ کی نسبت رقم کئے ہیں، شیعہ انہیں بغیر کسی حیل و حجت کے قبول کرتے ہیں (۸۵) لیکن ایک غیر جانب دار مورخ ہر علمی نکتے یا معجزے پر اعتراض کرتا ہے اور دلیل و برہان کے بغیر کسی بات کو قبول نہیں کرتا جب ایک غیر جانبدار مورخ سنتا ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا، ہوا ایک بڑا عنصر نہیں بلکہ یہ چند عناصر پر مشتمل ہے اور ان میں سے ایک عنصر ایسا ہے جس کی وجہ سے اشیا جلتی ہیں اور یہ عنصر بعض چیزوں کو آلودہ بھی کرتا ہے تو لامحالہ اس مورخ کے ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ آپ نے کس طرح اس بات کو درک کیا تھا۔ امام جعفر صادقؑ کا معجزہ یہ نہ تھا کہ آپ نے پہاڑ کو حرکت دی (کیونکہ عقلی لحاظ سے یہ بات قابل قبول نہیں) بلکہ آپ کا اعجاز یہ ہے کہ آپ نے ساڑھے بارہ سو سال پہلے ہوا میں آکسیجن دریافت کر لی تھی اور یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ پانی میں ایسی چیز ہے جو جلتی ہے اور اسی وجہ سے فرمایا کہ پانی آگ میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ جن لوگوں کا کہنا ہے کہ ایک پیغمبر کا سب سے بہترین اعجاز اس کا کلام ہے ان کی یہ بات بے بنیاد نہیں ہے چونکہ آج ہم تاریخ میں پڑھتے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ نے کوہ صفا کو حرکت دی اور کوہ صفا آپ کے نزدیک آیا اور پھر دور ہٹ گیا اس روایت پر یقین نہیں کر سکتے کہ امام جعفر صادقؑ نے یہ معجزہ دکھایا ہوگا۔ لیکن جب ہم سنتے ہیں کہ آپ نے دوسری صدی ہجری کے پہلے پچاس سالوں کے دوران آکسیجن اور ہائیڈروجن کی (پانی میں) موجودگی کا پتہ چلا لیا تھا تو ہم تہہ دل سے اس بات کو تسلیم کر لیتے ہیں کہ یہ اعجاز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے اپنے والد کی جو ایک سائنس دان تھے کے ذریعے پانی میں ہائیڈروجن کا پتہ چلا لیا تھا جس کے بعد آپ خود بھی اس بات کو سمجھ گئے تھے کہ ہوا میں آکسیجن ہے، ہمیں افسوس ہے کہ ہمیں معلوم نہیں کہ وہ آکسیجن اور خالص ہائیڈروجن حاصل کر سکے یا نہیں ؟

بظاہر خالص ہائیڈروجن اور خالص آکسیجن لازم ملزوم ہیں لیکن خالص ہائیڈروجن کو حاصل کرنا خالص آکسیجن سے کہیں زیادہ مشکل ہے کیونکہ آکسیجن خالص حالت میں فضا میں ملتی ہے لیکن خالص ہائیڈروجن نہیں پائی جاتی۔ اسی وجہ سے حالیہ زمانوں میں جب تک پانی کا تجزیہ Electrolysis نہیں کیا جا سکا۔ خالص ہائیڈروجن ہاتھ نہیں آئی، یہاں پر انسان حیران رہ جاتا ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے اپنے والد سے مل کر کیسے ہائیڈروجن گیس کا پتہ چلا لیا جو دنیا میں خالص حالت میں نہیں پائی جاتی اور نہ ہی اس کا رنگ، بو اور ذائقہ ہے۔ امام جعفر صادقؑ یا آپ کے والد گرامی پانی کے علاوہ کسی اور جگہ اسے نہیں پا سکتے تھے اور پانی کا تجزیہ کئے بغیر اسے نہیں پہچان سکتے تھے۔ پانی کا تجزیہ بھی بجلی سے فائدہ اٹھائے بغیر ناممکن ہے اور کیا ان دونوں میں سے ایک نے بجلی کو پانی کے تجزیے کے لئے استعمال کیا تھا؟ یہ بات بھی قابل قبول نہیں ہے۔ جدید زمانے میں سب سے پہلے ایک انگریز

ہنری کاواندیش نے ہائیڈروجن کو پانی سے جدا کرنے میں کامیابی حاصل کی ۔اس کی وفات ۱۸۱۰ء میں ہوئی اس نے کئی سال پانی کی برقی پاشیدگی Electrolysis کرنے کی کوشش کی اور جب اسے ہائیڈروجن ہاتھ آئی تو اس نے اس کا نام بھڑکنے والی گیس رکھا اور پہلی مرتبہ جب یہ گیس بھڑک اٹھی تو قریب تھا کہ یہ شخص خود اور اس کا گھر دونوں جل جائیں ۔ کاو اندیش ۲۷ مئی ۱۷۶۶ء میں ہائیڈروجن سے بھرے ہوئے ایک سلنڈر کے نزدیک ایک شعلہ لایا جس کی وجہ سے وہ سلنڈر فورا" بھڑک اٹھا اور پھٹ گیا۔ اور چاروں طرف آگ پھیل گئی اس انگریز سائنس دان کے ہاتھ اور کسی حد تک چہرہ بھی جل گیا۔ اور اگر اس کی آواز پر اس کے گھر والے نہ دوڑتے اور آگ نہ بجھاتے تو گھر اور گھر کا سارا سامان جل جاتا۔ اس انگریز سائنس دان نے دو وجوہات کی بنا پر اس گیس کا نام بھڑکنے والی گیس رکھا ہے۔

پہلی یہ کہ اسے ایک تلخ تجربے کے ذریعے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ گیس بھڑک اٹھتی ہے.اور دوسری یہ کہ قدیم لوگوں کا خیال تھا کہ پانی مائع ہوا ہے۔ انہوں نے دیکھا تھا کہ جب پانی کو حرارت ملتی ہے تو بخارات میں تبدیل ہو کر اڑ جاتا ہے انہوں نے یہ بھی دیکھا تھا کہ پانی آسمان سے بارش کی صورت میں برستا ہے لہٰذا انہوں نے خیال کیا کہ پانی ' مائع ہوا کے علاوہ کوئی چیز نہیں یہی وجہ تھی کہ کاواندیش نے اس گیس کا نام بھڑک اٹھنے والی ہوا رکھا۔ لیکن امام جعفر صادقؑ کے زمانے میں بجلی سے صرف کھیلنے کی حد تک فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا یعنی جس طرح پتھروں کو آپس میں رگڑ کر آگ پیدا کی جاتی ہے اور ایک ریشمی کپڑے کو اس کے نزدیک رکھ کر جلایا جاتا ہے۔

کیا امام جعفر صادقؑ یا آپ کے والد گرامی نے ہائیڈروجن کو پانی سے علیحدہ کرنے کے لئے کوئی ایسا ذریعہ ڈھونڈ نکالا تھا جس سے سائنس دان اب تک بے خبر ہیں؟ اور انہوں نے بجلی کے علاوہ کسی اور ذریعے سے ہائیڈروجن کو پانی سے جدا کر لیا تھا؟ جب سے کاواندیش نے پہلی مرتبہ ہائیڈروجن کو بجلی کے ذریعے پانی سے جدا کرنے میں کامیابی حاصل کی اس دن سے آج تک ہائیڈروجن کو بجلی کے علاوہ کسی اور ذریعے سے پانی سے علیحدہ نہیں کیا جا سکا۔

حالیہ چند سالوں میں جب کہ زمینی فضا کافی آلودہ ہے امریکہ میں اس بات پر توجہ دی جا رہی ہے کہ ہائیڈروجن کو توانائی کی کمی دور کرنے کے لئے کام میں لایا جائے لیکن برق پاشیدگی کے علاوہ کسی اور ذریعے سے اسے حاصل کیا جائے۔ (۸۶)

اسی بنا پر شائد امام محمد باقرؑ نے ہائیڈروجن کے وجود کو برق پاشیدگی کے ذریعے معلوم کیا ہو اور اس کے ذریعے پانی کا تجزیہ کر لیا ہو یا پھر ایسا طریقہ اختیار کیا ہو جس سے سائنسدان ابھی تک خالص ہائیڈروجن حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے کیونکہ فلسفے کے ذریعے امام جعفر صادقؑ یا ان کے والد گرامی ہائیڈروجن کا وجود

نہیں معلوم کر سکے تھے۔

یونانی اور مسلمان قوموں کے ادب میں شامل نظم و نثر میں "آگ لگانے والا پانی" جیسے مضامین ملتے ہیں لیکن اس معنی میں نہیں کہ پانی آگ کی خاصیت رکھتا ہے بلکہ شراب کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے کیونکہ شراب' شرابی کو گرم کرتی ہے۔کسی بھی زمانے میں کسی فلسفی سے نہیں سنا گیا کہ اس نے کہا ہو کہ پانی' آگ پیدا کرتا ہے اور صرف امام صادقؑ کے بعد ہی یہ مضمون بعض حکماء اور عرفاء سے سنا گیا ہے اور صاف ظاہر ہے کہ انہوں نے یا تو امام جعفر صادقؑ سے نقل کیا ہے یا ان کے شاگردوں سے۔

جیساکہ ہمیں معلوم ہے گزشتہ زمانوں میں بعض ایسے افراد ہو گزرے ہیں جنہوں نے اپنی کوشش سے بعض علمی رازوں پر سے پردے اٹھائے لیکن ان کی یہ ایجادات بعد میں آنے والی نسلوں تک نہیں پہنچ سکیں کیونکہ جو کچھ انہوں نے معلوم کیا تھا وہ اسے بعد میں آنے والی نسلوں کے لئے کتابی صورت نہیں دے سکے تھے اسی لئے ان کی موت کے بعد ان کی کاوشوں کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ان میں سے بعض نے اپنی ایجادات کو جان بوجھ کر دوسروں تک نہیں پہنچایا کہ کہیں یہ علم غیر صالح افراد کے ہاتھوں تک نہ پہنچ جائے اور ایسا نہ ہو کہ اسے لوگوں کو نقصان پہنچانے کے لئے استعمال میں لائیں۔ اموات نامی کتاب میں جو بنی نوع انسان کی قدیم ترین کتابوں میں سے ایک ہے اور مصر میں لکھی گئی ہے (یہ ساری کتاب موجود نہیں بلکہ اس کے کچھ حصے باقی ہیں) اس میں یہ تاکید کی گئی ہے کہ علم کو غیر صالح افراد کو نہ سکھائیں کیونکہ اس سے وہ خداؤں اور لوگوں کو نقصان پہنچائیں گے۔ مشہور چینی فلسفی کنفیوشس جو ۴۷۶ء میں ۷۲ سال کی عمر میں فوت ہوا اور جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ وہ سرکاری ملازم اور اخلاقی معلم تھا اور آج بھی اس کی اخلاقی تعلیمات چین میں خاصی اہمیت کی حامل سمجھی جاتی ہیں اس نے تاکید کی ہے کہ بعض علمی اسرار جن سے لوگوں کو نقصان پہنچایا جا سکتا ہے مکار لوگوں کو نہ سکھائیں کیونکہ ممکن ہے وہ اسے لوگوں کو نقصان پہنچانے کے لئے استعمال میں لائیں اس اخلاقی معلم نے اس بات پر زور دیا ہے کہ دوسروں کے ساتھ اس طرح پیش آئیں جس طرح آپ دوسروں سے اچھا سلوک کرنے کی امید رکھتے ہیں۔اس عظیم فلسفی کا خیال ہے کہ بعض علمی رازوں کا غیر صالح افراد کے ہاتھوں لگنا خطرناک ہے حتیٰ کہ بعض تصوف و عرفان کے فرقوں میں کچھ ایسی باتوں کو جنہیں راز خیال کیا جاتا تھا بعض مریدوں سے مخفی رکھا جاتا تھا اوراب جبکہ بحثوں اور عرفان و تصوف کے غور و فکر میں ایسی طبیعیاتی قوتیں موجود نہیں جن کی وجہ سے غیر صالح افراد کے ہاتھوں میں پہنچ جائیں اور لوگوں کے لئے خطرے کا باعث بن سکیں۔ بہرکیف مذکورہ فرقوں میں اقطاب کی طرف سے بعض رازوں کو مخفی رکھنا واجبات میں سے تھا تاکہ یہ راز نااہل ہاتھوں میں نہ پہنچ پائیں۔ تصوف کے بعض فرقوں میں تعلیم و تربیت کے سات مراحل تھے جب کوئی مرید ان سات مراحل سے گزرتا تھا پھر قطب یا سرپرست اسے بعض اسرار و رموز سے آگاہی حاصل کرنے کا اہل سمجھتا۔یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ یہ راز

فزکس، کیمسٹری یا میکانکس کے قوانین کے راز نہ تھے کہ کوئی معاشرے کو نقصان پہنچانے اور خود فائدہ اٹھانے کے لئے استعمال میں لا سکتا ہے یہ صرف نظریات (Thoeries) ہوتے تھے جنہیں مرشد نااہل افراد تک پہنچنے کو اجتماعی یا اخلاقی لحاظ سے خطرناک سمجھتا تھا۔

جو کچھ اوپر ذکر کیا گیا ہے کیا اس کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے بجلی استعمال کئے بغیر پانی سے خالص ہائیڈروجن حاصل کی ہو اور اس راز کو نااہل ہاتھوں میں پہنچنے سے بچانے کے لئے فاش نہ کیا ہو؟

عموماً مسلمانوں اور خصوصاً شیعوں کو اس بات کا بخوبی علم ہے کہ بعض ایسے اسرار و رموز تھے جن سے پیغمبرؐ اسلام اور شیعوں کے بارہ امامؑ آگاہ تھے لیکن انہوں نے ان سے اس لئے پردہ نہیں اٹھایا کہ اس سے معاشرے کے نظم و ضبط کا شیرازہ بکھر جائے گا یا یہ کہ یہ اسرار نااہل افراد کے ہاتھوں میں پہنچ جائیں گے اور وہ اسے لوگوں کو تکلیف پہنچانے اور معاشرے کا نظم و ضبط تہہ و بالا کرنے کے لئے بروئے کار لائیں گے۔

اگر امام جعفر صادقؑ ہائیڈروجن کے حصول کے لئے پانی کی پاشیدگی یا تجزیے سے آگاہ تھے اور انہوں نے اس کا اظہار نہیں کیا تو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ انہوں نے ایک اچھا کام کیا ہے کیونکہ بجائے اس کے کہ ہائیڈروجن کو پانی سے جدا کر کے انسانی فلاح و بہبود کے کاموں میں لایا جاتا اسے ہائیڈروجن بم بنانے کے لئے استعمال میں لایا جانے لگا ہے اور یہ اسلحہ موت کی مانند بنی نوع انسان کو صفحہ ہستی سے مٹا دے اگر ہائیڈروجن دریافت نہ ہوتی تو یہ آفت بنی نوع انسان کے سر پر نہ منڈلاتی۔

## نظریہ روشنی Light Theory

امام جعفر صادقؑ کے علمی کمالات سے ایک ان کا نظریہ روشنی Light Thoery بھی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ روشنی چیز کی طرف سے انسانی آنکھوں میں آتی ہے۔وہ روشنی جو اشیاء سے ہماری آنکھوں کی طرف آتی ہے اس کا صرف کچھ حصہ ہماری آنکھوں میں چمک پیدا کرتا ہے جس کی وجہ سے ہم دور کی اشیاء کو اچھی طرح نہیں دیکھ سکتے۔ اگر وہ تمام روشنی جو ایک دور کی چیز سے ہماری آنکھوں کی طرف آئے اور پتلی تک پہنچ پائے تو ہم دور کی چیز کو نزدیک دیکھ سکیں گے اور اگر کوئی ایسا آلہ بنایا جائے جو ایک چیز سے خارج ہونے والی تمام روشنی کو آنکھوں کی پتلی تک پہنچا سکے تو ہم نہایت دور سے بھی اس چیز کو باسانی دیکھ سکیں گے۔

یہ تھیوری امام جعفر صادقؑ کے شاگردوں کے ذریعے ارد گرد کے علاقوں تک پہنچی اور جب صلیبی جنگوں کے ذریعے مشرق اور یورپ میں رابطہ بڑھا تو یہ تھیوری یورپ منتقل ہو گئی اور یورپ کی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جانے لگی۔ انگلستان کی آکسفورڈ یونیورسٹی کا مشہور استاد راجر بیکن Roger Beacon (۸۷) بھی اس

تھیوری کو پڑھاتا تھا۔ موصوف کا روشنی کے بارے میں وہی نظریہ ہے جو امام جعفر صادقؑ نے پیش کیا تھا۔ اس نے امام جعفر صادقؑ کی مانند اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اگر ہم ایسا آلہ بنا سکیں جو دور کی تمام اشیاء کی روشنی ہماری آنکھوں تک پہنچا سکے تو ہم ان چیزوں کو پچاس گنا زیادہ قریب دیکھ سکتے ہیں۔

بعد میں ۱۶۰۸ء کے دوران ایک فلمینڈی لپرشی (۸۸) نے اس نظریے کی روشنی میں دنیا کی سب سے پہلی دوربین ایجاد کی۔ پھر اس دوربین کو دیکھتے ہوئے گلیلیو نے فلکی دوربین ایجاد کی وہ اپنی فلکی دوربین کو ۱۶۱۰ء میں کام میں لایا اور اس نے اس دوربین سے ۷ جنوری کی رات کو آسمان پر ستاروں کا مشاہدہ کیا۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں فلامنڈی موجد کے دوربین بنانے اور گلیلیو کے دوربین بنانے کے درمیان کل عرصہ تقریباً" دو سال ہے اور چونکہ گلیلیو نے اپنی دوربین ۱۶۱۰ء کے پہلے مہینے میں استعمال کرنا شروع کی لہذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ دو سال سے بھی کم عرصہ ہے لہذا یہ بعید نہیں کہ ہر دو موجدوں کو ایک ہی موقع پر فلکی دوربین بنانے کا خیال آیا ہو۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ گلیلیو نے فلامنڈی موجد کی تقلید کی اور جو نقائص اس کی دوربین میں پائے جاتے تھے انہیں اس زمانے کی ٹیکنیک کی حد تک درست کیا اور ۷ جنوری کی رات کو اس نے اس دوربین سے استفادے کے لئے اس کا افتتاح کیا۔

گلیلیو پاڈو یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ تھا وہ پاتاویوم (ملک) میں واقع ہے جو بعد میں وسٹے کے نام سے موسوم ہوا اور آج اس کی کرسی کو وینلز کہا جاتا ہے اور مشرق میں پاتاویوم یا وسٹے 'بندوقیہ (۸۹) کے نام سے مشہور تھا۔

گلیلیو جو پاڈو جیسی مشہور یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ تھا اسی ملک میں ریاضی کا استاد بنا اس نے جب پہلی مرتبہ اپنی دوربین سے چاند کا نظارہ کیا تو یہ دیکھ کر مبہوت رہ گیا کہ چاند میں بھی زمین کی مانند پہاڑوں کے سلسلے ہیں اور اس نے دیکھا کہ چاند کے یہ پہاڑی سلسلے چاند کے صحراؤں پر سایہ ڈالتے ہیں اس سے اسے اندازہ ہوا کہ جہان صرف ہماری زمین ہی نہیں بلکہ چاند بھی ایک جہان ہے۔

اگر امام جعفر صادقؑ روشنی کا نظریہ (Light Thoery) نہ پیش کرتے تو فلانڈ کا باسی لپرشی اور گلیلیو فلکی دوربین تیار کر سکتے تھے؟ اور کیا گلیلیو نظام شمسی کے سیاروں کا آسانی سے مشاہدہ کر سکتا تھا؟ کیا وہ اپنے مشاہدات کے ذریعے کوپر نیک و کپلر کا مشہور نظریہ کہ نظام شمسی کے سیارے زمین سمیت سورج کے گرد گھوم رہے ہیں کی تصدیق کر سکتا تھا؟

گلیلیو کی فلکی دوربین نے لوگوں میں اتنا جوش و خروش پیدا کیا کہ وینیز کے سینیٹرز' حتی کہ وہاں کا صدر بھی اس فلکی دوربین سے نظام شمسی کے سیاروں کو دیکھنے کے لئے بے تاب ہو گیا اور گلیلیو اپنی دوربین کو پاڈو سے اٹھا کر وینلز شہر میں لایا اور اسے ایک کلیسا کی چھت پر نصب کیا۔ بوڑھے بوڑھے سینیٹرز کو پکڑ کر چھت پر پہنچایا گیا تاکہ رات ہونے پر وہ چاند اور ستاروں کو دیکھ سکیں۔ جب گلیلیو سے سوال کیا جاتا تھا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ

اس کی دوربین آسمانی سیاروں کو اتنا قریب کر دیتی ہے کہ اس سے چاند کے پہاڑوں کا نظارہ بھی ہو سکتا ہے تو وہ امام جعفر صادقؑ کی تھیوری کو دہراتے ہوئے کہتا تھا کہ یہ دوربین اس تمام روشنی کو جو آسمانی سیاروں سے ہماری آنکھ تک پہنچتی ہے جمع کرتی ہے جس کے نتیجے میں جو فاصلہ تین ہزار قدم ہوتا ہے وہ گھٹ کر ساٹھ قدم رہ جاتا ہے۔

جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ گلیلو کی اس ایجاد کے بعد عطارد، زہرہ اور مشتری کے چاند آنکھ سے دیکھے گئے تو اس کا کوپر نیک اور کپلر کے نظریے پر کیا اثر پڑا۔ (۹۰)

اس حقیقت کو تسلیم کرنا چاہئے کہ مشہور حکیم اور مشہور مشائی فلسفے کا عالم ارسطو اور اس کے بعد بطلیموس جو ارسطو کے پانچ سو سال بعد آیا انہوں نے علم نجوم کو اٹھارہ سو سال پیچھے دھکیل دیا یعنی تیسری صدی قبل مسیح سے پندرھویں صدی عیسوی تک اس علم میں کوئی پیشرفت نہ ہوئی ارلیستاوخوس (۹۱) جیسے جید فلاسفہ کا کہنا ہے کہ زمین اپنے محور کے گرد گردش کرتی ہے اور یہ سورج کے ارد گرد بھی گھومتی ہے زمین کی اپنے محور کے گرد گردش سے دن و رات وجود میں آتے ہیں اور اس کے سورج کے گرد گردش سے سال بھر کے موسم وجود میں آتے ہیں۔

ارسطو ایک عظیم مفکر اور فلسفی تھا اس کی کتابیں انسانی ثقافت کی زندہ جاوید کتب شمار ہوتی ہے لیکن ہیئت کے بارے میں جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہے کہ اس شعبے میں انسان کئی صدیوں تک کوئی قابل ذکر کارنامہ سرانجام نہیں دے سکا اور ہم نہایت حیرت سے یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ علم ہیئت کے اس زوال کا ذمہ دار ارسطو ہے۔ اگر وہ یہ نہ کہتا کہ زمین ساکن ہے اور سورج اور ستارے زمین کے گرد گردش کر رہے ہیں تو وہ عظیم علمی تحریک جو یورپ میں جدید علمی دور میں شروع ہوئی کم از کم پہلی صدی عیسوی سے شروع ہو چکی ہوتی۔ ہمیں یہ بات معلوم ہونی چاہئے کہ ماڈرن سائنسی دور کی تحریک جو آج تک جاری ہے اس کا آغاز پولینڈ کے کوپر نیک نے کیا جس نے کہا کہ زمین سورج کے ارد گرد گھومتی ہے اور اس کے بعد کپلر نے جو جرمن تھا اس سائنسی تحریک کو زمین سمیت دوسرے ستاروں کی سورج کے گرد حرکت کے قوانین کا پتہ لگانے کے ذریعے تقویت دی اس کے بعد گیلیلو نے سیاروں کی سورج کے گرد حرکت کو بحسن خوبی ثابت کر کے اس سائنسی تحریک کو خاصی قوت بخشی اگر یہ تین اشخاص پیدا نہ ہوتے اور چالیس ہزار آٹھ سو سالہ انسان کا زمین کے ساکن ہونے اور سورج کا اس کے گرد گردش کرنے کا نظریہ اس کے دماغ سے نہ نکالتے تو دکارت ہرگز پیدا نہ ہوتا جس نے سائنسی تحقیقات کی بنیاد ڈالی۔

وہ بھی دوسرے سائنس دانوں کی مانند کوپر نیک کے آنے تک ارسطو کے قائم کردہ ظلمت کدے میں رہ رہا تھا۔ جب گیلیلو نے پہلی مرتبہ اپنی فلکی دوربین سے ۱۶۱۰ء عیسوی میں آسمان کا نظارہ کیا۔ دکارت اس وقت چودہ

سالہ لڑکا تھا وہ کوپرنیک' کپلر اور گیلیلو کے بغیر اپنے آپ کو جہالت کی تاریکی سے نکال کر جدید عصر کی سائنسی تحقیق کے بنیاد نہ رکھ سکتا تھا۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے علم زنجیروں کی کڑیوں کی مانند ہے علم کی ایک کڑی دوسری سے ملتی ہے اور اس طرح ایک دوسرا علم وجود میں آتا ہے۔

زمین اور دوسرے سیاروں کا سورج کے گرد حرکت نہ کرنے پر مشتمل انسانی جہالت کا نظریہ جو ارسطو نے پیش کیا اس کی وجہ سے انسان اٹھارہ صدیوں تک علمی فضا میں پرواز کرنے سے رکا رہا اور ارسطو کا اثر ورسوخ بھی اس قدر تھا کہ کسی کو اس کے نظریئے کو باطل ثابت کرنے کی جرات بھی نہ ہوئی۔

ارسطو کے نظریئے کو دو اور محرکات نے بھی تقویت پہنچائی۔ پہلا محرک یہ کہ مشہور مصری جغرافیہ دان بطلیموس جو ارسطو کے پانچ سو سال بعد دنیا میں آیا نے اس کے نظریہ پر مہر تصدیق ثبت کی اور سیاروں کی حرکات کے بارے میں ایک نظریہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ سیارے ایسی چیزوں کے گرد گردش کرتے ہیں جو متحرک ہیں اور وہ چیزیں زمین کے گرد گھومتی ہیں لیکن زمین بذات خود ساکن ہے۔جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بطلیموس نے زمین کے ارد گرد کی گردش کو دو حصوں میں تقسیم کیا اور کہا کہ وہ سیارے ایسی چیز کے گرد گھومتے ہیں جو باری باری ساکن زمین کے گرد گھومتی ہیں ۔جس محرک نے ارسطو کے نظریے کو مزید تقویت بخشی وہ یورپ کے کلیسا کی جانب سے ارسطو کے نظریے کی صحت پر ثبت کرنا تھا اور ارسطو کے نظرے میں کہا گیا کہ اگر زمین ساکن نہ ہوتی اور کائنات کا مرکز نہ ہوتی تو خدا کا بیٹا حضرت عیسی ہرگز اس میں ظہور نہ کرتا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر کوپرنیک' کپلر اور گلیلو دنیا میں نہ آتے تو بھی دکارٹ جدید علمی تحقیق کی بنیاد رکھ دیتا اس کے بعد بھی اتنی علمی ترقی ہوتی کہ علم موجودہ ترقی سے ہم کنار ہو جاتا۔ لیکن موجودہ دور کے سائنس دان اس بات سے متفق نہیں ہیں انگلستان کا مشہور فزکس دان او یگنٹن جو ۷۵ سال کی عمر میں ۱۹۴۴ء میں فوت ہوا۔ جس کسی نے فزکس پر کام کیا ہے وہ او یگنٹن کے نام سے بخوبی آشنا ہے اسے معلوم ہے کہ او یگنٹن نے اس صدی میں فزکس پر نمایاں کام کیا ہے۔ او یسنگٹن کا قول ہے کہ ارسطو کا یہ نظریہ کہ زمین ساکن اور کائنات کا مرکز ہے اور سورج وستارے زمین کے گرد گھومتے ہیں سولھویں صدی کا یہ نظریہ ایک بوجھل جسم کی مانند علم پر پڑا ہوا تھا جس سے علم کے لئے سانس لینا بھی دشوار تھا اور اگر یہ بوجھ علم کے اوپر سے نہ ہٹتا اور مشرقی علم کے لئے سانس لینے کا راستہ ہموار نہ ہوتا تو موجودہ علمی پیش رفت انسان کو نصیب نہ ہوتی۔ مشرقی سائنس دانوں اور مصنفین میں سے بعض ایسے ہیں جو یہی نظریہ رکھتے ہیں ان میں سے ایک ہندوستانی چاتر جی (۱) کا کہنا ہے کہ اگر بنی نوع انسان زمین کی اپنے ارد گرد اور سورج کے اردگرد حرکت کا پتہ نہ لگاتا تو یہ اسی طرح جہالت میں گرفتار رہتا اور جدید دور کی علمی کامیابیوں سے ہرگز ہمکنار نہ ہوتا۔

جیسا کہ ہم نے ذکر کیا کہ عیسائی کلیسا نے ارسطو اور بطلیموس کے اس نظریے کی کہ زمین ساکن اور کائنات

کا مرکز ہے' تصدیق کی کیونکہ کلیسا کے نظریے کی بنیاد پر اگر زمین ساکن اور کائنات کا مرکز نہ ہوتی تو خدا کا بیٹا عیسیٰ اس میں ظہور نہ کرتا کیونکہ خدا کا بیٹا اس جگہ ظہور کرتا ہے جو ساکن اور کائنات کا مرکز ہو اور اگر یہ زمین کائنات کا مرکز اور ساکن نہ ہوتی تو ہرگز اس قابل نہ تھی کہ خداوند کا بیٹا اس پر ظہور کرتا۔

اگرچہ زمین کے ساکن اور مرکز کائنات ہونے کے نظریہ کو عیسائی کلیسا کی پشت پناہی حاصل تھی اور یہ نظریہ عیسائیت میں شامل ہو چکا تھا پھر بھی سائنس دان جب اس نظریے کی تصدیق کرتے تھے تو کہتے تھے کہ ارسطو نے اس طرح کہا ہے۔ وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ دین و عیسائیت اس طرح کہتے ہیں۔

اگر کوپرنیک' کپلر' گیلیلو' ارسطو کی اس غلطی کی اصلاح نہ کرتے اور اس نظریئے کے غلط ہونے کو ثابت نہ کرتے تو آج جو کوئی کسی چیز کو ثابت کرنا چاہتا تو اگر اس کے متعلق ارسطو نے کچھ کہا ہوتا تو وہ شخص یہ کہتا کہ ارسطو نے اس طرح کہا ہے۔

کیونکہ ارسطو کا کہنا حجت ہوتا تھا اور کسی کا بھی یہ خیال نہ تھا کہ ارسطو نے بھی غلط بات کہی ہوگی۔ یہی وجہ تھی کہ یہ نظریہ غیر متزلزل نظر آتا تھا۔ انسانی نسل کی زندگی میں غلط سائنسی نظریات بھی آئے ہیں (حالانکہ کوئی نظریہ اگر غلط ہو تو اسے سائنسی نظریہ نہیں کہا جاسکتا اس لئے کہ اس کے سائنسی ہونے کے لئے اس کی صحت ضروری ہے) اور ممکن ہے آج بھی موجود ہوں لیکن ارسطو کے کائنات میں زمین کی مرکزیت کے متعلق نظریے کی مانند کسی نظریے نے عقل اور علمی ادراک پر اس قدر سایہ نہیں ڈالا اور اس غلط نظریے نے انسانی عقل اور علمی ادراک کو اٹھارہ صدیوں تک اس قدر مات دی ہے جس قدر کسی اور نظریے نے نقصان نہیں پہنچایا۔

اس طویل مدت کے دوران جب کہ عیسائی کلیسا نے باقاعدہ طور پر ارسطو کے نظریئے کو قبول کر لیا تھا صرف ایک عیسائی شخص ایسا پیدا ہوا جس نے ارسطو کے نظریہ کی مخالفت کی اور وہ شخص نیکولا دوکوزا ہے جو کیتھولک کلیسا میں کارڈینال (Cardinal) کے مرتبے پر فائز تھا۔ اس شخص کو قدیم یونانی فلاسفہ کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کا بے حد شوق تھا اور یہی شوق ارسطو کے نظریہ سے اس کی مخالفت کا سبب قرار پایا۔ امریکی اور یورپی اقوام پر ثقافتی لحاظ سے ویٹیکن کے کافی احسانات ہیں کیونکہ یونان اور قدیم روم کی کتابوں کا بڑا حصہ ویٹیکن کے کتابخانہ کی وساطت سے یورپی اور امریکی قوموں تک پہنچا۔ یورپ میں کتابوں کے چند مراکز اور بھی ایسے ہیں جنہیں یونانی اور قدیم رومی کتب کو یورپی قوموں تک پہنچانے کا فخر حاصل ہے لیکن ان مراکز میں سے کوئی بھی ویٹیکن کے کتابخانے کی برابری نہیں کر سکتا اور یہ کتابخانہ نہ ہوتا تو ممکن ہے یونان اور قدیم روم کی بعض کتابیں گمنامی کی حالت میں پڑی رہتیں۔

یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ یورپ میں مسلسل جنگ کا بازار گرم رہا اور وہ لوگ جو لڑ رہے تھے ان کے لئے کتاب بے وقعت چیز تھی اس زمانے میں کتابیں یا تو جل رہی تھیں یا ویرانوں میں پڑی گل سڑ رہی

تھیں۔ لیکن جو کتابیں ویٹیکن کی طرح کے چند مراکز میں پڑی تھیں دو وجوہات کی بنا پر باقی رہ گئی تھیں پہلی وجہ یہ تھی کہ حملہ آور ویٹیکن اور دوسرے مذہبی مراکز پر حملے نہیں کرتے تھے کیونکہ وہ عیسائی تھے اور ان مراکز کو مقدس سمجھتے تھے ۔دوسری وجہ یہ تھی کہ ان مراکز میں کام کرنے والے کتابوں کے شائقین تھے انہیں کتابوں کی قدرومنزلت کا اندازہ تھا اس لئے انہیں سنبھال کر رکھتے تھے اور کیڑے مکوڑوں' یا گرد وغیرہ سے انہیں حتیٰ الامکان بچاتے تھے۔

یونان اور قدیم روم کی علمی اور یورپی میراث کو محفوظ کرنے کے لحاظ سے یورپ کی قدیم یونیورسٹیوں مثلاً "پاڈو یونیورسٹی (اٹلی) اور آکسفورڈ یونیورسٹی (انگلینڈ) اسی طرح سوربون یونیورسٹی (فرانس) کا پہلا درجہ نہیں تھا۔ چونکہ یہ تمام یونیورسٹیاں دوسری ہزارویں عیسوی صدی میں وجود میں آئیں جبکہ پہلی ہزارویں عیسوی صدی میں صرف ویٹیکن اور دوسرے مذہبی مراکز تھے جن میں کتابیں محفوظ تھیں۔ یورپ کے روساء اور امرا جن کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ تقریباً" سارے ناخواندہ تھے انہیں کتابوں سے ذرا بھی شغف نہ تھا بلکہ بعض زمانوں میں تو سلاطین اور امراء کے لئے پڑھا لکھا ہونا ایک بڑا عیب شمار کیا جاتا تھا ۔ اب آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اگر بادشاہ اور امراء ان پڑھ ہوں تو پڑھائی کے معاملے میں عام لوگوں کی کیا دلچسپی ہوگی ؟ یورپ میں خواندگی' کتابوں کے مطالعے اور کتابوں کو محفوظ کرنے کے مراکز صرف دینی ادارے ہی تھے اور اگر کتابوں کے یہ قدیم مراکز جن میں یونانی' لاطینی اور سریانی زبانوں میں مترجم کتابیں محفوظ تھیں نہ ہوتے تو یونان اور قدیم روم کی کتابیں آج یورپ کی قوموں تک نہ پہنچتیں ویٹیکن کا کتب خانہ قدیم یونانی اور لاطینی کتابوں کے لحاظ سے دوسرے مذہبی مراکز کی نسبت زیادہ وسیع تھا لیکن عام پادری حضرات اس کتب خانے تک رسائی حاصل نہ کر سکتے تھے۔ جبکہ آج عیسائی مذہب کا ہر روحانی پیشوا اس کتب خانے میں جا سکتا ہے لیکن افسوس ہے کہ قدیم زمانے میں عیسائی مذہبی رہنماؤں میں علمی امتیاز برتا جاتا تھا اور وہ پادری جو رتبے میں کم ہوتے تھے انہیں ویٹیکن کے کتب خانے میں داخل ہونے کی ہرگز اجازت نہ تھی بظاہر اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی تھی کہ کم علمی درجہ کے حامل پادری اس قدر علم نہیں رکھتے کہ ویٹیکن کی کتابوں سے فائدہ اٹھا سکیں۔ لیکن اس کی اصلی وجہ یہ تھی کہ کلیسا کے بڑے مذہبی رہنما اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ نچلے درجے کے پادری بھی آکر ان کے ساتھ کتب خانے میں بیٹھ کر مطالعہ کریں۔

ویٹیکن کے کتب خانے کی کتابیں جس طرح ماضی میں کسی کو امانتاً" گھر میں پڑھنے کے لئے نہیں دی جاتی تھیں اسی طرح کتب خانے کی کتابوں کے اسی کتب خانے تک محدود رہنے کے عوامل میں سے ایک عامل یہ تھا کہ یہ کتابیں کسی کو بھی اس کتب خانے سے باہر لے جا کر مطالعہ کرنے کی اجازت نہ تھی آج بھی اس کتب خانے کی کتابیں کسی کو امانتاً" نہیں دی جاتیں البتہ وہاں سے ان کی فوٹو کاپی حاصل کی جا سکتی ہے۔ نیکولادوکوزا' چونکہ

کلیسا کے امراء میں سے تھا لہٰذا اس کتب خانے میں جا کر مطالعہ کر سکتا تھا۔ اور وہ قدیم یونانی زبان بھی جانتا تھا۔ اس نے اس کتب خانے اور قدیم فلاسفہ سے (جن میں ارسطارخوس بھی شامل ہے) زمین کے حرکات کے متعلق معلومات حاصل کیں اس کے بعد وہ ویٹیکن سے جرمنی اپنے مذہبی مرکز کی طرف چلا گیا۔ جرمنی پہنچ کر اس نے زمین کی حرکات پر ایک کتاب لکھی۔ ابھی تک چھاپہ خانے کی صنعت نے اتنی ترقی نہ کی تھی کہ نیکولادوکوزا اس کتاب کو چھپوا سکتا لہٰذا مذکورہ کتاب قدیم طرز پر ہی تیار ہوئی اور جو کوئی اسے حاصل کرنا چاہتا اس کی نقل تیار کر لیتا تھا۔ نیکولادوکوزا نے یہ کتاب ۱۴۶۰ء میں (کوپرنیک کی پیدائش سے تیرہ سال قبل) تیار کی اس نے اس کتاب میں کہا کہ زمین ساکن نہیں بلکہ اپنے گرد اور سورج کے گرد گھوم رہی ہے پھر زمین کی گردش کے اعلان کا کریڈٹ آخر کار نیکولادوکوزا کو کیوں نہ ملا' پولینڈی کوپرنیک کو کیوں ملا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ نیکولادوکوزا ایک مذہبی شخص تھا اس کے پاس بہت کم نجوم اور ریاضی کی معلومات تھیں جبکہ کوپرنیک ایک صاحب بصیرت اور ریاضی کا ماہر تھا۔ اس نے زمین کی حرکت علم کے ذریعے ثابت کی۔ جبکہ نیکولادوکوزا نے بغیر کسی سائنسی دلیل کے یونانی حکما کے نظریہ کو من و عن پیش کر دیا تھا۔ چونکہ نیکولادوکوزا نے اپنی کتاب میں کوئی دلیل نہیں پیش کی تھی لہٰذا روحانی مرکز کے باہر اس کی کتاب کی پذیرائی نہ ہوئی اور نہ ہی یہ کتاب ویٹیکن کی توجہ مبذول کرا سکی۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ جن لوگوں نے کتاب کو پڑھا ہوگا انہوں نے اس پر یقین نہ کیا ہوگا بلکہ اسے مذاق گردانا ہوگا۔ چونکہ اس میں حقائق کو رد کیا گیا تھا اور ایسے حقائق کا رد محال ہے جن کی صحت اور وجود میں کوئی شک نہ ہو۔

بابائے ریاضی یونانی فیثاغورث کا کہنا ہے کہ بعض حقائق کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی مثلاً" دس پانچ سے زیادہ ہے یا پچاس سکے چالیس سکوں سے زیادہ ہیں۔ یہ بات روز روشن کی مانند آشکارا ہے اب ہمیں اسے ثابت کرنے کے لئے کسی قسم کی کوئی دلیل لانے کی ضرورت نہیں' اسی طرح سورج اور سیاروں کی زمین کے اردگرد حرکت کو ثابت کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ ابتدا سے انسان اپنی دو آنکھوں سے مسلسل دیکھتا آیا ہے اور دیکھ رہا ہے کہ سورج اور سیارے زمین کے اردگرد چکر لگا رہے ہیں۔ زمین کا ساکن اور بے حرکت ہونا بھی ایک دوسری حقیقت تھی کیونکہ اس وقت تک کسی نے نہیں دیکھا تھا کہ زمین متحرک ہے۔ اور جب کبھی ایک مضبوط عمارت تعمیر کرتے تھے تو اس خیال سے کہ یہ عمارت سالہا سال تک باقی رہے گی۔ اگر وہ ویران بھی ہو جاتی تھی تو بارش برف اور سورج کی وجہ سے' نہ کہ زمین کی حرکت کی وجہ سے۔ اگر کوئی کسی ٹیلے یا پہاڑ کے پاس سے گزرتا تھا اور پھر طویل عرصے کے بعد اگر اس کا گزر وہاں سے ہوتا تو وہ دیکھتا تھا کہ وہ پہاڑ یا ٹیلہ وہیں پر کھڑا ہے اور سرک کر کسی دوسرے مقام پر نہیں گیا۔ یہی وجہ تھی کہ اگر کوئی شخص یہ کہتا کہ زمین ساکن نہیں اور متحرک ہے (وہ بھی دو حرکات رکھتی ہے) تو اسے یا تو پاگل پن کہا جاتا اور یا پھر مذاق سمجھا جاتا۔ چونکہ

نیکولادوکوزا ایک قابل احترام مذہبی رہنما تھا لہٰذا اسے دیوانہ تو نہیں کہہ سکتے تھے بلکہ یہ کہا گیا کہ وہ مذاق کر رہا ہے۔ نیکولادوکوزا کی کتاب نے عوام پر اس لئے کچھ اثر نہ کیا کہ اس زمانے میں عوام کتاب وغیرہ کا مطالعہ نہیں کرتے تھے' اور خواص پر یہ اثر ہوا کہ انہوں نے کہا یہ شخص مذاق کر رہا ہے کیونکہ واضح حقائق کا انکارمذاق کے مترادف تھا۔ بہرکیف اگر یہ کتاب نیکولادوکوزا کی زندگی میں ویٹیکن تک پہنچ جاتی تو مصنف کے لئے کئی مشکلات پیدا ہو جاتیں۔ ممکن تھا کہ اس کا لباس اور سرخ رنگ کی کارڈینل کی ٹوپی اتار لی جاتی اور وہ کیتھولک کلیسا کا دوسرا بڑا رتبہ کھو دیتا یعنی کارڈینل نہ رہتا۔

جو کچھ کہا گیا ہے اس کی روشنی میں امام جعفر صادقؑ کی لائٹ تھیوری (Light Theory) آپ کے صدیوں بعد فلکی دوربین کی ایجاد اور اس سے اجرام فلکی کے مطالعے کا موجب بنی اور اس طرح جدید علوم کی توسیع میں کافی مدد ملی۔ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے امام جعفر صادقؑ کے زمانے میں صنعت کا وجود نہ تھا اس لئے امام جعفر صادقؑ نے لائٹ تھیوری کا ذکر تو کیا لیکن خود دوربین نہ بنا سکے تاکہ اس سے سیارے اور ستارے دیکھتے۔ اسی دوربین نہ بنا سکنے کی وجہ نے آپ کی تھیوری کی قدروقیمت پر کوئی اثر نہ ڈالا۔

کیا نیوٹن جس نے قوت تجاذب (Gravitational force) کا قانون دریافت کیا جو قوت اس قانون کی دریافت کا سبب بنی کہ مصنوعی سیارہ خلا میں بھیج کر زمین کے گرد گھمایا جا سکتا تھا۔ جیسا کہ ہم سب کو معلوم ہے کہ مصنوعی سیارے جو آج زمین یا چاند' مریخ و زہرہ کے گرد چکر لگا رہے ہیں' سب کے سب نیوٹن کے عام قوت تجاذب کے قانون کے تحت حرکت کر رہے ہیں۔ لیکن کیا نیوٹن جو اس پر عمل درآمد نہ کر سکا ان کے قوت تجاذب کے قانون کی قدروقیمت کو گھٹا سکتی ہے ؟ (۹۳)

کون یہ کہتا ہے چونکہ نیوٹن خلا میں زمین کے اردگرد ایک مصنوعی سیارہ بھیجنے میں کامیاب نہیں ہو سکا لہٰذا اس کا اس قانون کو دریافت کرنا بے قدروقیمت ہے ؟

اگر کوئی یہ بات کہے تو دانشور اسے حقیر سمجھیں گے کیونکہ اس کا یہ قول اس کی عقل کی کمزوری سمجھا جائے گا۔ اگر آج بھی بنی نوع انسان نیوٹن کے اس قانون پر عمل درآمد نہ کر سکتا تو بھی نیوٹن کے ان سائنسی انکشافات کی اہمیت پر کوئی اثر نہ پڑتا اس لئے کہ دنیا جانتی تھی اور جانتی ہے کہ نظام شمسی میں جو کچھ ہے وہ قوت تجاذب کے عام قانون کی زد میں ہے۔ اور شاید نظام شمسی سے باہر بھی سورج اور کہکشائیں قوت تجاذب کے قانون کی پیروی کر رہی ہوں اور اس طرح اس کا وسیع خلا میں سفر جاری وساری ہو۔ امید کی جاتی ہے کہ آئندہ جب مزید سیارے نظام شمسی سے باہر بھیجے جائیں گے تو عملی طور پر معلوم ہو جائے گا کہ کیا نظام شمسی کے باہر کائنات کا نظام چلانے کے لئے بھی قوت تجاذب کا قانون کارفرما ہے یا نہیں ؟ اگرچہ آج تک کے تجربات نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ کائنات میں استثناء نہیں پایا جاتا اور ہر قانون جو کائنات کے ایک حصے میں کارفرما ہے

دوسرے حصوں میں بھی لاگو ہے۔ لیکن جب تک عملی طور پر یہ بات ثابت نہیں ہو جاتی کہ قوت تجاذب کا قانون جس کی وجہ سے ہمارے نظام شمسی میں نظم و نسق قائم ہے نظام شمسی سے باہر بھی یہی نافذ العمل ہے یا نہیں اس قانون کی کیسے تصدیق ہو سکتی ہے ؟

امام جعفر صادقؑ کی لائٹ تھیوری (Light Theory) میں جو دوسرا نقطہ غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے فرمایا روشنی چیزوں سے انسانی آنکھ کی طرف آتی ہے جبکہ آپ سے پہلے کہا جاتا تھا کہ روشنی آنکھ سے نکل کر اشیاء کی طرف جاتی ہے۔ امام جعفر صادقؑ وہ پہلے مسلمان ہیں جنھوں نے اس نظریئے کی نفی کی اور کہا کہ روشنی آنکھ سے نکل کر چیزوں کی طرف نہیں جاتی بلکہ چیزوں سے نکل کر انسانی آنکھ کی طرف آتی ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ ہم اندھیرے میں کوئی چیز نہیں دیکھ سکتے جبکہ اگر روشنی ہماری آنکھ سے نکل کر چیزوں کی طرف جاتی تو ہم اندھیرے میں تمام چیزوں کو دیکھ سکتے۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا، کسی روشن چیز کو دیکھنے کے لئے اس کا روشن ہونا ضروری ہے اور اگر وہ خود روشن نہیں ہے تو کسی روشن چیز کی روشنی کا اس پر پڑنا ضروری ہے تاکہ اسے دیکھا جا سکے۔ امام جعفر صادقؑ نے روشنی کی رفتار کے متعلق بھی ایک ایسا نظریہ پیش کیا جو ان کے زمانے کے لحاظ سے توجہ کا طالب ہے۔ آپ نے فرمایا روشنی نہایت تیزی سے ہماری آنکھوں کی طرف آتی ہے اور یہ متحرک اشیاء میں سے ہے۔

ایک مرتبہ پھر اس نکتے کا ذکر کرتے ہیں کہ اس زمانے میں اتنے ٹیکنیکی ذرائع نہ تھے کہ امام جعفر صادقؑ روشنی کی رفتار کو ناپ سکتے۔

لیکن یہی جو فرمایا کہ روشنی متحرک ہے اور نہایت تیز رفتار ہے یہ نظریہ تقریباً" روشنی کے موجودہ نظریہ سے میل کھاتا نظر آتا ہے۔ آپ سے ایک روایت نقل کی گئی ہے کہ آپ نے ایک دن اپنے حلقہ میں فرمایا طاقتور روشنی، بھاری چیزوں کو حرکت میں لا سکتی ہے اور وہ روشنی جو طور سینا پر حضرت موسیٰؑ پر ظاہر ہوئی اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو یہ روشنی اس پہاڑ کو متحرک کر سکتی تھی اس بات کا امکان ہے کہ آپ نے اس روایت کے ذریعے شعاعوں کے نظریئے کی بنیاد کے بارے میں پیش گوئی کی ہو۔

امام جعفر صادقؑ نے روشنی کی حرکت، رفتار اور یہ کہ روشنی چیزوں سے ہماری آنکھ کی طرف آتی ہے، کے متعلق جو کچھ کہا اس کی اہمیت لیزر شعاعوں کی تھیوری سے زیادہ ہے۔ کیونکہ لیزر شعاعوں کی تھیوری کے بارے میں آپ سے پہلے بھی اظہار خیال ہو چکا تھا لیکن جو کچھ آپ نے روشنی کی رفتار، حرکت اور ایک جگہ اکٹھا ہونے کے بارے میں کہا، صرف آپ کی ذات سے مخصوص ہے۔ پرانے وقتوں میں مختلف اقوام کے درمیان یہ عقیدہ پایا جاتا تھا کہ روشنی اجسام کو متحرک کر سکتی ہے۔ ازمنہ قدیم میں یہ عقیدہ پایا جاتا تھا کہ روشنی ہر چیز سے گزر سکتی ہے اور اجسام کو متحرک کر سکتی ہے یہاں تک کہ پہاڑ بھی اس کے عبور کی راہ میں حائل نہیں ہو

سکتا۔ ان لوگوں کے مطابق عام روشنی پہاڑ سے نہیں گزر سکتی اور نہ ہی اسے متحرک کر سکتی ہے لیکن اگر طاقتور روشنی پیدا ہو تو وہ پہاڑ کے درمیان سے گزر کر اسے متحرک کر سکتی ہے اور یہ بات طاقتور روشنی کی صوابدید پر ہے کہ وہ پہاڑ کے درمیان سے گزر کر اسے متحرک کر دے۔

اس نظریہ کی طبیعیاتی وجہ کی وضاحت کہیں بھی نہیں کی گئی۔ لیکن تمام اقوام کے درمیان یہ عقیدہ موجود تھا' اور جن مذاہب کی تاریخ تک آج ہماری رسائی ہے ان کے وجود میں آنے سے پہلے بھی یہ عقیدہ رائج تھا۔ کیونکہ مذاہب پر ایمان لانے سے پہلے انسان جادوگری کا معتقد تھا اور دین اور جادوگری کے درمیان کوئی فرق نہ تھا۔ اور یہ عقیدہ کہ روشنی پردوں سے گزر کر اجسام کو متحرک کر سکتی ہے' جادوگری سے لیا گیا ہے۔ہمیں جادوگری کے اس عقیدے کی ابتدا کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں اور جن لوگوں نے اس بارے میں کچھ کہا بھی ہے وہ محض فرض کی حد تک ہے' مختصر یہ کہ کوئی ایسا ماخذ نہیں ملتا جس سے ہمیں یہ پتہ چل سکے کہ پہلے پہل یہ عقیدہ کس قوم میں وجود میں آیا ؟

اگر ہم روشنی کے توانائی ہونے کے نظریئے کو ترک کر دیں تو جو کچھ امام جعفر صادقؑ کی تھیوری میں روشنی کی رفتار کے بارے میں کہا گیا ہے وہی کچھ ہے جو آج ہم جانتے ہیں ' روشنی کی رفتار تین لاکھ کلو میٹر فی سیکنڈ بتائی گئی ہے یہ رفتار اتنی تیز نہیں ہے کیونکہ جدید پیمانوں کے مطابق ایک سیکنڈ ایک لمبی مدت ہے اور ستاروں کے فاصلوں کو مدنظر رکھیں تو تین لاکھ کلو میٹر ایک مختصر فاصلہ ہے لیکن قدیم پیمانوں کے لحاظ سے تین لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ اچھی خاصی تیز رفتار ہے۔ پس روشنی کی رفتار کو اخذ کرنے کے لحاظ سے امام جعفر صادقؑ نے پہل کی ہے جیسا کہ ہم نے تذکرہ کیا ہے کہ امام جعفر صادقؑ کی ثقافت چار ارکان پر استوار ہے اور ان ارکان کے نام بھی لئے ہیں۔ اس ثقافت کی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ یہ خشک تعصب اور گاڑھے پن سے مبرا ہے۔ اور امام جعفر صادقؑ کی مذہبی ثقافت کے بنیادی محرکات میں سے ایک یہ ہے کہ آپ نے خشک تعصب اور گاڑھے پن سے دوری برتی اور شیعہ فرقے کے پیروکاروں کو کوئی ایسا بہانہ یا دستاویز نہیں دی جس کی وجہ سے شیعوں میں تفریق پیدا ہو اور شیعہ فرقہ میں طرح طرح کے فرقے بن جائیں۔

امام جعفر صادقؑ نے جب بھی پیغمبرؐ اسلام یا اپنے آباء و اجداد میں سے کسی بزرگ کا تعارف کرانا چاہا تو انہیں ایک عام انسان کی طرح پیش کیا اور ان میں کسی کو خدا کی صف نہیں جانا۔ اور انہیں عالم بشر سے برتر کوئی مخلوق شمار نہیں کیا اور نہ ہی اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ وہ اللہ اور انسان کے درمیان میں کوئی انوکھی مخلوق ہیں۔ اگر آپ ایسا نہ کرتے تو شیعوں میں اختلاف پیدا ہو جاتا کیونکہ اس طرح یہ بحث جاری ہو جاتی کہ اللہ تعالیٰ اور انسان کے درمیان کتنا فاصلہ ہے اگر اللہ تعالیٰ اور انسان کے درمیانی فاصلے کو ۱۸۰ درجے فرض کر لیں اور اللہ کا آخری یعنی ۱۸۰ واں درجہ ہو اور انسان کا پہلا درجہ ہو تو کیا پیغمبرؐ اسلام کا درجہ ۹۰ ہو گا یا ۱۰۰ یا ۱۵۰ کے

فاصلے پر ہوں گے۔ شاید یہ کہا جائے کہ اگر امام جعفر صادقؑ یہ کہتے کہ پیغمبرؐ اسلام اور آپؐ کے آباء واجداد اللہ تعالیٰ اور بنی نوع انسان کے درمیان ہیں تو یہ بحث وجود میں نہ آتی کہ آپ خدا سے نزدیک ہیں یا بنی نوع انسان سے؟ لیکن بعض مذاہب میں ایسی بحثیں وجود میں آ چکی ہیں۔

پس امام جعفر صادقؑ اور ان کے خویش و اقرباعام بشری تھے اور انہوں نے ان کو کبھی بھی لبادہ الوہیت نہیں پہنایا اور یہ ہرگز نہیں فرمایا کہ وہ ہستیاں کوئی مافوق البشر مخلوق تھیں۔ نہ ہی کوئی ان کے بارے میں روحانی غلو یا مبالغہ آرائی کی ہے۔

آپ کے بعد تیسری صدی میں شیعہ چند فرقوں میں بٹ گئے جو عرفانی فرقے کہلاتے ہیں۔ ان فرقوں میں اس قدر تعصب پیدا ہو گیا کہ گویا ان میں سے ہر ایک جدا مذہب ہے۔ ہم نے یہ مشاہدہ کیا ہے کہ جعفری مذہب کی ثقافت کے ارکان میں عرفان ایک اہم رکن تھا لیکن امام جعفر صادقؑ کا عرفان معتدل تھا' آپ عرفان کو شیعہ کی بہتر شناخت کی حد تک مفید خیال کرتے تھے نہ یہ کہ عرفان اس حد سے تجاوز کر کے ایک نئے مذہب کی صورت میں ابھرے۔ لیکن وہ شیعہ عرفانی فرقے جو تیسری صدی کے بعد وجود میں آئے انہوں نے مبالغہ آرائی کی یہاں تک کہ وہ خالق و مخلوق کے ایک ہی ہونے کے معتقد ہو گئے۔ جبکہ امام جعفر صادقؑ اس کے صریحاً خلاف تھے۔

ان میں سے بعض نے اس قدر مبالغہ آرائی سے کام لیا کہ خالق و مخلوق میں انسان کو خالق سے بہتر خیال کرنے لگے جو شیعہ مذہب کے عقیدے کے مطابق کفر ہے۔ لیکن ان تمام عرفانی فرقوں نے جعفری مذہب کی ثقافتی آزادی سے فائدہ اٹھایا کیونکہ جس طرح ہم نے عرض کیا ہے کہ اس ثقافت میں کسی کو کوئی نظریہ پیش کرنے کے جرم میں سزا نہیں دی جاتی تھی۔ لیکن امام جعفر صادقؑ اور ان کے شاگردوں نے مقفع کے قول کو اسی طرح رد کیا جس طرح آپ کے شاگردوں نے ابن راوندی کے قول کو رد کیا۔ امام جعفر صادقؑ کے بعد وجود میں آنے والے تمام عرفانی فرقوں میں خالق اور مخلوق کی وحدت (ایک ہونا) دیکھی جاتی ہے ان میں فرق صرف اتنا ہے کہ بعض میں خالق و مخلوق کی وحدت کا تصور بلا واسطہ ہے اور بعض میں بالواسطہ۔ ان فرقوں میں سے بعض میں یہ تصور ہے کہ آدمی جو بھی ہو خدا اور اس کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ دوسرے فرقوں میں عام افراد کی خداوند تعالیٰ کے ساتھ وحدت کا تصور نہیں بلکہ پیغمبرؐ بارہ امامؑ اور خداوند تعالیٰ مل کر ایک وجود تشکیل دیتے ہیں۔ بعض ایسے فرقے پیدا ہوئے کہ ان میں فرقے کا رہنما' پیر یا قطب یا غوث' خداوند تعالیٰ سے مل کر ایک ہی وجود تشکیل دیتا ہے۔

ان شیعہ فرقوں کے پیروکار اپنے قطب کا اتنا احترام کرتے تھے کہ اسے آئمہؑ اور حتیٰ کہ پیغمبرؐ سے بھی زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ لیکن ان کی زبان سے کبھی نہ سنا گیا کہ قطب' آئمہؑ یا پیغمبرؐ سے برتر ہے یا وہ ڈرتے ہوں گے کہ اگر یہ کہیں گے کہ ان کا پیر آئمہؑ یا پیغمبرؐ سے برتر ہے تو وہ کافر ہو جائیں گے۔

ان فرقوں کا عرفانی عقیدہ قدیم مصری لوگوں کے اوزیریس سے متعلق عقیدے سے مشابہ ہے۔ یہ لوگ متعدد خداؤں کے قائل تھے۔ لیکن آمون را کو دوسرے خداؤں سے برتر خیال کرتے تھے اور مختصراً" اسے آمون کہتے تھے۔ مصریوں کے عقیدے کے مطابق آمون خداؤں کا خدا تھا۔ لیکن اوزیریس جو موت کا خدا تھا اس کے باوجود کہ وہ آمون کے ماتحتوں میں سے تھا۔ خداؤں کے خدا سے زیادہ مقتدر تھا اور خداؤں کے خدا سے برتر کام کرتا تھا۔ اور اس کی قدرت اس قدر تھی کہ وہ آمون کو موت کی دھمکی دیتا تھا اور آمون بھی اس کی دھمکی کے سامنے جھک جاتا تھا۔ حالانکہ خداؤں کے خدا کے پاس اتنی طاقت ہونی چاہیے تھی کہ سب اس کے سامنے سرنگوں ہوتے۔

امام جعفر صادقؑ شیعہ مذہب میں متعدد فرقے پیدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اگرچہ آپ کے بعد کئی عرفانی فرقے وجود میں آئے لیکن ان میں سے کسی نے شیعہ مذہب کے اصول کی مخالفت نہیں کی اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ شیعوں کے درمیان پیدا ہونے والے عرفانی فرقے نے شیعہ نہ ہونے کا دعویٰ کیا ہو یا یہ کہا ہو کہ وہ اس مذہب کے آئمہؑ کا معتقد نہیں ہے۔

حتیٰ کہ اسماعیلیہ فرقہ بھی (یہ ایک مذہبی فرقہ ہے نہ کہ عرفانی) جو امام جعفر صادقؑ تک شیعوں کے تمام آئمہ کو برحق سمجھتا ہے۔ شروع میں اسماعیلی فرقے کی مذہبی ثقافت کی بنیاد جعفری مذہب کی ثقافت پر تھی لیکن بعد میں جب اس فرقے میں توسیع ہوئی تو یہ چند مذہبی ثقافتی مکاتب میں تقسیم ہو گیا۔ اس کے بعد کے ادوار میں حب جاہ و مال کی وجہ سے اسماعیلیوں میں تفرقہ پڑ گیا۔ یہ تفرقہ اسماعیلیوں میں بدعات رائج ہونے کا سبب بنا' ورنہ اسماعیلیوں کی پہلی قوت جو بعد میں چند فرقوں میں بٹ گئی۔ اس کا تعلق امام جعفر صادقؑ کی مذہبی ثقافت سے تھا۔

فاطمی خلفاء جنہوں نے ۲۶۷ سال حکومت کی' انہوں نے امام جعفر صادقؑ کی مذہبی ثقافت سے طاقت حاصل کی۔ پہلا فاطمی خلیفہ عبیداللہ تھا جو شام میں شیعوں کا پیشوا شمار ہوتا تھا اور اس نے تیسری صدی ہجری کے دوسرے پچاس سالوں میں عباسی خلفا کی مانند اپنے آپ کو خلیفہ کہلوایا۔ اس نے بعد میں لیبیا پر قبضہ کیا اور اسے اپنی خلافت کا مرکز قرار دیا۔

بعض لوگوں کا خیال تھا کہ فاطمیوں کی خلافت ایک مقامی حکومت تھی جب کہ فاطمی شیعہ ایک شہنشاہیت وجود میں لائے تھے۔ عبیداللہ کے جانشینوں نے آہستہ آہستہ جنوبی اٹلی میں واقع جزیرہ سسلی اور حجاز کے مغربی حصے' فلسطین' شام اور مصر پر قبضہ جما لیا۔ اس طرح قاہرہ شہر فاطمیوں کی شہنشاہیت کا دار الحکومت بن گیا لیکن فاطمیوں نے بدعت ایجاد کی اور چھٹا فاطمی خلیفہ الحکیم چوتھی صدی ہجری کے دوسرے حصے کے دوران سختی سے عرفان میں مشغول ہو گیا لیکن یہ امام جعفر صادقؑ کا عرفان نہیں بلکہ وہ عرفان تھا جس میں وحدت وجود کا عقیدہ تھا۔

وحدت وجود کے عرفانی عقیدے کا خلاصہ یہ ہے کہ اس مکتب کے پیروکار کو عارف کہتے تھے۔ ان کا عقیدہ

تھا کہ اگر ہم کہیں کہ خدا نے دنیا کو تخلیق کیا ہے تو لازمی بات ہے کہ کسی نے خدا کو بھی تخلیق کیا ہوگا اور اس طرح وہ بھی دوسری مخلوق شمار ہوتی ہے اور یہ چکر اور تسلسل ہرگز ختم نہیں ہوتا اور ہر خالق جس نے کسی چیز کو خلق کیا ضرور اسے بھی کسی دوسرے نے تخلیق کیا ہے۔

خدا کی شناخت کے معاملے میں یہ مشکل صرف اس صورت میں حل ہوتی ہے کہ خالق و مخلوق کی وحدت کا اقرار کیا جائے اور جب اس بات کے قائل ہو جائیں کہ خدا اور بشمول انسان کے جو کچھ اس نے تخلیق کیا ہے ایک ہی ہے' اس صورت میں یہ سوال پیش نہیں آتا کہ خدا کو کس نے خلق کیا ہے۔ چھٹا فاطمی خلیفہ عرفان میں کثرت مبالغہ کی وجہ سے اس فکر میں پڑگیا کہ اپنے آپ کو خدا کہلوائے اور لوگوں سے کہے کہ وہ خداوند ہے۔

اس ضمن میں ایک افسانہ بھی ملتا ہے کہ بعض لوگوں نے اس افسانے کو قدیم مصر کے فراعنہ میں سے کسی ایک سے منسوب کیا ہے جبکہ یہ افسانہ الحکیم سے مربوط ہے۔ مختصراً" اس طرح ہے کہ جب الحکیم نے خدائی کا دعویٰ کرنا چاہا تو اس کے وزیر نے اسے ایسا کرنے سے منع کیا اور کہا کہ لوگ تمہاری ربوبیت کو تسلیم نہیں کریں گے لیکن الحکیم نے کہا وہ اپنے آپ کو خدا سمجھتا ہے اور لوگوں کو بھی اسے خدا کہنا چاہئے۔ وزیر نے کہا پس تم حکم دو کہ لوگ گندم کی بجائے باقلہ دال کی ایک قسم کاشت کریں تاکہ سب کی اصلی غذا گندم کے بجائے باقلہ ہو۔ الحکیم نے بھی قدغن لگائی کہ اب کسان باقلہ کاشت کریں گے۔ گندم کاشت نہیں کریں گے۔ سات سال بعد جب وزیر ایک پل سے گزر رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ ایک چھوٹے قد والا شخص ایک بڑے قد والے شخص سے لڑ رہا ہے وزیر ان دونوں کے قریب گیا اور انہیں چھڑا کر جھگڑے کا سبب دریافت کیا۔ چھوٹے قد والے شخص نے کہا' اس شخص نے میرے بیٹے کو مار ڈالا ہے' وزیر نے بڑے قد والے شخص سے پوچھا کیا واقعی تو نے اس شخص کے بیٹے کو مار ڈالا ہے؟ اس شخص نے ایک نعل اپنی جیب سے نکالا اور کہا کہ میں نے یہ نعل گلی میں سے پایا ہے میرا خیال ہے کہ میں ایک گھوڑا خریدوں گا اور اس نعل کو اس کے سم میں نصب کروں گا اور اس گھوڑے کی باگ کو اس دروازے کی چوکھٹ کے ساتھ باندھوں گا۔ چھوٹے قد والے شخص نے کہا یہ دروازہ میرا ہے اور یہاں میرا گھر ہے اور میرا ارادہ ہے کہ شادی کروں گا' پھر میرا بیٹا ہوگا' بیٹا جب کھیلنے کے لئے گلی میں نکلے گا تو اس دروازے سے بندھا اس شخص کا گھوڑا اسے لات مار کر مار دے گا' اس طرح یہ چھوٹے قد والا شخص دوبارہ بڑے قد والے شخص پر برس پڑا۔ وزیر نے ان دونوں کو اپنے حال پر چھوڑا اور الحکیم کے پاس جاکر کہا کہ اب تم خدائی کا دعویٰ کر سکتے ہو کیونکہ لوگوں نے سات سال تک گندم نہیں کھائی لہٰذا اب ان کی عقل زائل ہو گئی ہے۔ جو بات اس روایت کے افسانہ ہونے کی نشاندہی کرتی ہے وہ عقل پر باقلہ کا منفی اثر ہے جس میں صحت نہیں ہے کیونکہ باقلہ زیادہ کھانے سے ممکن ہے صحت پر برا اثر پڑے لیکن اس سے عقل زائل نہیں ہوتی۔

الحکیم نے خدائی دعویٰ کیا اور اگر اس سے کسی نے دلیل چاہی تو جواب دیا کہ خداوند کائنات و مخلوق ایک

ہی ہیں اور چونکہ میری خالق کے ساتھ وحدت ہے لہٰذا میں خدا ہوں اور آپ کو میری پرستش کرنا چاہیے۔ کہا جاتا ہے کہ صلاح الدین ایوبی نے فاطمی خلیفہ کو خدائی دعویٰ کرنے کی پاداش میں قتل کرنے کے لئے مصر پر یلغار کی اور قاہرہ پر قبضہ کر لیا۔ لیکن الحکیم کے خدائی دعویٰ کرنے کے زمانے اور صلاح الدین ایوبی کے مصر میں داخلے کے زمانے میں ایک سو اکاون سال کا فاصلہ ہے۔ صلاح الدین ایوبی الحکیم کے دعویٰ کرنے کے ایک سو اکاون سال بعد قاہرہ میں وارد ہوا۔ لیکن یہ بات ثابت شدہ ہے کہ فاطمیوں کی خلافت کی مشینری کا صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں صفایا ہوا۔ الحکیم ربوبیت کا دعویٰ کرنے کے لئے چند مراحل سے گزرا۔

پہلے مرحلے میں اس نے وہی کچھ کیا جو اس کے ہم مسلک عرفا کہتے تھے اس نے یہ اظہار کیا کہ خالق و مخلوق ایک ہی ہے اور اس نے اس مرحلے سے تجاوز نہیں کیا اس کے بعد اس نے کہا کہ اس نے محسوس کیا ہے کہ خداوند نے اس کے اندر حلول کیا ہے اور یہ (اس کے بقول) کوئی عجیب بات نہیں کیونکہ خداوند تعالیٰ تمام مخلوقات میں موجود ہے لہٰذا وہ اس میں بھی ہے۔

الحکیم نے آج کے شہرت طلب لوگوں کی رسم کے مطابق اپنے آپ کو مشہور کرنے کی غرض سے پروپیگنڈے کے لئے مصر، شام، فلسطین اور ان تمام ممالک میں جو فاطمیوں کی قلمرو میں آتے تھے۔ ایک گروہ کو مامور کردیا اور کہا کہ خدا نے خلیفہ میں حلول کیا ہے۔ یہ مہم چوتھی صدی ہجری کے دوسرے پچاس سالوں کے دوران چلائی گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اسلامی ممالک میں تصوف اور عرفان کے مسالک میں مشائخ اور اقطاب سے ہر زمانے سے زیادہ عقیدت پائی جاتی تھی۔

چوتھی صدی ہجری اسلامی ممالک میں علمی ترقی کی صدی ہے لیکن اس علمی ترقی کے ساتھ ساتھ اقطاب و مشائخ سے عقیدت میں بھی توسیع ہوئی۔ تعلیم یافتہ لوگ بھی تصوف اور عرفان کے فرقوں سے وابستہ ہو رہے تھے۔ اس زمانے کا تقاضا تھا کہ ہر کوئی کسی نہ کسی عرفانی یا تصوف کے فرقے سے وابستہ ہو تاکہ دوسرے لوگوں سے پسماندہ نہ رہ جائے۔ اس وقت یہ تصور تھا کہ اگر کوئی کسی عرفانی یا تصوف کے فرقے سے وابستہ نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ زمانے کی چال نہیں چلا یعنی بے مرشد ہے۔

اس کے علاوہ جو باتیں اس زمانے کے لحاظ سے ضروری تھیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ جو کوئی تصوف یا عرفان کے ایک فرقے کی رہبری کا دعویٰ کرتا اس کے لئے ضروری تھا کہ اس کے پاس کرامت بھی ہوتی اور اس کے پیروکار اس سے غیر معمولی باتیں دیکھیں اور غیر معمولی باتیں تاریخی صورت میں نقل ہوتی تھیں اور اس سے مسلسل ایسی باتیں ہوتی رہی تھیں اور کوئی یہ نہ کہتا تھا کہ اس نے ایک پیر یا قطب میں کوئی غیر معمولی بات پائی ہے بلکہ یہ کہتا تھا کہ اس نے گزشتہ زمانے میں اس طرح کیا تھا۔ لیکن چونکہ اکثر اقطاب اور مشائخ پرہیزگار اشخاص تھے۔ جب ان کے پیروکار ان سے منسوب غیر معمولی باتیں سنتے تو اگرچہ وہ آنکھوں سے نہ بھی

دیکھتے تو بھی قبول کر لیتے تھے۔ ایک ایسے دور میں جب مختلف فرقوں کے مرشدوں کا کرامات دکھانا ایک عام بات تھی' لوگوں نے جب سنا کہ خداوند نے خلیفہ میں حلول کیا ہے تو لوگ زیادہ حیران نہیں ہوئے اس کے بعد فاطمی خلیفہ ربوبیت کے آخری مرحلہ میں داخل ہوا اور علی الاعلان کہا کہ وہ خدا ہے اور لوگوں کو اس کی پرستش کرنا چاہیے۔

پہلے اور دوسرے مرحلے میں جو کچھ الحکیم نے کہا وہ اس زمانے کے عارفوں کے نظریات کے مطابق تھا اور اس کی بنیاد وحدت وجود پر تھی۔ لیکن جب الحکیم نے کہا کہ وہ خدا ہے اور لوگوں کو اس کی عبادت کرنا چاہئے تو لوگ حیران رہ گئے اور نقادوں کی زبان کھل گئی۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ الحکیم اور سارے فاطمی خلفا شیعہ تھے اور شیعہ کا عقیدہ یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ آٹھ صفات ثبوتیہ رکھتا ہے اور آٹھ منفی صفات رکھتا ہے جنہیں صفات سلبیہ کہا جاتا ہے جنہوں نے خلیفہ پر اعتراض کیا انہوں نے کہا کہ خدا کی صفات ثبوتیہ میں سے ایک یہ ہے کہ وہ حی ہے یعنی کبھی نہیں مرے گا جبکہ خلیفہ حی نہیں ہے اور جب اس کی عمر پوری ہو جائے گی تو اس جہان سے کوچ کر جائے گا۔ خلیفہ اس تنقید سے پیچھے نہیں ہٹا اور کہا کہ حی (زندہ) ہونے سے مقصود ہے کہ خداوند تعالیٰ ہمیشہ سے ہے لیکن اس کے ہونے کی یہ دلیل نہیں ہے کہ اس میں تبدیلی ہی نہیں آئے گی۔ خداوند میں تبدیلی آتی ہے اور اس تبدیلی کو ہم موت کی صورت میں دیکھتے ہیں لیکن ہماری موت حقیقی موت نہیں ہے بلکہ موت ایک ظاہری تبدیلی ہے اور میں حی ہوں اور کبھی نہیں مروں گا۔ جو کچھ آپ کی نظر میں موت ہوگی وہ فقط میرے لباس میں تبدیلی ہوگی' مخالفوں نے کہا کہ خداوند تعالیٰ قادر ہے اور جو کچھ چاہے کر سکتا ہے پس خلیفہ کو بھی اس بات کا ثبوت پیش کرنا چاہئے کہ وہ ہر کام کی قدرت رکھتا ہے۔ خلیفہ نے مخالفوں کو جواب دیتے ہوئے کہا چونکہ خداوند تعالیٰ عالم ہے اور اس نے ہر چیز کی پیشین گوئی کر دی ہے جو کچھ انجام دینا چاہیے تھا وہ اس نے انجام دیا ہے اور اب کوئی ایسا کام باقی نہیں رہا جسے انجام دینے کی ضرورت ہو لہٰذا آج اور آئندہ خداوند تعالیٰ سے کوئی جدید کام نہیں دیکھا جائے گا اور یہ کہ خداوند کسی ناممکن کام کو انجام نہیں دیتا اور کسی کو اس سے ناممکن کام کی توقع نہیں رکھنی چاہیے خلیفہ سے کہا گیا کہ خداوند کی صفات ثبوتیہ میں سے ایک یہ ہے کہ وہ عالم ہے اور اس سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں اور اگر خلیفہ خداوند ہے اور عالم بھی تو جو مسائل اس سے پوچھے جائیں ان کا جواب دے اور دوسری اقوام کی زبان میں گفتگو بھی کرے۔ خلیفہ نے کہا خداوند کے عالم ہونے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ خدا اس علم سے بھی واقف ہو جس تک ہر ایک کی رسائی ہو۔

خلیفہ بولا' شرعی اور عرفی مسائل کا جواب دینا اور دوسری قوموں کی زبان میں کلام کرنا انسانی علوم کا حصہ ہے' جبکہ خداوند کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے' خداوند تعالیٰ کا علم وہ ہے جس سے انسان آگاہ نہیں' اور نہ ہی آگاہ ہو سکے گا۔ میرا رتبہ اس سے کہیں بلند ہے کہ تمہارے شرعی اور عرفی مسائل کا جواب دوں اور دوسری

اقوام کی زبان سے گفتگو کروں۔ کہا گیا کہ خلیفہ خداوند ہے' اور علوم الٰہی سے آگاہ' پس ان علوم میں سے کچھ ہمارے لئے ارشاد کرے تاکہ ہم ان علوم سے بہرہ مند ہو سکیں۔ خلیفہ نے کہا' انسانی کان' خداوند کے علمی اسرار کو سننے کے لائق نہیں۔ اور انسانی عقل علوم الٰہی کا ادراک نہیں کر سکتی اور اگر میں اپنے علوم الٰہی کا ایک ذرہ آپ کے سامنے پڑھوں تو آپ سب لوگ ایک لمحے میں مر جائیں۔ لہٰذا کبھی اپنی زندگی میں ایسے علوم سے مستفید ہونے کی توقع نہ رکھنا۔

معتزلہ فرقہ کے مشائخ میں سے ایک کا نام ابوطالب محمد بن خوریٖ تھا' کہا اگر محبوب کی رفاقت میسر آئے تو جان قربان کرنے میں کیا مضائقہ ہے اور اگر خداوند تعالیٰ اپنے علوم الٰہی میں سے کچھ حصہ مجھے سکھائے اور مجھے اس سے آگاہ کرے تو میں خوشی خوشی اپنی جان اس پر فدا کردوں گا اور کہا جاتا ہے کہ جو کوئی حقیقت پا لیتا ہے ۔ جاتا ہے۔ کیونکہ حقیقت اس قدر بڑی' موثر اور روشن ہوتی ہے کہ آدمی حقیقت سے آگاہ ہونے کے بعد زندہ نہیں رہ سکتا۔ خلیفہ کہنے لگا اے محمد بن خوریٖ' میں تیری درخواست قبول کرتا ہوں اور تجھے اپنے علم کا ایک حصہ لکھواؤں گا لیکن یقین جان کہ تو مر جائے گا۔ محمد بن خوریٖ ہر روز منتظر رہتا تھا کہ خلیفہ اسے بلوائے گا اور اپنے الٰہی علوم سے آگاہ کرے گا لیکن الحکیم نے کبھی اس شخص کو حاضر ہونے کا حکم نہیں دیا۔ حتیٰ کہ محمد بن خوریٖ کسی ناگہانی بیماری کی وجہ سے انتقال کر گیا۔ صبح جب خلیفہ کو اس کے مرنے کی اطلاع ملی تو الحکیم نے کہا میں نے اس سے کہا تھا کہ انسانی جسم' روح علم الٰہی کو برداشت نہیں کر سکتا اور اگر میں اپنے علم کا تھوڑا سا حصہ اسے سکھاؤں تو وہ مر جائے گا۔ جبکہ وہ میرے علم الٰہی سے بہرہ مند ہونے پر مصر رہا اور اسی اصرار کی وجہ سے اس نے جان دے دی۔ اس زمانے کے سادہ لوح لوگوں نے خلیفہ کے قول پر یقین کر لیا' اس گروہ نے بھی جسے اس بات کا علم تھا کہ خلیفہ خدا نہیں ہے جو علم الٰہی رکھتا ہو۔ اس زمانے کے تقاضے کے پیش نظر اس طرح اظہار کیا جیسے انہیں خلیفہ کی باتوں کا یقین ہو۔ خلیفہ کے خدائی دعوے کے باوجود اس کی سلطنت میں بسنے والے شیعوں میں امام جعفر صادقؑ کی مذہبی ثقافت کی روح حکم فرما تھی اور ہم نے دیکھا کہ جعفری مذہب کی ثقافت کی خوبیوں میں سے ایک اظہار خیال کی آزادی تھی اور کسی کو اس بات پر تکلیف نہیں پہنچائی جاتی تھی کہ وہ مذہبی مسائل کے بارے میں اظہار خیال کیوں کرتا ہے؟

قدرتی بات ہے کہ جو شخص خدائی کا دعویٰ کرے نہیں چاہتا کہ لوگ اس پر تنقید کریں اور اس سے خدائی کی دلیل طلب کریں۔ لیکن چونکہ شیعہ ابھی تک جعفری مذہب کی ثقافتی آزادی سے بہرہ مند تھے لہٰذا الحکیم لوگوں کو تنقید کرنے سے نہیں روک سکتا تھا چنانچہ سابقہ روایت اسے لوگوں کی تنقید سننے سے مجبور کرتی تھی۔

محمد بن خوریٖ کی موت کے بعد تنقید ختم نہیں ہوئی اور لوگوں نے الحکیم سے چاہا کہ مردے کو زندہ کرے اور اس سے کہا گیا کہ خداوند اس بات پر قادر ہے کہ مردے کو زندگی بخشے اور خدا کے علاوہ کوئی بھی ایسی قدرت

نہیں رکھتا' اور اگر خلیفہ یہ چاہتا ہے کہ ہم اس کی خدائی پر ایمان لائیں تو اسے مردے کو زندہ کرنا ہوگا۔ جو لوگ خلیفہ کی قدرت کا مظاہرہ دیکھنے کے خواہشمند تھے' انہوں نے الحکیم سے ایک گھاس بیچنے والے کے باپ کو جسے مرے ہوئے تین سال ہو چکے تھے' زندہ کرنے کی درخواست کی اور کہا کہ اس شخص کا باپ چونکہ مرتے وقت لوگوں پر ایسا حساب واضح نہیں کر سکا اور اس کی موت کے بعد اس کے بیٹے اور قرض خواہوں کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا ہے لہٰذا اگر خلیفہ اس مردے کو زندہ کر دے تو نہ صرف یہ کہ ہم خلیفہ کی خدائی قدرت کا مشاہدہ کر لیں گے بلکہ مذکورہ اختلاف بھی ختم ہو جائے گا۔ کیونکہ مرنے والا زندہ ہونے کے بعد خود بتائے گا کہ کس سے اس نے قرض لینا ہے اور کس کو قرض دینا ہے۔ خلیفہ نے جستجو کی کہ اس گھاس بیچنے والے کی موت کے بعد اس کے بیٹے کے لئے کیا بچا ہے؟ جب اسے معلوم ہو گیا کہ گھاس بیچنے کی دکان کے علاوہ بیٹے کے لئے کچھ پونجی' شہر میں ایک مکان اور شہر کے باہر ایک باغ باقی بچا ہے تو کہا کہ میں تو مردے زندہ کر سکتا ہوں لیکن اس کا بیٹا اس کے زندہ ہونے پر خوش نہیں ہے۔ کیونکہ اگر باپ زندہ ہو جائے گا تو بیٹا تین سال سے جس میراث پر بیٹھا ہے اسے وہ باپ کو واپس دینا پڑے گی۔ جب گھاس بیچنے والے نے یہ بات سنی تو اس بات سے خوف کھا کر کہ کہیں خلیفہ اس کے باپ کو زندہ نہ کر دے اور وہ حاصل شدہ میراث سے ہاتھ دھو بیٹھے' اس نے باپ کے قرض خواہوں سے صلح کر لی۔

لیکن وہ لوگ جو خلیفہ کی قدرت دیکھنا چاہتے تھے انہوں نے خلیفہ سے مردے کو زندہ کرنے پر اصرار کیا جب الحکیم نے اپنے آپ کو دباؤ میں دیکھا تو کلام خدا کی غلط تفسیر بیان کی اور کہا کہ مسلمانوں کا ایمان ہے کہ خدا نے آسمانی کتاب میں فرمایا ہے وہ زندہ کو مردے سے خارج کرتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے۔ مسلمانوں کے اس عقیدے اور خدا کے قول کے مطابق خداوند تعالیٰ مسلسل زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکال سکتا ہے۔ لیکن الحکیم نے کہا' خداوند کے اس قول کے مطابق کبھی خداوند زندہ کو مردے سے نکالتا ہے اور کبھی مردہ سے زندہ کو' اور میں تمہاری تسلی کے لئے مردہ کو زندہ سے نکالتا ہوں۔ تنقید کرنے والوں نے کہا' یہ کام تو سارے قصائی روز انجام دیتے ہیں اور مرنے والی بھیڑوں کو زندہ بھیڑوں سے نکال دیتے ہیں۔ اگر خلیفہ حقیقی معنوں میں خداوند ہے تو اسے انسان یا کم از کم کسی حیوان کو بھی مرنے کے بعد زندہ کرنا چاہیے۔ خلیفہ نے کہا کہ وہ یہ کام کسی خاص وقت پر کرے گا۔ جس کا تعین بھی وہ خود کرے گا۔ لیکن چونکہ نقادوں نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا اور اسی طرح خلیفہ سے خدائی دعویٰ ثابت کرنے پر مصر رہے' تو الحکیم اس تنقید سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جان چھڑانے کی خاطر جعفری مذہب کی ثقافت میں بدعت وجود میں لایا وہ یہ کہ مذہبی مسائل کے بارے میں آزاد بحث پر پابندی لگادی۔

جیسا کہ ہم نے تذکرہ کیا کہ جعفری مذہب میں ہر طرح کی مذہبی بحث کی آزادی شیعہ مذہب کا بنیادی رکن

اور اس کی تقویت کا باعث تھی۔ جو لوگ اعتراض کرتے تھے انہیں امام جعفر صادقؑ اور ان کے بعد آپ کے شاگرد اور اس کے بعد ان کے دوسری اور تیسری نسل کے شاگرد جواب دیتے تھے۔ تمام شیعہ قلمرو میں کسی ایک بابصیرت انسان کو بھی مذہبی مسئلے پر اعتراض کرنے کی بنا پر اذیت نہیں پہنچائی جاتی تھی۔

الحکیم نے یہ آزادی چھین لی اور اس نے اپنے حکم کو شرعی حکم قرار دینے کے لئے کہا جو کوئی خدا کا منکر ہے اور خدا کے کاموں پر اعتراض کرتا ہے وہ مرتد اور واجب القتل ہے اور خداوند تعالیٰ کی ثبوتیہ اور سلبیہ صفات کے بارے میں ہر قسم کی بحث منع ہے۔

یہ پہلا قدم تھا جو الحکیم نے جعفری مذہب کی ثقافت کی آزادی کو محدود کرنے کے لئے اٹھایا اور اس کے بعد کسی کو جرات نہ ہوئی کہ خدائی دعویٰ کرنے والے شخص کی صفات ثبوتیہ اور سلبیہ کے بارے میں بحث کرے۔ الحکیم کی یہ پابندی ان مسائل میں شامل ہو گئی جو خداوند تعالیٰ کی صفات ثبوتیہ اور سلبیہ سے متعلق تھے۔ مختصر یہ کہ جو شیعہ الحکیم کی خلافت کی حدود میں رہ رہے تھے انہیں یہ حق حاصل تھا کہ توحید کے متعلق بحث کریں البتہ صرف اسی صورت میں جب وہ الحکیم کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوں اور اس کے دعویٰ کی تائید کرتے ہوں۔

لیکن لوگ مذہب شیعہ کے متعلق تمام مسائل کے بارے میں بحث کرنے کے لئے آزاد تھے اور خلیفہ انہیں ان بحثوں پر آزار نہیں پہنچاتا تھا۔ جن لوگوں کا خیال ہے کہ حسن بن صباح نے دعویٰ کرنے سے پہلے الحکیم سے الہام لیا تھا وہ غلطی پر ہیں کیونکہ الحکیم کے خدائی دعویٰ کرنے اور حسن بن صباح کے تعلیم حاصل کرنے کے لئے مصر جانے کے درمیان ۸۰ سال کا فاصلہ ہے الحکیم نے چوتھی صدی ہجری کے آخر میں خدائی کا دعویٰ کیا جبکہ حسن بن صباح پانچویں صدی ہجری کے نصف حصے دوران علم حاصل کرنے کے لئے مصر گیا' اور جب الموت میں منتقل ہوا تو خدائی دعویٰ نہیں کیا' اس نے الموت منتقل ہونے کے بعد پہلے چند سال مسلسل چلے میں گزارے اور دوسرا یہ کہ جب حسن بن صباح تعلیم حاصل کرنے کے لئے مصر میں منتقل ہوا تو اس نے قدیم ایرانی تاریخ سے آگاہی حاصل کی۔

شاید قدیم ایرانی تاریخ سے آگاہی اس نے قدیم اسکندریہ کے علمی مکتب کی باقیات سے حاصل کی ہو۔ یہ مکتب جو کسی تعریف کا محتاج نہیں اس نے قدیم یونان کے علم و ادب سے استفادہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ حسن بن صباح نے الموت میں قیام کے بعد جو تحریک شروع کی وہ صرف مذہبی نہیں تھی بلکہ اس کا قومی پہلو بھی تھا۔ اس صورت میں جب الحکیم کے خدائی دعوے اور حسن بن صباح کی تحریک جو بعد میں وجود میں آئی ہے کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ اور یہ بات قابل قبول نہیں کہ حسن بن صباح نے الحکیم سے الہام لیا تھا۔

سویڈن کی لونڈ (۹۴) یونیورسٹی میں مذہبی تاریخ کے شعبے کا استاد پروفیسر بریم کہتا ہے کہ الموت کے اسماعیلی ایرانی تاریخ سے دلچسپی رکھتے تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی تحریک میں قومیت کا مسئلہ خاصی اہمیت

کا حال تھا۔

ایک عرصے تک نقادوں کی زبان بند رہی لیکن جونہی خلیفہ نے نرمی اختیار کی وہ پھر چلانے لگے اور کہا کہ وہ خدا کی صفات ثبوتیہ و سلبیہ کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے' لیکن خلیفہ ان صفات کا مصداق نہیں ہے اور ان کا اعتراض اسی موضوع کے بارے میں ہے نہ کہ توحید کے بارے میں' کیونکہ کوئی بھی مسلمان خدا کی وحدانیت پر اعتراض نہیں کرتا۔ جب خلیفہ سمجھ گیا کہ یہ چھوٹے چھوٹے اعتراضات بڑے اعتراضات کے لئے تمہید بنیں گے تو اس نے پابندی لگائی کہ جو کوئی صفات ثبوتیہ اور سلبیہ کی خلیفہ سے مطابقت پر معترض ہوگا وہ مرتد اور واجب القتل ہے۔ اس پر جو زبانیں کھلنے والی تھیں یکسر ساکت ہوگئیں۔ خلیفہ کی خرابی صحت کی بنا پر اس کی تنقید پر نگرانی سست پڑ گئی جو لوگ اعتراض کرنا چاہتے تھے لیکن وہ موت کے ڈر سے زبان کشائی نہیں کر سکتے تھے کہ خلیفہ تو خدا ہے لہٰذا اس کا بیٹا نہیں ہونا چاہیے کیونکہ آسمانی کتاب میں نہایت واضح الفاظ میں ارشاد ہوا ہے کہ خدا نہ کسی سے پیدا ہوا اور نہ کوئی اس سے پیدا ہوگا اس کے برعکس خلیفہ کے چند بیٹے تھے۔ جس سے وہ انکار نہیں کر سکتا تھا اور جو محبت ہر باپ کو اپنے بیٹوں سے ہوتی ہے وہ اس کے انکار میں حائل تھی چونکہ وہ خدائی دعوے سے دستبردار نہیں ہونا چاہتا تھا اور نہ ہی اپنے بیٹوں کا انکار کر سکتا تھا۔ کہنے لگا اگر خدا کا بیٹا ہو تو کیا حرج ہے کیا عیسیٰؑ خدا کا بیٹا نہیں تھا اور کیا حدیث میں وارد نہیں ہوا کہ تمام بندے خدا کے بیٹے ہیں (۹۵) جو کچھ الحکیم نے عیسیٰؑ کے بارے میں کہا اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس نے عیسائیوں کے عقائد کا ایک حصہ شیعوں کے مذہب میں داخل کردیا اور جو لوگ اس کے باوجود کہ عیسیٰؑ کو پیغمبر اور خدا کا بھیجا ہوا مانتے تھے یہ عقیدہ نہیں رکھتے تھے کہ وہ خدا کا بیٹا ہے۔ شیعوں کے علاوہ کوئی دوسرا مسلمان بھی نہیں مانتا تھا کہ خدا کا بیٹا ہو سکتا ہے۔ لیکن فاطمی خلیفہ الحکیم نے محض اس لئے کہ بیٹوں کی موجودگی اس کے خدائی دعوے میں حائل نہ ہو کہا کہ خدا کے بیٹے بھی ہو سکتے ہیں اور چونکہ خدا کی اولاد ہونا جائز ہے لہٰذا خدا کے بیٹے اس کے بعد خدا بن سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے الحکیم کی حب جاہ و بزرگی جعفری ثقافت کو اس کی خلافت میں زبردست ٹھیس پہنچانے کا باعث بنی۔

لیکن یہ ٹھیس حقیقی اور روحانی پہلو کی حامل نہ تھی۔ کیونکہ کوئی بھی عقلمند شیعہ اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھا کہ خلیفہ خدا ہے' تمام شیعہ اس بات سے آگاہ تھے کہ اس کا دعویٰ بے بنیاد ہے۔ لیکن جان بچانے یا روزی کمانے کے لئے یا ان دونوں چیزوں کے لئے خاموش رہنے پر مجبور تھے۔ الحکیم نے محسوس کر لیا تھا کہ اگر عقلمند طبقے نے اس کے خدائی دعوے پر خاموشی اختیار کی ہے تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ انہوں نے اسے خدا تسلیم کر لیا ہے بلکہ انہوں نے محض خوف کی وجہ سے ایسی روش اختیار کی ہے پس اس نے اپنے خدائی دعویٰ کے عقیدہ کو لوگوں کے دلوں میں جاگزیں کرانے کے لئے امام جعفر صادقؑ کی مانند مذہبی ثقافت وجود

میں لانے کی ضرورت محسوس کی۔

یہی وجہ تھی کہ اس نے اہل علم و فضل حضرات کے ایک گروہ کو اپنی لائبریری میں جمع ہونے اور ایک دوسرے کے علم کی مدد سے خلیفہ کے خدائی دعویٰ کے ثبوت کے لئے ایک کتاب لکھنے پر مامور کیا' تاکہ یہ کتاب اس کے پیروکاروں کا مذہبی سہارا قرار پائے بلکہ سادہ الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ الحکیم نے ایک گروہ کو قرآن کی مانند ایک ایسی کتاب لکھنے پر مامور کیا جو اس کے خدائی دعویٰ کو ثابت کرسکے۔ ہمیں اس بارے میں کوئی اطلاع نہیں ہے کہ جن لوگوں کو اس کام پر مامور کیا گیا تھا وہ خود یہ عقیدہ رکھتے تھے یا نہیں؟

لیکن چونکہ یہ حضرات مسلمان' شیعہ مذہب اور اہل علم تھے تب ہی تو خلیفہ نے انہیں یہ کام سونپا تھا لہٰذا ہم گمان نہیں کرتے کہ وہ لوگ دل سے اس کی خدائی کے قائل ہونگے۔ خصوصاً" اس زمانے میں چونکہ خلیفہ بیمار بھی تھا۔ حالانکہ خدا کو کبھی بیمار نہیں ہونا چاہیے اور تندرستی و بیماری ان مخلوقات کی صفات ہیں جو جسم رکھتی ہیں اور ماحول ان پر اثرانداز ہوتا ہے وہ غذا کھاتے ہیں اور ماحول کے اثرات یا کسی غذا کے ناگوار اثرات انہیں بیمار کرتے ہیں۔ بعض کا قول ہے کہ الحکیم نے جب تسلیم کرلیا کہ خداوند تعالیٰ کا بیٹا بھی ہو سکتا ہے جس طرح عیسیٰؑ خدا کا بیٹا تھا تو اس کے بعد اس نے عیسائیوں کے لئے بیت المقدس کی زیارات آزاد کردیں۔ اس نظریے کی تصحیح کی ضرورت ہے۔ اور یہ جاننا چاہیے کہ جب فاطمی خلفا نے شہنشاہیت بنالی اور فلسطین سمیت چند ممالک بھی اس کے زیر نگیں آگئے تو اس نے بیت المقدس کے مقامات مقدسہ کو عیسائیوں کے لئے آزاد کر دیا اور اس سلسلے میں ان سے کوئی معاوضہ وغیرہ بھی طلب نہیں کیا جاتا تھا۔ عیسائی زائرین پر بیت المقدس جانے کی پابندی اس وقت عائد ہوئی تھی جب سلجوقیوں نے فلسطین پر تسلط حاصل کرلیا اور جونہی انہوں نے بیت المقدس پر قبضہ کرلیا تو عیسائی زائرین پر ٹیکس لگا دیا۔ جس کی مقدار اتنی بڑھا دی گئی کہ ایک عیسائی زائر کے لئے اس کی ادائیگی ایک بوجھ بن گئی۔

۱۰۹۵ء میں عیسائی کلیسا سے پوپ اوربن دوم نے کیتھولکی مذہب کے ایک بڑے اجلاس میں جو کلرمون شہر میں منعقد ہوا کہا' آج ایک فرانسیسی زائر جب زیارت کے لئے جاتا ہے تو اسے آنے اور جانے کا تین گنا زیادہ ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے اور اگر ٹیکس میں سے ایک پیسہ بھی کم ہو تو اسے زیارت کی اجازت نہیں دی جاتی اور عیسائیوں کو آزادانہ طور پر بیت المقدس آنے جانے کے لئے جنگ کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ پوپ ہی پہلی صلیبی جنگ کا باعث بنا اور اسی سال ۱۰۹۵ء میں کیتھولکی مذہب کی عظیم کونسل کلرمون میں تشکیل دی گئی تھی اور بن دوم نے سلجوقیوں کے خلاف جنگ کے لئے ایک فوج بھیجی۔ اس فوج کے آنے جانے میں ۱۰۹۹ء تک کا طویل عرصہ لگا' لیکن یہ فوج سلجوقیوں سے بری طرح شکست کھاکر اپنے بچے کھچے اور بے حال افراد کے ساتھ واپس ہو گئی۔ اس جنگ کو یورپ کی تاریخ میں پہلی صلیبی جنگ کا نام دیا جاتا ہے کیونکہ اس میں شریک تمام

عیسائیوں نے اپنے لباس پر کپڑے سے صلیب کا نشان سی رکھا تھا اور عیسائیوں نے اس پہلی صلیبی جنگ سے کافی تلخ تجربات حاصل کئے بعض تجربات کی روشنی میں انہوں نے بعد کی صلیبی جنگیں لڑیں ۔بہرحال فاطمی خلفا کے زمانے میں جب تک فلسطین پر سلجوقیوں کا قبضہ نہیں ہوا تھا کوئی عیسائی زائرین کو بیت المقدس میں داخل ہونے سے منع نہ کرتا تھا اور نہ ہی ان سے ٹیکس طلب کیا جاتا تھا۔

الحکیم کے متعلق اس ساری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کا خدائی دعویٰ بھی جعفری مذہب کی ثقافت کو اس قدر متزلزل نہیں کر سکا کہ جعفری مذہب سرے سے نابود ہو جاتا اور اس کی عمر نے بھی اتنی وفا نہ کی کہ وہ اپنے خدائی دعوے کے ثبوت میں اپنی کتاب تکمیل کرتا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ کتاب کا کچھ حصہ جو الحکیم کی زندگی کے دوران لکھا گیا تھا اس کا کیا ہوا؟ الحکیم کے دور کی ایک اصطلاح قیامت القیامہ باقی رہ گئی' کہ جب حسن بن صباح نے الموت میں اپنی تحریک کا آغاز کیا تو اس نے اس اصطلاح سے فائدہ اٹھایا۔

الحکیم کا مقصد یہ تھا کہ جونہی اس کی کتاب اس کی خدائی کی تصدیق کرے گی۔ وہ قیامت القیامہ تحریک کا اعلان کر دے گا۔ وہ اس معنی میں کہ دنیا تبدیل ہو گئی ہے اور کائنات میں ایک نئے دور کا آغاز ہونے والا ہے اور اس دور میں اس کی خدائی پر مہر تصدیق ثبت ہو چکی ہے اور تمام لوگوں کو اسے خدا تسلیم کرنا چاہئے۔ اس کی کتاب جو اس کی خدائی کی تصدیق کرے گی' قرآن کی جگہ لے گی۔ لیکن الحکیم کی موت کے ساتھ ہی یہ سارا پروگرام چوپٹ ہو گیا اگرچہ الحکیم کی وفات کے بعد فاطمی خلفا نے اپنی بڑائی میں مبالغے سے کام لیا لیکن ان میں سے کسی نے خدائی دعویٰ نہیں کیا۔

جب حسن بن صباح نے پانچویں صدی ہجری کے دوسرے پچاس سالوں کے دوران الموت میں اپنی تحریک کا آغاز کیا تو اس نے قیامت القیامہ کا اعلان کرنے پر توجہ دی تاکہ لوگ یہ جانیں کہ کائنات میں ایک جدید دور کا آغاز ہو چکا ہے۔

## جعفری ثقافت میں تصور "زمانہ"

جن مسائل پر جعفری ثقافت میں بحث ہوئی تھی ان میں ایک زمانہ بھی تھا۔ امام جعفر صادقؑ جو فلسفے کا درس دیا کرتے تھے' زمانے کے بارے میں بھی بہت سے مسائل پر اظہار خیال کرتے تھے۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ فلسفے میں زمانے کے متعلق بحث' قدیم بحثوں میں سے ہے اور قدیم یونان میں یہ موضوع فلسفیوں کی توجہ کا مرکز بنا رہا ہے اور آج تک اس کے متعلق بحث کا خاتمہ نہیں ہوا۔ قدیم یونان کے فلسفیوں کے ایک گروہ کا عقیدہ تھا کہ زمانہ وجود نہیں رکھتا لیکن ان میں سے بعض زمانے کے وجود کے قائل تھے۔

جو لوگ زمانے کے وجود کے منکر تھے ان کے بقول زمانے کا ذاتی وجود نہیں ہے بلکہ دو حرکتوں کے درمیانی فاصلے کا نام ہے اور اگر انسان کی مانند ایک ذی شعور اور حساس وجود اس فاصلے کا احساس کرے تو یہ فاصلہ اس کے لئے زمانے کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ بصورت دیگر اسے اس کا احساس نہیں ہوتا اور ایک بے حس و بے شعور وجود کو تو دو حرکتوں کے درمیانی فاصلے کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ کیا جانور زمانے کے وجود کا احساس کرتے ہیں ؟ یونانی فلاسفر کے بقول اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ جانور یا ان کی بعض اقسام زمانے کا احساس کرتی ہیں کیونکہ وہ وقت کی پہچان کرسکتے ہیں۔ اگر زمانے کا احساس نہ کریں تو وقت کی پہچان نہیں کرسکتے۔ ان کی وقت کی پہچان شاید بھوک یا دن کے نکلنے یا سورج کے غروب ہونے کی بناء پر ہو۔ لیکن بہرحال جانوروں کی بعض اقسام کے بارے میں ہمیں اس بات کا بخوبی علم ہے کہ وہ وقت کی شناخت کرسکتے ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ زمانے کا احساس رکھتے ہیں۔

یونانی فلاسفہ نے زمانے کی بذاتہ عدم موجودگی کو ثابت کرنے کے لئے جو دلائل پیش کئے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب انسان کے ہوش و حواس کھوجاتے ہیں تو وہ زمانے کے گزرنے کا احساس نہیں کرتا۔ اگر چند دن رات تک بے ہوش رہے اور پھر جب وہ ہوش میں آئے تو اسے یہ بات بھی نہیں یاد آسکتی کہ وہ کتنا عرصہ بے ہوش رہا۔ اگر بذاتہ زمانے کا وجود ہوتا تو جب انسان ہوش و حواس میں آتا ہے تو اسے یہ بھی جاننا چاہئے تھا کہ وہ کتنی مدت بے ہوش رہا۔ اگر گہری نیند سو جائے تو بھی جاگنے کے بعد محسوس نہیں کرسکتا کہ وہ کس قدر سویا ہے ؟ البتہ دن کو سورج اور رات کو ستاروں کو دیکھ کر یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کس قدر نیند کی ہے ؟

زمانے کی موجودگی پر دلائل دینے والوں کا کہنا ہے کہ زمانہ بہت چھوٹے چھوٹے ذرات پر مشتمل ہے۔ یہ ذرات اس قدر چھوٹے ہیں کہ ہم زمانے کی موجودگی کا احساس بھی نہیں کرسکتے۔ ہمارے حواس خمسہ ان ذرات کا احساس کرنے پر قادر نہیں ہیں۔

زمانے کے ذرات مسلسل حرکت کر رہے ہیں۔ وہ ایک طرف سے آتے ہیں اور دوسری طرف نکل جاتے ہیں۔ اگرچہ ہم ان کے گزرنے کا احساس کرتے ہیں اور اس بات کو اچھی طرح درک کرتے ہیں کہ بچپن سے نوجوانی اور پھر جوانی اور اس کے بعد بڑھاپے میں پہنچ جاتے ہیں۔ زمانے کے گزرنے کا احساس ہمیں ہمارے اردگرد کے جانوروں اور درختوں میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے بھی ہوتا ہے۔

ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ ہمارے بیٹے جو پہلے دودھ پیتے تھے' بڑے ہوگئے ہیں اور انہوں نے اپنا قدم جوانی کے مرحلے میں رکھا' اسی طرح بھیڑ کا بچہ پہلے چھوٹا سا ہوتا ہے پھر بڑا ہوجاتا ہے۔ اس ضمن میں درخت کے پودے کی مثال بھی دی جاسکتی ہے کہ وہ پہلے ایک چھوٹا سا پودا ہوتا ہے اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑا

تن آور درخت بن جاتا ہے۔ زمانے کی دوسری قسم وہ ہے جس کے ذرات حرکت نہیں کرتے اور خاکی یا وہ ذرات جو کسی نہر کی تہہ میں پڑے ہوتے ہیں باقی رہتے ہیں۔اس قسم کا زمانہ متحرک ہی نہیں ہوتا کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جائے۔ اس بے حرکت اور ٹھہرے ہوئے زمانے کو ابدیت کا نام دیا جاتا ہے۔

قدیم یونانی فلاسفہ کے عقیدے کے مطابق ابدیت' خداؤں کا زمانہ ہے اور متحرک زمانہ انسان سمیت تمام موجودات کا زمانہ ہے۔ چونکہ خداؤں کے لئے ساکن اور بے حرکت ہے لہٰذا ان کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ لیکن درخت' جاندار اور انسان متحرک زمانے میں ہیں لہٰذا ان میں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں اور کسی صورت میں بھی ان میں وقوع پذیر تبدیلیوں کو روکنا محال ہے۔جب کبھی ان میں وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں کو روکا جا سکا تو وہ خداؤں کے ہم پلہ ہوجائیں گے۔ کیونکہ وہ بے حرکت اور ساکن زمانے سے بہرہ مند ہوں گے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اتفاق سے ایسا واقعہ وقوع پذیر ہو یعنی پودے و جاندار ساکن زمانے سے بہرہ مند ہو جائیں۔ دوسرے لفظوں میں پودے اور انسان سمیت تمام جاندار خدا بن جائیں۔ اس بارے میں یونانی فلاسفہ کا جواب مثبت ہے۔ یہ وہی یونانی عرفان ہے جس کے بعض یونانی فلاسفہ معتقد تھے۔ وہ اپنے آپ کو خدا کے برابر کرنا چاہتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے ایک راستہ اختیار کیا مثلاً" مشہور ایوانی فلسفے کی ابتدا کرنے والا زنون' نفس کے کچلنے اور ہوئی اور ہوس کو مارنے کو خداؤں کے درجے تک پہنچنے کا ذریعہ سمجھتا تھا (اس کے فلسفے کو ایوانی اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ ایتھنز کے ایوان میں درس دیتا تھا)

اس نے کہا تھا کہ ایتھنز جیسے جمہوری ملک میں صرف قانون کی وساطت سے آزادی حاصل نہیں کی جاسکتی اور آزادی تو اس وقت میسر آ سکتی ہے جب لوگ جہاداکبر کریں۔ یعنی جہاد بالنفس کریں اور جب نفس کچل دیا جائے اور سرکش لوگوں کی ہوئی و ہوس انہیں دوسرے لوگوں کے انفرادی اور اجتماعی حقوق پر ڈاکہ نہ ڈالنے دے تو تمام لوگ آزادی سے بہرہ مند ہوسکتے ہیں۔

اسی طرح ایک دوسرا فلسفی جو زنون سے ایک سو پچاس سال پہلے اس دنیا میں آیا اور ۲۷۰ قبل مسیح میں اس دنیا سے کوچ کرگیا' اس کے بقول انسان کو تمام لذات سے بہرہ مند ہونا چاہئے تب ہی انسان خداؤں کا رتبہ حاصل کرسکتا ہے۔

اپیکور کے ہم عصر ایک دوسرے فلسفی دیوژن کے بقول خداؤں کے رتبے تک رسائی حاصل کرنے کے لئے انسان کو تمام اشیاء سے ہاتھ دھو کر ایک گوشے میں بیٹھ جانا چاہئے' تب ہی انسان غیر متحرک زمانے تک رسائی حاصل کرکے خداؤں کا رتبہ پا سکتا ہے۔ ایک دن اس نے ایک لڑکے کو اپنے دوہاتھوں سے پانی پیتے ہوئے دیکھا تو اس نے اپنا لکڑی کا پیالہ دور پھینک دیا اور کہنے لگا یہ دنیاوی اسباب میں سے ہے لہٰذا خداؤں سے پیوستگی میں مانع ہے۔

جو نکتہ یہاں پر سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ یونان اور مشرقی ممالک میں خداؤں تک رسائی حاصل کرنے میں جس چیز پر زور دیا گیا ہے وہ ہوائے نفس سے روکنا ہے۔ اس لحاظ سے قدیم یونان اور قدیم مشرق میں کوئی فرق نہیں۔ فرق صرف نفسانی خواہشات کو روکنے کے معیار میں ہے۔ دیوژن جیسے بعض یونانی عارفوں نے شرمگاہ کو ڈھانپنے والے کپڑے کے علاوہ کسی بھی لباس کو خداؤں سے پیوستگی میں رکاوٹ قرار دیا ہے۔ یہ فکر یونان اور مشرق میں ایک ہی صورت میں کیسے ظاہر ہوئی؟ ہمیں معلوم ہے کہ ھخامنشیوں سے پہلے یونان اور مشرق میں ثقافتی رابطہ نہ تھا۔ اس رابطے کا آغاز ھخامنشی حکمرانوں کے دور سے ہوا لہٰذا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ خدا کا درجہ حاصل کرنے کے لئے جہادبالنفس کی فکر مشرق سے یونان گئی یا یونان سے مشرق میں آئی۔ اس قسم کی سوچ جس میں چین میں کنفیوشس، ہندوستان میں بدھ، زردشت کی ایران میں حقیقی تعلیمات میں نہیں پائی جاتیں اور انہوں نے ہرگز یہ نہیں کہا کہ اگر آپ خدائی رتبہ حاصل کرنے کے خواہشمند ہیں تو اپنے نفس کو کچل ڈالیں۔ بلکہ یہ سوچ یونان اور مشرق کے عرفانی مکاتب میں کسی ثقافتی اور فکری رابطے کے بغیر ہی پیدا ہوئی۔کیا اس موضوع سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہ عرفانی سوچ تمام مفادات پر ان لوگوں میں پیدا ہوئی جو دنیاوی طاقت کے حامل نہیں تھے اور اپنے آپ کو ضعیف سمجھتے تھے۔ اسی لئے کہتے تھے کہ خداوند سے پیوستہ ہونے کا راستہ نفسانی خواہشات کی نفی اور جہادبالنفس ہے۔ اگر عرفان کے طالب دنیاوی لحاظ سے طاقتور ہوتے تو خداوندتعالیٰ سے وابستہ ہونے کے لئے کسی دوسرے راستے کا انتخاب کرتے۔

لیکن ہمیں اس بات کو نظرانداز نہیں کرنا چاہئے کہ بعض اہل عرفان دنیاوی طاقت بھی رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے نفس امارہ کو کنٹرول کرتے تھا۔ لہٰذا یہ کہنا درست نہیں کہ خداوندتعالیٰ سے متصل ہونے کے لئے اپنی نفسانی خواہشات کو زیر کرنا اور نفس کے خلاف جہاد کرنا صرف مادی لحاظ سے کمزور لوگوں کا خاصہ رہا ہے۔

بعد میں آنے والے ادوار میں بعض فلاسفہ زمانے کے وجود کے منکر ہوگئے اور انیسویں صدی میں یہ انکار یورپ کے عام سکالرز میں پیدا ہوا' انہوں نے کہا کہ زمانہ موجود ہی نہیں' جو کچھ ہے وہ مکان ہی ہے۔

ایک گروہ مکان کا منکر ہوگیا اور کہنے لگا' مکان بذات خود وجود نہیں رکھتا اور اس کا وجود مادی ہے۔ اگر مادہ موجود ہے تو مکان بھی ہے' اگر مادہ موجود نہیں تو مکان بھی نہیں۔ عام لوگوں کی نظر میں یہ نظریہ احساسات کا انکار تھا اور ہے۔ جو شخص کسی ایسے کمرے میں جو چند میٹر لمبا اور چوڑا ہے' بیٹھا ہوا ہے اور احساس کر رہا ہے کہ وہ ایک مکان ہے تو وہ اس مکان کی موجودگی کا ہرگز انکار نہیں کر سکتا۔

جب ایک دانشور سے یہ سوال کیا جائے کہ اگر مکان وجود نہیں رکھتا تو کیسے یہ ہوائی جہاز دنیا کے ایک مقام سے اڑ کر دوسرے مقام تک اتنی رفتاری سے ہزاروں کلومیٹر کا فاصلہ طے کرتے ہیں؟ اگر مکان نہیں ہے تو

یہ کس طرح پرواز کرتے ہیں؟ وہ جواباً" کہتا ہے کہ وہ مادے میں پرواز کرتے ہیں۔

عام ذہنوں اور سطحی احساسات کے حامل افراد کو یہ باور کرانا مشکل ہے کہ آج کل جو راکٹ مریخ یا زہرہ کی طرف جاتے ہیں، مادے میں سے پرواز کرتے ہیں کیونکہ شاید زمین سے دوہزار یا تین ہزار کلومیٹر کی بلندی تک تو ہوا کے ذرات موجود ہوں گے لیکن اس کے بعد ہوا کے ذرات نہیں ہیں۔ جس فضا میں راکٹ سفر کرتے ہیں وہاں پر خلا ہے اور کوئی چیز نہیں پائی جاتی سوائے شعاعوں کے، مثلاً" صرف روشنی کی برقی، مقناطیسی اور قوت کشش کی شعاعیں پائی جاتی ہیں۔ وہاں پر مادے کے کوئی آثار نہیں ملتے کہ یہ راکٹ اس میں سے گزریں۔

لیکن وہ سائنس دان جو مکان کے وجود کے مخالف ہیں، ان کے بقول یہ خلا جس میں راکٹ پرواز کر رہے ہیں ایٹم کے مرکزے اور الیکٹرانوں کے درمیانی فاصلے کی مانند ہے۔ ایٹم اور الیکٹرانوں کے درمیان فاصلے کی لمبائی کو سورج اور سیاروں کے درمیانی فاصلے سے نسبت ہے۔

اسی طرح جو فاصلہ زمین اور سورج، زہرہ اور سورج وغیرہ کے درمیان موجود ہے مادے کا جزو ہے اور اس کے جزو مادہ ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ قوت تجاذب (قوت کشش) اس سے گزرتی ہے اور قوت تجاذب مادے سے اور مادہ قوت تجاذب سے جدا نہیں ہے۔ اس نظریہ میں جیسا کہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں توانائی اور مادے کا درمیانی فرق ختم ہوجاتا ہے اور ہر دو ایک ہی سمجھے جاتے ہیں کیونکہ اس بات کو نہایت صراحت سے یہاں بیان کردیا گیا ہے کہ قوت تجاذب مادہ ہے اور مادہ و قوت تجاذب کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اٹھارہویں صدی عیسوی سے سائنس دان اس نتیجہ پر پہنچ چکے تھے کہ مادہ اور توانائی ایک ہی چیز کے دو رخ ہیں۔ لیکن مادے کی خصوصیات کو توانائی کی خصوصیات سے مختلف سمجھتے ہیں۔ جدید فزکس میں مادے اور توانائی کی تعریف اس قدر مشکل ہوگئی ہے کہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مادہ کیا ہے اور توانائی کیا ہے؟

بیسویں صدی کے آغاز تک یہ کہا جاتا رہا ہے کہ مادہ کثیر مقدار میں جمع شدہ توانائی کا نام ہے اور اسی طرح توانائی مادے کی لہروں کا نام ہے۔ لیکن آج کل ہر تعریف مادے اور توانائی کی وضاحت کرنے کے لئے کافی نہیں ہے کیونکہ جب قوت تجاذب وہی مادہ بن جاتا ہے جو آج تک ایک کثیر مقدار میں توانائی اور لہروں کے علاوہ کسی چیز کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا وہی آج لہروں کی صورت اختیار کرکے لامتناہی بن جاتا ہے اور ہم اس تعریف کے ساتھ ناگزیرا" قبول کرنے پر مجبور ہیں کہ کائنات میں مادے کے علاوہ کچھ بھی موجود نہیں ہے اور جہاز اور مصنوعی راکٹ مادے میں پرواز کر رہے ہیں۔ لیکن یہ بات ابھی تھیوری کے مراحل میں ہے کہ مکان کا کوئی وجود نہیں اور جو کچھ ہے مادہ ہے۔ اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ قوت تجاذب کی لہروں کی تیزی میں سیارہ لامتناہی ہوجاتا ہے اور اس نظریہ کی بنیاد پر مادہ لامتناہی ہے۔

جن لوگوں کا یہ نظریہ ہے کہ کائنات میں مکان کا وجود نہیں اور جو کچھ ہے مادہ ہے وہ اس نظریہ کی وضاحت کے لئے ایک دوسری مثال دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کائنات میں اندازاً" ایک لاکھ کہکشائیں موجود ہیں۔ یہ بھی ایک اندازہ ہے۔ ممکن ہے کہکشاؤں کی اصلی تعداد اس سے دوگنا یا تین گنا زیادہ ہو۔ ان کہکشاؤں نے اپنی اپنی جسامت کے لحاظ سے کائنات میں جگہ گھیری ہوئی ہے۔ اب ہم فرض کرتے ہیں کہ ایک ہزار ملین کہکشائیں وجود میں آتی ہیں' جبکہ ہماری عقل کہتی ہے کہ اس میں ایک ہزار ملین کہکشاؤں کے لئے مزید جگہ نہیں ہے کیونکہ جس قدر جگہ تھی وہ پہلے سے موجود کہکشاؤں نے پر کرلی ہے اور کائنات کی مثال اس ہال کی ہے جس میں تماشائیوں نے ساری کرسیاں پر کردی ہیں اور کسی نئے آنے والے تماشائی کے لئے کوئی جگہ نہیں' کرسیاں بھی کچھ اس طرح ہیں کہ دو تماشائی ایک کرسی پر نہیں بیٹھ سکتے۔ لیکن وہ لوگ جن کے بقول کائنات میں مکان نہیں ہے اور جو ہے وہ مادہ ہے' ان کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس مسئلے سے کوئی الجھن پیدا نہیں ہوتی کیونکہ جونہی ایک ہزار ملین فالتو کہکشائیں وجود میں آئیں گی ان کے لئے مکان بھی وجود میں آجائے گا اور کہکشاؤں کا مکان وہی مادہ ہے جو انہیں وجود میں لاتا ہے۔ ان فزکس دانوں کے عقیدے کے مطابق لامتناہی کائنات میں مادے کی کچھ مقدار اگر موجودہ مادے پر بڑھادی جائے تو کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ جب ہم کسی ایسے تماشاخانے کے ہال کا تصور کرتے ہیں جس کا طول' عرض اور بلندی لامحدود ہو اور اس کی کرسیوں کی تعداد بھی لامحدود ہو' اگر ایک ملین تماشائیوں کا موجودہ تماشائیوں پر اضافہ کردیا جائے تو کوئی خاص مسئلہ پیدا نہیں ہوتا اور ان کے بعد آنے والے ایک ملین یا ایک ہزار ملین مزید تماشائیوں کے لئے جگہ ہے۔

عام عقل کے حامل لوگوں اور ان لوگوں کے درمیان جو یہ کہتے ہیں کہ مکان موجود نہیں ہے اور جو کچھ ہے مادہ ہے۔ ان دو طرح کے لوگوں کی سمجھ میں فرق یہ ہے کہ عام عقل رکھنے والے لوگوں کا خیال ہے کہ پہلے مکان موجود ہو تاکہ اس میں کہکشاں وجود میں آئے اور جو مکان کے عدم وجود کے حامی ہیں ان کا خیال ہے کہ جو کہکشاں وجود میں آئے گی وہی مکان ہوگی۔ اس پر غور کرنے کے ساتھ ساتھ اگر ہم طول و عرض اور اونچائی (یا ضخامت) کی گہرائی میں جائیں تو ہم محسوس کریں گے کہ اگر ایک شعور طول کو محسوس کرلیتا ہے تو اس کے لئے عرض کی گہرائی کو درک کرنا محال ہے اور ایک مربع جو طول و عرض پر مشتمل ہے یا ایک دائرہ' دونوں آپ کے لئے بے معنی ہیں کیونکہ حقائق کا ادراک مشکل ہے۔ وہ صحیح معنوں میں طول یا عرض کی تعریف نہیں کرسکتا۔

اگر فرض کریں وہ طول و عرض محسوس کرلیتا ہے اور ایک مربع یا دائرے کو سمجھ سکتا ہے کہ وہ کیسے ہے؟ لیکن اس کے لئے یہ سمجھنا محال ہوگا کہ ایک آنکھ جو طول' عرض اور بلندی پر مشتمل ہے' ایک کریٹ یا ایک ویگن سے کہاں نسبت رکھتی ہے؟

اس قیاس کی بناء پر ہم عام انسان جو کسی چیز کو تین اطراف سے ناپ سکتے ہیں چوتھی طرف کو محسوس نہیں

کرسکتے۔ جبکہ ریاضی دانوں نے چوتھی طرف کا وجود بھی ثابت کیا ہے۔ چونکہ چوتھی طرف کے وجود کے قائل ہیں للذا پانچویں اور چھٹی طرف کے بھی قائل ہوں گے۔ لیکن تین اطراف کی کیت رکھنے والی چیزوں کی مانند ان کے وجود کو سننے والے اور پڑھنے والے کے لئے مجسم صورت میں نہیں پیش کرسکتے۔ جب سے انسان عملی طور پر خلاء میں گیا ہے' مادے کے بارے میں اس کی معلومات میں اضافہ ہوا۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ جتنے اجسام موجود ہیں ان سے مسلسل (Infra Red Rays) خارج ہورہی ہیں۔ جبکہ اس سے پہلے یہ تصور پایا جاتا تھا کہ مذکورہ شعاعیں صرف گرم چیزوں سے خارج ہورہی ہیں۔ زمین کے گرد گھومنے والے مصنوعی سیاروں کی تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ بحر منجمد شمالی اور جنوبی سے بھی مسلسل مذکورہ شعاعیں خارج ہو رہی ہیں۔ (۹۶)

سائنسی تحقیقات سے لیبارٹریوں میں یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اگر کسی چیز کو سرد خانے میں رکھ دیا جائے تو بھی وہ سردی کے مطلق صفر درجہ تک یہ شعاعیں خارج کرتی رہتی ہے لیکن جونہی سردی کا مطلق صفر درجہ پہنچتا ہے یہ شعاعیں خارج ہونا بند ہوجاتی ہیں۔ مطلق صفر وہ درجہ ہے جہاں پر مالیکیول کی حرکت رک جاتی ہے۔ (۹۷)

یہی وجہ ہے کہ رات کو ان دوربینوں کے ذریعے جو انفرا ریڈ ریز کو دیکھتی ہیں عام چیزیں نظر آتی ہیں اور جن لوگوں کے پاس یہ دوربین ہوتی ہیں ان سے کوئی چیز نہیں چھپ سکتی۔ یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ زندہ جانوروں یا پودوں سے یہ شعاعیں مردہ جانوروں یا پودوں کی نسبت زیادہ خارج ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ کے محاذوں پر ٹینک یا توپ یا بکتربند گاڑیوں کو درختوں یا پودوں کی مدد سے اس دشمن سے نہیں چھپایا جاسکتا جس کے پاس چیزوں کو ان کی انفراریڈ ریز کی مدد سے دیکھنے والی دوربین ہو' کیونکہ دشمن مذکورہ دوربین سے درختوں کی شاخوں کو انفراریڈ ریز خارج کرنے کی بناء پر دیکھ لیتا ہے۔ دشمن دیکھتا ہے کہ درختوں کی شاخیں اپنی جڑوں سے نہیں ملی ہوتیں تو وہ یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ یہ شاخیں ضرور کسی ٹینک یا بکتربند گاڑی کو چھپانے کے لئے ڈالی گئی ہیں۔

اسی طرح آج کے دور میں فوجیوں کو بھی میدان جنگ میں مذکورہ دوربین رکھنے والے دشمن کی نظروں سے بچانا محال ہے کیونکہ فوجیوں کے بدن سے انفرا ریڈ ریز خارج ہوتی ہیں۔

جیسا کہ ہم ذکر کرچکے ہیں تمام اجسام سے انفرا ریڈ ریز خارج ہوتی ہیں البتہ صرف ان اجسام سے یہ شعاعیں خارج نہیں ہوتیں جن کا جسم مطلق صفر درجے تک ٹھنڈا ہو۔ مطلق صفر درجے تک کی سردی کو ۲۷۳ درجے سینٹی گریڈ یا ۴۵۹ درجہ فارن ہائیٹ کے مساوی مانا جاتا ہے۔ اس درجے تک کی سردی کو ابھی تک سائنسدان دباؤ میں اضافہ کرنے کے باوجود' وجود میں نہیں لا سکے۔ البتہ لیبارٹریز میں ابھی تک اس پر ریسرچ جاری ہے۔

اس دنیا کی لیبارٹریز منفی دو سو بیس درجے سنٹی گریڈ تک کی سردی کو حاصل کر سکی ہیں لیکن اس سے زیادہ ٹھنڈک پیدا کرنے میں انہیں کافی زیادہ مشکلات کا سامنا ہوتا ہے کیونکہ صرف دس درجے ٹھنڈک حاصل کرنے کے لئے انہیں بڑے بڑے وسائل سے کام لینا پڑتا ہے تاکہ وہ یہ جانیں کہ مالیکیول کا مکمل طور پر جامد رکھنا اجسام پر کیا اثر ڈالتا ہے ؟ اور کیا مالیکیولوں کا جامد ہونا ایٹم پر بھی اثر انداز ہوتا ہے ؟ اس بات کے زیراثر کہ چونکہ مادے کی شناخت ابھی ترقی کے مراحل میں ہے' یہ خیال آتا ہے' جن لوگوں کا عقیدہ ہے کہ کائنات ایک لامتناہی مادہ کے سوا کچھ نہیں' کہ جو کچھ ہمیں خلا نظر آتی ہے وہ مادے کے موجیں مارنے کا زمانہ ہے۔ ان کا عقیدہ بے بنیاد نہیں اور ان کے قول کے نتیجہ میں کہا جاسکتا ہے اور جو کچھ موجود ہے وہ مادہ ہی ہے' شاید یہ بات بے بنیاد نہ ہو۔ لیکن جب تک یہ تھیوری سائنسی قانون کی شکل اختیار نہیں کرلیتی اسے قبول نہیں کیا جاسکتا۔ موجودہ فزکس دانوں میں سے ایک آئزک آسیموف (۹۸) ہیں جو روس میں پیدا ہوئے اور بعد میں امریکہ ہجرت کرگئے اور آج کل امریکہ کے شہری ہیں۔ انہوں نے مکان کے بارے میں ایک جدید نظریہ پیش کیا ہے جسے سائنسی اصطلاحوں اور ریاضی کے فارمولوں کی مدد سے اس طرح سمجھا جاسکتا ہے' مکان مادے اور اس کی شعاعوں سے عبارت ہے۔ وہ اس ترتیب کے ساتھ کہ مادہ ایٹم کے مرکزے یا مجموعی طور پر ایٹموں کے مرکزوں کا نام ہے۔ اس مرکزے سے مسلسل شعاعیں خارج ہوتی رہتی ہیں۔ جب یہ شعاعیں مرکزے سے قریب ہوتی ہیں تو ان پر مرکزے کی گرفت ڈھیلی پڑتی جاتی ہے۔ البتہ ان کی رفتار کم نہیں ہوتی۔ ہم ایک مرکزے کو چراغ سے تشبیہ دے سکتے ہیں کہ چراغ کے قریب روشنی کافی زیادہ ہوتی ہے لیکن جوں جوں یہ روشنی چراغ سے دور ہوتی جاتی ہے ماند پڑتی جاتی ہے۔ البتہ اس روشنی کی رفتار پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جس وقت ہم چراغ سے اتنے دور ہوجاتے ہیں کہ اس کی روشنی ہمیں دکھائی نہیں دیتی تب بھی اس کی روشنی موجود ہوتی ہے اور اسی رفتار (تین لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ) سے پھیل رہی ہوتی ہے لیکن ہماری آنکھوں تک نہیں پہنچتی۔ ہمارے حواس خمسہ شعاعوں کو ایک حد تک درک کرتے ہیں۔ اگر شعاعوں کی حرکت اس حد میں نہ ہو تو نہ ہی ہماری آنکھ روشنی کو دیکھتی ہے اور نہ ہمارے کان آواز کو سنتے ہیں اور نہ ہمارے بدن کی جلد گرمی کا احساس کرسکتی ہے مثلاً" جب ہم گھر میں روشن چراغ سے دور ہوجاتے ہیں تو اس چراغ کی روشنی ماند پڑتی نظر آتی ہے حالانکہ اس کی روشنی اسی رفتار سے یعنی تین لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ کے حساب سے پھیل رہی ہوتی ہے۔ پرانے زمانے میں یہ تصور پایا جاتا تھا کہ روشنی خط مستقیم پر چلتی ہے لیکن بعد میں یہ ثابت ہوا کہ یہ طاقتور قوت کشش رکھنے والے ستارے کی قربت میں خط منحنی راستہ اختیار کرلیتی ہے۔ سورج جس کی قوت جاذبہ بہت زیادہ ہے اور اس کے زیراثر ہمارے چراغ کی روشنی منحنی راستہ اختیار کرلیتی ہے کیا اس سورج کی روشنی اسے اپنی طرف کھینچتی بھی ہے ؟ علم فزکس جواب نہیں دیتا۔

ہم حیران ہوتے ہیں کہ کیسے سورج اپنی مضبوط قوت کشش کے ساتھ ہمارے گھر کے چراغ کی روشنی کو خط منحنی پر ڈال دیتا ہے لیکن اسے اپنی طرف نہیں کھینچتا ؟

ہر ستارے کی قوت تجاذب اس کی کمیت کے متناسب ہوتی ہے اور سورج کی کمیت اس لحاظ سے بہت زیادہ ہے۔ اگر سورج کی کمیت کو سو حصوں میں تقسیم کیا جائے اور پھر سو میں سے کسی ایک حصے کو دوبارہ سو حصوں میں تقسیم کیا جائے تو نظام شمسی کے باقی سیاروں کی کل کمیت اس سوویں حصے کے چودہ فیصد کے مساوی ہوگی۔ یہاں ہمیں اجسام کی کمیت کو ان کا حجم خیال نہیں کرنا چاہئے۔ ایک غبارے کو جب بھر دیا جائے تو اس کا حجم بڑھ جاتا ہے لیکن اس کی کمیت وہی رہتی ہے۔

اجسام کی کمیت کا ہم ان کے وزن سے اندازہ لگاتے ہیں۔ جتنا ایک جسم بھاری ہوگا اس کی کمیت بھی اتنی ہی ہوگی اور جتنی کسی جسم کی کمیت زیادہ ہوگی اتنی ہی اس کی قوت تجاذب بھی ہوگی۔ چونکہ سورج کی کمیت بہت زیادہ ہے لہٰذا اس کی قوت تجاذب بھی بہت زیادہ ہے۔ بہرکیف سورج اپنی تمام قوت کشش کے ساتھ بھی ہمارے گھر کے چراغ کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکتا لیکن اس کے راستے کو ٹیڑھا کر دیتا ہے۔ سورج کے ہمارے گھر کے چراغ کی روشنی کو اپنی طرف کھینچ نہ سکنے کی وجہ ہمارے گھر کے چراغ کی روشنی کی غیر معمولی رفتار ہے۔ چونکہ ہمارے گھر کے چراغ کی روشنی تین سو ہزار (تین لاکھ) کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے چلتے ہوئے سورج کی روشنی کو عبور کر کے اس کے پار پہنچ جاتی ہے۔ اگر آپ کے ذہن میں یہ سوال ابھرے کہ جب ہمارے گھر کے چراغ کی روشنی سورج کو عبور کرتی ہے تو کس طرف جاتی ہے ؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ روشنی نظام شمسی سے گزرنے کے بعد ایک دوسرے سورج کو عبور کر لیتی ہے' البتہ اس کا راستہ ٹیڑھا ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ روشنی اس سورج سے بھی آگے نکل جاتی ہے۔

کیا اس بات کا امکان ہے کہ کسی سورج کی قوت تجاذب اس قدر زیادہ ہو کہ وہ ہمارے گھر کے چراغ کی روشنی کو جو تین لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے چلتی ہے' اپنے اندر جذب کر لے اور اسے دور نہ جانے دے ؟

ہاں' اس بات کا امکان پایا جاتا ہے کہ اگر ہمارے گھر کے چراغ کی روشنی ایک کوتولہ سے عبور کرے تو اس میں جذب ہو جائے گی۔ نجومیوں نے یہ نام بیسویں صدی کے آغاز میں ان ستاروں کے لئے منتخب کیا جن کی کمیت اس قدر زیادہ اور ان کی قوت کشش اتنی طاقتور ہے کہ روشنی ان سے نہیں گزر سکتی اور ان میں جذب ہو جاتی ہے۔ کوتولہ نامی ستاروں کی کمیت اس قدر زیادہ ہے کہ ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ مذکورہ ستاروں کی کمیت اس لئے بہت زیادہ ہے کہ ان کے ایٹموں کے الیکٹران نہیں ہوتے اور وہ صرف مرکزے پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ ایٹم جو مادے کا چھوٹے سے چھوٹا ذرہ ہے' ہمارے نظام شمسی کی نسبت ایک

خالی فضا ہے۔

ایٹم کا اصلی حصہ مرکزہ ہے اور باقی خالی فضا ہے۔ الیکٹران ایٹم کے مرکزے کے اردگرد اس طرح گھوم رہے ہیں جس طرح سیارے سورج کے گرد گردش کر رہے ہیں۔ اگر تمام الیکٹرانوں اور مرکزوں کا درمیانی فاصلہ ختم کردیا جائے تو کرہ ارض کا حجم فٹ بال کی گیند کے برابر ہوگا لیکن اس کا وزن وہی ہوگا جو آج کرہ ارض کا ہے۔

کوتولہ نامی ستاروں کے ایٹموں میں خالی فضا نہیں پائی جاتی اور نہ ہی ان کے الیکٹران ہیں۔ ان میں صرف مرکزے باقی ہیں جو آپس میں ملے ہوئے ہیں۔ ان کا وزن اس قدر زیادہ ہے کہ مذکورہ بالا مثال کے مطابق ان کا فٹ بال جتنی ایک گیند کی کمیت کا وزن آج کے کرہ ارض کے کل وزن کے برابر ہے۔ چونکہ قوت تجاذب کو کمیت سے نسبت ہے لہٰذا ہمارے چراغ کی روشنی کوتولہ ستاروں سے نہیں گزر سکتی کیونکہ ان کی کمیت اتنی زیادہ ہے کہ یہ روشنی ان میں جذب ہوجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوتولہ ستارے تاریک دکھائی دیتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ ہم اپنے ساتھ چراغ لے کر کوتولہ ستارے تک پہنچ جاتے ہیں' وہاں ہم اندھیرے کو دور کرنے کے لئے اپنا چراغ جلاتے ہیں (اگر جل سکے) تو بھی ہم دیکھیں گے کہ ہمیں کچھ بھی دکھائی نہیں دے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قبل اس کے ہمارے چراغ کی روشنی اردگرد پھیلنے کے لئے حرکت کرے' کوتولہ ستارے میں جذب ہوجائے گی کیونکہ کوتولہ ستاروں کی قوت تجاذب اس قدر زیادہ ہے کہ وہ ہمارے چراغ کی روشنی کو متحرک ہونے اور اردگرد پھیلنے سے پہلے ہی جذب کرلے گی اور اس طرح ہمارا ماحول تاریکی میں ڈوبا رہے گا۔

کوتولہ ستاروں کے تاریک ہونے کی وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے قرب و جوار میں روشنی کی شعاعیں نہیں ہوتیں۔ اگر ہوتی بھی ہیں تو ستارے میں جذب ہوجاتی ہیں۔ فلکیات کے ماہرین نے کوتولہ ستاروں کو ان کے اطراف میں پائے جانے والے ستاروں کی مدد سے دیکھا ہے لیکن آج جبکہ ریڈیو ٹیلی سکوپ ایجاد ہوچکا ہے اس کی مدد سے کوتولہ ستاروں کے وجود کا احساس کیا جا سکتا ہے۔ اگر گھروں میں روشن چراغ کی روشنی کسی کوتولہ ستارے میں جذب نہ ہو تو وہ اپنے راستے پر چلتی ہے' اس کا راستہ دائیں طرف یا بائیں طرف اور اوپر یا نیچے بھی مڑ سکتا ہے۔

آئزک آسیموف کے بقول راستہ یعنی مکان وجود نہیں رکھتا بلکہ روشنی خود اسے وجود میں لاتی ہے اور روشنی کی شعاعیں مکان ہیں۔ اس ماہر طبیعیات کے نظریہ کی بنا پر مکان کا کوئی وجود نہیں ہے جب تک روشنی اس میں سفر نہ کرے۔ بلکہ روشنی اور اس کی شعاعوں نے مکان وجود میں لایا ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ ہمارے گھر کے چراغ کی روشنی کب تک محو سفر رہتی ہے ؟ علم فزکس جواب دیتا ہے کہ اس کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا۔ وہ اس وقت تک اپنا سفر جاری رکھتی ہے جب تک وہ مادے میں تبدیل نہیں ہوجاتی۔ ہمارے گھر کے چراغ کی روشنی جو توانائی (انرجی) ہے' کیسے مادے میں تبدیل ہوجاتی ہے ؟

آج تک علم فزکس اس کا جواب دینے سے عاری ہے۔ اگر علم فزکس اس سوال کا جواب ڈھونڈ لے تو وہ ایک لاکھ سال کا سائنسی راستہ ایک سیکنڈ میں طے کرلے گی کیونکہ فزکس میں سب سے بڑا راز یہی ہے۔ عظیم تخلیق کے راز کا بھی یہی سوال ہے کہ توانائی مادے میں کیسے تبدیل ہوتی ہے؟ مادے کا توانائی میں تبدیل ہونا ہماری نظر میں عام سی بات ہے۔ ہم دن اور رات کارخانوں' بحری جہازوں' گاڑیوں اور گھروں میں مادے کو توانائی میں تبدیل کرتے ہیں لیکن آج تک ہم توانائی کو مادے میں تبدیل نہیں کرسکے۔ ابھی تک ہمیں معلوم نہیں ہوسکا کہ توانائی مادے میں کیسے تبدیل ہوتی ہے؟ ہماری آنکھوں کے سامنے تخلیق کا بہترین نمونہ سورج ہے۔ لیکن سورج میں بھی توانائی مادے میں تبدیل ہوتی ہے بلکہ ایک مادہ دوسرے مادے میں تبدیل ہوتا ہے۔ وہ اس طرح کہ سورج میں پائی جانے والی ہائیڈروجن کی مقدار ہیلیم میں تبدیل ہوتی ہے جس کے نتیجے میں کافی حرارت وجود میں آتی ہے۔ لیکن ہمیں یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ خود سورج کیسے وجود میں آیا؟ جو کچھ اس بارے میں اب تک کہا گیا ہے وہ سب تھیوری کی حد تک محدود ہے' اس کی سائنسی اہمیت کوئی نہیں۔ ہمیں اس نکتے پر بھی غور کرنا چاہئے کہ جب ہم کہتے ہیں کہ ہمارے گھر کا چراغ جب ایک طویل عرصے میں شعاعیں بکھیر لیتا ہے تو مادے میں تبدیل ہوجاتا ہے' اس کا مطلب ہے کہ ہم نے ایک اور تھیوری بیان کردی ہے۔ کیونکہ ہم نے آج تک کوئی مشاہدہ نہیں کیا کہ توانائی مادے میں تبدیل ہوتی ہو اور قطعی طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ توانائی مادے میں تبدیل ہوئی ہوگی۔

لیکن اس اندازے یا فرض کرنے اور یقینی علم کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے' سائنس میں اندازہ لگانے یا مرضی کرنے کی گنجائش نہیں۔

مختصر یہ کہ آئزک آسیموف موجودہ زمانے کا ایک معروف سائنس دان مکان کے وجود کا منکر ہے۔ اس کے بقول مکان کا کوئی وجود نہیں اور جو کچھ موجود ہے وہ مادہ یا اس کی شعاعیں ہیں۔ ہم بنی نوع انسان مکان کو شعاعوں کے ذریعے محسوس کرسکتے ہیں۔ اگر آپ ایک آزاد فضا میں چل پھر رہے ہیں یا کمرے میں بیٹھے ہیں تو آپ کو مکان کا احساس اس لئے ہو رہا ہے کہ آپ شعاعوں کے نرغے میں ہیں اور اگر شعاعیں رک جائیں تو پھر یہ احساس ختم ہوجائے گا کہ آپ مکان میں ہیں۔ کیا اس بات کا امکان ہے کہ شعاعیں کٹ جائیں اور آسیموف کے بقول ہم مکان کا احساس نہ کریں۔

علم فزکس کہتا ہے۔ نہیں' چونکہ تاریک راتوں میں بھی ہمیں روشنی کی ایسی شعاعوں نے گھیر رکھا ہوتا ہے جنہیں ہم نہیں دیکھ سکتے۔ خاموش ترین ماحول میں بھی مختلف النوع آوازوں کی لہریں جنہیں ہم سننے سے معذور ہیں ہمارے اردگرد متحرک ہوتی ہیں۔ ان میں سے بعض ہمارے جسم کے پار چلی جاتی ہیں۔ لیکن فرض کریں اگر تمام شعاعیں کٹ بھی جائیں تو بھی عام قوت تجاذب کی شعاع نہیں کٹے گی' یعنی کسی حالت میں بھی

یہ شعاع نہیں کٹتی۔ حتیٰ کہ جب خلاباز' خلائی جہاز میں بے وزنی کی حالت میں ہوتے ہیں تو اس حالت میں بھی خلائی جہاز کی رفتار اور زمین کی قوت کشش کے درمیان برابری ہوتی ہے جس کی وجہ سے خلاباز (خلائی جہاز سے باہر نکلنے کے بعد) نہیں گرتا۔ یہ تصور صحیح نہیں کہ خلائی جہاز میں یا اس کے باہر خلاباز قوت تجاذب کے زیراثر نہیں ہوتے۔ قوت تجاذب کی مادے سے اس قدر وابستگی ہے کہ علم فزکس کی رو سے اگر قوت تجاذب مادے سے چھین لی جائے تو مادہ باقی نہیں رہے گا اور یہ محال ہے کہ قوت تجاذب کی شعاعوں کے کٹ جانے کے بعد کوئی جاندار یا بے جان زندہ رہ سکے۔

یہ تھے انیسویں صدی اور موجودہ دور کے طبیعیات دانوں کے زمان اور مکان کے بارے میں نظریات۔ اب اگر ہمیں اطلاع ملے کہ زمان اور مکان کے بارے میں انہی نظریات کو آج سے ساڑھے بارہ سو سال پہلے ایک شخص نے پیش کیا تھا تو کیا یہ مناسب نہیں کہ ہم اس شخص کو آفرین کہیں اور اس کی عقلمندی کی داد دیں ؟

زمان و مکان کے بارے میں یہ نظریات دوسری صدی ہجری کے پہلے پچاس سالوں کے دوران امام جعفر صادقؑ نے پیش کئے تھے جو آج کے نظریات سے مطابقت رکھتے ہیں۔

اس کے باوجود کہ امام جعفرصادقؑ کے زمان اور مکان کے بارے میں پیش کردہ نظریات میں آج کی اصطلاحات (Terms) اور فارمولے استعمال نہیں ہوئے پھر بھی آپ ان نظریات کو جدید نظریات کے ساتھ منطبق کیا جا سکتا ہے۔

امام جعفرصادقؑ کے بقول زمانہ فی نفسہ وجود نہیں رکھتا بلکہ ہمارے احساسات کے نتیجے میں وجود میں آتا ہے اور ہمارے لئے دو واقعات کے درمیانی فاصلے کا نام زمانہ ہے۔

مکان کے بارے میں امام جعفر صادقؑ کا نظریہ یہ تھا کہ مکان تابع ہے' اس کا ذاتی وجود نہیں' مکان ہمیں ایک ایسی فضا کی صورت میں نظر آتا ہے جس کا طول و عرض اور بلندی ہے اور اس کا یہ تابع وجود بھی زندگی کے مختلف مراحل میں مختلف دکھائی دیتا ہے۔

ایک چھوٹا بچہ جو ایک چھوٹے سے گھر میں رہ رہا ہے' اس گھر کے صحن کو وہ ایک بڑا میدان خیال کرتا ہے۔ لیکن یہی چھوٹا بچہ بیس سال بعد اس گھر میں داخل ہوتا ہے تو اسے وہ صحن بہت چھوٹا نظر آتا ہے۔ وہ انگشت بدنداں سوچتا ہے کہ یہ صحن جو پہلے بہت وسیع تھا اب اتنا چھوٹا کیوں ہوگیا ہے ؟ مختصر یہ کہ امام جعفر صادقؑ کی نظر میں مکان وجود طبیعی رکھتا ہے اور آج بھی طبیعیات دانوں کا گروہ (جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے) اس نظریئے کا حامی ہے۔

# اسباب امراض کے بارے میں جعفری نظریہ

جو نظریات امام جعفر صادقؑ کے سائنسی کمالات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں ان میں ایک بیماری کا بعض روشنیوں کے ذریعے منتقل ہونا بھی ہے۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔ بعض ایسی شعاعیں ہیں جو اگر ایک بیمار شخص سے تندرست شخص پر پڑیں تو ممکن ہے وہ تندرست آدمی کو بیمار کردیں۔ یہاں پر اس بات کو ملحوظ نظر رکھیں کہ آب و ہوا یا جراثیم کے منتقل ہونے کے بارے میں گفتگو نہیں ہورہی (کیونکہ دوسری صدی ہجری کے اوائل میں لوگ اس سے بے خبر تھے) بلکہ شعاع کے متعلق بات ہورہی ہے' وہ بھی تمام شعاعوں کے بارے میں نہیں صرف چند اقسام کی شعاعوں کے بارے میں' جو اگر ایک بیمار انسان سے ایک تندرست انسان پر پڑیں تو ممکن ہے اسے بیمار کردیں۔ حیوانیات کے ماہرین (Zoologists) اور ڈاکٹر صاحبان نے اس نظریہ کو بیہودہ خیال کیا تھا کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ ایک بیمار انسان سے تندرست انسان تک بیماری منتقل کرنے کا عامل بیکٹریا یا وائرس ہوتا ہے خواہ یہ بیماری کیڑوں مکوڑوں یا پانی یا ہوا کے ذریعے منتقل ہو یا دو (بیمار یا تندرست) انسانوں کے ایک دوسرے سے براہ راست رابطے کے ذریعے۔

بیکٹریا اور وائرس کے وجود کی شناخت سے قبل یہ خیال تھا کہ بیماریوں کے منتقل ہونے کا سبب بو (Smell) ہے اور قدیم ادوار میں بیماریوں کو پھیلنے سے روکنے کے لئے تمام اقدامات بو کو روکنے کے ذریعے انجام پاتے تھے تاکہ ایک بیمار شخص کی بیماری' بو کے ذریعے ایک تندرست شخص تک نہ پہنچ پائے اور اسے بیمار نہ کرے۔

کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ بعض شعاعیں ایسی ہیں جو اگر بیمار شخص سے تندرست پر پڑیں تو اسے بیمار کردیتی ہیں۔ صرف امام جعفر صادقؑ ہی وہ انسان تھا جنہوں نے یہ فرمایا۔ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا کہ اس نظریہ کو سائنس دانوں نے بیہودہ شمار کیا' لیکن جدید علمی تحقیقات نے یہ ثابت کردیا کہ یہ نظریہ حقیقی ہے۔ اگر بعض شعاعیں ایک بیمار شخص پر سے ایک تندرست انسان تک پہنچیں تو وہ اسے بیمار کردیتی ہیں۔ روس میں پہلی مرتبہ اس حقیقت کا کھوج لگایا گیا ہے۔ روس کے شہر نوو وو سائبیرسک (۹۹) میں جو کہ میڈیکل سائنس' کیمیا اور بیالوجی کے عظیم مراکز میں سے ایک ہے' وہاں یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ پہلے بیمار شخص کے خلیوں سے شعاعیں نکلتی ہیں اور پھر جونہی یہ شعاعیں تندرست انسان کے خلیوں پر پڑتی ہیں تو اسے بیمار کردیتی ہیں۔ اگرچہ بیمار شخص کے خلیوں اور تندرست انسان کے خلیوں کے درمیان معمولی سا رابطہ بھی نہ ہو اور نہ ہی بیمار

شخص کے خلیوں سے بیکٹیریا یا وائرس نکل کر تندرست انسان کے خلیوں میں حلول کر گئے ہوں۔

نوو وو سائبیرسک کے سائنسدان جو تحقیق میں مصروف تھے ان کا طریقہ کار یہ تھا کہ انہوں نے ایک ہی زندہ عضو (مثلاً" دل یا گردے) سے خلیات کا انتخاب کیا اور انہیں ایک دوسرے سے جدا کر کے دو حصوں میں تقسیم کیا اور دیکھا کہ ان خلیوں سے چند اقسام کی فوٹان نکل رہی ہیں (جیسا کہ ہم تذکرہ کر چکے ہیں روشنی کے ایک ذرے کو فوٹان کہا جاتا ہے) اور آج شعاعوں پر تحقیقات اتنی وسیع ہو گئی ہیں کہ ایک فوٹان پر بھی تحقیق ہو سکتی ہے۔ سائنسدانوں نے دوسرے حصے کے صحتمند خلیوں کو لے کر دو محفوظ بکسوں میں رکھ دیا جن میں سے ایک سیلیکا (Silica) (۱۰۰) کا بنا ہوا تھا اور دوسرا شیشے سے تیار کیا ہوا تھا۔ سیلیکا میں یہ خاصیت ہے کہ اس میں سے سوائے الٹرا وائلٹ شعاعوں کے کوئی شعاع نہیں گزر سکتی اور عام شیشے میں یہ خاصیت ہے کہ اس میں سے الٹراوائلٹ شعاعوں کے علاوہ تمام شعاعیں گزر سکتی ہیں۔ چند گھنٹوں کے بعد بیمار خلیوں کی شعاعیں سیلکا اور شیشے میں محفوظ خلیوں پر ڈالی گئیں تو معلوم ہوا کہ سیلکا کے بکس میں محفوظ خلیے بیمار ہو گئے ہیں' لیکن وہ صحتمند خلئے جو شیشے بکس میں محفوظ تھے' بیمار نہیں ہوئے۔

چونکہ سیلکا میں سے الٹرا وائلٹ شعاعوں کے علاوہ کوئی شعاع نہیں گزر سکتی لہٰذا انہی شعاعوں نے صحتمند خلیوں تک پہنچ کر انہیں بیمار کیا ہے' لیکن شیشے میں سے الٹراوائلٹ شعاعوں کے علاوہ تمام شعاعیں گزر سکتی ہیں اور چونکہ وہ شعاعیں صحتمند خلیات پر نہیں پڑیں لہٰذا وہ صحتمند رہے اور بیمار نہیں ہوئے۔یاد رہے کہ صحتمند خلیوں پر پڑنے والی تمام شعاعیں بیمار خلیوں سے نکلتی ہیں لیکن چونکہ صحتمند خلئے شیشے میں محفوظ تھے اور بیمار خلیوں سے نکلنے والی الٹرا وائلٹ شعاعوں کی زد میں نہیں آئے لہٰذا سالم رہے۔

یہ تجربہ مختلف بیماریوں اور ایک جیسے یا متفرق خلیوں پر بیس سالوں کے دوران پانچ ہزار مرتبہ دہرایا گیا کیونکہ نوو وو سائبیرسک کے تحقیقاتی مرکز کے سائنس دان چاہتے تھے کہ تجربے کے نتیجے میں ذرا بھر شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔

پانچ ہزار مرتبہ انجام پانے والے تجربے کا نتیجہ ایک ہی تھا اور وہ یہ کہ بیمار خلئے الٹرا وائلٹ شعاعوں سمیت تمام شعاعیں خارج کرتے ہیں اور دوسرے یہ کہ جب کبھی صحتمند خلئے بیمار خلیوں سے خارج ہونے والی الٹرا وائلٹ شعاعوں (نہ کہ کوئی دوسری الٹرا وائلٹ شعاعوں) کی زد میں آتے ہیں' بیمار ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کو وہی بیماری لاحق ہو جاتی ہے جو اس مریض کے خلیوں کی بیماری ہوتی ہے۔

ان تجربات کو انجام دینے میں بیس سال کا عرصہ لگا۔ اس دوران صحتمند اور بیمار خلیوں کے درمیان کسی قسم کا رابطہ نہ تھا جس سے یہ گمان پیدا ہوتا کہ وائرس یا بیکٹریا ایک گروہ کے خلیوں سے دوسرے گروہ کے خلیوں میں نفوذ کرتے ہیں۔ پانچ ہزار تجربات کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو گئی کہ صحتمند خلیوں میں بیماری پیدا کرنے کا

سبب وہ الٹرا وائلٹ شعاعیں ہیں جو بیمار خلیوں سے خارج ہوتی اور صحتمند خلیوں پر پڑتی ہیں۔

اگر بیمار انسان کے خلیوں سے خارج ہونے والی شعاعوں کو کسی طرح روک دیا جائے تو صحتمند خلئے بیمار نہیں ہوں گے اور اینٹی بائیوٹک ادویات (جو بیکٹریا یا وائرس کو مارتی ہیں) کی خاصیت یہ بھی ہے کہ وہ بیمار جسم سے ان خلیوں سے خارج ہونے والی شعاعیں اتنی کم اثر ہوجاتی ہیں کہ وہ مزید نقصان دہ نہیں رہتیں۔

روسی سائنس دانوں کے تجربات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمارے بدن کے خلیوں میں سے ہر ایک شعاعیں خارج کرنے والا اور شعاعیں وصول کرنے والا ہے۔ اگر ایک صحتمند خلیہ ایک بیمار خلئے سے خارج ہونے والی الٹرا وائلٹ شعاع کو وصول یا ریکارڈ کرے تو وہ صحتمند خلیہ بھی بیمار ہوجائے گا۔ لیکن اگر الٹراوائلٹ شعاعوں کو خارج کرنے والا خلیہ بیمار نہ ہو تو اس کی شعاعیں صحتمند خلیوں میں بیماری نہیں پیدا کرسکتیں۔

متعدد تجربات کی روشنی میں یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ اگر کچھ صحتمند خلیے toxin کے اثر سے بیمار ہو جائیں اور الٹرا وائلٹ شعاعیں خارج کریں تو ان کی شعاعیں ان صحتمند خلیوں کو بھی بیمار کر دیتی ہیں جن کا ان سے کسی قسم کا کوئی رابطہ نہیں ہوتا۔ ٹاکسین (toxin) ایک زہر کا نام ہے جو ہمارے جسم کے بعض اعضاء پیدا کرتے ہیں اور ان کا خلیوں کو بیمار کرنے کا طریقہ بیکٹریا اور وائرس سے مختلف ہے۔ خصوصاً" نصف عمر کے بعد بدن میں ٹاکسین بنانے کے جو عوامل ہیں ان میں ایک زیادہ اور مقوی غذا کھانا بھی ہے۔ بہرحال Toxin ایک زہر ہے جو صحتمند خلیوں کو بیمار کردیتا ہے۔ یہ بات تجربے سے ثابت ہے کہ جو خلئے Toxin کی وجہ سے بیمار ہوتے ہیں اور شعاعیں خارج کرتے ہیں وہ الٹرا وائلٹ شعاعوں کے ذریعے صحتمند خلیوں کو بھی بیمار کر دیتے ہیں یعنی اس بات کا انحصار صرف اسی پر نہیں کہ وائرس اور بیکٹریا کے ذریعے ہی بیمار ہونے والے خلئے صحتمند خلیوں کو بیمار کرسکتے ہیں بلکہ ٹاکسین کے ذریعے بیمار ہونے والے خلئے بھی الٹرا وائلٹ شعاعیں خارج کرکے صحتمند خلیوں کو بیمار کرسکتے ہیں۔

یہاں اس بات کی وضاحت کی ضرورت نہیں کہ یہ علمی حقیقت جو بیس سال کے عرصے میں پانچ ہزار تجربات کے نتیجے میں پایہ ثبوت کو پہنچی کوئی جدید نظریہ اس کی برابری نہیں کرسکتا۔ اس کی وجہ سے ڈاکٹروں اور سائنس دانوں کے لئے بیماریوں کا علاج معالجہ کرنے کے سلسلے میں نئی راہیں کھلیں۔

وہ اس ترتیب کے ساتھ کہ بیماری کے نمودار ہونے کے بعد جسم کے کچھ خلئے بیمار خلیوں سے خارج ہوکر صحتمند خلیوں کی طرف رخ کرنے والی الٹرا وائلٹ شعاعوں کے راستے میں رکاوٹ بنے اور اس طرح بیماری کے پھیلنے میں رکاوٹ ثابت ہوئے۔

اس کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ خلیوں کو بیمار ہی نہ ہونے دیا جائے کہ وہ الٹرا وائلٹ شعاعیں خارج کرکے تندرست خلیوں کو بیمار کردیں۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ کسی زمانے میں اگر علاج معالجہ کی کوئی جدید روش دریافت

ہوتی ہے تو اس روش پر انحصار کرتے ہوئے اس سے کافی امیدیں وابستہ ہو جاتی ہیں اور خیال کیا جاتا ہے کہ تمام امراض کا اس روش کے ذریعے علاج ہو سکتا ہے۔

لیکن ہم اس طبی روش کی دریافت کے بارے میں مبالغہ آرائی نہیں کرتے اور یہ نہیں کہتے کہ سرطان سمیت تمام بیماریوں کا علاج اس طریقہ کار سے ہو سکتا ہے خصوصاً" وہ سائنس دان جنہوں نے یہ روش دریافت کی ہے' انہوں نے اس طریقہ کار کی نشاندہی نہیں کی اور نہ ہی یہ بتایا ہے کہ بیمار خلیوں سے خارج ہونے والی الٹرا وائلٹ شعاعوں کو کیسے روکا جاسکتا ہے۔

بہرکیف یہ دریافت علمی نقطہ نگاہ سے قابل توجہ ہے اور اس پر اتنا کام اور تحقیق ہوئی ہے کہ اب اس کی صحت پر کوئی شک و شبہ نہیں ہو سکتا۔ محقق سائنس دانوں نے معلوم کرلیا ہے کہ خلیوں کا ایک گروہ اگر چند بیماریوں میں مبتلا ہوجائے تو ان میں سے ہر بیماری ایک مخصوص قسم کی فوٹان خارج کرتی ہے۔ یہ سائنس دان اب ان فوٹانوں کے جدول اور ان کی اپنی اصطلاح میں ان فوٹانوں کے کوڈ کو تیار کرنے میں مشغول ہیں جو بیمار خلیے مختلف قسم کی بیماریوں کی اقسام کی وجہ سے خارج کرتے ہیں اور چونکہ بیکٹریا یا وائرس اور ٹاکسین کے ذریعے پھیلنے والی بیماریاں کوئی ایک یا دو نہیں لہٰذا اس جدول کے تیار کرنے میں ایک عرصہ لگے گا۔ البتہ جدول کی تکمیل کے دوران کئی بیماریوں کا علاج ہو سکتا ہے۔

مثال کے طور پر جب یہ معلوم ہوجائے گا کہ انفلوانزا کے وائرس سے بیمار ہونے والے خلیے کونسی شعاع خارج کرتے ہیں ؟ اور وہ کتنی ہیں یا ان کی لمبائی وغیرہ کتنی ہے ؟ تو انفلوانزا کے علاج و معالجے اور صحتمند خلیوں کو بیمار ہونے سے روکنے کے سلسلے میں اقدامات کئے جاسکتے ہیں۔

اس سلسلے میں امریکہ میں بھی تحقیقات ہوئی ہیں اور جو نتائج حاصل ہوئے ہیں وہ روسی سائنس دانوں کے نتائج سے ملتے جلتے ہیں۔ یہ نتائج امریکہ کے سائنسی رسالوں میں بھی شائع ہوچکے ہیں۔ اس موضوع پر ایک محقق ڈاکٹر جوہن اوٹ نے ایک کتاب بھی لکھی ہے۔

اس ساری بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دوسری صدی ہجری کے پہلے پچاس سالوں کے دوران امام جعفر صادقؑ کا یہ نظریہ کہ روشنی کی بعض شعاعیں بیماریاں پھیلانے کا باعث بنتی ہیں' جسے اس زمانے میں اور اس کے بعد بیہودہ خیال کیا جاتا رہا آخرکار حقیقت ثابت ہوا اور آج ہمیں معلوم ہوچکا ہے کہ الٹرا وائلٹ شعاعیں جب بیمار اجسام سے خارج ہوکر تندرست اجسام پر پڑتی ہیں تو انہیں بیمار کردیتی ہیں' جبکہ سورج سے خارج ہونے والی الٹرا وائلٹ شعاعیں ہوا کی عدم موجودگی میں جانداروں کے بدن پر پڑیں تو ان کی ہلاکت کا باعث بن سکتی ہیں لیکن یہی شعاعیں چونکہ ہوا کی موجودگی میں زمین پر جانداروں کے اجسام پر پڑتی ہیں تو کسی جاندار کو بیمار نہیں کرتیں۔ بہرحال بیالوجی اور جدید طبی تحقیقات نے بارہ سو پچاس سال کے بعد امام جعفر صادقؑ کے نظریہ کی

صحت کا ثبوت فراہم کردیا ہے۔

جیسا کہ ہم نے تذکرہ کیا ہے' پرانے زمانے میں بیماری کے منتقل ہونے کا واحد ذریعہ بیماری کی بو کو خیال کیا جاتا تھا' لیکن قدیم زمانوں میں انسان اس بات کا کھوج لگا چکا تھا بعض امراض متعدی ہیں اور ایک سے دوسرے تک پہنچتے ہیں۔

فرانس میں موجود ایک مصری پاپی روس (دستاویز) (۱۰۱) جس کا تعلق پندرہویں صدی قبل مسیح سے ہے تحریر ہے کہ مصری لوگوں کو بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لئے ساحل پر لنگرانداز ہونے والی کشتیوں کے مسافروں کو مصر کے ساحل پر اترنے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔ اس دستاویز سے پتہ چلتا ہے کہ پندرہویں صدی قبل مسیح میں کشتیاں مصر کی جانب سفر کرتی تھیں اور وہاں تک مسافر لے جاتی تھیں اور آج سے تین ہزار پانچ سو سال پہلے بھی کم از کم بحیرہ روم اور بحیرہ احمر میں جہاز رانی عام تھی۔ اس بات کا احتمال ہے کہ سمندری جہاز اس ڈر سے کہ راستہ گم نہ ہو' ساحل کے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ اگر پاپی روس کی دستاویز کے علاوہ کوئی اور دستاویز اس بات کا ثبوت فراہم نہ بھی کرتی کہ آدمی قدیم زمانے سے متعدی امراض سے واقف تھا تو صرف یہی دستاویز یہ بات ثابت کرنے کے لئے کافی تھی کہ آدمی ۳۵ صدیاں پہلے اس بات سے آگاہ تھا کہ بعض امراض ایسے ہیں جو ایک انسان سے دوسروں تک پھیلتے ہیں۔ جیسا کہ آج کے علوم نے امام جعفر صادقؑ کے اس نظریہ کی تصدیق کردی ہے کہ روشنی کی بعض اقسام بیماریوں کے پھیلانے کا باعث بنتی ہیں تو کیا اس بنا پر یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ متعدی بیماریاں جو کسی جگہ اچانک نمودار ہوتی ہیں وہ روشنی کی وجہ سے نمودار ہوتی ہیں ؟

کیونکہ الٹرا وائلٹ شعاعیں بیمار خلیوں سے خارج ہونے کے بعد اردگرد پھیل جاتی ہیں اور اسی وجہ سے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جہاں متعدی بیماری کے وجود کا شائبہ تک بھی نہیں ہوتا وہاں اچانک ایک آدمی اس وبائی بیماری کا شکار ہوجاتا ہے۔ الٹرا وائلٹ شعاعوں کے ذریعے روس اور امریکہ کے ماہرین جنہیں یقین ہے کہ بیماری' بیمار خلیوں سے UVR کے ذریعے صحتمند خلیوں تک پہنچتی ہے لیکن ابھی تک وہ اس بات کو نہیں سمجھ سکے کہ بیماری کا نفوذ کیسے ہوتا ہے جبکہ انہیں اس بات کا بھی یقین ہے کہ الٹرا وائلٹ شعاعیں جو بیمار خلیات سے خارج ہوتی ہیں صحتمند خلیوں میں بیماری پھیلانے کا سبب بنتی ہیں۔

سائنس دان اس بات پر غور کر رہے ہیں کہ روشنی کی حرارت کیسے صحتمند خلئے میں بیماری کو جنم دیتی ہے ؟ کیونکہ جب تک یہ معلوم نہ ہوجائے کہ روشنی کی حرارت صحتمند خلیے میں بیماری کو جنم دیتی ہے' اس وقت تک اس بات کو قبول نہیں کیا جاسکتا کہ کسی علاقے میں ناگہاں پھوٹ پڑنے والی متعدی بیماری جہاں اس بیماری کے پھوٹ پڑنے کا کوئی احتمال نہیں ہوتا روشنی کی الٹرا وائلٹ شعاعوں کے ذریعے پھوٹتی ہے۔

چونکہ ہم الٹرا وائلٹ شعاعوں کے ذریعے بیماری کے پھیلنے کا تذکرہ کر رہے ہیں اور اب تک یہ معلوم نہیں

ہوسکا کہ الٹرا وائلٹ شعاعیں جب ایک بیمار خلیے سے تندرست خلیے پر پڑتی ہیں تو اسے کیسے بیمار کرتی ہیں ؟
پس ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ انسانی علم' وائرس کے بیماری پھیلانے کے عمل کے ایک حصے کے متعلق کوئی اطلاع نہیں رکھتا۔

انسانی علم یہ جانتا ہے کہ وائرس خلئے میں جگہ گھیر کر اسے تباہ کرنے پر لگ جاتا ہے اور جب کوئی دوائی مریض کو دی جاتی ہے تو وہ دوائی وائرس کی نابودی میں مدد کرتی ہے۔ بہرکیف اس بارے میں ابھی تک بعض چیزوں سے انسانی علم آگاہ نہیں ہے۔ چونکہ علم نے نہ تو ابھی خلیے کو بخوبی پہچانا ہے اور نہ ہی وائرس کی شناخت کرسکا ہے۔ اگر انسانی علم یہ جان لے کہ بدن کے خلیے کیسے بوڑھے ہوتے ہیں تو وہ ضرور بڑھاپے پر قابو پالے۔

امریکی اور روسی سائنس دانوں کی تحقیقات کے نتیجے میں ثابت ہوچکا ہے کہ فوٹان جو روشنی کا ایک ذرہ ہے اگر اس کا شمار الٹرا وائلٹ شعاعوں میں کیا جائے اور یہ ایک بیمار خلیے سے خارج ہو تو صحتمند خلئے کی بیماری کا باعث بنتا ہے۔

بہرکیف شاید انسانی علم سے اندازہ لگانے سے فوٹان کے ذریعے بیماری کے پیدا ہونے کی حالت اتنی مختلف ہو کہ ہم اس نتیجہ پر پہنچیں کہ بیماری کے پیدا ہونے کا سبب اس سے بالکل مختلف ہے جو ہم خیال کرتے تھے۔

فزکس سمیت مختلف علوم کے بارے میں امام جعفر صادقؒ کے نظریات یہاں تک ہی محدود نہیں ہین بلکہ فزکس سمیت دوسرے علوم کے بارے میں آپ کے ایسے نظریات ہیں جن کی تائید آج کل کے علوم کرتے ہیں۔ امام جعفر صادقؒ کے نظریات میں سے ایک نظریہ یہ ہے کہ خداوندتعالی کے علاوہ جتنے وجود اس کائنات میں پائے جاتے ہیں ان کی ضد بھی موجود ہے لیکن ان اضداد میں تصادم نہیں پیدا ہوتا۔ اگر تصادم وجود میں آجائے تو بعید نہیں کہ یہ کائنات ویران ہوجائے۔

یہ نظریہ آج کے مادہ اور ضد مادہ کے نظریئے سے ملتا جلتا ہے جس کا ہم مختصراً" گزشتہ صفحات میں ذکر کر چکے ہیں اور اب بحث کی مناسبت سے امام جعفر صادقؒ کے نظریہ کے بارے میں گفتگو کریں گے اور بتائیں گے کہ آپ کا نظریہ تھیوری کے مرحلے سے گزر کر عملی مرحلے میں داخل ہوگیا ہے اور بتدریج سائنس دان مختلف ممالک میں عناصر کے ضد مادہ (۱۰۲) کو دریافت کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ مادہ اور ضدمادہ کے درمیان فرق یہ ہے کہ عناصر کے مادہ کے ایٹموں میں الیکٹران پر منفی اور پروٹان پر مثبت برقی بار ہوتا ہے۔ ابھی تک کسی نے تجربہ نہیں کیا کہ اگر مادہ کے ایٹم ضدمادہ کے ایٹموں سے متصادم ہوجائیں اور دھماکہ ہو تو کیا ہوگا ؟ اس بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ تھیوری تک محدود ہے اور ایسا ہی ہے جس طرح ۱۹۴۴ء کی گرمیوں سے پہلے یورینیم کے ایٹموں کے دھماکے کے بارے میں کہا جاتا تھا جبکہ اس وقت تک امریکہ نے اپنے ملک میں ایٹمی تجربہ نہیں کیا تھا۔ اس وقت کہا جاتا تھا کہ ایٹم بم کا تجربہ ممکن ہے ایسا نہیں ہوا اور اس کے بعد آج تک کئی مرتبہ

ایٹمی اور ہائیڈروجنی دھماکے ہوئے لیکن کرہ زمین کے عناصر دھماکے کا شکار نہیں ہوئے۔ ایٹم بم کے دھماکے اور مادہ و ضدمادہ کے دھماکے میں فرق پایا جاتا ہے کیونکہ ایٹم بم یا ہائیڈروجن بم پھٹتا ہے تو مادے کا کچھ حصہ توانائی میں تبدیل ہوتا ہے اور مادے کا زیادہ حصہ بیکار رہ جاتا ہے یعنی وہ توانائی میں تبدیل نہیں ہوتا' جیسا کہ ہمیں معلوم ہے توانائی کو مادے میں تبدیل کرنے کا قانون جسے آئن سٹائن نے وضع کیا یہ ہے۔

E=mc2

اس قانون کے مطابق جو کچھ ایک ایٹم بم یا ہائیڈروجن بم میں ہے اگر وہ سب کچھ توانائی میں تبدیل ہوجائے تو بہت زیادہ توانائی وجود میں آتی ہے۔ انگلستان کے ایک ماہر طبیعیات جول (Jule) نے جس کے نام پر ایک مقناطیسی پیمانے کا نام رکھا گیا ہے اور جو انیسویں صدی عیسوی میں ہوگزرا ہے۔ اس کے بقول اگر ایک کلوگرام مادہ تمام کا تمام توانائی میں تبدیل ہوجائے اس طرح کہ اس سے دھواں اور راکھ بھی وجود میں نہ آئے تو کائنات محو ہو جائے گی۔

لیکن ایک اور ماہر طبیعیات آئن سٹائن نے بیسویں صدی میں مادے کو توانائی (انرجی) میں تبدیل کرنے کے قانون کے ذریعے اس بات کی نشاندہی کی کہ اگر ایک کلوگرام مادہ مکمل طور پر توانائی میں تبدیل ہوجائے تو کائنات فنا نہیں ہوگی۔ لیکن بنی نوع انسان آج تک ایٹمی اور ہائیڈروجنی بموں کے ذریعے مادے کو مکمل طور پر توانائی میں تبدیل کرنے کے قابل نہیں ہوسکا۔

اگست ۱۹۵۵ء میں ہیروشیما پر جو بم گرایا گیا تھا اس کی کمیت کے ہزار حصوں میں سے انیس حصے توانائی میں تبدیل ہوئے تھے جبکہ باقی ضائع ہوگئے تھے۔ہائیڈروجنی بموں میں مادے کے توانائی میں تبدیل ہونے کے اندازے کے بارے میں ہمیں اطلاع نہیں اور وہ حکومتیں جن کے پاس یہ بم ہیں اور انہوں نے ان پر تجربات کئے ہیں ان کے بقول اس راز کو افشاء نہیں کیا کہ بم کی کتنی مقدار کمیت توانائی میں تبدیل ہوتی ہے تاکہ ہم جان لیں کہ ان کا کتنا حصہ ضائع ہوتا ہے۔ اس بارے میں ان حکومتوں کی خاموشی کی وجہ دفاعی رازوں کی حفاظت ہے۔

آئن سٹائن کے اس قانون کے باوجود کہ اگر ایک کلوگرام مادہ مکمل طور پر توانائی میں تبدیل ہوجائے تو زمین نیست و نابود نہیں ہوگی۔ لیکن بہرحال جب امریکی سائنس دان ۱۹۴۴ء میں ایٹمی تجربہ کرنا چاہتے تھے تو اس بلڈنگ میں موجود سائنس دان اس بات سے گھبرا گئے تھے کہ کرہ ارض فنا ہو جائے گا۔ آج بھی جب فزکس میں مادہ اور ضدمادہ کی بحث سامنے آتی ہے تو ماہرین طبیعیات کہتے ہیں کہ مادہ اور ضدمادہ کا ٹکراؤ دونوں کو مکمل طور پر توانائی میں تبدیل کردے گا۔ان سائنس دانوں کے بقول ایک کلوگرام مادے کے ایک کلوگرام ضدمادہ میں تبدیل ہونے سے اس قدر توانائی وجود میں آئے گی کہ کرہ ارض تباہ ہوکر گیس میں تبدیل ہوجائے گا۔ چونکہ اس گیس کی حرارت بہت زیادہ ہوگی لہٰذا یہ سورج تک پھیل جائے گی۔ لیکن پروفیسر آلفن جو سویڈن کی لوند یونیورسٹی میں

فزکس کے استاد ہیں اس نظریہ کے مخالف ہیں۔ ان کے بقول آئندہ بنی نوع انسان کی توانائی کا منبع نہ تو یورینیم کا برقی کارخانوں میں استعمال ہے اور نہ دریاؤں اور سمندروں سے ہائیڈروجن حاصل کرکے اس کا استعمال ہے۔ بلکہ بنی نوع انسان آئندہ مادہ اور ضد مادہ کے تصادم کے ذریعے توانائی حاصل کرلے گا اور ایک سو کلوگرام مادہ اور ضدمادہ یعنی پچاس کلوگرام مادہ اور پچاس کلوگرام ضدمادہ تمام دنیا میں انسان کی توانائی کی سالانہ ضروریات پوری کرنے کے لئے کافی ہوگا۔

جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے کہ ابھی تک مادہ اور ضدمادہ کو آپس میں ٹکرایا نہیں گیا جس سے یہ معلوم ہوسکتا کہ کیا چیز حاصل ہوتی ہے ؟ لیکن پروفیسر آلفن کی تھیوری کے مطابق توانائی کے علاوہ کوئی ایسی چیز وجود میں آئے گی جو ماحول کو آلودہ کرے۔

پروفیسر آلفن نے اس توانائی کو جو مادہ اور ضدمادہ کے تصادم کے نتیجے میں وجود میں آتی ہے میٹرجی (Matergy) کا نام دیا ہے جیسا کہ عام توانائی کو انرجی کہا جاتا ہے۔اس سائنس دان کے نظریئے کے مطابق اگر آدھا کلوگرام مادہ' آدھے کلوگرام ضد مادہ کے ساتھ تصادم کرے تو ایک ارب درجہ حرارت وجود میں آئے گا اور دنیا میں کوئی ایسا منبع یا ذریعہ نہیں ہے جو اتنی حرارت پیدا کرسکے۔ علم نجوم کے ماہرین کے بقول سورج کے مرکز کا درجہ حرارت دس ملین درجے ہے۔ کیابنی نوع انسان اتنی زیادہ حرارت کو کنٹرول کرکے اپنے کام میں لاسکتا ہے ؟ پروفیسر آلفن کہتا ہے ہاں' مادہ اور ضد مادہ کے نامکمل دھماکے سے درجہ حرارت میں کمی پیدا کی جاسکتی ہے۔ نامکمل دھماکے سے اس کی مراد ایٹمی بموں کا دھماکہ ہے جس میں مادے کا صرف تھوڑا سا حصہ توانائی میں تبدیل ہوتا ہے' جبکہ باقی حصہ ضائع ہوجاتا ہے۔ مادہ اور ضدمادہ میں تصادم کے موضوع کو جو چیز تھیوری کی حدود سے آگے نہیں بڑھنے دیتی وہ اس کا اقتصادی پہلو ہے۔ کیونکہ لندن یونیورسٹی کے پروفیسر آلفن کے نظریہ کے مطابق مادہ اور ضدمادہ کے آپس میں ٹکرانے اور توانائی پیدا کرنے پر دس سے پندرہ ارب ڈالر خرچ آتا ہے اور آج کوئی حکومت یا ادارہ دس سے پندرہ ارب خرچ کرکے مادہ اور ضدمادہ کے دھماکے کا تجربہ کرنے پر تیار نہیں ہے۔ تاکہ پروفیسر آلفن کی اصطلاح کے مطابق میٹرجی وجود میں آئے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ اگر مادہ اور ضدمادہ کے تصادم کا تجربہ کرلیا جائے تو مادہ اور ضدمادہ کے دھماکے سے میٹرجی کا حصول آسان ہوجائے گا۔

جس طرح ایٹمی توانائی سے فائدہ اٹھانے کے لئے تمام عناصر میں سے یورینیم کا انتخاب کیا گیا تھا اسی طرح خیال کیا جاتا ہے کہ مادہ اور ضدمادہ کے دھماکے سے توانائی حاصل کرنے کے لئے ہیلیم (Helium) کے عنصر سے استفادہ کیا جائے گا کیونکہ روسی ماہرین طبیعیات نے ہیلیم کا ضد مادہ حاصل کیا ہے اور روس میں ہیلیم کے مادہ اور ضد مادہ کے دھماکے کی ابھی سے تیاریاں ہورہی ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اس بارے میں مزید بحث فضول ہے۔

# ستاروں کی روشنی پر گفتگو

جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ علمی بحثوں میں سے کوئی ایسی بحث نہیں جس کے بارے میں امام جعفر صادقؑ نے اظہار خیال نہ فرمایا ہو۔ آپ کے بعض نظریات جو اب تک ہمارے سامنے آئے ہیں آپ کے علمی کمال کی دلیل ہیں۔

آپ کے منجملہ نظریات میں سے ستاروں کے بارے میں آپ کا ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ جو ستارے ہم رات کو آسمان پر دیکھتے ہیں ان میں سے ایسے ستارے بھی ہیں جو اس قدر نورانی ہیں کہ سورج کی روشنی ان کے مقابلے میں ہیچ ہے۔

ستاروں کے متعلق بنی نوع انسان کی محدود معلومات امام جعفر صادقؑ اور ان کے بعد آنے والے دور سے لے کر اب تک اس حقیقت کو سمجھنے میں رکاوٹ بنی رہیں۔ اس زمانے میں انسان کا خیال تھا کہ جو کچھ امام جعفر صادقؑ نے ستاروں کے متعلق کہا ہے وہ عقل سے بعید اور ناقابل قبول ہے۔ یہ بات محال نظر آتی ہے کہ یہ چھوٹے چھوٹے نورانی نقطے جنہیں ستاروں کا نام دیا جاتا ہے اس قدر روشن ہوں کہ سورج ان کے سامنے بے نور نظر آئے۔

آج جبکہ امام جعفر صادقؑ کو گزرے ہوئے بارہ سو سال ہو چکے ہیں' یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ جو کچھ اس عظیم انسان نے کہا صحیح ہے اور دنیا میں ایسے ستارے موجود ہیں جن کی روشنی کے سامنے ہمارا سورج بے نور نظر آتا ہے۔

یہ روشن ستارے کوارز' (۱۰۴) کے نام سے موسوم ہیں۔ ان میں سے بعض کا زمین سے فاصلہ نو ہزار ملین (نو ارب) نوری سال ہے اور آج دن و رات میں ریڈیو ٹیلی سکوپ کی آنکھ تک پہنچنے والی شعاعیں نو ہزار ملین سال کا فاصلہ طے کرنے کے بعد زمین تک پہنچتی ہیں۔ ہم نے یہاں پر دن و رات کہا ہے' ممکن ہے کہ یہ خیال کیا جائے کہ ہم نے غلطی کی ہے' کیونکہ ستارے تو صرف رات کو نظر آتے ہیں۔ لیکن اب وہ زمانہ گیا جب انسان کے پاس ریڈیو ٹیلی سکوپ (۱۰۵) تھی۔ جبکہ آج تین سو میٹر قطر کی ٹیلی سکوپ' پورٹوریکو میں موجود ہے۔ اس کی مدد سے دن میں بھی ستاروں کو دیکھا جا سکتا ہے۔

بعض کوارز نامی ستاروں کی روشنی ہمارے سورج کی روشنی سے دس ہزار ارب گنا زیادہ ہے۔ یہاں پر ہم نے نہ غلطی کی ہے اور نہ ہی مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے۔ ستاروں کی روشنی ناپنے کے لئے ہمارے پاس پیمائش کی واحد اکائی ہمارے سورج کی روشنی ہے۔ بعض کوارز ستارے اس قدر روشن ہیں کہ ان کی روشنی ہمارے

سورج کی روشنی سے دس ہزار ارب گنا زیادہ ہے۔ لہٰذا کسی مبالغہ آرائی کے بغیر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا سورج کوارز ستارے کے مقابلے میں ایک بجھا ہوا چراغ ہے۔ اس کو اچھی طرح تصور میں لانے کے لئے ایک کا ہندسہ ڈالیں اور اس کے دائیں جانب سولہ صفر لگادیں۔

یہ ستارے جن میں سے پہلا ستارہ ۱۹۶۳ء میں دریافت ہوا اور اب تک ان میں سے دوسو سے زیادہ دریافت ہوچکے ہیں۔ اب سائنس دان ایک ایسی ریڈیو ٹیلی سکوپ بنانے میں لگے ہوئے ہیں جس کا عرض تیس کلومیٹر عرض والی دوربین کے برابر ہو۔ ہمارے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ تیس کلومیٹر (تیس ہزار میٹر) عرض والی دوربین کی مانند ہو نہ کہ خود وہ تیس کلومیٹر عرض رکھتی ہو۔ کیونکہ ریڈیو ٹیلی سکوپ کے لئے کوئی ایسی دوربین نہیں بنائی جاسکی جس کا عرض تیس کلومیٹر (تیس ہزار میٹر) ہو۔

اس عظیم ریڈیو ٹیلی سکوپ کی سائنس دانوں نے منصوبہ بندی اس طرح کی ہے کہ ریڈیو ٹیلی سکوپ کے انٹینا (Antenna) کی کچھ تعداد کو ایک علاقے میں انگریزی کے وائی یا فرانسیسی کے ایگرگ (Y) کی شکل میں اس طرح لگایا جائے کہ اس وائی یا ایگرگ کی تینوں شاخوں میں سے ہر ایک اکیس کلومیٹر ہو اور یہ انٹینا (Antenna) کی پٹڑی پر رکھے جائیں تاکہ ان کو مرضی سے ادھر ادھر حرکت دے کر معین فاصلے پر کھڑا کیا جا سکے۔ ان اینٹیناز کا مجموعی رقبہ جو اکیس کلومیٹر ہوگا اس کی قوت ریڈیو ٹیلی سکوپ کے نظارہ کرنے کی قوت کے مساوی ہوگی۔ پھر اس عظیم ریڈیو ٹیلی سکوپ کو کوارز کے دیکھنے کے لئے استعمال کریں گے تاکہ اس کے ذریعے اچھی طرح اس کا مشاہدہ کرسکیں۔

نجومیوں نے اٹھارہویں صدی عیسوی کے بعد آہستہ آہستہ عادت بنالی تھی کہ کائنات میں دریافت ہونے والے بڑے بڑے اور روشن ستاروں کے بارے میں حیرت کا اظہار نہیں کرتے تھے۔

پھر بھی جب ۱۹۶۳ء میں پہلا کوارز دریافت ہوا تو ماہرین فلکیات کی عقل دنگ رہ گئی تھی اور جب انہوں نے دوردراز ایک کوارز پر تحقیق کرنے کے لئے ٹیلی سکوپ کی آنکھ سے آنکھ لگائی تو انہوں نے اپنے سر کو اپنے دو ہاتھوں سے پکڑلیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی عقل ان کے سر سے اڑ جائے اور وہ دیوانے ہو جائیں۔

جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں دور دراز موجود کوارز زمین سے نو ارب نوری سال کے فاصلے پر واقع ہیں۔ جبکہ آئن سٹائن کا کہنا ہے کہ کائنات کا قطر تین ارب نوری سال سے زیادہ نہیں ہے۔ فضائی وسعت جسے روشنی نو ہزار ملین سال میں طے کرتی ہے اس کے لئے صرف اتنا جاننا کافی ہے کہ روشنی ہر سال نوہزار پانچ سو ارب کلومیٹر فاصلہ طے کرتی ہے۔ اس طرح ہمیں کوارز اور زمین کا درمیانی فاصلہ معلوم کرنے کے لئے نو ہزار پانچ سو ارب کلومیٹر کو نو ارب سال سے ضرب دینا چاہئے۔

یہ فاصلہ جس کا انسانی عقل احاطہ نہیں کرسکتی اس سے بھی حیران کن چیز کوارز کی روشنی ہے جس نے

سائنس دانوں کی عقل مبہوت کردی ہے۔ یہ روشنی جو سورج کی روشنی کے دس ہزار ارب گنا برابر ہے اور سائنس دان ابھی تک اس بات کا کھوج نہیں لگا سکے کہ وہ کونسی توانائی ہے جو اس روشنی کو وجود میں لاتی ہے۔

پروفیسر آلفن کا کہنا ہے کہ کائنات میں مادہ اور ضدمادہ کے دھماکوں کے علاوہ کوئی ایسا ذریعہ نہیں جو اس قدر توانائی پیدا کرسکے۔ وہ تجربہ جس کی تمہید روس میں باندھی جا رہی ہے اگر عملی صورت میں سامنے آجائے اور ہیلیم اور ضد ہیلیم کا دھماکہ ہو تو نہ صرف یہ کہ توانائی کا ایک بیش بہا منبع بنی نوع انسان کے ہاتھ لگے گا بلکہ ممکن ہے کہ کوارز کی توانائی (انرجی) کا منبع بھی معلوم ہوجائے۔

شاید آپ یہ پوچھیں کہ روس میں عنصر (Element) اور ضد عنصر (Anti element) دھماکہ نہیں کیا جاتا اور ہیلیم اور ضد ہیلیم کو ہی کیوں اس مقصد کے لئے استعمال کرتے ہیں ؟

اس کا جواب یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں ضد ہیلیم (Anti Helium) باسانی دستیاب ہے جبکہ آکسیجن یا ہائیڈروجن کا اینٹی عنصر دستیاب نہیں۔ آج جب امریکہ میں پہلے ایٹمی دھماکے کے تجربے کو انتیس سال ہوچکے ہیں ابھی تک یورینیم اور پلوٹونیم (جسے یورینیم سے حاصل کرتے ہیں) اور ہائیڈروجن ہی کو ایٹمی دھماکوں میں استعمال کرتے ہیں اور ہائیڈروجن میں کسی دوسرے عنصر کے اٹموں کے ادغام کے ذریعے توانائی حاصل کی جاتی ہے نہ کہ یورینیم اور پلوٹونیم کی طرح اسے ٹکڑے ٹکڑے کرکے۔

سب سے زیادہ پائے جانے والے عناصر میں لوہا بھی ہے۔ لیکن ابھی تک لوہے کے اٹموں کا دھماکہ نہیں کیا جاسکا۔ اس کے باوجود کہ تھیوری کے لحاظ سے لوہے اور تانبے وغیرہ کے ایٹموں کا دھماکہ بھی ممکن ہے لیکن ابھی تک کسی ایٹمی طاقت نے ان دھاتوں کے ایٹموں کے دھماکے کے لئے کوئی اقدام نہیں کیا۔ پس ہیلیم اور ضد ہیلیم کے دھماکے کی وجہ ضد ہیلیم کی فراہمی ہے۔ ریڈیو ٹیلی سکوپ نہ صرف دور دراز کی شعاعوں کو ریکارڈ کرتا ہے بلکہ خلاء میں موجود مالیکیولوں تک بھی اس کی رسائی ہوتی ہے۔ اب تک اس عظیم کائنات میں تقریباً تیس قسم کے مالیکیول دریافت ہوئے ہیں جن کا کچھ حصہ مشہور تیزابوں اور پروٹین کے خام مال پر مشتمل ہے۔ سادہ الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جانداروں کی ساخت میں استعمال ہونے والے خام مال کے خلیوں پر مشتمل ہے۔

ان مالیکیولوں کی ہماری زمین پر موجودگی یہ ثابت کرتی ہے کہ انسان سمیت تمام جانداروں کی اس روئے زمین پر موجودگی ایک معمولی بات ہے کوئی استثنائی بات نہیں۔

آج ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ شروع میں زمین میں زندگی کے کوئی آثار نہ تھے کیونکہ زمین ایک انتہائی گرم سیارہ تھی لہٰذا اس میں کسی زندہ وجود کا پایا جانا محال تھا۔ لیکن جونہی زمین ٹھنڈی ہوئی اور کائنات میں پائے جانے والے زندہ جرثومے زمین پر پہنچنے لگے تو وہ نابود نہیں ہوئے اور ان سے جاندار خلیے وجود میں آئے خصوصاً

پانچ مالیکول جن کا نام "یوراسل" ہے یعنی کو آئین' ٹی مین' اوہ نین اور سیٹورین جن سے زمین میں مشہور تیزاب اور پروٹین بنی۔ پھر ان حیوانوں کے خلیوں کے لئے جن میں انسانی خلیے بھی شامل ہیں اور اس علمی دریافت کے ضمن میں ہم ریڈیو ٹیلی سکوپس کے ممنون احسان ہیں۔ فلکی دوربین کے ذریعے انسان آج تک ستاروں کا مشاہدہ کرتا تھا اور ستاروں میں پائے جانے والے عناصر کو دریافت کرتا تھا۔ اس طرح انسان ستارے کے درجہ حرارت کو بھی اخذ کرلیتا تھا۔

لیکن انسان اس بیکراں خلا میں موجود مالیکولوں کا پتہ نہیں چلا سکتا تھا۔ یہ مالیکول جن کا کچھ حصہ زندگی کی تولید کرنے والے مالیکولوں پر مشتمل ہے' ریڈیو ٹیلی سکوپ کے ذریعے دریافت ہوچکے ہیں۔ کیونکہ آج ہمیں معلوم ہے کہ زندگی زمین پر کوئی کمیاب وجود نہیں للذا ہم ان دوسرے سیاروں پر بھی زندگی کی موجودگی کے امیدوار ہوسکتے ہیں جن کی کیفیت کرہ ارض جیسی ہے اور شاید وہ معیار زندگی کے لحاظ سے ہزاروں ملین سال ہم پر سبقت رکھتے ہوں۔ چونکہ وہ اس کائنات میں ہم سے ہزاروں ملین سال پہلے وجود میں آئے ہیں للذا انہوں نے وہ مسائل بھی حل کردیئے ہوں گے جنہیں ہم ابھی تک حل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ اگرچہ زیادہ وقت زندہ رہنا ہی زیادہ علم رکھنے کی دلیل نہیں کیونکہ بنی نوع انسان نے تقریبا" اس زمین پر دو ملین سال گزارے ہیں لیکن اس کے علم کا آغاز صرف دس پندرہ ہزار سال پہلے ہوا ہے۔

بہرکیف آج چونکہ ہمیں معلوم ہے کہ صرف ہم ہی اس کائنات کے شاہد نہیں اور شاید ایسے کئی اربوں دوسرے سیارے موجود ہوں جن میں بے شمار جاندار اور باہوش مخلوقات پائی جاتی ہوں جن کے علوم اور تجربات سے ہم استفادہ کرسکیں۔ موجودہ زمانے میں ہمارے پاس ریڈیو ٹیلی سکوپس ہی دوسرے سیاروں کے ساتھ رابطے کا بہترین ذریعہ ہیں۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ بعض ستاروں کی روشنی اتنی زیادہ ہے کہ سورج ان کے سامنے ماند ہے۔ آج ہم آپ کے فرمان کی تائید کرتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا سورج ان ستاروں کے سامنے ایک بجھا ہوا چراغ ہے اور آپ کی سوچ اور فکر میں وسعت اور گہرائی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ نے دوسری صدی ہجری کے پہلے پچاس سالوں کے دوران اس حقیقت کو پالیا تھا جس سے ہم آج مطلع ہوسکے ہیں۔ یہ کوارز جن سے بعض زمین سے نوہزار نوری سال کے فاصلے پر واقع ہیں کیا یہ کائنات کی ابتدا میں واقع ہیں یا کائنات کے وسط یا آخر میں ؟

ہمارا سورج ان کوارز کے سامنے ایک بجھے ہوئے چراغ کی مانند ہے۔ جبکہ سورج ہمارے چوبیں گھنٹوں کے دوران' زمین اور دوسرے سیاروں کو حرارت اور روشنی پہنچانے کے لئے چارسو ارب ٹن ہائیڈروجن کو ہیلیم میں تبدیل کرتا ہے اور مزید دس ارب سال تک یہ اسی طرح جلتا رہے گا۔

جب ہمارے سورج کی عمر اتنی لمبی ہے تو ہم اندازا" یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک کوارز کی عمر کتنی ہوگی ؟ ہم ایک نہایت ہی سادہ تخمینے سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ کوارز جو زمین سے نو ہزار ملین نوری سال کے فاصلے پر واقع ہیں ان کی عمر ہزار ارب سال سے زیادہ ہے۔ چونکہ اس کائنات میں ہمارے سورج کی مانند ایسے دوسرے سورج بھی موجود ہیں جو دس ارب سال بعد بجھ جائیں گے۔ تو ناگزیر علم و عقل کے حکم کے تحت اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ اس کائنات میں صرف ہماری دنیا ہی نہیں بلکہ دوسری دنیائیں بھی موجود ہیں۔

اگرچہ ہمارے فلکیات کے ماہرین (Astronomists) کی نظر میں بعض ستارے نہیں بجھے اور نہ ہی ناپید ہوئے پھر بھی دو یا دو سے زیادہ سورجوں کے درمیان پائے جانے والے طول کے فرق نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ صرف ایک ہی دنیا نہیں بلکہ ہماری دنیا کے علاوہ بھی دنیائیں موجود ہیں۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا' دنیائیں صرف ایک یا دو ہی نہیں بلکہ متعدد دنیائیں موجود ہیں۔ آپ کا یہ فرمان آج ناقابل تردید طور پر ثابت ہوچکا ہے۔ ہمارے نظام شمسی کی مانند ہزاروں دنیائیں مٹ جاتی ہیں لیکن کوارز باقی رہتے ہیں۔

امام جعفر صادقؑ کے نظریہ کے مطابق یہ متعدد دنیائیں دو گروہوں میں تقسیم ہوسکتی ہیں۔ ایک کا نام عالم اکبر اور دوسرے کا نام عالم اصغر ہے۔

ہمارا خیال ہے چونکہ عوالم اکبر اور عوالم اصغر موجود ہیں لہٰذا عوالم اوسط بھی ضرور موجود ہوں گے۔ لیکن امام جعفر صادقؑ نے عوالم اوسط کا نام ہی نہیں لیا بلکہ صرف عوالم اکبر اور عوالم اصغر کا نام لیا ہے کیونکہ دو عوالم میں سے ضرور ایک عالم بڑا اور دوسرا چھوٹا ہوگا۔ جب آپ سے عوالم اکبر اور عوالم اصغر کی تعداد کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے جواب میں فرمایا- خداوند تعالیٰ کے علاوہ کوئی بھی ان کی تعداد سے مطلع نہیں ہے اور کسی طرح بھی عوالم کی تعداد کو شمار نہیں کیا جاسکتا۔ آج کا علم امام جعفر صادقؑ کے اس فرمان کی تصدیق کرتا ہے۔

کیونکہ علم فلکیات جب ترقی کرتا جاتا ہے' ماہرین کہکشاؤں اور سورجوں کی تعداد سے زیادہ سے زیادہ آگاہ ہوتے جاتے ہیں۔ وہ اس بات کو جان لیتے ہیں کہ کہکشاؤں اور سورجوں کی تعداد کے بارے میں ان کا پہلا تصور غلط تھا اور کائنات کے سورجوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے جو ارشمیدس نے تیسری صدی قبل مسیح میں ذرات کی تعداد کے بارے میں بتائی تھی۔ ارشمیدس نے کہا تھا کہ اگر ہم ۱۰ کے ہندسے کو ۶۳ بار اسی ۱۰ کے ہندسے سے ضرب دیں تو کائنات میں پائے جانے والے ذرات کی تعداد کا پتہ چل سکتا ہے۔ ارشمیدس کے نظریئے کے مطابق ذرہ' مادے کا چھوٹے سے چھوٹا ٹکڑا ہوتا ہے جسے مزید تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لئے اس ذرے کو ناقابل تقسیم کہا جاتا تھا۔

اوڈینگٹن' ایک انگریز ماہر طبیعیات جو ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوا اس نے کہا کہ اگر ۱۰ کے عدد کو ۸۸ مرتبہ اسی ۱۰

کے ساتھ ضرب دیں تو کائنات میں ایلمون کی تعداد معلوم کی جا سکتی ہے۔ جس دن اڈ           نے کائنات کے ایلمون کا ریاضی کے فارمولے سے حساب لگایا تو فلکیات کے ماہرین معتقد تھے کہ کہکشاں کی تعداد ایک ملین ہے اور اس وقت تک فلکی دوربین جو کوہ پالومر کی رصدگاہ پر نصب ہے اور جس نے دو ہزار ملین نوری سال کے فاصلے پر واقع دنیا کو ماہرین فلکیات کی آنکھوں تک پہنچایا ہے ابھی ایجاد نہیں ہوئی تھی اور اسی طرح اس زمانے میں ریڈیو ٹیلی سکوپ بھی ایجاد نہ ہوا تھا۔

اگر آج اڈینگٹن زندہ ہوتا اور ریڈیو ٹیلی سکوپ کے ذریعے کوارز کو دیکھنے میں کامیاب ہو جاتا تو اس کائنات میں ایلمون کی تعداد شمار کرنے کے لئے اس نے جو فارمولا دیا تھا اس پر نظر ثانی کرتا۔ کیونکہ ۱۹۰۰ء میں ماہرین فزکس اور فلکیات کا کائنات کے بارے میں جو تصور تھا اگر اس کا موازنہ آج کے تصور سے کیا جائے تو ہم بلا مبالغہ کہہ سکتے ہیں کہ پہلے تصور کو دوسرے تصور سے وہ نسبت ہے جو پانی کی ایک پیالی کو ایک سمندر سے ہے۔

کوارز کی دریافت کے بعد فلکیات کے ماہرین کو یہ نظریہ ہاتھ آیا کہ تمام وہ کہکشائیں جنہیں انسانی آنکھ دیکھ سکتی ہے وہ جہان کی سرحدوں سے باہر واقع سیارے ہیں اور جہان کی سرحد ان مذکورہ کوارز سے شروع ہوتی ہے جن میں سے بعض کا زمین سے نو ہزار ملین نوری سال کا فاصلہ ہے۔ بنابریں چونکہ ہمارے ریڈیو ٹیلی سکوپ نو ہزار ملین نوری سال سے زیادہ فاصلے تک نہیں دیکھ سکتے اس لئے جو کچھ کوارز سے آگے یا اوپر واقع ہے ہماری آنکھ اسے نہیں دیکھ سکتی۔

اس نظریہ کے مطابق ایک لاکھ ملین کہکشائیں جن میں سے ہر ایک دس ہزار ملین سورج کی حامل ہے۔ انسانی ٹیلی سکوپ کی آنکھ اور ریڈیو ٹیلی سکوپ کی ان تک رسائی ہے وہاں تک اصلی دنیا نہیں بلکہ کائنات کی سرحد کے باہر بکھرے ہوئے نہایت ہی قلیل سیارے ہیں۔ اصلی کائنات تو کوارزوں سے شروع ہوتی ہے کیونکہ اگر اصل نہ ہوتی تو ہر کوارز کی روشنی ہمارے سورج کی روشنی سے دس ہزار ارب گنا زیادہ نہ ہوتی۔

ہمارے سورج میں چوبیس گھنٹوں کے دوران جو روشنی پیدا ہوتی ہے وہ چار سو ارب ٹن ہائیڈروجنی دھماکوں کے نتیجے میں وجود میں آتی ہے۔ ایک کوارز میں چوبیس گھنٹوں کے دوران سورج کی روشنی کے دس ہزار ارب گنا کے برابر روشنی پیدا کرنے کے لئے کتنی ہائیڈروجن درکار ہوتی ہے (اگر کوارز کی روشنی مادہ اور ضد مادہ کے دھماکے کے نتیجے میں حاصل نہ ہوتی ہو) ایک سادہ حساب کے ذریعے ہم چار سو ارب ٹن کو دس ہزار ارب سے ضرب دیں تو ہمیں چار کا ہندسہ اور اس کے دائیں طرف ستائیس صفر ملتے ہیں۔ یہ عدد اس قدر بڑا ہے کہ ہم اسے زبان پر نہیں لا سکتے۔

لیکن ہم کہہ سکتے ہیں کہ قاعدے کی رو سے ہر کوارز میں چوبیس گھنٹوں کے دوران سورج سے دس ہزار

ارب گنا زیادہ ایندھن جلتا ہے لہٰذا اصلی دنیا کوارز ہے یعنی اصلی دنیا کوارز سے شروع ہوتی ہے۔ چونکہ ریڈیو ٹیلی سکوپس ابھی تک اس پر قادر نہیں ہیں کہ کوارز سے آگے دیکھ سکیں۔ لہٰذا ماہرین فلکیات اور طبیعیات کوارز سے شروع ہونے والی اصلی دنیا کی وسعت کا اندازہ نہیں لگا سکے۔ چونکہ جہان کی وسعت کا اندازہ لگانا بھی محال ہے اس لئے سورجوں کی تعداد کا اندازہ لگانا بھی ان کے لئے محال ہے چہ جائیکہ وہ ارشمیدس اور اڈینگٹن کی تقلید میں جہان میں موجود ایٹموں کا حساب لگا سکیں۔

اسی بناء پر بڑی اور چھوٹی دنیاؤں کی تعداد کے بارے میں منطقی ترین نظریہ وہی ہے جس کا امام جعفر صادقؑ نے اظہار فرمایا اور کہا۔ خداوندتعالیٰ کے سوا کوئی بھی دنیاؤں کی تعداد سے مطلع نہیں ہے اور اس نظریئے کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ بنی نوع انسان عوالم کبیر اور عوالم صغیر کے احاطہ کرنے پر قادر نہیں اور انہیں شمار نہیں کرسکتا۔ عالم کبیر اور عالم صغیر کے درمیان فرق امام جعفر صادقؑ کے نزدیک صرف حجم کے لحاظ سے ہے نہ کہ کمیت (Mass) کے لحاظ سے اور آج علم فزکس بھی اس نظریہ کی تصدیق کرتا ہے۔

ہم نے گزشتہ صفحات میں ذکر کیا ہے کہ اگر الیکٹرانوں اور مرکزے کے درمیان پائے جانے والے خلا کو درمیان سے ہٹا دیا جائے تو کرہ ارض فٹ بال کی ایک گیند کے برابر ہو جائے گا۔ لیکن اس فٹ بال کی گیند کا وزن کرہ ارض کے موجودہ وزن کے مساوی ہوگا۔ فٹ بال کی گیند کی مثال ہم نے اس لئے دی کہ اس سے ذہن آشنا ہے ورنہ اگر الیکٹرانوں اور نیوکلیس کا درمیانی خلا ختم کردیا جائے تو کرہ ارض کا حجم فٹ بال کی گیند سے بھی کم ہوجائے گا۔ لیکن اس گیند کا وزن کرہ ارض کے موجودہ وزن کے برابر ہوگا۔

اس طرف بھی توجہ کرنا ضروری ہے کہ خلا میں کرہ ارض بے وزن ہے اور ہم صریحاً" یہ کہہ سکتے ہیں کہ خلا میں کرہ ارض کا وزن مرغ کے ایک پر جتنا ہے۔ زمین پر ہی کیا منحصر ہے تمام سیارے جو سورج کے اردگرد گردش کر رہے ہیں اوربطور کلی تمام اجرام' وسیع خلا میں دوسرے اجرام فلکی کے گرد گردش کر رہے ہیں اور بے وزن ہیں۔ ان کے اس بے وزن ہونے کی دلیل ان کی حرکت کی رفتار ہے۔

امام جعفر صادقؑ کے نظریہ کے مطابق جو کچھ عالم اصغر میں ہے وہی عالم اکبر میں بھی ہے۔ لیکن جو کچھ عالم اکبر میں ہے اس کا حجم عالم اصغر کے موجودات کے حجم سے زیادہ ہے اور جو خواص عالم اکبر میں پائے جاتے ہیں وہی خواص عالم اصغر میں بھی پائے جاتے ہیں۔ بس فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے عالم کا حجم دوسرے عالم کے حجم سے زیادہ ہے۔

اس بنا پر اگر قدرت ہو تو ہر عالم اصغر کو عالم اکبر اور ہر عالم اکبر کو عالم اصغر میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ جس وقت ہم ان نظریات کو سنتے ہیں تو ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم فزکس کے کسی استاد سے سبق سن رہے ہیں یا یہ کہ فزکس کی کسی جدید کتاب کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ جبکہ یہ وہ نظریات ہیں جنہیں ساڑھے بارہ سو سال پہلے پیش

کیا گیا تھا۔ امام جعفر صادقؑ سے سوال کیا گیا کہ جہان کب وجود میں آیا ؟

آپ نے جواب میں فرمایا۔ جہان شروع سے موجود ہے۔ آپ سے جہان کی تاریخ پیدائش کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا۔ میں جہان کی تاریخ پیدائش نہیں بتا سکتا۔ چونکہ شیعہ اپنے ائمہؑ کے معجزات کے قائل ہیں لہٰذا ان کا عقیدہ ہے کہ امام جعفر صادقؑ بتا سکتے تھے کہ جہان کب وجود میں آیا ؟ شیعوں کا اپنے ائمہؑ کے معجزات کے بارے میں جو عقیدہ ہے اس میں ایک علم امامت بھی ہے جو وسیع معنوں میں علم مطلق ہے۔

مومن شیعہ جو امام کے معجزات کے قائل ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ امام جعفر صادقؑ دنیا کی تاریخ پیدائش بتانا نہیں چاہتے تھے ورنہ وہ علم امامت کے ذریعے جہان کی تاریخ پیدائش سے آگاہ تھے۔ شیعوں کے عقیدے کے مطابق (جو علم امامت اور امام کے اعجاز کے قائل ہیں) امام جعفر صادقؑ نے نہ صرف اس موقع پر جواب نہیں دیا بلکہ بہت سے دوسرے مواقع پر بھی سوال کرنے والوں کے جوابات نہیں دیئے۔ کیونکہ آپ نے بنی نوع انسان کی مصلحت اسی میں سمجھی کہ انسان کچھ اسرار سے ناآگاہ رہے کیونکہ بعض اسرار سے آگاہی انسانی زندگی کا شیرازہ بکھیرنے کا سبب بن جاتی ہے۔

بعض دوسرے مومن شیعہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں' چونکہ امام جعفر صادقؑ نے تمام علوم عوام کی دسترس میں دے دیئے تھے لہٰذا انہوں نے کوئی ضرورت محسوس نہیں کی کہ جہان کی تاریخ پیدائش کے بارے میں اظہار خیال فرماتے۔ لیکن علم امامت ناممکنات کا احاطہ نہیں کرسکتا اس لئے امام ناممکن کام بجا نہیں لا سکتا۔ ایک گروہ کا قول ہے کہ امام تو امام' خدا بھی ناممکنات کو انجام نہیں دے سکتا۔ اس موضوع پر علماء میں صدیوں سے فلسفیانہ بحثیں جاری ہیں کہ کیا خداوند تعالیٰ ناممکن کام کرنے پر قادر ہے ؟ بعض کا کہنا ہے کہ نہیں کرسکتا۔ جن کا قول ہے کہ خداوند تعالیٰ ناممکن کام کرنے پر قادر ہے انہوں نے یہ اظہار خیال کیا ہے کہ بنی نوع انسان کی محدود توانائی کی وجہ سے بعض کام اسے ناممکن دکھائی دیتے ہیں (۱۰۶)

لہٰذا محال کام بذاتہ ناممکن نہیں ہے بلکہ بنی نوع انسان کی محدود توانائی کی وجہ سے اسے بعض کام ناممکن دکھائی دیتے ہیں۔ جس طرح ایک دو سالہ لڑکے کے لئے بیس کلوگرام وزن اٹھانا محال ہے۔ لیکن علماء کا دوسرا گروہ کہتا ہے کہ بہرکیف ایسے کام جو محالات کے زمرے میں آتے ہیں ناممکن ہیں مثلاً "کل کو جزو کے برابر کرنا' کیونکہ عقلی لحاظ سے یہ ممکن نہیں۔

لیکن وہ لوگ جو اس بات کے قائل ہیں کہ خداوند تعالیٰ ہر محال کام کو انجام دے سکتا ہے ان کا کہنا ہے کہ کل اور جزو ہماری عقل کے لحاظ سے غیرمساوی ہیں۔ ممکن ہے کہ ایک دوسری عقل کل اور جزو کو مساوی خیال کرے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ خدا بکھری ہوئی اور خاک میں ملی ہوئی ہڈیوں کو اکٹھا کرے گا اور انسان کو اپنے اعمال کے حساب کے لئے زندہ کرے گا تاکہ انسان اپنے اعمال کی سزا یا جزا پائے۔ یہ کام محال ہے لیکن بہرکیف

خداوند تعالی اس محال کام کو انجام دیتا ہے۔ جو کوئی خداوند تعالی کی طرف سے اس محال کام کی انجام دہی کا منکر ہو وہ مسلمان نہیں، کیونکہ معاد دین اسلام کے اصولوں میں سے ہے۔ مختصر یہ کہ مومن شیعہ معتقد ہیں کہ امام جعفر صادقؑ جہان کی تاریخ پیدائش سے آگاہ تھے لیکن اس کے بارے میں اظہار خیال نہیں کرنا چاہتے تھے تاکہ لوگوں میں پریشانی نہ ہونے پائے۔ امام جعفر صادقؑ کا فرمان ہے کہ اگر آج سے لے کر میری زندگی کے آخری لمحے تک مجھ سے یہ پوچھا جائے کہ جہان سے پہلے کیا چیز موجود تھی تو میں کہوں گا کہ جہان موجود تھا۔ اس موضوع سے واضح ہوتا ہے کہ امام جعفر صادقؑ جہان کو ازلی مانتے ہیں۔ امام جعفر صادقؑ کا جہانوں کے بارے میں ایک دلچسپ نظریہ جہانوں کی وسعت اور سکڑنے کے متعلق ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ دنیائیں موجود ہیں جو ایک حال میں نہیں رہتیں کبھی وہ وسیع ہو جاتی ہیں اور کبھی ان کی وسعت کم ہونے کی وجہ سے وہ سکڑ جاتی ہیں۔ امام جعفر صادقؑ کا یہ نظریہ بھی ان کے دوسرے نظریات کی مانند سائنس دانوں کے لئے بے بنیاد تھا۔ سائنس دانوں نے اس نظریئے کو ایک تخیل سمجھا اور کہا کہ امام جعفر صادقؑ نے ایسی بات کہی ہے جس کے درست ہونے کے وہ پابند نہیں ہیں۔ جبکہ ایک سائنس دان جب کوئی بات کرتا ہے تو اس کی صحت کا پابند ہوتا ہے۔ ایک دانشمند کے لئے مناسب نہیں کہ کوئی ایسی بات کہے جسے وہ حقیقی اور صحیح نہ سمجھتا ہو۔

جب اٹھارہویں صدی عیسوی کے بعد فلکی دوربینیں زیادہ طاقتور بنا لی گئیں اور ماہرین فلکیات نے ان دوربینوں کے ذریعے نہ صرف نظام شمسی کے سیاروں کا پہلے سے بہتر مشاہدہ کیا بلکہ نظام شمسی سے باہر کی دنیا کا بھی بہتر نظارہ کیا اور انیسویں صدی عیسوی کے نصف میں سیاروں کی روشنی کے ذریعے ان میں موجود بعض عناصر کا بھی پتہ چلا لیا۔

بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں ایک یورپی ماہر فلکیات جس کا نام ایبی میٹر ہے جو مذہبی لباس بھی پہنتا تھا اور بلجیم یونیورسٹی میں پروفیسر بھی تھا، اس نے سائنس کے ابتدائی مراحل میں جان لیا تھا کہ کہکشاؤں کا ایک گروہ جو ہمارے نظام شمسی سے کافی قریب ہیں اور انہیں آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے بتدریج دور ہوتا اور اطراف میں بکھرتا جا رہا ہے۔ ایبی میٹر نے اپنے مشاہدات کی اطلاع رصدگاہ میں موجود دوسرے ماہرین کو دی اور ان سے درخواست کی کہ وہ یہ معلوم کریں کہ اس نے صحیح نتیجہ اخذ کیا ہے یا نہیں؟ ماہرین فلکیات جب فضا میں کسی ایسی چیز کو دیکھتے ہیں جو پہلے دکھائی نہ دی ہو تو وہ اس کی اطلاع دوسروں کو دیتے ہیں تاکہ انہیں یہ پتہ چلے کہ انہوں نے جو استنباط کیا ہے وہ صحیح ہے یا غلط ہے؟ اگر دوسرے بھی اس نئی چیز کو دیکھیں یا استنباط کر لیں تو یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ غلطی نہیں ہوئی۔ جو کچھ ایبی میٹر نے دیکھا تھا اس کی تصدیق چند یورپی اور امریکی رصدگاہوں نے کی اور معلوم ہوا کہ کہکشاؤں کا ایک گروہ جو نظام شمسی کے قریب تر ہے اور اسے اچھی طرح سے دیکھا بھی جا سکتا ہے دور ہٹتا جا رہا ہے۔ گویا وہ نظام شمسی سے حالت گریز میں ہیں اور ان کا فاصلہ اس

کہکشاں سے جس میں ہمارا نظام شمسی ہے بتدریج بڑھتا جا رہا ہے۔ ایبلی میٹر اور دوسرے سائنسدان جو متعدد رصدگاہوں میں آسمانی سیاروں پر تحقیق کر رہے تھے کہکشاؤں کے ہمارے نظام شمسی کی کہکشاں سے دور ہٹنے کے مسئلے کے بارے میں بھی ایک دوسرے سے رابطہ رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ دوسری جنگ عظیم کے شعلے بھڑک اٹھے اور ان میں سے بعض جو اس موضوع سے خصوصی دلچسپی رکھتے تھے مثلاً" ایبلی میٹر اور انگلستان کا ماہر طبیعیات اڈ۔نگٹن اس دنیا سے رخصت ہوچکے تھے لہٰذا کہکشاؤں کے دور ہونے کے مسئلے پر تحقیق ۱۹۶۰ء تک کھٹائی میں پڑ گئی۔ کیونکہ دوسرے نہیں چاہتے تھے کہ جس کام کی ابتدا ایبلی میٹر نے کی تھی اسے اس کے نام سے جاری رکھیں۔

۱۹۶۰ء کے بعد کہکشاؤں کے ہمارے نظام شمسی کی کہکشاں سے دور ہونے کے مسئلے کے بارے میں تحقیق دوبارہ شروع ہوئی۔ دوسری مرتبہ معلوم ہوا کہ جو کہکشائیں ہماری کہکشاں کے نزدیک ہیں اور ماہرین فلکیات انہیں اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں ہماری کہکشاں سے دور ہوتی جا رہی ہیں۔ لہٰذا ماہرین فلکیات کو اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا ہماری کہکشاں کے اردگرد وسیع ہوتی جا رہی ہے کیونکہ ہماری کہکشاں کے تمام اطراف میں کہکشائیں دور ہوتی جا رہی ہیں۔ لیکن سائنس دان نہیں جانتے کہ دوسری جگہوں پر بھی کہکشائیں حالت گریز میں ہیں اور دور ہو رہی ہیں یا نہیں ؟ ان کی اس مسئلے سے بے خبری کی وجہ کائنات کا وسیع ہونا اور اجرام فلکی کا زمین سے دور ہونا ہے۔ ہم نے گزشتہ صفحات میں دیکھا کہ بعض اجرام فلکی جن کا نام کوارز ہے ہم سے نوہزار ملین نوری سال فاصلے پر واقع ہیں۔ اگر ان کوارزوں میں سے اچانک آج ایک تباہ ہوجائے تو ہمارے ماہرین فلکیات نوہزار ملین سال کے بعد اس کی تباہی سے مطلع ہوں گے۔ لہٰذا ہمارے ماہرین فلکیات کے لئے یہ جاننا ناممکن ہے کہ دوردراز واقع اجرام فلکی نزدیک ہو رہے ہیں یا ہم سے دور ہو رہے ہیں ؟ جو بات تحقیق سے ثابت ہے وہ یہ ہے کہ وہ کہکشائیں جو ہماری کہکشاں کے نزدیک ہیں اور ماہرین فلکیات انہیں اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں وہ اطراف میں بکھرتی جا رہی ہیں۔ لہٰذا دنیا کے اس کائنات میں سکڑنے اور پھیلنے کی امام جعفر صادقؑ کے نظریئے کی ہماری کہکشاں سے تصدیق ہوجاتی ہے۔ چونکہ اس علاقے کی تمام کہکشائیں دور ہو رہی ہیں' ہماری کہکشاں بھی دور ہو رہی ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ یہ دور ہونے کا عمل کس زمانے سے شروع ہوا ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے ساڑھے بارہ سو سال پہلے کہا تھا کہ جہان کبھی پھیلتے ہیں اور کبھی سکڑتے ہیں۔ جس جہان میں ہم رہ رہے ہیں اس کا پھیلنا نہ صرف یہ کہ امام جعفر صادقؑ کے زمانے سے شروع ہوا بلکہ آپ سے ہزاروں یا لاکھوں سال پہلے شروع ہوا۔ ہمیں ان ہزاروں یا لاکھوں سال کے فرق پر حیران نہیں ہونا چاہئے کیونکہ ہمارے نزدیک واقع کہکشاؤں کے درمیان اتنا زیادہ فاصلہ ہے کہ ہم حساب نہیں لگا سکتے کہ وہ کہکشائیں ہزاروں سال پہلے دور ہٹنی شروع ہوئیں یا لاکھوں سال پہلے ؟ کائنات کے اس حصے میں کہکشاؤں کے دور ہونے کا پیمانہ ہمارے پاس وہ

روزافزوں فاصلہ ہے جو ایبلی میٹر کے مشاہدے سے لے کر آج تک کرہ زمین اور ان کہکشاؤں کے درمیان وجود میں آیا ہے۔ ماہرین فلکیات کائنات کے تمام حصوں سے مطلع نہیں ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ دوسری کہکشائیں بھی حالت گریز میں ہیں یا صرف کائنات کے اس حصے میں ایسا ہو رہا ہے۔ لیکن ان ستاروں کا وجود جن کا نام کوتولے اور جن کا ذکر گزشتہ صفحات میں ہوچکا ہے' ان کا سکڑنا ماہرین فلکیات کے ہاں ثابت ہے۔ ماہرین فلکیات نے مشاہدہ کیا ہے کہ بعض ستارے اس قدر سکڑتے ہیں جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ جیسا کہ ماہرین فلکیات کہکشاؤں کے سکڑنے اور پھیلنے یعنی فاصلوں کی زیادتی اور کمی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے کہ کس وقت یہ عمل شروع ہوا ہے۔ اسی طرح وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ کوتولہ ستارے کس زمانے میں سکڑ گئے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ جس طرح دنیاؤں کا سکڑنا اور پھیلنا تدریجی ہے اسی طرح ان ستاروں کا سکڑنا بھی تدریجی ہے۔ کوتولہ ستارے قلیل عرصے میں وجود میں نہیں آئے بلکہ ان کے ایٹموں کے الیکٹرانوں کے مفقود ہونے اور ایٹموں کے مرکزوں کو آپس میں پیوست ہونے میں ایک طویل مدت لگی ہے۔ بنابریں اس حالت میں کہ کائنات کے ایک حصے میں اجرام فلکی پھیل رہے ہیں اور دوسرے حصوں میں سکڑ رہے ہیں یا یہ کہ ان کے سکڑنے کا زمانہ ختم ہوچکا ہے اور وہ ہماری زمین کی مانند زندگی کے کاروبار میں مشغول ہیں۔ حالانکہ ایسا ہونا ہمیں محال نظر آتا ہے۔ مادے کی حقیقی موت کوتولہ ستاروں میں واقع ہوتی ہے۔ کیونکہ ان ستاروں میں مادہ مکمل طور پر ساکن ہوتا ہے۔ ظاہراً مادے کی آخری منزل یہ ہے کہ وہ کوتولہ کی شکل اختیار کرلے اور اس کے الیکٹران ختم ہوجائیں اور صرف ایٹموں کے مرکزے باقی رہ جائیں جو آپس میں جڑے ہوئے ہوں۔ اس طرح ایک ایسی کمیت وجود میں آئے جو ہماری زمین پر پائے جانے والے سب سے زیادہ کمیت والے میٹریل سے کھربوں گنا زیادہ کمیت کی حامل ہو۔ مختصر یہ کہ موجودہ زمانے میں علم نجوم اور فزکس امام جعفر صادقؑ کے جہانوں کے پھیلنے اور سکڑنے کے نظریہ کی تائید کرتے ہیں۔

اٹھارہویں صدی عیسوی تک یورپ والے ہندوستان کے تمام لوگوں کے دینی اور فلسفی اعتقادات سے مطلع نہیں تھے اور صرف ہندوستانی مسلمانوں کے عقائد سے آگاہ تھے۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں یورپ کے کچھ دانشوروں نے ہندوستان کی قدیم فلسفی اور دینی کتابوں کا یورپی زبانوں میں ترجمہ کیا اور اس طرح یورپ والے ہندوستان کے قدیم دینی اور فلسفی عقائد کے اصولوں سے آگاہ ہوئے اور انہوں نے جانا کہ ہندوستانیوں کے قدیم عقائد میں سے ایک عقیدہ یہ بھی تھا کہ دنیا بیداری اور جوش و خروش کا مرحلہ ہے اور کاہلی کا دور جو آہستہ آہستہ جمود میں تبدیل ہوجاتا اور آخرکار خوابیدگی پر منتج ہوتا ہے۔ دنیا کی بیداری کے زمانے میں اس قدر وسعت پیدا ہوگی کہ اس کی ابتدا اور انتہا کے بارے میں بھی ہم نہیں سوچ سکتے۔ اس دوران گوناگوں اقسام کے بے شمار درخت اور جانور دنیا میں وجود میں آئیں گے۔ اس دنیا کی وسعت کی ابتدا لاکھوں سال پہلے ہوچکی ہے اور مختلف

اقسام کے مواد' درخت اور جانور ابھی تک وجود میں آ چکے ہیں۔ ایک زمانے کے بعد وقت کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ یہ دنیا سکڑنی اور پھیلنی رک جائے گی اور پھر دنیا میں مختلف اقسام کے مواد' درخت اور جدید قسم کے جانور وجود میں نہیں آئیں گے۔ موجودہ مواد' درخت اور جانور بھی بتدریج ختم ہوتے جائیں گے۔ دنیا کی وسعت روبہ زوال ہوگی اور دنیا اپنے آپ کو سمیٹ لے گی اور اپنے مرکز کی طرف رجوع کرے گی۔ اپنے آپ کو سمیٹنے اور اپنے مرکز کی طرف جانے میں بھی لاکھوں سال لگیں گے۔ یہ مدت بھی اس قدر طویل ہے کہ ہم اس کو متعین کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ ایک زمانہ آئے گا کہ دنیا بے حرکت ہوکر اپنے اندر ڈوب جائے گی۔ اس طرح کہ کسی قسم کے مواد' درخت اور جانور کا نام و نشان نہیں رہے گا۔ اس مرحلے کو دنیا کے ڈوبنے یا خوابیدگی کا دوسرا مرحلہ شمار کیا جاسکتا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ دنیا کتنے عرصہ تک غفلت میں یا حالت خواب میں رہے گی۔ شاید یہ مدت ملین ہا سال طول کھینچے اور اس کے بعد دنیا کو جھٹکا لگے اور دنیا خواب سے بیدار ہوجائے اور دوبارہ وسیع ہو جائے اور جدید مواد' درخت اور جاندار وجود میں آنے لگیں اور دنیا کی توسیع میں روزبروز اضافہ ہوتا جائے۔ دنیا کی بیداری کے جدید مرحلے کے دوران وہ مواد' درخت اور جاندار وجود میں آئیں گے جو پہلے وجود میں نہیں آئے تھے۔ یہ قدرتی امر ہے جو انسان کے جدید مرحلے میں وجود میں آئے گا۔ وہ پہلے انسان سے مختلف ہوگا یعنی اس سے برتر ہوگا۔ کیونکہ دنیا جب بیدار ہوگی اور اس میں وسعت پیدا ہوگی تو وہ ایسی اشیاء وجود میں لائے گی جو پہلے سے ترقی یافتہ ہوں گی کیونکہ قدیم ہندوستانیوں کے عقیدے کے مطابق اگر دنیا گھٹیا چیزیں وجود میں لائے گی تو وہ زوال اور فساد کا باعث بنے گی اور نابود ہو جانے کے بعد پھر دوبارہ خواب سے بیدار نہیں ہوگی۔ بنابریں جس مرحلے میں دنیا خواب سے بیدار ہوگی اور انسان سمیت جو کچھ بھی اس میں پیدا ہوگا وہ پہلے سے زیادہ ترقی یافتہ ہوگا۔ اس عقیدے کے مطابق انسان کے مقدر کی ایک خاص حالت تھی۔ قدیم ہندوستانیوں کے عقیدے کے مطابق انسان دنیا کی خوابیدگی کے دوران میٹریل' درختوں اور جانداروں کے برعکس ختم نہیں ہوتا بلکہ مرنے کے بعد انسانی روح دوسرے مراحل طے کرتی ہےاور آخرکار ہمیشہ کی سعادت کے مرحلے تک پہنچتی ہے اور دنیا کی بیداری کےدوسرے مرحلے میں پہلے سے بہتر انسان وجود میں آتے ہیں جو موت کے بعد اپنی روح کے ذریعے باقی رہ جاتے ہیں۔ ان کی روح چند مراحل کو طے کرنے کے بعد جنت میں دوسری ارواح سے جا ملتی ہے۔ قدیم ہندوستانیوں کے عقیدے کے مطابق انسانی روح دنیا کے خواب اور بیداری کے قانون کی مطیع نہیں ہے۔ جب خوابیدگی کے دوران تمام مواد' درخت اور جاندار مرجاتے ہیں تو انسان کی روح باقی رہتی ہے۔ دنیا کی خوابیدگی کے موقع پر ہر چیز ختم ہوجاتی ہے مگر انسانی روح بہشت ارواح میں باقی رہتی ہے۔

۔ قدیم ہندوستانیوں کے اس عقیدے کو ان کی حب ذات اور خودپرستی کا نتیجہ خیال کیا جا سکتا ہے یا نہیں ؟
بظاہر یہ عقیدہ حب ذات اور خودپرستی کا نتیجہ ہے۔ لیکن اگر تھوڑا سا غور کیا جائے تومعلوم ہوجاتا ہے کہ جن

لوگوں کا یہ عقیدہ تھا وہ روح کو مواد' درختوں اور جانداروں کے برعکس ایک ایسی چیز سمجھتے تھے جسے موت نہیں آتی۔ کیونکہ وہ مادی نہیں ہے کہ مر جائے۔ اسی وجہ سے موت کے بعد انسان مادی دنیا سے بالاتر دنیا میں رہتا ہے۔ جس دن سے تاریخ لکھی گئی ہے اس دن سے لے کر آج تک جس معاشرے میں آخرت کے بارے میں عقیدہ رہا ہے اس میں روح کی بقاء کا عقیدہ بھی موجود رہا ہے اور کوئی ایک معاشرہ بھی ایسا نہیں مل سکتا جس میں آخرت کا عقیدہ تو ہو لیکن روح کی بقاء کا عقیدہ نہ پایا جاتا ہو۔

مرکزی افریقہ کے سیاہ فام قبائل سے لے کر توحیدی مذاہب کے پیروکاروں تک سابقہ اور موجودہ تمام معاشرے روح کی بقا کا عقیدہ اس لئے رکھتے تھے اور رکھتے ہیں کہ وہ روح کو مادے سے جدا خیال کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ مادے کو موت آجاتی ہے لیکن انسانی روح نہیں مرتی۔ جو کچھ ہم نے عرض کیا اس کا ماحصل یہ ہے کہ دنیا کے پھیلنے اور سکڑنے کے بارے میں نظریہ قدیم ہندوستانی عقائد کے رنگ میں رنگ گیا ہے۔

یہ نظریہ چاہے امام جعفر صادقؑ نے پیش کیا ہو یا قدیم ہندوستانیوں کا عقیدہ ہو' آج کے علم نجوم اور فزکس کے انکشافات اسے ایک علمی حقیقت قرار دیتے ہیں۔

اگر ساری کائنات سکڑ اور پھیل نہیں رہی تو بھی اس کے کچھ جہان پھیل اور سکڑ رہے ہیں۔ جس مقام پر جہان سکڑتا ہے وہاں اس کے بعد مادے کا وجود نہیں رہتا کیونکہ مادہ تو کیت کا نام ہے جو ایٹموں میں موجود ہوتی ہے۔ ایٹم جو اس مقام کو چھوڑ گئے اسے مادہ نہیں کہا جاسکتا۔ کیا یہ مردہ ستارے جن کی کیت اس قدر زیادہ ہے قدیم ہندوستانیوں کے عقیدے کے مطابق ایک دن زندہ ہوں گے۔ کیونکہ ان ستاروں کی حالت ویسی ہے جیسی قدیم ہندوستانیوں نے دنیا کے خواب میں جانے یا سانس روک لینے کے بارے میں کہی ہے۔ لیکن علم فزکس یہ نہیں بتاتا کہ یہ مردہ ستارے جن کا میزان کیت اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ ان کے ذرات کے درمیان تھوڑی سی خالی جگہ بھی نہیں ہے وہ کیسے زندہ ہوں گے ؟

# آلودگی ماحول کی ممانعت

امام جعفر صادقؑ کے زمانے تک صنعتیں دستی آلات تک محدود تھیں اور آج کے کارخانوں کی مانند ایک کارخانہ بھی موجود نہ تھا۔ دھاتوں کو آگ کی چھوٹی چھوٹی بھٹیوں میں پگھلایا جاتا تھا اور تمام دھاتیں حتی کہ لوہا بھی لکڑی سے پگھلایا جاتا تھا۔ لہٰذا ماحول کی آلودگی وجود میں نہیں آتی تھی حتی کہ اگر لوہے کو پتھر کے کوئلے کے ساتھ بھی پگھلاتے پھر بھی اتنا کوئلہ نہیں جلایا جاتا تھا کہ ماحول آلودہ ہو جاتا۔ اٹھارہویں صدی عیسوی کے آغاز سے لوہے اور فولاد کی کافی مقدار کو بھی جرمنی' فرانس' انگلستان اور تمام یورپی ممالک میں ماحول کو آلودہ کئے

بغیر کام میں لایا جانے لگا۔ لوہا پگھلانے والے تمام کارخانے جرمنی' فرانس اور انگلستان میں پتھر کا کوئلہ جلاتے تھے اور سال کے آغاز سے آخر تک کارخانوں کی چمنیوں سے دھواں ایک لمحے کے لئے بھی نہیں رکتا تھا۔ پھر بھی پتھر کے کوئلے کے دھوئیں سے ماحول آلودہ نہیں ہوتا تھا۔ جبکہ امام جعفر صادقؑ کے زمانے میں تو آج کے کارخانوں کی مانند ایک کارخانہ بھی نہیں تھا اور نہ ہی پتھر کا کوئلہ جلایا جاتا تھا۔ پھر امام جعفر صادقؑ نے اس طرح تاکید کی جس طرح کوئی آج کے ماحول کو دیکھ کر کرے۔ آپ نے فرمایا تھا کہ آدمی کو اس طرح زندگی گزارنا چاہئے کہ اس کا ماحول آلودہ نہ ہو کیونکہ اگر اس کا ماحول آلودہ ہوگیا تو ایک دن ایسا آئے گا کہ اس کے لئے زندگی گزارنا مشکل اور شاید ناممکن ہوجائے گا۔ ماحول کی آلودگی کا موضوع تیس سال پہلے موجود نہ تھا۔ یہ موضوع اس وقت سامنے آیا جب پہلا ایٹم بم پھٹا اور اس نے فضا کو آلودہ کیا۔ اگر صرف وہی پہلا دھماکہ ہوتا اور مزید دھماکے نہ کئے جاتے تو ماحول آلودہ نہ ہوتا۔ لیکن ایٹمی طاقتوں نے بعد میں بھی اس اسلحے پر تجربات جاری رکھے اور ان تجربات کے ساتھ ساتھ انہوں نے ایٹمی بجلی گھر بھی چلانا شروع کردیئے اور اس طرح فضا کی آلودگی آہستہ آہستہ بڑھ گئی۔ اسی دوران خصوصاً" امریکہ اور یورپ میں صنعتوں نے ماحول کو آلودہ کیا اور دریائے رائن جو مغربی یورپ میں واقع ہے کی مانند بعض دریاؤں کا پانی اس قدر آلودہ ہوگیا ہے کہ مچھلیوں کی نسل اس میں ختم ہوگئی ہے۔ اسی طرح شمالی امریکہ کے بڑے بڑے دریا جن کا پانی میٹھا ہے ان میں مچھلی کی نسل تقریباً" ناپید ہو چکی ہے۔ اس سے بھی خطرناک آلودگی سمندروں کی آلودگی ہے کیونکہ سمندروں کے پانی کی سطح پر پلا نکٹن نامی چند خلیوں کے حامل جاندار پائے جاتے ہیں جو کرہ ارض کی نوے فیصد آکسیجن تیار کرتے ہیں وہ اب سمندروں کی آلودگی کے نتیجے میں مر رہے ہیں۔ ان کے مرنے کے نتیجے میں آج کرہ ارض پر آکسیجن کی مقدار دس فیصد رہ گئی ہے۔ آکسیجن کی یہ مقدار نہ ہی جانوروں کے لئے اور نہ ہی انسانوں کے سانس لینے کے لئے کافی ہے اور اس طرح درختوں کے سانس لینے کے لئے بھی ناکافی ہے۔ نتیجۃً" درختوں اور جانوروں کی نسلیں کرہ ارض پر سے معدوم ہوتی جارہی ہیں اور یہ ایک تھیوری نہیں ہے جس کے جھوٹے اور سچے ہونے کا احتمال ہو بلکہ ایک سائنسی حقیقت ہے۔ آج اس حالت میں جبکہ سمندر آلودہ ہو رہے ہیں' پلا نکٹن کی مقدار سمندروں کی سطح پر آئندہ پچاس سالوں تک نصف ہوجائے گی اور اسی نسبت سے آکسیجن کی پیداوار کم ہو جائے گی۔ جو بچہ آج پیدا ہوتا ہے اگر آئندہ پچاس سال تک زندہ رہے تو اس وقت تک اس کے سانس لینے کی کیفیت وہ ہوگی جو ایک کوہ پیما کی کوہ ہمالیہ پر بغیر آکسیجن ماسک کے ہوتی ہے۔ یاد رہے کہ سلسلہ کوہ ہمالیہ دنیا میں سب سے بلند سلسلہ کوہ ہے۔

آئندہ پچاس سالوں تک سمندروں کے پانی کی آلودگی کی وجہ سے انسانوں اور جانداروں کے سانس لینے کی کیفیت ایسی ہوگی جس طرح ایک مضطرب انسان کی ہوتی ہے۔ آئندہ پچاس سال تک اگر کوئی دیاسلائی

(ماچس) جلانا چاہے گا تاکہ سگریٹ سلگائے یا چولہا جلائے تو دیا سلائی نہیں جلے گی۔ کیونکہ ہوا میں اس قدر آکسیجن نہیں ہوگی کہ وہ دیا سلائی جلا سکے۔ یہ قول کوئی علمی افسانہ نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ آئزک آسیموف (شاید اسحاق عظیم اوف) امریکی ماہر طبیعیات کا قول ہے کہ امریکہ میں ۱۹۵۰ء سے اب تک سانس لینے میں دشواری کی بیماری میں تین سو فیصد کا اضافہ ہوا ہے اور یہ اضافہ قوی امکان ہے کہ زمینی فضا میں آکسیجن کی کمی واقع ہونے سے ہوا ہے' کیونکہ پلا نکٹن کے خاتمے کے نتیجے میں فضا میں آکسیجن کی مقدار میں مسلسل کمی واقع ہو رہی ہے۔ یہی سائنسدان کہتا ہے کہ اگر یہی حالت جاری رہی تو ایک صدی بعد درختوں اور جانداروں کی موت یقینی ہے۔ نہ صرف خشکی میں درخت اور جاندار نابود ہو جائیں گے بلکہ تمام سمندری جانور بھی نابود ہو جائیں گے۔ کیونکہ سمندر میں کوئی ایسا جانور نہیں ہے جسے زندہ رہنے کے لئے آکسیجن کی ضرورت نہ ہو۔ اگرچہ وہ جانور دو تین سو میٹر گہرائی میں ہی کیوں نہ رہ رہا ہو۔

آج جو جہاز افریقہ کے مغرب سے جنوبی امریکہ کی طرف جاتے ہیں سمندر کے کافی بڑے رقبے (ہزار کلومیٹر) میں' لوگوں کی رہائش گاہوں کے کوڑے کرکٹ کے درمیان رہتے ہیں۔ اس رقبے کا زیادہ حصہ پلاسٹک پر مشتمل ہے جو نہ تو مٹی میں حل ہوتی ہے نہ سمندر میں' یہ سمندری موجیں ہیں جو اردگرد سے خس و خاشاک بہا کر وہاں لے گئی ہیں۔ سمندری خس و خاشاک صرف اسی جگہ تک محدود نہیں بلکہ گو آ جزیرے اور امریکہ کی بری' بحری اور فضائی چھاؤنی کے نزدیک ساکن سمندر میں خس و خاشاک سے بنی ہوئی ایک اور جگہ جس کا طول اور عرض ہزاروں کلومیٹر ہے بھی وجود میں آئی ہے اور اس علاقے میں جتنے پلا نکٹن تھے سب نابود ہوگئے ہیں۔ کیونکہ سمندری ریلے صرف خس و خاشاک کو مخصوص علاقوں میں جمع نہیں کرتے بلکہ مٹی کے تیل کو بھی جو ان علاقوں میں پانی کے اوپر پایا جاتا ہے ان علاقوں میں جمع کرتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں چند خلیے والے حیوانات جو بڑے سمندروں میں زندگی بسر کرتے ہیں اور آکسیجن پیدا کرتے ہیں بھی معدوم ہو جاتے ہیں۔ بنی نوع انسان سمندروں کو آلودہ کر کے ایک ایسا خطرہ مول لے رہا ہے جو ایٹمی اسلحے سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ کیونکہ ایٹمی اسلحے کے بارے میں ایک توازن موجود ہے۔ جن لوگوں کے پاس ایٹمی اسلحہ ہے وہ ایک دوسرے کے خوف سے اس کا استعمال کرنے کی جرات نہیں کرتے۔ ممکن ہے یہ توازن برقرار رہے اور مزید ایک زمانے تک ایٹمی اسلحے کو کام میں نہ لایا جائے' جس طرح دوسری جنگ عظیم میں اس کے باوجود کہ مخالف حکومتیں کیمیائی گیس اور گولیاں رکھتی تھیں مگر ایک دوسرے کے خوف سے کام میں نہیں لائیں۔ لیکن انسان کی طرف سے سمندروں کی آلودگی مزید ایک صدی تک انسان کی مطلق تباہی کا باعث ہوگی۔ سائنسی نکتہ نگاہ سے یہ موضوع اس قدر ناقابل تردید ہے کہ اگر یہ حالت جاری رہی اور سمندر اسی طرح آلودہ ہوتے رہے تو انسانوں اور جانوروں کی زندگی آئندہ پچاس سال تک دشوار ہو جائے گی۔ چونکہ آکسیجن کی مقدار خاصی کم ہو جائے گی اور لوگ اس

طرح سانس لیا کریں گے جس طرح کسی نے ان کے گلے کو دونوں ہاتھوں سے زور سے پکڑا ہوا ہو تاکہ وہ سانس نہ لے سکیں۔ یہ بات واضح ہے کہ جب انسان کے سانس لینے کی یہ حالت ہو تو وہ آج کی مانند کام نہیں کر سکتا۔ ہر انسان کی پیداواری صلاحیت چاہے وہ جو کام بھی کرتا ہو کم ہو جائے گی۔ انسان کی معلومات کی سطح تیزی سے رو بہ زوال ہوگی کیونکہ جب ایک طالب علم کلاس میں بے چینی کی حالت میں ہوتا ہے تو کوئی قابل غور چیز یاد نہیں کر سکتا۔ جب ایک استاد بے چین ہوتا ہے تو وہ کوئی قابل ملاحظہ بات طالب علموں کو نہیں سمجھا سکتا۔ ایک کسان جو کھیت میں کام کرتا ہے اور مزدور جو کارخانے میں کام کرنے میں مشغول ہے اگر آکسیجن کی کافی مقدار اس کے پھیپھڑوں تک نہیں پہنچتی اور اس کے علاوہ وہ دائمی طور پر بے چینی کا شکار بھی ہے تو اسے یہ محسوس ہوگا کہ اس کے بدن کا کوئی عضو اچھی طرح کام نہیں کر رہا اور نہ ہی اس کے ارادے کی مکمل طور پر اطاعت کر رہا ہے۔ چونکہ بدن کے کسی عضو تک کافی مقدار میں آکسیجن نہیں پہنچتی اور کافی مقدار میں آکسیجن کے بدن تک نہ پہنچنے کے نتیجے کا امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی کے بیالوجیکل انسٹی ٹیوٹ میں خرگوش سمیت بعض جانوروں پر تجربہ کیا گیا جس سے معلوم ہوا کہ جب دماغ کے خلیوں کو کافی مقدار میں آکسیجن نہیں پہنچتی تو وہ تمام احکامات جو دماغ کی طرف سے تمام بدن کے اعضا کو صادر کئے جاتے ہیں تاخیر سے پہنچتے ہیں۔

اگر ہم آکسیجن کے دماغ کے خلیوں تک پوری طرح نہ پہنچنے کے اثرات کا جائزہ لیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ آئندہ پچاس سال میں موٹر سازی کے کارخانے میں اگر ایک مزدور ایک چابی کو کام کرنے کے لئے اٹھاتا ہے تو اسے چابی کو اٹھانے پر حائل ہونے اور اس لمحے جس لمحے وہ اٹھائے گا کے لئے چند سیکنڈ درکار ہوں گے چونکہ دماغ کے خلیوں کو کافی مقدار میں آکسیجن فراہم نہیں ہوگی کہ وہ اپنے متعلقہ اعصاب کو چابی کے فوراً" اٹھانے کا حکم دے تاکہ اس طرح اس کے ہاتھ اسی لمحے چابی کو اٹھا لیں۔

اس طرح کی تاخیر تمام انسانی کاموں میں ظاہر ہوگی اور ایک گاڑی کا ڈرائیور جس وقت اپنے سامنے کسی چیز کو دیکھے گا اور بریک لگانا چاہے گا تو جس لمحے وہ بریک لگانے کا ارادہ کرے گا اس سے لے کر اس کے پاؤں کے بریک کے پیڈل پر دباؤ ڈالنے تک چند سیکنڈ درکار ہوں گے' جس کے نتیجے میں سامنے آنے والی چیز روندی جائے گی۔ ایک پائلٹ جو ائرپورٹ سے پرواز کرنا چاہتا ہے اس کا بھی یہی حال ہے۔ جس لمحے اسے عمودی ہینڈل گھمانا چاہئے تاکہ جہاز کا اگلا حصہ اوپر اٹھے اور پہئے ائرپورٹ سے جدا ہوں تو وہ یہ کام نہیں کر سکتا بلکہ وہ عمودی ہینڈل کو چند سیکنڈ کے بعد حرکت میں لاتا ہے جس کے نتیجے میں جہاز جس نے تمام راستہ طے کیا ہوتا ہے اور حرکت کے لئے مزید جگہ نہیں ہوتی چونکہ جہاز ائرپورٹ کے آخری حصے تک پہنچ چکا ہوتا ہے للذا وہ رکاوٹوں سے ٹکرا کر دھماکے سے اڑ جاتا ہے جس کے نتیجے میں جہاز کا پائلٹ اور اس میں سفر کرنے والے مسافر جل جاتے ہیں۔

جس طرح دماغ کے خلیوں کو کافی مقدار میں آکسیجن نہیں ملتی تو وہ متعلقہ اعضا کو تیزی سے کام کرنے پر

مائل نہیں کرسکتے اسی طرح نہایت حساس اعضا بھی تیزی سے کام انجام دینے سے قاصر ہوتے ہیں مثلاً" کان اور آنکھ فوراً" سن اور دیکھ نہیں سکتے اور ناک سونگھنے میں دیر لگاتی ہے اسی طرح قوت حافظہ بہت کمزور ہوجاتی ہے اور تمام لوگ فراموشی کی بیماری کا شکار ہوجاتے ہیں' ان کی یادداشتیں کھو جاتی ہیں اور اگر وہ چیزوں کو تازہ پڑھ یا سن کریاد کریں تو انہیں کافی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔

زندگی کے ماحول کو آلودہ (Polute) کرنے والی چیزوں میں سے ایک یورینیم یا پلوٹونیم کے ایٹموں کی افزودگی بھی ہے جس سے ایسا مواد خارج ہوتا ہے جو ماحول میں پھیل کر آلودگی (Pollution) کا باعث بنتا ہے۔ ایٹمی بجلی گھر مسلسل اس مواد کو باہر پھینکتے ہیں جبکہ ایٹمی بجلی گھر خود بھی احتمالاً" خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔

ایٹمی بجلی گھر بناتے وقت غیر معمولی احتیاط سے کام لیا جاتا ہے اور تمام لوازمات کا خیال رکھا جاتا ہے پھر بھی یہ خطرہ موجود رہتا ہے کہ کہیں کسی حادثے کے نتیجے میں سیل (Cell) دھماکے کا شکار نہ ہو جائے۔ سیل ایک بکس ہے جس میں گریفائیٹ کے ساتھ یورینیم یا پلوٹونیم موجود ہوتا ہے اور حرارت پیدا کرتا ہے۔ بجلی پیدا کرنے والے کارخانے کے لئے حرارت پیدا کرنے کا مرکز توانائی کا منبع کہلاتا ہے۔ جنوبی انگلستان کے ایٹمی بجلی کے کارخانے کے ایک سیل میں اگر دھماکہ ہو جائے تو اس کے چاروں طرف ایک سو ساٹھ کلومیٹر تک ہر قسم کے جاندار ختم ہوجائیں گے اور دھماکے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی حرارت چاروں طرف ۸۰ کلومیٹر تک گھروں کو ویرانوں میں تبدیل کردے گی اور جنگلوں کو مکمل طور پر ختم کرنے کے علاوہ دریاؤں اور سمندروں کو بھی خشک کردے گی۔ ابھی تک ایسا حادثہ پیش نہیں آیا لیکن ایسے حادثے کے لئے کسی ایک سیل میں گریفائٹ (جو موجودہ زمانے میں ایٹمی توانائی کو بریک لگانے کے لئے استعمال ہوتا ہے) کا کسی وجہ سے ختم ہونا یا ناکارہ ہوجانا کافی ہے جس کے نتیجے میں دھماکہ وقوع پذیر ہوجائے گا۔

ہمیں امید ہے کہ ایٹمی بجلی گھر میں جو مختلف ممالک میں واقع ہیں ایسا واقعہ رونما نہیں ہوگا۔ لیکن افسوس ہے کہ ان ممالک میں ایٹمی بجلی پیدا کرنے والے کارخانے مسلسل شعاعیں خارج کرنے والا مواد باہر پھینکتے ہیں اور ماہرین کو معلوم نہیں کہ اس مواد کو کہاں رکھیں کہ زندگی کا ماحول آلودہ نہ ہو۔ شعاعیں خارج کرنے والے مواد کو رکھنے کے لئے ماہرین کے ذہن میں جو پہلا خیال آیا وہ یہ تھا کہ اس مواد کو بند صندوقوں میں رکھ کر سمندروں کی گہرائی میں غرقاب کردیں لیکن انہوں نے سوچا کہ ممکن ہے پانی کے دباؤ سے ان صندوقوں میں شگاف پڑ جائیں یا پانی کا دباؤ انہیں توڑپھوڑ دے اور شعاعیں خارج کرنے والا مواد پانی سے مخلوط ہوکر پلا نکٹن سمیت تمام سمندری جانداروں کی ہلاکت کا باعث بنے۔ دوسرے یہ کہ اگر پانی کا دباؤ صندوقوں کو نہ توڑے تو بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ صندوق کھل جائیں گے اور سمندر کے پانی کو شعاعیں خارج کرنے والا مواد زہر آلود کرے گا اور سمندر کے تمام جانور ہلاک ہو جائیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ شعاعیں خارج کرنے والے مواد

کو سمندر میں ڈالنے سے باز رہے۔ جب ماہرین چاند پر گئے تو انہوں نے سوچا کیوں نہ شعاعیں خارج کرنے والے اس مواد کو چاند پر بھیج دیں۔ لیکن تین وجوہات کی بنا پر یہ کام آج تک انجام نہیں پاسکا۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ اسلمی بجلی پیدا کرنے والے کارخانوں کا محکمہ پرائیویٹ ہے یعنی وہ حکومتی محکموں کے زمرے میں نہیں آتے۔ روس اور دوسرے تمام سوشلسٹ ممالک کے کارخانے دار اتنی استطاعت نہیں رکھتے کہ شعاعیں خارج کرنے والے مواد کو مضبوط صندوقوں میں بند کرنے کے بعد راکٹ کے ذریعے زمین کی قوت تجاذب سے نکال کر چاند کی حدود میں پہنچا دیں۔ کیونکہ صرف امیر حکومتیں ہی شعاعیں خارج کرنے والے مواد کے صندوق کو چاند پر بھیجنے کا خرچ برداشت کرسکتی ہیں اور یہ کام کسی ایسے محکمہ کے بس کا روگ نہیں جس کے پاس محدود سرمایہ ہو۔

دوسری چیز جو ایسے صندوق کو چاند پر بھیجنے میں رکاوٹ ہے وہ یہ ہے کہ انہیں اطمینان نہیں کہ جس راکٹ کے ذریعے وہ مذکورہ صندوق کو بھیج رہے ہیں وہ کسی حادثے کا شکار نہ ہوگا اور زمین کے محیط سے خارج ہونے سے پہلے گر نہیں جائے گا یا خلا میں پھٹ نہیں جائے گا۔ ایسی صورت میں شعاعیں خارج کرنے والا مواد زمین پر بکھر کر جانوروں اور درختوں کو مسموم کردے گا۔ اس راستے میں تیسری رکاوٹ یہ ہے کہ چاند اس مواد سے آلودہ ہوجائے گا اور ابھی تک یہ معلوم نہیں کہ چاند اقتصادی لحاظ سے بنی نوع انسان کے لئے فائدہ مند ہے یا نہیں ؟ اگر چاند بنی نوع انسان کے لئے اقتصادی لحاظ سے مفید ہو تو شعاعیں خارج کرنے والے مواد کے صندوقوں کا وہاں پر ڈھیر لگانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان آئندہ چاند کے ذرائع سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اگرچہ چاند پر ہوا نہیں جو شعاعیں خارج کرنے والے مواد کو منتشر کرے لیکن دن کو چاند پر زمین کی نسبت زیادہ گرمی ہوتی ہے اور چاند کی قوت کشش زمین کی نسبت بہت کم ہے' زیادہ گرمی اور کم قوت تجاذب شعاعیں خارج کرنے والے مواد کے پھیلنے کا باعث بنتی ہے۔ اس طرح تمام کرہ چاند آلودہ ہوتا ہے اور پھر انسان وہاں پر کبھی بھی چاند کے معدنی مواد کو نکالنے کے لئے کام نہیں کرسکتا۔ ان تین باتوں کی وجہ سے ابھی تک انسان شعاعیں خارج کرنے والے مواد کو چاند پر بھیجنے سے قاصر رہا ہے۔

یہ جاننے کے لئے کہ امام جعفر صادقؑ کی اس وصیت یعنی انسان کو اپنے ماحول کو آلودہ نہیں کرنا چاہئے پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے کس طرح ایک دولتمند قوم مشکلات سے دوچار ہوگئی ہے۔ اس کے لئے ہم جاپان کی مثال دیتے ہیں۔ جس وقت دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی اور جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ جاپان نے اس میں شکست کھائی۔ اس زمانے میں ایک جاپانی کی اوسطاً" آمدنی تیس ڈالر سالانہ تھی۔ جبکہ آج ایک جاپانی کی اوسطاً" سالانہ آمدنی کی حد ساڑھے پانچ ہزار ڈالر ہے۔ جاپان کی تجارت اس قدر عالمگیر ہے کہ امریکہ جیسے صنعتی ملک میں فروخت ہونے والے بیس ہزار موٹر سائیکلوں میں سے اٹھارہ ہزار جاپانی ہیں۔ جیسا کہ ہمیں علم ہے مغربی جرمنی ریڈیو اور ٹیلی ویژن بنانے کی صنعت میں بہت آگے ہے اور آج مغربی جرمنی میں فروخت ہونے والے ایک سو

دستی ریڈیو میں سے ۹۹ جاپانی ہیں۔ آج جاپان آٹوموبائل' کمپیوٹر اور ریان یعنی درختوں کے مصنوعی ریشوں سے تیار کردہ کپڑوں کی صنعت میں امریکہ کے بعد پہلا ملک ہے۔ جبکہ ریڈیو' ٹیلی ویژن' ٹیپ ریکارڈر' کیمرے اور موٹر سائیکلوں کی صنعت میں پہلا ملک شمار ہوتا ہے۔

اگر ہم بیان کرنے لگ جائیں کہ جاپان نے کس طرح نہایت مختصر عرصے میں صنعت اور تجارت میں اس قدر ترقی کرلی تو ہم اپنے اصلی موضوع جو زندگی کے ماحول کی آلودگی سے متعلق ہے سے ہٹ جائیں گے۔ مختصرا" ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جاپان کی اس ترقی میں دو عوامل کارفرما ہیں۔ ایک باصلاحیت قیادت اور دوسری جاپانی مزدور کی اپنے کام میں لگن۔ لیکن اس دولتمند اور محنتی قوم نے چونکہ اپنے ماحول کو آلودگی سے محفوظ رکھنے کے لئے کوئی خاص انتظام نہیں کیا تھا لہٰذا آج نہ صرف یہ کہ ایک بڑے مسئلے سے دوچار ہے بلکہ اس کے معاشرے کی صحت بھی خطرے میں پڑ گئی ہے۔ ماحول کی آلودگی کی وجہ سے جاپان میں ایسے ایسے امراض نے جنم لیا ہے جن کی علم طب کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ مشہور یونانی طبیب بقراط سے لے کر آج تک ڈاکٹروں نے اپنی تحقیق سے ایسی چالیس ہزار مختلف بیماریوں کے نام درج کئے ہیں اور علامتیں لکھی ہیں جن میں انسان مبتلا ہوسکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ڈاکٹروں نے ان بیماریوں کے لئے دوائیں بھی تجویز کی ہیں لیکن جن بیماریوں نے جاپان میں ماحول کی آلودگی کی وجہ سے جنم لیا ہے ان میں کسی بیماری کا بھی علم طب میں ذکر نہیں ہے۔ ان بے مثال بیماریوں میں سے ایک بیماری کا نام جاپانیوں نے "ایتائی ایتائی" رکھا ہے' کیونکہ مریض درد کی شدت کی وجہ سے اس طرح آہ و زاری کرتا ہے۔ یہ بیماری کیڈمیم (Cadmium) کے عنصر کی انسانی بدن میں زیادتی کی وجہ سے ان مقامات پر جنم لیتی ہے جہاں کارخانے آب و ہوا اور کھیتوں کو آلودہ کرتے ہیں۔

اس بیماری کی پہلی علامت جسم میں ایک شدید اور ناقابل برداشت درد کا احساس ہے اور تھوڑی مدت کے بعد انسانی جسم کی ہڈیاں شیشے کی مانند ٹوٹنا شروع ہوجاتی ہیں اور محض ہاتھ لگانے سے ہی ٹوٹ کر شیشے کی طرح ریزہ ریزہ ہوجاتی ہیں۔

ہڈیوں کی اس بیماری کا تذکرہ علم طب کی کسی بھی کتاب میں نہیں ملتا۔ ڈاکٹر پرانے زمانوں سے موجودہ زمانے تک Ostheomalat یعنی انسانی جسم کی ہڈیوں کی خرابیوں کی اقسام سے آگاہ تھے اور ہیں۔ لیکن اس قسم کی بیماری انہوں نے نہیں دیکھی تھی جس کے نتیجے میں انسانی بدن اس قدر کمزور ہوجائے کہ اگر اسے ہاتھ لگایا جائے تو وہ ایک نازک شیشے کی مانند ریزہ ریزہ ہو جائے۔ اسی طرح ایک دوسری بیماری جو جزیرہ کیوشو (جاپان کے چار بڑے جزیروں میں سے ایک) میں پائی گئی ہے۔ اس سے کچھ انسان ہلاک ہوچکے ہیں اور کچھ ہلاکت کے دہانے پر ہیں۔ جو لوگ اس بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں ان کی بینائی ضائع ہوجاتی ہے اور ان کے عضلات اس طرح ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتے ہیں کہ ان کی حرکت کی طاقت سلب ہوجاتی ہے۔ اگر چند روز تک ان کا علاج معالجہ نہ کیا

جائے تو وہ مرجاتے ہیں۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ یہ بیماری پارے کی وجہ سے جنم لیتی ہے جو بعض کارخانوں سے خارج ہوکر آب و ہوا کے ذریعے انسانی بدن میں داخل ہوجاتا ہے۔ ڈاکٹر قدیم زمانے سے جانتے ہیں کہ ممکن ہے پارہ انسانی آنکھ کی بینائی ضائع کردے۔

سترہویں اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں یورپی ڈاکٹر آتشک کی بیماری کا علاج پارے سے حاصل ہونے والی دواؤں سے کرتے تھے۔ بعد میں جب انہیں علم ہوا کہ پارہ آنکھ کی بینائی کو اس قدر نقصان پہنچا سکتا ہے کہ ممکن ہے بیمار شخص مکمل طور پر نابینا ہوجائے تو اس کے بعد پارے سے علاج کرنے سے احتراز کرنے لگے۔ انہوں نے پارے کو صرف جلدی بیماریوں اور جلنے کی صورت میں جسم کی اوپری جلد کے علاج تک محدود رکھا ہے (۱۰۷)۔ اس کے علاوہ دو اور بیماریاں بھی ہیں جن کی مثال اس سے قبل نہیں ملتی۔ سانس لینے میں دشواری کی بیماری بھی جاپان میں کافی پھیل چکی ہے۔

جیسا کہ ہم نے گزشتہ صفحات میں تذکرہ کیا ہے اسحاق آسیموف امریکہ کا ایک ماہر طبیعیات امریکہ میں سانس لینے میں دشواری کی بیماری کی وجہ امریکہ کی ہوا میں آکسیجن کی کمی کو خیال کرتا ہے لیکن جاپانی ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ جاپان میں سانس لینے میں دشواری کی بیماری کے پھیلنے کی وجہ وہاں کے کارخانوں کا دھواں ہے جو فضا میں پایا جاتا ہے اور بعض گیسوں کو ہوا میں شامل کردیتا ہے۔ یہ بات کسی پر پوشیدہ نہیں کہ جاپانی لوگ اپنے ملک کی خوبصورتی پر ناز کرتے تھے اور اپنے ملک کے قدرتی مناظر کو دنیا کے خوبصورت ترین مناظر خیال کرتے تھے۔ لیکن اب وہ خود کہتے ہیں کہ زندگی کے ماحول کی آلودگی نے جاپان کے قدرتی مناظر کی وقعت کم کردی ہے اور بعض جگہوں پر آب و ہوا اور زمین کی آلودگی نے خوبصورتی کو ختم کرکے رکھ دیا ہے۔ بلاشک و شبہ زندگی کے ماحول کی آلودگی کسی حد تک سمندری جانوروں سے بھی انسانوں میں داخل ہوئی ہے۔ اس ضمن میں ایک ناقابل تردید دلیل موجود ہے اور وہ ایک انگریز ڈگلس رابرٹسن کے سفر کا حال ہے جو اس کی بیوی' اس کے بیٹے اور ایک مسافر نے طے کیا ہے۔ یہ گروہ بادبانی کشتی کے ذریعے کرہ ارض کے اردگرد چکر لگانا چاہتا تھا۔ اس گروہ کے سفر کی داستان طویل ہے اور ہماری بحث سے خارج بھی ہے۔ یہ لوگ سفر پر روانہ ہونے کے بعد بحرالکاہل کے علاقے میں پہنچے جہاں سے ساحل کا فاصلہ چھ ہزار کلومیٹر سے زیادہ تھا۔ وہاں پر ان کی کشتی ٹوٹ گئی جس کے نتیجے میں انہیں اس کشتی کو خیرباد کہہ کر ایک چھوٹی کشتی میں سوار ہونا پڑا جو اسی کشتی میں موجود تھی۔ ان کے پاس کشتی میں جتنا سامان تھا سب بہہ گیا اور ان کے پاس صرف پلاسٹک کے چند برتن رہ گئے جو پینے کے پانی سے بھرے ہوئے تھے' وہ انہیں کشتی میں لے آئے تھے تاکہ دوران سفر کام آسکیں۔ لیکن کھانے پینے کا سامان جو اس زندگی بچانے والی کشتی میں تھا جلدی ختم ہوگیا اور مسافر بھوکے ہوگئے۔ لیکن چونکہ موسم بارانی تھا لہٰذا جب بارش ہوتی تو وہ اپنے پلاسٹک کے برتنوں میں میٹھا پانی جمع کرلیتے۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ وہ بحرالکاہل جیسے

وسیع سمندر میں تیر رہے تھے اوران کے ہر طرف پانی تھا لیکن وہ اس پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں پی سکتے تھے۔ اگرچہ بعض کشتیوں میں سمندری پانی کو صاف کرنے کے لئے ایک چھوٹی سی مشینری ہوتی ہے جس کی مدد سے سمندری پانی کو صاف کرکے استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔اس مشینری سے صاف کیا ہوا پانی اگرچہ کسی حد تک پھیکا ہوتا ہے لیکن بہرحال پینے کے قابل ہوتا ہے (۱۰۸) ۔ اس پانی میں نمک نہیں ہوتا لیکن ڈگلس رابرٹسن اور اس کے ساتھیوں کی زندگی بچانے والی کشتی میں اس قسم کی مشینری نہ تھی۔ بہرکیف چونکہ ہر دو یا تین دن میں ایک مرتبہ بارش ہوتی تھی لہٰذا اس زندگی بچانےوالی کشتی کے مسافر پیاسے نہیں ہوتے تھے لیکن انہیں بھوک ستاتی تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ سمندری مسافر پلانکٹن کھا کر نہ صرف یہ کہ کئی دنوں اور ہفتوں بلکہ مہینوں تک اپنے آپ کو زندہ رکھ سکتا ہے۔ لیکن جس راستے سے وہ گزر رہے تھےوہاں پلانکٹن کا وجود نہ تھا جس کی وجہ سمندری آلودگی تھی۔ (جیسا کہ ہم گزشتہ صفحات میں ذکر کرچکے ہیں کہ پلانکٹن چند خلیوں پر مشتمل جانوروں کو کہا جاتا ہے جو سطح سمندر پر رہتے ہیں) لیکن دو اقسام کے سمندری جانور زیادہ پائے جاتے تھے۔ ایک ڈیوراڈ نامی مچھلی اور دوسرا سمندری کچھوا۔ وہ ڈیوراڈ مچھلی کو کانٹے کے ذریعے شکار کر رہے تھے۔ جب وہ ایک مچھلی کا شکار کرچکے اوردوسری مچھلی کے لئے کانٹا سمندر میں ڈالا تو وہ مچھلی ان کا کانٹا لے کرچلی گئی جس سے وہ ڈیوراڈ کے شکار سے محروم ہوگئے۔ لیکن جونہی کوئی کچھوا ان کی کشتی کے نزدیک آتا تو ان میں سے ایک پانی میں چھلانگ لگا کر اس کچھوے کو پکڑ لیتا تھا اور پھر دوسروں کی مدد سے اس جانور کو کشتی میں لے آتا اور سارے اس کا گوشت کھاتے تھے۔ اڑتیس دن تک ڈگلس رابرٹسن اور اس کے ساتھیوں کی خوراک کچھوے کا گوشت رہی۔ یہاں تک کہ ایک جاپانی ماہی گیر کی کشتی نے انہیں نجات دلائی۔ پھر انہیں مرکزی امریکہ میں واقع بال بوا کی بندرگاہ تک پہنچایا۔ جونہی یہ لوگ بندرگاہ پہنچے تو بیمار پڑ گئے۔ ان میں پارے سے جنم لینے والی بیماری کی علامتیں دکھائی دینے لگیں۔ جب انہوں نے اسی علاقے کے کچھوے کا شکار کیا تو معلوم ہوا کہ یہ جانور پارے سے آلودہ ہے اور جو کوئی اس کا گوشت کھائے پارے کی بیماری میں مبتلا ہوجائے گا۔ چونکہ سمندر کے درمیان میں پارے کے وجود میں آنے کی جگہ نہیں ہوتی پس معلوم ہوا کہ یہ جانور کسی دریا کے دوآبے میں انڈے سے باہر آتا ہے جس کے کنارے کافی کارخانےواقع ہیں۔ چونکہ دریا کا پانی پارے سے آلودہ ہوتا ہے لہٰذا وہ کچھوے میں سرایت کرجاتا ہے اور جب وہ دوآبے سے دور سمندر میں نکل جاتا ہے تو ایک عرصے تک پارہ اس کے بدن میں رہتا ہے۔ اسی لئے اس کا گوشت کھانے سے انسان بیمار پڑ جاتا ہے۔ بلا شک وشبہ جو مچھلیاں ایسی جگہوں پر رہتی ہیں وہ بھی بیماری کا سبب بنتی ہیں۔ جو کچھ ہم نے ذکر کیا اس سے معلوم ہوا کہ جاپانی لوگوں نے تیس سال سے بھی کم عرصے میں قدرتی وسائل کے بغیر اتنی ترقی کرلی ہے کہ آج امریکہ اور روس کے بعد تیسرا بڑا امیر ملک کہلاتا ہے۔ اس کے باوجود کہ نہ تو ان کے پاس لوہا اور پتھر کا کوئلہ ہے اور نہ ہی مٹی کا تیل وغیرہ' پھر بھی اس کی صنعتوں نے دنیا کی

مار کیسوں کو مسخر کرلیا ہے۔ لیکن جاپانیوں نے اپنے ماحول کو آلودہ کرکے اپنے لئے مشکلات پیدا کرلی ہیں اور اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ اپنا صنعتی نظام مکمل طور پر تبدیل کریں اور صنعتی یونٹوں کو بڑے بڑے شہروں سے نکال کر چھوٹے شہروں میں لگائیں۔ اس کے لئے انہیں ایک نقشہ تیار کرنا ہوگا جس پر اگر وہ آج سے عمل کرنا شروع کریں تو ۲۰۰۰ء تک اسے مکمل کرسکیں گے۔ اس نقشے کی تشریح ان صفحات میں محال ہے۔ بہرحال اس نقشے کا خلاصہ یہ ہے کہ بڑے بڑے شہروں مثلاً" ٹوکیو جو چند سال پہلے تک آبادی کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا شہر کہلاتا تھا (جبکہ آج کل شنگھائی آبادی کے لحاظ سے دنیا کا بڑا شہر کہلاتا ہے) کی آبادی کم کردی جائے اور ایسے شہروں کی زیادہ سے زیادہ آبادی صرف دولاکھ تک محدود کردی جائے۔

بڑے بڑے شہر اس لئے وجود میں آئے ہیں کہ کھیتی باڑی' صنعت و حرفت' تجارت' تعلیم و تربیت اور انتظامیہ کے ادارے وغیرہ سب شہر میں اکٹھے ہوگئے ہیں اور ہر سال ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ کیونکہ ایک شہر میں تمام کاموں کا اجتماع لوگوں کو اپنی طرف زیادہ مائل کرتا ہے اور ان شہروں میں دوسرے علاقوں کی نسبت بے روزگار لوگوں کے لئے روزگار کے مواقع بھی زیادہ فراہم ہوتے ہیں۔

لیکن جاپان میں جو نقشہ تیار کیا گیا ہے اس کے مطابق مختلف محکموں کے مراکز کو صنعتی مراکز سے اور ان مراکز سے تعلیم و تربیت اور کھیتی باڑی کے مراکز کو جدا کیا جائے اور تمام صنعتی مراکز جن کے بارے میں خیال ہے کہ ماحول کو آلودہ کرتے ہیں ان کی صفائی کے آلات نصب کئے جائیں گے تاکہ جو چیز کارخانے سے خارج ہو کر فضا' زمین یا دریا میں شامل ہو پہلے اس کی مکمل طور پر تطہیر ہوجائے۔ اگر اس طرح کی منصوبہ بندی جاپان میں کامیاب ہوجائے اور اس کے مثبت نتائج بر آمد ہوں تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ دنیا کے دوسرے ممالک بھی اس کی تقلید کریں گے۔ بنی نوع انسان نے زندگی کے ماحول کو آلودہ کرنے والے خطرات خصوصاً" زمین' دریاؤں اور سمندروں کو آلودگی کا باعث بننے والے اسباب پر حال ہی میں توجہ دی ہے۔

لیکن امام جعفر صادقؑ کی مانند دانشوروں نے بارہ سو سال پہلے اس بات کی طرف نشاندہی کردی تھی کہ بنی نوع انسان کو ایسی زندگی گزارنی چاہئے جس سے اس کا ماحول آلودہ نہ ہو۔

قدیم آریا زمین اور پانی کو آلودہ کرنے سے پرہیز کرتے تھے۔ جبکہ اس زمانے میں آج کل کی صنعتیں بھی موجود نہ تھیں اور انسان تعجب کرتا ہے کہ وہ کیسے اس موضوع سے آگاہ تھے کہ زمین اور پانی کو آلودہ نہیں کرنا چاہئے۔ کیا جس طرح ہمارے بعض دانشوروں نے کہا ہے کہ ہم زندگی میں جو کچھ سیکھتے ہیں اس کا ایک حصہ اس تہذیب پر مشتمل ہوتا ہے جو ہمیں اپنے آباء و اجداد سے ورثے میں ملتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم اس کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ پس ہمیں اپنے آباء و اجداد سے جو معلومات اور تجربات ورثے میں ملے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان کو اپنا ماحول آلودہ نہیں کرنا چاہئے کیونکہ جب ماحول آلودہ ہوگا تو زندگی مشکل بلکہ

ناممکن ہوجاتی ہے۔ وہ تمام قومیں جنہیں یورپی مورخین نے ہندوستانی اور یورپی قوموں کا نام دیا ہے (اس نام کے رکھنے پر اعتراض کیا گیا ہے) انہوں نے اپنے ماحول کو آلودگی سے بچانے کے لئے بہت محنت کی ہے۔ ان کی یہ کوشش وسوسے کے درجے تک پہنچ گئی تھی۔ ایک فرانسیسی محقق ماریجن موتے جو آج سے چار سال پہلے فوت ہوا اس کے بقول ہندوستان کے شہروں میں گندے پانی کی پہلی نالی اس طرح تعمیر ہوئی کہ ہندوستانی لوگ زمین کو آلودگی سے بچانا چاہتے تھے لیکن مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ اس قوم نے اس طرف توجہ نہیں کی کہ آخرکار آلودگی پھیلے گی کیونکہ یہ نالی دریا میں جاکر گرتی تھی۔ لیکن ایک جرمن "نولد" کا خیال ہے کہ ہندوستانی فالتو پانی کی نالی کو دریا میں اس لئے ڈالتے تھے کہ ان کا عقیدہ تھا ہرپاک چیز گندی چیز کو پاک کرتی ہے۔ اس لئے وہ دریائی پانی میں نہاتے تھے تاکہ اپنے آپ کو صاف کرلیں۔ آج جبکہ ابتدائی ہندوستانی اور یورپی تمدن ہزاروں سال پرانا ہوچکا ہے میں پھر بھی صفائی کے لئے پانی ہی استعمال کیا جاتا ہے جبکہ صفائی کے لئے مختلف اقسام کے کیمیائی ذرائع اور آکسیجن موجود ہے۔ لیکن صفائی کے لئے لوگ پانی کا استعمال کرتے ہیں۔ ہمیں سابقہ ادوار میں اٹلی کے شاعر اور مصنف داتوزیو (۱۰۹) جیسا شخص کوئی نہیں ملتا جو اپنی قمیصوں کو آکسیجن سے دھوتا ہو۔ داتوزیو کا طریقہ کار یہ تھا کہ اپنے لباس کو خالص آکسیجن میں ڈبو دیتا اور کہا کرتا تھا کہ آکسیجن کے بغیر کوئی چیز بھی لباس کو ستھرا کرنے پر قادر نہیں۔ اس کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ اس کا لباس اچھی طرح دھلا ہوا ہو۔ عمر کے ایک حصے میں اس نے لباس دھونا ترک کردیا تھا۔ لیکن جو لباس وہ ایک بار پہنتا تھا اسے اتار کر دور پھینک دیتا تھا۔ ہندوستانی اور یورپی اقوام اس کے باوجود کہ آکسیجن کو نہیں پہچانتی تھیں اور نہ ہی اس بات سے آگاہ تھیں کہ پانی میں آکسیجن پائی جاتی ہے جو کسی چیز کو صاف کرنے کی خاصیت رکھتی ہے۔ لیکن یہ قومیں قدیم زمانوں سے پانی کی پاک کرنے کی خاصیت سے آگاہ تھیں اور نولد کے بقول ان کا عقیدہ تھا چونکہ پانی پاکیزہ کرنے کی خاصیت رکھتا ہے لہٰذا جب گندے پانی دریا میں گر کر جاری پانی میں شامل ہوتے ہیں تو پانی آلودہ نہیں ہوتا۔ اس جرمن نولد کا نظریہ کسی حد تک صحیح ہے کیونکہ گندے پانی کی نالی جب دریا میں گرتی ہے تو جاری پانی کو آلودہ نہیں کرتی' اس لئے کہ پانی میں پائے جانے والے جراثیم دریا کے پانی میں بکھر جاتے ہیں۔ لیکن اگر ایک دریا میں گندے پانی کی سینکڑوں نالیاں گریں تو اس کے پانی کو آلودہ کردیتی ہیں۔ کیونکہ پانی میں پائے جانے والے چھوٹے چھوٹے جراثیم اچھی طرح منتشر نہیں ہوتے۔ بہرکیف اس زمانے میں کیمیائی مواد جس قدر دریاؤں کے پانی کو آلودہ کرتے ہیں اس قدر گندے پانی کی نالی نہیں کرسکتی۔ کیونکہ کیمیائی مواد پانی میں پائے جانے والے جراثیموں کی مانند تحلیل نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ کارخانوں سے نکلنے والا کیمیائی مواد چھوٹے چھوٹے جراثیموں کو ختم کردیتا ہے۔ اس طرح پانی جانداروں کی صفائی کے عوامل سے محروم ہوجاتا ہے۔ ہندوستانی اور یورپی اقوام کو اپنے ماحول کو آلودگی سے محفوظ کرنے کا اس قدر اندیشہ تھا کہ وہ اپنی میتوں کو زمین میں دفن نہیں کرتے تھے بلکہ انہیں یا تو زندہ جلا دیتے تھے یا

شہر سے دور بلند جگہ کسی پتھر پر رکھ دیتے تھے۔ یہاں تک کہ جب اس کی خشک ہڈیوں کے سوا کچھ بھی باقی نہ رہتا تو وہ پتھر سے ایک قبر بنا کر اس میں رکھ دیتے۔ وہ مردے کو خاک پر اس لئے نہیں پھینکتے تھے کہ ان کا خیال تھا اس طرح زمین آلودہ ہوجائے گی۔ یہاں تک کہ یہ لوگ جنگ کے خاتمے پر مردوں کو دفن نہیں کرتے تھے اور ان کی لاشیں یا تو جلا ڈالتے یا پھر کسی بلند جگہ پر گلنے سڑنے کے لئے چھوڑ دیتے تھے۔ کبھی ایسا ہوتا تھا کہ زمین ایک سے دوسرے کے ہاتھوں میں چلی جاتی تو وہ لوگ خشک ہڈیوں کو بھی دفن نہیں کرسکتے تھے اور یہ ہڈیاں اسی بلند جگہ پر پڑی رہ جاتی تھیں۔ (۱۱۰)

ہندی اور یورپی اقوام کا جب دوسری اقوام سے میل جول پیدا ہوا تو انہوں نے دوسری اقوام سے مردوں کو دفن کرنا سیکھا۔ بہرکیف پھر بھی وہ مضطرب ہوجاتے تو تب ہی اپنے مردوں کو دفن کرتے تھے۔ اگر جنگ چھڑ جاتی اور بہت سے مرد اس میں کام آجاتے تو چونکہ اس صورت میں وہ لاشوں کو کسی اونچے مقام پہ لے جا کر نہیں رکھ سکتے تھے لہٰذا انہیں دفن کردیتے تھے۔

وبائی امراض پھوٹ پڑنے کی صورت میں بھی چونکہ وہ میتوں کو نہ تو کسی اونچے مقام پر رکھ سکتے تھے اور نہ ہی جلا سکتے تھے لہٰذا انہیں دفن کردیتے تھے۔

جس وقت سکندر ہندوستان گیا اور وہاں اس نے جنگ کی تو ہندوستان والوں نے اپنے سینئر افسروں کے علاوہ تمام مقتولین کی لاشوں کو جلا ڈالا۔ سکندر کے اسی خط سے پتہ چلا ہے جو اس نے اپنے استاد ارسطو کے نام لکھا ہے۔ سکندر نے اپنے اس خط میں لکھا۔ میں نے ہندیوں سے سوال کیا کہ کیوں ان اجساد کو جلاتے ہو اور دفن نہیں کرتے ؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ اگر ہم ان اجساد کو دفن کردیں تو زمین آلودہ ہوجائے گی جو ہمارے قانون کے خلاف ہے۔ اگر آپ زمین کو آلودہ نہیں کرنا چاہتے تو آپ نے اپنے سپاہیوں کے اجساد کو کیوں دفن کیا ہے ؟ ہندیوں نے جواب دیا۔ سپاہیوں کے اجساد سے زمین زیادہ آلودہ نہیں ہوتی مگر چونکہ یہ افسران بالا ہیں لہٰذا اگر دفن ہوں تو زمین زیادہ آلودہ ہوجائے گی۔ بعد میں سکندر خود کہتا ہے میرا خیال ہے کہ وہ اس لئے افسران بالا کے اجساد کو دفن نہیں کرتے کہ اس طرح ان افسروں کا احترام مجروح ہوگا۔ سکندر کے خط نے ارسطو پر کافی اثر ڈالا۔ اس نے اس موضوع کو اپنی کتاب جو چھ رسالوں پر مشتمل ہے اور منطق پر لکھی گئی ہے میں رقم کیا ہے اور لکھا ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ ہندیوں کی مانند اجساد کو جلا ڈالیں ؟

ہندی اور یورپی اقوام نے اپنے ماحول کو آلودگی سے بچانے کے لئے اس وقت تگ و دو کی جب ماحول کی آلودگی بنی نوع انسان کی زندگی کے لئے مضر نہ تھی کیونکہ اس زمانے میں دنیا کے بڑے سے بڑے شہر کی آبادی شاید ایک لاکھ سے زیادہ نہ ہوگی۔ ہمیں ہندوستانی اور ایرانی شہروں کی قدیم زمانوں میں آبادی کا علم نہیں لیکن قدیم مصر کے دارالحکومت "طبس" کی دو ہزار سال قبل مسیح میں آبادی ایک لاکھ بھی نہ تھی جبکہ یہ شہر کم از کم ایک

ہزار سال سے دارالحکومت چلا آ رہا ہے۔

چینیوں کے بقول دو ہزار سال قبل مسیح میں پیکنگ شہر کی آبادی پانچ لاکھ افراد پر مشتمل تھی لیکن یہ قول محض روایت ہے اور اس کی کوئی تاریخی سند نہیں ملتی۔ خود چینیوں کی معتبر تاریخ میں اس موضوع کے بارے میں ذکر نہیں ہوا۔ لیکن فرض کریں اگر ایک ہزار سال قبل مسیح میں پیکنگ کی آبادی پانچ لاکھ افراد پر مشتمل تھی تو بھی یہ تعداد موجودہ دور کے بڑے شہروں کی آبادی کے مقابلے میں قابل اعتنا نہیں ہے۔ بہرکیف ہم دیکھتے ہیں کہ کنفیوشس جیسا فلسفی، معلم اخلاق اور معروف چینی قانون دان لوگوں کو حکم دیتا ہے کہ اپنے ماحول کو آلودہ نہ کریں۔

کنفیوشس ۵۵۱ قبل مسیح میں اس دنیائے فانی سے رخصت ہوا۔ جس وقت کنفیوشس نے دنیا میں قدم رکھا تو اس وقت تک ہندی اور یورپی اقوام کو ہندوستان میں رہتے ہوئے صدیاں بلکہ شاید ہزاروں صدیاں بیت گئی ہوں۔ ہم نے صدیاں یا ہزاروں صدیاں اس لئے کہا ہے کہ ہمیں آریا قوم کی ہجرت کرنے کی صحیح تاریخ معلوم نہیں۔ حتیٰ کہ ہم اس قوم کی ہجرت کی تاریخ کے بارے میں تخمینہ بھی نہیں لگاسکتے۔ مورخین کے بقول آریائی اقوام نے تین ہزار سال یا دوہزار سال قبل مسیح میں ہجرت کی۔ اسے ہم تخمینی تاریخ شمار نہیں کرسکتے۔ چونکہ تخمینی تاریخ وہ ہے جس کی دو رقموں میں پچاس سال یا زیادہ سے زیادہ سو سال کا فرق ہو۔ اگر یہ فرق ہزار سال تک ہو تو پھر ہم اس تاریخ کو تخمینی تاریخ نہیں کہہ سکتے۔

قبل از تاریخ کے زمانوں میں اگر دس ملین سال کا فرق ہو تو بھی اسے قابل اعتنا سمجھا جاتا ہے۔ چونکہ حقیقی تاریخ کو اخذ کرنے کا کوئی مآخذ نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر کہا جاتا ہے کہ تاریخ سے قبل بڑے جانوروں کی نسل آج سے پچاس یا ساٹھ ملین سال پہلے معدوم ہوگئی۔ اس کے باوجود کہ ان دو رقموں کے درمیان دس ملین سال کا فاصلہ موجود ہے پھر بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ لیکن آریاؤں کی ہجرت قبل از تاریخ کو ایک صدی کے فرق کے ساتھ متعین کرتے ہیں جسے تخمینی تاریخ نہیں کہا جاسکتا۔ بہرحال کنفیوشس جو ایک بڑا آدمی تھاجب اس نے اپنا وعظ و نصیحت شروع کیا تو ہندوستان میں زندگی بسر کرتے ہوئے آریائی قوم کو ایک مدت بیت چکی تھی۔ لہٰذا بعید نہیں کہ کنفیوشس جس نے دنیا اور انسانوں کی ایک مدت تک سیر کی تھی اس نے ماحول کو آلودگی سے بچانے کی ضرورت کو آریاؤں سے سیکھا ہو۔ کیا آریا جو اپنے ماحول کو آلودہ ہونے سے بچاتے تھے انہوں نے یہ سبق کسی دوسری قوم سے سیکھا۔ آج زندگی کے ماحول کو آلودگی سے بچانا ہماری نظر میں عام سی بات ہے۔ چونکہ خاص طور پر دوسری جنگ عظیم کے بعد ہم نے آلودگی کے خطرات کی طرف توجہ مبذول کی ہے۔

لیکن جس زمانے میں آریاؤں نے ہجرت کی اور ایران و ہندوستان میں سکونت اختیار کی اس زمانے میں دنیا کی آبادی اس قدر زیادہ نہ تھی کہ آلودگی کا مسئلہ ایک خطرناک موضوع بن چکا ہوتا۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے

تک کرہ ارض کی آبادی زیادہ تھی اور نیویارک' لندن اور ٹوکیو جیسے شہروں کی آبادی کئی کئی ملین تک پہنچ چکی تھی۔ لیکن بہرکیف آلودگی کا مسئلہ اس وقت وجود میں نہیں آیا تھا۔ یہ مسئلہ دوسری جنگ عظیم کے بعد جدید صنعتوں کے وجود میں آنے اور ایٹمی توانائی کو استعمال میں لانے کے بعد پیدا ہوا۔ (۱۱۱)

# نصیحت' عقیدہ اور کردار تعلیمات جعفریہ کی رو سے

اگر فرض کیا جائے کہ قدیم زمانے میں آبادی زیادہ تھی لیکن آج کی مانند صنعتیں موجود نہ تھیں کہ آلودگی خطرناک شکل اختیار کر لیتی تب بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آریائی اقوام نے ماحول کو آلودگی سے بچانے کے لئے اتنی سنجیدگی کیوں دکھائی کہ آلودگی سے احتراز کرنا اپنے مذاہب کے اصول کا جزو بنا لیا اور ہندوستان و ایران غرضیکہ جہاں جہاں آریائی اقوام آباد تھیں انہوں نے ماحول کو آلودگی سے بچانے کے لئے اپنی پوری کوشش کی اور جیسا کہ اس سے پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ ان کی یہ کوشش اندیشے کا درجہ اختیار کر گئی

کیا ہم یہ سوچ سکتے ہیں کہ آریاؤں کی ہجرت سے پہلے اس کرہ ارض پر ایک ایسا تمدن موجود تھا جس نے ماحول کو آلودہ کیا اور آلودگی کے نتیجے میں وہ تمدن مٹ گیا یا اسے شدید نقصان اٹھانا پڑا ؟ ہمارا خیال ہے یہ بات عقلمندوں اور دانشوروں نے گھڑی ہے تاکہ آئندہ آنے والے لوگ زندگی کے ماحول کو آلودہ کرنے سے پرہیز کریں۔

اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ یہ بات صرف تخیل کی حد تک نہیں بلکہ حقیقت ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ناصحوں نے صرف آریائی اقوام کو دیکھا ہے اور دوسری قوموں کا مشاہدہ نہیں کیا۔ چونکہ ان کی نصیحت صرف آریائی اقوام تک ہی محدود ہے۔ انہوں نے کسی دوسری قوم سے یہ اندیشہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ بھی اپنی زندگی کے ماحول کو آلودہ کر سکتی ہے۔ اگرچہ یہ آلودگی اس درجے تک نہیں پہنچتی تھی کہ لوگوں کے لئے خطرہ پیدا ہوتا۔

امام جعفر صادقؑ نہ صرف علمی مسائل میں نابغہ روزگار شمار ہوتے تھے اور آپ نے نہ صرف ایسی باتیں کہیں کہ آج ہم بارہ سو سال بعد بھی ان باتوں کو سن کر حیران ہوتے ہیں بلکہ آپ ایک قابل نظریاتی انسان (Ideologist) بھی شمار ہوتے ہیں اور آئیڈیولوجی (Ideology) کے لحاظ سے آپ کے نظریات بارہ سو سال بعد بھی قابل غور ہیں' اگرچہ سترہویں صدی کے بعد دنیا میں بڑے بڑے نظریاتی لوگ پیدا ہوئے ہیں۔

امام جعفر صادقؑ کے نظریات میں سے ایک نظریہ یہ ہے کہ ہر شخص کا عمل اس کے عقیدے کے مطابق ہونا چاہئے اور ہر شخص کے عقیدے کو اس کے افکار کی عکاسی کرنا چاہئے۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا انسان شروع میں صدیق پیدا ہوتا ہے اور اپنے عقیدے کے خلاف کوئی عمل انجام نہیں دیتا لیکن بعد میں بعض اشخاص

میں یہ بات نمودار ہوتی ہے کہ ان کا عمل ان کے عقیدے کے برعکس ہوتا ہے اور وہ جھوٹ سے کام لیتے ہیں۔
امام جعفر صادقؑ نے فرمایا' چھوٹا بچہ جھوٹ نہیں بولتا اس کا عمل اس کے عقیدے کا عکاس ہوتا ہے اگر اسے کوئی اچھا لگے تو اس کی گود میں چلا جاتا ہے اور اگر اسے کوئی برا لگے تو اس سے منہ پھیر لیتا ہے۔ جس چیز کو پسند کرتا ہے' اس کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے اور جس چیز سے نفرت کرتا ہے اس سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے' یہ علامتیں اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ انسان ابتدا میں صدیق ہوتا ہے اور اس کے اعمال اس کے تصور کے عین مطابق ہوتے ہیں۔ لیکن جب بلوغت کی منزل پر آتا ہے تو بعض لوگوں کا کردار ان کی سوچ کے برعکس ہوتا جاتا ہے۔ اور جھوٹ' سچائی کی جگہ لے لیتا ہے۔

آج بشریات Anthropologists اور حیوانیات Zoology کے ماہرین اس بارے میں کہ انسان صدیق پیدا ہوتا ہے اور اس کے اعمال اس کے عقیدے اور تصور سے مطابقت رکھتے ہیں' امام جعفر صادقؑ سے آگے نکل گئے ہیں ان کے بقول شروع میں انسان جھوٹ نہیں بول سکتا اور نہ ہی اپنے عقیدے اور سوچ کے برعکس کوئی کام انجام دے سکتا تھا۔ جو چیز اس کے جھوٹ بولنے اور اپنے عقیدے کے برعکس عمل کرنے کا سبب بنی وہ اس کی گفتگو ہے۔ جس دن تک انسان نے بولنا نہیں سیکھا تھا وہ جس انداز سے سوچتا اسی انداز سے عمل کرتا تھا اور جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ جو کچھ اس کے باطن میں ہوتا اسے ظاہر کر دیتا تھا۔

بنی نوع انسان کی اجتماعی حالت' جانوروں کی اجتماعی حالت جیسی تھی مثلاً "جیسا کہ آج ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ جب دو جانور ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو اگر وہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہوں تو آپس میں دوستی گانٹھ لیتے ہیں۔ لیکن اگر ایک دوسرے کو ناپسند کرتے ہوں تو آپس میں لڑنا جھگڑنا شروع کر دیتے ہیں۔

ہر جانور کا دوسرے جانور کے متعلق باطنی احساس ایسا ہے کہ گویا وہ اس جانور کے بدن پر لکھا ہوا ہے' جونہی اسے دوسرا جانور دیکھتا ہے تو وہ اس باطنی احساس کو فوراً" محسوس کر لیتا ہے۔

شروع شروع میں انسان بھی ایسا ہی تھا اور یہ ریاکاری سے کام نہیں لے سکتا تھا' جو کچھ اس کے باطن میں ہوتا فوراً" ظاہر کر دیتا۔ لیکن جب اس نے بول چال سیکھی اور یہ اپنے مدعا کو اپنے کلام کے ذریعے دوسرے تک پہنچانے کے قابل ہو گیا تو اس وقت اس نے جھوٹ بولنا اور واقعات کو غلط ملط بیان کرنا سیکھا۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بنی نوع انسان کی ترقی اس دن سے شروع ہوئی جب اس نے بولنا سیکھا۔ چونکہ کلام کرنے کے نتیجے میں اس نے اپنے تجربات دوسروں تک پہنچائے اور اسی طرح دوسروں کے تجربات سے خود سبق حاصل کیا اور یوں انسان نے اپنی معلومات میں اضافہ کیا۔ لیکن یہی کلام جس کے ذریعے بنی نوع انسان کی ترقی کی راہیں کھلیں بنی نوع انسان کے جھوٹ بولنے' ریاکاری سے کام لینے اور عقیدے اور تخیل کے برعکس کردار سازی (منافقت) کا باعث بھی بنا۔

موجودہ زمانے کے ڈنمارک کے مشہور و معروف محقق اور مصنف پالووان مولہ کے بقول انسان شروع میں اپنی زندگی سے وابستہ دو چیزوں سے مطلع رہا۔ ایک جھوٹ اور دوسری موت۔ اس مصنف نے مرگ ہابیل کے نام سے ایک کتاب تحریر کی ہے جسے اہل ادب نے موجودہ زمانے کے اچھے ادبی آثار میں شمار کیا ہے۔ یہاں اس کتاب کی تفصیل تو نقل نہیں ہوسکتی بہرکیف چند سطور کا ذکر بے محل نہیں ہے۔

پالووان مولہ اپنے ناول میں لکھتا ہے کہ قابیل اپنے بھائی ہابیل کو قتل کرنے کے بعد رونے لگا۔ اس پر حوا اپنے بیٹے ہابیل کی طرف گئی اور اس کے سر کو زمین سے بلند کرنے کے بعد اسے سہارا دیا۔ اسے یقین تھا کہ اس کا بیٹا سویا ہوا ہے۔ سورج کے غروب ہونے سے تھوڑی دیر پہلے جب آدمؑ صحرا سے واپس آئے تو حوا نے انہیں کہا کہ معلوم نہیں یہ ہابیل نیند سے بیدار کیوں نہیں ہوتا ؟

آدمؑ نے کہا' کس وقت سے سویا ہے ؟ حوا نے کہا ظہر کے بعد سویا ہے۔ آدمؑ بولے ضرور یہ کافی تھکا ہوا ہے اس لئے اسے سونے دو تاکہ اس کی تھکاوٹ مکمل طور پر دور ہوجائے۔ اس وقت تک ہابیل خیمہ کے باہر پڑا ہوا تھا پھر وہ اسے اٹھا کر خیمے کے اندر لے گئے۔ اس کے بعد آدمؑ اور حوا بھی سو گئے۔ جب یہ دونوں سو کر صبح کے وقت اٹھے تو دیکھا کہ ہابیل اسی طرح سو رہا ہے۔ آدمؑ نے حوا سے کہا میرا خیال ہے ہابیل دوبارہ درخت سے گرا ہے کیا تمہیں یاد ہے کہ یہ جب پہلی مرتبہ درخت سے گرا تھا تو ایک دن و رات سوتا رہا حتی کہ اس نے اس دوران آنکھ بھی نہیں کھولی تھی۔ حوا نے شوہر سے کہا سورج نکل آیا ہے لہٰذا آپ ہابیل کو خیمے سے نکال کر دھوپ میں رکھیں تاکہ سورج کی حرارت سے اس کا جسم گرم ہو کیونکہ اس کے ہاتھ ٹھنڈے ہیں' شاید سردی نے اس کی یہ حالت بنائی ہے۔ آدمؑ نے بیٹے کو اٹھایا اور خیمے سے باہر دھوپ میں رکھ دیا۔ لیکن ہابیل سورج کی حرارت پہنچنے پر بھی نیند سے بیدار نہیں ہوا۔ آدمؑ نے بیٹے کو آہستہ سے ہلایا اور کہا ہابیل بیدار ہوجاؤ اور کھانا کھاؤ' تم کل سے سوئے ہوئے ہو اور ابھی تک کچھ نہیں کھایا' کیا تمہیں بھوک نہیں لگ رہی ؟ اٹھو اور کھانا کھاؤ۔ ہابیل نے کوئی جواب نہیں دیا اور نہ ہی آنکھیں کھولیں۔

اس دن ہابیل سورج غروب ہونے تک دھوپ میں پڑا رہا۔ جب شام کو آدمؑ صحرا سے لوٹ کر گھر آئے تو اپنے بیٹے کی طویل نیند پر حیران ہوئے اور حوا سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔ پہلی دفعہ جب یہ درخت سے گرا تھا تو چوبیس گھنٹے گزرنے کے بعد نیند سے جاگ گیا تھا لیکن مجھے حیرانی ہورہی ہے کہ اس دفعہ کیوں نہیں اٹھ رہا ؟ جب رات پڑ گئی تو آدمؑ بیٹے کو اٹھا کر خیمے میں لائے اور اسے زمین پر رکھ دیا۔ اس کے بعد آدمؑ اور حوا دونوں سوگئے۔ جونہی صبح بیدار ہوئے تو انہیں خیمے سے ناگوار بو آنے لگی۔ یہ بو ان کے لئے نئی نہ تھی کیونکہ وہ بو کئی مرتبہ صحرا میں جانوروں کی لاشوں سے سونگھ چکے تھے۔ ایک مرتبہ آدمؑ نے تین دن مسلسل بارہ سنگھے کا شکار کیا اور حوا کے لئے لائے۔ چونکہ چند دنوں میں ان سب بارہ سنگوں کا گوشت نہیں کھا سکتے تھے لہٰذا جو گوشت باقی بچا

اس سے بدبو آنے لگی۔ اس پر حوا نے اپنے شوہر سے کہا کہ وہ اس فاسد گوشت کو خیمے سے باہر پھینک دے۔ اس پر آدمؑ نے گوشت کو خیمے سے نکالا اور دور صحرا میں لے جاکر پھینک دیا۔

آدمؑ و حوا کو اتنی سمجھ آگئی تھی کہ جو بدبو وہ خیمے میں سونگھ رہے ہیں وہ کسی جانور کی لاش کی ہے۔ لیکن اس خیمے میں کسی جانور کی لاش کا وجود نہ تھا جس کی بدبو وہ سونگھتے۔ آخرکار آدمؑ و حوا کی سمجھ میں یہ بات تو آگئی کہ یہ بدبو ان کے اپنے بیٹے کی ہے لیکن وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ ان کا بیٹا مردہ ہے۔ آدمؑ نے ایک مرتبہ پھر ہابیل کو اٹھایا اور اسے خیمے سے باہر لے آئے تاکہ اسے دھوپ میں رکھیں۔ وہ حوا سے مخاطب ہوکر کہنے لگے ہابیل کا بدن بہت ٹھنڈا ہے' مجھے امید ہے کہ جب اس کا بدن دھوپ میں گرم ہوجائے گا تو یہ نیند سے بیدار ہوجائے گا۔ لیکن جب وہ بیٹے کو دھوپ میں لائے تو اس کی شکل و صورت بدل گئی تھی اور اس کا رنگ سیاہ پڑ چکا تھا۔ آدمؑ نے اپنی بیوی کو آواز دی' جب وہ قریب آگئی تو اس سے کہنے لگے' ہابیل کا رنگ تو سیاہ پڑ چکا ہے۔ حوا بھی بیٹے کے رنگ میں تبدیلی کی وجہ نہ جان سکی۔ اس دوران جبکہ بیوی خاوند دونوں ہابیل کی سیاہ صورت کا مشاہدہ کر رہے اور اس سے آنے والی بدبو پر متحیر تھے۔ چند گدھ آسمان پر نمودار ہوئے' جونہی آدمؑ نے صحرا کا رخ کیا اور حوا بھی ذرا سی خیمے سے دور ہوئیں گدھ نہایت تیزی سے ہابیل تک پہنچے اور اگر آدمؑ کی آواز پر وہ وحشت زدہ نہ ہوجاتے تو ہابیل کی تکا بوٹی کردیتے۔

صرف قابیل ایسا شخص تھا جو انہیں یہ بتاسکتا تھا کہ ہابیل کیوں بیدار نہیں ہورہا اور اس سے بدبو کیوں آرہی ہے؟ لیکن جس دن سے ہابیل گہری نیند سویا تھا اس دن سے قابیل کا اتہ پتہ نہ تھا کہ ماں اور باپ دونوں اس کی طویل عرصہ تک عدم موجودگی پر حیران نہ تھے کیونکہ بعض اوقات شکار کے تقاضے ایسے ہوتے تھے کہ اسے صحرا میں رکنا پڑجاتا تھا اور وہ کئی کئی دن خیمے میں واپس نہیں لوٹتا تھا۔

حوا نے مشاہدہ کیا کہ کچھ گدھ آکر قریب ہی زمین پر بیٹھ گئے۔ جونہی وہ دونوں ہابیل کو چھوڑ کر اپنے کام کاج میں مصروف ہونے کا ارادہ کرتے تو وہ گدھ اڑ کر ہابیل کے **قریب** آجاتے اور اس پر جھپٹنا چاہتے لیکن جب وہ دیکھتے کہ وہ دونوں پھر خیمے کی طرف لوٹ آئے ہیں تو دور ہٹ جاتے۔ غرضیکہ یہ آنکھ مچولی جاری رہی۔

اس کے باوجود کہ ہابیل کی نعش سے بدبو آرہی تھی پھر بھی آدمؑ و حوا کو اس کی موت کا علم نہ تھا۔ انہوں نے یہ بدبو صحرا میں گلے سڑے ہوئے جانوروں کی لاشوں سے سونگھی تھی اور اتنا جانتے تھے کہ وہ جانور نہ تو اب حرکت کرسکتے تھے اور نہ ہی غذا کھاسکتے تھے۔ یعنی پہلی حالت پر کبھی بھی واپس نہیں آسکتے تھے۔ لیکن انہوں نے کبھی یہ سوچا بھی نہ تھا کہ انسان بھی جانوروں جیسا ہوسکتا ہے' اس پر ایسا وقت آسکتا ہے کہ نہ تو چل پھر سکے اور نہ کھا پی سکے۔ غرضیکہ موت آدمؑ اور حوا کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ جیسا کہ آج کرہ ارض پر انسان کی پیدائش کے کم از کم چار پانچ ملین سال گزرنے کے بعد بھی موت ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ یہاں تک کہ وہ

ممالک جہاں تعلیم یافتہ مرد اور عورتوں کی تعداد زیادہ ہے' وہ لوگ یہ نہیں سوچتے کہ آدمی مرتا ہے بلکہ ان کا خیال ہے کہ انسان زندہ جاوید ہے لیکن طبعی لحاظ سے موت کے وجود کا انکار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ موت کے بعد انسان کا جسم گل سڑ جاتا اور ختم ہوجاتا ہے یہاں تک کہ کچھ عرصہ بعد اس کی ہڈیاں بھی خراب ہوجاتی ہیں۔ پھر بھی آج کا انسان' انسان کی زندگی جاوید کا معتقد ہے اور اس کی عقل اس بات کو قبول نہیں کرتی کہ انسان اپنے جسم کے ساتھ زندہ رہ سکتا ہے۔ لہٰذا انسان کہتا ہے کہ وہ اپنی روح کے ساتھ زندہ جاوید ہے۔ جو لوگ مادہ پرست اور روح کے وجود کے منکر ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ آدمی مکمل طور پر ختم نہیں ہوتا بلکہ اس سے کچھ چیز باقی رہ جاتی ہے اگرچہ وہ شعاعوں کی شکل میں ہی کیوں نہ ہو۔

بلجیم کا رہنے والا میٹرلنک جو اس صدی کے فلسفیوں میں سے ہے' اگرچہ ایک مادہ پرست انسان تھا لیکن اس کا کہنا تھا کہ سینکڑوں ملین سال پہلے اگر کسی ستارے کا عکس پانی پر پڑا ہے تو وہ نہیں مٹتا تو پھر انسان کیسے مٹ سکتا ہے ؟ اور یہی مادہ پرست انسان ارواح کی حاضری کے اجلاس میں حاضر ہوتا تھا۔ چونکہ یہ اس بات کا معتقد تھا کہ یہ بات ناگزیر ہے کہ انسان سے کوئی چیز باقی رہ جاتی ہے اور جو چیز انسان سے باقی رہتی ہے شاید اسی کے ذریعے انسان اس جہان میں اپنے عزیزوں اور دوستوں سے رابطہ قائم کرسکتا ہے۔

آج سے ایک سو سال پہلے' بھکاری راتوں کو سپین' فرانس اور اٹلی کے گلی کوچوں میں صدا لگایا کرتے تھے کہ اے لوگو ! تمہاری میتیں تمہاری منتظر ہیں اور لوگ بھی معتقد تھے کہ میتیں زندہ ہیں اور انہیں غذا وغیرہ کی ضرورت ہے لہٰذا لوگ انہیں کچھ غذا اور تھوڑی بہت رقم دے دیتے تھے اور بعض رحمدل خواتین تو شراب کا جام بھی دیتی تھیں کیونکہ انہیں یقین تھا کہ میتیں پیاسی ہیں اور انہیں پینے کی ضرورت ہے۔ آج بھی فرانس' سپین اور اٹلی جیسے ممالک میں لوگ اپنی میتوں کے لئے خیرات دیتے ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ لوگ میتوں کی زندگی کے معتقد ہیں۔ کیونکہ اگر وہ یہ سمجھیں کہ وہ واقعی مردہ ہیں تو ان کے لئے خیرات نہ دیں۔

اموات کے زندہ ہونے کے بارے میں لوگوں کا عقیدہ اس قدر پختہ ہے کہ آج دنیا کے سب سے مہذب ملکوں میں بھی لوگ اپنی اموات کو سیر کرنے کے لئے فقراء میں کھانا تقسیم کرتے ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ اگر بھوکے کو کھانا کھلایا جائے تو ان کی میتیں جنہیں غذا کی ضرورت ہے سیر ہوجاتی ہیں۔ لہٰذا ہمیں اس پر حیران نہیں ہونا چاہئے کہ آدمؑ اور حوا موت سے کیوں مطلع نہ تھے ؟ اس کے باوجود کہ انہوں نے ہابیل کی سیاہ صورت دیکھی تھی اور اس کے جسد سے بدبو بھی سونگھی تھی پھر بھی انہیں علم نہ تھا کہ وہ مردہ ہے۔ نہ تو آدمؑ صحرا کی طرف جاسکتے تھے اور نہ ہی حوا خیمے کو واپس جا سکتی تھیں حتی کہ وہ گھریلو کام کاج کرنے سے بھی عاجز تھے کیونکہ جونہی گدھ دیکھتے کہ یہ دونوں ہابیل سے دور ہوگئے ہیں تو وہ فوراً حملہ کے لئے جھپٹ پڑتے' یہاں تک کہ حوا نے اپنے شوہر سے کہا کہ کیا یہ بہتر نہیں کہ جیسے ہم نہیں چاہتے کہ ہمارا گوشت ان جانوروں کے کام آئے اسی

طرح ہابیل کو بھی مٹی کے نیچے دفن کردیں ؟ پہلے انہیں اس بات کا تجربہ ہوچکا تھا کہ جب ان کے پاس زیادہ گوشت ہوتا تو وہ اسے محفوظ کرنے کے لئے ایک گڑھا کھود کر گوشت کو اس میں رکھنے کے بعد گوشت پر درختوں کے پتے رکھتے تاکہ گوشت کے ساتھ مٹی نہ لگے اور پھر اوپر مٹی ڈال کر اسے ڈھانپ دیتے تھے۔ ایک یا دو دن بعد اسے نکال کر اپنے استعمال میں لاتے تھے۔ حوا نے مشورہ دیا کہ ہابیل کو گدھوں کی دست برد سے بچانے کے لئے اسے مٹی میں دفن کیا جائے۔

آدمؑ پتھر کی خودساختہ کدال لائے اور زمین کھودنا شروع کردی۔ جب وہ تھک جاتے تو کدال حوا کو دے دیتے۔ پھر وہ زمین کھودنا شروع کردیتی تھیں۔ حتیٰ کہ انہوں نے اتنی زمین کھود ڈالی اور اتنی مٹی باہر نکال دی جو ہابیل کو دفن کرنے کے لئے کافی نظر آنے لگی۔

جب انہوں نے ہابیل کو اس گڑھے میں ڈالنا چاہا تو اس کی صورت بالکل سیاہ پڑ چکی تھی۔ آدمؑ اپنے بیٹے کا سیاہ چہرہ دیکھ کر سوچ میں پڑ گئے اور بیوی سے کہنے لگے مجھے ایک ایسی بات یاد آ رہی ہے جس کے بارے میں میں نے اب تک سوچا بھی نہ تھا۔ حوا نے پوچھا آپ کو کیا چیز یاد آئی ہے ؟

آدمؑ نے کہا مجھے یاد ہے کہ جس وقت ہم بہشت میں تھے تو خداوند تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ فلاں پھل ممنوع ہے اسے نہ کھانا۔ اگر کھاؤ گے تو مرجاؤ گے۔ کیا تمہیں بھی یاد ہے ؟ حوا کہنے لگیں میں تو بھول گئی تھی لیکن چونکہ اب آپ نے یاد دلا دیا ہے تو مجھے یاد آگیا کہ خداوند تعالیٰ نے بہشت میں ہم سے یہ بات کہی تھی۔ آدمؑ کہنے لگے میرا خیال ہے کہ ہمارا بیٹا جس گہری نیند سے بیدار نہیں ہورہا وہ وہی ہے جس کے متعلق خداوند تعالیٰ نے بہشت میں ہمیں بتایا ہے۔ حوا نے خیال ظاہر کیا' لیکن اس وقت تو ہابیل پیدا بھی نہیں ہوا تھا چہ جائیکہ وہ ممنوعہ پھل کھاتا اور میں اور تم نے وہ میوہ کھایا ہے لہٰذا ہمیں موت آنا چاہئے نہ کہ ہابیل کو۔ آدمؑ بولے۔ وہ ہمارا بیٹا ہے اور ہمارے عمل کی سزا بھگت رہا ہے۔ حوا بولیں۔ میں اس بات کو تسلیم نہیں کرتی' ہابیل نے تو وہ پھل نہیں کھایا کہ اسے موت آجائے۔ آؤ دونوں مل کر اسے مٹی تلے دفن کردیں تاکہ پرندے اس پر حملہ نہ کریں' کل اسے مٹی سے نکال لیں گے شاید اس وقت تک وہ نیند سے بیدار ہوجائے گا۔ آدمؑ نے بیوی کی بات مان لی۔ جب ہابیل کو گڑھے میں رکھا گیا تو اس کے اوپر مٹی ڈال کر بیوی اور خاوند اپنے اپنے کام کاج میں مشغول ہوگئے۔ جب گدوں نے دیکھا کہ نعش کو مٹی کے نیچے دفن کردیا گیا ہے تو وہ بھی اڑ گئے۔ چونکہ وہ آدمؑ اور حوا سے کئی ملین سال پہلے وجود میں آئے تھے لہٰذا انہیں علم تھا کہ موت کیا ہے اور نعش جو موت کا پھل تھی اسے کھاتے تھے اور موت کے متعلق کسی شک و شبہ میں نہیں پڑتے تھے۔ انہیں علم تھا کہ ہابیل نیند سے بیدار نہیں ہوگا اور جونہی انہوں نے ہابیل کی نعش کی بدبو سونگھی وہ سمجھ گئے کہ لڑکا مردہ ہے اور وہ اس کا جسد کھا سکتے ہیں۔ دوسرے دن صبح آدمؑ نے پتھر کی کدال ہاتھ میں لی اور حوا کے ہمراہ اس گڑھے تک گئے جہاں انہوں نے

ہابیل کی نعش رکھی ہوئی تھی۔ آدمؑ نے کدال سے مٹی ہٹا کر ایک طرف کی تاکہ ہابیل کو مٹی کے نیچے سے باہر نکالیں۔

آج ہم حوا اور آدمؑ کی سادگی پر حیران ہوتے ہیں کہ وہ کیوں نہیں سمجھ سکے کہ ان کا بیٹا مردہ ہے جبکہ آج بھی جب ایک آدمی مرتا ہے تو کچھ لوگ اس کے زندہ ہو جانے کے منتظر ہوتے ہیں۔

آج موت کی علامتوں سے سب آگاہ ہیں اور ڈاکٹر ان علامتوں سے دوسروں سے زیادہ آگاہی رکھتے ہیں' لیکن پھر بھی کبھی کبھار ڈاکٹر ان تمام علائم کا مشاہدہ کرنے کے باوجود سوچتا ہے کہ شاید جس شخص کو وہ مردہ سمجھ رہا ہے وہ مرا نہ ہو۔

پس ہمیں اس بات پر حیران نہیں ہونا چاہئے کہ کیوں آدمؑ اور حوا ہابیل کے زندہ ہونے کی توقع رکھتے تھے۔ جونہی انہوں نے مٹی ہٹائی اور ان کی نظریں ہابیل پر پڑیں تو انہوں نے اس میں نعش کی علامتیں دیکھیں۔ اب اس نعش سے آنے والی بدبو تیز ہو گئی۔ اس وقت حوا نے کہا میرا خیال ہے جو کچھ آپ نے کہا ہے وہ حقیقت ہے اور ہابیل مر چکا ہے۔ اب ہم اسے مزید چلتا پھرتا' بات چیت کرتا' ہنستا اور کھانا کھاتا نہیں دیکھ سکیں گے۔

یہ اس ناول کا خلاصہ تھا جو ڈنمارک کے مصنف پالووان مولہ نے دنیا میں پہلی انسانی موت کے بارے میں لکھا۔ جیسا کہ مشاہدہ ہوا جب آدمؑ اور حوا سمجھ گئے کہ ان کا بیٹا مردہ ہے تو وہ نہیں روئے چونکہ ابھی تک ان کے جذبات اپنے ایک عزیز کی موت پر ردعمل ظاہر کرنے کے لئے تیار نہ تھے اور مردے پر رونا انسان نے بعد میں سیکھا ہے' وہ بھی تمام مردوں پر نہیں بلکہ صرف ان مردوں پر جو ان کے بہت قریبی عزیز ہوتے ہیں۔ جبکہ بیگانوں کی موت ان کی نظر میں اس قدر اہمیت نہیں رکھتی کہ اس پر آنسو بہائیں بلکہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ اپنے نزدیک ترین عزیزوں کی موت پر بھی آنسو نہیں بہاتے۔اور میدان جنگ اور ہسپتالوں جیسی جگہیں بھی ہیں جہاں پر کوئی مردے پر آنسو نہیں بہاتا۔

ہم نے کہا کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔ آدمی جب پیدا ہوتا ہے تو فطرتاً" صدیق ہوتا ہے۔ اس کا کردار اس کے عقیدے کے مطابق ہوتا ہے اور جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے آدمی جس کی تخلیق کی ابتدا کے بارے میں ابھی تک سائنس دان جاننے میں کامیاب نہیں ہو سکے' اس ابتدا میں انسان جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ انسان کی پیدائش کے آغاز کے متعلق سائنس دانوں کے درمیان ساٹھ ملین سال کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض انسان کی تخلیق کو خیال کرتے ہیں جو آج سے پینسٹھ یا ستر سال پہلے کا زمانہ ہے اور یہ زمانہ بڑی جسامت والی چھپکلیوں (ڈائنوسار) کے خاتمے کے فوراً" بعد کا زمانہ ہے۔ انسانی بدن کا پتھر میں محفوظ ڈھانچہ یا سکیلٹن جو حال ہی میں چین میں دریافت ہوا ہے اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آج سے ساٹھ ملین سال پرانا ہے۔ اگر اس کی قدامت اتنی ہی ہے تو جن لوگوں کے بقول انسان تیسرے عہد کے آخر میں وجود میں آیا وہ لوگ صحیح ہیں۔ تیسرا عہد کہ

ارض کا وہ دور ہے جس میں زمین کی موجودہ شکل بنائی گئی ہے' جس کے بعد نہ تو ہمیشہ بارش برستی ہے اور نہ ہی پہاڑوں میں دراڑیں ڈالنے والے بڑے بڑے دریا وجود میں آئے تھے۔ دریا اور سمندر تقریباً" ایک جیسی حالت پر تھے۔ اس مرحلے میں انسان نے اپنے گمنام آباء و اجداد (۱۱۴) کے بعد دنیا میں قدم رکھا تھا۔ اس زمانے میں انسان چوپایہ تھا۔ اسے بات کرنے کا ڈھنگ نہیں آتا تھا۔ وہ کتوں کی مانند بھوں بھوں کرتا اور چنگھاڑتا تھا۔ اس زمانے میں انسان آسانی سے آدم خور جانوروں کا نوالہ بن جاتا تھا کیونکہ اس میں تیزی سے فرار ہونے کی صلاحیت نہ تھی' یہاں تک کہ آدم خور جانوروں کے مقابلے میں خرگوش کی مانند بھاگنے کی صلاحیت بھی نہ رکھتا تھا۔ اس کا بدن بھیڑوں کی مانند سر سے پاؤں تک اون سے ڈھکا ہوتا تھا تاکہ وہ سردی کا مقابلہ کرسکے۔ لیکن بھیڑ کا بدن تو کیڑوں مکوڑوں کی دسترس سے محفوظ ہے جبکہ انسان کی اون میں بے شمار کیڑے مکوڑے رہا کرتے تھے۔ پہلے دور کے انسان کا کام ہی جسم کی خارش کرنا ہوتا تھا۔ جونہی اس کا پیٹ بھرتا اور وہ اس طرف سے مطمئن ہوجاتا تو جسم کی خارش کرنا شروع کردیتا تھا۔ پیٹ بھرنا بھی شروع شروع میں انسان کے لئے ایک طویل کام ہوتا تھا کیونکہ انسان گھاس کھاتا تھا اور چونکہ حرارے مہیا کرنے والا گھاس کم میسر آتا تھا للذا انسان عام گھاس کھانے پر مجبور تھا تاکہ اپنا پیٹ بھرے۔

اگر ڈارون کا نظریہ صحیح ہے تو انسان اپنی تخلیق کے آغاز میں زمین سے کوئی چیز اٹھا کر اسے منہ تک لے جانے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتا تھا کیونکہ انسانی انگلیوں کی شکل آج کی مانند نہ تھی اور انسان اپنا پیٹ بھرنے کے لئے مجبوراً" بھیڑوں کی مانند چرتا تھا۔ کئی ملین سال گزرنے کے بعد آدمی کی انگلیوں کی موجودہ حالت بنی تاکہ انسان کوئی چیز زمین سے اٹھا کر منہ میں ڈال سکے۔

موجودہ زمانے کے معروف سائنس دان مارشل مائیک کے بقول انسان کا وحشت گری سے موجودہ دور میں داخل ہونے کا سبب یہی چار ہاتھ اور پاؤں سے چلنا تھا۔ چونکہ چار ہاتھ اور پاؤں سے چلنا یا دو ہاتھوں اور دو پاؤں کو کام میں لانا انسان کے دماغ میں دو کروں کو کام میں لانے کا سبب بنا جس کے نتیجے میں آدمی کی عقل پختہ ہوئی اور اس میں ذہانت وجود میں آئی۔ انسان نے نت نئے کام مہذب دور میں منتقل ہونے کے لئے انجام دیئے ہیں۔ ذہانت اس کے لئے ضروری تھی۔ مارشل مائیک لوہن کہتا ہے کہ اگر علمی اور ثقافتی میراث جو ہمارے اسلاف سے ہمیں ملی ہے' جنگ یا کسی اور بڑے المئے کے نتیجے میں ختم ہوجائے اور بالغ افراد جو کئی باتوں سے آگاہ ہیں وہ بھی ختم ہوجائیں اور صرف بچے رہ جائیں اور ان کے سامنے بھی مہذب زندگی کا نمونہ نہ ہو تو انسان ایک وحشی جانور میں تبدیل ہوجائے گا اور اس طرح اپنے کام کے مرحلے تک نہیں پہنچا سکے گا۔ کیونکہ آدمی کے دماغ کا آدھا حصہ اچھی طرح کام کرتا ہے اور آدھا حصہ ساکن ہے۔ کیونکہ انسان یا تو دائیں ہاتھ سے کام کرتا ہے یا بائیں ہاتھ سے۔ جو لوگ دائیں ہاتھ سے کام کرتے ہیں نہ صرف ان کا بایاں ہاتھ کام نہیں کرتا بلکہ بایاں

ہاتھ بیکار ہوجاتا ہے۔ اس بات کو وہ اس وقت محسوس کرتے ہیں جس وقت وہ فٹ بال کے گراؤنڈ میں بائیں پاؤں سے گیند کو ٹھوکر مارنا چاہتے ہیں۔ پھر جاکر انہیں علم ہوتا ہے کہ ان کے بائیں پاؤں اور بازو میں کوئی زیادہ فرق نہیں کیونکہ وہ بائیں پاؤں سے گیند کو ٹھوکر لگانے پر قادر نہیں۔

لیکن کینیڈا کے ماہر سوشیالوجی کے بقول چونکہ انسان آغاز میں دو ہاتھ اور دو پاؤں سے چلتا تھا اور درختوں پر چڑھتا تھا اور تمام کام دو ہاتھوں سے انجام دیتا تھا لہٰذا اس کے دونوں دماغی نصف کرے کام کرتے تھے جس کے نتیجے میں انسان کی ذکاوت اتنی بڑھ گئی کہ اس نے اپنے آپ کو وحشی کے مرحلے سے نکال کر تہذیب کے مرحلے میں پہنچا دیا۔ بہرحال وحشی گری کے اس دور میں جب انسان گھاس پر چار ہاتھ پاؤں سے چلتا تھا آج کے انسان کی نسبت اخلاقی لحاظ سے برتر تھا۔ وہ اس طرح کہ نہ تو جھوٹ بول سکتا تھا اور نہ ہی اپنے باطن کو چھپا سکتا تھا۔ لیکن وہ اخلاقی قاعدے قوانین نہیں رہے اور کوئی ان پر عمل نہیں کرتا۔ موجودہ دور میں دیکھا گیا ہے کہ جتنا ایک معاشرہ تہذیبی نقطہ نگاہ سے پسماندہ ہوگا اتنا ہی اس میں جھوٹ، ریاکاری اور بناوٹ کم ہوگی۔ وہ اقوام اب بھی نیم وحشی ہیں جو نیوگنی کے مرکز اور سمندر کے بعض جزائر میں زندگی بسر کر رہی ہیں جو جھوٹ نہیں بولتیں اور دوسروں کی نسبت ریاکار بھی نہیں ہیں۔ مرکزی افریقہ کے سیاہ فام بھی انیسویں صدی کے دوسرے عشرے تک جھوٹ نہیں بولتے تھے یعنی جھوٹ نہیں بول سکتے تھے۔ جو چیز اس حقیقت کو ثابت کرتی ہے وہ ڈاکٹر لایونک اسٹون کی یادداشتیں ہیں جس نے دریائے نیل کے سرچشموں کو دریافت کیا۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ ان سرچشموں کی دریافت کے بعد اس نے صرف جغرافیائی نقشے اور اپنے مقالات رائل جیوگریفک یونین آف انگلینڈ کو بھیجے اور خود افریقہ کے مرکز سے باہر نہیں آیا۔ جس طرح اس دور میں ڈاکٹر شوایٹ زر نے اپنی زندگی سیاہ فاموں کی خدمت میں صرف کی، ڈاکٹر لائیونک اسٹون نے بھی اپنی عمر سیاہ فاموں کی خدمت کے لئے وقف کردی۔ اس کے مقاصد میں سے ایک یہ تھا کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بردہ فروش تاجر جو افریقی عرب تھے، سیاہ فاموں کو مرکزی افریقہ سے اغوا کرکے کسی اور جگہ بیچ ڈالیں۔

ڈاکٹر لائیونک اسٹون نے افریقہ میں واقع علاقے ٹانگانیکا میں سیاہ فاموں کو بردہ فروش تاجروں کے خطرے سے محفوظ رکھنے کے لئے انگلستان کا پرچم نصب کر دیا تھا تاکہ بردہ فروش تاجر وہاں کے سیاہ فاموں کو انگلستان کے شہری سمجھ کر انہیں بردہ فروشی کی غرض سے اغوا نہ کریں۔

ڈاکٹر لائیونک اسٹون کے مخالفین اور انگلستان والوں نے کہا کہ دریائے نیل کے منبعوں کو دریافت کرنے والے کا مقصد انگلستان کا پرچم نصب کرکے سیاہ فاموں کو تحفظ فراہم کرنا نہ تھا بلکہ براعظم افریقہ کے مرکز کو انگلستان کے حوالے کرنا تھا۔ بعد میں انگلستان نے ٹانگانیکا کو سرکاری طور پر اپنے قبضے میں لے کر اسے برطانیہ کی نوآبادی قرار دیا تھا۔

دریائے نیل کے سرچشموں کے دریافت کرنے والے کا ذکر کرنے سے ہمارا کچھ اور بھی مطلب ہے جو یہ ہے کہ اس نے سیاہ فاموں کو کہا ہوا تھا کہ جہاں کہیں وہ بردہ فروش تاجروں کے ہتھے چڑھ جائیں اور وہ انہیں اغوا کرنے کی ٹھان لیں اور سیاہ فام اس کی مدد بھی نہ حاصل کرسکیں تو انہیں چاہئے کہ وہ کہیں کہ وہ انگلستان کے شہری ہیں۔ اس طرح بردہ فروش تاجر انہیں اغوا کرنے کی جرات نہیں کرسکیں گے۔ لیکن وہ یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ وہ انگلینڈ کے شہری ہیں جبکہ انہیں علم تھا کہ اگر وہ جھوٹ بولیں گے تو آزادی اور جان کے چھن جانے کے خطرے سے دوچار نہیں ہوں گے۔

ڈاکٹر لائیونگ اسٹون نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ ٹانگانیکا کا سیاہ فام ہرگز جھوٹ نہیں بول سکتا اگرچہ اپنی جان کے تحفظ کے لئے ہی کیوں نہ بولنا پڑے۔ ایک سیاہ فام کو اگر ہاتھی کے دو دانت (جو مرکزی افریقہ کی گرانبہا اجناس میں سے ہیں) دیئے جائیں تو تب بھی وہ جھوٹ بولنے پر آمادہ نہیں ہوگا۔

اس علاقے کے سیاہ فام کی نظر میں جھوٹ بولنا ایک ایسا محال کام ہے جس سے وہ عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔ نیویارک کے ہیرالڈ ٹرائی بیون کا نامہ نگار بھی دریائے نیل کے سرچشمے دریافت کرنے کے لئے افریقہ گیا تھا۔ ہم اس کی ڈائری میں دیکھتے ہیں کہ وہ لکھتا ہے افریقی سیاہ فام جو مرکزی افریقہ میں وحشیانہ زندگی گزارتے ہیں (نہ کہ وہ جو افریقہ کے سواحل پر مہذب سیاہ فام ہیں) کی جان پر بھی بن آتی ہے تب بھی وہ جھوٹ نہیں بولتے۔

جو لوگ دریائے نیل کے سرچشموں کی دریافت کی تاریخ سے آگاہ ہیں وہ یہ جانتے ہیں کہ انگریز ڈاکٹر لائیونگ اسٹون جب انیسویں صدی کے دوسرے پچاس سالوں کے دوران دریائے نیل کے سرچشموں کی دریافت کے لئے مرکزی افریقہ گیا تو اس نے دس سال تک کوئی خبر بیرونی دنیا کو نہیں بھیجی۔ روزنامہ نیویارک ٹرائی بیون کے ناشر نے ایک قابل نامہ نگار اسٹینلے کو ڈاکٹر لائیونگ اسٹون کے ڈھونڈنے کے لئے افریقہ بھیجا تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ وہ مردہ ہے یا زندہ ؟ جب یہ نامہ نگار مرکزی افریقہ پہنچا تو اس نے دریائے نیل کے سرچشمے دریافت کرنے والے شخص کو ڈھونڈ نکالا (۱۱۳)۔

اس نامہ نگار نے دو مرتبہ افریقہ کا سفر کیا۔ ایک مرتبہ دریائے نیل کے سرچشموں کو دریافت کرنے والے کو ڈھونڈنے کے لئے اور دوسری مرتبہ جغرافیائی معلومات حاصل کرنے کے لئے وہ ایک آبشار دریافت کرنے میں کامیاب ہوا جس کا نام وکٹوریہ ہے اور جو دریائے نائجیریا میں واقع ہے۔

دوسرے سفر کے دوران اسٹینلے اپنے قافلے کا قاضی بھی تھا اور فیصلے کرتا تھا۔ اس نے سیاہ فاموں میں سے ایک کو قتل کرنے اور دوسروں کو دھمکی دینے کے جرم میں پھانسی کی سزا دی۔ اس نے پھانسی کے آخری لمحات میں سیاہ فام سے کہا اگر تم وعدہ کرو کہ اس کے بعد اپنے رفقاء کو اذیت نہیں پہنچاؤ گے تو میں تمہیں پھانسی کی سزا نہیں دیتا۔ لیکن اس سیاہ فام نے کہا کہ اگر وہ زندہ رہا تو اپنے رفقاء کو قتل کرے گا۔

یہ شخص جو اپنے رفقاء کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا اگر جھوٹ بولتا اور کہہ دیتا کہ میں نے اپنا ارادہ ترک کردیا ہے تو وہ زندہ رہ سکتا تھا لیکن وہ جھوٹ نہیں بول سکا' اس کی زبان جھوٹ بولنے کے لئے نہیں کھل سکی۔ مرکزی افریقہ کے یہی سیاہ فام قبائل جو دریائے نیل کے سرچشمے دریافت کرنے والے ڈاکٹر لائیونگ اسٹون اور امریکی نامہ نگار اسٹینلے کے بقول جھوٹ نہیں بول سکتے تھے آج کے مہذب دور میں داخل ہوئے تو انہوں نے جھوٹ بولنا شروع کردیا۔

امام جعفر صادقؑ جھوٹ اور ریاکاری سے سخت متنفر تھے اور کہا کرتے تھے کہ انسان کے قول اور فعل میں تضاد نہیں ہونا چاہئے اور ہر ایک کا عقیدہ اس کے خیالات کا عکاس ہونا چاہئے یعنی جو کچھ انسان کے باطن میں ہو وہی ظاہر میں ہو۔ امام جعفر صادقؑ ریاکاری اور دکھلاوے سے نفرت کرتے اور اسے کسی صورت بھی تسلیم نہیں کرتے تھے۔ چونکہ ریاکار بننا پسند نہیں کرتے تھے اور نہ ہی اپنے عقیدے کو چھپاتے تھے لہٰذا اسی بنا پر آپ نے اپنے عقیدے پر جان قربان کردی۔

# سائنس و فلسفہ کی توضیح

اب ہم اس نابغہ علمی شخصیت کے شاندار نظریات میں سے ایک اور نظریئے کا تذکرہ کرتے ہیں اور وہ ہے آپ کا سائنس اور فلسفہ کے درمیان فرق کا نظریہ۔

امام جعفر صادقؑ مذہبی پیشوا' عالم' فلسفی' حکیم اور ادیب بھی تھے۔ جیسا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ آپ ان چاروں علوم کو اپنے حلقہ درس میں پڑھاتے تھے۔ آپ نے فلسفہ اور سائنس کے درمیان فرق کے بارے میں ایسا نظریہ پیش کیا ہے کہ ایک ہزار دوسو پچاس سال گزرنے کے بعد اور ہزاروں فلسفیوں کے دنیا میں آنے کے بعد بھی خاصا پرکشش ہے۔ امام جعفر صادقؑ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے فلسفہ اور سائنس میں فرق کی وضاحت کی۔ آپ سے پہلے کسی نے بھی اس جانب توجہ نہیں کی تھی کہ فلسفہ اور سائنس کے درمیان فرق پایا جاتا ہے۔

قدیم یونانی فلسفیوں کی نظر میں جو چیز معلوم ہوجاتی تھی فلسفے میں شمار ہوتی تھی۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ اسکندریہ کا مکتب جو قدیم زمانے میں دنیا کے بڑے علمی مکاتب میں شمار ہوتا تھا وہاں پر فلسفے اور سائنس کے درمیان کسی فرق کی نشاندہی نہیں کی گئی تھی وہ اس طرح کہ تمام سائنسی علوم کو فلسفہ میں شمار کیا جاتا تھا یہاں تک کہ علم طب بھی فلسفے کا جزو تھا۔ (۱۱۴)

قدماء کی نظر میں فلسفہ وہ منبع تھا جس سے علوم کے سرچشمے پھوٹتے تھے اور وہ علم العلوم شمار کیا جاتا تھا۔ جو فلسفے کا ماہر ہوتا وہ تمام علوم میں ماہر ہوتا تھا۔ لیکن اگر کوئی شخص صرف علم طب جانتا تھا تو وہ یہ دعویٰ نہیں

کر سکتا تھا کہ وہ فلسفہ بھی جانتا ہے۔ ایک فرانسیسی فلسفی ژان دولا کروا کے بقول قدیم یونان میں شروع شروع میں ادب اور آرٹ بھی فلسفے کا جزو شمار ہوتے تھے۔ یونانیوں کا عقیدہ تھا کہ شاعری' موسیقی' مجسمہ سازی اور مصوری بھی فلسفہ سے نکلتے ہیں۔ لیکن بعد میں یونانیوں نے ادب اور ہنر کو فلسفہ سے جدا کرلیا کیونکہ وہ معتقد تھے کہ تمام علوم فلسفہ سے نکلے ہیں لہٰذا ان کی نظر میں سائنس کو فلسفہ سے جدا کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

یہ نظریہ اس وقت تک قائم رہا جب تک امام جعفر صادقؑ نے سائنس اور فلسفہ میں امتیاز کی نشاندہی نہ کردی۔ آج جبکہ علم کی حدود معلوم ہوگئی ہیں ہمیں اس بات پر کوئی حیرت نہیں کہ فلسفہ کو سائنس سے جدا کیوں سمجھا جاتا ہے۔ جس دن امام جعفر صادقؑ نے فلسفے کو سائنس سے جدا کیا ہے اسی وقت سے آپ کا نظریہ ایک انقلابی نظریہ شمار کیا گیا اور ایک حقیقی انقلابی نہ کہ مجازی۔ کیونکہ امام جعفر صادقؑ نے فرق کے متعلق ایک ایسی بات کہی جس نے ہر فلسفی کو ہلا کر رکھ دیا۔ امام جعفر صادقؑ کا یہ نظریہ سو حصوں پر مشتمل ہے اور وہ اس طرح کہ سائنس کسی حتمی نتیجے تک پہنچتی ہے اگرچہ وہ نتیجہ بہت مختصر اور محدود ہی کیوں نہ ہو لیکن فلسفہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچتا۔

امام جعفر صادقؑ کے نظریئے کے اس حصے سے ان فلسفیوں کی کاوش باطل ہوجاتی ہے جو ساری عمر فلسفے کی گتھیاں سلجھانے میں صرف کردیتے ہیں۔

اس ارشاد کا سادہ مفہوم یہ ہے کہ دنیا کے فلسفیو ! جو کچھ تم نے پڑھا اور کسب فیض حاصل کیا ہے وہ سب فضول تھا اور فضول ہے۔ تم لوگوں نے اپنی زندگی فضول چیزوں میں ضائع کردی ہے کیونکہ جو چیز تم نے حاصل کی ہے اس کا نہ تمہیں کوئی فائدہ ہے اور نہ ہی دوسرے لوگ اس سے فائدہ حاصل کرسکتے ہیں۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ جس زمانے میں کسی نے دوسروں کے علم کی قدرو قیمت کا انکار کیا وہ تمام لوگ اور ان کے حامی اس کے دشمن بن گئے۔ اگر کوئی کسی شخص کے گھر یا کھیتی کی قدر و قیمت کا انکار کرے تو وہ اس شخص سے سخت دشمنی نہیں مول لیتا لیکن اگر کسی شخص کے علم کا انکار کیا جائے تو وہ سخت دشمن بن جاتا ہے کیونکہ جن کے پاس علم ہوتا ہے وہ اس پر فخر کرتے ہیں اور وہ ہرگز اپنے علم کی بے قدری برداشت نہیں کرسکتے۔

یہاں تک کہ عظیم انسان بھی جب سنتے ہیں کہ علم کی قدرو قیمت نہیں ہوئی تو انہیں بیحد رنج ہوتا تھا۔ بزرگان اسلام میں سے مالکی فرقے کے بانی مالک بن انس (۱۱۵) جو چار مشہور اسلامی فرقوں مالکی' شافعی' حنفی اور حنبلی میں سے ایک کے بانی ہیں۔

جب امام جعفر صادقؑ کا یہ نظریہ کہ فلسفہ نتیجہ حاصل کرنے کے لحاظ سے بے فائدہ ہے (البتہ ابھی امام جعفر صادقؑ کے نظریئے کا صرف پہلا حصہ ہی لوگوں تک پہنچا تھا) جونہی اس نظریہ کو مالک بن انس کے ایک قریبی مرید ابراہیم غزی نے مالک بن انس تک پہنچایا اور ان سے کہا کہ جو کچھ آپ نے فلسفے سے سیکھا ہے اس کا

کوئی فائدہ نہیں۔ روایت ہے کہ وہ نیک سیرت انسان ابراہیم غزی سے اس قدر رنجیدہ خاطر ہوا کہ ابراہیم غزی کے مرنے تک اس سے نالاں رہا۔

جب مالک بن انس جیسا انسان اپنے علم کی قدروقیمت پر اس قدر رنجیدہ ہوتا ہے تو دوسرے لوگوں پر کیا شکوہ۔ مشہور فرانسیسی ہمعصر فلسفی ژان دولاکروا امام جعفر صادقؑ کے نظریہ کے پہلے حصے پر اعتراض کرتے ہوئے کہتا ہے کہ آپ کو اپنے نظریئے کے پہلے حصے کو اس طرح بیان کرنا چاہئے تھا کہ آپ کہتے اگر فلسفہ سائنس کی صورت میں سامنے نہ آئے تو بے سود ہے۔ لیکن جب سائنس کی صورت میں سامنے آتا ہے تو اس سے مفید نتیجہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ فرانسیسی فلسفی اور محقق کہتا ہے کہ نہ صرف فلسفہ سائنس کی صورت میں سامنے نہ آنے کی بنا پر بے سود ہے بلکہ ہر وہ سائنس جو صرف تھیوری کی حد تک محدود ہے یعنی اس کا عملی استعمال نہیں تو وہ بے سود ہے۔

کبھی کسی علم میں مستقل قوانین دریافت ہوتے ہیں تو جب تک ان قوانین کا عملی اجراء نہ ہوگا وہ بے سود ہیں۔ مشہور ماہر فلکیات کپلر جس نے سورج کے گرد سیاروں کی حرکت کے تین قوانین وضع کئے فلکیات اور فزکس کے ماہرین میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جو ان قوانین کو شک کی نگاہ سے دیکھتا۔ سائنس دان جانتے تھے کہ یہ قوانین تھیوری نہیں بلکہ علم اور حقیقت ہیں۔ لیکن نہ ہی کپلر کے قوانین سے کوئی نتیجہ برآمد ہوتا ہے اور نہ نیوٹن کے دریافت کردہ قوت تجاذب کے قانون سے ہی کوئی نتیجہ نکلتا ہے۔

۱۹۵۷ء میں جب روس نے اپنا پہلا مصنوعی سیارہ خلا میں بھیجا تو کپلر کے تین قوانین اور قانون تجاذب سے نتیجہ حاصل ہونا شروع ہوا اور تمام سیارچے اور تمام خلائی جہاز جو زمین یا دوسرے سیاروں کے گرد گھومتے ہیں ان قوانین کے تابع ہیں اور بنی نوع انسان کو ان قوانین کا عملی نتیجہ یہ ملا ہے کہ آج ایک ٹیلی ویژن پروگرام کو سیاروں کی مدد سے کرہ ارض کے تمام لوگوں تک پہنچایا جاسکتا ہے اور مصنوعی سیاروں کی مدد سے طوفانوں کے بارے میں مکمل پیش گوئی کی جاسکتی ہے اور اسی طرح غلط جغرافیائی نقشوں کو بھی درست کیا جاسکتا ہے۔ (۱۱۶)

جیسا کہ ہمیں معلوم ہے امام جعفر صادقؑ اپنے حلقہ تدریس میں فلسفہ بھی پڑھاتے تھے لہٰذا یہاں سے اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ جو شخص کہتا ہے کہ فلسفہ حقیقی اور عملی نتیجہ حاصل کرنے کے لحاظ سے بے سود ہے وہ خود اس کو کیوں پڑھاتا ہے۔ امام جعفر صادقؑ جیسے انسان جو علمی مقام رکھنے کے علاوہ مذہبی پیشوا بھی تھے نے کیوں اپنے شاگردوں کو ایک عرصہ فضولیات میں مشغول رکھا جن کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ اس موضوع کے سبب کو سمجھنے کے لئے ہمیں امام جعفر صادقؑ کے نظریئے کے دوسرے حصے یعنی فلسفے اور سائنس کے فرق پر نظر ڈالنا ہوگی۔

جب ہم امام جعفر صادقؑ کے نظریئے کے دوسرے حصے کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ بات مدنظر رکھنا چاہئے کہ آپ فلسفہ و سائنس کے ضمن میں اس موضوع کو زبان پر لاتے ہیں نہ کہ مذہب کے ضمن میں۔ چونکہ امام

جعفر صادقؑ ایک مذہبی پیشوا تھے بلا کسی شک کے حقیقت کو مذہب اور اس کے مبدا میں سمجھتے تھے جو خدا ہے۔
لیکن آپ نے اپنے نظریہ کے دوسرے حصے کو فلسفہ اور سائنس کے محور پر ذکر کیا ہے اور وہ اس طرح کہ سائنس دور کی حقیقت کو مدنظر نہیں رکھ سکتی جبکہ فلسفہ اس کو مدنظر رکھتا ہے۔ اس نظریہ کو سطحی نظر سے نہ دیکھئے اور اس سے تیزی سے نہ گزر جائیے کیونکہ جب تک انسان اس نظریئے کی گہرائی میں نہ جائے سمجھ نہیں سکتا کہ اس عظیم انسان نے سائنس اور فلسفہ کا درمیانی فرق کس چیز کو قرار دیا ہے۔ اس کے باوجود کہ وہ فلسفے کے عملی فائدے سے انکاری ہے اسے کیوں تدریس کرتا ہے ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا سائنس حقائق کا کھوج لگا سکتی ہے چاہے وہ حقائق کتنے ہی معمولی کیوں نہ ہوں۔ ایک ایسا شخص جو کہتا ہے کہ سائنس زمانے کی حقیقت کا پتہ نہیں چلا سکتی لیکن فلسفہ ایسا کرسکتا ہے۔کیا دو نظریات جو سائنس اور فلسفہ کے فرق یعنی ایک موضوع سے متعلق ہیں' کیا ان میں تضاد نہیں پایا جاتا ؟
امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ سائنس حقائق کا کھوج لگا سکتی ہے۔ اگر بڑے حقائق کا کھوج نہ بھی لگا سکے تو چھوٹے حقائق کا پتہ چلا سکتی ہے' لیکن اس حقیقت کے وجود میں لانے کا مقصد بیان نہیں کرسکتی۔ شاید اس بات کو اس طرح بھی کہا جاسکتا ہے کہ سائنس آنکھ کی مانند تمام چیزوں کا مشاہدہ کرسکتی ہے لیکن اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکتی کہ حقائق کے ادراک سے اس کا کیا مطلب ہے ؟ لیکن فلسفہ جو اس کے باوجود کہ ابھی تک کسی حقیقت تک نہیں پہنچ سکا پھر بھی زمانے کی حقیقت کو مدنظر رکھتا ہے اور جانتا ہے کہ یہ سمجھنا چاہتا ہے کہ دنیا اور اس میں بنی نوع انسان کیوں وجود میں آئے' خالق کون ہے ؟ دنیا کو خلق کرنے کا مقصد کیا ہے ؟ اور اس دنیا میں بنی نوع انسان کا انجام اور خود دنیا کا انجام کیا ہوگا ؟
اس کلام کو ساڑھے بارہ سو سال گزر چکے ہیں۔ آج بھی ایک ایسا امتیازی نشان ہے جو سائنس کو فلسفے سے جدا کرتا ہے۔ آج بھی سائنس نہیں جانتی کہ کس لئے حقائق کی جستجو میں ہے اور کس منزل مقصود تک پہنچنے کی خواہاں ہے ؟ اس بات سے بھی آگاہ نہیں کہ کہاں سے آئی اور کہاں جا رہی ہے؟ ایک ایسا ترازو ہے جس میں ہر چیز کو تولا جاسکتا ہے لیکن اگر پوچھیں کہ اس دوڑ دھوپ اور جستجو سے تیرا کیا مقصد ہے تو جواب دینے سے عاری ہے۔ جبکہ فلسفہ جواب دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ کس لئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے اور کس منزل کی جانب رواں دواں ہے۔ اگرچہ فلسفہ آغاز سے لے کر آج تک کسی ایک حقیقت کا سراغ بھی نہیں لگا سکا۔
جو تعریف امام جعفر صادقؑ سائنس و فلسفہ کی بیان فرماتے ہیں اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انسان سائنس کی نسبت فلسفہ کی قدروقیمت کا زیادہ قائل رہا ہے۔ کیونکہ آپ کے بقول سائنس زمانے کی حقیقت کو مدنظر نہیں رکھ سکتی جبکہ فلسفہ اس حقیقت کو مدنظر رکھتا ہے۔
یہ حقیقت خداوند تعالیٰ کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔ کیونکہ جب فلسفیانہ مراحل طے ہوگئے تو فلسفہ

اس مرحلے میں داخل ہوتا ہے جہاں اس کے جاننے کی ضرورت ہے کہ خداوند تعالیٰ کون ہے' اس کے تخلیق کرنے کا مقصد کیا ہے اور اس خلقت کا آخری نتیجہ کیا ہوگا ؟

پس جیسا کہ ہم آج فلسفہ کو سمجھتے ہیں وہ یہ ہے کہ فلسفہ امام جعفر صادقؑ کی نظر میں خداوند تعالیٰ کی طرف راہنمائی کرتا ہے جبکہ سائنس اس طرح کی رہنمائی نہیں کرتی۔ پس اگر سائنس کے عمومی معنی ہی مراد لیں یعنی دانائی' تو اس صورت میں سائنس فلسفہ میں بھی شامل ہوجاتی ہے۔

یہاں اس نکتے کا ذکر ضروری ہے کہ امام جعفر صادقؑ جو توحید پرست اور ایک مذہبی پیشوا تھے' خداوند تعالیٰ کی معرفت کو مذہب کے ذریعے جائز سمجھتے تھے نہ کہ فلسفے کے ذریعے۔

ہمیں معلوم ہے کہ پہلی صدی ہجری میں مذہب اسلام میں فلسفے کا وجود نہ تھا۔ بعد میں آنے والے زمانوں میں بھی فلسفہ ہرگز دین اسلام کے اصول و فروع کا جزو نہیں بنا لیکن علماء نے کوشش کی کہ دین اسلام' اصول و فروع کو فلسفے کے ساتھ مطابقت دیں اور اس سے دین کے اصول و فروع کی تعریف کے لئے مدد لیں۔

یہ اقدام دوسری صدی ہجری کے اوائل سے شروع ہوا اور جن لوگوں کو فلسفے میں دسترس حاصل تھی انہوں نے دین کے اصول و فروع کی تعریف کے لئے فلسفہ کی مدد حاصل کرنے کی جانب توجہ دی اور اس موضوع نے اس بات کی نشاندہی کی کہ مسلمان پہلے صدی ہجری سے زیادہ روشن فکر ہوگئے تھے کیونکہ پہلی صدی ہجری میں کسی نے فلسفے کو دین اسلام کے اصول و فروع پر منطبق کرنے کی جانب توجہ نہیں دی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عرب مسلمانوں کی دوسری اقوام سے آمیزش نے مسلمانوں کو احکام دین کی فلسفے کے نقطہ نگاہ سے تعریف کرنے کی فکر دلائی۔ وہ اسلامی دانشور جنہوں نے دوسری صدی ہجری کے آغاز سے فلسفہ کی دین کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کی جانب توجہ دلائی تاکہ وہ فلسفہ سے اسلام کے اصول و فروع کی تعریف و توجہ کے لئے مدد حاصل کریں انہیں متکلمین کے نام سے پکارا گیا اور ان کے علم کو علم الکلام کہا گیا اور اسلام میں علم کلام کے معنی فلسفے کی دین کے ساتھ تطبیق ہے۔

عیسائیوں نے فلسفے کی دین پر تطبیق مسلمانوں سے سیکھی اور صلیبی جنگیں جو تقریباً دو سو سال جاری رہیں اور مسلمان دانشوروں کی کتابوں سے لاطینی زبان میں تراجم نے یورپی لوگوں کو فلسفے کو عیسائیت کے ساتھ تطبیق کی جانب توجہ دلائی۔ اگر صلیبی جنگیں نہ چھڑتیں تو شاید یورپی سترہویں صدی عیسوی تک مسلمانوں کے علوم سے بے خبر رہتے۔ جس طرح مشرقی سبزیوں اور پھلوں کی وہ اقسام جو اس سے پہلے یورپ میں کاشت نہیں ہوتی تھیں اس براعظم میں کاشت نہ ہوئیں۔

بعض یورپی دانشوروں نے مسلمان دانشوروں کی کتابوں کے تراجم پڑھنے کے بعد بہت کوشش کی کہ فلسفے کو مسیحؑ کی تعلیمات پر منطبق کریں اور آج ہم بلاشک و شبہ کہہ سکتے ہیں کہ عقیدے کے لحاظ سے جسم اور روح کی

دوئی مسلمان متکلمین سے لی گئی ہے۔

جن لوگوں نے فلسفہ کو مذہب پر منطبق کرنا مسلمانوں سے سیکھا ہے ان میں ایک فرانسیسی مالبرانش بھی ہے جو ۱۶۳۸ء میں پیدا ہوا اور ۱۷۱۵ء میں فوت ہوا۔ یہ شخص جس نے مسلمانوں سے رہنمائی حاصل کی۔ کارتزیان (۱۱۷) کے فلسفے کا حامی تھا۔

ڈکارٹ کا فلسفہ یورپ میں اتنی تیزی سے پھیلا کہ ۱۶۵۰ء جو ڈکارٹ کا سال وفات ہے تک ڈکارٹ کا فلسفہ تمام یورپی ممالک میں ایک قابل احترام مکتب کی حیثیت اختیار کرگیا تھا۔

ڈکارٹ کے فلسفی مکتب کی بنیاد اس پر تھی کہ تمام چیزوں کو شک کی نگاہ سے دیکھنا چاہئے۔ ڈکارٹ کہتا تھا (کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس میں شک نہیں کیا جاسکتا' اگر کوئی ہے تو وہ خود شک ہے) ظاہر ہے کہ جو شخص چیزوں کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہو حضرت عیسیٰ کے آئین اور خداوند تعالیٰ کے وجود کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھتا ہوگا۔ ہم یہ وضاحت اس لئے کر رہے ہیں تاکہ معلوم ہوجائے کہ مسلمانوں میں متکلمین کے نظریات کس قدر موثر تھے کہ مالبرانش جیسا شخص جو ڈکارٹ کے فلسفی مکتب کا مرید تھا اس سے متاثر ہوا۔

کارتزیان کے فلسفی مکتب کو وجود میں لانے کے لحاظ سے ڈکارٹ اتنا مشہور ہے کہ لوگوں کو گمان بھی نہیں کہ وہ ایک فلسفی نہیں تھا بلکہ ریاضی دان اور فوج کا افسر تھا۔ ڈکارٹ نے ریاضی اور روشنی پر تحقیق کے بارے میں چند قوانین وضع کئے جن کا نام اس کے نام پر کارتزیان کے قوانین ہے۔ لیکن ماہرین کے علاوہ کسی اور کو ان قوانین کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں۔ فلسفے میں ڈکارٹ کی شہرت اتنی زیادہ ہے کہ علم ریاضی اور روشنی کا مطالعہ اس کے سامنے ماند پڑچکا ہے۔ ڈکارٹ کی وفات کے وقت اس کے فلسفی مکتب کا مرید مالبرانش بارہ سال کا تھا۔ وہ جونہی بلوغت کو پہنچا ڈکارٹ کے فلسفی نظریہ نے اس پر گہرا اثر ڈالا اور اس کی کتابوں میں سے ایک جس کا نام "حقیقت کی جستجو" ہے ڈکارٹ کے فلسفے کی تحقیق کی روشنی سے متعلق لکھی گئی ہے۔ چونکہ مالبرانش ڈکارٹ کے فلسفی مکتب کا پیروکار تھا اسے فلسفے کو دین عیسیٰ پر تطبیق کرنا چاہئے تھا لیکن اس کی روش سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ مسلمان متکلمین کے نظریات سے متاثر ہے۔

مسلمان متکلمین نے فلسفے کی دین اسلام کے اصول و فروع پر تطبیق کی۔ انہوں نے اسلامی احکام کے مطابق جسم اور روح کا عقیدہ پیدا کیا۔ جسم کو فانی اور روح کو جاوید اور باقی قرار دیا۔ ان کے عقیدے کے مطابق انسانی زندگی کے دوران جسم اور روح آپس میں وابستہ ہیں لیکن جب انسان مرجاتا ہے تو روح اور جسم کا پیوند ٹوٹ جاتا ہے۔ جسم ختم ہوجاتا ہے لیکن روح باقی رہتی ہے۔ روح ان تمام خصوصیات کی حامل ہوتی ہے جو روح اور جسم کی وابستگی کے دوران پائی جاتی ہیں۔ اسی بنا پر روح باقی اور جاوید ہے اور ہر حیثیت سے ایک انسان اور انسانی شعور کی حامل ہے۔ اکیلی روح کے ادراک اور اس کے اس وقت کے ادراک جب وہ جسم سے وابستہ تھی' میں کوئی

فرق نہیں ہے، مگر صرف اتنا ہے کہ بعد میں وہ خوراک اور پوشاک کی محتاج نہیں رہتی۔ یہاں توجہ طلب بات یہ ہے کہ مسلمان متکلمین کے درمیان بھی عقیدے کا فرق پایا جاتا ہے۔ اگر یہ فرق نہ ہوتا تو غیر معمولی بات تھی۔ چونکہ جب کچھ فلسفی سینکڑوں سال کی طویل مدت کے دوران فلسفے کو دین کے اصول و فروع پر منطبق کرتے ہیں تو ان کے درمیان فرق پیدا ہوجاتا ہے کیونکہ ہر فلسفی اپنی سوچ کے مطابق فلسفے کو اسلام کے اصول و فروع پر منطبق کرتا ہے۔ لہذا بعض متکلمین کے بقول روح اگرچہ باقی اور جاوید ہے لیکن جس دوران یہ جسم سے وابستہ ہوتی ہے اس دوران اس میں ادراک کی صلاحیت نہیں ہوتی۔

ان کا کہنا ہے کہ انسان کی موت کے بعد روح انسان کی زندگی کے دور کے ادراکات یا محسوسات کی حامل ہے۔ ان کے بقول اگر روح اس دنیا کے ادراکات کی حامل نہیں ہوگی تو روز جزا حساب کے لئے کیسے تیار ہوگی ؟ لہذا یہ لازمی بات ہے کہ روح موت کے بعد اس دنیا کے ادراکات کی حامل ہوگی۔ تمام مسلمان متکلمین جنہوں نے فلسفے کو دین اسلام پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے انہوں نے یہ کوشش بھی کی ہے کہ ان کی تطبیق ایسی ہو جس سے دین اسلام کے اصول کا انکار نہ ہو۔ چونکہ اسلام کے اصول میں سے ایک قیامت بھی ہے لہذا تمام مسلمان متکلمین نے موت کے بعد روح کی بقا کو تسلیم کیا ہے کیونکہ فلسفیانہ نقطہ نگاہ سے معاد یا آخرت کو تسلیم کرنے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ روح کی بقا ہے۔

ہم یہاں اس بات کا اعادہ کرتے ہیں کہ فلسفیانہ نقطہ نگاہ سے آخرت کو اس وقت تک تسلیم نہیں کیا جاسکتا جب تک روح کی بقا کو تسلیم نہ کیا جائے۔ لیکن مذہب اسلام کی رو سے ممکن ہے کہ روح کی بقا کے بغیر بھی قیامت کا وجود تسلیم کیا جائے۔ ایک مسلمان جو فلسفے سے بے خبر ہے اس کا ایمان ہے کہ اگرچہ انسان مرنے کے بعد فنا ہوجاتا ہے اور اس کی کوئی چیز باقی نہیں رہتی لیکن خداوند تعالیٰ روز جزا کو اسے اس دنیا والی شکل اور جسم کے ساتھ اٹھائے گا تاکہ وہ حساب دے۔ لیکن فلسفی، روز جزا کو انسان کے موجودہ شکل و صورت میں زندہ ہونے کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے موت کے بعد انسانی جسم کا ڈھانچہ خراب ہوجاتا ہے اور ہڈیاں ختم ہوجاتی ہیں اور مضبوط سے مضبوط ہڈیاں بھی ایک دن خاک میں مل جاتی ہیں۔ ہوائیں اور سیلاب انسانی جسم کے ذرات کو دنیا کے اطراف میں بکھیر دیتے ہیں۔ فلسفہ اس بات کو قبول نہیں کرتا کہ وہ بکھرے ہوئے ذرات جن کی ماہیت مکمل طور پر تبدیل ہوچکی ہو ایک لمحہ میں ایک جگہ اکٹھے ہوکر اسی شکل و صورت کے انسان کا روپ دھار لیں جو اس دنیا میں موجود ہے لیکن فلسفہ روح کی بقا کو تسلیم کرتا ہے۔

مسلمان اہل کلام جو فلسفہ کو دین اسلام پر منطبق کرتے ہیں کا کہنا ہے کہ جو چیز انسان سے باقی رہتی ہے وہ روح ہے اور معاد روح کی بقا کے ہمراہ ہی ممکن ہے۔ یعنی چونکہ روح باقی ہے لہذا معاد وقوع پذیر ہوسکتی ہے۔

اہل کلام حضرات نے فلسفہ کو دین اسلام پر منطبق کرتے ہوئے اصول دین سے منحرف ہونے سے بچنے کے

لئے روح کی بقا کو تسلیم کیا ہے تاکہ فلسفیانہ نقطہ نظر (نہ کہ مذہبی) سے آخرت یا معاد کا امکان موجود ہو۔ جو اہل کلام فلسفے کو دین اسلام پر اس طرح تطبیق نہیں کرسکے کہ اصول دین باقی رہے ان پر مرتد ہونے کا فتویٰ لگادیا گیا اور مسلمانوں نے انہیں مرتد کافر سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ جو کوئی متکلم فلسفے کو دین اسلام پر منطبق کرنے کی جانب توجہ کرے تو وہ ایک دشوار کام کو اپنے ہاتھ میں لیتا ہے کیونکہ یہ کام وقت طلب ہونے کے ساتھ ساتھ قدرے خطرناک بھی ہے۔ مختصر یہ کہ مسلمان اہل کلام حضرات کا عقیدہ تھا کہ آدمی جسم اور روح سے تشکیل پاتا ہے۔ جو پیوند جسم اور روح کو آپس میں جوڑتا اور پھر دونوں کو کام پر شرکت کے لئے آمادہ کرتا ہے وہ زندگی ہے۔ جب تک وہ پیوند باقی ہے آدمی زندہ ہے اور جونہی مذکورہ پیوند ٹوٹتا ہے انسان مرجاتا ہے۔ موت کے بعد جسم اور روح جدا ہوجاتے ہیں اور ہر ایک آزاد زندگی اختیار کرلیتا ہے لیکن جسم جلد بوسیدہ ہوکر ختم ہوجاتا ہے جبکہ روح باقی رہتی ہے۔

مسلمان روح کی بقا کا عقیدہ رکھنے کے لئے اپنے آپ کو اہل کلام علما کی مانند فلسفیانہ دلائل سے تھکاتے نہیں اور کہتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے روح مجھ سے مربوط امور میں سے ہے۔ چونکہ یہ خدا سے مربوط ہے لہٰذا یہ باقی اور جاوید ہے۔ اب فلسفے کی عیسیٰؑ کی تعلیمات پر تطبیق کے بارے میں مالبرانش کے کام پر نظر ڈالتے ہیں۔ مالبرانش جو ڈکارٹ کا مرید تھا اصولاً" اسے ہر چیز میں شک کرنا چاہئے تھا لیکن وہ مسلمان اہل کلام سکالرز کے نظریئے کے مطابق انسانی وجود کو روح اور جسم سے متشکل جانتا ہے اور اس بات کا معتقد ہے کہ جو پیوند جسم اور روح دونوں کے مشترکہ طور پر کام کرنے کا سبب ہے وہ زندگی ہے اور جب جسم اور روح کا پیوند ٹوٹ گیا تو ان دو میں سے ہر ایک آزاد زندگی پالیتے ہیں حتیٰ کہ جسم مکمل طور پر ختم ہوجاتا ہے۔

اسی ترتیب سے مالبرانش کی طرف سے عیسوی دین پر فلسفے کی تطبیق کا نتیجہ مسلمان اہل کلام کے فلسفے کی اسلام پر تطبیق ہے۔

## شک اور یقین امام صادقؑ کی نظر میں

جیسا کہ ہم نے ذکر کیا اس کے باوجود کہ امام جعفر صادقؑ فلسفے کو سائنس سے برتر مانتے ہیں انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ سائنس بعض جگہوں پر یقین تک پہنچاتی ہے لیکن فلسفہ ابھی تک شک سے باہر نہیں نکلا۔ آپ یہ نہیں فرماتے کہ سائنس ہمیشہ یقین تک پہنچاتی ہے بلکہ آپ فرماتے ہیں کہ سائنس بعض مقامات پر یقین تک پہنچاتی ہے لیکن فلسفہ اپنے وجود میں آنے کے دن سے لے کر اب تک شک سے باہر نہیں نکل سکا۔ فلسفے کے بارے میں امام جعفر صادقؑ کا فرمان درست ہے بشرطیکہ جو علوم فلسفے سے وجود میں آئے اور جن علوم نے انسان

کو بعض ایقان تک پہنچایا ہے انہیں غلطی سے فلسفہ نہ سمجھا جائے۔

جس دن سے یونان میں فلسفہ وجود میں آیا اس دن سے لے کر آج تک یہ بحث جاری ہے کہ یقین کیا ہے اور شک کیا ہے ؟ اور کیا بنی نوع انسان ایسے مقام تک پہنچ سکتی ہے جہاں وہ شک نہ کرے اور کیا شک اور یقین کے درمیان پایا جانے والا فرق ظاہری فرق نہیں ہے ؟

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ شک جہل سے عبارت ہے اور یہ بات درست ہے۔ ہم ریاضی کے کسی قاعدے کے نتیجے میں شک نہیں کرتے کیونکہ اس کے بارے میں ہمیں علم الیقین ہوتا ہے۔ البتہ نفسیات کے قاعدے کے نتیجے کے بارے میں شک کرتے ہیں کیونکہ اس کے متعلق ہمیں علم الیقین نہیں ہوتا۔

نفسیات کے قاعدے کا نتیجہ ریاضی کے قاعدے کے نتیجے کی مانند نہیں ہے کہ ہم اس کے بارے میں علم الیقین رکھیں (مثلاً" ۲ کو ۲ سے ضرب دی جائے تو چار ہوتے ہیں)۔

نفسیات کے قوانین کا مسئلہ اس قدر استثنائی ہے کہ یہ کہا جاسکتا ہے علم نفسیات حقیقی معنوں میں قوانین نہیں رکھتا' عادات و اطوار' طرز فکر اور سلیقے کے لحاظ سے ہر انسان انفرادی حیثیت کا حامل ہے۔ دو افراد ایسے نہیں مل سکتے جن کی عادات و اطوار' طرز فکر اور سلیقہ ایک دوسرے سے ملتا جلتا ہو۔ لہٰذا نفسیات کے متعلق ایسے قواعد وضع نہیں ہوسکتے جن کا اطلاق تمام افراد پر ہوسکے۔

لوگوں میں نسلی اور قومی فرق کے علاوہ ایک معاشرے میں لوگوں کے درمیان عادات و اطوار اور طرز فکر میں بھی بہت نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ اگر لوگوں کے ایک گروہ کے درمیان فکری مشابہت مشاہدہ کی جاتی ہے تو اس لئے کہ وہ اشخاص اپنی زندگی کی ضروریات کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ وہ ان افراد کی طرز زندگی اختیار کرکے ان کے ساتھ اپنے نظریہ اور سلیقے کی مطابقت پیدا کرلیتے ہیں جن کی پیروی سے ان کی زندگی کی ضروریات پوری ہوسکتی ہیں۔

ایک خاندان کے قریب ترین افراد مثلاً" باپ' بیٹا' ماں اور بیٹی میں شکل و صورت' طرز فکر اور سلیقے میں شباہت نہیں پائی جاتی۔

بیوی اور خاوند کے درمیان بھی عادات و اطوار اور طرز فکر اور سلیقے کی مشابہت نہیں پائی جاتی۔ حتی کہ عاشق اور معشوق میں بھی عادات و اطوار اور سوچ کے انداز کے لحاظ سے مشابہت نہیں پائی جاتی اور اسی وجہ سے عاشقوں کی آپ بیتی کا آغاز شیریں سے ہوتا ہے نہ کہ انجام' اگر داستان گو عاشقوں پر بیتی ہوئی داستان کے انجام کا ذکر نہ کریں اور صرف یہی کہیں کہ ان کی زندگی میں خوشی ہی خوشی تھی اور ان کے ہاں بہت سے بیٹے پیدا ہوئے اور پھر اگر داستان گو ان کے انجام کا بھی تذکرہ کرے تو سامع سمجھتا ہے کہ شروع میں وہ کچھ اور نظر آتے تھے اور آخر میں کچھ اور بن گئے یعنی عاشقوں کے آغاز اور انجام میں زمین اور آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں ایک فرانسیسی فلسفی برگسون جو بین الاقوامی شہرت کا حامل ہے کے بقول وحشی اور نیم وحشی اقوام پر نفسیات کے قواعد صادق آتے ہیں اور نیم وحشی اقوام پر وحشی اقوام کی نسبت یہ قواعد کم صادق آتے ہیں۔

برگسن کے بقول' وحشی اقوام میں لوگ ہر چیز کے بارے میں ایک جیسی سوچ رکھتے ہیں یعنی ان کی سوچ میں مشابہت پائی جاتی ہے۔ چونکہ ان کی معلومات اور مفادات کی حدود محدود ہوتی ہیں للذا ان کی سوچ مختلف نہیں ہو سکتی لیکن جونہی وہ ترقی کرتے ہیں اور نیم وحشی ہوجاتے ہیں تو ان کی معلومات میں اضافہ ہوجاتا ہے اور ان کے مفادات کی حد،، میں بھی وسعت آجاتی ہے۔

ایک ماہر نفسیات جب کسی قبیلے کے لئے نفسیات کے قواعد وضع کرتا ہے تو اسے یقین ہوسکتا ہے کہ یہ قواعد قبیلے کے تمام افراد کے لئے ہیں۔

لیکن ممکن ہے وہ ایک نیم وحشی قبیلے کے تمام افراد کے لئے مشترکہ قواعد وضع نہ کرسکے۔ بہرکیف ہم نفسیات کے سارے قواعد کا انکار نہیں کرتے بشرطیکہ ماہر نفسیات یہ دعوی نہ کرے کہ جو قواعد وہ وضع کر رہا ہے وہ تمام افراد کے لئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نفسیات کے قواعد لوگوں کے ایک گروہ پر تو صادق آسکتے ہیں لیکن نفسیات کا کوئی قاعدہ ایسا نہیں جو تمام انسانوں پر صادق آسکے۔

مثال کے طور پر نفسیات کے قواعد میں سے ایک قاعدہ لوگوں میں ترجیح کے نتائج ہیں۔ اس طرح کہ اگر ایک کارخانے میں مزدوروں کا ایک گروہ کام میں مشغول ہے اور ان کا کام کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے مساوی ہے لیکن ان میں سے کچھ مزدور دوسروں کی نسبت دوگنا مزدوری پاتے ہیں تو اس ترجیح کی وجہ سے اکثر مزدوروں کی کام سے لگن کم ہوجائے گی' کیونکہ وہ دیکھیں گے کہ جو مزدوری ان چند مزدوروں کو ملتی ہے اس پر ان کا حق نہیں بنتا۔ ہم تصور کرتے ہیں کہ ترجیح کے اثرات تمام معاشروں میں ایک جیسے ہیں اور یہ نفسیات کا وہ قاعدہ ہے جو ہر جگہ صادق آتا ہے۔ جبکہ ایسے معاشرے ہو گزرے ہیں اور آج بھی موجود ہیں جن پر ترجیح اثرانداز نہ ہوتی ہو۔

انگریز مصنف ایچ جی ویلز جو ۱۹۴۶ء میں ۷۹ سال کی عمر میں فوت ہوا۔ لوگ اسے "جہانوں کی جنگ" اور "زمانے کی مشین" کے مصنف کے نام سے پہچانتے ہیں۔ ویلز نے تقریباً" ایک سو ساٹھ کتابیں مختلف موضوعات کے بارے میں لکھی ہیں' اپنی کتاب "سیاحت نامہ" میں لکھتا ہے۔ ہندوستان کے شہر امرتسر میں انگریزوں کی طرف سے ایک کارخانہ چلایا گیا تھا (اس زمانے میں ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت تھی) جس کے کچھ مزدوروں کو دوسرے مزدوروں سے زیادہ اجرت ملتی تھی جبکہ نہ تو ان کے کام کے گھنٹے ان سے زیادہ تھے اور نہ دوسروں سے زیادہ ماہر تھے۔ ان کا کام کیفیت اور کمیت کے لحاظ سے ایک جیسا تھا۔ لیکن وہ لوگ جو اضافی تنخواہ

سے محروم تھے وہ اس پر مکمل طور پر راضی تھے اور ان میں زیادہ اجرت پانے والے سے کوئی حسد نہیں پایا جاتا تھا۔ وہ کہتے تھے ہر کوئی اپنی قسمت لیتا ہے۔ اگر اس کی قسمت میں دوسرے سے کم حصہ لکھا ہو تو اسے دوسروں سے حسد نہیں کرنا چاہئے۔

ممکن ہے اس طرح کی سوچ کو کوتاہ اندیشی کا نام دیا جائے لیکن اگر لوگوں کے درمیان عادات و اطوار اور سوچ کا فرق نہ ہو تو ہم کبھی نہیں کہہ سکتے کہ نفسیات کے قواعد تمام لوگوں پر لاگو نہیں ہوسکتے۔ یہ عادات و اطوار اور سوچ کا فرق ہے جس کی وجہ سے ہم کہتے ہیں کبھی ہزار افراد کے درمیان بھی نفسیات کا ایک قاعدہ لاگو نہیں ہوسکتا۔

مثال کے طور پر علم الجمال ہے لاطینی میں اسے اسٹھ ٹیک کہا جاتا ہے۔ اس علم میں خوبصورتی کی پہچان کے لئے کچھ قواعد وضع کئے گئے ہیں لیکن تمام یورپی اقوام ان قواعد سے متفق نہیں ہیں چہ جائیکہ دوسری قومیں ان سے متفق ہوں۔ یورپی لوگوں میں کچھ علم الجمال کے ماہر ایسے ہیں جو جنوبی سوڈان میں بسنے والے بلند قامت لوگوں کو دنیا کے خوبصورت ترین افراد قرار دیتے ہیں۔

ایک امریکی سیاح انتھونی ہل نیوگنی کے قبائل کے بارے میں اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ وہاں پر کومپا نامی ایک قبیلہ ہے جس کے مرد ایک طرح کا رقص کرتے ہوئے ایک اژدہا سے کھیلتے ہیں اور وہ اژدھا رقاص کے سر کو اپنے منہ میں ڈال کر نگلنا چاہتا ہے اور رقاص نے اپنے آپ کو اس کا لقمہ بننے سے بچانا ہوتا ہے۔ یہ اژدہا جس کا نام بوآ ہے دنیا کا سب سے لمبا سخت ترین سانپ ہے۔ اگرچہ زہریلا نہیں ہوتا لیکن اگر کمر کے گرد لپٹ جائے تو کمر کی اوپری ہڈیوں کو پیس کر رکھ دے۔ رقاص کو جسمانی طور پر طاقتور ہونے کے علاوہ ایک عرصے تک اس قسم کے سانپوں کے ساتھ مشق کرنا ہوتی ہے تاکہ رقص کے دوران اپنے آپ کو اس سانپ سے بچاسکے۔ یہ لوگ پہلے چھوٹی اقسام اور پھر آہستہ آہستہ اپنی مشق کے لئے بڑے سانپوں کا انتخاب کرتے ہیں تاکہ قبیلے کے جشن میں بڑے سانپ کے ساتھ رقص کرسکیں۔

اس قبیلے کے مرد اور عورتیں اپنے آپ کو دنیا کے خوبصورت ترین افراد خیال کرتے ہیں اور یورپی خوبصورت سفید فام لوگوں کو اچھا خیال نہیں کرتے۔ امریکی سیاح انتھونی ہل کے بقول کومپا کا یہ یقین کہ وہ دنیا کے خوبصورت ترین لوگ ہیں اس قدر دوٹوک اور پختہ ہے کہ گمان بھی نہیں کیا جاسکتا کہ انہیں اس زمانے میں کوئی قائل کرسکے کہ دنیا میں ایسی اقوام ہیں جو خوبصورتی میں ان کی برابری کرسکتی ہیں چہ جائیکہ انہیں یہ کہا جائے کہ ان سے زیادہ خوبصورت اقوام موجود ہیں۔

اگر ایک فرانسیسی سے پوچھا جائے کہ دنیا میں خوبصورت ترین کیا چیز ہے تو وہ بیدھڑک جواب دے گا' ایفل ٹاور (۱۱۸) ۔ یہی سوال اگر اٹلی کے کسی شخص سے کریں تو وہ کہے گا کہ اٹلی میں نیپلز کی بندرگاہ کا علاقہ۔

جب دوسرے جانداروں اور چیزوں کی خوبصورتی کے بارے انسان کا نظریہ اتنا مختلف ہو تو علم الجمال کے عام قواعد جو ہر حیثیت سے مکمل ہوں کیسے وضع ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ریاضی کے قواعد اور ہر وہ قاعدہ جو اس زمرے میں آتا ہے پہلے زمانے میں اس پر یقین نہیں کیا جاتا تھا کہ وہ علم الیقین تک پہنچ سکتا ہے۔ امام جعفر صادقؑ کی نظر میں جس چیز کے علم الیقین ہونے میں کوئی شک نہیں وہ دین اسلام کے اصول ہیں جو سارے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ آپ کا عقیدہ ہے کہ خدا ایک اور دنیا کا خالق و محافظ ہے اور دنیا کو اپنے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق چلا رہا ہے۔ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ جو لوگ خدا کے وجود کا انکار کرتے ہیں نادان ہیں اور ایسے نادان ہیں گویا جاہل مطلق ہیں۔

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں وہ گونگے اور بہرے ہیں کہ نہ تو کوئی چیز دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی سن سکتے ہیں۔ چونکہ دیکھنے اور سننے کی صلاحیت سے محروم ہیں لہٰذا نہ خود اپنی عقل کو خالق کے وجود کی معرفت حاصل کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں اور نہ دوسروں کی راہنمائی کے ذریعے خداوند تعالیٰ کی معرفت سے بہرہ مند ہو سکتے ہیں۔ ان کی زندگی کھانے، سونے اور دوسری حیوانی خواہشات تک محدود ہوتی ہے۔ ان کی زندگی کا اپنی حیوانی خواہشات کو تسکین پہنچانے کے علاوہ کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ اسی طرح ان کے دن اور رات گزرتے ہیں۔ ان کی زندگی میں ہرگز یہ سوچ پیدا نہیں ہوتی کہ وہ کسی چیز کو سمجھیں اور یہی لوگ ہیں جن کے بارے میں خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ حیوان یا ان سے بھی بدتر ہیں۔ وہ خدا کی جاندار اور اپنے سمیت بے جان مخلوق کا مشاہدہ نہیں کرتے تاکہ انہیں پتہ چلے کہ خداوند تعالیٰ نے مخلوق کو ایسی خصوصیات سے نوازا ہے جو صرف اس سے مربوط ہیں۔ یہ خصوصیات اس لئے پیدا کی گئی ہیں کہ وہ مخلوق باقی رہے۔ اگر درخت جاندار ہے تو وہ افزائش نسل کے ذریعے اپنی نسل کو ختم ہونے سے بچاتا ہے۔ خداوند تعالیٰ نے اپنے علم اور طاقت کے ذریعے ایسے جانور پیدا کئے ہیں جو گرمیوں کی گرم ترین حرارت کو گرم علاقوں اور صحراؤں میں برداشت کر لیتے ہیں اور انہیں کوئی تکلیف نہیں ہوتی اور سرد علاقوں میں رہنے والے ایسے جانور پیدا کئے ہیں جو خداوند تعالیٰ کے علم اور قدرت سے سردیوں کے تمام عرصے کے دوران سوتے رہتے ہیں اور بھوکے پیاسے بھی نہیں ہوتے۔ اس طویل خوابیدگی کے عرصے میں وہ کمزور بھی نہیں ہوتے۔ موسم سرما میں سرد علاقوں کے وہ جانور جو چھ یا سات ماہ سوتے ہیں، ان میں سے بعض کا دل گرمیوں کے موسم میں معمول کے مطابق دھڑکتا ہے لیکن یہی جانور جب سردیوں میں چھ سات مہینوں کے لئے سو جاتے ہیں تو ان کا دل ساٹھ ستر مرتبہ فی گھنٹہ سے زیادہ نہیں دھڑکتا۔

یہی جانور موسم گرما میں جب جاگ رہے ہوتے ہیں تو دو ہزار چار سو یا دو ہزار پانچ سو مرتبہ فی گھنٹہ کے حساب سے سانس لیتے ہیں۔ لیکن جب سردیوں کے موسم میں سوتے ہیں تو ان کا سینہ پچیس مرتبہ فی گھنٹہ سے زیادہ نہیں چلتا۔ اگر کوئی ان جانوروں کی خوابیدگی کے موقع پر ان کے قریب جائے اور ان کے جسم پر ہاتھ رکھے

تو شدید سردی کا احساس کرتا ہے۔ ان کی سردی برف کی مانند معلوم ہوتی ہے۔ بہرکیف وہ جانور زندہ ہوتے ہیں اور کئی کئی مہینے زندہ رہتے ہیں یہاں تک کہ سردیاں ختم ہوکر بہار شروع ہوجاتی ہے لیکن اگر انسانی جسم کا درجہ حرارت عام درجہ حرارت (۱۴۰) کا آدھا ہوجائے تو آدمی مرجائے گا۔

یہ خداوندتعالیٰ ہی ہے جس نے سرد علاقوں میں پائے جانے والے جانوروں کو چھ یا سات ماہ سونے کی صلاحیت بخشی ہے اور ان کے جسم کی سردی برف کی مانند ہوجاتی ہے اور پھر بھی وہ زندہ رہتے ہیں۔ لیکن ایک بیوقوف جاہل مطلق اور نابینا و بہرہ ہے کہ خداوندتعالیٰ کی اس قدرت کا مشاہدہ نہیں کرتا اور چونکہ وہ سننے کی طاقت نہیں رکھتا لہٰذا وہ دوسروں سے خدا کی ان نشانیوں اور قدرت کے بارے میں نہیں سن سکتا۔ (۱۴۱)

سرد علاقوں کے ان جانوروں کے مقابلے میں خداوندتعالیٰ نے اونٹ جیسا گرم علاقوں کا جانور پیدا کیا ہے جو بیابانوں میں زندگی گزارتا ہے۔ اس کی غذا سخت اور خشک کانٹے ہوتے ہیں۔ گھاس کھانے والا جانور اگر خشک گھاس کھائے اور اسے پینے کے لئے پانی بھی نہ ملے تو وہ ہلاک ہوجائے گا۔ اونٹ ایسا جانور ہے جو بیابان سے خشک کانٹے کھاتا ہے لیکن اسے پیاس نہیں لگتی یہاں تک کہ وہ اپنے سوار کو وہاں تک پہنچا دیتا ہے جہاں پانی ہوتا ہے۔

ایک بے شعور شخص نہیں جانتا کہ خداوندتعالیٰ نے اپنے علم اور قدرت سے اونٹ کو ایسی صلاحیت بخشی ہے کہ وہ بیابانوں میں بھی تھکاوٹ اور پیاس کا احساس نہیں کرتا۔ اگر اونٹ پر سوار شخص بیابان میں راستہ گم کردے اور وہ بھی کڑکتی دھوپ اور پیاس کا عالم ہو تو اس صورت میں اگر اونٹ پر سوار شخص مہار ڈھیلی چھوڑ دے اور اونٹ کو دائیں یا بائیں نہ موڑے تو اونٹ اسے پانی تک پہنچا دے گا کیونکہ اونٹ پانی کی نمی کو دور دراز سے محسوس کرلیتا ہے اور سمجھ جاتا ہے کہ پانی کا چشمہ کہاں ہے؟ اونٹ میں پانی کی نمی کو محسوس کرنے کی صلاحیت اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ وہ بڑے بڑے کنوؤں سے خارج ہونے والی نمی کو دور دراز سے محسوس کرلیتا ہے اور اگر اس کے تھکے ماندے سوار میں صبر ہو تو اسے کنوئیں تک پہنچا دیتا ہے۔ لیکن انسان دور سے پانی کی موجودگی کا اس وقت تک پتہ نہیں چلاسکتا جب تک وہ پانی کے چشمے کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لے۔

یہ توانائی جو انسان میں نہیں اونٹ میں پائی جاتی ہے' خدا نے اپنے علم اور قدرت سے اس جانور کو ودیعت کی ہے تاکہ جب وہ گرم بیابانوں میں پیاسا ہو تو اپنے آپ کو پانی تک پہنچا کر سیراب ہوسکے۔ اگر اونٹ کو صحرا میں چرنے کے لئے کھلا چھوڑ دیا جائے تو وہ ہرگز پیاسا نہیں ہوتا۔ جو چیز اس کو پیاسا کرتی ہے وہ انسان کا اس پر سامان لادنا یا سوار ہونا اور اسے بیابانوں میں سفر کرانا ہے ورنہ آزاد حالت میں وہ جانتا ہے کہ کون سی جگہ پانی کے نزدیک ہے جہاں اسے چرنا چاہئے۔ اگر وہ اپنے سوار کا فرمان بردار ہو اور اسے سمجھ میں آئے کہ اس نے اپنے سوار کے ساتھ بے آب و گیاہ بیابان میں ایک لمبا سفر کرنا ہے جس میں ممکن ہے کئی دن بغیر پانی پیئے سفر کرنا پڑے

تو وہ احتیاطاً" اس قدر پانی پی لیتا ہے جو اس کے لئے کافی ہو۔

خداوند عالم نے اونٹ کو یہ استعداد اپنے علم و قدرت سے عطا کی ہے تاکہ وہ گرم اور خشک صحراؤں میں زندہ رہ سکے اور اس کی نسل پانی کی قلت اور پیاس کی وجہ سے ختم نہ ہو۔ لیکن ایک نادان یہ بات نہیں سمجھ سکتا۔ وہ خیال کرتا ہے کہ اونٹ خود بخود پیدا ہو کر ان صلاحیتوں کا حامل ہو گیا ہے۔ امام جعفر صادقؑ کے نظریہ کے مطابق جب تک کوئی جہل مرکب میں گرفتار نہیں ہو گا وہ خداوند تعالیٰ کا انکار نہیں کرے گا اور جو کوئی عقل رکھتا ہو اور دانا ہو اگرچہ اس کی دانائی ایک حد تک ہی محدود کیوں نہ ہو وہ سمجھتا ہے کہ خداوند تعالیٰ کے وجود میں شک جائز نہیں ہے۔

امام جعفر صادقؑ نے ساڑھے بارہ سو سال پہلے دنیا کے نظام کے بارے میں وہ بات کہی ہے جو موجودہ زمانے کے ماہرین طبیعیات کے نظریئے سے ذرا بھی مختلف نہیں ہے۔امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔ جب آپ دنیا کے حالات میں بدنظمی پائیں اور مشاہدہ کریں کہ اچانک طوفان آگیا ہے' سیلاب آگیا ہے یا زلزلہ گھروں کو برباد کر رہا ہے تو ان باتوں کو آپ دنیا کی بدنظمی پر محمول نہ کریں اور اس بات سے آگاہ رہیں کہ یہ غیر متوقع واقعات ایک یا کئی مستقل اور ناقابل تغیر قواعد کی اطاعت کا نتیجہ ہیں۔ ان قواعد سے ثابت ہے کہ مذکورہ واقعات وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ آج ماہرین طبیعیات (یعنی وہ سائنس دان جو صرف ریاضی کے قواعد کی پیروی کرتے ہیں اور ان کے علاوہ دوسرے قواعد کا علم نہیں سمجھتے) اس بات کے قائل ہیں۔ امام جعفر صادقؑ اس لحاظ سے قابل احترام ہیں کہ انہوں نے ساڑھے بارہ سو سال پہلے یہ نظریہ پیش کیا تھا۔

ماہرین طبیعیات اور جیولوجسٹس کے بقول طوفان' زلزلہ اور آتش فشاں پہاڑوں کا پھٹنا غیر معمولی واقعات نہیں ہیں بلکہ فطری قوانین کے تابع ہیں اور زلزلہ ہماری نظر میں غیر معمولی اس لئے ہے کہ ہم اس کے قانون سے مطلع نہیں ہیں۔

بنی نوع انسان کی نظر میں ہزاروں سال کے دوران غیر متوقع واقعات میں ایک واقعہ آب و ہوا کی تبدیلی تھا انسان اسے دنیا میں بدنظمی سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ گرمیوں کے درمیان آب و ہوا فوراً" تبدیل نہیں ہونی چاہئے لیکن آج آب و ہوا کی تبدیلی انسان کی نظر میں غیر متوقع نہیں ہے اور دنیا کی بدنظمی سے عبارت نہیں کیونکہ انسان آب و ہوا کی تبدیلی کے قانون کو سمجھ چکا ہے۔ اگرچہ اس قانون کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکا لیکن پھر بھی وہ کرہ ارض کے گرد چکر لگانے والے مصنوعی سیاروں کی مدد سے آب و ہوا کی تبدیلی کی پیش گوئی کر لیتا ہے۔ (۱۳۲)

زلزلے کا وقوع پذیر ہونا اور آتش فشاں کا پھٹنا بھی آب و ہوا کی تبدیلی کی مانند ہے اور جس دن انسان ان دو کے قوانین سے آگاہی حاصل کر لے گا تو وہ یہ پیش گوئی کر سکے گا کہ زلزلہ کس جگہ اور کہاں پر آئے گا اور

کونسا آتش فشاں کس وقت لاوا اگلے گا۔

امام جعفر صادقؑ نے اپنے شاگردوں سے فرمایا کہ تم لوگوں کو دنیا میں جو بد نظمی نظر آتی ہے وہ دراصل ایک یا چند مستقل اور ناقابل تغیر قواعد کے تحت ہے۔ دنیا کے قواعد کے مستقل اور ناقابل تغیر ہونے کی تمام فلسفی تائید کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ تبدیلیاں جو انسان کو نظر آتی ہیں وہ صرف اس کی نظراور عقل کا دھوکہ ہے۔ جبکہ خداوندتعالیٰ کے نزدیک دنیا کی کسی چیز میں کوئی تبدیلی وجود میں نہیں آتی۔ خداوندتعالیٰ دانائے مطلق ہے اور اس نے جو قانون بنایا ہے وہ ابدی ہے۔ خدا کی معرفت رکھنے والے فلاسفہ کے نظریئے کی بنا پر جو تبدیلیاں بشری قوانین میں وجود میں آتی ہیں وہ انسان کی جہالت کی بنا پر وجود میں آتی ہیں۔ کیونکہ آدمی یہ پیش گوئی نہیں کرسکتا کہ پچاس سال بعد اس کی اجتماعی یا انفرادی حالت کیا ہوگی ؟ وہ قوانین کو صرف موجودہ زمانے کے لئے بناتا ہے اور جب پچاس سال بعد دنیا کے حالات بدلتے ہیں تو انسان بھی قوانین کو تبدیل کردیتا ہے۔ لیکن خداوندتعالیٰ نے کائنات کے تمام قوانین کو ایک لمحے میں اور ہمیشہ کے لئے وضع کیا ہے۔ چونکہ وہ دانا ہے لہٰذا اس نے ابد تک رونما ہونے والے تمام واقعات کی پیش گوئی کی ہے۔ وہ ایسے قوانین وضع کرتا ہے جن کو آئندہ پچاس سال کے بعد بھی تبدیل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اسے معلوم ہے کہ پچاس سال بعد کون کون سے واقعات رونما ہوں گے اور یہ کہ اس نے تمام پیغمبروں کو بھیجنے سے قبل پیش گوئی کرلی تھی اور اسے شروع ہی سے معلوم تھا کہ زمانے کے تقاضے کے مطابق کون سے پیغمبرکو کس دور میں بھیجے' نہ صرف خدا کی معرفت رکھنے والے فلسفی کائنات کے قوانین کو مستقل اور ناقابل تغیر جانتے ہیں بلکہ وہ فلسفی جو خدا پر ایمان نہیں رکھتے وہ بھی معتقد ہیں کہ دنیا کے قوانین ہیں۔ مسٹر لینک جو ایک لادین فلسفی تھا اور خدا کا معتقد نہ تھا اس کا کہنا تھا کہ دنیا اگر ایک مرتبہ ویران ہوجائے اور اربوں کہکشائیں جن میں سے ہر ایک اربوں سورج کی حامل ہے بھی تباہ ہو جائیں تو کائنات میں یہ تباہی بھی غیر متوقع نہیں بلکہ ایک خاص قانون کے تحت ہے اور جو کوئی اس قانون سے آگاہ ہو وہ پیش گوئی کرسکتا ہے کہ دنیا کس وقت ویران ہوجائے گی۔ گزشتہ زمانے میں امام جعفر صادقؑ کے علاوہ کسی نے بھی غور نہیں کیا کہ دنیا کے قوانین مستقل اور ناقابل تغیر ہیں۔ (۱۴۳)

ازمنہ قدیم میں عقیدہ تھا کہ جہان میں موجود ہر قانون تبدیل ہوتا ہے اور جب ارسطو آیا تو اس نے اس قدیم عقیدے کو اپنے فلسفہ کے زمرے میں شامل کرکے فلسفے کے قواعد کا حصہ بنا لیا۔ اس کے بعد دنیا کے قواعد میں تبدیلی ہر جگہ ایک ناقابل تردید حقیقت قرار پاگئی۔ ارسطو نے کہا دنیا دو چیزوں سے وجود میں آئی ہے ایک مادہ اور دوسری شکل' لیکن یہ دونوں ناقابل تقسیم ہیں اور ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتیں۔

یہاں تک ارسطو کا نظریہ اس بات کی نشاندہی نہیں کرتا کہ وہ دنیا کے قوانین میں تبدیلی کا معتقد ہے۔ لیکن اس کے بعد ارسطو اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ دنیا کے قوانین میں تبدیلی کا معتقد ہے کیونکہ اس کے بقول

شکل کو مادہ پر منطبق کرنے کے لئے ضروری ہے کہ شکل حرکت کرتی ہو اور اس میں تبدیلی واقع ہوتی ہو کیونکہ شکل کی حرکت اور تبدیلی کے بغیر اسے مادے پر منطبق نہیں کیا جاسکتا۔ چونکہ یہ حرکت اور تبدیلی موجود ہے لامحالہ دنیا کے قوانین بھی تبدیل ہوتے ہیں۔ (۱۴۴)

یہ نظریہ ارسطو کے دوسرے نظریات کی مانند سترہویں صدی کے عشرے تک علم کے ارکان میں سے تھا اور کوئی سائنس دان اس کا انکار کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ جس شخص نے ارسطو کے نظریات کو باطل قرار دیا وہ ڈکارٹ تھا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے جو ۱۶۵۰ء میں فوت ہوا۔ ارسطو کا استاد افلاطون تھا لیکن ہم دنیا کے قوانین کے بارے میں افلاطون کے نظریہ سے صحیح معنوں میں مطلع نہیں ہیں۔ (۱۴۵)

ہم جانتے ہیں کہ افلاطون کے نظریات آئندہ نسلوں کے لئے مکالمے کی صورت میں باقی ہیں اور ان میں دنیا کے قوانین میں تبدیلی کے متعلق کوئی اشارہ نہیں ہے۔ یہ موضوع افلاطون کے نظریات کی قدروقیمت کا باعث نہیں بنا جب تک انسانی تہذیب باقی ہے افلاطون کو قدیم زمانے کے عظیم مفکروں میں شمار کیا جائے گا۔ اس کے اسلوب بیان کی خوبصورتی جو انسانی تہذیب کے وجوب تک باقی رہے گی اسے خراج تحسین پیش کرتی رہے گی۔ افلاطون یونان کے اشراف میں سے نہ تھا جبکہ ارسطو کے باقی شاگردوں کا شمار اشراف میں سے ہوتا تھا۔ جس وقت افلاطون کہتا ہے کہ جب ایک قوم خوش بخت ہوجاتی ہے تو اس قوم کی خوشبختی میں اس کا فلسفی پیش پیش ہوتا ہے۔ اس سے اس کی مراد یہ ہے کہ اس قوم کو خوشبختی تک پہنچانے میں اس کا بڑا ہاتھ ہے۔

مختصر یہ کہ ڈکارٹ کے زمانے تک سائنس دانوں کا نظریہ یہ تھا کہ دنیا کے قوانین مستقل نہیں ہیں اور یہ تغیر پذیر ہیں۔ عام لوگوں کو اس سے کوئی واسطہ نہ تھا کہ وہ یہ جاننے کی کوشش کرتے کہ دنیا کے قوانین ثابت یا ناقابل تغیر یا تغیرپذیر ہیں۔ سترہویں صدی عیسوی کے بعد ستاروں کے بارے میں سائنس دانوں کی تحقیقات روزبروز بڑھتی گئیں۔ یاد رہے کہ ان تحقیقات کی ابتدا کرنے والے کوپرنیک اور کپلر تھے۔ ان کے بعد گلیلو اور نیوٹن نے ان میں خاطرخواہ اضافہ کیا۔ فلکیات کے ماہرین رفتہ رفتہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ کائنات اس سے کہیں بڑی ہے جس قدر قدماء کا تصور تھا۔ انیسویں صدی میں جب وہ ہماری کہکشاں سے آگے دوسری کہکشاؤں کو دریافت کرنے میں کامیاب ہوئے تو انہیں معلوم ہوا کہ ان کہکشاؤں میں سے ہرایک کے کئی کئی سورج ہیں۔ انہوں نے کہکشاؤں کو ان کے متعدد سورجوں کے ہمراہ دیکھا تو یہ نتیجہ اخذ کیا کہ گویا یہ کہکشائیں ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے کے لئے وجود میں آئی ہیں اور کائنات اس قدر بڑی اور مضبوط و مستقل قوانین کی حامل ہے کہ اگر کائنات میں ایک طرف ایک سورج تباہ ہوجائے تو سب سے قریب ترین ستاروں پر بھی اس کا کوئی ناخوشگوار اثر نہیں پڑے گا چہ جائیکہ دوردراز واقع ستاروں پر اثر انداز ہو۔ گویا دنیا پر لاگو قوانین مستقل ہیں اور بعض سورجوں کا تباہ ہونا قوانین کے تحت ہے۔

انیسویں صدی کے دوسرے نصف حصے اور بیسویں صدی کے پہلے نصف حصے میں بنی نوع انسان نے چھوٹی دنیا یعنی ذرے کی دنیا کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور معلوم کیا کہ ذرے کے اندر ایسے قوانین حکم فرما ہیں جو ہمیشہ لاگو رہتے ہیں۔ایٹم میں پایا جانے والا الیکٹران ہر تین کیٹریلین مرتبہ فی سیکنڈ کی رفتار سے ایٹم کے اردگرد چکر لگاتا رہتا ہے اور کوئی واقعہ اس گردش کو نہیں روکتا۔ (۱۴۶)

لوہے کے ایک ذرے میں الیکٹران ہر سیکنڈ میں تین کیٹریلین مرتبہ ایٹم کے مرکز کے گرد چکر لگاتا ہے۔ اگر لوہے کو پگھلایا جائے تو پھر بھی پگھلے ہوئے لوہے کے ایٹم کے الیکٹرانوں کی گردش تین کیٹریلین مرتبہ فی سیکنڈ ہوگی۔ حتی کہ اگر لوہے کو اس قدر گرم کیا جائے کہ وہ گیس میں تبدیل ہوجائے تو پھر بھی الیکٹران کی ایٹم کے مرکز کے اردگرد رفتار تین کیٹریلین مرتبہ فی سیکنڈ ہوگی۔

اس دائمی اور عجیب و غریب حرکت میں خلل ڈالنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ایٹم کی توڑپھوڑ کی جائے تو الیکٹران مرکز سے دور ہٹ جائے گا۔ لیکن اس صورت میں بھی الیکٹران کی حرکت ختم نہیں ہوگی بلکہ الیکٹران ایک دوسرے مرکز کے گرد گھومنا شروع کردے گا۔

جس قانون کے تحت الیکٹران تیزی سے ایٹم کے مرکزے کے اردگرد گھومتا ہے اس قانون کے تحت زمین سورج کے اردگرد چکر لگاتی ہے اور سورج ستاروں کے مجموعہ کے اردگرد جسے ہرکول (۱۴۷) کہا جاتا ہے چکر لگاتا ہے۔ یہ مجموعہ کہکشاں کے اردگرد اور کہکشاں کسی دوسری چیز کے اردگرد جس سے ہم آگاہ نہیں ہیں چکر لگاتی ہے کیونکہ کہکشاں کی حرکت عملی لحاظ سے ثابت ہوچکی ہے اور اجرام فلکی کی گردش کی مدت اس قدر طویل ہے کہ ستاروں کے مجموعے کو کہکشاں کے اردگرد ایک چکر کاٹنے کی مدت کو دیکھنے کے لئے ہمارے سورج کی عمر ناکافی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ علم فلکیات کی مانند کوئی ایسا علم نہیں ہے جس سے انسان خداوند تعالٰی کے وجود اور مستقل و ناقابل تغیر قوانین کی موجودگی کا قائل ہوسکے اور یہ بات صحیح بھی ہے۔

کہکشائیں جس چیز کے گرد گردش کر رہی ہیں وہ بھی کسی چیز کے گرد گھوم رہی ہوگی کیونکہ آج تک سائنس دانوں نے آسمان پر جو چیز بھی دریافت کی ہے وہ ضرور کسی دوسری چیز کے گرد گھوم رہی ہے۔ لہٰذا گمان یہ ہے کہ کہکشائیں جس چیز کے اردگرد گردش کر رہی ہیں وہ چیز ضرور کسی دوسری چیز کے اردگرد گردش کر رہی ہوگی۔

جس وقت زمین کی عمر کے بارے میں بات کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ زمین کی عمر اندازاً" پانچ ارب سال ہے تو ہمیں حیرانی ہوتی ہے اور یہ رقم ہمیں بہت بڑی نظر آتی ہے جبکہ نجومیوں کے حساب کے مطابق ایک کہکشاں کو اپنے مطاف کے اردگرد ایک چکر پورا کرنے میں ایک سال کا عرصہ لگتا ہے۔ کہاں ہیں وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ دنیا کی پیدائش کو دس ہزار سال ہوئے ہیں اور دنیا میں آدمؑ کی پیدائش کو چھ ہزار سال ہوچکے ہیں۔

کہکشاؤں کی اپنے مدار کے اردگرد گردش یہ ظاہر کرتی ہے کہ دنیا کی عمر اس سے کہیں زیادہ ہے جو اس صدی کے شروع میں خیال کی جاتی تھی کیونکہ اس صدی کے آغاز میں ابھی تک صرف کہکشاؤں کی گردش کی طرف متوجہ ہوئے تھے اور انہیں وسیع خلا میں ثابت ستارے خیال کیا جاتا تھا۔ اب فلکیات کے ماہرین اس بات کے قائل ہوچکے ہیں کہ کہکشائیں اپنی وضع کی مناسبت سے متحرک ہیں اور اپنے اردگرد بھی گردش کر رہی ہیں۔ کہکشاؤں کی اپنے مطاف کے اردگرد گردش کی مدت کی طوالت فرضی ہے نہ کہ علمی۔ کہکشاؤں کی اپنے مطاف کے اردگرد گردش کی مدت کا حساب لگانے کے لئے اس کے گھومنے کا مدار دریافت کرنا ہوگا اور یہ جاننا ہوگا کہ جس مدار میں کہکشاں اپنے مدار کے اردگرد چکر لگاتی ہے وہ کتنا وسیع ہے۔

اس مدار کا طول معلوم کرنے کے لئے مدار سے ایک قوس کھینچی جائے تاکہ جیومیٹری کے قواعد کے مطابق مدار کا قطر معلوم ہوسکے۔ اگر بنی نوع انسان مزید پانچ سو سال اس دنیا میں رہے تو بھی وہ کہکشاں کے مدار کی ایک قوس (یعنی دائرے کے قطر کے ایک جزو) کو حاصل نہیں کرسکتا چہ جائیکہ وہ اس کے ذریعے تمام مدار کا حساب لگائے۔ دنیا میں اس قدر کہکشائیں ہیں کہ آج تک ان کی تعداد معلوم نہیں ہوسکی اور صرف اندازاً" کہا جاتا ہے کہ دنیا میں ایک سو ارب کہکشائیں پائی جاتی ہیں۔ کوئی نجومی اس اندازے پر اعتماد نہیں کرتا۔ اس اعتماد نہ کرنے کے دو اسباب ہیں۔ پہلا یہ کہ ابھی تک عام ٹیلی سکوپس اور ریڈیو ٹیلی سکوپس کی دیکھنے کی طاقت اتنی نہیں ہے کہ بنی نوع انسان کائنات کی گہرائیوں کا اچھی طرح مشاہدہ کرسکے۔

آج کی دنیا کی سب سے بڑی ریڈیو ٹیلی سکوپ اجرام فلکی کو نوہزار ملین نوری سال فاصلے تک دیکھ سکتی ہے۔ اس کے دیکھنے کی طاقت نو ہزار ملین نوری سال سے زیادہ نہیں ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اگر ایک ریڈیو ٹیلی سکوپ بنائی جائے جس کے دیکھنے کی طاقت بیس ارب یا تمیں ارب نوری سال ہو تو ایسی کہکشاؤں کا پتہ لگایا جاسکتا ہے کہ جو ابھی تک دریافت نہیں ہوسکیں۔ دوسرے یہ کہ جو کہکشائیں آج ہم دیکھتے ہیں شاید دوسری کہکشاؤں کو دیکھنے میں حائل ہوں جو ان کے پیچھے واقع ہیں۔

جس وقت ضدمادہ کا وجود ثابت ہوا یہ نظریہ ایجاد ہوا کہ یہ جہان جو ایک سو ارب کہکشاؤں پر مشتمل ہے اس کے علاوہ دوسرا جہان بھی موجود ہے جس کی وسعت اس جہان کے مساوی ہے یا وہ اس سے بھی زیادہ وسیع ہے جس کی وسعت کا اندازہ آج نہیں لگایا جاسکتا' اس ہمزاد کی مانند کہ جس کے بارے میں قدماء کا عقیدہ تھا کہ ہر زندہ وجود کا ہمزاد ہوتا ہے' لیکن اس ہمزاد کا دیکھنا محال ہے۔ اسی طرح آج ضدمادہ کے وجوب کا تصور پیدا ہوگیا ہے' لیکن اس جہان کو ابھی تک کسی ذریعے سے محسوس نہیں کیا جاسکا۔ اس طرح ضدمادہ کی دنیا میں لاگو فزکس اور کیمیا کے قوانین کو بھی نہیں سمجھا جاسکتا کہ آیا وہ اس جہان کے قوانین کی مانند ہیں یا ان کی کوئی اور شکل ہے۔ سائنس دان ان کے متعلق صرف نظریات پیش کرتے ہیں جو علمی افسانوں کے مانند ہیں' اگرچہ علمی

افسانوں میں مذکور بعض نظریات علمی حقیقت کا روپ دھار گئے ہیں۔

مثال کے طور پر ایک انگریز مصنف رابرٹ کلارک جو علمی افسانوں کا مصنف تھا اس نے ۱۹۴۸ء میں ایک علمی افسانہ لکھا جس میں اس نے ایک ایسے سیارے کا ذکر کیا تھا جو لندن کے اوپر چھتیس ہزار کلومیٹر پر واقع تھا۔ چونکہ زمین کے اردگرد اس سیارے کی حرکت زمین کی چوبیس گھنٹوں کے دوران اپنی حرکت کے مساوی تھی لہٰذا اس کے باوجود کہ وہ سیارہ زمین کے اردگرد گردش بھی کر رہا تھاہمیشہ لندن کے اوپر واقع ہوتا تھا۔

۱۹۴۸ء میں سیاروں کو زمین کے مدار میں چھوڑنے اور ان سیاروں کی کرہ ارض کے اردگرد حرکت کا خیال صرف علمی افسانوں تک محدود تھا اور کسی بھی حکومت نے سیاروں کو خلا میں زمین کے اردگرد چکر لگانے کے لئے بھیجنے کے متعلق سوچا بھی نہ تھا۔

بہرکیف رابرٹ کلارک نے اپنے علمی افسانے میں اس مستقلاً" زمین کے اردگرد خلا میں چکر لگانے والے سیارے کا ذکر کرتے ہوئے کہا سیارہ زمین کے اوپر چھتیس ہزار کلومیٹربلندی پر واقع ہے۔ اس تاریخ کے دس سال بعد روسی حکومت نے ۱۹۵۷ء میں جیوفزکس کی سالگرہ کے موقع پر اس سال اکتوبر کے مہینے میں پہلا چاند جس کا وزن ۸۳ کلوگرام' چھ سو گرام تھا خلا میں بھیجا اور اس کا نام "اسپوت نیک" رکھا گیا۔

ابھی تک سائنس دان بڑے مصنوعی سیارے بنانے کی جانب متوجہ نہیں ہوئے تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک مصنوعی سیارے کو زمین سے چھتیس ہزار کلومیٹر کی بلندی پر خلا میں بھیج کر خلا کے ایک مقام کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ساکت کیاجاسکتا ہے۔ آج دنیا میں تین اقسام کے مصنوعی سیارے پائے جاتے ہیں اور یہ تینوں مسلسل زمین کے اردگرد گردش کرنے کے علاوہ خلا میں مستقل طور پر ایک ساکن مقام بھی رکھتے ہیں اور انہی ساکن سیاروں کی وجہ سے ٹیلیویژن کے ایک پروگرام کو کرہ ارض کے تمام باشندوں تک پہنچایا جاسکتا ہے۔ اس بڑی ایجاد کی پیش گوئی کو عملی مرحلہ میں داخل ہونے سے پہلےایک ایسے شخص نے پیش کیا اور اپنے علمی افسانے میں لکھا تھا جو کسی یونیورسٹی کا فارغ التحصیل نہ تھا۔ اس کے پاس صرف کالج کی سند کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

یہاں یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ رابرٹ کلارک نے تاریکی میں تیرپھینکا اور اتفاق سے وہ نشانے پر جا لگا۔

چونکہ اس نے چھتیس ہزار کلومیٹر کی رقم کے علاوہ اپنے سائنسی افسانے میں کچھ دوسری چیزوں کا بھی ذکر کیا ہے جنہیں آج کے ساکن مصنوعی سیاروں میں ٹیلی اسٹارز (۱۳۸) کا نام دیا گیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ٹیلی اسٹارز کے بنانے اور انہیں استعمال میں لانے کے لئے مذکورہ سائنس دانوں نے اس مصنف کے افسانے سے استفادہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خصوصاً" روس میں سائنسی افسانوں کو جہاں عوام جوش و خروش سے پڑھتے ہیں وہاں سائنس دان بھی ان سائنسی افسانوں کامطالعہ پورے انہماک سے کرتے ہیں۔ چونکہ یہ بات تجربہ سے ثابت ہوچکی ہے کہ ان میں دلچسپی سے پڑھے جانے والے ایسے افسانے بھی ہو سکتے ہیں جو عملی مرحلے میں داخل

ہوسکیں۔ سوویت یونین میں مصنوعی چاند کو خلا میں بھیجنے سے کئی سال پہلے اس کا ذکر سائنسی افسانوں میں آچکا تھا۔ اس ملک میں آج سائنسی افسانوں کے مصنفین کے لئے انعام مخصوص کیا گیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جو کچھ سائنسی افسانوں میں ضدمادہ دنیا کے متعلق لکھا جاتا ہے اسے مہمل نہیں سمجھنا چاہئے۔ ان افسانوں میں شاید ایسی سوچ پائی جاتی ہو جو حقیقت کے مطابق ہو۔ جبکہ ہمیں معلوم ہے کہ جو کچھ مصنفین اپنے سائنسی افسانوں میں ضدمادہ کے متعلق لکھتے ہیں وہ ان کی اپنی سوچ ہوتی ہے۔ بعض سابق فلاسفہ کہتے تھے کہ انسان کسی ایسی چیز کو اپنے ذہن میں مجسم نہیں کرسکتا جو دنیا میں موجود نہ ہو۔

مثال کے طور پر اگر انسان اپنے ذہن میں کسی ایسے جانور کو مجسم کرے جس کے ہزاروں سر ہوں تو اس فلسفی نظریہ کے مطابق یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ جانور دنیا کے کسی نہ کسی حصے میں موجود ہے جبکہ عقل کسی ایسے جانور کے وجود کو تسلیم نہیں کرتی جس کے دو سر ہوں۔ اس نظریہ کی بنا پر جو کچھ علمی افسانے لکھنے والے مصنفین ضدمادہ کے بارے میں لکھتے ہیں وہ موجود ہے۔ اگر یہ ضدمادہ اس دنیا میں نہ بھی ہو تو کوئی دوسری جگہ ہوگی جہاں یہ موجود ہوگا۔

فزکس، کیمسٹری کے اس نظریہ کی بنا پر ضدمادہ دنیا سائنسی افسانوں میں مذکور پائی جاتی ہے۔ اگرچہ ضدمادہ ہماری دنیا میں نہ سہی کسی دوسری جگہ پائی جاتی ہوگی۔ جو کچھ ہم سمجھتے ہیں وہ یہ ہے کہ وہ دنیا اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے جتنی وہ ریڈیو ٹیلی سکوپ کی ایجاد سے پہلے یعنی تیس سال قبل خیال کی جاتی تھی۔ اس بات کی تصدیق کرنا چاہئے کہ امام جعفرصادقؑ کا یہ فرمان کہ دنیامیں مستقل اور ناقابل تغیر قوانین لاگو ہیں درست ہے اور دو علم یعنی فزکس اور فلکیات دوسرے علوم سے زیادہ اس بات کی تائید کرتے ہیں۔ ہماری عقل کہتی ہے کہ اگر عظیم جہان میں مستقل اور ناقابل تغیر قوانین نہ ہوتے اور قوانین لحہ بہ لحہ تبدیل ہوتے رہتے تو دنیا باقی نہ رہتی۔

بیسویں صدی کی پہلی دہائی کے ماہرین طبیعیات میں ایک فرانسیسی شہزادہ ڈوبروی (۱۳۹) بھی ہے۔ اس شخص نے فزکس کے میدان میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں کہ سائنس دانوں کے لئے اس کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ یہ پہلا شخص ہے جس نے اس بات کی نشاندہی کی کہ الیکٹران شعاعوں کا جزو ہیں اور طبیعیات میں اسے ۱۹۲۹ء میں نوبل انعام سے نوازا گیا تھا۔ شہزادہ ڈوبروی فلسفی نہ تھا کہ اپنے عقلی تخیل کی بنا پر کوئی بات کہتا۔ وہ ایک طبیعیات دان شمار ہوتا تھا اور اس طرح کے افراد جب تک کسی بات کو ثابت نہ کرسکیں اس کے متعلق بات نہیں کرتے۔ اس نے کہا تھا کائنات میں ایک چیز تبدیل نہیں ہوتی اور وہ ہے قانون۔ اس کی مراد یہ ہے نہ فقط اس زمین پر اور نہ صرف اس نظام شمسی میں بلکہ تمام کائنات میں قدرت کے قوانین میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔ اس کے بقول اگر ایک دن ایسا آئے کہ بنی نوع انسان ایک ایسے ریڈیو ٹیلی ویژن کو ایجاد کرے جس کے ذریعے وہ زمین سے ایک سو ارب نوری فاصلے پر واقع اجرام فلکی کا بھی مشاہدہ کرسکے تو وہاں پر

بھی فطرت کے قوانین مستقل ہوں گے۔

اس بات کو سب تسلیم کرتے ہیں کہ جس چیز کا وجود نہیں ہے اس کو عقل نہیں مانتی اور جس چیز کو عقل نے تسلیم کرلیا یہ اس کی دلیل ہے کہ وہ موجود ہے۔ شہزادہ ڈوبروی یہ نہیں کہتا کہ فلاں قانون میں تبدیلی نہیں آئی بلکہ اس کے بقول قانون کے علاوہ کائنات میں ہر چیز تبدیل ہوتی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ کائنات نیست و نابود ہوجائے تو کیا اس پر حاکم قوانین باقی رہیں گے۔

لیکن یہاں یہ سوال وضاحت طلب ہے۔ کیونکہ فزکس کہتی ہے کہ کوئی چیز ختم نہیں ہوتی اور نہ ہی مٹتی ہے بلکہ اس میں صرف تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ لہٰذا دنیا ہرگز ختم نہیں ہوتی چہ جا نکہ اس پر حاکم قوانین کا خاتمہ ہو۔ بلکہ ممکن ہے کہ کائنات میں تبدیلی رونما ہو اور اس صورت میں وہ تبدیلی بھی کائنات کے ناقابل تغیر قوانین کے مطابق ہو۔ اس طرح اس دور کا ایک دوسرا عظیم نوبل انعام یافتہ ماہر طبیعیات امام جعفر صادقؑ کے اس فرمان کی تصدیق کرتا ہے کہ دنیا کے قواعد ثابت اور مستقل ہیں۔

## انسان اپنی عمر خود گھٹاتا ہے

امام جعفر صادقؑ کے توجہ طلب نظریات میں سے ایک نظریہ انسانی عمر کی طوالت کے متعلق ہے۔ آپ نے فرمایا انسان اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ دراز عمر گزارے۔ وہ خود اپنی عمر کو کم کرتا ہے۔ اگر انسان دین اسلام کے قوانین پر عمل کرے اور ممنوعہ چیزوں سے پرہیز کرے اور کھانے پینے میں قرآنی احکامات کے مطابق عمل کرے تو وہ لمبی عمر پائے گا۔ انسانی عمر کی لمبائی کا مسئلہ دو چیزوں سے وابستہ ہے۔ ایک صحت کا خیال رکھنا ہے اور دوسرا سیر ہوکر کھانے سے پرہیز کرنا۔

پہلی صدی عیسوی میں روی شہنشاہیت کے شہر روم میں لوگوں کی اوسط عمر بائیس سال تھی کیونکہ رومی شہنشاہیت میں صحت کے قوانین کا لحاظ نہیں رکھا جاتا تھا۔ روم کے اشراف اس قدر غذا کھاتے تھے کہ قے کرنے لگتے اور عام لوگ جہاں تک ہوسکتا غذا کھانے میں اشراف کی روش کی پیروی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے۔ روم کے اشراف کے محلوں میں ڈائننگ ہال کے ساتھ ایک کمرہ ہوتا جس کا نام ومیٹوریم یعنی قے کرنے کی جگہ تھا۔ اگر غذا کھانے کے بعد قدرتی طور پر قے نہ آتی تو وہ لوگ قے لانے والی دوائی کھاتے تاکہ انہیں قے آئے۔ کیونکہ قے نہ آنے کی وجہ سے ممکن تھا وہ مرجاتے۔ (۱۳۰)

بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں انگلستان اور فرانس جیسے ممالک میں جو بچہ پیدا ہوتا توقع ہوتی تھی کہ وہ اوسطاً" پچاس سال زندگی بسر کرے گا کیونکہ صحت کی حالت قدیم رومی شہنشاہیت سے بہت بہتر تھی اور لوگ

روی باشندوں کی مانند غذا کھانے میں افراط سے کام نہیں لیتے تھے۔

آج یورپی ممالک میں صحت میں بہتری کی وجہ سے دنیا میں آنے والے ہر بچے کی اوسط عمر ۶۸ سال ہے اور ہر بچی کی اوسط عمر ۷۸ سال ہے۔ اس طرح عورتوں کی اوسط عمر مردوں کی اوسط عمر سے زیادہ ہے۔

اگر سرطان کی بیماری قابل علاج قرار دی جائے اور دل یا دماغ کے دورے یا خون کی بیماریوں پر قابو پالیا جائے تو کیا انسان کی اوسط عمر بہت زیادہ بڑھ جائے گی ؟

ریکارڈ شدہ اعداد و شمار اس سوال کا منفی جواب دیتے ہیں۔ جب سرطان قابل علاج ہوجائے گا اور دل و دماغ کی مہلک بیماریوں پر قابو پالیا جائے گا تو بھی انسان کی اوسط عمر میں صرف دو سال کا اضافہ ہوگا۔ کیونکہ جو چیز اوسط عمر کی حد کو بڑھاتی ہے وہ ایک یا چند بیماریوں کا علاج نہیں بلکہ کھانے اور پینے کی تمام چیزوں سمیت صحت کے اصولوں کا خیال رکھنا ہے۔ جس دن بنی نوع انسان تمام بیماریوں کے علاج پر قادر ہوگا تو بھی بڑھاپے سے مرجائے گا۔ موجودہ دور میں سرطان' حرکت قلب یا حرکت دماغ کا رک جانا یا ایڈز جیسی بیماریاں مہلک بیماریاں کہلاتی ہیں۔ ان کے علاوہ کسی بیماری کو مہلک نہیں کہا جاتا۔ پھر بھی لوگ متعدی بخار جیسی بیماریوں سے بھی مرجاتے ہیں۔ چونکہ بڑھاپا موت کا سبب بنتا ہے اور جب بڑھاپے کے نتیجے میں انسانی اعضا فرسودہ ہو جاتے ہیں تو قابل علاج بیماریاں موت کا سبب بن جاتی ہیں۔ مگر یہ کہ بڑھاپا جو چند حیاتیات دانوں کے مطابق ایک بیماری ہے اس کا علاج کیا جائے۔ اس زمانے میں پیش آنے والے مسائل میں سے ایک مسئلہ ماحول کی آلودگی ہے جو امام جعفر صادقؒ کے نظریئے کی تصدیق کرتا ہے۔ یہ آلودگی بعض جگہوں پر کم اور بعض جگہوں پر زیادہ ہوتی ہے۔ اقوام متحدہ کی صحت کی تنظیم نے امریکہ اور میکسیکو کے چند شہروں کی تحقیق کے بعد یہ رپورٹ پیش کی ہے کہ امریکہ اور میکسیکو کے بعض شہروں کی آب و ہوا اتنی آلودہ ہے کہ ان شہروں میں زندگی بسر کرنے والے مرد' عورتیں اور بچے اس طرح زندگی گزار رہے ہیں کہ ہر چوبیس گھنٹے میں بیس عدد سگریٹ والے دو پیکٹ یعنی چالیس سگریٹ پیتے ہیں۔ اقوام متحدہ کی مذکورہ تنظیم کی رپورٹ کے مطابق وہی برے اثرات جو دن اور رات میں چالیس سگریٹ پینے والے پھیپھڑوں اور دوسرے اعضاء پر پڑتے ہیں اس شہر کی آب و ہوا کے ذریعے اس کے باشندوں پر بھی پڑتے ہیں۔ لہٰذا امریکہ اور میکسیکو کے شہروں کی آب و ہوا اس قدر آلودہ ہے کہ وہاں کے لوگ دوسری بیماریوں کے ساتھ ساتھ پھیپھڑوں کے سرطان میں بھی مبتلا ہیں۔ ان کے سرطان میں مبتلا ہونے کے امکانات اس قدر زیادہ ہیں جتنے سگریٹ پینے والے شخص کے ہوسکتے ہیں۔ جو اعداد و شمار کی رو سے ہزار میں سے ساڑھے سات سے آٹھ تک ہیں۔

ماحول کی آلودگی کے علاوہ جو چیز انسانوں کی عمر کو کم کرنے کا سبب بنتی ہے وہ آواز ہے۔ اب تک ڈاکٹروں کا یہی خیال تھا کہ صرف زندگی کے ماحول ہی میں آلودگی پیدا ہو سکتی ہے۔ انہیں یہ خیال نہ تھا کہ آواز بھی انسان

کی زندگی پر برے اثرات ڈال سکتی ہے۔ لیکن اب انھوں نے غور کیا ہے کہ لگاتار آواز سے انسان کی عمر میں کمی واقع ہوتی ہے۔ یہ خوش فہمی کہ انسان آواز کا عادی ہوجاتا ہے اور پھر اس سے اسے تکلیف نہیں پہنچتی صحیح نہیں۔ انسان اپنی عمر کے کسی مرحلے میں آواز کا عادی نہیں ہوتا۔ آواز کی لہریں بچپن سے لے کر عمر کے آخری دن تک اس کے اعصاب اور جسم کے خلیات کو تکلیف پہنچاتی ہیں۔ مشہور فرانسیسی انجنیئر کامی راجرون جو دوسری جنگ عظیم سے قبل فرانس کی نیوی کی بڑی جنگی کشتیاں جن کا نام ایشیو اور زان بار تھا' بنانے کے کارخانے کا انچارج تھا۔ اس کے نظریئے کے مطابق لگاتار آواز سے جسم کے خلیات پر وہ اثرات پڑتے ہیں جو اثرات آکسیجن لوہے پر ڈالتی ہے۔ جس طرح آکسیجن آہستہ آہستہ لوہے کو زنگ آلود کرکے ختم کردیتی ہے اسی طرح لگاتار آواز بھی جسم کے خلیات کو فرسودہ کردیتی ہے جس کے نتیجے میں انسان کی عمر کم ہوجاتی ہے۔ یہی انجنیئر کہتا ہے کہ شہر میں ایک اچھا گھر وہ ہے جس کے در و دیوار ایسے بنائے گئے ہوں کہ باہر سے آنے والی کسی قسم کی آواز گھر کے مکینوں کے آرام میں مخل نہ ہوتی ہو۔

کامی راجرون کہتا ہے کہ آج کی زندگی کی حالت ایسی ہے کہ لگاتار آواز سے پیچھا چھڑانا مشکل ہے للذا اس کا ایک حل یہ ہے کہ آواز کو روکنے والے پلستر کو درودیوار میں استعمال کیا جائے۔ اس طرح کا پلستر اب امریکہ کے بازاروں میں دستیاب ہے۔ اس شخص کے نظریہ کے مطابق اگر سارے مکان میں مذکورہ پلستر استعمال نہ کیا جائے تو بھی دو تین کمروں میں ایسے پلستر کا استعمال کیا جائے تاکہ انسان کم از کم آرام کے اوقات میں وہاں لگاتار آوازوں کے بے ہنگم شور سے محفوظ رہ سکے۔ اس شخص کے بقول ہمیشہ آواز کے اثرات میں سے ایک اثر انسان پر اچانک جنون کی کیفیت ہے۔ ہمیشہ کی آواز سے انسانی اعصاب فرسودہ ہوجاتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ صابر اور نرم دل اشخاص جن کی زندگی کا ایک حصہ صبر اور نرم دلی میں گزرا ہے اچانک جنون کا شکار ہوجاتے ہیں۔ اس کے دوٹوک اثرات میں سے ایک اثر ہمیشہ کی تھکاوٹ ہے۔ یہ تھکاوٹ بے حوصلگی اور خواہ مخواہ کی لڑائی جھگڑے پر اتر آنے کا باعث بنتی ہے۔ وہ افراد جن پر یہ اثرات پڑتے ہیں وہ اپنی اس بیماری سے آگاہ نہیں ہوتے اور جب ڈاکٹر سے رجوع کرتے ہیں اور ڈاکٹر ان کا معائنہ کرتا ہے تو ان کے جسم کے حقیقی اعضا میں کوئی خرابی دکھائی نہیں دیتی۔ کامی راجرون کا کہنا ہے کہ لگاتار آواز آدمی کو تھکا دینے اور بے حوصلہ کرنے کے علاوہ پانچ سے دس سال تک (اشخاص میں فرق کے لحاظ سے) انسان کی عمر کو کم کردیتی ہے۔ اگر انسان کے پاس گاڑی ہو تو شہروں میں یا وہاں پر جہاں لگاتار آوازیں سنائی دیں رہائش اختیار نہیں کرنا چاہیے۔

غیر متوازن خوراک بھی جو آج کے مشینی دور کی پیداوار ہے انسانی عمر میں کمی واقع کرنے والے عوامل میں سے ایک ہے۔ یہ بات امام جعفر صادقؑ کے اس نظریہ کی تائید کرتی ہے کہ آپ نے فرمایا انسان کی عمر طویل ہے بشرطیکہ وہ خود اسے کم نہ کرے۔ یورپی ممالک اور ریاستہائے متحدہ امریکہ اور ہر اس ملک میں جہاں مشینی زندگی

کا دوردورہ ہے۔ یہ مشینی زندگی اس بات کا باعث بنی ہے کہ لوگ اپنے آپ کو زیادہ تر مصنوعی غذاؤں کے ذریعے سیر کریں۔

امریکہ میں لوگوں کا ایک طبقہ ہے جو اچھی غذا کھاتا ہے اور مویشی وغیرہ چراتا ہے۔ وہ ہر جگہ کاؤ بوائے کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ لوگ تازہ دودھ پیتے' دودھ کی ملائی وغیرہ کھاتے اور ہمیشہ شہروں سے دور وسیع و عریض صحراؤں میں زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کی جوانی کی طاقت اوسطاً" اسی یا پچاسی سال تک برقرار رہتی تھی۔ یہی مضبوط کاؤ بوائے جو پچاسی سال تک گھوڑے کی پشت پر سوار رہتے تھے اور صحرا میں گائے کے ریوڑوں کے ساتھ سفر کرتے تھے۔ آج جونہی پچاس سال کی عمر کو پہنچتے ہیں ناقص غذا سے پیدا ہونے والی بیماریوں کا شکار ہوجاتے ہیں۔ چونکہ وہ مخصوص غذائیں جو بدن میں یوریا اوریورک ایسڈ جیسی رطوبتوں کی زیادتی کا باعث بنتی ہیں' انہوں نے کھانا شروع کردی ہیں جس کے نتیجے میں وہ پٹھوں اور ہڈیوں کے شدید درد میں مبتلا ہوئے۔ اس کے علاوہ ان میں ایسی بیماریوں نے جنم لیا ہے جو خون کی بدنظمی کی صورت میں لاحق ہوتی ہیں۔ یہ بیماریاں بھی ناقص غذاؤں کی وجہ سے جنم لیتی ہیں۔ ان لوگوں کو پچاس سال کی عمر میں ہی کام کے قابل نہیں چھوڑتیں جبکہ اس صدی کے شروع میں ایک کاؤبوائے پچاس سال کی عمر میں جوانی کی انتہا کو چھو رہا ہوتا تھا۔

الاسکا جو امریکی ریاستوں میں سے ایک ہے' وہاں اس صدی کے آغاز میں کوئی بیمار نہ ہوتا تھا۔ وہاں کے باشندوں کی بیماری دانتوں کا درد ہوتا تھا۔ وہ درد بھی عمر کے آخری حصے میں ہوتا تھا کیونکہ مرد عورتیں اپنے دانتوں کو ستر اسی سال تک محفوظ رکھتے تھے کیونکہ وہ عام غذا کھاتے اور ہمیشہ کام میں مشغول رہتے تھے۔ الاسکا کے لوگوں کی خوراک دودھ' بارہ سنگھے کا گوشت اور سفید مچھلی ہوتی تھی جو دریائے الاسکا سے کافی مقدار میں شکار کی جاتی تھی۔ وہاں کے گڈریوں کے گلوں میں ہزاروں بارہ سنگھے ہوتے تھے لیکن انہیں ان کو گھاس مہیا کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ حتی کہ الاسکا کی سخت سردی میں بھی جب برف ہر جگہ کو ڈھانپ لیتی تھی۔ انہیں اس سلسلہ میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی تھی۔ ان جانوروں کے پاؤں کے سم تیز ہوتے ہیں وہ اپنے دوپاؤں کے ساتھ برف کو ہٹا کر ایک گہرا گڑھا بنا لیتے تھے اور اس علاقے کی خاص گھاس "لیشن" کھاتے تھے جو سرد علاقوں میں گرمیوں میں اگتی ہے اور جلد خشک ہو جاتی ہے۔ امریکی مصنف ایلن رولیس اونس کی الاسکا کے لوگوں کی زندگی کی حالت اور خاص طور پر قطبی بارہ سنگھے کے متعلق تحقیقات کو مستند سمجھا جاتا ہے۔ وہ ۱۹۶۰ء میں فوت ہوا۔ کہتا ہے کہ ۱۹۳۵ء میں وہ خزاں کے موسم میں بارہ سنگھوں کی موسمی ہجرت کا شاہد تھا۔ پانچ دن تک وحشی بارہ سنگھوں کے ٹکرانے سے بجلی کی سی آواز سنائی دیتی رہی۔ یہی وہ بارہ سنگھے تھے جنہیں الاسکا والوں نے قابو کیا ہوا تھا اور لوگ ان کے دودھ اور گوشت کو استعمال کرتے تھے۔ یہی مصنف بیان کرتا ہے کہ الاسکا میں کوئی ڈاکٹر نہیں کیونکہ ڈاکٹروں کو معلوم ہے کہ وہاں کوئی بیمار نہیں پڑتا وہاں جاکر بیکار پڑے رہیں گے۔

وہاں صرف چند ڈانتوں کے ڈاکٹر کام کر رہے ہیں۔ الاسکا میں مردوں کی اوسط عمر نوے سال اور عورتوں کی سو سال ہے۔

یہ تحریر ۱۹۳۵ء کی ہے اور بہت قدیم نہیں۔ یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہیں کہ ڈاکٹروں اور ماہرین صحت کے بقول انسان کو لمبی عمر گزارنے اور ہمیشہ صحتمند رہنے کے لئے زیادہ تر نباتاتی غذا کھانا چاہئے۔ خصوصا" جوانی کے بعد حیوانی چربی اور چربی والے گوشت سے پرہیز کرنا چاہئے۔ تیس سال کی عمر کے بعد انسان کے لئے بہترین غذا فروٹ اور سبزی ہے۔ لیکن جیسا کہ ایلن روس نے لکھا ہے الاسکا والے تمام عمر فروٹ اور سبزی نہیں کھاتے کیونکہ الاسکا کی ٹھنڈی آب و ہوا میں فروٹ اور سبزی پیدا نہیں ہوتے۔ سوائے لیشن گھاس کے کسی قسم کی گھاس نہیں اگتی۔ یہ گھاس بیل کی شکل کی ہوتی ہے لیکن اس کا پودا قدرے بڑا ہوتا ہے۔ آج تک کوئی بھی الاسکا کی کھلی آب و ہوا میں سبزی کاشت کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا چہ جائیکہ فروٹ پیدا ہو۔ صرف حالیہ سالوں کے دوران الاسکا میں گرم خانے بنائے گئے جن میں سبزی اور پھل پیدا کئے گئے ہیں۔

الاسکا میں آب و ہوا اس قدر ٹھنڈی ہے کہ گرمیوں میں بھی گوشت کو فریج میں رکھنے کی ضرورت نہیں۔ صرف اتنا کافی ہے کہ اسے ایسے کمرے میں رکھ دیا جائے جہاں دھوپ نہ پڑے۔ مردوں کو دفن کرنے کے لئے قبر کھودنا گرمیوں کے موسم میں بھی مشکل ہے کیونکہ زمین کو تھوڑا سا کھودا جاتا ہے تو نیچے برف ملتی ہے۔ سردیوں کے موسم میں تو زمین پتھر کی مانند ہوجاتی ہے جسے کھودنا انتہائی دشوار ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ گزشتہ زمانے میں الاسکا کے لوگ ساری عمر نہ پھل کھاتے اور نہ ہی سبزی کھاتے تھے۔ ان کی غذا صرف بارہ سنگھے کا گوشت اور سفید مچھلی ہوتی تھی۔ بہرحال وہ ایک صدی تک زندہ رہتے تھے۔ اب تک الاسکا کے لوگوں کی طویل عمر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ لوگ بارہ سنگھے کا گوشت' مچھلی اور دودھ کے علاوہ کچھ بھی نہیں کھاتے۔ ممکن ہے ان کی عمر بھی لمبی ہو اور درازی عمر کے لئے ضروری نہیں کہ انسان سبزی اور پھل ہی کھائے۔

لیکن ہمیں آب و ہوا کی تاثیر کو بھی مدنظر رکھنا چاہئے۔ شاید الاسکا کے لوگوں کی طویل عمر کا راز ان کی آب و ہوا کی تاثیر ہو۔ ابھی تک کسی نے اس موضوع پر تحقیق نہیں کی کہ علم کی رو سے پتہ چلے کہ الاسکا کے لوگوں کی طویل عمر وہاں کی آب و ہوا کی وجہ سے ہے یا نہیں ؟ لیکن ہمیں اتنا معلوم ہے کہ الاسکا کے لوگ مسلسل ٹھنڈی آب و ہوا میں رہتے تھے اور گزراوقات کے لئے کافی تگ و دو کرتے تھے جس کی وجہ سے انہیں کافی مقدار میں پروٹین کی ضرورت ہوتی تھی تاکہ حرارے (کیلوریز) حاصل کریں۔

# ماؤں کو حکیمانہ نصیحت

امام جعفر صادقؑ کی علمی فوقیت کے اظہارات میں سے ایک یہ تھا کہ آپ نے ماؤں کو وصیت کی اپنے شیر خوار بچوں کو اپنے بائیں طرف سلائیں۔

صدیوں سے اس تاکید کو بے محل اور فضول خیال کیا جاتا رہا جس کی وجہ یہ تھی کہ کسی نے اس تاکید پر غور نہیں کیا تھا۔ بعض نے اس پر عمل کرنے کو خطرناک سمجھا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر شیر خوار بچے کو ماں کی بائیں جانب سلایا جائے تو ممکن ہے ماں سوتے میں کروٹ بدلے اور بچے کو اپنے جسم کے نیچے کچل دے۔

محمد بن ادریس شافعی ۱۵۰ھ میں امام جعفر صادقؑ کی ولادت کے دو سال بعد غزہ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۹ھ میں قاہرہ میں فوت ہوئے۔ ان سے پوچھا گیا کہ کیا ماں کو اپنے بچے کو بائیں طرف سلانا چاہئے یا دائیں طرف ؟ تو انہوں نے جواب دیا' دائیں اور بائیں میں کوئی فرق نہیں۔ ماں اپنے بچے کو جس طرف آسان سمجھے اس طرف سلائے' بعض لوگوں نے امام جعفر صادقؑ کے فرمان کو عقل سلیم کے خلاف قرار دیا۔ چونکہ ان کے خیال میں دایاں' بائیں سے زیادہ محترم ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ماں اپنے بچے کو دائیں جانب سلائے تاکہ بچہ اس کے دائیں جانب کی کرامت سے بہرہ مند ہو سکے۔ امام جعفر صادقؑ کی اس وصیت کو نہ تو مشرق میں کوئی اہمیت دی گئی اور نہ ہی مغرب میں۔ کسی نے اس کی قدر و قیمت کو نہ جانا۔ حتی کہ علمی احیاء کے دور میں جبکہ دانشور ہر علمی موضوع پر اچھی طرح غور کر رہے تھے کسی نے امام جعفر صادقؑ کے قول کو خاطر خواہ اہمیت نہ دی اور نہ ہی یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ آپ کا یہ فرمان علمی نقطہ نظر سے سودمند ہے یا نہیں ؟

سولہویں' سترہویں اور اٹھارہویں صدی عیسوی کے ادوار جو علمی احیا کے ادوار کہلاتے ہیں' گزر چکے تھے اور انیسویں صدی عیسوی آپہنچی تھی۔ اس صدی کی دوسری دہائی میں امریکہ کی کورنیل (۱۳۱) یونیورسٹی قائم ہو کر کام کرنا شروع کر چکی تھی۔ عزرا کورنیل جو کورنیل یونیورسٹی کا بانی تھا' جس نے بچپن میں کافی مشکلات جھیلی تھیں' فیصلہ کیا کہ اس یونیورسٹی میں شیر خوار اور نومولود بچوں پر تحقیق کے لئے ایک انسٹی ٹیوٹ قائم کیا جائے۔ اس انسٹی ٹیوٹ نے پہلے ہی سال تدریس شروع کر دی اور اسے میڈیکل کالج سے منسلک کر دیا گیا۔ ایک صدی سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے کہ اس یونیورسٹی میں نومولود اور شیر خوار بچوں پر تحقیق کا کام جاری ہے۔ نوزائیدہ اور شیر خوار بچوں سے متعلق کوئی موضوع ایسا نہیں جس پر اس انسٹی ٹیوٹ میں تحقیق نہ ہوئی ہو۔ دنیا میں کوئی ایسا علمی مرکز نہیں جس میں نومولود اور شیر خوار بچوں کے بارے میں اس مرکز جتنی معلومات کا ذخیرہ ہو۔ یہاں تک کہ نومولود اور شیر خوار بچوں کے اشتہارات اور سائن بورڈ پر بھی اس انسٹی ٹیوٹ میں تحقیق ہوتی تھی۔

بیسویں صدی کے پہلے حصے میں اس انسٹی ٹیوٹ کے محققین نے دنیا کے عجائب گھروں میں پائے جانے والے نومولود بچوں کے متعلق سائن بورڈوں پر نگاہ ڈالی تو انہیں پتہ چلا کہ ۴۶۶ سائن بورڈوں میں سے ۳۷۳ سائن بورڈوں پر ماؤں نے بچے کو بائیں جانب بغل میں لیا ہوا ہے اور صرف ۹۳ سائن بورڈ ایسے ہیں جن میں ماؤں نے بچے کو دائیں طرف بغل میں لیا ہوا ہے۔ اس بنا پر عجائب گھروں میں پائے جانے والے اسی (۸۰) فیصد سائن بورڈ ایسے تھے جن میں ماؤں نے بچے کو بائیں بغل میں لیا ہوا تھا۔ نیویارک کی ریاست میں کورنیل یونیورسٹی سے منسلک چند زچہ خانے ایسے ہیں جو تحقیق کے مرکز سے وابستہ ہیں اور وہاں پر کام کرنے والے ڈاکٹر صاحبان اپنے مطالعے اور تحقیق کی رپورٹیں مذکورہ مرکز کو بھیجتے رہتے ہیں۔ ان ڈاکٹروں کی طرف سے ایک طویل مدت تک بھیجی جانے والی مذکورہ رپورٹوں کے مطابق پیدائش کے بعد ابتدائی دنوں میں جب نومولود ماں کی بائیں جانب سوتا ہے تو اسے دائیں جانب سونے کی نسبت زیادہ آرام ملتا ہے۔ اگر اسے دائیں طرف سلایا جائے تو جلد ہی جاگ اٹھتا ہے اور رونے لگتا ہے۔

مذکورہ تحقیقی مرکز کے محققین نے اپنی تحقیق کا دائرہ کار صرف سفید فام امریکیوں تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ انہوں نے سیاہ فام اور ریڈ انڈین بچوں پر بھی تحقیق کی۔ طویل تحقیق کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس موضوع کا تعلق رنگ و نسل سے نہیں۔ دنیا کی تمام اقوام کے بچوں میں یہ خاصیت موجود ہے۔ کورنیل یونیورسٹی کے تحقیقی مرکز نے اس موضوع پر مسلسل تحقیق کی تھی۔ اس مرکز کے ڈاکٹروں نے نامعلوم شعاعوں کے ذریعے جنین کا حاملہ عورت کے پیٹ میں معائنہ کیا لیکن ان کی معلومات میں کوئی خاص اضافہ نہ ہوا یہاں تک کہ ہولوگرافی ایجاد ہوگئی۔ ہولوگرافی (۱۳۲) کی ایجاد کے بعد اس تحقیقی مرکز کے ڈاکٹروں نے ہولوگرافی کے ذریعے ماں کے پیٹ میں جنین کی تصویر لی۔ انہوں نے دیکھا کہ ماں کے دل کی دھڑکن کی آوازوں کی لہریں جو تمام بدن میں پھیلتی ہیں جنین کے کانوں تک پہنچتی ہیں۔ اس مرحلے کے بعد ڈاکٹروں نے یہ معلوم کیا کہ ماں کے دل کی دھڑکنوں کا وقفہ بھی جنین میں ردعمل ظاہر کرتا ہے یا نہیں ؟

چونکہ ڈاکٹر صاحبان ماں کے دل کی دھڑکن کو ہلاکت کے اندیشے سے نہیں روک سکتے تھے لہٰذا انہوں نے اس تحقیق کو ممالین یعنی دودھ دینے والے جانوروں پر جاری رکھا۔ انہوں نے جونہی ماں کے دل کی دھڑکن روکی انہوں نے دیکھا کہ جنین میں ردعمل پیدا ہوا۔

جب انہوں نے یہ تجربات بار بار دہرائے تو انہوں نے یقین کرلیا کہ ممالین جانوروں کے دل کی دھڑکن کو روکنے سے ان کے جنین میں ردعمل ظاہر ہوتا ہے اور ماں کی موت کے بعد جنین بھی ہلاک ہوجاتا ہے۔ کیونکہ ماں کے دل سے نکلنے والی ایک بڑی شریان جنین کو خون پہنچاتی ہے جو اس کی غذا بنتا ہے۔ جب دل ساکن ہوجائے گا تو جنین کو غذا نہیں پہنچے گی اور وہ ہلاک ہو جائے گا۔ کورنیل یونیورسٹی کے تحقیقی مرکز کے سائنس

دانوں نے متعدد تجربات سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ بچہ نہ صرف یہ کہ ماں کے پیٹ میں اس کے دل کی دھڑکنوں کو سننے کا عادی ہو جاتا ہے بلکہ ان دھڑکنوں کا اس کی زندگی سے بھی گہرا تعلق ہے۔ اگر یہ دھڑکن رک جائے تو بچہ ماں کے پیٹ میں بھوک سے مرجائے۔

ماں کے دل کی دھڑکن سننے کی جو عادت بچے کو پیدائش سے پہلے ہوتی ہے وہ اس میں اس قدر نفوذ کرجاتی ہے کہ بچہ پیدائش کے بعد اگر ان دھڑکنوں کو نہ سنے تو پریشان ہوجاتا ہے۔ بچہ ان دھڑکنوں کی بخوبی پہچان رکھتا ہے۔ جس وقت بچے کو ماں کی بائیں جانب سلایا جاتا ہے تو بچہ ان دھڑکنوں کو سن کر پر سکون رہتا ہے۔ لیکن چونکہ دائیں جانب دل کی دھڑکنیں سنائی نہیں دیتیں لہٰذا اگر دائیں جانب سلایا جائے تو بچہ مضطرب ہوجاتا ہے۔

اگر کورنیل یونیورسٹی کا بانی نومولود اور شیرخوار بچوں پر تحقیق کا یہ مرکز قائم نہ کرتا تو اس موضوع پر ہرگز تحقیق نہ ہوتی اور یہ معلوم نہ ہوسکتا کہ امام جعفر صادقؑ نے یہ کیوں فرمایا کہ مائیں اپنے شیرخوار بچوں کو بائیں طرف رکھیں اور سلائیں ؟ اور اس میں کیا مصلحت اور فوائد مضمر ہیں۔

آج شیرخوار بچوں کی پرورش کے تمام سنٹرز جو کورنیل یونیورسٹی کے تحقیقی مرکز سے وابستہ ہیں ان میں جس جس کمرے میں نومولود لیٹے ہوتے ہیں وہاں ایک مشین رکھی ہوتی ہے جس سے ماں کے دل کی دھڑکنوں جیسی آواز سنائی دیتی ہے۔ یہ آواز ایک ریسیور کے ذریعے ہر بچے کے کان تک پہنچائی جاتی ہے۔ بالغ انسان چاہے مرد ہو یا عورت عموماً اس کا دل ایک منٹ میں ۷۲ بار دھڑکتا ہے۔ کورنیل یونیورسٹی سے وابستہ تحقیقی انسٹی ٹیوٹ میں قائم شیرخوار بچوں کی پرورش کے مذکورہ مراکز میں اگر ماں کے دل کی مصنوعی دھڑکنیں ایک سو دس سے بیس ہوجائیں تو ایک کمرے میں موجود تمام بچے رونے لگتے ہیں۔ پس سائنس دانوں نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ماں کے دل کی مصنوعی دھڑکنیں ۷۲ دھڑکنیں فی منٹ ہونا چاہئیں تاکہ بچے پریشان نہ ہوں اور رونے نہ لگیں۔ مذکورہ مراکز میں چند مرتبہ یہ تجربات دہرائے گئے ہیں۔

کچھ نومولودوں کو ایک ایسے کمرے میں رکھا گیا جہاں ماں کے دل کی مصنوعی دھڑکنیں ان کے کانوں تک نہیں پہنچتی تھیں اور کچھ نومولودوں کو ایک دوسرے کمرے میں رکھا گیا جہاں وہ ماں کے دل کی مصنوعی دھڑکنیں سن سکتے تھے۔ اس دوران یہ معلوم ہوا کہ وہ نومولود جن کے کانوں تک ماں کے دل کی مصنوعی دھڑکنیں پہنچ رہی تھیں (حالانکہ دونوں کمروں والے بچوں کی غذا ایک جیسی تھی) لیکن وہ کمرہ جہاں ماں کے دل کی مصنوعی دھڑکنیں سنائی دے رہی تھیں اس کے بچے زیادہ بھوک کا اظہار کرتے ہوئے غذا کھاتے تھے جبکہ اس کے برعکس دوسرے کمرے والے کم بھوک والے ہوتے تھے۔

کورنیل یونیورسٹی کے تحقیقی مرکز سے وابستہ شیرخوار بچوں کی پرورش کے مراکز میں ماں کے دل کی مصنوعی دھڑکنوں کی شدت کے لحاظ سے بھی تحقیق کی گئی ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اگر یہ دھڑکنیں ماں کے دل کی

دھڑکنوں کی آواز سے زیادہ شدید ہوں تو بچے مضطرب ہو کر رونے لگتے ہیں۔

کورنیل یونیورسٹی کے تحقیقی مرکز کے ایک ڈاکٹر نے دنیا کے براعظموں کا سفر کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ مختلف ممالک میں مائیں اپنے بچوں کو اٹھائے ہوئے کس طرف گود میں لیتی ہیں ؟ یہ ڈاکٹر جس کا نام ڈاکٹر لی سالک بیان کیا جاتا ہے اور ابھی تک کورنیل یونیورسٹی کے تحقیقی مرکز میں کام میں مشغول ہے اس کے بقول دنیا کے تمام براعظموں میں مائیں اپنے بچوں کو بائیں طرف کی بغل میں لیتی ہیں اور وہ خواتین جو اپنے بچوں کو دائیں طرف والی بغل میں لے لیتی ہیں' ان میں سے اکثر بائیں ہاتھ سے کام کرنے والی ہیں۔ خصوصاً" جب وہ ٹوکری اٹھاتی ہیں تو اپنے بچوں کو دائیں طرف والی آغوش میں لیتی ہیں تاکہ وہ بائیں ہاتھ سے ٹوکری اٹھا سکیں۔ ڈاکٹر لی سالک نے تحقیقی مرکز سے منسلک بچوں کی پرورش گاہ میں زچہ خواتین سے جو پیدائش کے بعد وہاں سے چلی جاتی ہیں اور نومولودوں کو بائیں طرف والی بغل میں لیتی ہیں سوال کیا' کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ اپنے بچے کو بائیں جانب بغل میں کیوں رکھتی ہیں ؟ لیکن ابھی تک کسی خاتون نے ڈاکٹر لی سالک کو یہ جواب نہیں دیا کہ چونکہ دل سینے کے بائیں حصے میں واقع ہے اور بچوں کے لئے اس کی دھڑکنوں کی آواز سننا مفید ہے۔ مائیں اس بات سے آگاہ نہیں کہ وہ بچے کو بائیں طرف رکھنے کو کیوں ترجیح دیتی ہیں پھر بھی وہ بچے کو بائیں طرف سے بغل گیر رکھتی ہیں۔

افریقہ کے سیاہ فام قبائل کی عورتیں جب بچے کو پیٹھ پر نہیں اٹھاتیں تو اسے بائیں جانب بغل میں رکھتی ہیں۔ افریقہ کے تمام سیاہ فام قبائل میں خواتین کو علم ہے کہ بچے کو بائیں طرف سینے پر رکھنے سے اس کی بھوک بڑھتی ہے اور وہ خوب دودھ پیتا ہے جبکہ دائیں طرف کے اثرات اس کے برعکس ہیں۔ ڈاکٹر لی سالک نے ماؤں سے سنا ہے کہ رات کو بچہ جب بھوکا ہوتا ہے تو اندھیرے میں حیران کن تیزی سے ماں کے پستان تلاش کر کے اس پر منہ رکھ کر دودھ پینا شروع کر دیتا ہے۔ انہیں تعجب ہے کہ بچہ کیونکر روشنی کے بغیر ہی ماں کے پستان کو ڈھونڈ کر اس سے دودھ پینا شروع کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر لی سالک نے ماؤں کو بتایا کہ رات کی تاریکی میں ماں کے پستان سے دودھ پینے میں ماں کے دل کی دھڑکن بچے کی مدد کرتی ہے اور جب بچہ ماں کے دل کے دھڑکنے کی آواز سنتا ہے تو فوراً" پستان کو ڈھونڈ کر دودھ پیتا ہے۔

## ہر شے متحرک ہے

امام جعفر صادقؑ کے اہم نظریات میں ایک اور نظریہ اشیاء کی حرکت کے متعلق ہے۔ آپ نے فرمایا جو کچھ موجود ہے حرکت کر رہا ہے حتیٰ کہ جمادات بھی متحرک ہیں۔ اگرچہ ہماری آنکھیں ان کی حرکات کو نہیں دیکھ

سکتیں لیکن کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو متحرک نہ ہو۔

یہ بات امام جعفر صادقؑ کے زمانے میں قابل قبول نظر نہ آئی تھی جبکہ آج ناقابل تردید حقیقت ہے اور کائنات میں کوئی ایسا جسم نہیں جو متحرک نہ ہو۔ سائنس اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہے کہ کیا حرکت کے بغیر بھی کسی چیز کا وجود ہو سکتا ہے۔ تصور کی بھی کوئی طاقت کسی ساکن جسم کا اتہ پتہ نہیں بتا سکتی۔ جونہی حرکت رکی تصور کی وہ طاقت جسے حرکت کو فرض کرنا تھا ختم ہوگئی۔ چونکہ جس لمحے حرکت رک جاتی ہے انسان مرجاتا ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے ساڑھے بارہ سو سال پہلے اس حقیقت کو بیان کیا اور فرمایا جس لمحے حرکت رک جاتی ہے انسان کی موت واقع ہوجاتی ہے۔

لیکن موت کے بعد بھی ایک دوسری طرف سے حرکت جاری رہتی ہے ورنہ آدمی کا جسد خراب نہ ہو۔ ہم زمانے کی تبدیلی کو صرف حرکت کے زیر اثر احساس کرتے ہیں۔ اگر ہمارے وجود میں دائمی حرکت نہ ہو تو ہم ہرگز لمبائی' چوڑائی اور بلندی وغیرہ کا استنباط نہیں کر سکتے تاکہ مکان کی کھوج لگائیں۔ ہر ساکن جسم میں دو قسم کی دائمی حرکت موجود ہوتی ہے۔ پہلی حرکت جو ایٹم کے اندر ہے اور گزشتہ صفحات میں ہم نے ذکر کیا ہے کہ الیکٹران ایٹم کے مرکز کے اردگرد ایک سیکنڈ میں تین کیٹریلین مرتبہ چکر لگاتا ہے۔ دوسری حرکت مالیکولوں کا دائمی ارتعاش ہے۔ ہر جسم کے مالیکول سردی ہو چاہے گرمی ہو صفر سے دس کیٹریلین مرتبہ فی سیکنڈ حرکت کرتے ہیں۔ (۱۳۳)

فرانسیسی ڈرامہ نویس مولیر (۱۳۴) جو فرانسیسی کامیڈی کا بانی ہے اس نے اپنے ایک ڈرامے کے ہیرو کے متعلق کہا ہے کہ وہ زندہ تھا لیکن حرکت نہیں کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ مولیر خود بھی متعجب تھا کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک چیز حرکت نہ کرے اور وہ زندہ ہو ؟ آج یہ مذاق قابل قبول نہیں ہے کہ اگر کوئی جسم ساکن ہو تو وہ مردہ ہے اور امام جعفر صادقؑ کے بقول موت کے بعد بھی اس کے اندر حرکت جاری رہتی ہے' لیکن دوسری شکل میں' وہ حرکت دنیا کے آخری دن تک باقی رہتی ہے۔ اگرچہ انسانی جسم سے بچنے والے ذرات مادہ نہ رہیں اور توانائی میں تبدیل ہوجائیں۔ اس صورت میں وہ توانائی کی شکل میں حرکت جاری رکھیں گے۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا جو کچھ ہے خالق کا گرویدہ ہے۔ یہ نظریہ آج تک عرفانی نظریہ سمجھا جاتا رہا ہے نہ کہ سائنسی نظریہ۔ امام جعفر صادقؑ جو عرفاء میں سے تھے (لیکن آپ کا مخصوص عرفان دین اسلام پر مبنی تھا) ان کا کہنا تھا کہ آدمی کی تخلیق کا یہ مقصد ہے کہ وہ آخرکار خداوند تعالیٰ سے مل جائے۔

وقت کے گزرنے کے ساتھ تصوف و عرفان کے گوناگوں فرقے وجود میں آئے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نظریہ کے کچھ پیروکاروں نے بیباکی دکھائی اور خدا تک پہنچنے کے نظریئے کو خدا ہونا بنالیا۔ یہ وہی نظریہ ہے جو مشرق و مغرب کے عرفاء میں وحدت وجود کے نام سے پھیل چکا ہے اور حتیٰ کہ اپسی نوزا (۱۳۵) کی مانند ایک

فلسفی بھی وحدت وجود کے عرفانی مکتب کا پیروکار بن گیا اور اس نے اپنے فلسفے کو وحدت وجود کی بنیاد پر لکھا اور چھپوادیا۔ عرفاء کہتے تھے چونکہ خدا کے علاوہ کوئی چیز موجود نہیں ہے لہذا جو کچھ ہے یعنی جسم اور روح' درخت' حیوانات اور چار عناصر' سب خدا کے ہیں۔ پس انسان بھی خدا کا ہے۔ لیکن عرفان' تصوف و فلسفے کی تاریخ کے دوران اس نظریہ کا صرف ایک مرتبہ ڈنکا بجا اور وہ بھی ہالینڈ کے اپسی نوزا کی طرف سے سترہویں صدی کے نصف کے دوران میں۔ اس وقت اپسی نوزا کی کتابوں کو نہایت تیزی سے جمع کیا گیا اور کتابیں چھاپنے والوں نے اس کی کتاب چھاپنے سے صاف انکار کردیا چونکہ انہیں علم تھا کہ ایسا کرنا ان کے لئے خطرناک ہے۔

صوفیاء اور عرفاء نے جو وحدت وجود کے قائل تھے اس نظریئے کو اصلاحات اور تعبیرات کی گتھی میں اس طرح الجھا دیا کہ ان کے علاوہ کوئی دوسرا اس سے کچھ بھی نہیں سمجھ سکتا۔ امام جعفرصادقؑ کی مذہبی ثقافت میں توسیع کے بعد مشرقی ممالک میں گوناگوں مسائل پر بحث آزاد ہوگئی تھی لیکن پھر بھی وحدت وجود کے حامیوں کو کھلم کھلا اپنا نظریہ بیان کرنے کی جرات نہیں ہوئی کیونکہ ان کے بعض خلفاء اور حکام متعصب تھے اور اس بات کا امکان تھا کہ وہ وحدت وجود کے نظریہ کے حامیوں کو قتل کر دیتے۔ جو کوئی اس نظریہ کا حامی ہوتا اگر وہ قتل نہ بھی کیا جاتا تو مذہبی علماء اس پر کفر کا فتویٰ ضرور لگاتے اور جس پر یہ فتویٰ لگ جاتا وہ جذام کے مریض سے بھی بدتر سمجھا جاتا۔ اسے آبادی سے باہر نکال کر دوردراز مقام پر پہنچا دیا جاتا۔

چونکہ جذام کے مریضوں پر رحم کھایا جاتا' انہیں زمین اور کھیتی باڑی کا ساز و سامان مہیا لیا جاتا تھا تاکہ وہ خود کاشت کریں اور اپنے لئے غلہ پیدا کریں۔ لیکن جس پر ایک دفعہ کفر کا فتویٰ لگ جاتا تو اس پر کسی قسم کا رحم نہ کھایا جاتا۔ اگر وہ کہیں کام کر رہا ہوتا تو اسے وہاں سے نکال دیا جاتا اور کوئی اس کو کام نہ دیتا۔ اگر وہ سوداگر ہوتا تو نہ اس سے کوئی سوداسلف خریدتا اور نہ اس کو سودا بیچتا۔ اگر وہ صنعتکار ہوتا تو کوئی اس سے کسی چیز کے بنانے کے لئے رجوع نہ کرتا۔ جب وہ اپنے گھر سے باہر آتا تو لوگ اسے تکلیف پہنچاتے اور اس پر عرصہ حیات اس قدر تنگ کیا جاتا کہ اس کے لئے گھر سے نکلنا محال ہوجاتا' یہاں تک کہ وہ اپنا گھر چھوڑ کر ہجرت بھی نہ کرسکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وحدت وجود کے نظریہ کے پیروکاروں نے اپنے نظریہ کو اصطلاحات اور تعبیرات کے لفافے میں اس طرح بند کیا کہ ان کے سوا کسی دوسرے کو خبر نہ ہوتی تھی کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ مذہبی علماء ان کے اس کہنے کی بناء پر ان پر کفر کا فتویٰ نہیں لگاسکتے تھے۔

صوفیاء اور عرفاء نے اپنی گفتگو کے لئے میکدہ' ساقی' معشوق' مینا' ساغر اور مئے وغیرہ کی اصطلاحات ایجاد کرلیں اور جب فارسی زبان میں عرفانی شاعری کا رواج ہوا تو یہ اصطلاحیں جوں کی توں شعر کی زبان میں داخل ہوگئیں۔ اب وہ لوگ جو صوفی اور عارف نہیں تھے' جو کچھ عارفوں نے شعروں میں کہا وہ ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس طرح صوفیاء اور عرفاء کفر کے فتویٰ سے بچ گئے۔ (۱۳۶) جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ تصوف

اور عرفانی سوچ نے تیسری صدی سے زور پکڑا اور اس وقت صوفیا اور عرفا نے یہ خیال کیا کہ امام جعفر صادقؑ کا یہ عرفان کہ ہر چیز خدا کی طرف لوٹتی ہے وحدت وجود کا عقیدہ ہے اور آپ کا بھی یہی عقیدہ تھا۔

جبکہ امام جعفر صادقؑ وحدت وجود کے معتقد نہ تھے اور مخلوق کو خالق سے جدا جانتے تھے۔ دین اسلام کے اصول کے مطابق آپ کا عقیدہ تھا کہ کائنات میں جو کچھ ہے خالق کا تخلیق کیا ہوا ہے۔ بعد میں آنے والے زمانوں میں جب علوم کی درجہ بندی اس طرح کی گئی کہ عرفان اور فلسفہ کو علوم سے جدا کیا گیا تو علماء نے امام جعفر صادقؑ کے اس نظریئے کو کہ ہر چیز خدا کی طرف لوٹتی ہے کو عرفانی نظریہ سمجھا ہے نہ کہ سائنسی۔ لیکن آج علما پر سائنسیات کے میدان میں یہ حقیقت واضح ہوئی ہے کہ جو کچھ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا تھا اس کا تعلق سائنس سے ہے نہ کہ عرفان سے۔ ابھی اس بارے میں دوٹوک الفاظ میں اظہار خیال کرنا قبل از وقت ہے کہ تمام چیزیں صرف ایک چیز (امام جعفر صادقؑ کے بقول خدا) کی طرف پلٹتی ہیں۔

لیکن یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ہر دفعہ جب الیکٹران سے شعاع نکلتی ہے تو وہ شعاع ایک طرف کو جاتی ہے اور جب تک اس کے راستے میں مقناطیسی قوت حائل نہ ہو وہ اطراف میں نہیں پھیلتی۔ البتہ وہ اس صورت میں اطراف میں پھیلتی ہے جب برقی اور مقناطیسی لہر کا جزو شمار ہو کہ اس صورت میں وہ اطراف میں پھیلتی ہے۔ یہی لہریں ہیں جن سے ٹیلی فون' ریڈیو اور ٹیلیویژن کام کرتے ہیں۔

ہم الیکٹرانوں کی ایک ہی سمت میں حرکت کو قطب نما کی سوئی کے ذریعے محسوس کرسکتے ہیں جو ہمیشہ شمال کی جانب رہتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کرہ زمین میں قطب نما شمالی قطب (نارتھ پول) کے مقناطیسی میدان کی طرف کھنچا رہتا ہے۔ اسی بنا پر قطب نما کی سوئی شمال کی جانب رہتی ہے۔

قطب نما مسلمانوں کی ایجاد ہے (۱۳۷)۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ اس ایجاد نے سمندری سفر میں کافی مدد دی ہے۔ اگر قطب نما ایجاد نہ ہوتا تو نہ تو پرتگال کا باشندہ واسکوڈی گاما پندرھویں صدی کے دوسرے نصف حصے میں کشتی کے ذریعے جنوبی افریقہ ہندوستان پہنچ سکتا تھا اور نہ اٹلی کا کرسٹوفر کولمبس اپنے زمانے میں کشتی کے ذریعے امریکہ دریافت کرسکتا تھا اور نہ پرتگالی ماجیلان اسپین کے بادشاہ کے خرچ پر کشتی کے ذریعے دنیا کے اطراف میں چکر لگا سکتا تھا اس طرح اس نے ناقابل تردید طور پر ثابت کیا ہے کہ زمین گول ہے۔

جیسا کہ ہم مانتے ہیں کہ آج قطب نما جہازرانی کے لئے انتہائی ضروری ہے۔ اس کے باوجود کہ ہوائی جہاز کا رابطہ ائیرپورٹ کے ساتھ مسلسل قائم رہتا ہے اور کنٹرول ٹاور سے اسے ہدایات ملتی رہتی ہیں پھر بھی کوئی ہوائی جہاز قطب نما سے بے نیاز نہیں۔

جب خلائی جہاز چاند پر پہنچے تو ان کے قطب نما کی سوئی اس طرح شمال کی جانب مڑی رہی۔ اس پر سائنسدانوں نے گمان کیا کہ قطب نما ابھی زمینی کشش کے زیر اثر ہے۔ دوسرے ستاروں کی جانب جانے والے

خلائی جہازوں میں قطب نما کچھ عرصہ کے لئے ناکارہ رہنے کے بعد ستاروں کے شمالی علاقے کی نشاندہی کرتا ہے (اسے زمین کا شمال نہ سمجھا جائے) اور اس طرح جیسے ہر جگہ شمال کی جانب رخ کرنے والی ایک مقناطیسی سوئی موجود ہے اور دوسرے سیاروں مثلاً" مریخ' زہرہ اور مشتری کی جانب جانے والے خلائی جہازوں میں کوئی چیز سامنے آئے جس سے ابھی تک لوگوں کو اطلاع نہیں ہے۔

البتہ چونکہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی کی مانند سائنسی معلومات رکھنے والے ان معلومات کو لوگوں کے مفت حوالے نہیں کرتے۔ اس دور میں بعض سائنسی معلومات فوجی رازوں کا حصہ ہیں اور جو حکومتیں اپنے خلائی جہازوں یا مصنوعی سیاروں کی مدد سے یہ معلومات حاصل کرلیتی ہیں وہ انہیں ظاہر نہیں کرتیں (۱۳۸)۔

ہمیں معلوم ہے کہ دوسرے سیاروں کی جانب سفر کرنے والے خلائی جہاز جن کو سفر میں کئی ماہ لگتے ہیں قطب نما کے بغیر سفر کرتے ہیں۔ اس کے باوجود کہ چاند زمین سے نزدیک ہے چاند کی طرف سفر کرنے والے اپالو کو قطب نما کی ضرورت پیش نہیں آئی کیونکہ قطب نما جب زمین کی مقناطیسی فیلڈ سے دور ہوتا ہے اس میں گڑبڑ شروع ہوجاتی ہے اور وہ کسی خاص سمت کی نشاندہی نہیں کرتا۔

بعض اوقات زمین پر بھی برقی فیلڈ کی موجودگی کی وجہ سے قطب نما فضا میں گڑبڑ کرنے لگتا ہے اور قطب نما کی سوئی ہر لمحے مختلف سمتوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ چونکہ آج تمام بحری جہاز فولاد سے بنائے جاتے ہیں لہٰذا قطب نما کو ان میں اس طرح فٹ کیا جاتا ہے کہ وہ بحری جہاز کی دھات سے کوئی ربط نہ رکھتا ہو ورنہ اس میں خلل پڑ سکتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ستر درجے تک غلطی کرجاتا ہے (قطب نما پر لگے ہوئے کل درجے تین سو ساٹھ ہیں)۔

اگر کرسٹوفر کولمبس کے امریکہ کی جانب سفر کے لئے استعمال ہونے والے بحری جہاز لکڑی کے بنے ہوئے نہ ہوتے اور لوہے کے بنے ہوتے تو وہ اٹالین کشتی ران ہرگز امریکہ دریافت نہ کر سکتا' قطب نما کی غلطی اسے کسی اور سمت لے جاتی۔

موجودہ زمانے کے مشہور ماہرین طبیعیات میں سے ایک پروفیسر ڈاش ہے جو واشنگٹن یونیورسٹی میں پڑھاتا ہے یہ شخص جو ماہر فلکیات بھی ہے کائنات کے بارے میں ایک ایسا نظریہ رکھتا ہے جس سے جعفر صادقؑ کے اس نظریے کی تائید ہوتی ہے کہ اس کائنات میں جو کچھ ہے اس نے خالق کی طرف لوٹنا ہے ہم سب جانتے ہیں کہ سائنس نے انیسویں صدی سے لے کر آج تک کائنات کی صورت و حرکت کی وضاحت کرنے پر توجہ دی ہے اور اس ضمن میں تین علماء کی جانب سے متعدد نظریات پیش کئے گئے ہیں لیکن یہ تمام نظریات صرف تھیوری کی حد تک محدود رہے ہیں۔

علم کائنات میں موجود بعض قوانین مثلاً" قوت تجاذب کا قانون' سورج کے اردگرد سیاروں کے گھومنے کا

قانون اور آزاد اجسام کے گرنے کے قانون کی جانب توجہ دی ہے یہ تمام قوانین انیسویں صدی عیسوی سے پہلے دریافت ہو چکے تھے۔

سائنس دانوں نے جو کچھ آج تک کائنات کی شکل و صورت (محسوس ہونے والی حرکات کے علاوہ) کے بارے میں کہا ہے اس کا تعلق تھیوری سے ہے۔

## آئن سٹائن کا نظریہ نسبیت (Theory of Relativity)

آئن سٹائن کے حامی کہتے ہیں کہ کائنات کے بارے میں آئن سٹائن کا نظریہ نسبیت ریاضی کے اوزان کی بنیاد پر ہے لیکن ریاضی کا ایک ورق ایک ترازو کی مانند ہے۔ جب ترازو کی درمیانی ڈنڈی ایک افقی خط پر رک جاتی ہے تو ہم تصدیق کرتے ہیں کہ دونوں پلڑوں میں وزن برابر ہے۔ لیکن ترازو کی درمیانی ڈنڈی کا افقی خط پر ٹھہرنا اور ترازو کے دو پلڑوں کا برابر ہونا دو پلڑوں میں رکھی گئی چیزوں کا تعین نہیں کرسکتا۔ اگر ہمیں یہ علم نہ ہو کہ ترازو کے دو پلڑوں میں گندم ہے یا پتھر تو ہم ترازو کی درمیانی ڈنڈی کے افقی خط کو دیکھ کر ہرگز اندازہ نہیں لگا سکتے کہ پلڑوں میں کیا ہے ؟ ریاضی کے اوزان جیسا کہ کہا گیا ہے کہ صحیح ہیں اور ریاضی بشری علوم میں سے وہ واحد علم ہے جس کا کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ لیکن ریاضی کے اوزان سے صرف اس بات کا علم ہوسکتا ہے کہ فلاں چیز جو ہم نے پلڑے میں رکھی ہے وہ اس قدر ہے۔ البتہ اس کا علم نہیں ہوسکتا کہ جو چیز پلڑوں میں موجود ہے وہ کیسی ہے ؟ لہٰذا اس کے باوجود کہ ریاضی کے اوزان کے درست ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں پھر بھی یہ بات قابل قبول نہیں کہ آئن سٹائن نے اپنے پلڑوں میں جو کچھ رکھا وہ حقیقت ہے۔ دوسرے یہ کہ آئن سٹائن نے اپنی نسبیت کی تھیوری میں کائنات کے قطر کو تین ہزار ملین نوری سال لکھا ہے۔ جبکہ آج کل ریڈیو ٹیلی سکوپس کی اطلاع کے مطابق اجرام فلکی کے بارے میں بتاتے ہیں کہ ان کا زمین سے فاصلہ نوہزار ملین نوری سال ہے۔

سائنس دانوں نے ستائیس (ریڈیو ٹیلی سکوپ کے) انٹینوں پر مشتمل ریڈیو ٹیلیویژن سکوپ بنائی ہے جو تین شاخوں والے انگریزی کے حرف وائی (Y) یا فرانسیسی ایگرگ پر رکھی گئی ہے۔ ان تین شاخوں کا درمیانی فاصلہ اکیس کلومیٹر ہوگا۔ اس ریڈیو ٹیلی سکوپ کے مجموعہ کی کل طاقت ریڈیو ٹیلی سکوپ کے دوربین کے یونٹ کے برابر ہے جس کا قطر تیس کلومیٹر ہے۔ جب ریڈیو ٹیلی سکوپ کے مجموعے نے کام شروع کیا تو ممکن ہے ثابت ہو کہ کائنات کی وسعت جو نو ہزار ملین نوری سال نظر آتی ہے سے زیادہ ہو۔ جو بات مسلم ہے وہ یہ ہے کہ آئن سٹائن کی نسبیت کی تھیوری کا وہ حصہ جس میں اس نے کہا ہے کہ کائنات کا قطر تین ہزار ملین نوری سال ہے

صحیح نہیں ہے۔

۱۸۱۴ء میں جب انگریزوں نے امریکہ کے دارالحکومت واشنگٹن پر حملہ کر کے تباہی پھیلائی تو اس زمانے میں واشنگٹن یونیورسٹی کے طبیعیات کے استاد نے ایک نظریہ (۱۳۹) پیش کیا جو یہ ہے۔ جب سے ریڈیو ٹیلی ویژن سکوپس نے انسانی بینائی کے میدان میں وسعت پیدا کی ہے اور انسان ان کی مدد سے دوردراز کے اجرام کو دیکھنے لگا ہے' فلکیات کے ماہرین پر ایک نئی بات آشکار ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ کہکشاں کی مانند بعض بڑے اجرام آسمانی تیزی سے حیرت انگیز حرکت کر رہے ہیں اور ایک نقطے کی سمت جا رہے ہیں۔ ان کی تیزرفتاری کا حساب لگانے کے بعد پتہ چلا ہے کہ بعض کہکشائیں اس قدر تیزی سے حرکت کررہی ہیں کہ ان کی رفتار روشنی کی رفتار کا ۹۵ فیصد ہے۔ (۱۴۰)

یہ اجرام فلکی جو خلا میں جہاں کہیں حرکت کر رہے ہیں ان کی حرکت کا رخ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ ایک مرکز کی طرف جا رہے ہیں۔ چونکہ ایسا ہے لہٰذا ضرور اس مرکز تک پہنچتے ہوں گے اور ان کے درمیان ٹکراؤ بھی وقوع پذیر ہوتا ہوگا۔

اس بات کی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی کہ ان بڑے اجرام کے تصادم سے جو ایک مرکز میں ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوں گے کس قدر توانائی وجود میں آتی ہےاور دنیا میں اس توانائی کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ کیا کچھ دوسرے قوانین کے ساتھ کوئی اور جہان وجود میں آتا ہے یا یہ کہ شعاعوں کا ایک گرداب پیدا ہوتا ہے اور دنیا کے آخر تک ایسا ہی ہوتا رہے گا۔

پروفیسر ڈاش جس نے اس نظریہ کا ذکر کیا ہے یہ بات نہیں بتا سکا کہ اجرام فلکی جو دنیا کے اردگرد نہایت تیزی سے ایک مرکز کی طرف جا رہے ہیں وہ اس مرکز تک کب پہنچیں گے۔ اجرام فلکی کی گردش کرنے کے راستے کی قوسیں اس قدر وسیع ہیں کہ پروفیسر ڈاش ابھی تک کمپیوٹر کی مدد سے قوسوں کے راستے کو نہیں سمجھ سکا کہ وہ اس بات کا تعین کرسکے کہ قوسیں آپس میں کہاں ملتی ہیں اور وہ مرکز جہاں اجرام فلکی آپس میں ملتے ہیں کس جگہ واقع ہے ؟ کہا جاتا ہے کہ اس نظریہ سے یہ پتہ نہیں چل سکا کہ اجرام فلکی کی گردش کا خط اس لئے بے معنی ہے کہ اجرام فلکی کی روشنی طاقتور قوت تجاذب کے مراکز میں جذب ہوجاتی ہے۔ اگر اس طرح ہے تو اجرام فلکی جو حیرت انگیز رفتار سے حرکت کر رہے ہیں ان کے قریب طاقتور قوت تجاذب کے مراکز واقع ہونے چاہئیں جو ان کی روشنی کو ٹیڑھا کریں۔ اس صورت میں وہ مادہ مراکز ہیں ورنہ اس قدر طاقتور قوت تجاذب نہ رکھتے۔

اس تھیوری پر ایک بڑا اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ کہکشائیں جو مادہ ہیں اس قدر تیزرفتاری سے حرکت نہیں کرسکتیں۔ ڈاش کہتا ہے کہ اجرام فلکی جو اس قدر تیزی سے حرکت کر رہے ہیں ان کا تعلق چوتھی قسم "پلازما"

سے ہے۔ ایک زمانے سے علم نے مادے کی چوتھی قسم (جو ٹھوس، مائع اور گیس کے علاوہ ہے) کو تسلیم کرلیا ہے اور اس بات کا قائل ہے کہ ممکن ہے مادہ ایک ایسی صورت اختیار کرے جو نہ ٹھوس ہو نہ مائع اور نہ گیس۔

بہرکیف ماہرین طبیعیات کے بقول پلازما بھی روشنی کے ۹۵ فیصد کے برابر حرکت نہیں کرسکتا ورنہ وہ اپنی ماہیت کھو بیٹھے گا اور شعاع میں تبدیل ہوجائے گا۔ لیکن پروفیسر ڈاش اس بات پر مصر ہے کہ کہکشاؤں کے اجرام جو اس قدر تیزی سے ایک مرکز کی طرف جا رہے ہیں پلازما ہیں اور اس کے بقول اگر کہکشاؤں میں پلازما کے وجود کو تسلیم نہ کریں تو بھی ان کی تیزرفتاری میں کوئی شک نہیں۔ چونکہ کہکشاؤں کے اجرام کے متعلق نظریہ اگر ایک فرضی نظریہ ہو تو بھی ان کی تیزرفتاری کے بارے میں نظریہ فرضی نہیں بلکہ کمپیوٹر کے ذریعے اس کی پیمائش کی گئی ہے جس کے مطابق ان اجرام کی رفتار دو لاکھ پچاسی ہزار کلومیٹر فی سیکنڈ ہے۔ بہرحال اس کے نظریے کے مطابق دوردراز واقع تمام اجرام فلکی نہایت تیزی سے ایک مرکز کی طرف جا رہے ہیں۔ اس سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ جس کہکشاں میں ہمارا سورج واقع ہے وہ اور دوسری کہکشائیں بھی نہایت ست رفتاری سے اسی مرکز کی طرف رواں دواں ہیں۔ اگر اس نظریئے کی تائید کی جائے تو سائنسی نظریئے اور امام جعفر صادقؑ کے نظریئے میں سوائے الفاظ کے ہیرپھیر کے کوئی فرق نہیں۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا تمام چیزیں خدا کی طرف پلٹتی ہیں اور ڈاش کے بقول تمام چیزیں ایک مرکز کی طرف پلٹتی ہیں۔ واشنگٹن یونیورسٹی کے فزکس کے استاد جس کے بارے میں ہم نے ذکر کیا ہے کہ وہ ماہر فلکیات بھی ہے۔ اس کا نظریہ یورپ کی لیون یونیورسٹی کے استاد ایلبے لامتر (۱۴۱) کے نظریئے کے بالکل الٹ ہے۔ جس کا نظریہ دنیا کی وسعت کے بارے میں گزشتہ صفحات میں قارئین کی نظر سے گزرچکا ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ دنیا وسیع ہورہی ہے اور کہکشائیں کناروں کی جانب بڑھ رہی ہیں۔ لیکن ایلبے لامتر کے زمانے میں کہکشاؤں کو دیکھنے کا واحد ذریعہ فلکی دوربین تھی اور ریڈیو ٹیلی سکوپ کا وجود نہ تھا۔ وہ شخص دوردراز کہکشاؤں کو ریڈیو ٹیلی سکوپ کے ذریعے مشاہدہ نہیں کرسکا تھا اور جو حساب کتاب آج کمپیوٹر کی مدد سے ہورہا ہے اس زمانے میں اس کی کوئی مثال نہ تھی۔ صرف یہ ہوتا تھا کہ ریاضی دانوں کے ایک بڑے گروہ کو ستاروں کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کے لئے کام پر لگا دیا جاتا تھا تاکہ آج کل خلائی جہازوں کی دوسرے سیاروں کی طرف پرواز میں پیش آنے والے مسائل کا حل نکالیں۔ دوسرے یہ کہ تھوڑے تھوڑے فاصلوں سے ایک کہکشاں کی حرکت کا مشاہدہ کرتے ہوئے یہ سمجھ میں نہیں آسکتا کہ وہ مرکز سے پرے ہٹ رہی ہے یا مرکز کی طرف بڑھ رہی ہے۔ شاید دیکھنے والے کو یہ دکھائی دے کہ کہکشاں مرکز سے فرار کر رہی ہے۔ حالانکہ کہکشاں مرکز کی جانب گامزن ہو۔ اس کے باوجود کہ آج فلکیات کا حساب و کتاب ایلبے لامتر کے زمانے کی نسبت زیادہ صحیح اور ترقی یافتہ ہے۔ پھر بھی ہم پروفیسر ڈاش کے نظریئے کو مدنظر رکھنے کے بعد بھی

ایلبے لامتر کے نظریئے کو مسترد نہیں کرسکتے۔ کیونکہ ہم ابھی تک اس حقیقت تک رسائی حاصل نہیں کرسکے کہ کہیں یہ ایلبے لامتر کی رائے اور جو کچھ پروفیسر ڈاش کہتا ہے وہ محض تھیوری ہے۔ اس کے دو پوائنٹس کمزور ہیں۔ پہلا یہ کہ مادہ روشنی کی حرکت کی رفتار کے ۹۵ فیصد کے برابر حرکت نہیں کرسکتا۔ للذا ماہرین طبیعیات کے بقول پلازما بھی نہیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ پروفیسر یہ نہیں بتا سکا کہ وہ مرکز جس کی جانب تمام کہکشائیں جارہی ہیں وہ کونسا ہے ؟ اور کہاں واقع ہے ؟ اگر قوت تجاذب کا قانون جو ہمارے نظام شمسی میں حکم فرما ہے نظام شمسی سے باہر بھی لاگو ہو تو ظاہر ہے کہ جس مرکز کے گرد کائنات کی تمام کہکشائیں گھوم رہی ہیں وہ ایک مادی مرکز ہے جس کی قوت تجاذب تمام کہکشاؤں کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے اور ایسا مادی جسم جس کی قوت تجاذب اس قدر زیادہ ہو ابھی تک دریافت نہیں ہوسکا جس کی جانب تمام کہکشائیں رواں دواں ہوں اور اس نظریہ کا حامل بھی ایسے مرکز کی وضاحت نہیں کرسکا جس کی طرف تمام کہکشائیں کھنچی چلی جا رہی ہیں۔ امام جعفر صادقؑ اپنے زمانے کے نہایت ہی تحمل مزاج استاد تھے۔ آپ درس پڑھانے کے بعد اپنے علمی مخالفین کے اعتراضات کا جواب بھی دیتے تھے۔ کبھی ایسا ہوتا تھا کہ آپ علمی مخالفین کے جواب دینے میں اس قدر مشغول ہوجاتے کہ کھانا کھانے کے لئے گھر بھی نہ جاسکتے تھے اور ایک آدمی کو بازار بھیجتے کہ وہ بازار سے ایک روٹی لے آئے۔ یہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ چھوٹی سی روٹی کو آپ نے مکمل طور پر کھایا ہو۔ چند لقمے کھانے کے بعد روٹی بچ جاتی تھی۔ جن دنوں کھانے کے لئے گھر نہیں جاتے تھے تو اس سوکھی روٹی پر گزارا کرلیتے تھے۔ آپ نے علمی مخالفین سے درخواست کر رکھی تھی کہ جب تک درس ختم نہ کرلیں اس وقت تک کوئی اعتراض نہ کریں۔ جب درس ختم ہوجائے تو جو جی میں آئے پوچھیں۔ امام جعفر صادقؑ درس ختم کرنے کے بعد اپنے شاگردوں کو چھٹی دے دیتے تھے۔ معمول کے مطابق ایسا ہوتا تھا کہ آپ درس ختم کرنے کے بعد نماز ظہر پڑھتے تھے اور گھر چلے جاتے تھے۔ آپ کے بعض شاگردوں کو جنہیں یہ علم ہوتا کہ ہمارے استاد آج اپنے علمی مخالفین کے سوالوں کے جوابات مرحمت فرمائیں گے وہ اس دن کھانا کھانے کے بعد گھر سے واپس آجاتے تاکہ امام جعفر صادقؑ کے اپنے علمی مخالفین کے بحث مباحثے کے موقع پر موجود رہیں۔ امام جعفر صادقؑ کے علمی مخالفین میں سے ایک ابوشاکر نامی بھی تھا۔ ایک دن جب امام جعفر صادقؑ نماز سے فارغ ہوچکے تو یہ شخص آپ کے پاس آیا اور بیٹھ کر کہنے لگا۔ کیا مجھے اجازت ہے کہ جو کچھ میں چاہوں اس کے بارے میں اظہار خیال کروں ؟ امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا جو چاہتے ہو کہو۔ ابوشاکر نے کہا۔ اپنے شاگردوں اور سامعین کو آپ افسانے کے ذریعے کیوں فریب دیتے ہیں ؟ آپ جو کچھ خدا کے بارے میں کہتے ہیں وہ افسانے سے زیادہ کچھ نہیں۔ آپ لوگوں کو افسانہ سرائی کے ذریعے ایسی چیز قبول کرنے پر مائل کرتے ہیں جس کا کوئی وجود نہیں۔ خدا کی عدم موجودگی کی دلیل یہ ہے کہ ہم اپنے حواس خمسہ کے ذریعے اسے درک نہیں کرسکتے۔ جیسے آپ کہتے ہیں کہ انسان اپنے حواس خمسہ کے ذریعے خدا کو درک نہیں کرسکتا لیکن

ممکن ہے کہ انسان اپنے باطنی حواس کے ذریعے خداوند تعالٰی کی معرفت حاصل کر سکے مگر باطنی حواس سے کام لینے کے لئے ظاہری حواس سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ اگر آپ اپنے ذہن میں کسی چیز کا تصور لاتے ہیں تو اس میں بھی آپ کے ایک یا زیادہ ظاہری حواس کارفرما ہوں گے۔ اگر آپ اپنے ایک دوست کی غیر موجودگی میں اسے اپنے ذہن میں مجسم کرتے ہیں تو اگر آپ کی بینائی کی حس نہ ہو تو اس کو آپ کا دیکھنا محال ہے۔ اگر آپ کی سننے کی حس نہ ہو تو باطن میں آپ اس کی آواز بھی نہیں سن سکتے۔ جب آپ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں تو اپنی لمس کرنے کی حس کو کام میں لاتے ہیں ورنہ آپ ہرگز باطن میں اس کے ہاتھ کو مس نہیں کر سکتے۔ پس آپ کے تمام باطنی احساسات آپ کے پانچ ظاہری حواس سے وابستہ ہیں۔ اگر آپ کے ظاہری حواس مفقود ہوں تو آپ ہرگز اپنی کسی باطنی حس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے لہٰذا اگر آپ کہتے ہیں کہ آپ اپنے باطنی احساسات کے ذریعے خدا کو درک کرتے ہیں تو میں اس بات کو تسلیم نہیں کرتا۔ ممکن ہے آپ کہیں کہ نہ تو آپ خدا کو اپنے باطنی حواس کے ذریعے درک کرتے ہیں اور نہ ہی ظاہری حواس کے ذریعے بلکہ اپنی عقل کے ذریعے اس کے وجود تک پہنچتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ آپ کی عقل بھی کسی ظاہری حس کے بغیر کسی چیز کو سمجھنے پر قادر نہیں ہے۔ جس چیز کو سمجھنا چاہئے وہ پانچ ظاہری حواس کے ذریعے سمجھی جاتی ہے۔ اگر آپ عقل کی مدد سے ظاہری حواس کو کام میں لائے بغیر کوئی دلیل لائیں اور نتیجہ نکالیں کہ حواس خمسہ میں سے کسی ایک حس نے بھی اس دلیل یا نتیجے میں مدد نہ کی ہو تو میں تسلیم کرلوں گا کہ آپ عقل کے ذریعے خداوند تعالٰی کے وجود تک پہنچ سکتے ہیں۔ جس خدا کی عبادت کے لئے آپ لوگوں کو دعوت دیتے ہیں وہ آپ کے اپنے تخیل کی اختراع ہے۔ آپ نے اپنے تخیل میں ایک ایسے وجود کو متصور اور متشکل کیا ہے۔ جس طرح آپ بات کرتے ہیں' غذا کھاتے ہیں اور سوتے ہیں اسی طرح آپ کا خیال ہے کہ وہ بھی بات کرتا ہے' غذا کھاتا اور سوتا ہے۔ آپ اپنے اثر و رسوخ کو لوگوں میں قائم رکھنے کے لئے اسے کسی کو نہیں دکھاتے اور کہتے ہیں کہ وہ دیکھا نہیں جاسکتا اور نہ ہی دیکھا جا سکے گا اور نہ ہی اس نے کبھی ماں کے پیٹ سے جنم لیا ہے نہ اس کی کوئی اولاد ہے۔ آپ کا خدا ہندوؤں کے اس پردہ نشین بت کی مانند ہے جس پر ہندوؤں نے پردہ ڈالا ہوا ہے اور کسی نے اس بت کو نہیں دیکھا۔

مندر کے متولیوں کا کہنا ہے کہ یہ بت اپنے آپ کو ہرگز انسانوں کو نہیں دکھاتا کیونکہ اسے پتہ ہے کہ وہ اسے دیکھیں گے تو مر جائیں گے۔ متولیوں کے بقول یہ بت از راہ مہربانی اپنے آپ کو کسی کو نہیں دکھاتا۔ اس طرح آپ کا خدا بھی لوگوں پر ظاہر نہیں ہوتا ہوگا کہ لوگ اس کے دیکھنے سے مر نہ جائیں اور آپ کہتے ہیں کہ اس کائنات کو خدا نے خلق کیا ہے۔ وہ بھی ایسا خدا جس کی نہ تو آواز سنی جاسکتی ہے نہ ہی اسے دیکھا جاسکتا ہے اور صرف ایک آدمی اس کی آواز کو سنتا ہے۔ وہ پیغمبر ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ کائنات کو کسی نے خلق نہیں کیا۔ یہ خود بخود وجود میں آئی ہے۔ کیا صحرا کی گھاس کو کوئی پیدا کرتا ہے ؟ یا یہ کہ گھاس صحرا میں خود بخود اُگتی

ہے۔ کیا چیونٹی اور پسو کو کوئی خلق کرتا ہے ؟ کیا ایسا نہیں ہے کہ یہ مخلوقات خود بخود وجود میں آتی ہیں۔ اے وہ شخص ! جو عالم ہونے کا دعوی کر رہا ہے اور کہتا ہے کہ مسلمانوں کے پیغمبرؐ کا جانشین ہے۔ میں تجھ سے کہتا ہوں کہ جتنے افسانے لوگوں کے من گھڑت ہیں ان میں سے سب سے گھسا پٹا اور خیالی افسانہ ایک ان دیکھے خدا کی موجودگی کا ہے۔ اگر دوسرے افسانے من گھڑت ہیں تو ان افسانوں میں انسانی زندگی کی شبیہہ ہوتی ہے اور جو کردار ان افسانوں میں ہوتے ہیں اگرچہ ان کا وجود نہیں ہوتا لیکن ان کے اعمال انسانوں کے اعمال کی مانند ہوتے ہیں۔ انسان جو دکھائی دیتے' یا باتیں کرتے' غذا کھاتے' عشق لڑاتے اور سوتے ہیں۔ انسان جس وقت ایک خیالی افسانے کو سنتا ہے تو اگرچہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ افسانہ بے بنیاد ہے لیکن اسے سنتے ہوئے لذت اٹھاتا ہے کیونکہ وہ افسانے میں اپنے آپ یا اپنی طرح کے مردوں و عورتوں کو دیکھتا ہے اور جانتا ہے کہ اگرچہ وہ مرد اور عورتیں موجود نہیں لیکن ان کی طرح کے لوگ موجود ہیں جو کوئی کسی افسانے کو سنتا ہے اس پر اسے یقین نہیں آتا لیکن اس کی عقل اسے کہتی ہے کہ ان عورتوں اور مردوں کا وجود جن کا نام افسانے میں لیا گیا ہے ممکن ہے وہ موجود ہوں۔ لیکن انسانی عقل جس کے بارے میں ہم نے کہا کہ پانچ ظاہری حواس سے وابستہ ہے وہ ایسے خدا کو جس کے بارے میں آپ بات کرتے ہیں تسلیم نہیں کرتی چونکہ عقل کسی ایسے وجود کو تسلیم نہیں کر سکتی جو نہ تو دیکھا جاسکے اور نہ ہی اس کی آواز سنائی دے' نہ اسے سونگھا جاسکےاور نہ اسے لمس کیا جاسکے اور نہ ہی اسے چکھا جاسکے۔ پیغمبر جو آپ سے پہلے گزر چکے ہیں اور ان کے بعد آپ نے لوگوں کو ایک لاموجود خدا کے بارے میں فریب دیا ہے جس کا وجود آپ کی ذہنی اختراع ہے اور آپ اس کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ ہر چیز کو دیکھتا ہے لیکن کوئی اسے نہیں دیکھ سکتا۔ آخر ایک ایسا خدا جس کا جسم نہیں ہے کہ اس کی آنکھیں ہوں تاکہ لوگوں کو دیکھے۔ اس کی زبان ہو تاکہ وہ کلام کرے اور وہ جو جسمانی وجود نہیں رکھتا کیسے کسی چیز کو تخلیق کرسکتا ہے ؟ ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ آپ سے فریب کھاتے اور یقین کرلیتے ہیں کہ خدا موجود ہے جو دیکھا نہیں جا سکتا ہے لیکن میں آپ کے فریب میں نہیں آتا۔ ایسے افسانے کو جو ایسے خدا کے بارے میں جو دکھائی نہیں دیتا اسے میں قبول نہیں کرتا۔ میں ایک ایسے خدا کی عبادت کروں گا جسے میں اپنی دو آنکھوں سے دیکھ سکوں اور دو کانوں سے سن سکوں اور اگر اس کی آواز نہ ہو تو اسے اپنے دو ہاتھوں سے چھو سکوں۔

میں ایک ایسے خدا کی جو لکڑی یا پتھر کا بنا ہوا ہو کی عبادت کروں گا کیونکہ اس کو میں دیکھ سکتا ہوں اور اپنے دونوں ہاتھوں سے لمس کرسکتا ہوں۔ آپ کہتے ہیں کہ چونکہ خود میں نے لکڑی سے خدا کو تراشا ہے اور اسے وجود میں لانے والا ہوں لہٰذا زیب نہیں دیتا کہ میں اس کی پوجا کروں۔ کیا یہ نہ دکھائی دینے والا خدا آپ جس کی عبادت کے لئے لوگوں کو وصیت کرتے ہیں آپ کی اپنی طرف سے اور آپ کے تخیل کی پیداوار کی

بدولت وجود میں نہیں آیا ہے۔ میں اور آپ اپنے اپنے خداؤں کو وجود میں لائے ہوئے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میرا خدا دکھائی دیتا ہے اور اسے لمس کیا جاسکتا ہے جبکہ آپ کا خدا نہ تو دکھائی دیتا ہے اور نہ ہی اس کو لمس کیا جاسکتا ہے۔ چونکہ میں افسانے کی پیروی نہیں کرتا للذا جب سے میں نے اپنا خدا تیار کیا ہے اس وقت سے میں نے اس کی پوجا شروع کردی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس نے اس کائنات کو اور مجھے بنایا ہے لیکن آپ چونکہ ایک موہوم خدا کو وجود میں لائے ہیں اور اس کائنات اور بنی نوع انسان کی تخلیق کے افسانے کو بھی اس سے نسبت دی ہے اور کہتے ہیں کہ اگر وہ نہ ہوتا تو یہ کائنات اور بنی نوع انسان وجود میں نہ آتے۔ جو کچھ ہے وہ خدا کی طرف سے وجود میں آیا ہے۔ میں چونکہ افسانے کا قائل نہیں ہوں للذا میں نہیں کہتا کہ جس خدا کو میں نے خود بنایا ہے اس نے کائنات اور بنی نوع انسان کو تخلیق کیا ہے۔ لیکن چونکہ آپ افسانے کے معتقد ہیں للذا آپ نے اپنے خدا کو بنانے کے بعد یہ کہہ دیا ہے کہ اس نے کائنات اور بنی نوع انسان کو تخلیق کیا ہے۔ اس بات کے کہنے کی کیا ضرورت ہے کہ خدا نے کائنات اور بنی نوع انسان کو تخلیق کیا ہے۔ آپ اس افسانے کے ذریعے لوگوں کو کیوں گمراہ کرتے ہیں ؟ لوگوں کو حقیقت نہیں پوچھنے دیتے۔ اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ کائنات اور بنی نوع انسان خدا کے تخلیق کئے ہوئے ہیں۔ کائنات اور بنی نوع انسان خود بخود وجود میں آئے ہیں اور یہ ہم ہیں جو اپنے خدا کو وجود میں لاتے ہیں۔ خالق ہم ہیں نہ کہ خدا۔ میں اپنے خدا کو اپنے ہاتھوں سے تراشتا ہوں اور وجود میں لاتا ہوں جبکہ آپ اپنے خدا کو اپنے وہم و گمان کے ذریعے وجود میں لاتے ہیں۔

اس دوران جبکہ ابوشاکر یہ گفتگو کررہا تھا ایک بار بھی امام جعفر صادقؑ نے اس کی قطع کلامی نہیں کی۔ جو شاگرد اس مجلس میں بیٹھے تھے انہوں نے کچھ کہنا چاہا لیکن امام جعفر صادقؑ نے اشارے سے انہیں منع کردیا۔ جب ابوشاکر کی بات ختم ہوچکی تو اس کے بعد امام جعفر صادقؑ نے بات کرنے کے لئے چند سیکنڈ تک ہونٹ نہیں ہلائے۔ وہ اس بات کے منتظر تھے کہ ابوشاکر بات کرے۔ اس کے بعد آپ نے ابوشاکر سے پوچھا کہ کیا اس کی گفتگو ختم ہوچکی ہے ؟ اور تو کچھ نہیں کہنا چاہتا ؟ ابوشاکر نے کہا۔ میری آخری بات یہ ہے کہ آپ نے ان دیکھے خدا کو لوگوں سے اس لئے متعارف کرایا ہے کہ آپ اس کے ذریعے اثر و رسوخ پیدا کریں' دولتمند بنیں اور آپ کی زندگی خوشحال گزرے۔ بس یہ میری آخری بات تھی اس کے بعد میں کچھ نہیں کہتا۔ امام جعفر صادقؑ نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا۔ چونکہ تمہاری گفتگو ختم ہوچکی ہے للذا میں تمہیں جواب دیتا ہوں اور اس جواب کو تمہاری گفتگو کے آخری حصے سے شروع کرتا ہوں۔ تم نے کہا ہے کہ میں اس لئے لوگوں کو خدا پرستی کی طرف دعوت دیتا ہوں کہ انہیں فریب دے کر اثر و رسوخ پیدا کروں اور زندگی کو آرام سے گزاروں۔ اگر میری حالت خلیفہ جیسی ہوتی تو تیری یہ تہمت شاید مناسب نظر آتی۔ لیکن تم نے آج یہاں پر میری روزمرہ کی غذا دیکھی ہے اور مشاہدہ کیا ہے کہ میں کتنے لقمے سوکھی روٹی کھاتا ہوں اور تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ آج رات

میرے گھر آؤ اور مشاہدہ کرو کہ میری شام کی غذا کیا ہے ؟ اور میرے گھر میں کس قدر سامان ہے ؟ اے ابوشاکر اگر میں دولت جمع کرنے والا ہوتا اور تمہارے بقول زندگی کو آرام سے گزارتا تو ضروری نہ تھا کہ میں خدا پرستی کی تبلیغ کے ذریعے دولت کے حصول کی تگ و دو کرتا اور آرام سے زندگی گزارتا۔ میں کیمیادانی (۱۴۲) کے ذریعے دولتمند بن سکتا تھا اور اگر اس ذریعے سے دولت حاصل نہ کرنا چاہتا تو تجارت کے ذریعے دولت حاصل کرسکتا تھا کیونکہ دوسرے ممالک کے بارے میں میری معلومات تاجروں سے زیادہ ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ کون سے ملک میں کس قسم کا سامان تیار ہوتا ہے اور کون سی اقسام کا سامان دوسرے ممالک لے کے جانا فائدہ مند ہے۔ اس شہر کے تاجروں سے پوچھو کہ اصفہان' ترکی اور کیلیکی میں کونسا سامان تیار ہوتا ہے جس کا خریدنا ان کے لئے سودمند ہے۔ میرا خیال ہے وہ تمہیں جواب نہیں دے سکتے کیونکہ یہاں کے تاجر صرف شام' مصر' الجزائر اور بین النہرین (۱۴۳) میں تیار کئے جانے والے سامان سےواقف ہیں اور دوسرے ممالک کے سامان جسے جزیرۃالعرب میں لانا فائدہ مند ہے اس کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں رکھتے لیکن میں جانتا ہوں کہ غیر ممالک میں کون سا سامان موجود ہے جسے لاکر فروخت کیاجائے تو خاطرخواہ منافع ہوتا ہے اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس سامان کو کس راستے سے لایا جائے کہ سامان لانے کا خرچ کم سے کم آئے۔

اے ابوشاکر تو نے کہا ہے کہ میں خدا پرستی کی تبلیغ کے ذریعے لوگوں کو فریب دے کر مال و دولت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ تیرے جواب میں میں کہتا ہوں کہ جب سے میں نے لوگوں میں خدا پرستی کی تبلیغ شروع کی ہے اس دن سے لے کر آج تک میں نے کسی سے چھوٹے چھوٹے تحفوں کے سوا وہ بھی پھل وغیرہ کے علاوہ کوئی چیز حاصل نہیں کی۔ جب کہ خزاں کے موسم میں کھجوریں پکتی ہیں تو میرا ایک دوست اپنے باغ سے کھجوریں چن کر اور ایک کریٹ میں ڈال کر اپنے نوکر کے ذریعے مجھے بھیجتا ہے اور میں یہ تحفہ اس لئے قبول کرتا ہوں کہ میرا دوست خفا نہ ہو۔ میرا ایک اور دوست جس کا طائف میں اناروں کا باغ ہے۔ جب موسم خزاں میں انار پکتے ہیں تو ان میں سے کچھ وہ کریٹ میں ڈال کر مدینے آنےوالے کارواں کے ذریعے میرے لئے بھیجتا ہے اور میں ان اناروں کو صرف اس لئے قبول کرتا ہوں کہ میرا دوست مجھ سے خفا نہ ہو۔ اے ابوشاکر تو اس بات کی تصدیق کرے گا کہ کوئی شخص ایک عرصہ تک اس لئے لوگوں میں تبلیغ نہیں کرتا کہ اس کے بدلے اسے سال میں ایک دفعہ انار کے چند دانے اور کچھ کھجوریں حاصل ہوں۔ اے ابوشاکر میں نے سنا ہے کہ تیرا باپ موتیوں کو پہچانتا تھا۔ اگر تو موتی شناس ہے تو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں ہر قسم کے ہیرے اورجواہرات کی شناخت رکھتا ہوں۔ کوئی ایسا موتی نہیں جسے میں نہیں پہچانتا اور اس کی قیمت نہیں لگاسکتا۔ اگر میں مال و دولت جمع کرنے کا خواہشمند ہوتا تو ضروری نہیں تھا کہ لوگوں کو خدا پرستی کے راستے کی طرف دعوت دینے کے ذریعے ہی مال و دولت اکٹھی کرتا۔ بلکہ میں جواہرات کا کاروبار کرکے بھی امیر بن سکتا تھا۔ اس بات کے پیش نظر کہ تمہارا باپ موتیوں کا

تاجر تھا کیا تم جانتے ہو کہ یاقوت کتنی قسم کے ہیں ؟ ابو شاکر نے نفی میں جواب دیا۔ امام جعفر صادقؑ نے پوچھا کیا تمہیں معلوم ہے کہ الماس کتنی قسم کے ہیں ؟ اور تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ الماس کے کتنے رنگ ہوتے ہیں ؟ ابو شاکر نے جواب دیا مجھے الماس کی قسموں کے بارے میں کوئی علم نہیں۔ امام جعفر صادقؑ نے کہا میں الماس کی قسموں سے واقف ہوں اور ہر قسم کی قیمت بھی مجھے معلوم ہے حالانکہ میں نے جواہر کی تجارت نہیں کی اور جواہر کی اقسام کے بارے میں میری معلومات میرے علم کی رو سے ہیں۔ موتی بیچنے والے مختلف اقسام کے موتی بیچتے ہیں لیکن انہیں یہ معلوم نہیں کہ یہ موتی کہاں سے آئے ہیں ؟ کیا تو جانتا ہے کہ الماس کی چمک کس وجہ سے ہے ؟ ابو شاکر بولا نہ میں الماس کا تاجر تھا نہ میرا باپ کہ مجھے الماس کی چمک کے بارے میں علم ہو۔ امام جعفر صادقؑ نے کہا ہیرے کی چمک اس کی تراش خراش کی وجہ سے ہے' تجھے معلوم ہے کہ ہیرا کیسے حاصل کیا جاتا ہے ؟ ابو شاکر نے نفی میں جواب دیا۔ امام جعفر صادقؑ نے کہا ہیرا دریاؤں اور ندیوں کی تہوں سے حاصل ہوتا ہے (۱۴۴) اور جب اسے حاصل کرتے ہیں تو تراشنے کے لئے ماہرین کے حوالے کر دیتے ہیں۔ جب وہ تراشنے کے بعد تیار ہو جاتا ہے تو اس میں چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ ہیرا تراشنے والے ماہرین بچپن سے باپ' بھائی یا اپنے عزیزوں میں سے کسی ایک کے زیر سایہ تربیت حاصل کرتے ہیں اور ہیرا تراشنے کے رازوں سے آگاہی حاصل کرتے ہیں۔ ہیرے کا تراشنا ایک وقت طلب اور دشوار کام ہے۔ اسے ہیرے کے علاوہ کسی دوسری چیز سے نہیں تراشا جا سکتا۔

یہ باتیں میں نے تمہیں اس لئے بتائی ہیں کہ اگر میں دولتمند بننا چاہتا تو جواہر کا تاجر بن جاتا۔ چونکہ مجھے علم کے ذریعے جواہر کی شناخت ہے لہٰذا نہایت ہی قلیل عرصے میں جواہر فروشی کے ذریعے دولتمند بن جاتا۔ اب میں تمہارے اعتراض کے دوسرے حصے کی طرف آتا ہوں جو تمہارا اصلی اعتراض ہے۔ تو نے کہا ہے کہ میں افسانہ سرائی کرتا ہوں اور لوگوں کو ایسے خدا کی عبادت کی طرف دعوت دیتا ہوں جو دکھائی نہیں دیتا۔ اے ابو شاکر تو جو ان دیکھے خدا کا منکر ہے' اپنے اندر دیکھ سکتا ہے ؟ ابو شاکر نے کہا نہیں۔ امام جعفر صادقؑ نے اظہار خیال فرمایا کہ جب تو اپنے اندر نہیں دیکھ سکتا تو تجھے یہ نہیں کہنا چاہئے تھا کہ ان دیکھے خدا کی موجودگی ایک افسانے سے زیادہ نہیں البتہ اگر تو اپنے اندر دیکھ سکتا تو پھر ان دیکھے خدا کے وجود کو ایک افسانہ قرار دے سکتا تھا۔ ابو شاکر بولا اپنے اندر دیکھنے کا ایک غیر موجود خدا کی عبادت سے کیا تعلق ؟ امام جعفر صادقؑ نے کہا تو کہتا ہے کہ جو چیز دکھائی نہ دے اور اس کی آواز سنی نہ جاسکے اور اسے چھوا نہ جاسکے یا اسے سونگھا یا چکھا نہ جاسکے تو ایسا وجود عبادت کے لائق نہیں۔ ابو شاکر نے کہا اسی طرح ہے۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کیا تو اپنے جسم میں خون کی حرکت کی آواز سنتا ہے ؟ ابو شاکر بولا میں اس کی آواز نہیں سنتا۔ کیا جسم میں خون حرکت کر رہا ہے ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ہاں' اور کیا تو اپنے جسم میں

خون کی بو سونگھ سکتا ہے ؟ ابوشاکر نے کہا نہیں۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا اے ابوشاکر خون تمہارے سارے جسم میں چند منٹوں میں ایک مرتبہ گردش مکمل کر لیتا ہے۔ اگر خون کی یہ حرکت جسم میں چند منٹوں کے لئے رک جائے تو تو مر جائے گا۔ کیا آج تک تم نے اپنے جسم میں خون کی گردش دیکھی ہے ؟ ابوشاکر نے کہا نہیں اور میں اسے تسلیم نہیں کر سکتا کہ خون جسم میں متحرک ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا جو چیز تجھے اس بات کو قبول کرنے میں مانع ہے کہ خون انسانی نسوں میں حرکت کر رہا ہے وہ تمہاری جہالت ہے اور یہی جہالت ان دیکھے واحد خدا کو تسلیم کرنے میں مانع ہے۔ کیا تو اس مخلوقات سے مطلع ہے جو خداوند تعالیٰ نے تمہارے جسم میں تخلیق کر کے کام پر لگا دی ہے جس کی وجہ سے تم زندہ ہو ؟ ابوشاکر بولا نہیں۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا چونکہ تم اپنے مشاہدات پر تکیہ کرتے ہو اور جو کچھ تمہیں نظر نہیں آتا اس کے بارے میں کہتے ہو کہ اس کا وجود نہیں ہے حالانکہ تم اسے دیکھ نہیں پائے۔ اگر تم اپنی جہالت کو کم کرنے کی جستجو کرتے تو تمہیں پتہ چلتا کہ تمہارے جسم میں اس قدر زندہ مخلوقات ہیں جن کی تعداد بیابان کی ریت جتنی ہے اور وہ تمہارے جسمانی ڈھانچے کے اندر وجود میں آتے اور بڑھتے رہتے ہیں اور ان سے مزید تولید ہوتی ہے۔ ایک عرصے کے بعد وہ ختم ہو جاتے ہیں۔ لیکن تم نہ ان کو دیکھ سکتے ہو اور نہ ان کی آواز سن سکتے ہو اور نہ ہی انہیں چھو سکتے ہو اور نہ ان کی بو سونگھ سکتے ہو اور نہ ہی تمہیں اس بات کا علم ہے کہ ان کا ذائقہ کیسا ہے ؟ اے ابوشاکر جان لو کہ تمہارے اندر موجود جاندار جو تمہارے ڈھانچے کے اندر زندگی بسر کر رہے ہیں اور پھر مر جاتے ہیں ان کی تعداد اس دنیا کے تمام انسانوں کی تعداد سے زیادہ ہے بلکہ بیابان کی ریت کے ذرات سے بھی زیادہ ہے۔ یہ وجود میں آتے' پھلتے پھولتے اور مر جاتے ہیں تاکہ تم زندہ رہو اور اگر یہ جاندار مخلوق جسے خدا نے تمہارے اندر کام پر لگا رکھا ہے اپنا کام چھوڑ دیں تو تم مر جاؤ گے۔ لیکن چونکہ تم جاہل ہو لہذا ان کے وجود کا انکار کرتے ہو اور کہتے ہو چونکہ میں انہیں نہیں دیکھتا اور ان کی آواز نہیں سن سکتا لہذا میں یہ تسلیم نہیں کرتا کہ وہ موجود ہیں۔ تمہارا خیال ہے کہ جو چیز تمہیں اپنے ڈھانچے کے اندر موجود اس جاندار مخلوق کا انکار کرنے پر اکساتی ہے وہ تمہاری عقل' فہم و فراست کی قوت ہے جبکہ درحقیقت وہ بے عقلی اور ناسمجھی ہے۔ یہ جہالت اور نافہمی ہے جو تمہیں اپنے جسم میں خون کی حرکت اور تمہارے ڈھانچے کے اندر موجود جانداروں کے انکار پر مائل کرتی ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ دنیا میں ایسے لوگ ہیں جن کی آنکھیں ہیں لیکن دیکھتے نہیں اور جن کے کان تو ہیں لیکن سنتے نہیں اور اپنی جہالت کو علم اور بے عقلی کو عقل خیال کرتے ہیں۔ یہ کیوں کہا گیا ہے کہ جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے خدا کو پہچان لیا۔

اے ابوشاکر ! اگر تو اپنے آپ کو پہچان لیتا اور جان جاتا کہ تمہارے جسم کے اندر کیا وقوع پذیر ہو رہا ہے اور تمہارے وجود کے اندر کس قدر جاندار مخلوق پیدا ہوتی' بڑھتی اور مر جاتی ہے تاکہ تم زندہ رہو' تو تم

ہرگز یہ نہ کہتے کہ چونکہ میں خدا کو نہیں دیکھ رہا' اس کی آواز نہیں سن رہا اور نہ ہی اسے لمس کر رہا ہوں لہٰذا میں اس کے وجود کو قبول نہیں کرتا اور ان دیکھے خدائے واحد کو افسانہ سمجھتا ہوں۔

اے ابوشاکر تو اس پتھر کو دیکھ رہا ہے جو اس ایوان کے ستون میں جڑا ہوا ہے۔ تمہارا خیال ہے کہ یہ پتھر ساکن ہے۔ چونکہ تمہاری آنکھ اس کی حرکت کو نہیں دیکھ رہی اور اگر تمہیں کوئی کہے کہ وہ اپنے اندر سے اس قدر متحرک ہے کہ ہم جو یہاں بیٹھے ہوئے ہیں ہم اس کی نسبت ساکن ہیں تو تم اس کے کہے کو تسلیم نہیں کروگے اور کہوگے کہ وہ افسانہ سرائی کر رہا ہے اور اس طرح تم اپنے آپ کو عقلمند شمار کرتے ہو کیونکہ افسانے کو تسلیم نہیں کرتے اور اس بات سے غافل ہو کہ تم اپنی نادانی کی وجہ سے اس پتھر کی باطنی حرکت کو نہیں سمجھ سکتے اور شاید وہ دن آئے جب لوگ اپنی عقلمندی کی وجہ سے پتھر کے اندر موجود حرکت کو دیکھ سکیں (۱۴۵)۔

اے ابوشاکر ! تم نے کہا ہے کہ جو کچھ اس دنیا میں وجود میں آتا ہے خودبخودوجود میں آتا ہے اور اس کا خالق کوئی نہیں' تمہارا کہنا ہے کہ گھاس صحرا میں خودبخود سبز ہوتی ہے اور کوئی اسے نہیں اگاتا۔ لیکن تم نے یہ خیال نہیں کیا کہ جب تک صحرا میں گھاس کا بیج نہ ہو گھاس نہیں اگتی اور جب گھاس کا بیج زمین پر گرے تو جب تک بارش زمین کو نم نہ کروے وہ نہیں اگے گی اور بارش خودبخود نہیں برستی بلکہ زمین سے اٹھنے والے بخارات جو بادل کی شکل اختیار کرلیتے اور برستے ہیں وہ بھی ہروقت نہیں بلکہ خاص خاص موسموں میں برستے اور زمین کو نم کرتے ہیں تاکہ گھاس کا بیج نم مٹی میں اگ آئے اور سبز ہو جائے اور پھر اس کی جڑیں نکل آئیں جبکہ اس کے برعکس دوسری صورت میں صحرا میں کسی قسم کی گھاس نہیں اگ سکتی۔ تم دس اقسام کے گھاس کا بیج ایک بند برتن میں رکھ دو اور اس برتن میں پانی بھی ڈال دو اور پھر مشاہدہ کرو کہ اس کی جڑیں نکلتی ہیں یا نہیں ؟ کیونکہ صحرا یا دوسری جگہ پر گھاس کو سبز ہونے کے لئے صرف نمی کافی نہیں ہے بلکہ ہوا کی بھی ضرورت ہے اور ہوا میں ایسا اثر ہوتا ہے جس کی وجہ سے درخت اُگتا اور پھلتا پھولتا ہے۔

اے ابوشاکر سرد علاقوں میں سردیوں کے موسم میں شدید سردی میں گھاس کو گرم خانوں میں اگایا جاسکتا ہے بشرطیکہ ہوا موجود ہو اور سرد علاقوں میں مختلف اقسام کے پھل پیدا کئے جاتے ہیں لیکن یہ پھل گرم خانوں میں ہوا کے بغیر نہیں حاصل ہوسکتے اور اگر ہوا نہ ہو تو نہ صحرا میں گھاس اگتی اور نہ گرم خانے میں پھل اور نہ ہی انسان اور جانور باقی رہ سکتے ہیں۔ اے ابوشاکر اس کے باوجود کہ ہوا تمہاری اور انسانوں کی زندگی کا ذریعہ ہے تم اسے نہیں دیکھ پاتے اور صرف اس وقت جب ہوا چلتی ہے تو تمہیں اس کے وجود کا احساس ہوتا ہے۔ کیا تم ہوا کے وجود کا انکار کرسکتے ہو ؟ صحرا میں گھاس کے اگنے کے لئے خاک' ہوا' بارش اور مطلوبہ موسم کا ہونا ضروری ہے تاکہ گھاس اگے اور ایک ایسی قوت کا ہونا بھی ضروری ہے جو ان تمام عوامل کو باہم یکجا کرے اور وہ قوت خداوندتعالیٰ کی ہے۔ اگر تم اہل علم ہوتے تو تمہیں پتہ چلتا کہ حکمت کسی ایسی چیز کے خودبخود وجود میں آنے کو

تسلیم نہیں کرتی اور ہر چیز کے وجود میں آنے کے لئے اس کے خالق کا ہونا ضروری ہے۔ خواہ وہ جمادات ہوں یا نباتات یا جانور ہوں۔ انسان بھی جانوروں کے زمرے میں شامل ہے۔ اگر تم عالم ہوتے تو تمہیں معلوم ہوتا کہ متعدد مکاتب کے فلاسفہ میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں گزرا جو خالق کا معتقد نہ ہو۔

بعض اوقات یہ خیال کیا جاتا ہے کہ بعض فلاسفہ خالق کے معتقد نہ تھے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ خالق کو اللہ کے نام کے علاوہ کسی اور نام سے پکارتے تھے ورنہ حتی کہ وہ لوگ جو مطلقاً" خدا کی نفی کرتے تھے اور کہتے تھے کہ خالق کا وجود نہیں ہے۔ پھر بھی وہ اپنے فلسفے میں کسی مبداء کے معتقد تھے اوروہ اپنے اس مبداء کے عقیدے سے بے نیاز نہیں ہوسکتے تھے۔ اے ابوشاکر ! خالق کا انکار کرنا جہالت ہے نہ کہ دانشمندی۔ ایک عقلمند انسان اگر صرف چند منٹوں کے لئے جسم کے نظام پر غور کرے تو وہ سمجھ جاتا ہے کہ اس متوازن اور دائمی نظام کا کوئی ناظم بھی ہے اور جس نے اس دنیا کو خلق کیا ہے وہی اس کا ناظم بھی ہے۔ کوئی چیز دنیا کے نظام کو درہم برہم نہیں کرسکتی سوائے دنیا کے ناظم کے۔ اے ابوشاکر ! تو نے مجھ سے کہا ہے کہ تم اور میں دونوں اپنے خدا کو بناتے ہیں اور تیرے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا خدا خود ہمارے ہاتھوں وجود میں آتا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ تو اپنے خدا کو ترکھان کے اوزار یا لکڑی یا پتھر توڑنے والے آلے کی مدد سے پتھر تراش کر اور میں اپنے خدا کو اپنے تخیل سے وجود میں لاتا ہوں۔ تمہارے خدا اور میرے خدا میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ جب تو ترکھان کے اوزار یا سنگتراشی کے آلات ہاتھ میں لیتا ہے اور کام شروع کرتا ہے تواس وقت تمہارا خدا موجود نہیں ہوتا۔ لیکن میرا خدا میرے سوچنے سے بھی پہلے موجود ہوتا ہے۔ میں نے اپنے خدا کو خود تیار نہیں کیا اور نہ ہی میں اسے اپنی سوچ کے نتیجے میں وجود میں لایا ہوں۔تمہارا خدا تمہارے بقول تمہارے ہاتھوں کا بنایا ہوا ہے اور اس کو بنانے کے لئے لکڑی یا پتھر کی ضرورت ہے۔ میرا خدا میرے تخیل کی پیداوار نہیں ہے کیونکہ وہ میرے سوچنے سے پہلے ہی موجود تھا۔ جو کچھ میں نے کہا ہے اور کرتا ہوں وہ اپنی سوچ کے ذریعے خدا کی بہتر معرفت حاصل کرنا اور اس کی عظمت پر غورو فکر کرنا ہے۔

جس وقت تم جنگ کی طرف جاتے ہو اور ایک پہاڑ کو دیکھتے ہو اور اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی کوشش کرتے ہو تو کیا میں کہہ سکتا ہوں کہ تم نے اسے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا یا اپنے غورو فکر سے ایجاد کیا ہے ؟ پہاڑ تم سے پہلے بھی تھا اور تمہارے بعد بھی رہے گا۔ جو کچھ تمہیں کرنا ہے وہ یہ ہے کہ اس کو اچھی طرح پہچانو۔ یہ پہچان بھی معرفت کی حد تک محدود ہے۔ تم پہاڑ کو اچھی طرح نہیں پہچان سکتے کیونکہ تمہاری دانائی اتنی نہیں ہے کہ تم پہاڑ کے مبداء کی شناخت کرسکو اور یہ جان سکو کہ پہاڑ کی انتہا کس وقت ہوگی۔ یہ کس چیز سے بنا ہے ؟ اس کے جوف میں یا اس کی گہرائی میں کون کون سی دھاتیں موجود ہیں اور وہ دھاتیں زمین سے نکالی جائیں تو انسان کو کیا کیا فائدے پہنچا سکتی ہیں ؟

تمہیں معلوم نہیں کہ پہاڑ میں موجود پتھر کس وقت اور کیسے وجود میں آئے ؟ اگر تم دانا ہوتے تو ہرگز نہ کہتے کہ بت جو تمہارا خدا ہے اسے تم وجود میں لاتے ہو۔ چونکہ وہ لکڑی یا پتھر جس سے تم بت بنا رہے ہو یا تراش رہے ہو اسے تم وجود میں نہیں لائے۔ کیا تم جانتے ہو کہ جس پتھر کو تم تراشتے اور بت کی شکل دیتے ہو وہ ہزاروں سال پہلے سے موجود ہے اور تمہارے بعد بھی موجود رہے گا ؟ کیا تجھے معلوم ہے کہ جس پتھر سے تم بت تراشتے ہو وہ بہت دوردراز کی دنیا سے آیا ہے؟ کیونکہ زمین کے مختلف حصے مسلسل حرکت کر رہے ہیں (۱۴۶) لیکن چونکہ ان کی حرکت ست ہے ہم اسے دیکھ نہیں سکتے۔ اگر تم ایک عقلمند انسان ہوتے اور خدا کے معتقد ہوتے تو تمہیں پتہ چل جاتا کہ اس دنیا میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں جو متحرک نہ ہو یعنی دنیا میں جمود بے معنی ہے اور ہماری زندگی میں بھی جمود بے معنی ہے کیونکہ ہم کسی حال میں بھی ساکن نہیں حتی کہ سوتے ہوئے بھی۔ سوتے میں ہم زمین کی حرکت کے ساتھ ساتھ حرکت کرتے ہیں اور یہ حرکت ہمارے اندر موجود حرکات کے علاوہ ہے۔ اے ابوشاکر ! میں اس سے کہیں چھوٹا ہوں کہ اپنے خدا کو اپنے تخیل میں لاسکوں۔ یہ وہ ہے جو میرے شعور کو وجود میں لایا ہے تاکہ میں اس کی مدد سے اسے اچھی طرح پہچان سکوں اور میرا یہ شعور میرے مرنے کے بعد ختم ہوجائے گا لیکن اس کی ذات باقی رہے گی۔ اے ابوشاکر ! جان لو کہ ختم ہونے سے میرا مقصد یہ نہیں کہ بالکل ختم ہوجائے گا بلکہ میری مراد یہ ہے کہ اس جہان میں اس کا وجود باقی نہیں رہے گا کیونکہ صرف خدا کے علاوہ اس دنیا میں موجود تمام چیزوں میں تبدیلی وقوع پذیر ہوتی ہے۔ اے ابوشاکر ! اگر تو اس پتھر کے ٹکڑے کو جس سے تو بت تراشتا ہے پہچان لے تو اتنی آسانی سے خدا کے وجود کا انکار نہیں کرسکتا اور ہرگز یہ نہ کہتا کہ میرا خدا میرے تخیل کی پیداوار ہے۔ تم چونکہ پتھر کو نہیں پہچانتے لہٰذا خیال کرتے ہو کہ پتھر تمہارے ہاتھوں کا مطیع ہے اور تم اسے جس شکل میں چاہو تراش سکتے ہو۔ ایسا اس لئے ہے کہ جب اس کے مبداء کی شناخت نہ ہوسکتی تھی اس وقت خداوندتعالیٰ پتھر کو ایک مائع سے وجود میں لایا تاکہ تم اسے تراش سکو ورنہ تمہارے ہاتھوں میں شیشے کی مانند چکناچور ہو جاتا۔

ابوشاکر نے پوچھا کیا پتھر کو مائع سے بنایا گیا ہے ؟ امام جعفرصادقؑ نے فرمایا ہاں۔ ابوشاکر قہقہہ لگاکر ہنسنے لگا۔ اس پر امام جعفرصادقؑ کا ایک شاگرد طیش میں آگیا لیکن امام جعفرصادقؑ نے اسے کوئی قدم اٹھانے سے منع کردیا اور کہا اسے ہنسنے دو۔ ابوشاکر نے کہا میں اس لئے ہنس رہا ہوں کہ تمہارے بقول اتنا سخت پتھر پانی سے بنایا گیا ہے۔ امام جعفرصادقؑ نے فرمایا میں نے یہ نہیں کہا کہ پانی سے بنایا گیا ہے بلکہ میں نے کہا ہے کہ یہ شروع میں مائع حالت میں تھا۔ ابوشاکر بولا مائع اور پانی ایک ہی تو ہیں۔ امام جعفرصادقؑ نے نہایت بردباری سے جواب دیا کہ بعض چیزیں ایسی ہیں جو مائع ہیں لیکن پانی نہیں ہیں یا خالص پانی نہیں ہیں۔ دودھ مائع ہے لیکن پانی نہیں ہے اور سرکہ مائع ہے لیکن کوئی اسے پانی نہیں سمجھتا۔ لیکن ان دونوں میں پانی کی مقدار موجود ہے۔ پتھر بھی

شروع میں مائع تھا لیکن پانی نہیں رطوبت کی شکل میں تھا اور سیال تھا۔ اس سے کافی مقدار میں حرارت نکل رہی تھی۔ خدا کی قدرت سے اس مائع سے آہستہ آہستہ کافی مقدار میں حرارت خارج ہونے لگی اور وہ اس قدر ٹھنڈا پڑ گیا کہ اس کی شکل جامد بن گئی۔ تم آج اس سے بت تراش سکتے ہو لیکن یہی پتھر جو جامد حالت میں ہے اگر اسے زیادہ حرارت پہنچائی جائے تو مائع صورت اختیار کرلے گا۔

ابوشاکر بولا میں جونہی گھر جاؤں گا پتھر کو آگ میں ڈال کر دیکھوں گا کہ کیا آپ کا فرمان صحیح ہے اور پتھر مائع شکل اختیار کرلیتا ہے یا نہیں ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا تمہاری انگیٹھی کی حرارت پتھر کو نہیں پگھلا سکتی۔ کیا تم اپنی انگیٹھی کی حرارت سے لوہے کے ایک ٹکڑے کو پگھلا سکتے ہو۔ ابوشاکر نے نفی میں جواب دیا۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا پتھر کو پگھلانے کے لئے ایک بھٹی درکار ہے اور اس بھٹی میں کافی مقدار میں ایندھن ایک لمبی مدت تک جلایا جائے تاکہ بھٹی خوب گرم ہوجائے تو اس وقت پتھر مائع حالت میں تبدیل ہوجائے گا۔ میں تم سے یہ کہنا چاہتا تھا کہ تم ایک بت کو تراشتے ہو تو خیال کرتے ہو کہ تم نے اسے تراشا ہے حالانکہ یہ خداوند تعالیٰ کا پیدا کیا ہوا ہے۔ یہ اس کی ذات ہے جس نے پتھر کو مائع حالت سے جامد حالت میں تبدیل کیا ہے کہ تیری تراش سے وہ ریزہ ریزہ نہیں ہوتا۔ اگر شیشے کی مانند ہوتا تو ہرگز اس کو تراش کر بت نہ بنا سکتا۔ یہ خداوند تعالیٰ ہے جس نے تجھے پیدا کیا اور تجھے ہاتھ دیئے اور تمہاری انگلیاں اس طرح بنائیں کہ تم اوزاروں کو اپنے ہاتھ میں پکڑ سکتے ہو اور پھر تمہیں شعور عطا کیا تاکہ تم پتھر سے انسانوں یا جانوروں یا دوسری چیزوں کے مجسمے تراش سکو۔

میں اس بات کی تصدیق کرتا ہوں کہ پتھر کو تراشنے کے مرحلے میں یہ تم ہو جو اپنے خدا کو وجود میں لاتے ہو۔ لیکن تم اپنے خدا کو وجود میں لانے کے لئے جتنے وسائل استعمال کرتے ہو وہ سب ان دیکھے اور واحد خدا کی طرف سے وجود میں لائے ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ پتھر کو تراشنے کے لئے تم جس شعور سے کام لیتے ہو وہ بھی خداوند تعالیٰ کا عطا کیا ہوا ہے۔ اے ابوشاکر ! یہ شعور خداوند تعالیٰ نے تمہیں عطا کیا ہے اور تم اس شعور کی مدد سے بت تراشتے ہو تاکہ اس کی پوجا کرو۔ اگر خداوند تعالیٰ تمہیں یہ شعور نہ عطا کرتا تو تم ہرگز ایک بت تراشنے پر توجہ نہ دے سکتے اور اسے اپنا خدا نہ جان سکتے۔

اے ابوشاکر ! میں تم سے ایک سوال کرتا ہوں اور تمہارے جواب کا منتظر ہوں۔ تم جب ایک بت تراشتے ہو اور اسے اپنا خدا سمجھتے ہو تو کیا تمہارا عقیدہ ہے کہ پتھر کا وہ ٹکڑا تمہاری حاجات برلانے کے لئے توانا ہوجائے گا؟ کیا تمہارا خیال ہے کہ جب تم بیمار ہوتے ہو تو پتھر کا وہ ٹکڑا تمہارا علاج کرسکتا ہے ؟ اگر متعدی بیماری کی صورت میں کوئی وبا پھوٹ پڑے گی تو وہ تمہیں اس سے نجات دلاسکے گا ؟ اگر بارش نہ ہو تو پتھر کا وہ ٹکڑا بارش برسا کر خشکی دور کرسکے گا اور اگر تم کسی کے قرضدار بن جاؤ تو وہ تمہارا قرض اتار دے گا ؟ ابوشاکر بولا میں پتھر سے اس قسم کی امید نہیں رکھتا۔ امام جعفر صادقؑ نے کہا تو پھر کس سے اس طرح کی امید

رکھتے ہو ؟ ابوشاکر نے کہا میں صحیح طرح سے نہیں بتاسکتا کہ میری یہ امیدیں کس سے وابستہ ہیں لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ پتھر کے اندر کوئی ایسی چیز ہے جو سب کام کرسکتی ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے پوچھا کیا پتھر کے اندر اس کی جنس سے کوئی چیز ہے ؟ ابوشاکر نے کہا اگر پتھر کی جنس سے کوئی چیز ہو تو وہ کام نہیں آسکتی۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا اے ابوشاکر ! تیرے عقیدے کے مطابق جو کچھ پتھر کے اندر ہے پتھر کی جنس سے نہیں اور تمام کام انجام دے سکتا ہے' وہ وہی ان دیکھا اور واحد خدا ہے۔

ابوشاکر سوچ میں پڑگیا اور چند لمحوں کے بعد پوچھنے لگا کیا دکھائی نہ دینے والا واحد خدا پتھر کے اندر موجود ہے ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ہر چیز کے اندر اور ہر جگہ موجود ہے۔ ابوشاکر نے کہا میری عقل اس بات کو تسلیم نہیں کرسکتی کہ ایک چیز ہر جگہ ہو لیکن دکھائی نہ دے۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کیا تمہاری عقل اس بات کو قبول نہیں کرتی کہ ہوا تو دکھائی نہیں دیتی لیکن پھر بھی ہر جگہ موجود ہے۔ ابوشاکر نے جواب دیا اگرچہ ہوا دکھائی نہیں دیتی لیکن خود آپ کے بقول جب وہ چلتی ہے تو محسوس کی جاسکتی ہے لیکن آپ کا خدا جو دکھائی نہیں دیتا اسے محسوس نہیں کیا جاسکتا۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا جب ہوا نہیں چلتی تو کیا تم ہوا کو محسوس کرسکتے ہو ؟ ابوشاکر نے نفی میں جواب دیا۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا تو اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ جو کچھ تو نہیں دیکھ پاتا اور محسوس نہیں کرتا ہر جگہ موجود ہے ؟ ابوشاکر نے اثبات میں جواب دیا۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا خدا بھی دکھائی نہ دینے کے لحاظ سے ہر جگہ موجود ہے مثلاً" جس طرح ہوا موجود ہے لیکن ہوا چونکہ عنصر اور مخلوق ہے لہٰذا مخلوق اور خالق کے درمیان ماہیت کے لحاظ سے کوئی شباہت نہیں پائی جاتی۔ اے ابوشاکر وہ شعور جو تجھے ایک پتھر سے بت تراشنے اور اس کی پرستش کے لئے کہتا ہے وہ تیرے بقول تجھے کہتا ہے کہ اس بت سے تجھے کوئی امید وابستہ نہیں رکھنی چاہئے کیونکہ وہ کسی کام کے کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا بلکہ اس کے اندر ایسی چیز ہے جو تمہاری حاجات برلا سکتی ہے۔ یہ شعور جو تجھے بت بنانے پر لگاتا ہے گویا اپنی زبان سے تجھے کہتا ہے کہ تو خدا کی پرستش کے بغیر زندگی بسر نہیں کرسکتا اور خدا کی پرستش تمہارے لئے ناگزیر ہے۔ ابوشاکر نے کہا میں اس بات کی تصدیق کرتا ہوں کہ میں بت کی پوجا کے بغیر اپنی زندگی جاری نہیں رکھ سکتا۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا یہ نہ کہو کہ بت کی پوجا کے بغیر بلکہ یہ کہو کہ اس کی پوجا کے بغیر جس کی پوجا کے لئے تم بت تراشتے ہو۔ اگر آج تم کسی وجہ سے اس کی پرستش سے باز آجاؤ تو کیا تم زندگی جاری رکھ سکتے ہو ؟ ابوشاکر بولا نہیں۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ہر انسان کے لئے ناگزیر ہے کہ خدا کی پوجا کرے اور اگر خدا کی پوجا نہیں کرے گا تو نہ زندگی میں اسے کوئی رہنما ملے گا اور نہ وہ کسی چیز پر تکیہ کرسکے گا۔ اب اگر کوئی خدا کو نہیں پوجتا تو اس کی مثال ایسی ہے کہ اس نے ایک لمحے میں حواس خمسہ کو ضائع کردیا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ

کہاں جائے، کیا کرے اور کس کا سہارا لے ؟ خداوند تعالیٰ کی پوجا کا موضوع زندگی میں اس قدر ضروری ہے کہ جانوروں کی زندگی میں بھی موجود ہے اور وہ بھی خداوند تعالیٰ کی پرستش سے بے نیاز نہیں ہیں۔ اگر ہم ان کی زبان سے واقف ہوتے اور جو کچھ وہ کہتے ہیں اسے سن سکتے تو ہمیں پتہ چلتا کہ وہ بھی خدا کی پوجا کر رہے ہیں۔ ہم جانوروں سے گفتگو نہیں کر سکتے اور نہ ہی ان سے پوچھ سکتے ہیں کہ کیا وہ خدا کے معتقد ہیں یا نہیں ؟ البتہ عقل کی رو سے ہم خود یہ بات آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ جانور بھی خدا کی عبادت کرتے ہیں اور ان کی زندگی میں پایا جانے والا ڈسپلن اسی بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ خدا کی پرستش کرتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ جانور پرستش کے لحاظ سے ہماری طرح عقیدہ رکھتے ہیں لیکن اس میں مجھے کوئی شک نہیں کہ وہ ایک مبداء کے مطیع ہیں اور ان قواعد کے سختی سے پابند ہیں کیونکہ اگر اس مبداء کے قواعد کے سختی سے پابند نہ ہوتے تو جو نظم اور ترتیب ان کی زندگی میں نظر آرہی ہے وہ ہرگز نظر نہ آتی۔

تجھے معلوم ہے کہ بہار آنے پر پرندہ مقررہ ہفتے میں آتا ہے اور گاتا ہے۔ ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ بہار کے آنے کی خوشخبری سنا رہا ہے۔ اس مہاجر پرندے کا آنا اس قدر منظم ہے کہ اگر سردیوں کے آخری دنوں کی ہوا ٹھنڈی ہو تو وہ ایک ہفتے سے لے کر دس روز آنے میں لگاتا ہے اور اس سے زیادہ دیر نہیں لگاتا۔ اس کے بعد ابابیل آتی ہے اور شاید وہ ہزاروں میل کا راستہ طے کرتی ہے لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ وہ اسی جگہ گھوسلہ بناتی ہے جہاں اس نے گزشتہ بہار میں بنایا تھا۔ کیا ایک مبداء کی اطاعت اور اس پر عقیدے کے بغیر یہ چھوٹا سا پرندہ اس قدر منظم زندگی گزار سکتا ہے ؟ جو کام اس نے انجام دینا ہوتا ہے وہ کسی سستی اور دیر کے بغیر مقررہ تاریخ کو انجام دے دیتا ہے۔ اے ابوشاکر حتیٰ کہ درختوں کا بھی خدا پر ایمان ہے وہ اپنے شعور سے خداوند تعالیٰ کی پیروی کرتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کی زندگی ہرگز منظم نہ ہوتی۔ خداوند تعالیٰ نے درختوں کے جو ایک سو پچاس طبقات بنائے ہیں اور ان میں سے ہر طبقے کی کئی کئی اقسام ہیں۔ تم ان میں سے کوئی ایک درخت بھی ایسا نہ پاؤ گے جس کی زندگی غیر منظم ہو (۱۴۷)۔

اے ابوشاکر درخت بھی میری اور تمہاری طرح اپنے خدا کو نہیں دیکھتے لیکن اپنے شعور کی وجہ سے اس کی پرستش کرتے ہیں۔ درخت کی خدا پرستی کی دلیل یہ ہے کہ وہ بغیر کسی تاخیر اور سستی کے خداوند تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین کی اطاعت کرتے ہیں۔ اگر درخت خدا کا نہ ہوتا اور وہ اس کی پرستش نہ کرتا تو اس کی زندگی میں یہ منظم روش نہ دیکھی جاتی تو مجھے معلوم ہے کہ تو اس چیز کو تسلیم نہ کرتا جو میں کہتا ہوں۔ شاید اسے سمجھ بھی نہیں پاتا کیونکہ بعض مسائل کو سمجھنے کے لئے کم از کم علم کے مقدمات کو طے کرنا ضروری ہے تاکہ کسی حد تک کچھ سیکھ کر اپنی جہالت دور کر کے بعض مسائل کو سمجھنے کے لئے تیار ہو سکے۔ میں کہتا ہوں کہ نہ صرف جانور اور درخت اپنے حیوانی اور شجری شعور کی مدد سے خداوند تعالیٰ کی پرستش کرتے ہیں بلکہ جمادات بھی اپنے جمادی

شعور سے خدا کی پرستش کرتے ہیں۔ اگر وہ خدا کی پرستش نہ کرتے تو ان کی جمادی زندگی درہم برہم ہوجاتی اور ان کے ذرات پاش پاش ہوجاتے۔

اے ابوشاکر تو اس روشنی کو دیکھ رہا ہے جو یہاں چمک رہی ہے جس کی وجہ سے میں اور تم ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔ یہ روشنی جس کا منبع سورج ہے یہ بھی خدا کی پرستش کر رہی ہے کیونکہ یہ ان قواعد کی پیروی کر رہی ہے جو خداوندتعالی نے اس کے لئے مقرر کردیئے ہیں اور اس کی اطاعت اس قدر منظم اور صحیح ہے کہ یہ دو متضاد عوامل سے وجود میں آتی ہے۔ ان دو عوامل میں سے ایک میں بھی روشنی نہیں ہوتی لیکن جب یہ دونوں آپس میں ملتے ہیں تو روشنی پیدا ہوجاتی ہے۔ وہ دو متضاد عوامل بھی اس روشنی کی مانند خدا کی معرفت رکھتے ہیں کیونکہ جو قواعد خداوندتعالی نے ان کے لئے وضع کئے ہیں ان کی اطاعت کرتے ہیں تب ہی روشنی وجود میں آتی ہے۔ اے ابوشاکر اگر خداوندتعالی موجود نہ ہوتا تو یہ جہان بھی وجود میں نہ آتا اور میں اور تم بھی موجود نہ ہوتے۔

یہ کلام کہ اگر خدوندتعالی موجود نہ ہوتا' محض بے معنی جملہ ہے کیونکہ یہ محال تھا اور ہے کہ خداوندتعالی موجود نہ ہوتا۔ دوسرے معنوں میں خدا واجب الوجود ہے۔ اگر خداوندتعالی نہ ہوتا اور مجھے اور تمہیں پیدا نہ کرتا تو یہ بے معنی الفاظ "اگر خداوندتعالی موجود نہ ہوتا" ہرگز ہمارے تخیل میں نہ آتے اور اگر ایک لمحے کے لئے خداوندتعالی کی توجہ اس کائنات کے انتظام سے ہٹ کر کسی اور طرف مائل ہوجائے تو یہ کائنات اور جو کچھ اس میں موجود ہے فنا ہوجائے گا یعنی دوسری چیزوں میں تبدیل ہوجائے گا کیونکہ کوئی چیز ختم ہونے والی نہیں ہے لیکن خدا کی توجہ کائناتی امور کے انتظام سے ہرگز نہیں ہٹتی کیونکہ دنیا کے امور کا انتظام مستقل اور ہمیشہ کے لئے طے شدہ قواعد کے تحت چل رہا ہے جن میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی کیونکہ اللہ تعالی دانا ہے اور اس کی مطلق دانائی اس بات کا باعث ہے کہ جو قاعدہ اس نے کائنات کے امور کو منظم کرنے کے لئے وضع کیا ہے وہ ہمیشہ کے لئے ہے۔ اس نے تمام چیزوں کی ابد تک کے لئے پیش گوئی کردی ہے اور اس نے جو تمام قواعد دنیا کے لئے مقرر کردیئے ہیں ان میں اس کی مصلحت ہے اور کوئی ایسا قاعدہ نہیں جو مصلحت سے خالی ہو۔

# موت

امام جعفر صادقؑ نے ابوشاکر سے فرمایا۔ احمق لوگوں کی نظر میں ایک قاعدہ جو مصلحت کے بغیر ادھورا بلکہ مضر ہے وہ موت ہے۔ احمق لوگ انسان کی موت کو ایک بڑا ظلم خیال کرتے ہیں جو خداوند تعالیٰ کی طرف سے انسان پر کیا جاتا ہے۔

لیکن انسان کی موت میں ایک مصلحت ہے۔ اگر موت نہ ہوتی تو بنی نوع انسان ختم ہوگیا ہوتا اور قدیم زمانے کے سائنس دان جنہوں نے موت کو ختم کرنے کی کوشش کی وہ سنگین غلطی پر تھے۔ میں آنے والے سائنسدان کو وصیت کرتا ہوں کہ موت کو ختم کرنے کی طرف توجہ نہ دیں کیونکہ اگر موت ختم ہوگئی تو نسل انسانی تباہ ہو جائے گی۔ (۱۴۸)

اے ابوشاکر ! چند لمحوں کے لئے غور کرو کہ اگر موت نہ ہو اور آدمی یہ جان لے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ رہے گا' جونہی یہ پتہ چلا کہ آدمی نہیں مرے گا تو ظالم لوگ دوسروں کا مال ہڑپ کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ لامحدود زندگی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دولت کے مالک بنے رہیں۔ چونکہ کمزور لوگ اپنے اموال کے بچاؤ کی خاطر ظالموں کے خلاف متحد ہوں گے اور مقابلہ کریں گے تو توانا غاصب دوسروں کو ختم کردیں گے کیونکہ فطری موت تو نہیں لیکن قتل کے ذریعے موت موجود ہے۔ لہٰذا طاقتور' غاصب کمزور لوگوں کو قتل کردیں گے۔ آج جبکہ ہر طاقتور غاصب آدمی کو علم ہے کہ وہ ایک دن مرجائے گا اور اس کی موت زیادہ دور نہیں ہے' پھر بھی اس کے باوجود وہ مال و دولت جمع کرنے کی حرص کرتا ہے۔ اگر لوگوں کو معلوم ہوتا کہ وہ ہمیشہ کے لئے زندہ رہیں گے تو ان کی حرص آج کی نسبت کہیں زیادہ ہوتی۔ پھر طاقتور لوگوں کی آپس میں جنگ و جدل ہوتی اور آخرکار سب سے طاقتور شخص باقی رہ جاتا جس کا مطلب یہ ہوا کہ نسل انسانی ختم ہوجاتی۔

اگر موت نہ ہو تو زندگی میں کسی کے لئے لذت نہیں ہے۔ جس طرح کام نہ کرنا ہو تو آرام میں کسی کے لئے لذت نہیں ہے۔ جو چیز لوگوں کی زندگی میں کشش کا باعث ہے وہ موت کا خوف ہے۔ اے ابوشاکر ! آج اگر والدین اپنے بیٹے پر مہربان ہیں تو اس لئے کہ انہیں علم ہے کہ وہ مرجائیں گے اور ان کا بیٹا زندہ رہے گا اور ان کے بعد اس دنیا میں ان کی یادگار ہوگا اور اپنی زندگی کے ساتھ ساتھ اپنے والدین کے نام کو بھی دنیا میں روشن کرے گا۔ اے ابوشاکر ! اگر موت نہ ہوتی تو خداپرست لوگ خدا سے نہ ڈرتے۔ آج جبکہ ہر موحد خدا سے ڈرتا اور اس کے کام بجالاتا ہے تو اس لئے کہ اسے معلوم ہے کہ اگر خدا کی اطاعت نہیں کرے گا اور اس کے احکام نہیں بجالائے گا تو موت کے بعد قیامت کے دن سزا کا مستوجب ہوگا۔ لیکن اگر موت نہ ہوتی تو

چونکہ کوئی نہ مرتا تو لامحالہ قیامت کا دن بھی نہ ہوتا کیونکہ قیامت کے دن کے لئے ضروری ہے کہ انسان مرنے کے بعد زندہ ہو اور اللہ اسے اس دنیا میں کئے گئے اعمال کی جزا یا سزا دے۔

موت سے خوف توحید پرست لوگوں کو خدا کے احکامات کی بجاآوری کی طرف مائل کرتا اور ظلم سے روکتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ظلم وجود میں نہیں آیا کیونکہ موت سے خوف کے باوجود ظلم ختم نہیں ہوا۔ وہ لوگ جو خدا کے معتقد نہیں ہیں دوسروں پر ظلم و ستم کرتے ہیں۔ چونکہ وہ شخص جس کا خدا پر ایمان ہو اور اس کے احکامات کی پیروی کرتا ہو وہ دوسروں پر ستم نہیں کرتا۔ اگر موت موجود نہ ہوتی اور فرض کریں تمام بنی نوع انسان باقی رہتے تو زندگی کی جو حالت ہم آج دیکھ رہے ہیں اس سے کہیں زیادہ بدتر ہوتی۔

ایسی صورت میں کوئی بھی اپنے آپ کو گرم صحراؤں یا ٹھنڈے علاقوں میں زندگی بسر کرنے کی زحمت نہ دیتا۔ جو علاقے آب و ہوا کے لحاظ سے معتدل ہیں وہ وہاں چلا جاتا اور وہاں کے ساکنوں کو قتل کرکے ان کی اراضی پر قبضہ کرنے کے بعد آرام سے وہاں زندگی گزارنے لگتا۔ انسان صرف ایسی صورت میں نقل مکانی کرتا جب وہ مقامی آبادی کو ختم کرکے ان کی جائیداد پر قبضہ نہ جماسکتا۔

اگر فرض کریں موت نہ ہونے کی صورت میں بنی نوع انسان ختم نہ ہوتا تو چند صدیوں کے دوران ہی انسانی آبادی اس قدر بڑھ جاتی کہ انسان نہ صرف تمام جانوروں بلکہ بھوک مٹانے کے لئے اپنے ہم جنسوں کو بھی کھا جاتا کیونکہ آبادی اس قدر بڑھ جاتی کہ زمین پر کھیتی باڑی کے لئے جگہ نہ ملتی کہ لوگ اس میں ہل چلاکر بیج بوئیں۔ کھیتی باڑی ختم ہوجاتی اور انسان آہستہ آہستہ پہلے جانوروں کو کھانا شروع کرتے اور جب تمام جانور ختم ہوجاتے تو بھوک مٹانے کے لئے ان کے پاس انسانوں کو کھانے کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہوتا۔

یہ موت ہے جس کی وجہ سے انسانی آبادی اس قدر نہیں بڑھتی کہ زمین میں کھیتی باڑی کے لئے کوئی جگہ باقی نہ رہے۔

یہ موت ہے جو انسان کو اللہ کے احکامات کی پیروی پر لگاتی ہے۔

یہ موت ہے جو انسان کے دل میں اپنوں اور غیروں کے لئے رحم کا مادہ پیدا کرتی ہے۔

یہ موت ہے جو غاصبوں کو دوسروں کا مال ظلم سے ہڑپ کرجانے کے راستے میں حائل ہوتی ہے۔

یہ موت ہی ہے جو زندگی انسانوں کے لئے شیریں بناتی ہے۔ اللہ نے جو چیز پیدا کی ہے اس میں اس کی ایک یا ایک سے زیادہ مصلحتیں پوشیدہ ہیں اگرچہ وہ ہماری نظر میں بے سود یا مضر ہی کیوں نہ ہوں۔

اے ابوشاکر! تم پتھروں سے بھرے ہوئے پہاڑوں کو بے فائدہ خیال کرتے ہو اور اپنے آپ سے پوچھتے ہو کہ پہاڑ کس لئے پیدا ہوئے ہیں؟ جبکہ اللہ نے مصلحت کے تحت پہاڑوں کو پیدا کیا ہے۔ جہاں جہاں پہاڑ ہے جاری پانی بھی موجود ہے۔ کیونکہ پہاڑ کی بلندیوں پر بارش اور برف پڑتی ہے جس کی وجہ سے چشمے وجود میں

آتے اور نہروں کی صورت اختیار کرلیتے ہیں۔ پہاڑ سے جاری ہونے والی نہر زرعی زمین کو سیراب کرتی ہے۔ اس لئے لوگ پہاڑ کے دامن میں رہائش اختیار کرتے ہیں تاکہ زراعت کریں کیونکہ پانی میسر ہوتا ہے۔ وہاں گرمیوں میں آب و ہوا ٹھنڈی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ گرم علاقوں میں رہتے ہیں۔ گرمیوں میں ان کی کوشش ہوتی ہے کہ پہاڑی علاقوں میں جائیں تاکہ گرمی سے محفوظ رہ سکیں۔ پہاڑ کے دامن میں واقع شہر' قصبے اور دیہات' پہاڑ کی پیٹھ کی طرف سے آنے والے طوفانوں کا شکار نہیں ہوتے کیونکہ پہاڑ اس طوفان کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ ہوتا ہے۔

سرسبز پہاڑ جانوروں کے چرانے کے لئے مفید ہوتے ہیں اور گرمیوں میں جب دوسری جگہوں پر گھاس نہیں ہوتی تو گڈریئے اپنی بھیڑ بکریوں کو پہاڑ کی طرف لے آتے اور جاڑے کے آنے تک وہ اپنی بھیڑ بکریوں کو پہاڑ پر چرا سکتے ہیں۔ ان سرسبز پہاڑوں میں ایسے چرند و پرند ملتے ہیں جن کا گوشت حلال ہے اور وہ دامن کوہ میں سکونت پذیر افراد کے لئے غذا کا سامان بھی ہیں۔ حتی کہ جن پہاڑوں پر سبزہ اور پانی نہیں وہ بھی مکمل طور پر بے سود نہیں ہیں اور اگر ان میں معدنیات تلاش کی جائیں تو ممکن ہے وہاں وہ معدنیات ملیں جو انسانی زندگی کے لئے مفید ہوں۔

جب امام جعفر صادقؑ کی گفتگو ختم ہوئی تو ابوشاکر سوچ میں پڑ گیا۔ یوں نظر آرہا تھا کہ آپ کی باتوں کا اس پر گہرا اثر ہوا ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے اس سے پوچھا کیا تو اس بات کا قائل ہوا ہے کہ ان دیکھا خدا موجود ہے اور کیا اس بات کا قائل ہوا ہے کہ جس چیز کی تم اپنے بت میں پوجا کرتے ہو وہ بت نہیں بلکہ نہ دکھائی دینے والا خدا ہے۔ ابوشاکر نے جواب دیا ابھی تک میں قائل نہیں ہوا لیکن شک میں ضرور پڑ گیا ہوں۔

امام جعفر صادقؑ نے اظہار خیال فرمایا' بت پرستی کے بارے میں شک ان دیکھے اور واحد خدا کی پرستش کا آغاز ہے۔ ابوشاکر نے کہا' خصوصاً" موت کے بارے میں آپ کی گفتگو نے مجھے حیران کردیا ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے پوچھا' اس کی کونسی چیز تمہاری حیرانی کا باعث بنی ہے ؟ ابوشاکر بولا' آپ کی گفتگو سے میں سمجھا کہ ہم انسانوں کو جتنا ہوسکے اپنے آپ کو قتل کردینا چاہئے کیونکہ آپ کے بقول خدا کی مصلحت اسی میں ہے کہ آدمی مرے۔ چونکہ خدا کی مصلحت اس طرح ہے لہٰذا جتنا جلدی ہم مرجائیں بہتر ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے کہا اے ابوشاکر جو کوئی اپنے آپ کو قتل کرے وہ اللہ کے قانون سے منہ موڑتا ہے کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اس کے بندوں کو اپنی جان کی حفاظت کرنا چاہئے' جان کی حفاظت کا ایک راستہ یہ ہے کہ کھانے پینے میں افراط سے کام نہ لیں۔ کیونکہ کھانے پینے میں افراط سے آدمی طبعی موت سے پہلے مرجاتا ہے۔ جان کی حفاظت کے لئے میرے جد نے فرمایا ہے کہ اپنے پیٹ کو جانوروں کا قبرستان نہ بناؤ۔ ابوشاکر بولا اس بات کے کیا معنی ہیں ؟ امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا یعنی گوشت زیادہ کھانے سے پرہیز کریں۔ ابوشاکر بولا لیکن میں تو گوشت کھانے میں

لذت محسوس کرتا ہوں اور گوشت کھانے سے پرہیز نہیں کرسکتا۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا زیادہ گوشت کھانے سے پرہیز کرو۔ ابوشاکر نے پوچھا کیوں پرہیز کروں ؟ امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا کیونکہ زیادہ گوشت کھانے سے بعض لوگوں پر بیماری کا اچانک حملہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے انسان ناگہانی موت کا شکار ہو کر چل بستا ہے۔
ابوشاکر بولا میں تو پہلی مرتبہ سن رہا ہوں کہ زیادہ گوشت کھانے سے انسان ناگہانی موت سے دوچار ہوجاتا ہے۔
امام جعفر صادقؑ نے اظہار خیال فرمایا میں نے یہ نہیں کہا کہ گوشت کھانا ناگہانی موت کا سبب بنتا ہے بلکہ میں نے یہ کہا ہے کہ زیادہ گوشت کھانے سے بعض لوگ اچانک بیمار پڑ جاتے ہیں اور زیادہ گوشت کھانا اچانک بیماری کا سبب بنتا ہے وہ بھی سب لوگوں میں نہیں بلکہ بعض لوگ ایسے ہیں جو گوشت کھاتے ہیں لیکن ناگہانی موت کا شکار نہیں ہوتے۔

ابوشاکر نے کہا ناگہانی موت کیا ہے ؟ امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا یہ غیر متوقع موت ہے۔ اس میں انسان بظاہر تندرست و توانا نظر آتا ہے لیکن اندر سے بیمار ہوتا ہے اور اچانک بیہوش ہو کر مرجاتا ہے۔ ابوشاکر نے پوچھا کیا باطنی بیماری بھی ہوتی ہے ؟ امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا ہاں اے ابوشاکر ! بعض لوگ اندرونی طور پر بیمار ہوتے ہیں لیکن انہیں اس بیماری کا احساس نہیں ہوتا اور وہ لوگ جو گوشت اور دوسری مرغن غذائیں کھانے میں اسراف سے کام لیتے ہیں ممکن ہے باطن میں بیمار ہوں اور ان کی بھوک میں کوئی کمی نہ آئے اور وہ درد کا احساس کئے بغیر بے خوابی کا شکار ہوجائیں۔

ابوشاکر نے کہا میں اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ آدمی بیمار ہوئے بغیر مر سکتا ہے۔ آدمی کسی جنگ یا جھگڑے میں تو مرسکتا ہے لیکن بیمار ہوئے بغیر نہیں مرسکتا۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا تم ایسے انسان ہو کہ جب تک کسی چیز کو دیکھ نہ لو اس کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔ چونکہ تم نے آج تک کسی کو ناگہانی موت مرتے نہیں دیکھا لہٰذا تم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ ممکن ہے آدمی بیماری کے بغیر ہی اس دنیا سے کوچ کر جائے۔ لیکن جان لو کہ ناگہانی موت کی تین اقسام ہیں ۔ ایک دماغ کو دوسری دل کو اور تیسری خون کو لاحق ہوتی ہے۔

(۱۳۹) ابوشاکر بولا دماغ' دل اور خون ہمیں اچانک کیسے ہلاک کردیتے ہیں ؟

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ہر قسم کی ناگہانی بیماری کا آخری مرحلہ خون کی خرابی ہے اور خون کی خرابی بھی زیادہ گوشت اور تمام مرغن غذاؤں کو افراط سے کھانے سے لاحق ہوتی ہے۔ جب خون میں خرابی پیدا ہوتی ہے تو اچانک حملہ کرنے والی بیماری دل' دماغ یا خون پر حملہ کرکے انسان کو ہلاک کردیتی ہے۔ عرب قبائل جو صحرا نشین ہیں ان میں یہ نہیں دیکھا گیا کہ کوئی ناگہانی موت سے مرا ہو۔ کیونکہ عرب قبائل کے صحرانشین لوگ گوشت اور تمام مرغن غذائیں کم مقدار میں کھاتے ہیں۔ سال میں ایک مرتبہ گوشت کھانے کے لئے وہ مکہ جاتے ہیں تاکہ حج کے دوران جو جانور وہاں ذبح ہوتے ہیں ان کا گوشت کھائیں۔ یہ لوگ جب تک کچھ دنوں کے لئے مکہ

میں ہوتے ہیں کثرت سے گوشت کھاتے ہیں۔ لیکن چونکہ سال میں صرف وہی چند دن گوشت کھاتے ہیں اور جب گھروں کو واپس لوٹتے ہیں تو ان کی غذا پہلے کی مانند دودھ ہوتی ہے۔ اگر ان کے پاس کھجوریں ہوں تو وہ بھی ان کی غذا ہوتی ہے لیکن اس سے ان کا خون خراب نہیں ہوتا جس سے وہ ناگہانی بیماری کے حملے کا شکار ہوں۔ دوسرے یہ بھی کہ عرب صحرا نشینوں کی زندگی مشکل ہے اور وہ کھانے پینے میں افراط نہیں برتتے للذا وہ کافی لمبی عمریں پاتے ہیں۔ اے ابوشاکر ! تم مدینے میں چند ایسے اشخاص کو نہیں پہچانتے جن کی عمر سو سال ہو ؟ ابوشاکر بولا میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جو سو سال کا ہو۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا اس شہر میں جب لوگ گوشت اور دوسری مرغن غذائیں کھانے میں افراط سے کام نہیں لیتے تھے تو سو سالہ مرد عورتیں پائی جاتی تھیں اور جس چیز نے اس شہر کے مکینوں کی عمر گھٹا دی ہے وہ مرغن غذاؤں کے کھانے میں افراط ہے۔ لیکن اب جبکہ مدینہ میں سو سال کی عورت یا مرد نہیں ہے تب بھی تم مدینہ کی نواحی بستیوں کے صحراؤں کی طرف جاؤ جہاں قبائل سکونت پذیر ہیں تو تم مشاہدہ کروگے کہ ان کے درمیان سو سال کے مرد اور عورتیں پائی جاتی ہیں اور اس کے باوجود کہ صحرا میں زندگی دشوار ہے ان میں سے بعض بوڑھے افراد اپنے کچھ دانتوں کو سو سال کی عمر تک محفوظ رکھتے ہیں۔ چونکہ زیادہ گوشت اور دوسری مرغن غذاؤں کے نہ کھانے سے ان کے خون میں خرابی بھی پیدا نہیں ہوتی کہ وہ قبل از وقت بوڑھے ہوجائیں کیونکہ خون کی خرابی بعض اشخاص میں ناگہانی بیماری کا باعث بنتی ہے اور پھر اسی کے زیراثر اکثر اشخاص جلدی بوڑھے ہوجاتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ ان کی طبعی عمر پوری ہو وہ مرجاتے ہیں۔ ابوشاکر نے کہا میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ موت کیا ہے ؟ امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا موت بدن کے افعال کا رک جانا ہے۔ خصوصاً دل کی دھڑکنوں اور سانس کا رک جانا۔ ابوشاکر نے پوچھا انسان کیوں مرجاتا ہے ؟ امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا انسان دو چیزوں سے مرتا ہے۔ ایک بیماری سے جیسا کہ میں نے کہا بعض لوگ ناگہانی بیماری میں مبتلا ہوجاتے ہیں اور ان کا خیال ہوتا ہے کہ وہ صحتمند ہیں لیکن اندرونی طور پر وہ بیمار ہوتے ہیں۔ یہ لوگ بھی بیماری سے مرتے ہیں۔ موت کا دوسرا سبب انسان کا بڑھاپا ہے۔ آدمی اگر صحتمند ہی کیوں نہ ہو آخرکار بڑھاپے کی وجہ سے مرجائے گا۔ قدیم یونان کے ایک حکیم بقراط نے کہا تھا کہ بڑھاپا بھی بیماری کی ایک قسم ہے اور جس دن اس بیماری کا علاج تلاش کرلیا جائے گا انسان نہیں مرے گا۔ ابوشاکر نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا، لیکن ہمارے ڈاکٹر تو اس بیماری کا علاج نہیں کرسکتے۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ابوشاکر مجھے یقین ہے ڈاکٹر ہرگز اس بیماری کا علاج دریافت نہیں کرسکیں گے۔ ابوشاکر بولا آپ کو کیسے علم ہے کہ ہمارے ڈاکٹر بڑھاپے کی بیماری کا علاج کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتے تاکہ انسان کو موت سے بچا سکیں۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا اس لئے کہ موت مشیت الٰہی ہے۔ چونکہ خدا کی قدرت اور مصلحت موت کو وجود میں لاتی ہے اس لئے بڑھاپے کی بیماری کا علاج نہیں کرسکتے (اگر

بقول بقراط بڑھاپا بیماری ہو) کیونکہ جو کچھ اللہ نے مقرر کردیا ہے ناقابل تغیر ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے موت موجود ہے اور ہر چیز مرے گی سوائے اللہ کے۔ موت بھی مخلوقات میں تبدیلی کا نام ہے۔ یہ ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیلی ہے اور کوئی چیز ایک حالت پر باقی نہیں رہتی حتیٰ کہ اگر اللہ انسان کے لئے موت مقرر نہ کرتا تو بھی جیسا کہ میں نے کہا اور تم نے سنا بنی نوع انسان کی بہتری اسی میں ہے کہ موت موجود ہو۔ بنی نوع انسان کی زندگی کے دوام کے لئے موت اس قدر ضروری ہے کہ اگر موت نہ ہوتی اور انسان باقی رہنا چاہتا تو اسے موت کو وجود میں لانا پڑتا تاکہ لوگ مریں اور موت کے نتیجے میں انسانی نسل باقی رہے اور برباد نہ ہو۔

ابوشاکر نے پوچھا یہ جو کہا جاتا ہے کہ بعض گزشتہ پیغمبر ہمیشہ کے لئے زندہ ہیں ان کے بارے میں کیا خیال ہے ؟ امام جعفر صادقؒ نے فرمایا اس پر یقین نہ کرو کیونکہ ابھی تک اس دنیا میں کوئی ایسا فرد پیدا نہیں ہوا جو نہ مرا ہو یا اگر اب زندہ ہے تو نہیں مرے گا۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ بعض گزشتہ انبیاء زندہ جاوید ہوگئے ہیں افسانے سے زیادہ کچھ نہیں (۱۵۰)۔

پیغمبروں میں سب سے افضل پیغمبر ہمارے نبی خاتم النبین ﷺ ہیں جن پر تو ایمان نہیں لایا وہ بھی اس دنیا سے کوچ کرگئے۔ ابوشاکر بولا میرا خیال ہے جب میں ان دیکھے خدا پر ایمان لے آؤں گا تو آپ کے پیغمبر کی نبوت کو بھی تسلیم کرلوں گا۔ لیکن اس کے باوجود کہ میں آپ کے پیغمبر پر ایمان نہیں لایا میں نے قرآن کے کچھ حصے سنے ہیں جنہیں میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔ جو کچھ آپ نے گوشت اور مرغن غذائیں کھانے اور خون میں خرابی کے بارے میں کہا ہے وہ قرآن کے سراسر خلاف ہے۔ ظاہر ہے جب آپ مسلمان ہیں تو آپ قرآن کو مانتے ہیں۔ امام جعفر صادقؒ نے فرمایا قرآن کے بارے میں ہمارا عقیدہ ہے کہ وہ کلام خدا ہے۔ ابوشاکر بولا جب آپ کا عقیدہ ہے کہ قرآن آپ کے خدا کا کلام ہے تو پھر آپ نے اس کے خلاف بات کیوں کی ؟ امام جعفر صادقؒ نے حیرانگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا وہ کونسی بات ہے جو میں نے خدا کے کلام کے خلاف کہی ہے ؟ ابوشاکر نے کہا میں نے سنا ہے آپ کے خدا نے کہا ہے' ہر شخص اپنے مقررہ وقت پر مرے گا اس کی موت نہ ایک گھنٹہ پہلے واقع ہوگی اور نہ ایک گھنٹہ بعد۔ امام جعفر صادقؒ نے فرمایا ہاں یہ کلام خدا ہے اور قرآن میں ہے۔

ابوشاکر نے کہا کیا آپ نے نہیں کہا کہ جو شخص زیادہ گوشت اور مرغن غذائیں کھائے گا وہ قبل از وقت ناگہانی بیماری کے نتیجے میں مرجائے گا ؟ امام جعفر صادقؒ نے فرمایا ہاں میں نے یہ بات کہی ہے۔ ابوشاکر بولا آپ کے خدا کا کہنا ہے کہ ہر ایک کی موت کا وقت معین ہے اور وہ اس سے نہ ایک گھنٹہ پہلے اور نہ ایک گھنٹہ بعد میں مرے گا۔ لیکن آپ کہتے ہیں کہ جو کوئی گوشت کھائے جلدی مرجائے گا اس طرح آپ نے کلام خدا کی نفی کی ہے۔ امام جعفر صادقؒ نے فرمایا پہلی بات تو یہ ہے کہ میں نے یہ نہیں کہا کہ جو کوئی زیادہ گوشت اور مرغن

غذائیں کھائے ناگہانی بیماری کا شکار ہوجائے گا بلکہ میں نے یہ کہا ہے کہ ممکن ہے بعض لوگ گوشت اور مرغن غذائیں کھانے کے نتیجے میں ناگہانی بیماری کا شکار ہوجائیں۔ دوسری بات یہ کہ طبعی عمر اور وہ عمر جسے انسان خود کم کرتا ہے دونوں میں فرق ہے۔ طبعی عمر وہ ہے جو ایک عام انسان گزارتا ہے اور اس کی عمر کی ایک مدت معین ہے جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے جس وقت وہ مدت پوری ہوجاتی ہے آدمی مرجاتا ہے اس وقت میں نہ ایک گھنٹہ کی کمی ہوتی ہے اور نہ بیشی۔ لیکن موت کی دوسری قسم وہ ہے جسے انسان خود اپنے ہاتھوں سے وجود میں لاتا ہے۔ یہ موت طبعی موت سے مختلف ہے اس کا نام خودکشی ہے۔ جو کوئی شخص خنجر سے اپنی گردن اور شہ رگ کو کاٹتا اور اپنے آپ کو ہلاک کرتا ہے وہ خدا کے مقررہ وقت پر نہیں مرتا۔ اللہ نے اس کے لئے شاید اسی یا نوے یا سو سال کی عمر کا تعین کیا ہو جبکہ وہ جوانی میں ایک ہی وار سے اپنی زندگی کا خاتمہ کردیتا ہے۔

جو لوگ گوشت اور دوسری مرغن غذائیں کھانے سے اپنے خون کو خراب کرتے ہیں وہ اپنی خودکشی کا سامان کرتے ہیں کیونکہ خون کی خرابی ناگہانی بیماری کا سبب بنتی ہے اگر اس بیماری کا سبب نہ بھی بنے تو کسی دوسری بیماری کا سبب بن جاتی ہے۔ للذا پیٹ بھر کر کھانا خصوصاً" گوشت و مرغن غذائیں زیادہ کھانا خودکشی کے مترادف ہے۔ پس جو کوئی بسیارخوری کے نتیجے میں اپنی طبعی عمر کے تقاضے سے پہلے اس دنیا سے کوچ کرجائے وہ اللہ کے فرمان میں شامل نہیں ہے۔ اے ابوشاکر ! جان لے کہ میں قرآن کو تجھ سے بہتر جانتا ہوں اور اس بات سے آگاہ ہوں کہ اللہ نے قرآن میں موت کے بارے میں کیا کہا ہے اور کسی نے کبھی بھی میرے منہ سے ایسی بات نہیں سنی ہوگی جو خدا کے فرمان کے خلاف ہو اور نہ ہی اس کے بعد سنے گا۔

## آپؑ کی جابر بن حیان سے گفتگو

ابوشاکر ایک ناسمجھ شخص تھا لیکن امام جعفر صادقؑ کے بعض شاگردوں میں جو سائنس دان شمار ہوتے ہیں وہ بھی استاد سے مباحثہ کرتے تھے۔ ان میں سے ایک جابر بن حیان بھی تھا۔

امام جعفر صادقؑ شاگردوں سے اس لئے بحث کرتے تھے تاکہ وہ علوم کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔ امام جعفر صادقؑ اسلامی دنیا میں وہ پہلے استاد ہیں جنہوں نے استاد اور شاگردوں کے درمیان بحث کی بنیاد رکھی اور یہ امر بعد میں آنے والے زمانوں میں اسلامی مدارس اور خصوصاً" شیعہ مدارس میں رواج پاگیا۔ ہر درس کے بعد شاگرد ایک دوسرے سے بحث مباحثہ کرتے تھے تاکہ استاد کے درس کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ ایک دن امام جعفر صادقؑ نے فلسفہ پڑھاتے ہوئے کہا ہر چیز حرکت کر رہی ہے اور اگر حرکت نہ ہو تو چیزوں کا وجود نہ ہو۔ یعنی اگر وہ اس طرح نہ ہوتیں جس طرح موجودہ شکل میں نظر آرہی ہیں اور حرکت کی وجہ سے یہ چیزیں باقی ہیں ان میں تبدیلی آچکی

ہوتی۔

امام جعفر صادقؑ کے ایک شاگرد جابر بن حیان نے سوال کیا' کیا آپ کو یقین ہے کہ کوئی چیز حرکت سے خالی نہیں۔ امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا اس بارے میں کوئی شک نہیں۔ جابر نے پوچھا کیا آواز حرکت کرتی ہے ؟ امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا ہاں اے جابر آواز متحرک ہے لیکن اس کی رفتار روشنی کی رفتار سے ست ہے۔ جب تم دور سے مشاہدہ کرتے ہو کہ لوہار کی دکان میں ایک شخص لوہے کے ہتھوڑے کو اوزار پر مارتا ہے تو اس کی آواز تھوڑی دیر بعد کانوں تک پہنچتی ہے۔ جبکہ تم دیکھتے ہو کہ ہتھوڑے سے وار کرنے والے نے جس لمحے وار کیا ہے اور اس کے نتیجے میں جو روشنی نکلی ہے وہ اسی لحہ تمہاری آنکھوں تک پہنچی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آواز کی رفتار روشنی کی رفتار سے ست ہے اور دیر سے سنائی دیتی ہے۔ جابر نے پوچھا کس قدر دیر سے سنائی دیتی ہے ؟ امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا یہ اس جگہ اور تمہارے درمیانی فاصلے پر منحصر ہے۔ قریبی مقام سے چند لحوں کے بعد تم آواز سن لوگے لیکن دور کی جگہ سے آواز تمہارے کانوں سے دیر سے ٹکراتی ہے۔ جابر نے پوچھا کیا فاصلوں کی لمبائی معلوم ہے ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا حکیم ارشمیدس نے اس فاصلے کو ناپا ہے اور اس کے بقول اگر انسان کا آواز کے منبع سے چار سو گز فاصلہ ہو تو آواز آٹھ سیکنڈ میں سنی جائے گی اور اسی نسبت سے انسان اور آواز کے منبع (source) کا فاصلہ جتنا زیادہ ہوگا آواز اتنی ہی دیر سے سنی جائے گی (۱۵۱)۔

جابر نے کہا جو حساب ارشمیدس نے لگایا ہے اس کے مطابق جب کبھی اللہ اپنے کسی پیغمبر سے بات کرنا چاہتا تو ہزاروں سال لگتے کیونکہ خدا ساتویں آسمان پر ہے۔ اس دنیا سے اس دنیا تک کا فاصلہ اتنا زیادہ ہے جس کا عقل حساب لگانے سے عاجز ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا یہ جو کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ساتویں آسمان پر ہے اس لئے کہا گیا ہے تاکہ عام لوگ اللہ کی عظمت کو درک کر سکیں ورنہ خدا تو ہر جگہ موجود ہے۔ کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں خدا نہ ہو۔ لہٰذا ہر زمانے میں جب کبھی اللہ اپنے کسی پیغمبر سے خطاب کرنا چاہتا تو اس کے اس قدر نزدیک ہوتا کہ جونہی اللہ کی آواز بلند ہوتی اس کا پیغمبر سن لیتا۔ لیکن اگر اللہ ساتویں آسمان پر بھی ہوتا تو بھی اس کی آواز ایک لحہ میں اس کے پیغمبروں تک جا پہنچتی کیونکہ اللہ کی آواز انسان اور دوسری مخلوقات کی مانند نہیں ہے کہ اسے سنائی دینے میں وقت درکار ہوتا ہو اور وہ فاصلے طے کرتی ہو بلکہ ادھر خدا نے کن کہا ادھر یکون ہوگیا اور یہ کائنات اسی طرح وجود میں آئی ہے۔ اللہ اپنی آواز کو کائنات کے دورترین مقام سے ایک لحہ میں اپنے پیغمبر تک پہنچا سکتا ہے۔ جابر نے پوچھا اگر دنیا ایک لمحے میں وجود میں آئی ہے تو یہ کیوں کہا گیا ہے کہ اللہ نے کائنات کو چھ دنوں میں خلق کیا ہے ؟

امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا کائنات کی حقیقی بنیاد ایک لحہ میں رکھی گئی اور چھ دن اس میں تبدیلی کے

وقوع پذیر ہونے میں لگے جس سے کائنات موجودہ شکل میں ظاہر ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خلقت کی ابتدا میں کائنات اس شکل میں نہ تھی۔ ایک لمبی مدت کی تبدیلی کے بعد دنیا اس حالت میں تبدیل ہوئی۔ خدا کے کلام میں جو چھ دن مذکور ہیں وہ اس لئے ہیں کہ عام لوگ اسے سمجھیں۔ تم یہ خیال نہ کرو کہ اللہ کے چھ دن میرے اور تمہارے چھ دنوں کی مانند ہیں۔ لیکن یہ بات ثابت ہے کہ چھ تبدیلیوں کے مراحل کے بعد کائنات نے موجودہ شکل اختیار کی تھی۔ (۱۵۲)

جابر نے پوچھا کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اللہ کا ایک دن کتنا ہے ؟ امام جعفرصادقؑ نے فرمایا اے جابر ! اگر میں تمہیں ایسا جواب دوں جس کے درست ہونے میں مجھے شک ہو تو میں کس لئے اس جواب کو زبان پر لاؤں ؟ اگر میں اللہ تعالیٰ کی ذات کو سمجھ سکتا تو تمہیں بتا سکتا کہ اللہ تعالیٰ کا ایک دن کتنا ہے ؟ میں اللہ کے دن کی مدت کے بارے میں جو کچھ تمہیں کہوں وہ میری اپنی اختراع ہوگی اور اس کا اللہ کے دن کی مدت سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ بہت طویل ہے اور ہم اپنے اندازوں سے اللہ کے دن کو نہیں سمجھ سکتے۔

جابر نے اپنے استاد سے پوچھا آپ کہتے ہیں کہ اللہ ہر جگہ موجود ہے اور کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں خدا نہ ہو۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ہاں اے جابر میں نے یہ بات کہی ہے اور یہی میرا عقیدہ ہے۔ جابر نے سوال کیا جب آپ کہتے ہیں کہ خدا ہر جگہ ہے تو لامحالہ آپ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ خدا ہر چیز میں بھی ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے مثبت جواب دیا۔ جابر نے کہا اس صورت میں جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ خالق اور مخلوق ایک ہی ہے ان کا قول صحیح ہونا چاہئے۔ چونکہ جب ہم اس بات کے قائل ہیں کہ خدا ہر چیز میں ہے تو ہمیں اس کی بھی تصدیق کرنا چاہئے کہ ہر چیز اگرچہ وہ پتھر' پانی اور درخت ہی کیوں نہ ہوں خدا ہے۔

امام جعفرصادقؑ نے فرمایا ایسا نہیں ہے' تم غلطی پر ہو۔ خدا پتھر' پانی اور درخت میں تو ہے لیکن پتھر' پانی اور درخت خدا نہیں ہیں۔ جس طرح تیل چراغ میں ہوتا ہے لیکن چراغ تیل میں نہیں ہوتا۔ اللہ ہر چیز میں ہے لیکن اس کے لئے پہلے وہ چیز وجود میں آئے اور دوسرے اپنی جمادی' شجری اور حیوانی زندگی کو جاری رکھے اور ختم نہ ہو۔ چراغ کی روشنی کا مایہ یعنی اس کی بقاء تیل اور فتیلہ ہے لیکن چراغ' تیل اور فتیلہ نہیں ہے۔ تیل اور فتیلہ چراغ میں شعلہ پیدا کرتے ہیں اور چراغ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا چونکہ تیل اور فتیلہ اس میں موجود ہے۔ پس وہ تیل اور فتیلہ ہے۔ یہ بات محال ہے کہ مخلوق جو خالق کی پیدا کی ہوئی ہے خالق بن جائے۔ تمام لوگ جو گزشتہ زمانوں میں خالق اور مخلوق کی وحدت کا عقیدہ رکھتے تھے وہ اپنے استدلال کی ظاہری شکل سے فریب کھاتے تھے۔ ان کے بقول چونکہ جو کچھ اس کائنات میں موجود ہے اس میں خدا ہے لہٰذا جو کچھ ہے وہ خدا ہے۔ اگر یہ عقیدہ صحیح ہوتا تو تمام مخلوق خدائی طاقت کی حامل ہوتی کیونکہ وہ خدا ہیں۔ لیکن تمام کائنات میں ایک

وجود بھی ایسا نہیں ہے جو خدائی قدرت رکھتا ہو۔ وہ لوگ جو اس بات کے معتقد ہیں کیا ان میں سے کوئی ایک بھی ایک پتھر ہی وجود میں لاسکا ہے ؟ کیونکہ خالق اور مخلوق کی وحدت کا مطلب یہ ہے کہ انسان بھی خدا ہے اور انسان کی خدائی کا لازمہ یہ ہے کہ وہ کام کر سکے جو خدا کرتا ہے۔ ایک لفظ "کن" سے ساری کائنات کو پیدا کرے اور ایک قطرے سے ایک انسان وجود میں لائے۔

جو لوگ خالق و مخلوق کی وحدت کے معتقد ہیں اور اس کے نتیجے میں اپنے آپ کو خدا سمجھتے ہیں کیا ان میں سے کسی ایک شخص نے ایسا کام کیا ہے جس سے ظاہر ہو کہ اس میں خدائی صفات ہیں۔ جب انہیں کہا جاتا ہے چونکہ آپ اپنے آپ کو خدا سمجھتے ہیں لہٰذا خدا کا کوئی کام کر کے دکھائیں تاکہ ہمیں یقین ہو جائے کہ آپ خدا ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ ہم خدا ہیں لیکن ہمیں خدا ہونے کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ہے اور کیا یہ منطق سے خالی بچوں جیسی بات قابل قبول ہے ؟

کیونکہ اگر کوئی شخص جان لے کہ وہ خدا ہے تو وہ کس طرح کہہ سکتا ہے کہ اسے خدا ہونے کے متعلق کوئی اطلاع نہیں۔ اے جابرؓ تم جان لو کہ اگرچہ اللہ ہر چیز میں اور ہر جگہ پر ہے لیکن وہ مکان اور اشیاء خدا نہیں ہیں۔ تمام خدا کی مخلوق ہیں خدا تمام مکانوں اور اشیاء میں ایک خالق اور محافظ کی مانند ہے۔ وہی ہے جس نے حرکات کو پیدا کیا ہے اور انہی حرکات کی وجہ سے جمادات جمادی زندگی' درخت اپنی شجری زندگی اور جانور اپنی حیوانی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس کے باوجود کہ زندگی حرکت کے بغیر ناممکن ہے کوئی موحد یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہی حرکت خدا ہے۔ چونکہ حرکت بھی دوسری اشیا کی مانند خدا کی مخلوقات میں سے ہے۔ بہرحال یہ ایک ایسی مخلوق ہے جو دوسری مخلوقات کی پیدائش کا سبب بنتی ہے۔ یونانی حکماء جو یہ کہتے ہیں کہ حرکت خدا ہے وہ سنگین غلطی پر تھے کیونکہ حرکت اس وقت تک وجود میں نہیں آتی جب تک اس کی قوت وجود میں نہ آئے۔ جب تک وہ قوت ہے حرکت جاری ہے اور جب یہ قوت ختم ہو جائے گی تو حرکت بھی رک جائے گی۔

چونکہ حرکت توانائی سے وجود میں آتی ہے لہٰذا مخلوق ہے نہ کہ خالق۔ وہ توانائی جو حرکت کو وجود میں لائی وہ خدائی قوت ہے۔ لیکن ایک موحد یہ بات تسلیم کر سکتا ہے کہ حرکت دوسری چیزیں بھی وجود میں لاتی ہے۔ یہ عقیدہ توحید کے خلاف نہیں ہے چونکہ خدا نے کائنات کے امور چلانے کے لئے اسباب پیدا کئے ہیں ان میں ایک حقیقی سبب حرکت ہے۔ بعض یونانی فلسفیوں کے بقول حرکت مادہ ہے اور مادہ حرکت۔ مادہ اپنے آخری مرحلے میں حرکت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اگر حرکت مادے میں رک جائے تو مادہ ختم ہو جاتا ہے۔ اے جابرؓ بعض یونانی فلسفیوں نے سوچ اور فکر کو بھی مادے کا جزو شمار کیا ہے اور کہا ہے کہ مادے کے بغیر سوچ اور فکر کا کوئی وجود نہیں۔ جس طرح پھول کے بغیر اس کے عطر کی خوشبو کوئی نہیں سونگھ سکتا اسی طرح اگر مادہ ختم ہو جائے تو سوچ اور فکر بھی ختم ہو جاتی ہے۔

لیکن ان کا مذکورہ نظریہ اس لئے درست نہیں کہ فلسفے میں چاہے یونانیوں کا زمانہ ہو یا آج کا دور' حقیقت یہ ہے کہ کوئی چیز فنا نہیں ہوتی بلکہ اپنی حالت تبدیل کرتی ہے۔ پس انسان بھی فنا نہیں ہوتا بلکہ موت کے بعد اپنی حالت تبدیل کرتا ہے اور اسی طرح اس کی سوچ بھی تبدیل ہوتی ہے اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ انسان کسی دوسری صورت میں باقی رہتا ہے اور انسان کی موت کے بعد اس کے باقی رہنے والے عوامل اور روحانی صفات اس کی روح ہے (۱۵۳)

اے جابر' جب ایک مومن سمجھتا ہے کہ اس کے اصول دین اور حقیقت برحق ہیں تو وہ لذت اٹھاتا ہے اور یہ لذت انسانی فطرت کا جزو ہے۔ انسان ہر منظم اور کامل چیز کو دیکھنے سے لذت اٹھاتا ہے۔ اے جابر' کیا تم اس نقش کو دیوار پر دیکھتے ہو اور مشاہدہ کرتے ہو کہ ایک منظم ہندسی صورت ہے۔ تو تم اس مشاہدے سے لذت اٹھاتے ہو۔ لیکن نہ صرف اس لئے کہ تم علم ہندسہ (جیومیٹری) سے واقف ہو اور تمہیں معلوم ہے کہ یہ جیومیٹری کی اشکال میں سے کونسی شکل ہے۔ بلکہ اس لئے کہ اسے منظم دیکھتے ہو اور مشاہدہ کرتے ہو کہ ایک مکمل نقش ہے۔ وہ لوگ جو جیومیٹری سے مطلع نہیں ہیں وہ بھی اس نقش کو دیکھنے کے بعد لذت اٹھاتے ہیں کیونکہ اسے مکمل اور منظم دیکھتے ہیں۔

چھوٹے بچے بھی اس نقش کے مشاہدے سے خوشی محسوس کرتے ہیں کیونکہ اس کی مکمل اور منظم شکل ان کی روح میں ایک طرح کی تسکین وجود میں لاتی ہے۔ اگر یہ نقش جسے میں اور تم دیکھ رہے ہیں غیر منظم ہوتا اور اس کی لائنیں بے ترتیب اور بکھری ہوئی ہوتیں' اس طرح کہ یہ ایک مکمل ہندسی شکل اختیار نہ کرگیا ہوتا اور نہ ہی کسی ایسی چیز کی شبیہہ ہوتا جسے ہم پہچانتے ہیں تو کیا اس صورت میں بھی ہم اس کے مشاہدے سے محظوظ ہوتے ؟ جابر بولا نہیں۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ہم ایک غیر منظم اور بے ترتیب نقش کے مشاہدے سے نہ صرف محظوظ نہیں ہوتے بلکہ اس کے برعکس ہمیں کوفت ہوتی ہے اور اس کا عیب اور نقص ہماری خفگی کا باعث بھی بنتا ہے گویا جس طرح ہم ایک بدمزہ کھانا کھا رہے ہوں۔

اسی طرح دینی حقائق پر بھی ہم غور کرتے ہیں تو محظوظ ہوتے ہیں کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ مکمل اور نقائص سے پاک ہیں۔ اگر ایک چیز نقص کے بغیر اور کامل ہو (خواہ مادی یا روحانی ہو) تو وہ خوبصورت ہوتی ہے اور ہمارے لئے مسرت کا باعث ہوتی ہے۔ اسی طرح دینی حقائق بھی چونکہ نقائص سے پاک ہیں لہٰذا وہ بھی ہماری مسرت و شادمانی کا ذریعہ ہیں۔

جابر بن حیان نے کہا لیکن یہ دینی حقائق عام لوگوں کو معلوم نہیں لہٰذا لوگ انہیں سمجھنے سے لطف اندوز نہیں ہوسکتے۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا عام لوگوں کے پاس علم نہیں اسی لئے میں لوگوں کو تاکید کرتا ہوں کہ علم حاصل کریں۔ جابر بن حیان نے پوچھا دین اسلام کے حقائق اس طرح نازل کیوں نہیں ہوئے کہ تمام لوگ انہیں

سمجھ سکتے ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا نہ صرف یہ کہ اسلام کے حقائق اس طرح نازل نہیں ہوئے کہ لوگ انہیں سمجھ سکیں بلکہ اسلام سے قبل مذاہب کے حقائق جو خدا کی طرف سے مقرر کئے گئے ہیں اس طرح نازل نہیں ہوئے تھے کہ تمام لوگ انہیں سمجھ کر ان سے محظوظ ہوں۔

اے جابر ! جان لو' دین فلسفے سے جدا ہے۔ فلسفے میں یہ ہے کہ جو کچھ کہا جائے اس کے لئے استدلال کی ضرورت ہے تاکہ سامع کی عقل اسے تسلیم کرے۔ جب ایک سامع ایک فلسفیانہ مسئلہ سنتا ہے تو جب تک بولنے والا شخص دلیل کے ساتھ اس کی صحت کا ثبوت فراہم نہ کردے اس وقت تک سامع اس مسئلے کو تسلیم نہیں کرتا کیونکہ سامع بھی بولنے والے کی مانند فلسفی ہے اور اگر فلسفی نہ ہو تو بھی اسے فلسفہ سے شغف ضرور ہے ورنہ وہ ہرگز فلسفیانہ بحث کو سننے اور سمجھنے کی طرف راغب نہیں ہوسکتا۔

فلسفے سے متعلق ہر قسم کا مسئلہ چونکہ فلاسفہ یا فلسفے سے ذوق رکھنے والوں کے لئے بیان کیا جاتا ہے اور یہ کہ وہ مدلل ہو اور اسے ثابت کیا گیا ہو تاکہ فلاسفہ اسے قبول کریں۔ لہٰذا ہر فلسفیانہ مسئلے میں دلیل یا دلائل کا ہونا ضروری ہے۔ ہر فلسفیانہ مسئلہ انسانی عقل سے سروکار رکھتا ہے اور جب تک اسے عقل تسلیم نہ کرے اس مسئلے کی صحت ثابت نہیں ہوتی۔ جب ایک فلسفی کسی نظریئے کو پیش کرتا ہے تو اسے عام لوگوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ وہ نہیں چاہتا کہ عام لوگ اس کے فلسفیانہ نظریے کو سمجھیں گویا وہ جانتا ہے کہ عام لوگ اس کے فلسفیانہ نظریئے کو سمجھنے پر قادر نہیں ہیں اور جو کچھ کہتا ہے فلسفیوں یا ان لوگوں کے لئے کہتا ہے جو فلسفیانہ ذوق رکھتے ہیں۔ وہ جو کچھ کہتا ہے ان کی عقل سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

لیکن دین فلسفیانہ نظریئے سے جدا ہے۔ ہمارے پیغمبر ﷺ دین اسلام کو خدا کی طرف سے تمام انسانوں کے لئے لے کر آئے۔ نہ کہ صرف ان لوگوں کے لئے جن کی عقل دوسرے لوگوں سے برتر ہے اور وہ ہر چیز کو تسلیم کرنے کے لئے دلیل مانگتے ہیں۔ دوسرے پیغمبر بھی جو ہمارے پیغمبر سے قبل مبعوث ہوئے وہ دین کو تمام لوگوں کے لئے لائے۔ نہ صرف ایک مخصوص گروہ کے لئے جو عقلی لحاظ سے دوسروں سے برتر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر کے لئے دینی حقائق کو لوگوں کے لئے سادہ ترین شکل میں پیش کرنا ناگزیر تھا۔ ہر حقیقت کے ثبوت کے لئے دلیل پیش نہیں کی کیونکہ عام لوگ ہر دینی حقیقت کی مصلحت کو نہیں سمجھ سکتے تھے اور آج بھی تمام دینی حقائق کی مصلحتوں کو کوئی نہیں سمجھ سکتے۔ حتیٰ کہ اگر ایک شخص نہایت سادہ ترین طریقے سے حقائق دینی کو دلائل کے ساتھ لوگوں کے سامنے ثابت کرے تو بھی بعض لوگ ان میں سے بعض کی مصلحتوں کو نہیں سمجھ پاتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ احکام دین لوگوں کے عقیدے کے لئے نازل ہوئے ہیں نہ کہ ان کی عقل کے لئے سوائے ان لوگوں کے جو عقلی لحاظ سے دوسروں سے طاقتور ہیں۔

فلسفے کے مسائل انسانی عقل سے سروکار رکھتے ہیں اور دینی مسائل لوگوں کے ایمان سے۔ مومنین کے

درمیان وہ لوگ جو علم حاصل کرتے ہیں وہ اپنی عقلی ترقی کے نتیجے میں جو علم کے ذریعے حاصل ہوتی ہے دین اسلام کی مصلحت کو سمجھ سکتے ہیں اور وہ لوگ جو علم نہیں حاصل کرسکتے اور اپنی عقل کو قوی نہیں کرسکتے اور دین اسلام کے حقائق کی مصلحت کو نہیں سمجھ سکتے ان کے لئے وہی ایمان کافی ہے۔

دین اسلام کے حقائق کی مصلحت کے بارے میں جو وضاحت عوام کے لئے پیش کی جائے بے فائدہ ہے کیونکہ ایک عام آدمی کو کسی موضوع کے علمی لحاظ سے سمجھنے کے لئے علم کے مقدمات کا جاننا ضروری ہے ورنہ وہ کوئی چیز نہیں سمجھ پاتا۔ دین اسلام کے حقائق کو عوام کے لئے دلیل سے بیان کرنے کے لئے ان کے ساتھ علمی وضاحت پیش کرنا ضروری ہے۔ اس علمی وضاحت کو صرف وہ لوگ درک کرسکتے ہیں جو اگر عالم نہ ہوں تو کم از کم علم کے مقدمات طے کرچکے ہوں۔

علم حاصل کرنا ارادے کا محتاج ہے۔ علم حاصل کرنے کا ارادہ ایک شخص میں اس قدر ہونا چاہئے کہ وہ علم حاصل کرنے پر آمادہ ہوجائے۔ یہ ارادہ عوام میں نہیں ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ایک عام آدمی جانتا ہے کہ اگر علم حاصل کرنا شروع کردے تو کئی سالوں تک وہ مادی فوائد سے محروم رہے گا۔ لیکن اس کے بجائے اگر وہ کھیتی باڑی کرے یا بھیڑ بکریاں یا اونٹ پالے تو اسے خاطرخواہ فائدہ ہوگا۔ البتہ وہ روحانی نتائج جو انسان علم کے ذریعے حاصل کرتا ہے ان کا امکان نہیں ہوتا۔ پس عام لوگوں کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ صرف ایمان رکھتے ہوں اور اصول و فروع دین اسلام سے وہی کچھ اخذ کریں جو اس کے ظاہر میں ہے۔

اے جابر ! تو ایک عالم شخص ہے تجھے معلوم ہے کہ کلام خدا میں جنت اور دوزخ کا جو ذکر آیا ہے اس سے کیا مراد ہے ؟ تجھ سے پوشیدہ نہیں ہے کہ جنت اور دوزخ کا اصلی مفہوم کچھ اور ہے لیکن کیا تو اس مفہوم کو ایک عام آدمی کے ذہن میں بٹھا سکتا ہے ؟ صرف ایک صورت میں ایک عام آدمی جنت اور جہنم کے مفہوم کو سمجھ سکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ علم حاصل کرے اور جب عالم ہوجائے تو جنت اور دوزخ کے حقیقی مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ اگر وہ خود بہشت اور دوزخ کے حقیقی مفہوم کو نہ سمجھ سکے تو چونکہ وہ عالم ہے لہٰذا اس کے سامنے جب ان دو کی تشریح بیان کی جائے تو وہ اس سے سمجھ جائے گا۔ لیکن اگر تو آج جنت اور دوزخ کے حقیقی مفہوم کو ایک عام شخص کے ذہن میں بٹھانا چاہے تو اس کا واحد نتیجہ یہ نکلے گا کہ اس کا ایمان متزلزل ہو جائے گا اور وہ شخص جو ایمان تیری وضاحت سے پہلے رکھتا تھا اس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ لوگوں سے ان کی عقل کے مطابق گفتگو کرو۔ ہر ایک سے اس زبان میں بات کی جائے جو اس کی عقل اور فہم کے مطابق ہو کیونکہ دین کے مخاطب تمام بنی نوع انسان ہیں لہٰذا کلام خدا نہایت سادہ اسلوب میں نازل ہوا ہے۔ عام لوگ بھی کلام خدا کے ظاہری معنوں کو سمجھ سکتے ہیں اور اس سلسلے میں کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔

صرف ایک صورت میں ممکن تھا کہ لوگ کلام خدا کے مفہوم کو کسی دوسرے معنوں میں لیتے اور وہ یہ ہے

کہ کلام خدا کا پڑھنے والا حروف کے اعراب میں غلطی کرتا جس کے نتیجے میں عام سامعین غلطی کا شکار ہوجاتے جیسا کہ تجھے معلوم ہے میرے دادا نے اس غلطی کو دور کرنے کے لئے علم نحو وضع کیا تاکہ لوگ قرآن کو غلط نہ پڑھیں۔ اس طرح یہ خطرہ ٹل گیا کہ لوگ قرآن کو غلط پڑھے جانے کی وجہ سے کسی غلطی کا شکار ہوں۔

جابر نے کہا مجھے افسوس ہے کہ لوگ دین مبین سے احکامات کی مصلحت اور کلام خدا کے وسیع مفہوم کو سمجھنے کی جانب توجہ نہیں کرتے۔ میرا خیال ہے کہ اگر لوگ ان نکات کی طرف توجہ دیں تو دین خدا آج سے زیادہ وسیع ہو جائے گا۔ امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا سابقہ تمام ادیان میں لوگوں کی ایک اقلیت ہمیشہ ایسی رہی ہے جو احکام دین کو خوب سمجھتے تھے اور دین کے قوانین سے واقف ہونے کی بنا پر دینی لحاظ سے لوگوں کے مذہبی رہنما ہوتے تھے۔

دین اسلام میں بھی ایسا ہی ہے اور اسی طرح آج بھی ایک اقلیت دینی لحاظ سے لوگوں کی رہبری کر رہی ہے۔ آئندہ بھی مسلمانوں کی ایک اقلیت عالم بن کر لوگوں کی دینی رہبری کا فریضہ انجام دے گی۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کیفیت اس وقت تک باقی رہے گی جب تک علم سب کے لئے عام نہیں ہوجاتا۔

جابر نے پوچھا کیا ممکن ہے ایسا دن آئے کہ علم تمام لوگوں کے لئے عام ہوجائے ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ایسا دن آئے گا کہ انسان سمجھے گا کہ تمام انسانوں کو عالم بننا چاہئے اور انسان اس کے لئے تمام وسائل بروئے کار لا کر تمام انسانوں کو علم حاصل کرنے کی طرف راغب کرے گا۔ جابر نے کہا۔ لامحالہ اس دن تمام انسان عالم بن جائیں گے۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا نہیں اے جابر ! حتی کہ اس دن بھی تمام بنی نوع انسان عالم نہیں بن جائیں گے کیونکہ لوگوں میں تحصیل علم کی استعداد میں فرق ہوگا۔ اگرچہ علم حاصل کرنے کے مواقع سب کے لئے فراہم ہوں گے لیکن چونکہ لوگوں میں استعداد یکساں نہیں ہوگی کہ سب عالم بن جائیں لہٰذا بعض تو عالم بن جائیں گے اور بعض علم حاصل کرنے کی طرف راغب نہیں ہوں گے۔ وہ تحصیل علم کو ترک کرکے کوئی اور پیشہ اختیار کرلیں گے لہٰذا کسی بھی دور میں ایسی حالت پیدا نہیں ہوگی کہ تمام بنی نوع انسان عالم بن جائیں۔

لیکن اس کے باوجود کہ اس وقت تمام لوگ عالم نہیں بن سکیں گے عوام کی موجودہ حالت نہیں ہوگی کیونکہ ہر کوئی کچھ نہ کچھ علم حاصل کرچکا ہوگا اور کم از کم خواندہ ہوگا۔ لہٰذا اس دن علماء دینی حقائق کو لوگوں کو سمجھا سکیں گے۔ اگر کوئی دیوانہ نہ ہو تو چونکہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے لہٰذا دینی حقائق کو سمجھ سکتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا کہ اگر تمام لوگ دینی حقائق سے واقف نہ بھی ہوسکیں تو بھی لوگوں کی اکثریت ان حقائق کو درک کرلے گی۔ جابر نے پوچھا۔ انسان کے تفکرات اور ارادوں میں سے کونسا سب سے زیادہ مضبوط ہے ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا زندگی کی حفاظت اور زندہ رہنے کا ارادہ۔ جابر سے سوال کیا۔ کیا اس مضبوط ارادے کا سرچشمہ علم ہے ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا اس ارادے کو زندگی کے سرچشمے سے

تقویت ملتی ہے اور ایسے بھی ہیں جنہیں خود علم نہیں کہ زندہ رہنے کا ارادہ رکھتے ہیں لیکن ان میں بھی یہ ارادہ دوسرے لوگوں کی مانند قوی ترین ارادے کی حیثیت سے موجود ہے۔ اس دنیا میں بنی نوع انسان کی زندگی میں تم جو کچھ دیکھ رہے ہو اس ارادے سے وجود میں آیا ہے۔ جابر نے پوچھا۔ کیا انسانی زندگی میں یہ ارادہ زیادہ موثر ہے یا حرکت ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ان دونوں کا موازنہ نہیں ہو سکتا کیونکہ حرکت ایک مادی چیز ہے اور زندہ رہنے کا ارادہ ایک روحانی شے ہے۔ زندہ رہنے کا ارادہ انسان میں حرکت سے وجود میں آتا ہےاور یہ ارادہ خود حرکات کا سبب بنتا ہے۔ اے جابر ! کوئی ایسا زندہ وجود نہیں ہے جو زندہ رہنے کا ارادہ نہ رکھتا ہو۔ جیسا کہ جب کوئی اپنے آپ کو موت کے خطرے میں پاتا ہے تو اگر اس سے ہوسکے تو دفاع کرتا ہے اگر دفاع کرنے پر قادر نہ ہو تو جان بچانے کے لئے پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اگر حرکت ختم ہوجائے تو آدمی مرجائے اور اگر زندہ رہنے کا ارادہ ختم ہوجائے تو وقتی طور پر انسان زندہ رہتا ہے۔ وقتی طور پر ہم اس لئے کہتے ہیں کہ زندہ رہنے کے ارادے کے ختم ہوجانے کے بعد زیادہ دیر نہیں گزرے گی کہ آدمی مرجائے گا۔ جو چیز انسان کو غذا کھانے اور پانی پینے پر مائل کرتی ہے وہ انسان کا زندہ رہنے کا ارادہ ہے۔ ممکن ہے اے جابر ! تو کہے کہ غذا کھانے اور پانی پینے کی طرف مائل ہونا انسانی ضرورت ہے اور جب انسان بھوکا ہوتا ہےتو اگر اس کے پاس غذا ہو تو وہ غذا کھاتا ہے اور پیاس کے وقت پانی پیتا ہے۔ میں تجھ سے کہتا ہوں کہ پیاس اور بھوک کی طلب انسان میں اس لئے وجود میں آتی ہے کہ ان دونوں سے زیادہ قوی تر طلب وہی زندہ رہنے کا ارادہ ہے۔ جونہی انسان بیمار ہوتا ہے اس میں بھوک یعنی بھوک کا احساس ختم ہوجاتا ہے۔ بہرحال جب انسان میں زندہ رہنے کا ارادہ باقی نہیں رہتا تو آدمی کھانا پینا چھوڑ دیتا ہے اور اپنی گزراوقات کے لئے کام نہیں کرتا اور نہ ہی صفائی کا خیال رکھتا ہے اور نہ اپنے بیوی بچوں کے سرچھپانے کے لئے گھر بناتا ہے۔ لیکن انسان میں زندہ رہنے کا ارادہ اس قدر قوی ہوتا ہے کہ وہ ہرگز ختم نہیں ہوتا سوائے ان لوگوں کے جو خودکشی کا ارادہ کرلیتے ہیں۔

جابر نے پوچھا میں نے سنا ہے عبقری (۱۵۴) اور مجنوں کو ایک دوسرے کی شبیہہ سمجھا جاتا ہے کیا یہ نظریہ صحیح ہے ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا افلاطون وہ پہلا شخص ہے جس نے یہ نظریہ پیش کیا (۱۵۵)

افلاطون نے بھی عبقری اور مجنوں کی شباہت کے بارے میں گفتگو نہیں کی بلکہ کہا کہ جب تک انسان تھوڑا بہت جنون نہ رکھتا ہو شعر نہیں کہتا۔ انسانی زندگی کی حالت میں کوئی بہتری نہیں آتی اور نہ ہی نقصان ہوتا ہے اور نہ ہی خود شاعر کے لئے سودمند ہے۔ لہٰذا یہ کسی عاقل شخص کا کام نہیں۔ پس افلاطون کے نظریئے کی بنا پر ہر شاعر کم و بیش دیوانہ ہے۔

لیکن قدیم یونان میں ایسے شاعر تھے جو شعر پڑھنے کے لحاظ سے خاصی استعداد کے مالک تھے۔ ان میں سے بعض کی استعداد اس قدر زیادہ تھی کہ یونانی لوگ انہیں عبقری کہا کرتے تھے۔ چونکہ افلاطون نے کہا تھا کہ شاعر

دیوانہ ہوتا ہے لہٰذا افلاطون کے بعد بعض صاحب نظر لوگوں نے کہا کہ اگر عبقری دیوانہ نہ ہو تو عبقری اور مجنوں کے درمیان کافی مشابہت پائی جاتی ہے۔ یہ نظریہ صحیح نہیں ہے کہ عبقری کو دیوانے سے کوئی شباہت نہیں ہے۔ دیوانہ وہ ہے جو اپنے اعمال میں عقل سلیم کا تابع نہ ہو اور ایسے کام کرے جنہیں عقل تسلیم نہ کرے۔ لیکن دیوانہ اپنے آپ کو عاقل سمجھتا ہے اور اسے یقین ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے عقل کی رو سے کر رہا ہے۔ لیکن ایک عبقری عقل سلیم رکھتا ہے اور جو کچھ کرتا ہے دوسروں کی عقل اس کی داد دیتی ہے۔

اتفاق سے خود افلاطون نے جس نے پہلی بار کہا کہ شاعر دیوانہ ہوتا ہے' اسی موضوع کے بارے میں مثال پیش کی ہے۔ اگرچہ یہ مثال اس نے کسی دوسرے موقع و محل کی نسبت سے کہی ہے لیکن میں تمہارے موضوع کو کھولنے کے لئے اس سے استفادہ کرتا ہوں جس کا خلاصہ یہ ہے۔ افلاطون کہتا ہے فرض کریں ایک گروہ ایک ایسی جگہ رہتا ہے جہاں سورج کی روشنی نہیں پڑتی اور اس جگہ کو سورج کی منعکس شدہ روشنی روشن کرتی ہے۔ فرض کرتے ہیں کہ اس گروہ کی زندگی کے وسائل ایک غار میں میسر ہیں اور ان لوگوں کو باہر آنے کی قطعی ضرورت نہیں۔ وہ کبھی باہر نہیں آئے۔ انہوں نے دن کو سورج کی دھوپ دیکھی اور نہ ہی رات کو چاند اور ستاروں کی روشنی دیکھی۔

ان کی کل کائنات یہی غار اور اس کی چاردیواریں ہیں۔ اب ہم فرض کرتے ہیں کہ عام لوگوں کا ایک گروہ جو باہر رہ رہے تھے اس میں داخل ہوئے۔ وہ سورج کے طلوع و غروب کو دن میں اور چاند ستاروں کو رات کو دیکھتے تھے۔ انہیں اس بات کا علم تھا کہ کائنات میں وسیع و عریض صحرا' بلندوبالا پہاڑ' گہرے سمندر' چرند' پرند' مچھلیاں اور بہت سے دوسرے جانور موجود ہیں۔ درخت و جڑی بوٹیاں آسمانی بادلوں کے پانی سے سیراب ہوتی ہیں۔ جونہی یہ لوگ غار میں داخل ہوں گے تو چونکہ وہ پہلی مرتبہ روشنی سے تاریکی میں داخل ہوئے ہیں لہٰذا انہیں کچھ بھی نظر نہیں آئے گا۔ انہیں اپنی آنکھوں کو تاریکی کا عادی بنانے کے لئے ایک عرصہ درکار ہے۔ لیکن تاریکی کے عادی لوگ جو وہاں رہ رہے ہیں ان داخل ہونے والوں کو دیکھ رہے ہیں اور ان کے اندھے پن سے لطف اٹھاتے اور ان کا تمسخر اڑاتے ہیں۔ ایک عرصہ گزر جانے کے بعد چونکہ یہ نئے داخل ہونے والے تاریکی کے عادی ہوجاتے ہیں اور وہاں رہائش پذیر افراد کو دیکھ سکتے اور ان کے لئے باہر کی حالت بیان کرسکتے ہیں۔ وہ انہیں بتاتے ہیں کہ باہر روشن سورج' سرسبز درخت و جڑی بوٹیاں پائی جاتی ہیں۔ پرندے پرواز کرتے ہیں اور گھاس کھانے والے جانور گھاس کھاتے ہیں' ہوا چلتی ہے لیکن وہ لوگ جو ہمیشہ سے غار میں رہتے ہیں پھر ان نئے آنے والوں کا تمسخر اڑاتے ہیں۔ چونکہ ان کی سوچ اس بات کو نہیں سمجھ سکتی جو کچھ نئے آنے والے کہہ رہے ہیں اور نہ ہی سمجھ سکتے ہیں کہ سورج' جانور' درخت اور ہوا کیا ہے؟ غار میں ان کی سوچ سب سے پست ترین مرحلے میں ہے۔ یہاں تک کہ ان کی سوچ جانوروں کے اس گروہ سے بھی پست ہے جو دن اور

رات کی پہچان کر سکتے ہیں۔

اس غار میں قیام پذیر لوگوں کی سوچ محدود اور پست ہونے کی وجہ سے ان کی نظر سے تمام وہ لوگ جو اس غار میں باہر سے داخل ہوتے ہیں دیوانے ہیں۔ لیکن ہمیں معلوم ہے کہ وہ عاقل ہیں مگر چونکہ اس غار میں قیام پذیر لوگ باہر سے آنے والے لوگوں کی سوچ کا ادراک نہیں کر سکتے لہٰذا انہیں دیوانے سمجھتے ہیں۔ خاص طور پر یہ کہ وہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ نئے آنے والے ان کی عام زندگی کی طرف ذرا بھر توجہ نہیں کرتے اور ان کی مانند لباس پہننا' غذا کھانا اور سونا نہیں چاہتے۔ یہ بات وہاں مستقل رہائش پذیر لوگوں پر ثابت کرتی ہے کہ وہ دیوانے ہیں۔ چونکہ اگر وہ دیوانے نہ ہوتے تو ان کی روزمرہ زندگی کے قوانین کا ضرور خیال رکھتے۔

عبقری بھی عام لوگوں کی نسبت خصوصاً" عوام کی نسبت تقریباً" ان لوگوں جیسے ہیں جو باہر سے غار میں وارد ہوئے ہیں اور بعض عبقری' لوگوں کی عام زندگی کی رسومات اور وظائف سے مبرا ہیں۔

لامحالہ وہ عام لوگوں اور خصوصاً" عوام کی نظر میں دیوانے نظر آتے ہیں۔ اے جابر ! تو جان لے کہ عبقری اور مجنوں کے درمیان مشابہت موجود ہونے کا نظریہ صحیح نہیں ہے۔ افلاطون کا یہ نظریہ کہ شاعر مجنون ہوتا ہے صحیح نہیں' کیونکہ اس کا خیال ہے کہ انسان جو سوچ بھی پیش کرے اس کے لئے اسے یا کسی اور کو مادی نتیجہ ملنا چاہئے۔ اس کے باوجود کہ وہ ایک فلسفی تھا لیکن اس نے اس پر غور نہیں کیا کہ بعض سوچ و بچار ایسی ہوتی ہیں جن کی مادی قدر و قیمت نہیں ہوتی لیکن وہ روحانی قدر و قیمت کی حامل ضرور ہوتی ہیں۔ ان سوچ و بچار یا تفکرات میں سے بعض ایسے ہیں جو اشعار میں سما جاتے ہیں۔ اگر شاعر باکمال اور باذوق ہو تو شعر پڑھنے والا یا سننے والا وجد میں آجاتا ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ اسے روحانی سرور مل رہا ہے۔

کیا خود افلاطون کی زندگی میں ایسی چیزیں نہیں تھیں جو ذوق سے وجود میں آئی ہوں وہ کیوں شعر کو برا بھلا کہتا ہے ؟ کیا جو کچھ وہ پڑھاتا تھا اس کا ایک حصہ ذوق کے پہلو کا حامل نہ تھا۔ کیا وہ فلسفے کے ذوق کے علاوہ کسی اور ذوق سے محظوظ نہیں ہوتا تھا ؟ کیا وہ چیزیں جو روح کو تازگی بخشتی ہیں ان میں ایک اللہ کی کائنات میں پیدا کردہ حسن و جمال میں سے کسی حسن کی تعریف کرنا نہیں ہے اور اس حسن و جمال کی تعریف کرنے کے لئے کیا شاعری کی زبان زیادہ برتر و موثر ہے یا فلسفے کی ؟ ہر چیز اپنی جگہ خوبصورت لگتی ہے۔ شعر کی زبان کا استعمال اپنی جگہ پر اور فلسفے کی زبان کا استعمال اپنے مقام پر مناسب لگتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ فلسفے کو شعر کی زبان میں بیان نہیں کیا جاسکتا اور وہ اشعار جو میرے دادا علیؑ نے کہے ہیں ان کا ایک حصہ فلسفے' نصیحت اور علم اخلاق پر مشتمل ہے بلکہ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ایک مقام ایسا ہوتا ہے جہاں شعر کام میں لایا جاتا ہے جبکہ فلسفہ اس چیز کو بیان نہیں کر سکتا جس چیز کو شعر بیان کر سکتا ہے۔ شعر کی زبان کا ایک اور موقع و محل رجز ہے۔ اے جابر ! کیا تو نے سنا ہے کہ کسی نے رجز کو فلسفے کی زبان میں بیان کیا ہو ؟

میری مراد یہ نہیں کہ میں جنگ اور خونریزی کو جائز جانتا ہوں بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ فلسفے کی زبان جس قدر بھی دلیل و برہان پر تکیہ کرے اس سے رجز نہیں پڑھا جا سکتا۔ اور نہ ہی اس سے شعر کی زبان کی مانند پھولوں کی خوبصورتی کی تعریف بیان کی جاسکتی ہے۔ چونکہ فلسفے کی زبان دلائل کی محتاج ہے اور شعر کی زبان انسانی حواس کی' ان دو زبانوں کے فرق کو ایک مثال سے واضح کیا جاسکتا ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ فلسفے کی زبان ایک فولادی تیشے کی مانند ہے جو بڑھئی کے ہاتھوں میں ہو تو وہ لکڑی کو چیر کر اس سے انسانی ضروریات کی اشیاء تیار کرتا ہے۔

لیکن شعر کی زبان پروں سے تیار شدہ پنکھے کی مانند ہے جو جب ہلایا جاتا ہے تو انسان کو ٹھنڈی ہوا دیتا ہے۔ جب کبھی اس کے پر جسم سے ٹکرائیں تو تکلیف نہیں پہنچاتے اور میں تعجب کرتا ہوں کہ افلاطون جیسے انسان نے جو فلسفی تھا اور اس کی عاقلانہ باتیں آج بھی مشہور ہیں کیسے کہہ دیا کہ شاعر دیوانہ ہے۔ کیونکہ وہ ایسے خیالات کو زبان پر لاتا اور لکھتا ہے جن سے نہ تو خود شاعر کو کوئی فائدہ پہنچا اور نہ دوسرے لوگوں کو۔ جابر بن حیان نے کہا جو کچھ افلاطون نے شاعروں کے بارے میں کہا وہ عقل سلیم سے دور ہے۔

اس کے بعد جابر بن حیان نے پوچھا۔ انسان اور بے جان چیزوں (جمادات) میں اتنا فرق کیوں ہے ؟ اور انسان اپنے آپ کو جمادات کی نسبت پودوں کے زیادہ قریب کیوں پاتا ہے ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔ انسان اور جماد کے درمیان فرق اس لئے پایا جاتا ہے کہ جمادات اپنی جمادی زندگی میں مستقل اور ناقابل تغیر قوانین کی پیروی کرتے ہیں جبکہ انسان اپنی زندگی میں مستقل اور ناقابل تغیر قوانین کی پیروی نہیں کرتا۔ مستقل اور ناقابل تغیر قوانین جو جمادات کی زندگی پر حکومت کرتے ہیں وہ اس بات کا سبب بنتے ہیں کہ جمادات ہر جگہ اور ہر وقت ایک دوسرے کی شبیہہ ہوتے ہیں۔ لیکن وہ قواعد جو انسان پر حکومت کرتے ہیں (میری مراد وہ قواعد ہیں جن کا سرچشمہ فکر ہے) ہر انسان میں دوسروں سے مختلف ہوتے ہیں۔

انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو آرزو' سلیقہ' ذوق اور تمام ان چیزوں کے لحاظ سے جن کا سرچشمہ فکر ہے دوسرے انسانوں سے مختلف ہوتا ہے اور لوگوں کی زندگی میں جو چیزیں امتیاز پیدا کرتی ہیں ان میں سے ایک ہوس ہے۔ کوئی مرد اور عورت ایسے نہیں جو ہوس نہ رکھتے ہوں۔ اگرچہ وہ کوئی پھل یا غذا کھانے کی حد تک ہی کیوں نہ محدود ہو۔

چونکہ جمادات اپنی جمادی زندگی میں ناقابل تغیر قوانین کی پیروی کرتے ہیں لہٰذا جمادات کے مستقبل کے واقعات کے بارے میں کوئی پیش گوئی کرنا مشکل ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حتی مثال کے طور پر دو سگے بھائی بھی یہ نہیں بتا سکتے کہ ان میں سے ہر ایک کا آئندہ سال کا کیا ارادہ ہوگا ؟ لیکن جمادی زندگی میں جامد اجسام ایک جیسے مستقل قوانین کی پیروی کرتے ہیں۔ جو کچھ ایک

جامد جسم انجام دیتا ہے وہی دوسرا جامد جسم بھی انجام دیتا ہے۔ انسان' پودوں سے اس لئے نزدیک ہے کہ پودے بھی بظاہر مستقل قوانین کی پیروی نہیں کرتے اگرچہ آخری مرحلے میں پودوں کی زندگی کے قواعد مستقل نہیں۔ جس طرح آخری مرحلے میں انسانی زندگی کے قواعد بھی مستقل ہوتے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔ ہماری ابتدا ماں کا شکم اور ہماری انتہا قبر ہے۔ چونکہ پودوں کی زندگی بھی بظاہر ہماری طرح مستقل نہیں ہے لٰہذا ہم اپنے آپ کو جمادات کی نسبت پودوں کے زیادہ قریب پاتے ہیں۔

میں نے کہا کہ انسان کے فیصلہ کرنے کے اسباب اس قدر مختلف ہیں کہ کسی انسان کے آئندہ ارادوں کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کی جاسکتی۔ کچھ حیوانی خصلتیں تمام انسانوں میں مشابہ ہیں۔ وہ کھانے' پینے' سونے اور اپنے جوڑے کا انتخاب کرنے سے عبارت ہیں۔ اس کے باوجود کہ یہ خصلتیں تمام انسانوں میں موجود ہیں پھر بھی ہر کوئی اپنے سلیقے اور طبیعت کے مطابق ان میں سے ہر حاجت کو سرانجام دیتا ہے۔ اسباب کا اختلاف جو افراد کو فیصلے کرنے پر مائل کرتا ہے لوگوں یا گروہوں کے درمیان دشمنی وجود میں لاتا ہے جس کا حتمی نتیجہ جنگ یا کشت و خون ہوتا ہے۔

پیغمبرؐ جو خدا کی طرف سے بھیجے گئے ہیں انہوں نے احکام دینی اور قواعد کو لانے کے ساتھ ساتھ کوشش کی کہ لوگ ارادہ کرنے کے لحاظ سے ایک جیسی روش اختیار کریں اور انہیں متشابہ قواعد کی پیروی کرنے پر مائل کریں اور تم اس بات کی تصدیق کرو گے کہ دین لوگوں کے ارادوں میں یگانگت پیدا کرنے میں موثر واقع ہوا ہے۔ اگر تم دیکھتے ہو کہ مسلمان اپنی اجتماعی زندگی سے ارادوں کے لحاظ سے یگانگت کے حامل نہیں ہیں تو وہ اس لئے ہے کہ ان میں سے ایک گروہ صمیم قلب سے ایمان نہیں لایا۔ جب کبھی تمام مسلمان صمیم قلب سے ایمان لائیں گے' ان کی اجتماعی زندگی کے بارے میں ان کے ارادوں میں بھی یگانگت آجائے گی۔

اس کے باوجود کہ تمام مسلمانوں کا ایمان محکم نہیں ہے کیونکہ جب تک ان کی حرص' حسد' نکتہ چینی اور کینہ ختم نہیں ہوجاتا ایسا نہیں ہوسکتا۔ لیکن پھر بھی دینی قواعد نے مسلمانوں کے مجموعی ارادوں کو مشابہ کردیا ہے اور وہ ایک خدا کی عبادت کرتے ہیں' ایک ہی قبلے کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے اور دن و رات میں ان کے اوقات نماز ایک ہی ہیں اور سب ایک ہی مہینے میں روزہ رکھتے ہیں۔

# قبلہ کی تبدیلی کا عقدہ

جابر نے کہا چونکہ آپ نے قبلے کا نام لیا ہے للذا عقدہ کھلوانے کے لئے آپ سے ایک سوال کرتا ہوں۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا جو کچھ پوچھنا چاہتے ہو پوچھو۔ جابر نے اظہار خیال کیا' میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ پیغمبرؐ نے مسلمانوں کے قبلے کو کیوں تبدیل کیا اور ان سے کیوں کہا کہ کعبہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھیں ؟ جبکہ اس سے قبل وہ ایک دوسری طرف رخ کرکے نماز پڑھتے تھے۔ امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا کہ پیغمبرؐ نے خدا کے حکم سے مسلمانوں کا قبلہ تبدیل کیا۔ جابر نے پوچھا خدا نے مسلمانوں کا قبلہ کیوں تبدیل کیا ؟ کیا خداوند تعالیٰ دانائے مطلق نہیں ہے ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا وہ دانائے مطلق ہے۔ جابر نے کہا وہ دانائے مطلق ہے اور آئندہ پیش آنے والی ہر چیز سے آگاہ ہے تو اسے پہلے ارادے کو تبدیل نہیں کرنا چاہئے کیونکہ ہم انسان اپنی نادانی کی وجہ سے اپنی زندگی میں ارادہ تبدیل کرتے ہیں۔ آج ہم ارادہ کرتے ہیں اور پھر اس پر عمل کرتے ہیں۔ چند مہینوں یا چند سالوں کے بعد تجربہ حاصل کرتے اور سمجھتے ہیں کہ ہم نے غلطی کی ہے۔ پھر ہم اپنے ارادے میں تبدیلی لاتے ہیں اور ایک دوسرا کام انجام دیتے ہیں لیکن خدا جو دانائے مطلق ہے غلطی نہیں کرتا اور ہم انسانوں کی طرح تجربے کا محتاج نہیں۔ وہ مستقبل میں پیش آنے والے تمام واقعات سے آگاہ ہے۔ اس کا ارادہ مستقل اور ابدی ہے۔ پھر اس نے ارادہ کیوں تبدیل کیا ؟ اور پیغمبرؐ کے ذریعے مسلمانوں کو کیوں کہا کہ بیت المقدس سے ہٹ کر کعبہ کی طرف نماز پڑھیں جبکہ اس سے قبل مسلمانوں سے کہا گیا تھا کہ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھیں۔

آپ نے فرمایا اے جابر ! تیرے استدلال کا ایک پلڑا درست ہے لیکن دوسرا پلڑا درست نہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ تم نے دوسرے پلڑے کو مدنظر نہیں رکھا۔ جابر نے پوچھا دوسرا پلڑا کونسا ہے ؟ امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا دوسرا پلڑا لوگ یعنی بنی نوع انسان ہیں۔ تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ احکامات بنی نوع انسان کے لئے صادر فرماتا ہے نہ کہ اس مخلوقات کے لئے جن کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آتی یعنی جمادات۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے ذریعے بنی نوع انسان کے لئے صادر کئے گئے احکامات ہمارے پیغمبرؐ کے ذریعے صادر کئے جانے والے احکامات سے مختلف ہیں۔

اللہ تعالیٰ کو ازل سے معلوم تھا کہ وہ ایک دن مسلمانوں سے بیت المقدس کی طرف منہ پھیر کرکے نماز پڑھنے کا حکم دے گا اور اللہ یہ بھی جانتا تھا کہ کچھ عرصہ بعد وہ ان سے کعبہ کو قبلہ بنانے کا کہے گا۔ اللہ کے احکامات میں' میں اور تم آج جو تبدیلی مشاہدہ کرتے ہیں وہ خدا کے نزدیک مستقل قوانین ہیں۔ کیونکہ

خداوند تعالیٰ نے ازل سے ان کی پیش گوئی کی ہوئی ہے مگر ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ خدائی احکامات میں کوئی تبدیلی نہیں آتی ہے۔ اس کی دو مثالیں دیتا ہوں تاکہ تم اسے بہتر طریقے سے سمجھ سکو۔ وہ شہد کی مکھی جو بہار کے نصف ماہ کے دوران پیدا ہوتی ہے اگر سردیوں کے سرد موسم کو دیکھے تو خیال کرے گی کہ دنیا کے قواعد تبدیل ہوگئے ہیں۔ لیکن کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے اور تمہارے لئے بھی دنیا کے قواعد تبدیل ہوچکے ہوں گے ؟ جابر نے کہا نہیں۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا میں اور تم نے پیش گوئی کی تھی کہ گرمیوں کے بعد سردیاں آئیں گی اور ہماری نظر میں دنیا کے احکام میں کوئی تبدیلی وجود میں نہیں آئی۔

ایک دوسری مثال دیتا ہوں فرض کیا آپ کے پاس کچھ زمین ہے اور اس میں کسی مزارع کو کام کرنے کے لئے منتخب کرتے ہیں اور آپ کا ارادہ یہ ہے کہ وہ شخص صرف ایک سال تک آپ کا مزارع رہے۔ ایک سال کے بعد آپ اسے کام سے نکال کر کسی دوسرے کو اس کی جگہ رکھ لیتے ہیں۔ جب ایک سال ہوتا ہے تو آپ اس شخص کو اطلاع دیتے ہیں کہ اس کی خدمات کی آپ کو مزید ضرورت نہیں ہے۔وہ شخص آپ کے ارادے سے متعجب ہوگا اور اسے آپ کے پہلے ارادے کے خلاف خیال کرے گا۔ لیکن کیا آپ نے اس مزارع کو نکال کر کسی دوسرے کو ملازم رکھ کر اپنے ارادے میں کوئی تبدیلی پیدا کی ہے ؟ ہرگز نہیں' کیونکہ آپ نے پہلے دن سے ارادہ کیا ہوا تھا کہ ایک سال بعد اسے نکال کر اس کی جگہ ایک دوسرے شخص کو رکھیں گے۔ اللہ کے احکامات بھی جو ہماری نظر میں الٹ یا متضاد ہوتے ہیں اسی طرح ہیں اور خداوند تعالیٰ نے جتنے قوانین صادر کرنے تھے ازل سے ان کی پیش گوئی کردی ہے اور اس کے لئے متضاد ارادے کوئی معنی نہیں رکھتے۔

جابر بن حیان نے کہا' میرا عقدہ کھل گیا کیونکہ مسلمانوں کے قبلے کی تبدیلی کا مسئلہ میرے ذہن پر بوجھ بنا ہوا تھا۔ اس کے باوجود کہ اس لحاظ سے میرے پاس کوئی سوال نہیں ہے پھر بھی اس موضوع کے بارے میں سوال کرتا ہوں۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا پوچھو۔ جابر نے کہا۔ اس میں کیا مصلحت تھی کہ خداوند تعالیٰ نے پیغمبرؐ کو حکم دیا کہ اس کے بعد کعبہ کی طرف منہ کرکے نماز پڑھیں۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا جب پیغمبرؐ نے رسالت پہنچانا شروع کی تو مسلمان تھوڑے کمزور تھے جبکہ یہودی اور عیسائی اکثریت میں اور طاقتور تھے۔ وہ مسلمانوں کو ختم کرسکتے تھے لہٰذا اس زمانے میں خداوند تعالیٰ نے مسلمانوں کو بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھنے کا حکم دیا کیونکہ یہودی اور عیسائی دونوں بیت المقدس کے احترام کے قائل تھے اور اس طرح وہ مسلمانوں کو دشمنی کی نظر سے نہ دیکھیں اور انہیں دشمن خیال نہ کرکے انہیں مٹانے سے باز رہیں۔ بیت المقدس کی جانب منہ کرکے نماز پڑھنے کا مقصد یہودیوں اور عیسائیوں سے نرمی سے پیش آنا تھا۔ یہ سلوک کافی موثر واقع ہوا کیونکہ یہودیوں اور عیسائیوں نے مسلمانوں میں دشمنی کے کوئی آثار نہ دیکھے تو انہیں تکلیف پہنچانے سے باز رہے لیکن اس کے بعد جیسا کہ تم جانتے ہو مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان تنازعہ شروع ہوگیا۔

جابر بن حیان نے کہا جیسا آپ فرما رہے ہیں اسی طرح ہوا ہو گا اور مسلمانوں کے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنے سے یہودی اور عیسائی مطمئن ہوئے ہوں گے لیکن خداوند تعالیٰ کے اس حکم میں کیا مصلحت تھی کہ مسلمان کعبہ کی طرف نماز پڑھیں ؟ کیا یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ خداوند تعالیٰ کسی دوسری جگہ کو مسلمانوں کا قبلہ قرار دے دیتا ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا تجھے معلوم ہے کہ پیغمبرؐ کے مدینے سے آکر مکہ فتح کرنے سے پہلے کعبہ کی کیا حالت تھی ؟ جابر نے کہا مجھے معلوم ہے' بت خانہ بنا ہوا تھا۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ان بتوں کی کون پوجا کرتا تھا ؟ جابر نے کہا جزیرہ عرب کے لوگ۔ امام جعفر صادقؑ نے پوچھا جزیرہ عرب میں کون لوگ بت پرست نہ تھے ؟

جابر نے کہا یہودیوں اور عیسائیوں کے علاوہ کوئی ایسا شخص نہ تھا جو بت پرست نہ ہوتا۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کعبہ میں تمام جزیرہ عرب کے قبائل کے بت رکھے ہوئے تھے اور اسی بنا پر کعبہ تمام عربوں کے لئے محترم تھا۔ جب پیغمبرؐ نے مسلمانوں سے کہا کہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھیں تو نہ صرف یہ کہ وہ حیران نہیں ہوئے بلکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ کعبہ کی طرف نماز پڑھنا ان کے لئے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنے سے کہیں آسان تھا کیونکہ جب سے ہوش سنبھالا تھا کعبہ کا احترام کرتے تھے۔ اسی لئے قبلہ کی تبدیلی کو جزیرہ عرب کے مسلمانوں نے راضی خوشی قبول کرلیا۔ جابر نے کہا لیکن اسلام جزیرہ عرب تک محدود نہیں رہا بلکہ مزید پھیلا اور مشرق و مغرب تک چھا گیا۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا اسی طرح ہے۔

جابر نے اظہار خیال کیا کعبہ ان لوگوں کے لئے محترم نہ تھا جو عرب نہ تھے ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا چونکہ پیغمبرؐ نے خداوند تعالیٰ کے حکم کے مطابق کعبہ کو مسلمانوں کا قبلہ بنایا تھا للذا وہ قومیں جو عرب نہ تھیں جب مسلمان ہوئیں تو ان میں کعبہ کے لئے احساس احترام پیدا ہوا اور تمام دنیا کے مسلمانوں کے کعبہ کی طرف نماز پڑھنے سے مسلمانوں کو ایک روحانی مرکز ملا جس کی مثال کسی بھی گزشتہ مذہب میں نہیں ملتی۔ آج مشرق میں رہنے والا مسلمان مغرب میں قیام پذیر مسلمان کی طرح کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتا ہے۔ جابر نے سوال کیا کیا یہ مرکزیت زیادہ اہمیت کی حامل ہے یا مسلمانوں کا حج کے لئے مکہ جانا اور وہاں اجتماع کی صورت اختیار کرنا۔

امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا یہ مرکزیت حج کے لئے مکہ جانے سے زیادہ اہمیت اور روحانی مفاد کی حامل ہے کیونکہ بہت سے مسلمان ایسے ہیں جو مادی استطاعت نہ ہونے یا راہزنوں کے خوف کی وجہ سے زندگی میں ایک مرتبہ بھی حج پر نہیں جاسکتے۔ لیکن دنیا کے ہر کونے میں رہنے والا مسلمان رات دن پانچ دفعہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتا ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ ہر شب و روز تمام مسلمانوں کی نگاہیں پانچ مرتبہ کعبہ میں پہنچتی ہیں گویا دنیا کے تمام مسلمان شب و روز پانچ مرتبہ ایک دوسرے کی آنکھوں سے آنکھیں ملاتے ہیں۔ اسی طرح دنیا کے تمام مسلمانوں کے اعمال اجتماعی ہیں کیونکہ وہ ایک ہی قبلہ کو مرکز عبادت قرار دیتے ہیں۔ گویا مسلمان ہر نماز

میں وہاں پہنچتا ہے اور دنیا کے مشرق و مغرب میں کروڑوں مسلمانوں کی تکبیر کعبہ میں سنی جاتی ہے۔ یہ مرکزیت کسی سابقہ مذہب میں موجود نہیں اور نہ ہی آئندہ موجود ہوگی۔ کیونکہ دین اسلام وہ آخری دین ہے جو خداوند تعالیٰ نے انسان کے لئے مقرر کیا ہے۔ اسلام کے بعد کوئی دوسرا آسمانی مذہب نہیں آئے گا۔ جو کوئی اسلام کے بعد پیغمبری کا دعویٰ کرے جھوٹا پیغمبر ہے اور خداوند تعالیٰ کی طرف سے مبعوث نہیں ہوا بلکہ جعلی ہے۔

جابر نے پوچھا بعض لوگ خودکشی پر کیوں مائل ہوتے ہیں ؟ امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا خودکشی کرنے والے لوگ مذہبی ایمان نہیں رکھتے۔ جو کوئی مذہبی ایمان رکھتا ہو وہ اپنے آپ کو قتل نہیں کرتا۔ مجھے یقین ہے کہ تو نے آج تک کوئی ایماندار شخص خودکشی کرتے نہیں دیکھا ہوگا۔ مسلمان جہاد کرتا ہے اور قتل ہوجاتا ہے لیکن اپنے خون سے اپنے ہاتھ رنگین نہیں کرتا۔

مذہبی ایمان نہ رکھنے کے علاوہ جو چیز کسی انسان کو خودکشی کرنے پر مائل کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں زندہ رہنے کا ارادہ ست پڑ جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ ہر زندہ وجود میں سب سے مضبوط ارادہ زندہ رہنے کی طرف میلان ہوتا ہے۔ یہ تمایل انسان کو کام پر لگاتا ہے اور اسے شادی کرنے اور اپنی بیوی بچوں کی رہائش کے لئے گھر بنانے پر مائل کرتا ہے۔ بعض لوگ جو مذہبی ایمان سے محروم ہوتے ہیں ان میں زندہ رہنے کا ارادہ ست پڑ جاتا ہے۔

ارادے کے ست پڑ جانے کی بھی چند وجوہات ہیں۔ ان میں ایک وجہ کاہلی ہے اور وہ انسان اس قدر ست ہوجاتا ہے کہ کوئی کام نہیں کرسکتا۔ اس میں بہت زیادہ سستی وجود میں آجاتی ہے جس سے ناامیدی جنم لیتی ہے۔ اسی ناامیدی کے نتیجے میں انسان اپنے ہاتھ اپنے خون سے رنگین کرلیتا ہے۔

زندگی کے ارادے کے ست پڑ جانے کی ایک دوسری وجہ جوابازی ہے جو ہمارے مذہب میں سختی سے منع ہے۔ جوئے میں انسان اپنا تمام مال و متاع نہایت مختصر مدت میں کھودیتا ہے اور جب سوچتا ہے کہ اس نے اپنے کئی سالوں کی کمائی تھوڑی دیر میں لٹادی ہے تو ناامیدی اس پر غالب آکر اسے خودکشی پر مائل کردیتی ہے۔

زندگی کے ارادے کے ست پڑ جانے کی ایک اور وجہ جنون ہے جو زیادہ تر موروثی ہوتا ہے اور آباء و اجداد کے شراب پینے کی وجہ سے جنم لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس طرح کا جنون مسلمانوں میں نہیں ہے کیونکہ مسلمان شراب نہیں پیتے جس کی وجہ سے ان کی اولاد جنون کا شکار نہیں ہوتی۔ لیکن وہ قومیں جو شراب پیتی ہیں ان میں دو بیماریوں کے وجود میں آنے کا خطرہ موجود رہتا ہے۔ ایک دماغ کا خبط اور دوسرا لقوہ۔

موروثی جنون جو آباء و اجداد کے بہت زیادہ شراب پینے کے نتیجے میں وجود میں آتا ہے ممکن ہے زندہ رہنے کے عزم کو بغیر کسی وجہ کے ختم کردے۔ جو کوئی اس طرح کے جنون میں مبتلا ہوتا ہے اپنے خلاف بہانے تراشتا اور اپنے کینے کو اپنے خلاف ابھارتا ہے۔ یہ شخص اپنے خلاف بغض و کینے میں اس قدر آگے بڑھ جاتا ہے کہ

اپنے آپ کو مار ڈالنے کا سزاوار قرار دے کر موت سے ہمکنار کر دیتا ہے۔

دوسری وجہ جو بعض افراد میں زندہ رہنے کے عزم کو ختم کر دیتی ہے وہ ہمت ہار بیٹھنا ہے۔ اگر ایک مومن مسلمان ہمت ہار بیٹھے تو چونکہ وہ خداوند تعالیٰ پر توکل کرتا ہے لہٰذا خودکشی کے بارے میں نہیں سوچتا۔ لیکن وہ لوگ جو مذہبی ایمان سے محروم ہیں جونہی وہ ہمت ہار بیٹھتے ہیں ممکن ہے زندہ رہنے کے عزم کو ہاتھ سے دے بیٹھیں اور اپنی جان کے خلاف برا ارادہ کر لیں۔

جو اسباب انسان کے زندہ رہنے کے عزم کو ختم کر دیتے ہیں ان میں سستی بہت عام ہے۔ اکثر لوگ جو خودکشی کرتے ہیں وہ سست ہوتے ہیں۔ اگر کوئی ان کے مافی الضمیر میں جھانک سکے تو وہ محسوس کرے گا کہ ان کی خودکشی کرنے کی اصل وجہ ان میں پائی جانے والی سستی ہے۔ دین اسلام کے احکام کا ایک مقصد انسان کو سستی اور کاہلی سے دور رکھنا ہے۔

اے جابر! آدمی فطرتاً آرام پسند ہے اور بذاتہٖ کام کرنے کا رجحان نہیں رکھتا۔ ہر آدمی صبح کے وقت سونا چاہتا ہے کیونکہ صبح کی نیند تمام اوقات سے زیادہ موثر ہوتی ہے۔ لیکن دین اسلام انسان کو سورج کے طلوع ہونے سے پہلے نماز پڑھنے کا حکم دیتا ہے۔ یہ فریضہ مسلمانوں میں سستی دور کرنے میں بہت موثر ہے۔ ایک مسلمان شخص جب صبح کی نماز پڑھ لیتا ہے تو وہ روزمرہ کے کاموں کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح دوسری چار نمازیں بھی اسی لئے واجب قرار دی گئی ہیں تاکہ مسلمان سستی سے پرہیز کریں۔

جابر نے کہا' میں نے ہندوستانی تاجروں سے جو جدہ آتے ہیں سن رکھا ہے کہ ان کے تین خدا ہیں۔ ہندوستانیوں کے تین خداؤں کے نام آپ کو معلوم ہیں؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ان تین خداؤں کے نام ہندی زبان میں براہما' ویشنو اور شیوا (۱۵۶) ہیں۔ جابر نے کہا۔ مجھے تعجب ہے کہ وہ لوگ توحید کے بجائے تین خداؤں کی پوجا کرتے ہیں؟ امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا۔ چونکہ یہ لوگ واحد اور حقیقی خدا کے کلام کو تسلیم نہیں کرنا چاہتے تھے لہٰذا انہوں نے اپنے تخیل سے تین خدا وجود میں لا کر ان کی پرستش شروع کر دی۔ ان کا عقیدہ ہے کہ برہما وہ خدا ہے جس نے کائنات کو خلق کیا ہے اور برہما کے کائنات کو وجود میں لانے کے متعلق وضاحت بھی کرتے ہیں جس کا خلاصہ ہے کہ برہما نے اپنی پھونک یا سانس سے کائنات کو خلق کیا ہے۔ جب کائنات وجود میں آگئی تو ایک دوسرا خدا جس کا نام ویشنو تھا کائنات کا محافظ بن گیا۔ ہندو عقیدے کے مطابق تیسرا خدا جس کا نام شیوا ہے موت یا ہلاکت کا خدا ہے۔ جو کچھ پہلے خدا برہما نے خلق کیا اور کرتا ہے اسے تیسرا خدا ہلاک اور نیست و نابود کرتا ہے۔ اس کے باوجود کہ دوسرا خدا کائنات کا محافظ ہے تیسرے خدا کے کام میں رخنہ نہیں ڈال سکتا اور موت و نیست و نابودی کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا۔ جابر نے پوچھا پھر ہندوؤں کو اپنے تخیل سے ویشنو کو وجود میں لانے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا اس خدا کا وجود اس لئے ضروری تھا کہ کائنات کی حفاظت

کر سکتا اور جب کائنات کی حفاظت پر قادر نہیں اور شیوا ہر ایک کو ہلاک اور نیست و نابود کرتا ہے تو کیا عقل کی رو سے یہی بہتر نہ تھا کہ ہندوؤں کے دو خدا ہوتے ایک براہما اور دوسرا شیوا۔

امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا' جس سوچ کی وجہ سے ہندو ویشنو کے معتقد ہوئے اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک ایسا خدا ہونا چاہئے جو کائنات کو موجودہ زمانے میں محفوظ رکھے۔ اے جابر ! تجھے معلوم ہے کہ ہندوؤں کا تین خداؤں پر ایمان لانا اس بات کا باعث ہوا کہ وہ تینوں جنگ کی حالت میں ہوں اور جو کچھ برہما وجود میں لائے اسے شیوا منہدم کر دے اور اگر وہ جاندار ہے تو اسے ہلاک کر دے اور یہ بھی کہ ویشنو کو ہمیشہ شیوا سے برسرپیکار رہنا چاہئے کیونکہ شیوا چاہتا ہے کہ جو کچھ پہلے خدا نے خلق کیا ہے اسے ہلاک یا منہدم کرے۔ لیکن ویشنو کوشش کرتا ہے کہ شیوا کو اپنے کام میں کامیاب نہ ہونے دے لیکن وہ اپنی اس کوشش میں ہمیشہ ناکام رہتا ہے اور جو کچھ شیوا چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔

ایسا نظر آتا ہے کہ تیسرے خدا کو کائنات کی حفاظت کے لئے وجود میں لانے کی سوچ اس سے بھی عبارت ہے کہ خلق کرنے اور ہلاک کرنے والے خدا کے درمیان کوئی واسطہ ہونا چاہئے تاکہ زندگی اور موت کے خداؤں کا براہ راست رابطہ نہ ہو کیونکہ اگر ان کا رابطہ براہ راست ہوگا تو نہ کوئی چیز خلق ہوگی اور نہ مرے گی۔

جابر بن حیان نے کہا میں جب یہ خیال کرتا ہوں کہ میں موحد ہوں تو میں اپنے آپ پر فخر کرتا ہوں کیونکہ میرے توحیدی مذہب میں اس طرح کا کوئی مسئلہ یا مشکل موجود نہیں۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا توحیدی مذاہب میں خالق اور محافظ ایک ہی ہے اور وہی ہے جو مارتا ہے کیونکہ یہ بات درست نہیں کہ معدوم کرتا ہے بلکہ حالت تبدیل کرتا ہے اور دین اسلام میں موت کے بعد قیامت موجود ہے جو اصول دین میں سے ہے۔ جس کے مطابق انسان دوبارہ زندہ ہوں گے اور اپنی زندگی کا دوبارہ آغاز کریں گے۔

## یونانی فلاسفہ

جابر بن حیان نے پوچھا کیا افلاطون اور اس کا شاگرد ارسطو موت کو برحق خیال کرتے تھے ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا یہ دو شخص یونانی تھے اور قدیم یونانیوں کا موت کے بارے میں یہ عقیدہ نہیں تھا کہ انسانی زندگی مکمل طور پر ختم ہوجاتی ہے بلکہ وہ موت کو بنی نوع انسان کی طویل عمر کا ایک مرحلہ سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے جب وہ مردے کے لئے تابوت تیار کرتے تو وہ تابوت پر اپنے ذوق کے مطابق رنگ برنگی تصویریں بناتے تھے۔ ان تصویروں میں مرد و عورت کے ملاپ' رقص اور شکار وغیرہ کے مناظر نقش ہوتے تھے۔ ان تصویروں کے بنانے سے ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ وہ تابوت میں موجود جسد کو مردہ نہیں بلکہ زندہ خیال کرتے تھے۔ لیکن اس کے

باوجود کہ یونانیوں کا موت پر ایمان نہ تھا پھر بھی ان کے فلاسفہ' موت کے بارے میں سوچ و بچار سے غافل نہ تھے۔

یونانی ماہر فلکیات ارسطوخوس' (۱۵۷) فلسفے میں بھی صاحب بصیرت شمار ہوتا تھا۔ اس نے موت کے بارے میں کافی غور و خوض کرنے کے بعد کہا۔ میں اس سوچ سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا کہ وہ لاکھوں مرد اور عورتیں جو مجھ سے قبل زندہ تھے وہ کہاں گئے ؟ اور ان میں سے کوئی دکھائی کیوں نہیں دیتا ؟ اور کسی کی آواز کیوں سنائی نہیں دیتی ؟ اور مجھے یہ سعادت کیوں نصیب ہوئی ہے کہ میں ان لاکھوں مردوں اور عورتوں کے درمیان میں جو مرگئے ہیں اور کوئی بھی ان میں سے واپس نہیں آیا زندہ ہوں ؟ اور زندگی کی خوشیوں سے بہرہ مند ہوں ؟ اور کیا میں بھی ایک دن ان ہی کی طرح مرجاؤں گا ؟ یا یہ کہ میں جو آج زندگی کی خوشیوں سے ہمکنار ہوں؟ نہیں مروں گا ؟ مجھے احساس ہوتا ہے کہ جو لاکھوں مرد اور عورتیں مرچکے ہیں اس لئے مرے ہیں کہ انہیں زندگی سے پیار نہ تھا اور وہ زندگی کی خوشیوں سے بہرہ مند نہیں ہونا چاہتے تھے۔ اس کے باوجود کہ میں اپنے آپ کو مستثنیٰ خیال کرتا ہوں اور مجھے ہمیشہ زندہ رہنے کی امید ہے کبھی کبھار اپنے آپ سے کہتا ہوں کہ اگر میں مرگیا تو کیا ہوجائے گا ؟ کیا میں موت کے بعد زندگی کی موجودہ خوشیوں سے بہرہ مند ہوسکوں گا ؟ کیا میں موت کے بعد لذیذ غذا کھانے کی لذت اٹھا سکوں گا ؟ اور کیا موسیقی کی آواز آج کی مانند مجھے لطف پہنچائے گی ؟ یا یہ کہ میں بھی موت کے بعد ان جانوروں کی مانند ہو جاؤں گا جو مرجاتے ہیں ؟ اور کیا وہ مرغ جس کا گوشت کل تک میری غذا تھی موت کے بعد زندہ ہوگا ؟ اور وہ بکرا جسے ہم نے ایک دن بعد ذبح کیا اور اس کے گوشت سے غذا پکائی اور میرے کئی عزیزوں اور دوستوں نے وہ غذا کھائی کیا موت کے بعد اس کے زندہ ہونے کی امید کی جاسکتی ہے ؟

لیکن بعد میں خیال کرتا ہوں کہ مجھ میں اور بکرے میں بہت فرق ہے۔ چونکہ میں انسان ہوں اور بکرا حیوان ہے۔ انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مرنے کے بعد زندہ رہے۔ چونکہ انسان کے پاس عقل و علم ہے اور بکرا تو علم و عقل سے محروم ہے اور اگر مرنے کے بعد میں زندہ نہ رہوں تو آج مجھے یہ خیال نہیں آسکتا کہ موت کے بعد زندہ رہوں گا اور اپنے آپ کو بھی پہچانوں گا۔ میں موت کے بعد نہیں چاہتا کہ اپنے آپ کو نہ پہچانوں کیونکہ اگر میں موت کے بعد اپنے آپ کو نہ پہچان سکا تو جو خوشیاں موت کے بعد میرے نصیب میں ہوں گی میں ان سے محظوظ نہیں ہوسکوں گا اور مجھے موت کے بعد اپنے آپ کو پہچاننا چاہئے تاکہ مجھے علم ہوسکے کہ یہ میں ہوں جو خوشیوں کی لذت اٹھا رہا ہوں نہ کہ کوئی دوسرا۔

اس کے بعد ارسطوخوس کہتا ہے کیا یہ بات ممکن ہے کہ میں بھی لاکھوں زرد پتوں کی مانند ہوں جو خزاں کے موسم میں درختوں سے گرتے اور جلد ہی ختم ہوجاتے ہیں۔ کبھی میں خیال کرتا ہوں کہ میں بھی انہی زرد پتوں کی

مانند غبار بن کر ختم ہوجاؤں گا۔ لیکن میرے ضمیر کی گہرائی میں کوئی مجھے کہتا ہے کہ اس طرح نہیں۔ مجھ میں اور خزاں کے موسم میں درختوں سے گرنے والے زرد پتوں میں فرق ہے۔ میں ذبح ہونے اور پھر غذا میں استعمال ہونے والے بکرے سے برتر ہوں۔ میرا خیال ہے کہ مجھ میں اور بکرے کی نسبت اور موسم خزاں میں درختوں کے زرد پتوں کی نسبت بدرجہ اولیٰ یہ برتری پائی جاتی ہے کہ میں زمانے کے گزرنے کا احساس کرتا ہوں اور وہ زمانے کے گزرنے کا احساس نہیں کرتے۔

کئی دفعہ میں نے سوچا کہ زمانے کا گزرنا کیا ہے ؟ اور اب سوچتا ہوں کہ زمانہ بہتے ہوئے دریا کی مانند ہے اور میں اس دریا میں پتھر کے تختے کی مانند ہوں جسے جب پانی پہنچتا ہے تو وہ کھڑا نہیں رہتا بلکہ حرکت کرتا ہے۔ پانی اس کے کچھ حصے سے ٹکرا کر آواز پیدا کرتے ہوئے گزر جاتا ہے۔ یہی میری زندگی موجودہ زمانہ ہے۔

دریا کا بالائی حصہ جہاں سے پانی آتا ہے گزشتہ زمانہ ہے۔ دریا کا ڈھلوانی حصہ جس کی طرف پانی جاتا ہے آئندہ زمانہ ہے اور میں جو ایک لمحے کے لئے پانی روکتا ہوں لہٰذا میں حال ہوں اور چونکہ دریا کا پانی مجھ سے ٹکراتا ہے لہٰذا وہ زمانہ حال میں تبدیل ہوجاتا ہے۔

مجھے گزشتہ زمانے سے کوئی دلچسپی نہیں چونکہ گزرے ہوئے زمانے کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں میں اس سے بہرہ مند نہیں ہوسکتا۔ میری زندگی زمانہ حال ہے اور ہمیشہ زمانہ حال میں زندہ ہوں اور وہ لمحہ جس میں میں یہ خیال کرتا ہوں کہ میں زندہ ہوں وہ لمحہ حال ہے نہ کہ گزشتہ زمانہ اور نہ آئندہ زمانہ۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے لئے زمانہ حال میں میری حقیقی زندگی ہے اور جس کے ذریعے میں اپنی زندگی کو پہچان سکتا ہوں وہ صرف زمانہ حال ہے۔ میری گزری ہوئی عمر ایک ایسے پرندے کی مانند ہے جو پنجرے سے آزاد ہوکر اڑ چکا ہے اور اب اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں اور آئندہ کی عمر ایک ایسے پرندے کی مانند ہے جو فضا میں اڑ رہا ہے اور ابھی تک اسے پکڑ کر پنجرے میں قید نہیں کیا گیا۔ صرف زمانہ حال ہے جو مکمل طور پر میرے اختیار میں ہے اور میں اس کا مالک ہوں جس طرح چاہوں اس سے فائدہ اٹھاؤں۔ یہ زمانہ حال میرے زندہ رہنے تک باقی ہے اور ہر وہ لمحہ جس میں میں احساس کرتا ہوں کہ میں زندہ ہوں وہ لمحہ میرے لئے زمانہ ہے۔ مجھے حیرانی ہوتی ہے کہ بعض لوگ گزرے ہوئے زمانے کو اپنی عمر خیال کرتے ہیں۔ وہ اس پر غور نہیں کرتے کہ جو زمانہ ان پر بیت گیا وہ اب ان کا نہیں رہا۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ کیسے بعض لوگ آئندہ آنے والے دور کو اپنی عمر خیال کرتے ہیں اور اس پر غور نہیں کرتے کہ جو زمانہ ابھی تک نہیں آیا وہ ایسی دولت کی مانند ہے جو ابھی تک حاصل نہیں ہوئی اور اسے اپنی خیال نہیں کیا جاسکتا۔

مجھے تعجب ہے کہ کیوں بعض لوگ اس روشن حقیقت کو نہیں دیکھتے اور تسلیم نہیں کرتے کہ زندگی زمانہ حال کے علاوہ کچھ نہیں۔ اگر کوئی اس سے فائدہ اٹھانا چاہے تو اسے زمانہ حال سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ میں دیکھتا

ہوں کہ بعض لوگ کہتے ہیں آج اس خوشی کا وقت نہیں۔ اسے کل پر رکھ چھوڑنا چاہئے۔ وہ اس بات سے غافل ہیں کہ کل ان کا نہیں کیونکہ ابھی تک وہ اس کے مالک نہیں بنے۔ آدمی کی عمر زمانہ حال ہے اور یہ زمانہ عمر کے خاتمے کے آخری لمحات تک جاری رہتا ہے۔ انسان کے لئے ہرگز کوئی ایسا لمحہ نہیں آتا جو زمانہ حال نہ ہو۔ گزشتہ کل مکالے میں بامعنی ہے لیکن فی نفسہٖ بے معنی ہے کیونکہ گزشتہ کل موجود نہیں۔ جو چیز موجود نہ ہو کیسے ممکن ہے وہ مفہوم رکھتی ہو۔ آنے والا کل بامعنی ہے لیکن بذاتہٖ موجود نہیں ہے کیونکہ جو چیز ابھی تک وجود میں نہیں آئی کیسے ممکن ہے مفہوم رکھتی ہو؟ لوگ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ کل بھی (اگر پہنچے تو) زمانہ حال ہے۔ میں اگر کل ظہر کے وقت پہنچوں تو ظہر کے وقت حال ہی پاؤں گا نہ کہ دوسرا دن۔ میری اور دوسرے انسانوں کی زندگی میں گزشتہ اور آئندہ کل صرف مکالے کی حد تک محدود ہے اور بذاتہٖ بے معنی اور بے مفہوم ہے۔ جب تک زندہ ہوں مجھے کوئی ایسا لمحہ پیش نہیں آئے گا جو زمانہ حال نہ ہو اور میں کسی لمحے بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ لمحہ گزشتہ کل یا آئندہ کل ہے۔ میرا باپ بھی جب تک زندہ تھا یہ نہیں کہہ سکا کہ یہ لمحہ گزشتہ کل یا آئندہ کل ہے۔ میرا بیٹا بھی جو جوان آدمی ہے یہ بات نہیں کہہ سکتا یعنی اس کے لئے عمر کا ہر لمحہ زمانہ حال ہے۔

جس وقت میں جوان تھا میں ڈیموکریٹس (۱۵۸) کی اس بات کو نہیں سمجھ سکا کہ اس نے کہا میں' میرا باپ اور میرا بیٹا ایک ہی لمحے پیدا ہوئے۔ اس سے اس کی کیا مراد ہے؟ آج ذیمقراطیس کے اس قول کی صحت پر مجھے کوئی شک نہیں کہ نہ صرف ایک باپ اور بیٹا بلکہ تمام بنی نوع انسان ایک لمحے یعنی زمانہ حال میں پیدا ہوئے اور ایک لمحے میں جو پھر زمانہ حال ہے مرجاتے ہیں۔

میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ زمانہ حال جو میری حقیقی عمر ہے کہیں میرے ہاتھ سے چلا نہ جائے۔ کبھی میں خیال کرتا ہوں کہ کیا عمر کا خاتمہ سونے کی مانند نہیں؟ اور میں سونے سے کیوں نہیں ڈرتا' مرنے سے ڈرتا ہوں۔ جب میں سوتا ہوں تو اپنے آپ سے بے خبر ہوجاتا ہوں اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ جو شخص سویا ہوا ہے کیا وہ میں ہی ہوں اور سونے کے دوران میں اپنی موت کو فراموش کردیتا ہوں۔

پس موت جو ایک دوسری طرح سونے کا نام ہے اس سے کیوں ڈروں؟ لیکن یہ طرفداری مجھے تسلی نہیں دیتی اور میرا موت سے ڈر دور نہیں ہوتا۔ چونکہ سونے سے پہلے مجھے علم ہوتا ہے کہ سونے کے بعد جاگ اٹھوں گا لیکن موت سے بیدار نہیں ہوں گا۔ اگر آدمی موت کے بعد سو کر بیدار ہوجاتا تو صرف یونان میں مجھ سے پہلے گزرے ہوئے لاکھوں لوگ بیدار ہوجاتے اور مجھ سے موت کے بعد کی آپ بیتی بیان کرتے۔ لیکن موت تو ایسی نیند ہے جس کے بعد بیداری نہیں ہے۔ میں امید نہیں رکھتا کہ بیدار ہوجاؤں گا۔

چونکہ مجھے معلوم ہے کہ بیدار ہونے کے لئے میرے جسمانی ڈھانچے کا وجود ضروری ہے جو موت کے بعد

ختم ہوجائے گا۔ نہ صرف میرا گوشت پوست اور خون ختم ہوجائے گا بلکہ میری ہڈیاں بھی غبار میں تبدیل ہوجائیں گی۔ چونکہ اس کے بعد میرا ڈھانچہ باقی نہیں رہے گا تو ظاہر ہے کہ میں بیدار نہیں ہوں گا اور یہی وہ بات ہے جو مجھے موت سے ڈراتی ہے۔ اگر مجھے علم ہوتا کہ میری موت کے بعد میرا ڈھانچہ باقی رہے گا تو میں موت سے ہرگز نہ ڈرتا۔ چونکہ ایک دن بیدار ہونے کا امیدوار ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک بیداری کے عوامل موجود ہوں انسان بیداری کا امیدوار رہتا ہے۔

میں نے سنا ہے مصری موت کے بعد جسد کی ایسی صورت بنا دیتے ہیں جو ہرگز ختم نہیں ہوتی اور اس کام کے لئے مخصوص انسٹی ٹیوٹ قائم ہیں۔ لیکن یہاں پر کوئی بھی جسد کو موت کے بعد محفوظ بنانے کے کام سے آگاہ نہیں۔ اگر آگاہ ہو تو بھی وہ مردے کے جسد کو محفوظ بنانے کی اجازت نہیں دے گا۔ چونکہ یونانیوں کا عقیدہ ہے کہ یونانی خدا اس روش کو پسند نہیں کرتے کیونکہ یہ ایک ایسی روش ہے جو غیرخدا نے بنائی ہے اور غیرخداؤں کی روش یونان میں رائج نہیں ہونی چاہئے۔

کبھی میں یہ سوچتا ہوں کہ بڑھاپے کے آخری سالوں میں مصر جاؤں اور وہیں مروں تاکہ میرے جسد کو موت کے بعد ایسی شکل دے دیں کہ وہ ختم نہ ہو اور مجھے امید ہو کہ میں موت کی نیند سے بیدار ہوجاؤں گا۔ (۱۵۹) لیکن جلد ہی اس سوچ کو ترک کردیتا ہوں کیونکہ میں اپنے آپ کو قائل نہیں کرسکتا۔ یونان کی خاک کے علاوہ کوئی خاک میرے جسم پر لپیٹی جاسکتی ہے۔ میں اپنے آپ کو اس سوچ پر قائم نہیں رکھ سکتا کہ یونانی خداؤں کی رائج کردہ روش کے علاوہ کسی دوسری روش سے مجھے دفن کرنا درست ہے کیونکہ میں یونان میں رائج روش کے علاوہ اگر کسی دوسری روش کے مطابق دفن کیاجاؤں تو میں نے اپنے وطن سے غداری کی ہے۔ (۱۶۰)

کبھی میں اپنے آپ سے کہتا ہوں کہ کیا یہ بہتر نہیں کہ میں اپنے وطن میں مروں اس شرط پر کہ میرے جسد خاکی کو میری موت کے بعد محفوظ رکھیں۔ اگر ہوسکے تو مجھے مصری روش کے مطابق دفن کیا جائے۔ لیکن پھر میں اس سوچ کو جھٹک دیتا ہوں کیونکہ یونانی خداؤں کی روش کے علاوہ کسی دوسری روش کو قبول کرنا وطن سے غداری کے مترادف ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ خدا مجھے امید دلائیں کہ موت کے بعد میں اپنے آپ کو پہچان سکوں گا ؟ اور یہ جان سکوں گا کہ میں وہی رہوں گا جو آج ہوں اور میں نے عمر کا ایک حصہ ستاروں کو پہچاننے میں گزارا ہے اور ان کی حرکات کے قوانین معلوم کئے۔ اگر خدا مجھے یہ امید دلائیں تو میں اس قدر خوش ہوں گا کہ اگر میرے پاؤں ہوتے تو میں رقص کرتے ہوئے قبر کی طرف بڑھتا۔ مجھے اگر یقین ہو کہ موت کے بعد اپنے آپ کو پہچان سکوں گا تو میں کھانے پینے کی لذت کو نظرانداز کردیتا اور دوسری دنیا میں بھوک اور پیاس مٹاتا (اگر اس دنیا میں کھانے اور پینے کا امکان موجود ہوتا) کھانا پینا اور سونا مجھے اس دنیا میں اس لئے لذت دیتا ہے کہ میں اپنی عمر کو کم دیکھتا ہوں۔ اگر مجھے ہمیشہ کی عمر ملے تو مجھے کھانے پینے اور سونے کی لذت سے کیا حاجت ہے کیونکہ

سب سے بڑی لذت عمر جاوداں سے محظوظ ہونا ہے۔ جب کبھی موت کے بعد اپنے آپ کو پہچانوں گا تو میری تمام چیزیں جاوداں ہوجائیں گی اور پھر چھوٹی چھوٹی لذتیں میرے لئے بے معنی ہوجائیں گی۔ لیکن اگر موت کے بعد اپنے آپ کو پہچانوں تو عمر جاوداں کی میری نظر میں کوئی قدروقیمت نہیں ہوگی کیونکہ وہ کسی دوسرے کی عمر جاوداں ہوگی نہ کہ میری۔ مجھے معلوم ہے کہ کوہ اولمپک جس میں خدا رہتے ہیں عمر جاوداں کا مالک ہے۔ لیکن کیا ہمیشہ کی عمر جاوداں میرے لئے کوئی معنی رکھتی ہے ؟ بالکل نہیں' کیونکہ نہ وہ کسی دوسرے کی ہمیشہ کی عمر ہوگی اور نہ میری۔ ممکن ہے میں سوچوں کہ اگرچہ موت کے بعد میں اپنے آپ کو نہیں پہچان سکوں گا لیکن چونکہ عمر جاوداں رکھتا ہوں للذا دنیا کی عمر کا شریک ہوجاؤں گا اور اس طرح کوہ اولمپک کی عمر کا بھی شریک ہو جاؤں گا۔ لیکن اگر اس طرح بھی ہو پھر بھی راضی نہیں ہوں گا۔ کیونکہ جو کچھ زندگی کے لحاظ سے میری نظر میں اہمیت رکھتا ہے وہ میں ہوں اور اگر میں نہیں ہوں تو ہمیشہ کی زندگی کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔ جس طرح آج کوہ اولمپک کی ابدی زندگی کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔

اے جابر ! میں نے تیرے سامنے ارسطوخوس کا قول بیان کیا ہے تاکہ تجھے علم ہوسکے کہ یونان میں ایسے لوگ موجود تھے جو موت کے بارے میں غوروفکر کرتے تھے اور مجموعا" موت کا موضوع کئی مرتبہ گزرے ہوئے زمانے میں لوگوں کے ایک گروہ کی سوچ کا ہدف بنتا رہا ہے۔ جابر نے پوچھا کہ ارسطوخوس اور دوسروں نے ان نظریات سے کیا نتیجہ اخذ کیا ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا چونکہ وہ موحد نہیں تھے اور ہم مسلمانوں کی مانند قیامت پر یقین نہیں رکھتے تھے للذا موت سے بہت ڈرتے تھے۔ جن لوگوں نے بھی ارسطوخوس کی مانند موت کے بارے میں سوچ و بچار کی ہے ان میں سے اکثر اس بات سے ڈرتے رہے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ موت کے بعد زندہ رہیں لیکن جسم کھودینے کے نتیجہ میں اپنے آپ کو نہ پہچان سکیں۔

لیکن ایک مسلمان وہ بھی مومن' موت کے بعد اپنی عاقبت کے بارے میں مطمئن ہے اور اسے معلوم ہے کہ موت کے بعد خداوند تعالیٰ نے جو وقت اس کے لئے معین فرمایا ہے اس وقت زندہ ہوگا اور اس وقت زندہ ہوکر نہ صرف اپنے آپ کو پہچانے گا بلکہ اعمال کا حساب بھی دے گا۔ وہ اپنے وجود کو اس قدر مکمل طور پر محسوس کرے گا کہ اپنے اس جہان کے اعمال کا حساب دے سکے اور اگر نیکوکار ہوا تو جنت میں جائے گا ورنہ اسے اس کے کردار کی سزا ملے گی۔

جابر نے کہا مسلمانوں کا مذہبی عقیدہ کتنا اچھا ہے کہ موت کے بعد انہیں ان کی حالت کا علم ہے۔ کیا گزشتہ مذاہب میں بھی مومنوں کو موت کے بعد کی حالت کا علم ہوتا تھا ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا اسلام سے قبل آنے والے تمام آسمانی مذاہب میں مومنین سے کہا گیا ہے کہ موت کے بعد پاداش اور کیفر ہے لیکن ان میں سے کسی میں بھی موت کے بعد پاداش اور کیفر کے مسئلے کو دین اسلام کی طرح وضاحت سے اور دوٹوک الفاظ میں بیان

نہیں کیا گیا۔ بعض گزشتہ مذاہب میں اس کے بارے میں کسی حد تک ابہام پایا جاتا ہے۔

جابر نے پوچھا کیا دین اسلام میں پاداش کی بنیاد موت سے ڈرنے پر رکھی گئی ہے ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا موت سے ڈرنے کی بنیاد پر نہیں بلکہ موت کے بعد پاداش سے خوف کی بنیاد پر ہے۔ مومن مسلمان موت سے نہیں ڈرتا بلکہ اسے موت کے بعد سزا کا ڈر ہوتا ہے۔ وہ موت کے بعد سزا سے بچنے کے لئے ساری عمر جن باتوں سے منع کیا جاتا ہے ان سے پرہیز کرتا ہے۔ ایک مومن مسلمان جو ساری عمر گناہ کا ارتکاب نہیں کرتا' میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ موت کی دعوت کو لبیک کہتا ہے اور اس کی روح آسانی سے اس کے جسم سے پرواز کرجاتی ہے۔

اے جابر ! دین اسلام میں موت کی بنیاد ڈر پر نہیں ہے بلکہ موت کے بعد پاداش سے ڈر کی بنیاد پر ہے۔ اگر موت سے ڈرنے والا مسلمان ہو تو وہ موت سے نہیں ڈرتا بلکہ موت کے بعد پاداش سے ڈرتا ہے۔ جابر نے کہا بہرکیف موت سے ڈر موجود ہے ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا لوگوں میں موت سے ڈر وہ خوف نہیں ہے جو ضرب الاجل کی وجہ سے ہوتا ہے مثلاً" اگر کوئی قتل کا مرتکب ہوتا ہے تو شریعت کی رو سے اسے قتل ہونا چاہئے اور اس کے قتل کا حکم اگر جج نے صادر کردیا ہے اور اسے علم ہوجاتا ہے کہ کل اسے پھانسی لگ جانا ہے تو وہ شخص موت سے بہت ڈرتا ہے۔ کیونکہ اسے علم ہے کہ اس کی موت ضرب الاجل کی حامل ہے اور معین وقت میں پہنچنے والی ہے۔

لیکن عام لوگوں میں موت ضرب الاجل کی حامل نہیں ہے۔ خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے ہر کسی کی موت کا وقت معین ہے اور اس سے ایک لمحہ ادھر ادھر نہیں ہوگا۔ لیکن اس معین وقت کا تعین خداوند تعالیٰ کرتا ہے نہ کہ وہ شخص جو مرتا ہے۔ تمام بنی نوع انسان موت کا عقیدہ رکھنے کے بارے میں ان قرضداروں کی مانند ہیں جنہیں اس بات کا علم نہیں ہے کہ ان کے قرض کی ادائیگی کا وقت کونسا ہے ؟ اور یہ احساس کرتے ہیں کہ اس کی ادائیگی بہت دور ہے۔ اسی وجہ سے عام زندگی میں کوئی بھی موت سے نہیں ڈرتا۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے کہ اس نے موت کو ہر زندہ چیز کے لئے مقرر کیا ہے۔ لیکن اس کا وقت ہر ایک سے پوشیدہ رکھا ہے۔ اسی لئے عام زندگی میں موت سے کوئی نہیں ڈرتا۔ موت سے یہ لاپرواہی بعض لوگوں میں اس قدر مضبوط ہوتی ہے کہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ وہ زندہ جاوید رہیں گے۔ اسی لئے وہ مال جمع کرنے میں بہت دوڑ دھوپ دکھاتے ہیں۔ ان پر حرص کا اتنا غلبہ ہوتا ہے کہ گویا وہ ہزاروں سال زندہ رہیں گے۔

اگر انسانی زندگی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکمت برقرار نہ ہوتی تو ہر کوئی ایک ایسے محکوم کی مانند زندگی گزارتا جسے علم ہوتا کہ دوسرے دن یا دوسرے گھنٹے میں اسے زندگی کو وداع کہنا ہے اور جب لوگوں میں یہ طرز فکر پیدا ہوجائے تو لوگ اس قدر مضطرب ہوتے ہیں کہ نہ تو حصول معاش کے لئے تگ و دو کرسکتے ہیں اور نہ

ہی اجتماعی زندگی وجود میں آتی ہے۔ اس طرح بنی نوع انسان مایوسی کے عالم میں اس دنیا سے رخصت ہوجاتا ہے۔
جابر نے کہا خداوند تعالیٰ جو انسان کو خلق کرتا ہے اور اسے جان دیتا ہے' اسے کیوں مارتا اور نابود کرتا ہے ؟
امام جعفر صادقؑ نے فرمایا اے جابر ! میں نے کہا ہے کہ موت جس طرح عام لوگ تصور کرتے ہیں وجود نہیں رکھتی بلکہ ایک حالت کی تبدیلی ہے میں یہ بات دہراتا ہوں کہ ایک مومن مسلمان اگر عالم ہے تو اس حالت کی تبدیلی سے نہیں ڈرتا کیونکہ اسے علم ہے کہ موت کے بعد زندہ ہوگا۔ لیکن میں فرض کرتا ہوں کہ اس وقت ایک ایسے شخص سے بات کر رہا ہوں جو مسلمان نہیں اور مجھ سے سوال کرتا ہے کہ خداوند تعالیٰ جس نے انسان کو خلق کیا ہے اور اسے جان عطا کی ہے اسے کس لئے مارتا ہے ؟ تو میں اس کے جواب میں کہوں گا کہ موت ایک ایسا دریچہ ہے جس سے انسان دوسری زندگی میں وارد ہوتا ہے اور وہ دوسری زندگی میں بھی دوبارہ زندہ ہوگا۔

اے جابر ! کیا تو اپنی ماں کے پیٹ میں زندہ تھا یا نہیں ؟ جابر نے کہا ہاں میں زندہ تھا۔ امام جعفر صادقؑ نے پوچھا کیا ماں کے پیٹ میں غذا کھاتا تھا یا نہیں ؟ جابر نے مثبت میں جواب دیا۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کیا تو ماں کے پیٹ میں ایک مکمل چھوٹا انسان شمار ہوتا تھا یا نہیں ؟ جابر نے کہا میں اس بات کی تصدیق کرتا ہوں کہ ایک مکمل انسان تھا۔ امام جعفر صادقؑ نے پوچھا کیا تجھے یاد ہے کہ تو نے ماں کے پیٹ میں موت کے بارے میں فکر کی تھی یا نہیں ؟ جابر نے جواب دیا مجھے یاد نہیں کہ ماں کے پیٹ میں موت کے بارے میں غور و فکر کرتا تھا یا نہیں۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔ موت کے موضوع کو چھوڑو۔ چلو یہ بتاؤ کہ ماں کے پیٹ میں تمہاری غذائیں کیا کیا تھیں ؟ جابر نے کہا' ماں کے پیٹ میں اپنی زندگی کی حالت کے بارے میں مجھے کچھ بھی یاد نہیں ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا اس کے باوجود کہ تمہیں ماں کے پیٹ میں اپنی حالت کے بارے میں کچھ بھی یاد نہیں کیا اپنی زندگی کو اس جہان میں اچھا سمجھتے ہو یا ماں کے پیٹ میں ؟ جابر نے کہا ماں کے پیٹ میں میری زندگی بہت مختصر یعنی تقریباً" نو ماہ تھی۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا وہ نو ماہ کی مدت جو تم نے ماں کے پیٹ میں گزاری ہے شاید وہ نو ماہ کی مدت تمہیں اس دنیا کی اسی یا نوے سال کی عمر سے جو تم اس دنیا میں گزارو گے تمہیں زیادہ نظر آئے کیونکہ زمانہ ہر قسم کے حالات میں تمام لوگوں کے لئے ایک جیسا نہیں ہے اور ہر کوئی تھوڑے بہت غور کے بعد اپنی زندگی میں اس موضوع کا ادراک کر سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کبھی چند گھنٹے تم نے ایسے گزارے ہوں گے کہ تم نے سمجھا ہوگا کہ ایک گھنٹہ گزرا ہے اور کبھی تمہارے لئے ایک گھنٹہ اس قدر لمبا ہوگیا ہوگا کہ تمہارا خیال ہوگا کہ تم نے چند گھنٹے گزارے ہیں۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ جو نو ماہ کی مدت تم نے ماں کے پیٹ میں گزاری ہے شاید وہ تمہیں اس موجودہ دنیا کی عمر سے بھی طویل محسوس ہوئی ہوگی (۶۱)

اے جابر ! تو ماں کے پیٹ میں ایک مکمل اور زندہ انسان شمار ہوتا تھا اور باشعور بھی تھا۔ باشعور ہونے کی نسبت سے شاید تمہاری کچھ آرزوئیں بھی ہوں گی اور جب کہ تم اس دنیا میں زندگی بسر کر رہے ہو تمہیں ماں کے پیٹ کے زمانے کی معمولی سی بات بھی یاد نہیں۔ کیا تم جو ایک فاضل انسان ہو یہ گمان نہیں کرتے کہ تمہارا ماں کے پیٹ سے باہر نکلنا اور اس دنیا میں وارد ہونا شاید ایک طرح کی موت تھی ؟ کیا تم یہ خیال نہیں کرتے کہ جب تم ماں کے پیٹ میں تھے تو تم چاہتے تھے کہ تم وہیں رہو اور ہرگز وہاں سے باہر نہ نکلو ؟ تمہارا خیال تھا کہ ماں کے پیٹ سے بہتر اور آرام دہ جہان موجود نہیں۔ جب تم ماں کے پیٹ سے نکالے گئے (جس کے بارے میں میں نے کہا ہے کہ شاید وہ موت کی ہی ایک قسم ہے) اور اس جہان میں پہنچے تو تم نے رونا دھونا شروع کردیا۔ لیکن کیا آج تم اس بات کی تصدیق کرتے ہو کہ جس دنیا میں تم زندگی گزار رہے ہو وہ ماں کے پیٹ کی دنیا سے کہیں بہتر ہے ؟

جابر نے کہا اس کے باوجود کہ مجھے ماں کے پیٹ میں اپنی زندگی کی کیفیت کے بارے میں کچھ علم نہیں میں اس بات کی تصدیق کرتا ہوں کہ میری زندگی ماں کے شکم کی زندگی سے بہتر ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کیا اس موضوع کا قرینہ نہیں بتاتا کہ موت کے بعد ہماری زندگی اس دنیا کی زندگی سے بہتر ہوگی۔ جابر نے کہا اگر اس دنیا سے بدتر ہو تو پھر ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا جو لوگ اس دنیا میں خداوند تعالیٰ کے احکامات پر عمل کرتے ہیں ان کی دوسرے جہان کی زندگی اس موجودہ جہان کی زندگی سے بہتر ہوگی۔ اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ چونکہ خداوندتعالیٰ نے اس موضوع کے بارے میں اپنے بندوں سے واضح وعدہ کیا ہے لہٰذا عقلی لحاظ سے بھی یہی بات درست ہے۔ علاوہ ازیں خداوندتعالیٰ دانا' توانا اور عادل ہے۔ وہ حاسد نہیں کہ اپنے بندوں کو اچھے جہان سے برے جہان کی طرف لے جائے۔ اگر ہم اس بات کے قائل ہیں کہ انسانی تخلیق کا مقصد اسے کمال تک پہنچانا ہے تو ہمیں یہ بات قبول کرنا چاہئے کہ انسان کی زندگی کا ہر لحہ اس کے کمال میں اضافہ کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر خدا نے صریحاً" اور کسی ابہام کے بغیر اپنے بندوں کو موت کے بعد ان کے اچھے اعمال کا اجر دینے کا وعدہ بھی نہ کیا ہوتا اور یہ نہ کہا ہوتا کہ وہ ابدی سعادت سے بہرہ مند ہوں گے پھر بھی ہماری عقل یہ سمجھتی۔ کیونکہ انسان کی تخلیق کا مقصد اسے کامل انسان بنانا ہے۔ لہٰذا اس جہان میں انسان کی زندگی کی حالت اس زندگی کی حالت سے بہتر ہوگی۔

جابر نے پوچھا' ہمیں اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ موت کے بعد ہم اپنے آپ کو پہچانیں گے اور اپنی اصلیت کو نہیں کھوئیں گے۔ امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا' اس بات میں کوئی شک نہیں' ہر مومن مسلمان جانتا ہے کہ موت کے بعد خداوندتعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ وقت پر دوبارہ زندہ ہوگا اور اپنے آپ کو پہچان لے گا۔ اسلام نے موت کے بعد دوبارہ زندگی کے بارے میں انسانوں کو گزشتہ مذاہب کی نسبت زیادہ یقین

دلایا ہے۔
مجھے مشرکین سے کوئی غرض نہیں جن کی اس دنیا کے بعد کی زندگی کے بارے میں خوف کے متعلق مثال میں نے تمہیں ارسطوخوس کی زبانی دی ہے۔ لیکن حتی کہ بعض گزشتہ توحیدی مذاہب میں لوگ موت کے بعد زندگی پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ ان کا خوف تقریباً" ارسطوخوس کے خوف کی مانند تھا۔ ان کا خیال تھا کہ موت کے بعد زندہ تو ہوں گے لیکن اس دوسری زندگی میں اپنے آپ کو پہچان نہیں سکیں گے اور یہ بھی نہیں جان سکیں گے کہ وہی ہیں جو اس دنیا میں کھاتے' پیتے اور سوتے تھے۔ ان کے مذاہب میں جو باتیں دوسرے جہان میں انسانی زندگی کے بارے میں موجود تھیں وہ ان کے قائل نہیں تھے کہ وہ دوسرے جہان میں اپنے حقیقی شعور کو محفوظ رکھ سکیں گے اور اپنی اس زندگی کی تمام خصوصیات کو یاد رکھ سکیں گے۔
دین اسلام نے اس تشویش کو مومنین کے دلوں سے مکمل طور پر محو کردیا اور صریحاً" کسی استثناء کے بغیر کہا کہ انسان موت کے بعد جس دن خداوند تعالیٰ کے حکم سے زندہ ہوگا اپنے آپ کو اچھی طرح پہچان لے گا اور اس دنیا کی اپنی تمام انسانی خصوصیات کو یاد رکھے گا اور اس دنیا کی مانند کھانے اور پینے سے لذت اٹھائے گا۔
خداوند تعالیٰ کے بقول نہ صرف نیک بندے موت کے بعد اپنے آپ کو پہچانتے ہیں بلکہ گناہگار بندے بھی اپنی اصلیت سے آگاہ ہوتے ہیں۔ اگر وہ اپنی اصلیت پر نہ ہوں تو وہ کیسے اپنی اس دنیا کے اعمال کا حساب دے سکتے ہیں۔ جابر بن حیان نے پوچھا' کیا آپ نے ابھی نہیں کہا کہ ماں کے شکم سے بچے کا باہر نکلنا بھی موت ہے ؟ امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا' میں نے قطعاً" نہیں کہا کہ بچے کا نکلنا موت ہے بلکہ کہا ہے کہ ماں کے شکم سے بچے کا نکلنا شاید موت کی ایک قسم ہے۔
جابر بن حیان نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا۔ درست ہے آپ نے کہا ہے کہ شاید موت کی ایک قسم ہے لیکن میرا مقصد کچھ اور ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے پوچھا' بولو تم کیا کہنا چاہتے ہو ؟ جابر نے کہا میں یہ کہنا چاہتا ہوں اس کے باوجود کہ میں آپ کے بقول ماں کے شکم میں ایک طویل مدت تک رہا ہوں اور میرا ماں کے شکم میں نو ماہ تک رہنا شاید اس دنیا کے ایک آدمی کی عمر کے برابر ہو' اب مجھے اس نو ماہ یا زیادہ کی زندگی سے کوئی چیز یاد نہیں۔ کیا ماں کے شکم میں میری زندگی کی حالت سے بے خبری اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ میں مرنے اور اس جہان سے چلے جانے کے بعد دوسری دنیا میں اپنے آپ کو نہیں پہچان سکوں گا اور نہیں جان سکوں گا کہ میں وہی ہوں جو آج کی مانند ایک دن آپ سے بات چیت کر رہا تھا۔ اس کے بعد جابر نے اس طرح وضاحت کی' چونکہ میں مسلمان ہوں لہٰذا خداوند تعالیٰ کے فرمان کے مطابق میرا ایمان ہے کہ میں دوسری دنیا میں اپنے آپ کو پہچان لوں گا۔ لیکن میرا مطلب یہ ہے کہ اس موضوع پر فلسفے کے نقطہ نگاہ سے روشنی ڈالی جائے اور میں جو ماں کے پیٹ میں اپنی زندگی کی کیفیت سے بے خبر ہوں کیسے یقین کروں کہ موت کے بعد دوسری دنیا

میں اس دنیا کو یاد رکھ سکوں گا اور اپنے آپ کو پہچان لوں گا۔

امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا' اس سے قبل کہ میں تمہارے سوال کے جواب کی ماہیت سے تمہیں آگاہ کروں تم سے کہتا ہوں کہ قرینے کو دلیل میں گڈمڈ نہ کرو کیونکہ دلیل اور قرینے میں فرق ہے۔ اس طرح کہنا چاہئے کہ چونکہ میں ماں کے شکم میں اپنی زندگی کی حالت سے بے خبر ہوں لہٰذا یہ موضوع اس بات کا قرینہ ہے کہ موت کے بعد بھی اس دنیا کی زندگی کی حالت سے کوئی چیز مجھے یاد نہیں ہوگی اور میں اپنے آپ کو نہیں پہچان سکوں گا کیونکہ ماں کے شکم میں گزری ہوئی زندگی سے کسی چیز کا یاد نہ ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ اس دنیا کی حالت بھی یاد نہ ہو لیکن قرینہ ہے۔

جابر بولا' میرا خیال ہے میں اس قرینے کی رو سے موت کے بعد کی دنیا میں اپنے آپ کو نہیں پہچان سکوں گا اور اس دنیا کی زندگی کی خصوصیات کو یاد نہیں کرسکوں گا۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا' یہ جان لو کہ کافر اس نسبت سے کہ معاد کا منکر ہے یا یہ کہ ایک مسلمان کی مانند معاد کا معتقد نہیں ہے موت سے ڈرتا ہے۔ جبکہ موت کے بارے میں اسے کوئی اطلاع نہیں اور چونکہ وہ موت سے مطلع نہیں لہٰذا اسے موت سے نہیں ڈرنا چاہئے۔ کیونکہ جب انسان ایک چیز کے بارے میں اطلاع نہ رکھتا ہو تو اس کا اس چیز سے ڈرنا عقل سے بعید ہے۔

جابر نے کہا' کیا آپ یہ نہیں سوچتے کہ کافر اس لئے موت سے ڈرتا ہے کہ اس کا خیال ہوتا ہے کہ وہ اس دنیا کی خوشیوں کو کھودے گا ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا میں یہی کہنا چاہتا تھا کہ کافر کو ڈر ہوتا ہے کہ موت کے نتیجے میں وہ اس جہان کی خوشیوں سے محروم ہوجائے گا لیکن مسلمان اس وجہ سے نہیں ڈرتا چونکہ اسے علم ہوتا ہے کہ اس جہان کی خوشیوں سے کہیں زیادہ خوشیاں دوسرے جہان میں اس کی منتظر ہیں اور اس دنیا میں اس کی خوشیوں کے مراحل محدود ہیں جبکہ دوسرے جہان میں لامحدود ہیں۔ عقلی لحاظ سے کافر کو موت سے نہیں ڈرنا چاہئے کیونکہ اس پر موت کے بعد کی زندگی مجہول ہے۔ لیکن وہ اپنی عقل کو کام میں نہیں لاتا حالانکہ اپنا تصور جو وہ اپنے آپ کو پیدا کرنے کے لئے استعمال میں لاتا ہے اس سے وہ موت کے بعد کی زندگی کو بھی سمجھنے میں مدد لے سکتا ہے۔

مذکورہ تصور کافر کی نگاہ میں مجہولات کو ایک خوفناک صورت میں پیش کرتا ہے۔ اس کے باوجود کہ کافر جانتا ہے شروع میں اس دنیا میں نہ تھا اور ماں کے شکم سے اس دنیا میں آیا ہے۔ اگر اس جہان سے جائے گا تو شاید اس طرح ہو کہ وہ کسی دوسری ماں کے شکم میں جائے گا' پھر بھی وہ موت سے ڈرتا ہے۔

یہ باتیں جو میں کر رہا ہوں وہ موت کو ایک کافر کی نگاہوں کے دریچے سے دیکھنا ہے نہ کہ ایک مسلمان کی نگاہوں سے جو معاد پر ایمان رکھتا اور موت کے لئے تیار رہتا ہے۔

مثال دینے میں کوئی حرج نہیں اور میں مثال دیتا ہوں کہ اگر کافر کو علم ہوتا کہ اس کی زندگی موت سے شروع ہوتی ہے اور ماں کے پیٹ کی طرف جا رہا ہے اور اس کا مستقبل یہ ہے کہ عمر کے خاتمے کے بعد ماں کے شکم میں جائے گا تو وہ ماں کے شکم میں دوبارہ جانے سے ڈرے گا جس طرح آج موت سے ڈرتا ہے اور ماں کے شکم میں زندگی کے مجہولات اسے خوف سے لاحق کردیں گے۔ لیکن تمہارے سوال کا جواب یہ ہے کہ کیا کبھی اتفاقیہ ایسا ہوا ہے کہ تم بے ہوش ہوگئے ہو ؟ جابر نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا میرے ساتھ کبھی ایسا نہیں ہوا۔ امام جعفر صادقؒ نے سوال کیا۔ کیا تم خواب دیکھتے ہو ؟ جابر نے جواب دیا بہت سے خواب دیکھتا ہوں۔ امام جعفر صادقؒ نے فرمایا' خواب کے دوران ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے ہو ؟ جابر نے کہا کئی مرتبہ ایسا ہوا ہے۔ امام جعفر صادقؒ نے پوچھا کس کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے ہو ؟ کیونکہ تمہیں علم ہے کہ خواب میں تم راستہ نہیں چلتے۔ جابر نے کہا۔ میں اپنی روح کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا ہوں۔ امام جعفر صادقؒ نے پوچھا کیا تمہارا ایمان ہے کہ یہ تمہاری اپنی روح ہے کسی دوسرے کی نہیں ؟ جابر نے کہا اس لحاظ سے مجھے کوئی شک نہیں۔ امام جعفر صادقؒ نے پوچھا کیا یہ روح جو نقل مکانی کرتی ہے تجھ سے جدا ہوتی ہے یا نہیں ؟ جابر نے جواب دیا مجھ سے جدا ہوتی ہے چونکہ اگر مجھ سے جدا نہ ہوتی تو ہرگز نقل مکانی نہ کرسکتی۔

امام جعفر صادقؒ نے پوچھا کیا تمہاری روح جو تم سے جدا ہوتی ہے اور نقل مکانی کرتی ہے' غذا کھاتی ہے ؟ جابر نے مثبت جواب دیا۔ امام جعفر صادقؒ نے پوچھا کیا پانی پیتی ہے ؟ جابر نے پھر اثبات میں جواب دیا۔ امام جعفر صادقؒ نے فرمایا کیا جس وقت تمہاری روح کھانے اور پینے میں مشغول ہوتی ہے تو تمہارے منہ سے کھاتی ہوگی ؟ جابر بولا نہیں چونکہ میرا منہ خواب میں متحرک نہیں ہوتا۔ امام جعفر صادقؒ نے پوچھا کیا تمہاری روح کھانے پینے کے لئے اپنا منہ استعمال کرتی ہے ؟ جابر نے جواب دیا' نہیں۔ امام جعفر صادقؒ نے فرمایا اس کے باوجود کہ اس کا منہ نہیں ہے تم سوتے ہوئے خواب میں غذا کی لذت اور پانی کا مزہ محسوس کرتے ہو ؟ جابر نے اثبات میں جواب دیا۔

امام جعفر صادقؒ نے فرمایا جب تم خواب دیکھتے ہو تو تمہاری روح اس کے باوجود کہ اس کے پاؤں نہیں ہیں' چلتی ہے اور ایک مقام سے دوسرے مقام تک جا پہنچتی ہے۔ آنکھ نہیں رکھتی مگر دیکھتی ہے۔ اس کے کان نہیں ہیں لیکن سنتی ہے۔ اس کا منہ نہیں ہے لیکن وہ غذا کھاتی اور پانی پیتی ہے۔ لہٰذا تمہاری روح ایک آزاد زندگی کی حامل ہے اور خواب دیکھنے کے دوران تمہاری روح کو زندگی گزارنے کے لئے تمہارے جسم کی کوئی ضرورت نہیں۔ جابر نے کہا لیکن اگر میرا جسم نہ ہو تو میں ہرگز خواب نہیں دیکھ سکتا۔ امام جعفر صادقؒ نے فرمایا خواب نہیں دیکھ سکتے مگر تمہاری روح تمہارے جسم کے بغیر زندہ رہ سکتی ہے۔ یاد رکھو میں نے کہا ہے کہ میں

فرض کر رہا ہوں تم مسلمان نہیں ہو اور میں ایک ایسے شخص سے مخاطب ہوں جو اپنے آپ کو دوسری دنیا میں لے جاتا ہے۔ تم نے کہا ہے کہ اگر تمہارا جسم نہ ہو تو تم خواب نہیں دیکھوگے اور میں نے تمہارے قول کی تصدیق کی ہے۔ اب تم سے پوچھتا ہوں کہ کیا خواب دیکھنے کے دوران تمہاری روح ایک آزاد زندگی کی حامل ہوجاتی ہے اور جہاں جانا چاہے جاتی ہے اور جو کرنا چاہے کرتی ہے۔ کیا وہ وجود رکھتی ہے یا نہیں ؟ جابر نے کہا' ہاں۔ امام جعفر صادقؑ نے پوچھا کیا روح کے خواب دیکھنے کے دوران موجود ہونے اور اس کی آزادانہ زندگی میں تمہیں کوئی شک ہے یا نہیں ؟ جابر نے جواب دیا کوئی شک نہیں۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کیا تم فلسفے کے اس اصول کو تسلیم کرتے ہو کہ جو چیز وجود میں آتی ہے ختم نہیں ہوتی ؟ جابر نے کہا ہاں میں اس اصول کو تسلیم کرتا ہوں۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا پس تمہاری روح جو خلق ہوئی ہے اس کے وجود سے تمہیں انکار نہیں' تمہاری موت کے بعد ختم نہیں ہوگی اور جو کچھ تم جانتے ہو وہی تمہاری روح ہے۔ لہٰذا تم بھی باقی رہوگے اور موت کے بعد اپنے آپ کو پہچانوگے۔ جابر نے کہا مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ میری روح خواب دیکھنے کے دوران موجود ہوتی ہے۔ لیکن روح کا وجود تابع ہے' انفرادی اور آزاد نہیں۔ چونکہ اگر میرا جسم نہ ہو تو میں خواب نہیں دیکھ سکتا اور اگر خواب نہ دیکھوں تو میری روح جو مجرد اور آزاد زندگی کی حامل ہے میں اسے مشاہدہ نہیں کرسکتا۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا جب سورج کی دھوپ تمہارے جسم کی حامل ہے اور تمہارا سایہ زمین پر پڑتا ہے تو کیا یہ سایہ مرہون منت ہے یا نہیں ؟ جابر نے کہا بیشک مرہون منت ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے کہا کس چیز کا مرہون منت ہے ؟ جابر نے جواب دیا دو چیزوں کا۔ پہلی سورج کی روشنی اور دوسرا خود میرا وجود اور ان دو کے بغیر سایہ وجود میں نہیں آتا۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔ فلسفہ کے اصول کے مطابق تمہارا سایہ بھی جو زمین پر پڑتا ہے اور سورج کے غروب ہونے کے بعد بظاہر ختم ہوجاتا ہے وہ بھی ختم نہیں ہوتا تو پھر تمہاری روح کیسے ختم ہوگی ؟ اگرچہ وہ مرہون منت ہی کیوں نہ ہو اور انحصاری زندگی کی حامل ہی کیوں نہ ہو۔

جابر نے پوچھا خداوند تعالیٰ نے کس لئے مقرر کیا کہ ہم ایک مدت تک ماں کے شکم میں زندگی گزاریں اور پھر ایک عرصہ تک اس جہان میں زندگی گزارنے کے بعد مرجائیں ؟ تاکہ ہمیں ایک بہتر زندگی کی جانب منتقل کیا جائے۔ جس طرح آپ نے کہا ہے کہ خداوند تعالیٰ کو کسی سے کینہ اور حسد نہیں جو وہ ہمیں برے جہان کی طرف منتقل کرے۔

اس سوال کے پوچھنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ کیا یہ زیادہ آسان اور بہتر نہ تھا کہ خدا شروع ہی سے ہمیں بہتر دنیا میں یعنی وہ دنیا جس میں ہم موت کے بعد پہنچیں گے میں خلق کردیتا اور ہم اس دنیا میں زندگی کے مراحل طے نہ کرتے ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ایک مسلمان کے لئے یہ مسئلہ حل شدہ ہے۔ چونکہ ایک مسلمان

جانتا ہے کہ آدمؑ کا مکان بہشت میں تھا اور انہیں بظاہر ہوس کی پیروی کی وجہ سے جنت سے نکالا گیا اور اسے زمینی تقاضے پورے کرنے پڑے۔ ماں کے شکم میں زندگی گزارنے کے مراحل اور اس دنیا میں زندگی اور موت کے مراحل کو اسے طے کرنا چاہئے۔ تاکہ اگر نیکوکار ہو تو پہلی جگہ واپس چلا جائے یعنی بہشت میں اپنا مقام بنالے اور اگر گنہگار ہو تو ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد اپنی سزا پائے۔

لیکن اگر ایک ایسے انسان سے بات کروں جو مسلمان نہیں ہے تو وہاں پر مجھے اس کا مذہب جاننا چاہئے۔ اگر یہودی یا نصرانی ہو تو اس کا بھی عقیدہ ہے کہ آدمی شروع میں بہشت میں تھا اور وہاں سے نکالا گیا۔ جو مراحل اس جہان میں طے کر رہا ہے وہ اس کے پاک و طاہر ہونے کے لئے ہیں تاکہ وہ اس قابل ہوسکے کہ بہشت میں قدم رکھ سکے۔

اگر مجھ سے مخاطب شخص کسی ایک توحیدی مذہب پر ایمان نہ رکھتا ہو تو میں اسے کہوں گا کہ اگر وہ میرے خدا پر ایمان رکھتا ہے تو یہ سوال مجھ سے کرے اور اگر ایمان نہیں رکھتا تو کس لئے پوچھتا ہے کہ کیوں خداوندتعالیٰ نے شروع میں انسان کو بہتر دنیا میں جگہ نہ دی اور چند مراحل طے کرنے پر لگادیا تاکہ وہ ان مراحل کو طے کرنے کے بعد بہتر دنیا تک پہنچے۔ اگر مجھ سے سوال کرنے والا شخص لادین ہو اور مجھ سے خداوندتعالیٰ کی حکمت کو سننا چاہے تو میں اسے کہوں گا کہ خداوندتعالیٰ کا انسان کو مختلف مراحل سے گزارنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان ہر مرحلے میں پہلے سے زیادہ پاک و طاہر ہو تاکہ کامل بن جائے یہاں تک کہ وہ ہمیشہ کی نیک بخت دنیا میں داخل ہونے کے قابل ہوجائے۔ اسے یہ بھی کہوں گا کہ خدائے دانا اور توانا اس سے کہیں بڑا ہے کہ آدمی کو گوناگوں مراحل سے اس لئے گزارے تاکہ آدمی پہلے سے بھی زیادہ بدبخت بن جائے لہٰذا دانا و توانا خدا کا حتمی مقصد یہ ہے کہ انسان نیک بختی حاصل کرلے۔ جابر نے کہا میرا ایک اور سوال ہے اور وہ یہ کہ خداوندتعالیٰ کو انسان کو خلق کرنے کی کیا ضرورت تھی ؟ کیا اس بات کا امکان نہ تھا کہ خداوندتعالیٰ انسان کو خلق کرنے سے احتراز کرتا ؟ امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا' ایک مسلمان جانتا ہے کہ خداوندتعالیٰ نے انسان کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ اس سے خود کو متعارف کرائے یعنی انسان اپنے وجود کی شناخت کرے۔ ایک مسلمان کا عقیدہ یہ ہے کہ خداوندتعالیٰ نے انسان کو جو سب سے بڑی نعمت عطا کی ہے وہ اس کا خلق کرنا ہے۔ جابر نے کہا۔ فرض کیا آپ ایک ایسے شخص سے گفتگو کر رہے ہیں جو مسلمان نہیں ہے تو پھر آپ انسان کو خداوندتعالیٰ کی طرف سے خلق کرنے کی کیسے توجیہہ کریں گے ؟

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا میرا اپنا ایمان ہے کہ خداوندتعالیٰ کی طرف سے انسان کی تخلیق اور مجموعی طور پر جو کچھ وجود میں آیا ہے اس کا وجود میں آنا خداوندتعالیٰ کے کرم کی بنا پر ہے اور خداوندتعالیٰ نے اس دنیا کی تمام مخلوقات کو اس لئے خلق کیا ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ تمام مخلوقات اپنے آپ کو پہچانیں اور صاحب ایمان ہوں۔

مجھے یقین ہے کہ کوئی ایسی مخلوق نہیں جو اپنے آپ کو نہ پہچانتی نہ ہو خواہ وہ جمادات میں ہی کیوں نہ شمار ہوتی ہو۔ میری نظر میں اس جہان کی تخلیق کا سبب خداوندتعالیٰ کے کرم کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ چونکہ بے نیاز خدا نہ مادی اور نہ ہی روحانی لحاظ سے دنیا کو وجود میں لانے کا محتاج تھا۔ قدیم یونانی کہتے تھے کہ چونکہ خدا تنہائی کا احساس کرتے تھے لہٰذا انہوں نے کائنات کو تخلیق کیا تاکہ اکیلے نہ ہوں۔ لیکن یونانی خدا' خدا نہ تھے۔ اگر خدا ہوتے تو انہیں تنہائی کا احساس نہ ہوتا۔ انہیں کائنات کو خلق کرنے کی ضرورت نہ پڑتی کیونکہ جو ضرورت کا احساس کرے وہ خدا نہیں ہے۔

جابر نے پوچھا اگر آپ کسی ایسے شخص سے گفتگو کر رہے ہوں جو یہ بات تسلیم نہ کرے کہ خداوندتعالیٰ نے انسان اور مجموعی طور پر دنیا کو اپنے کرم سے خلق کیا ہے تاکہ مخلوقات اپنے آپ کو پہچانیں تو کائنات کے وجود میں آنے کی آپ کیا توجیہہ بیان کریں گے ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا اگر اس نے میری بات تسلیم نہ کی تو میں دنیا کے وجود میں آنے کی کسی دوسری طرح توجیہہ نہیں کروں گا اور اسے کہوں گا کہ میرا نظریہ یہی ہے۔ وہ اسے مانے یا نہ مانے۔

جابر نے پوچھا۔ آپ جو فرماتے ہیں کہ خداوندتعالیٰ نے اپنے کرم سے جہان کو جس میں انسان شامل ہیں تخلیق کیا ہے کیا آپ یہ بات مذہبی عقیدت کی رو سے کہتے ہیں یا یہ کہ اسے ایک حقیقت سمجھتے ہیں ؟
امام جعفر صادقؑ نے فرمایا جابر کیا تو مجھے ایسا انسان خیال کرتا ہے کہ اگر میں کسی چیز کو حقیقت نہ سمجھوں تو اس پر ایمان لے آؤں گا ؟

جابر نے کہا میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کیا یہ آپ کا عقیدہ ہے کہ خداوندتعالیٰ نے اپنے کرم سے جہان کو خلق کیا ہے یا حقیقت بھی یہی ہے۔ دنیا کی تخلیق میں خدا کی مشیت ہے اور خدا کی مشیت کے بارے میں ہم اس کے بندے شاید اور نظریہ رکھتے ہوں اور خود خداوندتعالیٰ کا دوسرا نظریہ ہو۔ ہم اپنی بشری عقل کے دریچے سے خدا کی مشیتوں کے سبب کے متعلق اظہار خیال کرتے ہیں اور ہماری خدائی مشینری تک کوئی رسائی نہیں کہ ہمیں علم ہوسکے کہ جو کچھ ہماری عقل کہتی ہے وہ خدائی مشینری کی عقل کے مطابق ہے یا نہیں ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا میں جانتا ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو ؟ تم کہتے ہو تمہارا عقیدہ ہے کہ خداوندتعالیٰ نے اپنے کرم سے جہان کو خلق کیا اور یہ بات میں اپنے ایمان سے کہتا ہوں۔ ممکن ہے کائنات کی تخلیق کی وجہ خداوندتعالیٰ کی مشینری میں کوئی اور ہو۔

جابر نے کہا میرا مقصد یہی ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا اس ضمن میں میں تمہیں یا کسی اور کو کوئی چیز نہیں بتاسکتا کیونکہ میں ایک انسان ہوں اور انسان کو تخلیق کے اسباب سے واقف ہونے کے لحاظ سے خداوندتعالیٰ کی مشینری تک رسائی نہیں۔

جابر نے پوچھا کیا آپ نے خلقت کے بارے میں جس نظریئے کا اظہار کیا ہے اس کے علاوہ کوئی دوسرا نظریہ پیش کرسکتے ہیں ؟ امام جعفر صادقؑ نے منفی جواب دیا اور کہا میں جس چیز پر ایمان رکھتا ہوں اس سے انکار نہیں کرسکتا۔ یہ میرا ایمان ہے اور اس میں مجھے کوئی شک و شبہ نہیں۔ اگر تمہارے بقول کائنات اور انسان کی تخلیق کا سبب اس کے علاوہ کچھ اور ہو تو چونکہ وہ اسرار الٰہی سے ہے لہٰذا مجھے اس کی کوئی اطلاع نہیں۔

جابر نے پوچھا موت کے بارے میں آپ کا کیا نظریہ ہے ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا موت کا مفہوم بالکل ختم ہوجانا نہیں بلکہ اس کا مفہوم ایک حالت کی تبدیلی ہے اور صرف ایک ہستی کائنات میں حالت تبدیل نہیں کرتی اور وہ خدا ہے۔ اپنے علاوہ وہ تمام چیزوں کی حالت تبدیل کرتا ہے۔

جابر نے پوچھا کیا آپ موت کو تکلیف دہ سمجھتے ہیں ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا نہیں اے جابر ! موت تکلیف دہ نہیں ہے۔

جابر نے پوچھا پس انسان بیماری وغیرہ کے درد سے کیوں تکلیف اٹھاتا ہے اور چوٹیں و زخم' درد کا سبب کیوں بنتے ہیں ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا' یہ تمام درد زندگی سے متعلق ہیں اور آدمی جس وقت تک زندہ ہے بیماری یا چوٹ وغیرہ کے نتیجے میں تکالیف اٹھاتا ہے اور جس لمحہ روح جسم سے جدا ہوتی ہے اور موت آ پہنچتی ہے تو انسان موت کا درد محسوس نہیں کرتا۔

## ستاروں کے بارے میں جابر کے استفسارات

جابر نے امام جعفر صادقؑ سے پوچھا' یہ روشن ستارے جو مسلسل متحرک ہیں اور ان میں بعض کو ہم معین فاصلوں تک دیکھتے ہیں یہ کیا ہیں ؟ اور کیوں' حتیٰ کہ ایک دن کے لئے ہی سہی رکتے نہیں ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا آسمان کا ہر ستارہ ایک دنیا ہے اور ان سب ستاروں کے مجموعے سے ایک بڑا جہان تشکیل پاتا ہے۔

ستاروں کی دائمی حرکت اس لئے ہے تاکہ یہ سقوط نہ کریں اور گر نہ پڑیں اور دنیا کا ڈسپلن ختم نہ ہو جائے اور یہ حرکت وہی حرکت ہے جس سے زندگی وجود میں آتی ہے' یا یہ کہ خود حرکت زندگی ہے اور جب حرکت رک جاتی ہے تو زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن خداوند تعالیٰ نے اس طرح ترتیب دیا ہے کہ حرکت کسی وقت بھی نہیں رکتی یہ ہمیشہ زندہ رہتی ہے اور زندگی کی بقا بھی مخلوقات کے فائدے میں ہے جو خداوند تعالیٰ کے کرم ہی سے جاری وساری رہتی ہے۔

خداوند تعالیٰ بے نیاز ہے اسے اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ کائنات میں مسلسل حرکت ہوتی رہے اور اس

کے نتیجے میں زندگی موجود رہے۔ حرکت اور اس کے نتیجے میں زندگی ایک نعمت ہے جو خداوند تعالیٰ کی طرف سے مخلوقات کو عطا کی گئی ہے اور جب تک خداوند تعالیٰ نے مقرر کر دیا ہے حرکت اور زندگی جاری رہے گی۔ جابر نے پوچھا' خلا میں ستاروں کی شکل کیسی ہے ؟ امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا' آسمان کے بعض ستارے جامد اجرام ہیں اور بعض دوسرے مائع اجرام ہیں اور آسمانی ستاروں کا ایک حصہ بخارات سے وجود میں آیا ہے۔

جابر بن حیان نے تعجب سے پوچھا' یہ بات کس طرح قبول کی جا سکتی ہے کہ آسمان کے ستارے بخارات سے وجود میں آئے ہوں۔ کیا یہ بات ممکن ہے کہ بخارات اس قدر چمکیلے ہوں جس طرح رات کو یہ ستارے چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا' تمام ستارے بخارات سے تشکیل نہیں پاتے۔ لیکن وہ ستارے جو بخارات سے تشکیل پاتے ہیں' گرم ہیں اور ان کی زیادہ گرمی ان کی چمک کا سبب ہے اور میرا خیال ہے کہ سورج بھی بخارات سے بنا ہے۔

جابر نے پوچھا' ستاروں کی حرکت کیسے ان کے سکون میں مانع ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا' تم نے ایک چرخی کو جس میں پتھر ہو کبھی گھمایا ہے ؟ جابر نے مثبت جواب دیا' امام جعفر صادقؑ نے اظہار خیال کیا' کیا چرخی کو گھمانے کے دوران اچانک ساکن کیا ہے ؟

جابر نے جواب دیا' میں نے ساکن نہیں کیا۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا اگر پھر کبھی چرخی کو گھماؤ تو ایک مرتبہ اسے روکنا تاکہ پتا چل سکے کہ کیا ہوتا ہے اور چرخی کے رکنے کے بعد وہ گر پڑتی ہے۔ جو پتھر اس میں لگا ہوتا ہے وہ زمین پر گر پڑتا ہے اور یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ اگر ستارے مسلسل حرکت نہ کر رہے ہوں تو سقوط کر جائیں۔

جابر نے کہا' آپ نے فرمایا ہے کہ ستاروں میں سے ہر ایک' ایک دنیا ہے۔

امام جعفر صادقؑ نے تصدیق فرمائی' جابر نے پوچھا' کیا انسان ان جہانوں میں ہمارے جہان کی مانند موجود ہے ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا' انسان کے بارے میں' میں تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس دنیا کے علاوہ دوسرے جہانوں میں بھی موجود ہے یا نہیں ؟ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ دوسرے ستاروں میں مخلوقات موجود ہیں اور ان ستاروں کے دور ہونے کی بنا پر ہم ان مخلوقات کو نہیں دیکھ پا رہے۔

جابر نے پوچھا' آپ کے پاس کیا دلیل ہے کہ دوسرے ستاروں میں مخلوق موجود ہے ؟

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا' اللہ تعالیٰ کے بقول' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں انسان کے ذکر کے ساتھ جن کا ذکر بھی کیا ہے اور جن ایسی مخلوق ہے جو دیکھی نہیں جا سکتی۔ یعنی ہم انہیں نہیں دیکھ پاتے۔ وگرنہ خداوند تعالیٰ سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں وہ تمام مخلوقات کو دیکھتا ہے اور جن جو شاید دوسرے جہانوں میں رہ رہے ہیں ہم انسانوں کی مانند ہیں یا ہم سے برتر انسانوں جیسے ہیں۔ جابر نے پوچھا ہم سے برتر انسانوں سے آپ کی کیا مراد ہے

؟ امام جعفر صادقؒ نے فرمایا' شاید وہ ایسے انسان ہیں جو ہماری جیسی دنیا میں زندگی گزارنے کے بعد بہتر دنیا میں منتقل ہو گئے ہیں اسی طرح جیسے اگر ہم نیکوکار ہوئے تو موت کے بعد اس دنیا سے اچھی دنیا میں منتقل ہوں گے۔

جابر نے پوچھا' اس طرح تو ہم موت کے بعد زندہ ہونے کے بعد ان ستاروں میں سے کسی ایک میں زندگی گزاریں گے جنہیں ہم راتوں کو دیکھتے ہیں۔

امام جعفر صادقؒ نے فرمایا' میں تمہیں نہیں بتا سکتا کہ موت کی نیند سے بیدار ہونے کے بعد ہماری جگہ کہاں ہوگی اور شاید ہماری جگہ اس دنیا میں ہو جس میں ہم رہ رہے ہیں اور خدا کے لئے کچھ مشکل نہیں کہ وہ اسی دنیا میں نیکوکار بندوں کے لئے جنت اور گنہگاروں کے لئے دوزخ وجود میں لائے یا یہ کہ انسان کے موت سے بیدار ہونے کے بعد اسے دوسرے جہان میں جگہ دے۔

جابر نے کہا کیا خداوند تعالیٰ کو علم ہے کہ موت سے بیدار ہونے کے بعد آئندہ ہمارا ٹھکانہ کہاں ہے ؟ یا یہ کہ ہمیں زندہ کرنے کے بعد فیصلہ کرے گا کہ کونسی جگہ میں نیکوکاروں کو رکھے اور کونسی جگہ گنہگاروں کے لئے مخصوص کرے۔

امام جعفر صادقؒ نے جواب دیا' خداوند تعالیٰ ازلی اور ابدی ہے (یعنی نہ تو وجود میں آیا اور نہ اس کی انتہا ہے) وہ دانا اور توانائے مطلق ہے اس کے لئے ماضی اور مستقبل نہیں ہے جو کچھ گزر چکا ہے اور جو کچھ ہونا ہے اس پر واضح ہے۔

کائنات میں کوئی ایسا واقعہ نہیں جس سے خداوند تعالیٰ پہلے سے مطلع نہ ہو اور اس کا حکم صادر نہ کر چکا ہو کہ وہ واقعہ فلاں معین وقت میں وقوع پذیر ہوگا۔

اگر ایسا ہوتا کہ کائنات میں دور مستقبل میں ایک ایسا واقعہ رونما ہونا ہوتا جس کے انعقاد کا خداوند تعالیٰ کو علم نہ ہوتا تو خداوند تعالیٰ کا وجود نہ ہوتا اور وہ پھر خدا نہ کہلاتا بلکہ وہ واقعہ جو خداوند تعالیٰ کی پیش گوئی اور اس کے عرفان کے بغیر وقوع پذیر ہوتا وہ خدا کہلاتا چونکہ اس واقعے نے اپنے آپ کو خدا کے علم اور توانائی کے تسلط سے نجات دلائی ہے تو لامحالہ وہ خداوند تعالیٰ سے زیادہ عالم اور توانا ہے لہٰذا وہ خدا کہلانے کی صلاحیت رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ خداوند تعالیٰ انسان کی موت سے پہلے آگاہ ہے کہ وہ جب انسان کو دوبارہ زندہ کرے گا تو اس کو کہاں ٹھکانہ مہیا کرے گا۔ بلکہ پہلے لمحے ہی جب اس نے آدمؑ کو خلق کیا تھا تو وہ اس بات سے واقف تھا۔ جابر نے کہا یہ جو آپ فرما رہے ہیں اس نے مجھے ورطہ ء حیرت میں ڈال دیا ہے۔

امام جعفر صادقؒ نے فرمایا کس بات نے ؟ جابر نے کہا آپ فرماتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے پہلے ہی لمحے تمام چیزوں کی پیش گوئی کر دی ہے اور جو واقعات کائنات میں رونما ہونا تھے ان کے وقوع پذیر ہونے کا زمانہ معین کر دیا ہے۔ امام جعفر صادقؒ نے فرمایا' ازلی اور ابدی ہونے کے معنی بھی یہی ہیں اور دانا اور توانا ہونے کا

مطلب بھی یہی ہے۔

جابر نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اس وجہ سے خداوند تعالیٰ نے تمام چیزوں کی پیش گوئی کر دی ہے اور جو حکم صادر کرنا تھا' صادر کر دیا تو اس طرح اس نے ہر قسم کے فیصلے' اقدام اور جدید ارادے کو اپنے آپ سے چھین لیا ہے اور جب تک وہ ہے ہاتھ پر ہاتھ دھرا بیٹھا رہے گا۔ چونکہ اس کا کوئی کام نہیں جو کچھ اس نے کرنا تھا' کر دیا ہے اور جو پیشگوئی اس نے کرنا تھی' کر دی ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا' اے جابر تم نے مجھ سے ایسا سوال کر دیا جو انسانی فہم کے ادراک سے باہر ہے۔ چونکہ انسان خداوند تعالیٰ کے ازلی' ابدی اور دانائی و توانائی مطلق کے پہلو کو سمجھنے سے قاصر ہے اور ان حقائق سے آگاہ نہیں لہٰذا وہ اس وسوسے کا شکار ہو جاتا ہے۔ کہ چونکہ خداوند تعالیٰ نے تمام چیزوں کی پیش گوئی کر دی اور جو کچھ انجام دینا تھا انجام دے دیا ہے' اس بنا پر لامحدود وسعت اور ابدی موجودگی کے باوجود اس کے پاس کرنے کے لئے کوئی کام نہیں۔ اے جابر کیا تم سوچ سکتے ہو کہ خداوند تعالیٰ کے ازلی اور ابدی ہونے کی مدت کتنی ہے ؟

جابر نے کہا' کیا دس ہزار سال سے زیادہ ہے ؟ امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا ہاں اے جابر' جابر نے پوچھا کیا پچاس ہزار سال سے بھی زیادہ ؟

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا' ہاں اے جابر۔ جابر نے پوچھا کیا ایک لاکھ پچاس ہزار سال سے زیادہ ؟ امام جعفر صادقؑ نے مثبت جواب دیا۔ جابر نے کہا' میری سوچ اس سے زیادہ آگے نہیں جاتی۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا' اے جابر تو ایک لاکھ پچاس ہزار سال سے بھی بڑی رقم بول سکتا ہے' تو ابد اور ازل کے درمیانی فاصلے کا اپنی فطری قوت سے اندازہ لگا سکتا ہے لیکن میں اس بات کی تصدیق کرتا ہوں کہ جب ازلی اور ابدی کی گفتگو ہوتی ہے تو انسانی سوچ اس بات کو درک نہیں کر سکتی کہ ازل کب سے شروع ہوا ہے اور ابد کب تک جاری رہے گا۔ ازل کی ابتدا اور ابد کی انتہا کے درمیانی فاصلے کا حساب لگانا انسانی فکر اور حساب کی قوت کے بس کا روگ نہیں۔ میں تمہیں اتنا ہی بتاتا ہوں کہ اگر میں اور تم مزید ایک سو سال تک زندہ رہتے اور اس تمام عرصے میں ہر لمحے سالوں کی تعداد دوگنا بڑھاتے جاتے پھر بھی ایک سو سال بعد جو عدد ہمیں میسر آتا وہ ازل کے آغاز اور ابد کی انتہا کے درمیانی فاصلے سے کم ہوتا۔

جابر نے کہا' کیا اس تمام عرصے میں خداوند تعالیٰ جس نے تمام کاموں کو انجام دے دیا ہے اس کا کوئی کام نہیں اور اس نے اپنے آپ کو بیکاری کا شکار بنا لیا ہے ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا' اے جابر' میں نے جو تم سے کہا ہے کہ ازل اور ابد کے درمیانی فاصلے کو اپنی قوت فکر سے ناپو' اور اپنی قوت فکر سے اس کا تعین کرو اس سے میری مراد کچھ اور تھی۔

جابر نے پوچھا' کیا کہنا چاہتے تھے ؟

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا' میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ طویل عرصہ جو ازل کے آغاز اور ابد کی انتہا کے درمیان موجود ہے ہم اس کا تعین ایک سو سال کے حساب کرنے اور اعداد کو بڑھاتے جانے سے بھی نہیں کر سکتے۔ حالانکہ یہ خداوند تعالیٰ کے لئے ایک لمحہ ہے۔

جابر اس بات سے حیران ہوگیا۔ امام جعفر صادقؑ نے پوچھا' کیا جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے سمجھ رہے ہو ؟

جابر نے کہا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جو فاصلہ ازل اور ابد کے درمیان ہے خداوند تعالیٰ کے لئے ایک لمحہ ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا' ہاں میں یہی کہنا چاہتا ہوں اور یہ اس لئے خداوند تعالیٰ کے لئے ایک لمحہ ہے کہ وہ زمانے کے گزرنے کا تابع نہیں اور چونکہ ہم بھی موت کے بعد زمانے کے گزرنے کے تابع نہیں ہوں گے لہٰذا زمانے کے گزرنے کا احساس نہیں کریں گے۔اور اگر خداوند تعالیٰ ہزار سال یا دس ہزار سال بعد ہمیں زندہ کرے گا تو ہم نیند سے بیدار ہونے کے بعد یہی خیال کریں گے کہ ایک لمحہ سوئے رہے۔ کیونکہ موت کی حالت میں زمانے کے گزرنے کا احساس نہیں ہوگا۔اس بنا پر تمہارا یہ اعتراض درست ہے جو اس امر پر مبنی ہے کہ چونکہ خداوند تعالیٰ نے جو کام کرنا تھا کر دیا ہے تو جب تک وہ موجود رہے گا اس نے اپنے آپ کو بیکاری میں مبتلا کر دیا ہے اور جو کچھ تمہاری اور میری نظر میں لاکھوں سال کا زمانہ ہے (یہ میں اس لئے کہتا ہوں کہ عدد کا ذکر ضروری ہے ورنہ ازل اور ابد کے درمیانی فاصلے کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا) خداوند تعالیٰ کے لئے ایک لمحہ ہے اور وہ اس لمحے میں بھی کام میں مشغول اور جاوداں ہے۔ ایک ایسا وجود جو ازلی اور ابدی ہے اس کے لئے کام کا مسئلہ کام کی مانند ہمارے لئے واضح نہیں ہے ہماری زندگی میں کام کا مسئلہ روحانی یا مادی ضرورت کے پیش نظر ہے۔

بنی نوع انسان کو اپنے اخراجات پورے کرنے کے لئے کام کرنا پڑتا ہے اور اگر اس لحاظ سے اسے کام کرنے کی ضرورت نہ ہو تو روحانی ضرورت کے تحت اسے علم حاصل کرنے کے لئے کام کرنا پڑتا ہے اور اس بات سے آگاہ ہے کہ اگر مکمل طور پر بیکار ہو جائے تو اس قدر تنگ آجائے کہ اس کے لئے زندگی گزارنا مشکل ہو جائے یہی اندیشہ ہے جو امراء کو شکار کھیلنے پر مجبور کرتا ہے کیونکہ ان کی بیکاری انہیں زندگی سے اس قدر بیزار کر سکتی ہے کہ وہ زندگی سے سیر ہو جائیں۔ لیکن وہ لوگ جو تلاش معاش کے لئے سرگرم رہتے ہیں یا تحصیل علم میں مشغول رہتے ہیں ہرگز بیکاری کا شکار نہیں ہوتے۔خالق کائنات ازلی و ابدی' دانا اور توانائے مطلق ہونے کے لحاظ سے اس طرح کی کسی ضرورت کا محتاج نہیں ہے اگر کوئی کہے کہ خداوند تعالیٰ کو کسی چیز کی ضرورت ہے تو یہ کفر ہے اور اگر کبھی خدا کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو وہ خدا نہیں ہے پھر جس چیز کی اسے ضرورت ہوگی وہ اس کی جگہ لے کر خدا ہو جائے گی۔

پس اے جابر' جب ہم خداوند تعالیٰ کے کام کرنے کے بارے میں بات کرتے ہیں تو ہم اسے اپنی عقل کی حدود میں محدود کر دیتے ہیں اور اپنی عقل کی جانب سے اس کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہیں۔ خداوند تعالیٰ کا کام کرنا' ہمارے کام کرنے کی مانند نہیں ہے وہ جو دانا و توانائے مطلق اور ازلی و ابدی ہے' اس کا کام کرنا ہمارے کام کرنے کی مانند نہیں ہے کیونکہ ہمارے تمام کام جس صورت میں بھی ہوں ضرورت کے تحت ہیں۔ ہمارا ایسا کوئی کام نہیں جو مادی یا روحانی ضرورت کے پیش نظر نہ ہو۔ چونکہ ہماری عقل اس بات کو نہیں سمجھ سکتی کہ خداوند تعالیٰ کے کام کس نوعیت کے ہیں تو ناگزیر اس کے کاموں کو انسانی کام کی مانند خیال کرتے ہیں اور چونکہ آدمی کام ختم ہونے کے بعد اگر ایک لمبی مدت بیکار پڑا رہے تو بیمار پڑ جاتا ہے اور تمہارا خیال ہے چونکہ خداوند تعالیٰ نے تمام کام انجام دے دیئے ہیں لہٰذا اب وہ بیکار رہ رہ کر بیمار پڑ جائے گا۔

جابر نے کہا' ہم موت کے بعد خداوند تعالیٰ کو آج سے بہتر طور پر پہچان سکیں گے ؟

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا' مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ موت کے بعد انسان جب زندہ ہو گا تو آج سے بہتر کامل انسان بن چکا ہو گا۔ کیونکہ جیسا کہ ہم نے کہا کہ خداوند تعالیٰ جو بڑی عظمت و کرم کا مالک ہے۔ بنی نوع انسان کو اس لئے نہیں مارتا کہ اس کی زندگی کو بدتر بنائے بلکہ موت بنی نوع انسان کی تکمیل کے مراحل میں سے ایک اور اونچے مرحلے تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔

جابر نے پوچھا کیا موت کے بعد ہم خدا کو دیکھ سکیں گے ؟ مجھے معلوم ہے کہ موسیٰؑ نے کوہ طور پر خداوند تعالیٰ سے چاہا کہ اسے دیکھے اور خدا نے اس کے جواب میں فرمایا' اے موسیٰ تم مجھے نہیں دیکھ سکو گے۔ لیکن ہم مسلمان ہیں اور ہمیں دوسری قوموں پر فضیلت حاصل ہے کیا اس فضیلت کے باوجود خداوند تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکیں گے ؟

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا نہیں اے جابر' موت کے بعد اس کے باوجود کہ ہم مسلمان ہیں خدا کو نہیں دیکھ سکیں گے کیونکہ خدا کا جسم نہیں کہ ہم اسے دیکھ سکیں ہماری آنکھیں ایسی چیز کو نہیں دیکھ سکتیں جس کا جسم نہ ہو اور جس پر روشنی نہ پڑتی ہو۔ ہماری آنکھیں حتیٰ کہ تاریکی میں بھی چیزوں کو دیکھنے پر قادر نہیں تو تم کس طرح اس بات کے امیدوار ہو کہ انہی آنکھوں سے خداوند تعالیٰ کو دیکھ سکو گے جس کا جسم نہیں ہے۔ لیکن اگر خداوند تعالیٰ کو دیکھنے سے مراد اسے دل کی آنکھوں سے دیکھنا ہے یعنی خدا کی معرفت' تو اس طرح تم موت سے قبل بھی اس کو اس دنیا میں دیکھ سکتے ہو۔

جابر نے کہا' میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ خداوند تعالیٰ کیوں اپنے آپ کو مخلوقات کو نہیں دکھانا چاہتا۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا' یہ اس کی اپنی مشیت ہے اور ہم اس ضمن میں اظہار خیال نہیں کر سکتے اور نہ ہی یہ کہہ سکتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ کیوں اپنے آپ کو مخلوقات کو نہیں دکھاتا۔ لیکن چونکہ ہم خدا کو نہیں دیکھتے

لہٰذا اس کو دیکھنے کی بڑی تڑپ رکھتے ہیں۔
جابر نے پوچھا' میں آپ کی بات نہیں سمجھ سکا' خدا کو نہ دیکھ سکنا' اس بات کا سبب ہے کہ ہم اس کے دیکھنے کی تڑپ رکھتے ہیں۔ امام جعفر صادقؑ نے وضاحت فرمائی' اگر ہم خدا کو دیکھ سکتے تو چونکہ ہم اسے محدود کرتے اور اس کی ہستی تک پہنچ جاتے تو اس سے مایوس ہو جاتے۔
جابر نے سوال کیا' اگر اسے دیکھتے تو محدود کر دیتے ؟
امام جعفر صادقؑ نے مثبت جواب دیا اور فرمایا اجسام کو دیکھنا انہیں محدود کرنا ہے اور اگر انہیں محدود نہ کریں تو انہیں چاروں اطراف سے نہیں دیکھ سکتے۔ حتیٰ کہ اگر خدا کی ہستی کی معرفت حاصل نہ بھی کر سکیں تو بھی جتنا اسے دیکھ لیں گے اتنا ہی اس سے مایوس ہو جائیں گے۔ کیونکہ اسے محدود کریں گے اور چونکہ وہ ہماری طرف سے محدود ہو جائے گا اور مزید اسے لامحدود نہیں سمجھیں گے اس طرح ہم آخری نجات کے لحاظ سے اس سے مایوسی کا شکار ہو جائیں گے اگرچہ اس وقت تک اس کی ہستی کی معرفت حاصل نہیں کر سکیں گے۔ چونکہ ہم سوچیں گے کہ خدا خود محدود ہے اور اس نے ہمیں بھی محدود خلق کیا ہے اور ہم ہمیشہ کی زندگی اور سرمدی نجات کے امیدوار نہیں ہو سکیں گے اور سوچیں گے کہ جو خدا محدود ہے ہمیں کیسے لامحدود پیدا کر سکتا ہے۔ کیونکہ محدود خالق لا محدود مخلوق کو خلق کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اگر خدا کو دیکھنے کے بعد اس کی ہستی کی معرفت حاصل کریں تو زیادہ مایوس ہو جائیں گے۔ جابر نے پوچھا ہمیں کونسی چیز خدا کی ہستی کی معرفت حاصل کرنے کے بعد زیادہ مایوس کرے گی ؟
امام جعفر صادقؑ نے فرمایا جب ہم اس کی ہستی کی معرفت حاصل کر لیں گے اور جیسا وہ ہے ایسے اسے پہچان لیں گے تو وہ ہماری نظر میں چھوٹا ہو جائے گا۔ چونکہ ہم ان دیکھے اور واحد خدا کے بارے میں بلند سوچ رکھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ وہ اس قدر بڑا ہے کہ اگر ہماری موجودہ عقل کئی گنازیادہ طاقتور بھی ہو جائے تو پھر بھی ہم اس کی معرفت حاصل نہیں کر سکتے۔ یہ موضوع ہمیں امیدوار اور متلاشی رکھتا ہے اور ہمیں امید بندھی رہتی ہے کہ خداوند تعالیٰ جو لامحدود اور بے پایاں ہے اس نے ہمیں ہمیشہ کی زندگی کے لئے پیدا کیا ہے اور چونکہ توانا اور بے نیاز ہے اسے مخلوق سے کوئی حاجت نہیں اور ہمیں صرف اپنے کرم کی رو سے پیدا کیا ہے۔ لہٰذا ہمیں ہمیشہ کی سعادت عطا فرمائے گا۔ لیکن جب ہم خدا کی ہستی کی معرفت حاصل کر لیں گے تو اپنے آپ سے کہیں گے کہ خدا اتنا چھوٹا ہے کہ ہماری چھوٹی سی اور محدود عقل میں سما گیا ہے۔ یہ باتیں جو میں تمہیں بتا رہا ہوں' اصول دین کی رو سے نہیں بلکہ فلسفے کی رو سے بتا رہا ہوں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر تم مسلمان نہ ہو تو اس بات کو نہیں سمجھ سکتے کہ ہمارا خداوند تعالیٰ کو نہ دیکھنا اسے دیکھنے سے بہتر ہے کیونکہ اگر اسے دیکھ کر فضا میں محدود کر لیں گے تو وہ روحانی لحاظ سے بھی ہماری نظر میں محدود ہو جائے گا۔ پس بہتر یہی ہے کہ ہم اسے نہ

دیکھیں۔

جابر نے کہا، میں آپ کے اس فرمان سے متفق نہیں ہوں اور میرا خیال ہے جب ہم خدا کی ہستی کا کھوج لگا لیں گے تو وہ روحانی لحاظ سے ہماری نظر میں بڑا ہو جائے گا اور میرے اس قول کی میرے پاس دلیل بھی ہے۔ میری دلیل یہ ہے کہ جس وقت میں شہر کے بازار میں ایک شخص کو گزرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو میری نظر میں دوسرے راہگیروں سے مختلف نہیں ہوتا، ممکن ہے وہ اپنے دائیں یا بائیں طرف سے گزرنے والے لوگوں سے زیادہ بلند قامت اور موٹا ہو لیکن میری نظر میں روحانی لحاظ سے وہ دوسرے لوگوں سے مختلف نہیں ہے۔ لیکن اگر میں اس شخص کو محفل میں دیکھتا ہوں اور مجھے پتہ چلے کہ وہ فقیہ ہے تو میں اس کے قریب جا کر اس سے فقہ کا مسئلہ دریافت کروں گا، یوں جب میں نے اس کی گفتگو سنی اور میں سمجھ گیا کہ وہ شخص عالم ہے تو میں اس کی شخصیت تک رسائی حاصل کروں گا تو پھر وہ شخص میری نظر میں پہلے سے کہیں عظیم ہو جائے گا۔ جب کبھی میں تیسرے، چوتھے، پانچویں اور چھٹے دن اس کے ہاں جاؤں گا اور ہر دن اس سے مسئلہ دریافت کروں گا اور وہ مجھے جواب دے گا تو میں اس کا زیادہ احترام کرنے لگ جاؤں گا کیونکہ میں سمجھ جاؤں گا کہ وہ شخص عالم ہے۔ اس بنا پر اگر ہم خدا کی ہستی کی کماحقہ معرفت حاصل کر لیں گے تو ہماری نظر میں اس کے احترام کا احساس زیادہ بڑھ جائے گا۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا، وہ شخص جس کے پاس تم ہر روز جا کر اس سے مسئلہ دریافت کرو گے وہ تمہارے جیسا انسان ہو گا، اگرچہ اس کی فہم و فراست تمہاری فہم و فراست سے زیادہ ہو گی لیکن اس کی فہم و عقل ایک انسان کی فہم و عقل سے زیادہ نہیں ہو گی اور تمہارے مسائل کا جواب دینا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ دوسرے تمام انسانوں سے برتر ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔ اسی شخص کو اگر تم قفل ساز کے پاس لے جاؤ اور تالا بنانے کے اوزار اس کے ہاتھ میں دے دو اور اسے کہو کہ تمہارے لئے ایک تالا بنا دے تو وہ یہ کام نہیں کر سکے گا۔ چونکہ جو کچھ اس نے سیکھا ہے اس کا تعلق فقہ سے ہے، قفل سازی سے نہیں ہے۔ اس شخص کو تم تالا سازی کی دکان سے پنیر و دودھ وغیرہ بیچنے والے کی دکان پر لے جاؤ اور اس سے کہو کہ پنیر بیچ تو تم دیکھو گے کہ وہ پنیر بیچنے کے کام سے عہدہ برآ نہیں ہو سکے گا کیونکہ اس نے ہرگز ایسے کام نہیں کئے اور فقہ کے علاوہ کوئی چیز نہیں سیکھی۔ تم اس کے احترام کے قائل اس لئے ہوئے کہ اس کے علم کو سمجھ سکتے ہو جب کہ تمہاری فہم اور علم کا میزان محدود ہے لیکن اس قدر وسیع اور توانا ہے کہ تم ایک فقیہ کے علم تک رسائی حاصل کر سکتے ہو۔ جابر نے کہا، بہر حال جب میں اس کی ہستی سے متعارف ہو جاؤں گا تو میرے نزدیک زیادہ محترم ہو جائے گا اور جتنا زیادہ میں اس کی ہستی کی معرفت حاصل کروں گا اتنا ہی زیادہ اس کا احترام کروں گا۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا، بنی نوع انسان کے باہمی روابط کے لحاظ سے یہ موضوع حقیقت پر مبنی ہے۔ لیکن انسان اور خدا کے

درمیان اس موضوع کی کوئی حقیقت نہیں اور اگر بنی نوع انسان خدا کی ہستی تک رسائی حاصل کرلے تو وہ مزید خدا کا احترام نہیں کرے گا کیونکہ وہ اس کی نظروں میں چھوٹا نظر آئے گا اور وہ اپنے آپ سے کہے گا کہ اس کے باوجود کہ میں محدود فہم و عقل رکھتا ہوں' تب بھی میں نے خدا تک رسائی حاصل کرلی ہے تو لامحالہ خدا محدود ہے' وگرنہ میں اس محدود عقل و فہم کے ساتھ ہرگز خداوند تعالی کی ہستی تک رسائی حاصل نہ کرسکتا۔ یہ بات میں دلیل کے طور پر کہتا ہوں وگرنہ بنی نوع انسان خداوند تعالی کی ہستی تک رسائی حاصل نہیں کرسکتا کیونکہ ایک ایسی ہستی جو ازلی ابدی اور لا محدود ہے اس کی معرفت حاصل کرنا ممکن نہیں۔ لیکن اگر بفرض محال' ایک دن بنی نوع انسان خدا کی ہستی تک رسائی حاصل کرلے تو خداوند تعالی کی ہستی اس کی نظر میں اس قدر چھوٹی ہو جائے گی کہ اسے عام انسانوں میں شمار کرلیا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ میں کہتا ہوں' خدا کو نہ دیکھ سکنا ایک ایسا موثر عامل ہے جس کی وجہ سے ہم خدا کی معرفت سے ابدی نجات کے امیدوار ہوتے ہیں وگرنہ اگر ہم اس کی حدود تک رسائی حاصل کرکے اس کی ہستی کو پالیں تو وہ ہماری نظر میں محدود ہو جائے گا اور اس طرح ہم اسے عام انسانوں کی صف میں لے آئیں گے اور یہ بات میں فلسفے کی رو سے کہتا ہوں نہ اصول دین کے مطابق چونکہ مسلمانوں کو اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمیشہ کی نجات حاصل ہو کر رہے گی۔

## عہد پیری کا سوال

جابر نے پوچھا' آدمی بوڑھا ہونے کے بعد منکسرالمزاج کیوں ہو جاتا ہے ؟

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا یہ کوئی کلیہ قاعدہ نہیں ہے ہر بوڑھا ہو جانے والا شخص منکسرالمزاج نہیں ہوتا' کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو جوانی میں منکسرالمزاج ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی جوانی کی نشاط اور طراوت ان کے انکسار کو اچھی طرح دوسروں کی نظر تک پہنچانے میں رکاوٹ ہوتے ہیں۔ یہی لوگ بڑھاپے میں منکسرالمزاج دکھائی دیتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی جوانی کی نشاط و طراوت ان کے انکسار کو مزید نہیں چھپا سکتے۔

لیکن جو مرد یا عورت جوانی میں عاقل' مطلع اور پرہیزگار ہوتے ہیں' بڑھاپے میں بھی وہ مرد یا عورت عاقل' مطلع اور پرہیزگار ہوتے ہیں' مطلب یہ ہے کہ جسمانی طاقت کے لحاظ سے جوانی' بڑھاپے کی مانند نہیں ہے۔ بڑھاپے میں علما کا طبقہ جوانی کے زمانے کی نسبت زیادہ عاقل' مطلع اور عقلمند دکھائی دیتا ہے چونکہ جو توشہ وہ جوانی میں حاصل کرتے ہیں کم ہوتا ہے اور جوں جوں ان کی عمر بڑھتی جاتی ہے اس توشے میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور ان کی عقل مزید طاقتور ہو جاتی ہے اور وہ بے لوث ہو کر عدل قائم کرتے ہیں انہیں اس بات کا علم ہوتا ہے کہ انہیں ہمیشہ حقیقت کا حامی ہونا چاہیے۔

جابر نے کہا' میں نے سنا ہے کہ بڑھاپا نسیان پیدا کرتا ہے اور کیا یہ موضوع کلی قاعدہ ہے ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا نہ اے جابر' جو چیز نسیان وجود میں لاتی ہے وہ حافظے کی طاقت کا عدم استعمال ہے۔ حافظے کی قوت کو دوسری انسانی قوتوں کی مانند کام میں لاتے رہنا چاہئے تاکہ زائل نہ ہو۔ اگر ایک جوان بھی اپنی قوت حافظہ کو کام میں نہ لائے تو وہ بھی نسیان کا شکار ہو جائے گا۔ لیکن بعض عمر رسیدہ اشخاص اس لئے فراموشی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ جسمانی طاقت کی کمزوری کے نتیجے میں ان کی توجہ ان کے ماحول کی نسبت جس میں وہ زندگی گزار رہے ہوتے ہیں' کم ہو جاتی ہے اور حتیٰ کہ ان کی توجہ ان کے نواسوں و پوتوں وغیرہ کی نسبت بھی کم ہو جاتی ہے اور جب ان کے نواسے و پوتے وغیرہ بڑے ہو جاتے ہیں تو انہیں بھی نہیں پہچانتے۔ جسمانی قوت جتنی کمزور ہوگی ان کی اپنے ماحول جس میں وہ رہ رہے ہوتے ہیں کی جانب توجہ اتنی ہی زیادہ کم ہو جائے گی پھر وہ گھر سے نکلنا پسند نہیں کرتے اور سفر نہیں کرنا چاہتے حتیٰ کہ بڑے اور ناگہانی واقعات کی طرف بھی متوجہ نہیں ہوتے۔اسی لئے ان کا حافظہ (۴۲) مزید استعمال نہیں ہوتا' اور جمود کا شکار ہو جاتا ہے اور یہ جمود اس بات کا باعث بنتا ہے کہ پہلے تو ان کے حافظہ میں کسی چیز کا اضافہ نہیں ہوتا اور دوسرا ان کے حافظے کے ذخائر کا تمام یا کچھ حصہ فراموشی کے سپرد ہو جاتا ہے۔

جس کے نتیجے میں عمر رسیدہ مرد یا عورت نہ صرف یہ کہ جو کچھ اس کے زمانے میں وقوع پذیر ہوتا ہے اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا بلکہ جو کچھ وہ جانتا ہے اور اس کے حافظے میں ذخیرہ ہوتا ہے وہ بھی اسے بھول جاتا ہے لوگ جب ایک یا دو یا تین عمر رسیدہ آدمیوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنا حافظہ کھو چکے ہیں تو اسے ایک کلیہ قاعدہ سمجھ لیتے ہیں اور کہتے ہیں جو کوئی بوڑھا ہو جائے' فراموشی کا شکار ہو جاتا ہے۔ لیکن ایسے بوڑھے افراد جو جسمانی قوت کی کمزوری کے نتیجے میں اپنے حافظے کو جمود کا شکار نہیں ہونے دیتے ان کا حافظہ بڑھاپے میں ان کی جوانی کے دور سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے کیونکہ ان کا حافظہ تمام عمر کام میں مشغول رہتا ہے اور عمر کے آخری سالوں میں اپنی طاقت کے جوبن پر ہوتا ہے۔

جابر نے کہا میں نے کچھ عرصہ پہلے ایک ایسے شخص سے گفتگو کی جو اپنے آپ کو باخبر سمجھتا تھا کہنے لگا آدمؑ کے تمام فرزند' اپنے جد کے کیفر کا سامنا کرتے ہیں۔

میں نے اس سے پوچھا کہ اس بات کی کیا دلیل ہے کہ آدمؑ کے فرزند اپنے جد کے کیفر کا سامنا کرتے ہیں ؟ اس نے جواب میں کہا کہ خداوند تعالیٰ کے لئے ماضی اور مستقبل ایک ہی ہے اور جو کچھ ہے اس کے لئے زمانہ حال ہے چونکہ خداوند تعالیٰ کی نظر میں ابھی تک وہی دور ہے جب آدم وجود میں آئے تھے لہٰذا آدم اور فرزند کو یعنی ہمیں وہ آدم و حوا کے گناہ کی پاداش میں سزا دیتا ہے۔

امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا' اس شخص نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ خداوند تعالیٰ کے لئے زمانے کا

وجود معنی نہیں رکھتا تاکہ وہ شمول زمانہ ہو اگرچہ وہ زمانہ ہی کیوں نہ ہو اور شمول زمانہ ہونا مخلوق کی خصوصیات میں سے ہے نہ کہ خالق کی خصوصیات میں سے' اگر یہ شخص مسلمان ہوتا تو میں اسے کہتا کہ خداوند تعالی نے اپنے احکام میں نہایت صراحت سے بیان فرما دیا ہے کہ نیکوکاروں کو بہشت میں لے جائے گا اور گناہگاروں کو دوزخ میں جگہ دے گا۔ لیکن چونکہ مسلمان نہیں ہے (وگرنہ ایسی بات تم سے نہ کہتا) اس لئے اس کا جواب فلسفے کی رو سے دینا چاہئے۔ یہ شخص ایک لحاظ سے صحیح سمجھا ہے اور وہ یہ ہے کہ خداوند تعالی کے لئے ماضی اور مستقبل دونوں برابر ہیں لیکن یہ بات نہیں کہ اس کے لئے ماضی اور مستقبل کا وجود نہیں ہے یعنی وہ ماضی اور مستقبل کا استنباط نہیں کر سکتا' ماضی اور مستقبل کا شمول نہ ہونے اور ماضی اور مستقبل کو نہ سمجھ سکنے میں فرق ہے۔ میں مطلب کو مزید بہتر انداز میں سمجھانے کی خاطر مثال دیتا ہوں۔ کہ اگر تم زمین میں ہل چلاتے ہو اور زمین میں گندم کاشت کرتے ہو تو تمہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس گندم کا مستقبل کیا ہو گا لیکن تم خود اس غلے کے مشمول نہیں ہوگے۔ گندم کے وہ دانے جنہیں تم زمین میں کاشت کرتے ہو تمہیں معلوم نہیں کہ ان کا مستقبل کیا ہوگا۔ لیکن گندم کے ان دانوں کے مستقبل کے متعلق تم ہفتہ بہ ہفتہ مطلع ہو اور تمہیں معلوم ہے ہر ہفتے گندم کی کیفیت کیا ہوگی اور کس حد تک بڑھے گی اور کس وقت فصل کاٹنے کا وقت آ پہنچے گا۔ ہمارے استنباط کے مطابق خود گندم اپنے ماضی اور مستقبل سے آگاہ نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں (ہمارے استنباط کی بنا پر) چونکہ گندم باشعور ہے لیکن ہم اس کے کتنے اور کیسے ہونے سے مطلع نہیں ہیں اور اس طرح سوچتے ہیں کہ گندم اپنے ماضی اور مستقبل سے بے خبر ہے لیکن تم تو اس گندم کے کاشتکار ہو' اس کے ماضی اور مستقبل سے بخوبی مطلع ہو لیکن اس کے ماضی اور مستقبل کے شمول نہیں ہو۔ خداوند تعالی بھی ہمارے ماضی اور مستقبل کا شمول نہیں ہے وہ اس کائنات کے ماضی اور مستقبل کا بھی مشمول نہیں ہے لیکن اس کائنات اور تمام مخلوقات کے ماضی و مستقبل سے مطلع ہے۔ جس کسی نے تمہیں کہا ہے کہ خداوند تعالی صرف زمانہ حال کو دیکھ رہا ہے اس نے غلطی کی ہے اور اس نے خدا کو زمانہ حال میں محدود کردیا ہے یعنی اسے زمانہ حال کا شمول سمجھا ہے۔ جب کہ خداوند تعالی اس قدر بڑا ہے کہ زمانہ حال کا شمول ہونے سے مبرا ہے۔

اگر ہم کہیں کہ خداوند تعالی زمانہ حال کا شمول ہے یعنی زمانہ حال کے علاوہ اس کے لئے کوئی زمانہ نہیں ہے تو دین اسلام کی نظر میں یہ کلمہ کفر ہے اس شخص سے کہو کہ اگرچہ خداوند تعالی ماضی اور مستقبل کا شمول نہیں ہے لیکن ماضی اور مستقبل سے مطلع ہے اسے معلوم ہے کہ آدمی ماضی میں تھا اور گناہ کا مرتکب ہوا ہے تو وہ کیفر کردار تک پہنچا ہے اور اس کی سزا یہ تھی کہ اسے بہشت سے نکال دیا گیا۔ لیکن ہم' آدم اور حوا کے فرزند' اس کی نسبت سے مستقبل کا جزو ہیں اور خداوند تعالی ہمیں اپنے پہلے باپ کے جرم میں سزا نہیں دے گا۔ اس شخص سے کہو یہ اصل کہ خدا ماضی اور مستقبل کا شمول نہیں ہے اور یہ اصل کہ خداوند تعالی ماضی

اور مستقبل کی تشخیص نہیں دیتا ان دونوں میں غلط فہمی کا شکار نہ ہو۔

اور خداوند تعالٰی ہرگز ایک بیٹے کو باپ یا ماں کے گناہ کے جرم میں سزا نہیں دیتا اور اس کے بعد بھی کسی بیٹے کو اس کے والدین یا دونوں میں سے کسی ایک کے گناہ میں سزا نہیں دے گا۔ جابر نے پوچھا' پس یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ بیٹے اپنے والدین کے ناپسندیدہ اعمال کی سزا کا سامنا کرتے ہیں۔

امام جعفر صادقؒ نے جواب دیا اس موضوع اور خداوند تعالٰی کی طرف سے سزا دینے میں فرق ہے جب ماں یا باپ ایسے اعمال کے مرتکب ہوتے ہیں جن کے ارتکاب کی ممانعت ہے' تو یہ اعمال ان کے بیٹوں کی آئندہ زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

مثال کے طور پر شراب پینے کی ممانعت ہے اور جب باپ شراب نوشی کا عادی ہو تو جو بیٹے اس سے پیدا ہوں گے۔ ممکن ہے وہ ناقص العقل ہوں۔ ایک شرابی شخص کے بیٹوں کا احتمالاً" ناقص العقل ہونا خدائی سزا نہیں ہے بلکہ باپ کے عمل کا نتیجہ ہے جو شاید بیٹوں کو وراثت میں ملے اور انہیں ناقص العقل بنادے۔ یا یہ کہ ایک باپ ظلم کرے اور کچھ بے گناہ لوگوں کو قتل کردے تو جب وہ فوت ہوگا تو مقتولین کی اولاد قاتل کی اولاد سے قدرتی طور پر نفرت کرے گی اور اسے دوستانہ نگاہوں سے نہیں دیکھے گی' اس بات میں کسی بحث یا دلیل کی ضرورت نہیں۔

کیا مقتولین کے بیٹوں کا اس شخص کے بیٹوں سے اچھے تعلقات استوار نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ خداوند تعالٰی نے ظالم شخص کے بیٹوں کو سزا دی ہے ؟ ہرگز نہیں یہ باپ کے عمل کا نتیجہ ہے جو بیٹوں تک پہنچا ہے اور خداوند تعالٰی نہیں چاہتا تھا کہ ظالم شخص کے بیٹوں کو ایسے حالات پیش آئیں بلکہ خود اس نے اپنے بیٹوں کے لئے ایسے حالات پیدا کئے ہیں۔ جابر نے پوچھا' اس طرح تو خداوند تعالٰی کسی شخص کو اس کے والدین کے گناہوں کی پاداش میں سزا نہیں دے گا۔

خداوند تعالٰی اس سے کہیں زیادہ بڑا ہے کہ اس طرح کے نامعقول عمل کا مرتکب ہو اور بیٹوں کو ان کے گناہوں کے جرم میں سزا دے۔

جابر نے پوچھا' مجھے معلوم ہے کہ کن فیکون کے معنی کیا ہیں اور چونکہ میں مسلمان ہوں اس لئے میرا عقیدہ ہے کہ جونہی خداوند تعالٰی نے چاہا یہ کائنات وجود میں آگئی لیکن میں چاہتا ہوں کہ فلسفے کے لحاظ سے کن فیکون کے معنی سمجھوں تاکہ اگر اس موضوع کے بارے میں کسی غیر مسلم شخص سے گفتگو کروں تو اسے قائل کر سکوں۔

امام جعفر صادقؒ نے فرمایا تجھے فلسفے کی رو سے جواب دینے کے لئے ارادے کے بارے میں بات چیت کرنا ہے۔ ارادہ ایسی چیز ہے جس کا وجود ہے۔ اگر ایک توحید پرست سامع میرا مخاطب ہو تو اسے کہوں گا کہ ارادہ

خداوند تعالیٰ کی صفات ثبوتیہ کا جزو ہے۔ اسے کہوں گا کہ ارادہ خدا کی ذات کا جزو ہے کیونکہ خداوند تعالیٰ کی صفات اس کی ذات سے جدا نہیں ہیں۔ جب کہ انسان میں اس کی صفات' ذات سے جدا ہیں۔ اس طرح دنیا میں آنے والا بچہ دانا نہیں ہوتا اور دانائی اس کی ذات میں وجود نہیں رکھتی۔ اسے دانا بننے کے لئے ایک لمبی مدت تک علم حاصل کرنا پڑتا ہے پھر کہیں جاکر دانائی جو اس کی ذات میں موجود نہیں ہوتی اس کی ذات سے ملحق ہو جاتی ہے۔

کوئی صنعتکار پیدا ہوتے ہی صنعتکار نہیں ہوتا اور صنعت اس کی ذات میں موجود نہیں ہوتی اسے صنعت سیکھنے کے لئے ایک مدت تک استاد کے ہاں کام کرنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر صنعت سیکھتا ہے اور اس وقت صنعت اس کی ذات کا جزو بن جاتی ہے۔

لیکن خداوند تعالیٰ میں جتنی صفات موجود ہیں اس کی ذات کا جزو ہیں وہ پہلے ہی لمحے (اگر خداوند تعالیٰ کے متعلق پہلے اور آخری لمحے کی گفتگو کی جا سکے) دانا اور توانا تھا اور جو کچھ جانتا تھا اس کی ذات کا جزو شمار ہوتا تھا اور اس پر ہرگز کسی چیز کا اضافہ نہیں ہوگا اور کسی وقت اس سے کوئی چیز کم نہیں ہو گی۔

علم اور طاقت جو علم سے عبارت ہے خدا کی ذات کا جزو ہے۔ لیکن جو شخص توحید پرست نہیں ہے وہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتا اور مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ بت پرستی کا معتقد ہے اور ایک بت کی قدرت کا قائل ہے لیکن خدائے واحد کے علم اور قدرت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں البتہ یہ ہے کہ جیسا کہ تم جانتے ہو بت پرست بھی آخری مرحلے میں ایسی چیز کی پوجا کرتا ہے جو بت نہیں ہوتی چونکہ اسے معلوم ہے کہ اس کا بنایا ہوا یہ بت قدرت کا حامل نہیں ہے۔

میں ایک ایسے شخص سے جو موحد نہیں ہے اور خدائے واحد کا معتقد نہیں' کہتا ہوں کہ ارادہ بذاتہ موجود ہے اگر وہ اعتراض کرے اور کہے کہ ارادہ بذاتہ وجود نہیں رکھتا بلکہ اس کا وجود ہم سے وابستہ ہے اور اگر ہم نہ ہوں تو ارادہ بھی نہیں' تو میں اس سے کہتا ہوں کہ ارادہ ہمارے وجود کے بغیر وجود رکھتا ہے۔

چونکہ فلسفے کا ایک اصول' جسے تمام فلسفی تسلیم کرتے ہیں یہ ہے کہ جو چیز وجود رکھتی ہے فنا نہیں ہوتی لیکن ممکن ہے اس کی صورت تبدیل ہو جائے۔ اگر وہ کہے کہ ہماری موت کے بعد ارادہ ختم ہو جاتا ہے تو میں اس کے لئے مثال پیش کروں گا اور کہوں گا کہ ایک بڑا نالہ یا ایک نہر موجود ہے جس سے پانی مٹی کی نالی کے ذریعے گھر تک پہنچتا ہے۔ اگر مٹی کی نالی کا یہ جوڑ کاٹ دیا جائے تو پانی ہمارے گھر میں نہیں پہنچے گا۔

لیکن کیا مٹی کی نالی کے جوڑ کا کٹ جانا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ظلیج یا نہر جس کے ذریعے پانی ہمارے گھر تک آتا ہے سرے سے موجود ہی نہیں ؟

صاف ظاہر ہے ایسا نہیں اور وہ نہر یا مخزن اپنی جگہ موجود ہے۔ ہمارا وجود بھی ارادے کے لحاظ سے اس مٹی

کی نالی کے جوڑ سے مشابہ ہے' اور ہماری موت کے بعد ارادہ فنا نہیں ہوتا اور صرف مٹی کی نالی کا جوڑ کٹ گیا یا ختم ہو گیا ارادہ تو باقی ہے۔ میں اس غیر موحد شخص سے کہتا ہوں کہ ارادہ کائنات کا جوہر ہے اور کائنات ایک ایسا ارادہ ہے جو مشہود' محسوس اور ملموس صورت میں سامنے آیا ہے جس لمحے ارادہ نے محسوس صورت میں سامنے آنا چاہا' اس صورت میں سامنے آ گیا۔ ارادہ اور تخلیق جس سے محسوس و ملموس کائنات وجود میں آئی آپس میں اس قدر نزدیک ہیں کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔ اس میں کوئی حرج نہیں کہ اگر ارادے کا نام روح رکھ دیا جائے کیونکہ ارادے کی وضاحت اور محسوس و ملموس کائنات کی صورت میں اس سے جو تخلیق وجود میں آئی ہے۔ اس کی روح اور جسم میں کوئی فرق نہیں لیکن جو شخص موحد نہیں وہ ارادہ اور اس سے وجود میں آنے والی تخلیق کو قبول کرنے کی نسبت روح اور جسم کے قبول کرنے سے زیادہ آمادگی رکھتا ہے۔ یہ ارادہ اور اس سے وجود میں آنے والی محسوس و ملموس صورت میں تخلیق ہم میں بھی ہے اور ہمارا وہ ارادہ زندہ رہنے کے لئے اور وہ محسوس و ملموس وجود یعنی ہمارا جسم ہے اور جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ آدمی کے وجود میں زندہ رہنے کی طرف مائل ہونے سے زیادہ مضبوط ارادہ موجود نہیں ہے۔ میں اس شخص سے جو موحد نہیں کہتا ہوں کہ ارادے نے چاہا کہ اپنا محسوس وجود پیدا کرے اور وہ محسوس وجود یہی کائنات ہے جسے ہم دیکھتے ہیں اور ہم اس کا جزو ہیں۔

فلسفے کے مطابق یہ ہیں کن فیکون کے معنی' اور جو ارادے نے چاہا سو وہ ہو گیا اور محسوس کائنات وجود میں آئی یکائنات و ارادے میں اس سے زیادہ فرق نہیں ہے کہ انسان ارادے کو نہیں دیکھ سکتا اور نہ ہی لمس کر سکتا ہے جب کہ جہاں کو وہ مشاہدہ کر سکتا ہے اور لمس بھی کرتا ہے۔ جابر نے کہا اس طرح تو ہماری موت کے بعد ارادہ فنا نہیں ہوتا۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا' نہیں اور موت محسوس ہونے والے ارادے کے جسم کا جزو ہے۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ یہ جہان جسے ارادہ وجود میں لایا ہے زندگی ہے اور تجھے معلوم ہے کہ کائنات میں ایسی کوئی چیز نہیں جو زندہ نہ ہو اور جامد پتھر بھی زندہ ہیں چہ جائیکہ درخت' حیوان' انسان' دریاؤں اور سمندروں کا پانی۔

جب ارادے نے کن کہا' تو فیکون (یعنی ہو گیا) زندگی وجود میں آ گئی اور زندگی میں موت کے معنی فنا نہیں بلکہ صرف زندگی کے ایک حصے کی ایک صورت کی تبدیلی ہے ولادت اور موت دونوں زندگی ہیں اور ہمیں موت کو منحوس اور ولادت کو مبارک نہیں سمجھنا چاہئے چونکہ دونوں زندگی کے دو رخ ہیں پانی اور برف کی مانند جو پانی کی دو حالتیں ہیں جب کہ ماہیت کے لحاظ سے پانی اور برف میں کوئی تفاوت نہیں۔

ہماری زندگی اور رہائش بھی اسی طرح ہے یہ زندگی کے دو رخ ہیں' جس طرح ولادت موت کو ختم نہیں کرتی اسی طرح موت ولادت کو ختم نہیں کرتی۔ اگر ہم ولادت اور موت کو ایک لکڑی کے دو سرے فرض کریں'

تو یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ وہ لکڑی زندگی ہے جس کا ایک 'سرا' یا قطب 'ولادت ہے اور دوسرا 'سرا' یا قطب 'موت ہے۔ ایک موحد موت سے نہیں ڈرتا کیونکہ اسے معلوم ہے کہ موت کے بعد باقی رہے گا۔ اگر ایک غیر موحد شخص بھی جان لے کہ موت زندگی کا دوسرا رخ ہے تو وہ ہرگز موت سے نہیں ڈرے گا۔ اور یہ شخص جو خدا پر ایمان نہیں لایا اسے سمجھانا پڑے گا کہ موت کے بعد فنا نہیں ہوگا۔

جابر نے کہا اگر وہ شخص مجھ سے پوچھے کہ ارادہ کن لوازمات اور اوزاروں کے ذریعے زندگی کو وجود میں لایا ہے تو میں اسے کیا جواب دوں ؟

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا اسے کہو کہ ہماری عقل اور حواس اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ارادہ کن اوزاروں کے ساتھ کائنات کو وجود میں لایا ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کن لوازمات کے ذریعے وجود میں آئی ہے اور جن لوازمات کے ساتھ کائنات وجود میں لائی گئی وہ بھی آج ہماری نظروں کے سامنے ہیں۔

اسی بات کو سمجھنے کے لئے کہ ارادے نے کن اوزاروں کے ذریعے اس کائنات یا زندگی کو پیدا کیا ہے اس کے لئے عقل کو آج سے زیادہ طاقتور ہونا چاہیے اور آج جو حواس موجود ہیں ان سے زیادہ حواس موجود ہونا چاہیں۔ تجھے معلوم ہے کہ آج بنی نوع انسان میں ایسے بھی موجود ہیں جو کسی قسم کی خوشبو یا بدبو کو نہیں سونگھ سکتے کیونکہ ان میں اس حس کی کمی ہوتی ہے جس سے بو سونگھی جاتی ہے تجھے معلوم ہے کہ ہم جیسے انسانوں میں ایسے بھی ہیں جو کچھ نہیں دیکھ پاتے کیونکہ ان میں اس حس کی کمی ہوتی ہے جس سے اشیاء اور اشخاص کو دیکھا جا سکتا ہے۔

ہماری مثال ان لوگوں جیسی ہے جن کے بعض حواس مفقود ہوتے ہیں لہٰذا وہ بو کو نہیں سونگھ سکتے یا چیزوں کو نہیں دیکھ پاتے۔ ہمیں اس موضوع کو سمجھنے کے لئے موجودہ عقل سے زیادہ طاقتور عقل اور موجودہ حواس سے زیادہ طاقتور حواس درکار ہیں۔ جابر نے پوچھا کیا ممکن ہے کہ ایک دن ایسا آئے کہ ہم سمجھ سکیں کہ کائنات یا زندگی کس اوزار سے بنائی گئی ہے ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا' ہاں اے جابر ! کیونکہ آج تک کے تجربات سے ثابت ہو چکا ہے کہ علم جمود اور حرکت کے مراحل سے گزرتا رہا ہے اور ممکن ہے کہ آئندہ علمی حرکت کے ادوار آئیں اور ان ادوار میں بنی نوع انسان سمجھے کہ کائنات کن اوزاروں کے ساتھ بنائی گئی ہے۔

جابر نے سوال کیا بڑھاپا کس سے وجود میں آتا ہے ؟ امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا' انسانی مزاج پر مسلط ہونے والی بیماریوں کی دو اقسام ہیں ان میں سے ایک قسم تیز کہلاتی ہے ان بیماریوں کی اقسام اچانک مزاج پر مسلط ہو جاتی ہیں اور تیزی سے افاقہ ہو جاتا ہے یا پھر ہلاکت کا سبب بنتی ہیں۔

بیماریوں کی دوسری قسم کند کہلاتی ہے جن کا سفر لمبا اور بتدریج ہے اور یہ بیماریاں مدت تک مزاج میں رہتی ہیں اور علاج کارگر ثابت نہیں ہوتا یہاں تک کہ انسان ہلاک ہو جاتا ہے اور بڑھاپا کند بیماریوں کی ایک قسم

ہے۔

جابر نے کہا پہلی مرتبہ میں سن رہا ہوں کہ بڑھاپا ایک بیماری ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ہے یہ بیماری بعض لوگوں میں جلدی سرایت کر جاتی ہے اور بعض میں دیر سے۔ جو لوگ خداوند تعالیٰ کے احکامات کی پیروی نہیں کرتے اور منکرات سے اجتناب نہیں کرتے وہ نسبتاً جلدی بوڑھے ہو جاتے ہیں لیکن وہ لوگ جو خداوند تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں دیر سے بوڑھے ہوتے ہیں۔ (۲۴۳)

جابر نے کہا میرا ایک اور سوال ہے اور وہ یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے جب انسان کو مارنا ہی ہوتا ہے تو اسے اس جہان میں کیوں لاتا ہے اور کیا یہ بہتر نہیں کہ اسے اس دنیا میں مارنے کے لئے نہ لائے۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا میں نے تجھے کہا ہے کہ موت کا کوئی وجود نہیں ہے اور جو میری اور تمہاری نظروں میں موت کی صورت جلوہ گر ہوتی ہے وہ دوسری زندگی کی ابتدا ہے اور خداوند تعالیٰ انسان کو اس جہان میں اس لئے لاتا ہے تاکہ انسانیت کمال کا ایک مرحلہ یہاں طے کرلے۔ اس مرحلے کے بعد انسان گزشتہ مرحلے سے زیادہ کامل انسان کی صورت میں دوسرے جہان میں جاتا ہے اور اس جہان میں بھی کامل انسان کا ایک مرحلہ طے کرتا ہے۔

جابر نے پوچھا' تخلیق کا حتمی سبب کیا ہے ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا' تخلیق کا حتمی سبب خداوند تعالیٰ کی طرف سے تمام مخلوقات حتیٰ کہ جمادات کے لئے اس کے لطف و کرم سے عبارت ہے۔ جابر نے پوچھا' خداوند تعالیٰ نے کیوں لطف و کرم کیا ؟ امام جعفر صادقؑ نے پوچھا کیا تم ایک کریم کے مقصد کو نہیں سمجھ سکتے۔

جابر نے کہا ابن آدم میں ایسا کم اتفاق ہوا ہے کہ کوئی بغیر کسی مقصد کے کریم ہو جائے اور انسانوں میں ایک گروہ ایسا ہے جو شہرت اور ناموری کے لئے سخاوت کرتا ہے اور لوگوں سے چاہتا ہے انہیں کریم کہیں۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا لیکن خداوند تعالیٰ ایک ریاکار کریم نہیں ہے اور اس لئے نہیں بخشتا کہ نام پیدا کرے۔ وہ ریاکاری کے بغیر کریم ہے اور اس نے مخلوقات کو اس لئے خلق کیا ہے تاکہ وہ فیض پائیں لیکن اگر تو یہ پوچھے کہ اس مخلوقات کی تخلیق میں خداوند تعالیٰ کا فضل و کرم کے علاوہ کوئی اور سبب کارفرما ہے یا نہیں ؟ تو میں تم سے یہ کہوں گا کہ یہ سوال نہ کرو کیونکہ ایک موحد کو یہ سوال نہیں کرنا چاہئے۔ جابر نے کہا یہ بات واضح ہے کہ میں یہ سوال اس لئے پوچھتا ہوں تاکہ اگر میرا کسی غیر موحد سے پالا پڑے تو اسے جواب دے سکوں۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا' اے جابر' فلسفہ کی رو سے کائنات کو وجود میں لانے کا سبب خداوند تعالیٰ کے فضل و کرم کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ چونکہ اگر کائنات کو تخلیق کرنے کا کوئی اور سبب ہوتا اور وہ سبب خدا کو کائنات کی تخلیق پر لگاتا تو وہی سبب خدا کی جگہ لے لیتا اور پھر خداوند تعالیٰ خدائی نہ کر سکتا۔ اسی بنا پر'

فلسفے کی رو سے کائنات کو وجود میں لانے کا کوئی سبب نہ تھا کیونکہ اگر کوئی سبب موجود ہوتا تو وہ سبب خدا کی جگہ لے لیتا اس لئے کہ وہ سبب خدا کو کائنات کی تخلیق پر مجبور کر دیتا اور ایک مجبور کو خدا تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

جابر نے پوچھا' کیا یہ بات ممکن ہے کہ کائنات کو تخلیق کرنے کا کوئی سبب ہو جس کی بنا پر خدا نے کائنات کو تخلیق کیا ہو' قطع نظر اس کے کہ اس سبب نے خدا کو کائنات تخلیق کرنے پر مجبور کیا ہو ؟ فرض کرتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ کائنات کی تخلیق کی طرف اس لئے متوجہ ہوا کہ اپنی تخلیق کا تماشہ کرے یا اس لئے کائنات تخلیق کی ہو کہ اپنی خلقت سے لطف اٹھائے۔

امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا' اے جابر' کسی کام کو انجام دے کر اس سے لذت اٹھانا یا اس کا تماشہ کرنا ہم انسانوں کی طبیعت کا خاصہ ہے اور یہ دونوں باتیں ضرورت کی پیداوار ہیں ہم اپنی روح کو خوش کرنے کے لئے تماشا کرنے جاتے ہیں۔ چونکہ ہمیں لذت اٹھانے کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا جب ہم کوئی کام انجام دیتے ہیں تو وہ ہماری نظر میں لذت بخش دکھائی دیتا ہے۔

لیکن خداوند تعالیٰ جو بے نیاز ہے اسے تماشا کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ کسی چیز سے لطف اٹھانے کا محتاج ہے۔ اے جابر تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ ہماری لذتوں کا زیادہ حصہ بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر ہمارے جسم کی پیداوار ہے ہم بھوک کے وقت غذا کھاتے ہوئے لذت محسوس کرتے ہیں کیونکہ ہمارے بدن کو غذا کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر ہمارے منہ میں زبان یا چکھنے کی حس نہ ہوتی تو شاید ہم غذا کھانے سے محظوظ نہ ہو سکتے۔

اسی طرح ہم پانی پیتے ہوئے لذت محسوس کرتے ہیں کیونکہ ہمارے جسم کو پانی کی ضرورت ہے اور اگر جسم نہ ہو تو ہمیں پیاس کا احساس نہ ہو تاکہ ہم پانی پئیں۔

ہم باغ کی سیر سے لذت اٹھاتے ہیں اور اس کے باوجود کہ یہ ایک روحانی لذت ہے پھر بھی ہمارے جسم سے وابستہ ہے چونکہ اگر ہم اپنے جسم میں آنکھیں نہ رکھتے تو باغ کو نہ دیکھ سکتے تاکہ اس کے مشاہدے سے لذت اٹھائیں۔ ایک لذت ایسی ہے جس کے بارے میں پہلی نظر میں یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ یہ ایک روحانی لذت ہے اور جسم کی اس میں کوئی مداخلت نہیں۔ وہ علم کو درک کرنے کی لذت ہے۔

بہر کیف یہ لذت بھی جسم کے رابطے کے بغیر محال ہے چونکہ ہمارا جسم نہ ہوتا تو ہم کتاب نہ پڑھ سکتے اور نتیجتہً علم نہ سیکھ سکتے اور اگر کان نہ ہوتے تو علما کی باتیں نہ سن سکتے تاکہ انہیں یاد کر لیں۔

نہیں علم کے ادراک کی لذت بھی ہمارے جسم کے اعضا سے وابستہ ہے اور جسم سے وابستہ ہے جبکہ خداوند تعالیٰ کا جسم ہی نہیں کہ وہ کسی قسم کی مسرت یا لذت کا محتاج ہو۔

جابر نے کہا پس خداوند تعالیٰ کسی لذت کو درک کرنے پر قادر نہیں ؟

امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا تم اپنے سوال کو صحیح طریقے سے زبان پر نہیں لائے۔ تم نے کہا ہے کہ

خداوند تعالیٰ قادر نہیں ہے جبکہ خداوند تعالیٰ ہر کام کرنے پر قادر ہے اور کوئی ایسا کام نہیں جسے وہ انجام نہ دے سکتا ہو۔

یہ لذت جو ہمیں بھوک کے وقت کھانے سے اور پیاس کے وقت مشروب سے محسوس ہوتی ہے دراصل یہ اس نے ہمارے وجود میں رکھی ہے اور یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی قسم کی لذت کو درک کرنے پر قادر نہیں ؟

ہم میں کوئی چیز ایسی نہیں جس کو درک کرنے پر خداوند تعالیٰ قادر نہ ہو۔ چونکہ وہ خالق اور ہم مخلوق ہیں اور کوئی عاقل شخص یہ بات تسلیم نہیں کر سکتا کہ خالق' مخلوق کے حواس خمسہ سے آگاہ نہ ہوسکے۔ مختصر یہ کہ اسے اس بات کی ضرورت نہیں کہ ہماری طرح اپنے لئے لذتیں وجود میں لائے کیونکہ اس کا جسم نہیں ہے۔ ہماری زندگی میں جو چیز ہمیں لذت پہنچاتی ہے اور جو چیز ہمارے کام آتی ہے وہ ضرورت کی پیداوار ہے اور ضرورتوں کو بھی ہمارا جسم وجود میں لاتا ہے اور خدا جس کا کوئی جسم نہیں لذتوں سے بے نیاز ہے۔

اس موضوع سے قطع نظر' کائنات کی خلقت کا سبب جو کچھ بھی ہو اس سے خدائی قدرت کو سلب کر لیتا ہے اور کوئی موحد اس بات کا قائل نہیں ہو سکتا کہ کائنات کی پیدائش کا کوئی سبب تھا اور خداوند تعالیٰ نے اس سبب کی بنا پر اس کائنات کو خلق کیا ہے ہاں مگر یہ کہ خداوند تعالیٰ نے اپنے فیض و کرم سے اس کائنات کی تخلیق کی تاکہ مخلوقات زندگی کی نعمت سے بہرہ مند ہو اور اس کے علاوہ جو کچھ بھی کہا جائے وہ توحید کے خلاف ہے۔

جابر نے کہا' کیا خداوند تعالیٰ کا کرم جو کائنات کی تخلیق کا سبب ہوا ہے اس تخلیق کی وجہ نہیں ہے اور کیا جب ہم یہ کہتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے اپنے کرم کی رو سے مخلوقات کو خلق کیا ہے' ایک سبب کا ذکر نہیں کرتے۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا' ایک لازمی سبب نہیں ہے' یعنی ایک ایسا سبب نہیں جس کی وجہ سے خدا کائنات کو تخلیق کرنے پر مجبور ہوا ہو اور چونکہ لازمی سبب نہیں لہٰذا جب موحد کہتا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے اپنے کرم کی رو سے کائنات کو تخلیق کیا ہے تو اس کا یہ قول توحید کے خلاف نہیں۔ جابر نے کہا' میں سمجھتا ہوں کہ یہ سبب بھی لازمی ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے وضاحت چاہی اور جابر نے کہا خداوند تعالیٰ جس نے اپنے کرم کی رو سے کائنات کو خلق کیا ہے کائنات کی تخلیق سے صرف نظر بھی کر سکتا تھا۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ظاہر ہے۔

جابر نے کہا لیکن اس نے کائنات کی تخلیق سے صرف نظر نہیں کیا اور اسے اپنے کرم کی رو سے خلق کیا اور کیا یہ موضوع ہمیں اس بات تک نہیں پہنچاتا کہ خداوند تعالیٰ اپنے فیض و کرم سے پہلوتہی نہیں کر سکتا تھا۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا یہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو جھگڑا ہے نہ کہ مباحثہ' جب تم ایک شخص کا احترام کرتے ہو تو کیا تم اس کا احترام کرنے پر مجبور ہوتے ہو۔ غور کرو کہ میں احترام کے بارے میں اس کے اصلی معنوں سے بحث کر رہا ہوں نہ کہ وہ احترام جسے انسان اپنے فرض کے طور پر نبھاتا ہے اور جو مسلط کیا جاتا ہے۔ مثال کے

طور پر، تمہارا کوئی عزیز غریب ہے اور تم ایک معین عرصے میں لگاتار اس کی مدد کرتے رہتے ہو۔ اور جانتے ہو کہ اگر تم اس کی مدد نہیں کرو گے تو اس کا جینا محال ہو جائے گا اس کے باوجود کہ تم اس پر رحم کھا کر اس کی مدد کرتے ہو لیکن تمہارا یہ عمل، کرم نہیں بلکہ تمہاری ڈیوٹی ہے اور تم اپنی ڈیوٹی یہ سمجھتے ہو کہ معین وقت میں بغیر کسی لالچ کے اس کی مدد کرتے رہو اور تم سے مدد حاصل کرنے کے لحاظ سے تقریباً" وہ تمہارا قرض دار ہو جائے گا۔

لیکن میں اس اکرام کے بارے میں گفتگو کر رہا ہوں جو حقیقی معنوں میں کرم ہے ایک شخص تمہاری توجہ کا مرکز ہے اور تم اس کی مدد کرنا چاہتے ہو اور وہ پیش گوئی نہیں کرتا کہ تو اس کی مدد کرے گا۔ اور حتیٰ کہ ایک دفعہ بھی اس کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ تم سے کوئی چیز وصول کرے گا تم بھی اس کی مدد کرنے میں مکمل طور پر خود مختار ہو اور کوئی مادی یا روحانی محرک تمہیں اس کی مدد پر مجبور نہیں کرتا ان نکات کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر تم اس شخص پر کرم کرتے ہو تو کیا تم مجبور تھے ؟ جابر نے کہا نہیں۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا، خدا نے بھی بغیر کسی دباؤ کے اپنے حقیقی کرم کی رو سے کائنات کو تخلیق کیا ہے تاکہ زندگی کی یہ نعمت مخلوقات کو عنایت فرمائے۔ بہرحال میں جو ایک موحد ہوں، اپنی عقل کے مطابق کائنات اور جو کچھ اس میں ہے اس کی ایجاد کے لئے خدا کے کرم کے علاوہ کسی سبب کو مدنظر نہیں رکھتا۔

میں اپنی عقل کا سہارا لیتا ہوں، اور میری عقل انسانی ہے جبکہ خداوند تعالیٰ دانا اور توانائے مطلق ہے اس کی عقل، عقل الٰہی ہے۔

عقل الٰہی انسانی عقل سے اس قدر بڑی اور طاقتور ہے کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے کوئی نسبت نہیں، ان کا موازنہ کسی صورت ممکن نہیں، ہم جس قدر کہیں کہ عقل الٰہی انسانی عقل سے برتر اور زیادہ طاقتور ہے پھر بھی خداوند تعالیٰ کی عقل کو انسانی عقل سے کوئی نسبت نہیں دے سکتے۔ کیونکہ خداوند تعالیٰ کی عقل اس کی تمام صفات کی مانند لامحدود، ازلی اور ابدی ہے اس کو کسی پیمانے یا میزان سے ناپا یا تولا نہیں جا سکتا اور ایسا کوئی عدد نہیں جو اس کی برتری کی نشاندہی کر سکے۔ چونکہ جونہی زبان پر کوئی عدد لایا جاتا ہے یا کارڈز پر لکھا جاتا ہے تو وہ ایک محدود عدد ہو جاتا ہے اور ایک محدود چیز کا لامحدود ازلی اور ابدی چیز سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔

# آپؑ سے کئے جانے والے دوسرے سوالات

جابر نے پوچھا' بشری عقل کے الٰہی عقل سے موازنے سے آپ کی کیا مراد ہے ؟ امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا' میں بشری عقل کا الٰہی عقل سے موازنہ نہیں کر سکتا اور کوئی انسان اس موازنے پر قادر نہیں' صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ الٰہی عقل بشری عقل سے اس قدر برتر ہے جس کا قیاس کرنا ممکن نہیں اور اس کی برتری وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی۔ یہ بات میں نے اس لئے کہی کہ بتاؤں میں اپنی عقل کے مطابق کائنات کے وجود میں آنے کے سبب کو مدنظر رکھتا ہوں نہ کہ ایسی عقل کے مطابق جس سے میں بے خبر ہوں۔

جابر نے کہا' میں آپ کا مقصد نہیں سمجھا۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا میرا مطلب یہ ہے کہ میری عقل یہ کہتی ہے کہ ہر چیز کی تخلیق کا کوئی سبب موجود ہوتا ہے اور میری عقل کسی ایسے معلول (جس کا سبب یا علت بیان کی گئی ہو) کو تسلیم نہیں کرتی جس کی علت موجود نہ ہو۔ کیونکہ بشری عقل ہے اور شاید عقل الٰہی کے وسیع احاطے میں علت کا مسئلہ سرے سے موجود نہ ہو اور خالق کی عقل ضروری نہ سمجھتی ہو کہ ایک ایسی علت وجود میں آئے جس سے کوئی معلول نمودار ہو اور اس طرح کوئی حادثہ وجود میں آئے۔

ہماری عقل علت و معلول کے رابطے کو اس قدر ضروری خیال کرتی ہے کہ اس رابطے کے باہر مخلوقات کی پیدائش کو سمجھنے سے قاصر ہے اور جونہی کسی تخلیق کو دیکھتی ہے فوراً" اس کی علت تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے اور شاید خداوند تعالیٰ کی مشینری میں جو خدا تعالیٰ کے ارادے کی مطیع ہے تخلیقات بغیر کسی علت کے وجود میں آتی ہوں اور کسی علت کے موجود ہونے کی ضرورت نہ ہو تاکہ کوئی مخلوق وجود میں آئے اور لہٰذا شاید یہ کائنات کسی علت کے بغیر وجود میں آئی ہے۔

جابر نے اظہار خیال کیا' آپ نے جو کچھ کہا ہے میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں لیکن اس کے باوجود کہ ہماری عقل' عقل بشری ہے اور عقل الٰہی کا ہماری عقل سے کسی طور موازنہ ممکن نہیں ہمارے پاس اس عقل کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ خداوند تعالیٰ کے بارے میں غور و فکر کے لئے کوئی دوسرا ذریعہ استعمال کریں۔ اور خصوصاً" کائنات کی تخلیق کے سبب کے بارے میں فکر کریں۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ خداوند تعالیٰ نے ہمیں زیادہ طاقتور عقل کیوں نہ دی تاکہ اسے اچھی طرح پہچان سکیں۔ چونکہ جیسا کہ آپ نے کہا خدا کی مشینری تک رسائی نہیں ہے اور اس سلسلے میں ہمیں چون و چرا کا بھی حق حاصل نہیں۔

یہ ہماری عقل جو خداوند تعالیٰ کی معرفت کے لئے ہمارا واحد وسیلہ ہے' ہمیں کہتی ہے کہ کائنات اور جو کچھ اس میں ہے کسی علت کے بغیر وجود میں نہیں آیا اور ہم اس علت کی جستجو میں ہیں۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا' ہماری عقل کے مطابق وہ علت خداوند تعالیٰ کے کرم سے عبارت ہے تاکہ مخلوقات وجود میں آئیں اور زندگی کی نعمت سے بہرہ مند ہوں۔ اور اگر اس کے علاوہ کوئی علت موجود ہو تو وہ خدا ہی جانتا ہے اور بس۔

جابر نے کہا' جو کچھ آپ نے فرمایا ہے اس سے میں یہی سمجھا ہوں کہ خداوند تعالیٰ ازلی اور ابدی ہے اس کا کوئی مبدا اور منتہیٰ نہیں ہے جو کائنات کو مستقل قوانین کے تحت چلا رہا ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ہاں اے جابر۔

جابر نے پوچھا' اس طرح تو کائنات کی انتہا تک دنیا میں کوئی نیا واقعہ رونما نہیں ہوگا ؟

امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا ہاں اے جابر' خدا کے لئے کوئی نیا واقعہ رونما نہیں ہوتا۔ اس کی مثال میں نے گندم کاشت کرنے والے دہقان کی مثال سے دی ہے لیکن کائنات کی مخلوقات جس میں انسان بھی شامل ہیں ان کے لئے ہر رونما ہونے والا واقعہ نیا ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ موسموں کی تبدیلی بھی ان کے لئے نئی ہوتی ہے کیونکہ انہیں دو بہاریں ہر لحاظ سے مختلف دکھائی دیتی ہیں۔

جابر نے پوچھا کیا یہ ممکن ہے کہ کائنات کی مخلوقات میں کوئی اس دنیا کے لئے خداوند تعالیٰ کے وضع کردہ قوانین کی پیروی نہ کرے اور نافرمانی کر بیٹھے۔ (۱۹۴)

امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا' نہیں اے جابر' کائنات کی مخلوق میں سے کوئی بھی ایسی نہیں جو اس کائنات کے لئے خداوند تعالیٰ کے وضع کردہ قوانین کی نافرمانی کرے اگرچہ وہ ایک چیونٹی کیوں نہ ہو یا اس سے بھی کوئی چھوٹا ذرہ ہو۔ وہ مخلوقات بھی خدا کی تسبیح کرتی ہیں جو ہماری نظر میں بے جان ہیں لیکن ان کی زندگی میں پایا جانے والا جوش و خروش ہماری زندگی سے کہیں زیادہ ہے یہ سب مخلوقات خدا کے وضع کردہ قوانین کی پیروی کرتی ہیں۔

جابر نے سوال کیا' بیماری کے بارے میں آپ کا کیا نظریہ ہے ؟ کیا بیماری کو خداوند تعالیٰ انسان پر نازل کرتا ہے یا یہ کہ کسی حادثے کے نتیجے میں رونما ہوتی ہے۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا' بیماریوں کی تین اقسام ہیں۔ بیماریوں کی ایک قسم وہ ہے جو مشیت الٰہی سے رونما ہوتی ہیں ان میں بڑھاپا بھی شامل ہے کوئی بھی اس بیماری سے بچ نہیں سکتا یہ ہر ایک کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ بیماریوں کی دوسری قسم وہ ہے جو آدمی کی جہالت یا ہوس کے نتیجے میں رونما ہوتی ہیں جب کہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ کھانے اور پینے میں اسراف سے کام نہ لو اگر آدمی کھانے پینے میں اسراف نہ کرے اور چند لقمے کم کھائے اور چند گھونٹ کم پئے تو بیماری کا شکار نہیں ہوگا۔ بیماریوں کی تیسری قسم وہ ہے جو جسم کے دشمنوں سے عارض ہوتی ہیں وہ انسانی بدن پر حملہ کرتے ہیں لیکن جسم اپنے پورے وسائل کے ساتھ ان کا مقابلہ کرتا ہے۔

اگر جسمانی قوت ان دشمنوں کا مقابلہ کرنے میں ناکام رہے تو انسان بیمار پڑ جاتا ہے لیکن جب انسان بیمار پڑ جاتا ہے پھر بھی بدن مقابلہ کرتا ہے اور بدن کے اس مقابلے کے نتیجے میں بیماری ختم ہو جاتی ہے اور بیمار شفایاب ہو جاتا ہے۔

جابر نے پوچھا جسم کے دشمن کون ہیں ؟ امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا جسم کے دشمن اتنی چھوٹی مخلوق ہے جو بہت زیادہ چھوٹی ہونے کی وجہ سے دکھائی نہیں دیتی یہ مخلوق جسم پر حملہ کرتی ہے اور جسم میں بھی ایسی چھوٹی مخلوق موجود ہے جو نظر نہیں آتی اور جسم کے دشمنوں کے خلاف اس کا دفاع کرتی ہے۔ جابر نے پوچھا بیماری پیدا کرنے والے جسم کے دشمن کون سے ہیں ؟ امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا ان کی اقسام کی تعداد بہت زیادہ ہے اس طرح بدن کا دفاع کرنے والے جراثیم بھی مختلف اقسام کے ہیں لیکن جو چیز انہیں تشکیل دیتی ہے وہ محدود ہے۔ جابر نے کہا آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی ان کی اقسام کیسے زیادہ ہیں اور جو چیز انہیں تشکیل دیتی ہے وہ کیسے محدود ہے ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا جو کتاب تم پڑھ رہے ہو وہ ہزاروں کلمات کی حامل ہے اور اس کتاب میں ہر کلمہ حروف سے لکھا گیا ہے لیکن جو چیز کلمات کو تشکیل دیتی ہے وہ حروف تہجی کے محدود حروف ہیں اور حروف تہجی کے چند گنے چنے حروف کے ساتھ ہزاروں کلمات لکھے جا سکتے ہیں جن میں سے ہر ایک یا ان کلمات کا ہر دستہ مخصوص معنوں کا حامل ہے۔

ہمارے جسم کے دشمن اور ان دشمنوں کے خلاف دفاع کرنے والے تمہاری کتاب کے ہزاروں کلمات کی مانند ہیں لیکن سب محدود ہیں جو چند گروہوں سے تشکیل پاتے ہیں (جس طرح حروف تہجی سے کلمات تشکیل پاتے ہیں) جابر نے کہا اب میں سمجھا کہ آپ کا کیا مطلب ہے امام جعفر صادقؑ نے فرمایا میں تمہیں اچھی طرح سمجھانے کے لئے ایک اور مثال دیتا ہوں۔ جانوروں میں زیادہ تر ایسے ہیں جن کی ہڈیاں' گوشت اور خون ہے اور ہر طبقے کے جس جانور کا مشاہدہ کرو گے تو دیکھو گے کہ وہ ہڈیاں' گوشت اور خون رکھتا ہے لیکن کیا ان تین مادوں سے تشکیل پانے والے تمام جانور ایک دوسرے سے مشابہ ہیں ؟ اونٹ کی ہڈیاں' گوشت اور خون ہے اور بلی بھی ہڈیوں' گوشت اور خون کی حامل ہے لیکن اونٹ اور بلی کے درمیان کوئی مشابہت نہیں ہے ان میں سے ایک گھاس کھانے والا ہے اور دوسرا گوشت خور ہے جب کہ ان کے بدن کو تشکیل دینے والے مواد کی جنس بنیادی طور پر ایک ہی ہے۔ میں نے بنیادی طور پر اس لئے کہا کہ بلی کے گوشت کی جنس اونٹ کے گوشت کی جنس سے مختلف ہے لیکن بنیادی طور پر دونوں گوشت ہی ہیں۔ ہمارے جسم کے دشمن اور جو ہمارے جسم کے دشمنوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ بنیادی لحاظ سے تھوڑے سے مواد سے تشکیل پاتے ہیں لیکن ان کی اقسام زیادہ ہیں۔

جابر نے پوچھا دنیا کب وجود میں آئی ؟ امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا یہ خدا جانتا ہے۔ جابر نے اظہار خیال کیا لیکن یہودیوں کے بقول اب اس کی پیدائش کو ۴۷۴۳ واں سال گزر رہا ہے امام جعفر صادقؑ نے فرمایا

خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا کہ دنیا کب معرض وجود میں آئی اور عقل کہتی ہے کہ جہاں یہودیوں کی اس روایت سے کہ دنیا کا ۴۷۴۳واں سال ہے کہیں زیادہ قدیم ہے جابر نے پوچھا کیا ان کے پیغمبر نے نہیں کہا کہ کائنات آج سے ۴۷۴۳ سال پہلے وجود میں آئی ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا نہیں اے جابر ! اور یہ قول یہودی راویوں کا ہے نہ ان کے پیغمبر کا۔ اور اگر کوئی عالم انسان صحراؤں' دریاؤں اور سمندروں پر نظر ڈالے تو اسے اندازہ ہوگا کہ کائنات کی عمر ۴۷۴۳ سال سے کہیں زیادہ ہے۔ جابر نے پوچھا اگرچہ اندازاً" ہی سہی لیکن کیا آپ کائنات کی عمر بتا سکتے ہیں امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا' نہیں اے جابر ! میں اندازاً" بھی نہیں بتا سکتا کہ کائنات کو وجود میں آئے کتنا عرصہ ہو چکا ہے۔ صرف خدا ہی جانتا ہے کہ کائنات کب وجود میں آئی۔ دنیا کی بعض اقوام دنیا کو یہودیوں کی اس روایت کے برعکس کہیں زیادہ پرانی سمجھتی ہیں۔ ہندوستان والوں کے بقول دنیا کی عمر ۲۰ ہزار سال گزر چکے ہیں۔ چینی دنیا کو اس سے کہیں زیادہ قدیم سمجھتے ہیں۔ ان کے بقول دنیا کی عمر ایک لاکھ سال ہے یعنی یہودی راویوں کی روایت سے ۲۰ گنا سے بھی زیادہ ہے۔ (۱۶۵)

مصر میں ایک عمارت ہے جس کے بارے میں مصریوں کا کہنا ہے کہ آج سے چھ ہزار سال پہلے بنائی گئی اور اگر مصریوں نے درست اخذ کیا ہو تو وہ عمارت اس وقت بنائی گئی جب دنیا کے آغاز کو تقریباً" ایک ہزار تین سو سال رہتے تھے اس طرح قدیم مصریوں نے ایک ایسی دنیا میں عمارت بنائی جو ابھی تک وجود میں نہیں آئی تھی اور یہ بات قابل قبول نہیں ہے۔

جابر نے پوچھا اس دنیا کا خاتمہ کب ہو گا ؟ کہ اس کے بعد جہان باقی نہیں رہے گا' امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا ایسا زمانہ ہرگز نہیں آئے گا کہ جہان موجود نہ ہو کیونکہ جو چیز ایک دفعہ وجود میں آجاتی ہے فنا نہیں ہوتی' صرف اس کی شکل تبدیل ہوتی ہے۔ جابر نے پوچھا کہا جاتا ہے کہ دنیا کے اختتام پر سورج اور چاند کی روشنی ختم ہو جائے گی کیا یہ حقیقت ہے ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ممکن ہے ایسا زمانہ آئے کہ سورج ماند پڑ جائے اس صورت میں چاند بھی ماند پڑ جائے گا اور چاند سورج سے روشنی نہیں حاصل کر سکے گا تو وہ دنیا کا خاتمہ نہ ہوگا بلکہ دنیا کے ایک اور دور کا آغاز ہوگا۔ جابر نے پوچھا' کیا ممکن ہے بنی نوع انسان کی زندگی میں ایسی رات آئے جس کے بعد سورج طلوع نہ ہو امام جعفر صادقؑ نے فرمایا نہیں اے جابر' کیونکہ خداوند تعالیٰ دنیا کو مستقل قوانین کے تحت چلا رہا ہے اور ان قوانین کے تحت سورج کو ہر روز طلوع ہونا چاہئے۔

لیکن ایسا دن آئے کہ سورج ماند پڑ جائے (کہ وہ بھی خداوند تعالیٰ کے اس کائنات کو چلانے کے لئے وضع کردہ قوانین کے مطابق ہے) تو پھر طلوع نہیں ہو گا۔ جابر نے پوچھا' آپ سورج کے ماند پڑنے کے وقت کی قیاس آرائی کر سکتے ہیں ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا صرف خدا تعالیٰ بتا سکتا ہے کہ سورج کب ماند پڑے گا ؟ لیکن میرا نظریہ یہ ہے کہ یہ واقعہ اتنا جلدی وقوع پذیر نہیں ہوگا۔ شاید بیابان کی ریت کے ذرات کی

تعداد کے برابر سال گزر جائیں تب کہیں جا کر سورج ماند پڑے اور اس وقت کائنات کی زندگی میں نئے دور کا آغاز ہو گا۔ جابر نے پوچھا جو لوگ دنیا کے مال و متاع کو سمیٹنے میں حرص سے کام لیتے ہیں' دوسرے جہان میں ان کی کیا حالت ہوگی ؟ کیا وہ جنت میں جائیں گے ؟

امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا' زندگی گزارنے اور خاندان کی کفالت کے لئے جدو جہد ضروری ہے اور وہ لوگ جو اپنی زندگی کے وسائل مہیا کرنے کے لئے کام کرتے ہیں' خدا کی اچھی مخلوق ہیں اور ایسا کم ہوا ہے کہ ان لوگوں میں حرص پائی جائے۔ چونکہ یہ لوگ محنت کش ہوتے ہیں اپنی اور اپنے خاندان کی روزی کے حصول میں کوشاں رہتے ہیں لہٰذا ان کے پاس حریص بننے کا کوئی وسیلہ نہیں ہوتا۔

جن لوگوں کو مال جمع کرنے کی حرص ہوتی ہے وہ دوسرے طبقے کے لوگ ہوتے ہیں اور جو چیز انہیں حریص بناتی ہے وہ کم مدت میں زیادہ مال و دولت کا میسر آنا ہے۔ چونکہ صرف تکلیف اٹھا کر اور حلال روزی کما کر تھوڑی مدت میں زیادہ مال و دولت اکٹھی نہیں کی جا سکتی لہٰذا اس قسم کے لوگ ناجائز ذرائع استعمال کر کے نہایت ہی کم مدت میں زیادہ مال کما لیتے ہیں۔ ایسے لوگ جب ایک مرتبہ تجربہ کر لیتے ہیں کہ نہایت ہی قلیل مدت میں بہت سا مال جمع کیا جا سکتا ہے تو وہ بار بار یہ عمل دہراتے ہیں اور آخر کار ان میں مال جمع کرنے کی اتنی حرص پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ زندگی کے آخری حصے تک اس کام میں لگے رہتے ہیں ان کا بہترین مشغلہ مال جمع کرنا ہوتا ہے یہی لوگ ہیں جن کے بارے میں خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "الذی جمع مالا" و عددہ ان کی زندگی کی سب سے بڑی لذت مال جمع کرنا اور زر و جواہر کو گننا ہے۔ مال جمع کرنے کے لئے حریص ہونے کا ایک خاصہ یہ ہے کہ حریص انسان اپنے مال کا کچھ حصہ محتاجوں کی فلاح و بہبود کے کاموں پر خرچ نہیں کر سکتا اور نہ صرف محتاجوں کے لئے مال خرچ نہیں کر سکتا بلکہ محتاجوں اور مسکینوں کو ان کی موجودہ زندگی کا مستوجب سمجھتا ہے۔ اس کے شعور میں یہ بات جاگزیں ہو جاتی ہے کہ اگر خدا کسی کو محتاج نہ بنانا چاہے تو وہ محتاج نہیں ہوتا پس اسے کسی محتاج کی مدد کے لئے ہاتھ نہیں بڑھانا چاہئے کیونکہ حریص شخص کے نظریے کے مطابق کسی محتاج کی مدد مشیت الٰہی کے برخلاف ہے۔

دنیا میں اس طرح کے لوگ کسی چیز سے اتنی لذت نہیں اٹھاتے جتنی وہ سیم و زر کو گننے سے اٹھاتے ہیں یا اس میں کہ ان کے پاس وسیع و عریض اراضی ہو۔

دوسرے جہان میں ان کی حالت وہی ہوگی جو کلام خدا میں بیان کی گئی ہے لیکن وہ لوگ جو روزی کمانے کے لئے مشقت کرتے ہیں اور اپنی حلال کمائی سے کچھ رقم جمع کرتے ہیں تاکہ بوقت ضرورت کام آسکے تو ایسے لوگ حریص نہیں کہلاتے۔

یہ وہ لوگ ہیں جو قناعت پسند ہیں اور انہیں اپنے پسماندگان کے مستقبل کی فکر ہوتی ہے وہ یہ سوچتے ہیں

کہ اگر وہ چلے جائیں گے اور اپنے پسماندگان کے لئے کوئی چیز چھوڑ کر نہیں جائیں گے تو ان کے پسماندگان فقر و فاقے کا شکار ہو جائیں گے۔

اس قسم کے افراد جو اپنے بڑھاپے کی فکر کریں یا اس خیال سے کہ ان کی موت کے بعد ان کے اہل و عیال فقر وفاقے کا شکار نہ ہوں ایسے لوگوں کو خداوند تعالیٰ اجر عنایت فرمائے گا۔ اور اگر ان سے کوئی ایسا عمل سرزد نہ ہوا ہو جس کی وجہ سے وہ سزا کے مستحق ہوں تو وہ موت کے بعد جنت میں جائیں گے۔

زندگی میں قدم قدم پر یہی لوگ کارنامے انجام دیتے ہیں۔ یہی لوگ زراعت کرتے ہیں یہی لوگ بھیڑ بکریاں پالتے ہیں۔ پھل دار درختوں کی پرورش کرتے ہیں اور گھر بناتے ہیں اور اپنی قوم کی صنعتی ضروریات پوری کرتے ہیں اگر مسلمان ہوں تو جہاد کے موقع پر مجاہد فی سبیل اللہ بن جاتے ہیں اور میدان جنگ میں جا کر قتل ہو جاتے ہیں۔

لیکن وہ لوگ جو حریص ہیں اور تمام عمر مال جمع کرنے کے علاوہ کوئی کام اور آرزو نہیں رکھتے وہ اپنی قوم کے لئے کوئی مفید کام نہیں کرتے۔ اگر جہاد پیش آئے تو میدان جنگ میں نہیں جاتے کیونکہ اپنی وسیع و عریض اراضی' غلے سے بھرے ہوئے گوداموں اور بے تحاشا مال و دولت کو چھوڑ کر میدان جنگ میں نہیں جا سکتے چونکہ انہیں معلوم ہے کہ وہاں قتل ہونے کا خطرہ ہے اسی لئے خداوند تعالیٰ نے اپنے کلام میں فرمایا ہے کہ وہ حریص کو پسند نہیں کرتا۔

حتیٰ کہ اگر ایک حریص موت سے پہلے اپنا تمام مال اپنے پسماندگان کی ضرورت کے علاوہ محتاجوں میں تقسیم کر دے تو بھی بعید ہے کہ خداوند تعالیٰ اسے جنت میں بھیج دے چونکہ جیسا کہ تجربہ کیا گیا ہے مال جمع کرنے کی حرص وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں شروع ہی سے انسان نہایت کم مدت میں ناجائز طریقے سے بہت زیادہ مال اکٹھا کرنا شروع کرتا ہے اور یہ بات انسان کو بار بار اس طریقے سے اتنا یا اس سے زیادہ حاصل کرنے کا شوق دلاتی ہے۔ لہٰذا چونکہ مال ناجائز طریقے سے اکٹھا ہوتا رہا۔ تو یہ گناہ' خدا کی قربت کی خاطر مال خرچ کرنے سے دور نہیں ہوگا۔ کیونکہ اس سے لوگوں کے صرف ایک گروہ کو فائدہ پہنچے گا۔

جابر نے پوچھا' کیا جانوروں کا خدا پر ایمان ہے ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا' کسی شک و شبہ کے بغیر' جانور خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور اگر خدا پر ایمان نہ رکھتے ہوں تو ان کی زندگی منظم نہ ہوتی کہا جاتا ہے کہ فطرت جانوروں کی زندگی کو منظم کرتی ہے۔

اگر جانور خالق پر ایمان نہ رکھتے تو کیا یہ ممکن تھا کہ جانوروں کی بعض انواع جن کی منظم اجتماعی زندگی سے تم مطلع ہو' ایسی منظم زندگی کی حامل ہوتیں ؟

کیا خداوند تعالیٰ کے علاوہ کوئی خالق ہے جو جانوروں کی بعض انواع کی اجتماعی زندگی کو اس قدر منظم کرے

کہ ان میں سے ہزاروں' ایک لمحے میں ایک مخصوص کام کریں اور ساری زندگی ان سے ذرا سی کوتاہی سرزد نہ ہو ؟

کیا خالق کے ایمان کے بغیر جانوروں کی بعض اقسام جن سے تو مطلع ہے ایسی منظم و مرتب اجتماعی زندگی بسر کرسکتے ہیں ؟ جب کہ ان کا کوئی سردار یا کمانڈر نہیں ہوتا اور ان میں مرتبے کے لحاظ سے کوئی بھی دوسرے پر فوقیت نہیں رکھتا۔ اجتماعی زندگی گزارنے والے جانوروں کی بعض اقسام اپنے فرائض انجام دینے میں اس قدر کوشاں ہوتی ہیں کہ وہ جانور جو جوانی ہی میں مرجاتے ہیں اور اگر وہ کم دوڑ دھوپ کریں تو اپنی حیوانی زندگی کی نسبت طویل عمر گزاریں گے۔

میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جو جانور سماجی زندگی بسر کرتے ہیں اور انسان' جو لگاتار محنت کے نتیجے میں جوانی میں فوت ہو جاتے ہیں وہ اس محنت سے خود فائدہ نہیں اٹھاتے بلکہ جس معاشرے میں وہ زندگی بسر کرتے ہیں وہ معاشرہ ان کی محنت سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

کیا ممکن ہے کہ ایک خالق پر ایمان لائے بغیر اور اس خالق کو اپنی تقدیر میں موثر جانے بغیر اس معاشرے کے راستے میں جس میں وہ زندگی گزار رہے ہیں اس قدر فداکاری کریں ؟

اے جابر' جان لو یہ بات محال ہے کہ ایک چیز موجود ہو لیکن وہ ایک خالق کی اطاعت نہ کرے' اور اس خالق کی اطاعت اس پر ایمان کی دلیل ہے۔

فقط انسان' جانور اور درخت خالق کی فرمانبرداری نہیں کرتے بلکہ جمادات بھی خالق کے فرمانبردار ہیں اور اگر فرمانبردار نہ ہوتے تو باقی رہنے کے لئے وجود میں نہ آتے۔ جابر نے پوچھا' انسانوں نے خداوند تعالیٰ کی صفات تک رسائی کہاں سے حاصل کی ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا' انہوں نے قرآن سے خداوند تعالیٰ کی صفات تک رسائی حاصل کی۔ جابر نے اظہار خیال کیا' میرا مقصد وہ قرآن نہیں جس پر میرا ایمان ہے بلکہ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اسلام سے قبل خداوند تعالیٰ کی صفات تک کیسے رسائی حاصل کی ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا خدا کی صفات جن کی انہوں نے معرفت حاصل کی ہے وہ کون کون سی ہیں ؟

جابر نے کہا' اسلام سے قبل توحید پرست اقوام کو معلوم تھا کہ خداوند تعالیٰ کا جسم نہیں ہے اور وہ کسی چیز سے وجود میں نہیں آیا اور دیکھا نہیں جاتا اور لامکان ہے یا کسی مکان میں نہیں سماتا' واحد ہے اور لاشریک ہے' اس کی صفات اس کی ذات پر زائد نہیں بلکہ اس کی ہر صفت اس کی ذات کا جزو ہے' وہ دانا اور توانا ہے وغیرہ وغیرہ' میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیسے ان لوگوں نے خداوند تعالیٰ کی صفات کی معرفت حاصل کی ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا' ان میں سے بعض صفات جن کا تم نے ذکر کیا' قرآن میں آئی ہیں اور میں قرآن کے حوالے سے تصدیق کرتا ہوں کہ وہ خداوند تعالیٰ کی صفات میں سے ہیں لیکن اگر کوئی صفت خداوند تعالیٰ سے منسوب کی

جائے اور قرآن میں ذکر نہ کی گئی ہو تو میں اس کی تصدیق نہیں کرتا۔

جابر نے کہا کیا آپ کی عقل تسلیم نہیں کرتی کہ وہ صفات خداوند تعالیٰ کی صفات ہیں ؟

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا' میری عقل ایک انسانی عقل ہے وہ خدا کی صفات کو درک نہیں کر سکتی اور وہ لوگ جنہوں نے قرآن سے قبل خدا کی صفات کا تذکرہ کرتے ہوئے خدا کی بعض صفات کو مثبت اور بعض کو منفی قرار دیا انہوں نے خود بخود قیاس کیا ہے۔ (۱۶۶)

جابر نے کہا میں آپ کا مقصد نہیں سمجھا ؟

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا' میں مثال دیتا ہوں تاکہ تم میرا مطلب سمجھ جاؤ۔

اسلام سے قبل ایک شخص خداوند تعالیٰ کی صفات معلوم کرنا چاہتا تھا' اس کا خیال تھا کہ خداوند تعالیٰ پرندوں کی مانند پرواز کر سکتا ہے اور اس کی پرواز کو وہ اس کی مثبت صفات میں شمار کرتا تھا۔

وہ شخص پرواز کرنے کو کیوں خداوند تعالیٰ کی مثبت صفات میں شمار کرتا تھا ؟

اس کا جواب یہ ہے چونکہ خود وہ پرواز نہیں کر سکتا تھا لہٰذا اس کا خیال تھا کہ خداوند تعالیٰ پرواز کرنے پر قادر ہے۔ یا یہ کہ ایک شخص کا خیال تھا کہ خداوند تعالیٰ مچھلی کی طرح پانی میں زندہ رہنے پر قادر ہے اور خداوند تعالیٰ کے پانی میں زندگی بسر کرنے کو وہ خدا کی مثبت صفات میں سے خیال کرتا تھا اور جو چیز اسے اس فکر میں لگائے رکھتی تھی وہ یہ تھی کہ وہ خود مچھلی کی مانند پانی میں زندگی بسر نہیں کر سکتا تھا۔ تیسرے کا خیال تھا کہ خداوند تعالیٰ کا جسم نہیں ہے اور جو چیز اسے اس فکر میں لگائے رکھتی تھی وہ یہ تھی کہ وہ خود جسم رکھتا تھا۔ لہٰذا وہ جسم نہ رکھنے کو خداوند تعالیٰ کی صفات (منفی صفات) میں سے جانتا تھا۔ ایک دوسرے کا خیال تھا کہ خداوند تعالیٰ لامکان ہے۔ چونکہ خود وہ لامکان نہیں بن سکتا تھا اور ہر حالت میں کسی مکان میں سمایا ہوتا تھا۔

لہٰذا مکان نہ ہونے کو وہ خداوند تعالیٰ کی منفی صفات میں سے شمار کرتا تھا۔ ایک شخص جھوٹا تھا اس کا خیال تھا کہ خداوند تعالیٰ سچ بولنے والا ہے کیونکہ خود وہ سچ نہیں بول سکتا تھا۔ خلاصہ یہ کہ' تمام وہ لوگ جنہوں نے خدا کی مثبت یا منفی صفات کو مدنظر رکھا انہوں نے وہ صفات جو خود ان میں موجود نہیں تھیں یا ان تک وہ رسائی حاصل نہیں کر سکتے تھے انہیں انہوں نے خدا کی صفات کا جزو سمجھا اور یہی وجہ ہے کہ اسلام سے قبل جتنی صفات بھی خداوند تعالیٰ کی توصیف میں بیان کی گئی ہیں عام طور پر مثبت یا منفی صفات ہیں انہیں میں خداوند تعالیٰ کی صفات کا جزو خیال نہیں کرتا ہوں مگر یہ کہ ان کا ذکر قرآن میں آیا ہو۔ کیونکہ انسانی عقل خداوند تعالیٰ کی صفات اور خصوصیات کو درک کرنے پر قادر نہیں ہے۔ (۱۶۷)

جابر نے کہا اس طرح تو جو کچھ قبل از اسلام خدا کی صفات کے متعلق کہا گیا بے بنیاد ہے۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا' وہ صفات مستثنیٰ ہیں جن کی اسلام نے تصدیق کی ہے باقی تمام صفات اسی دلیل کی

بنا پر بے بنیاد ہیں۔ جابر نے کہا جو کچھ آپ نے بیان فرمایا میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں لیکن کیا ہم خداوند تعالیٰ کی صفات کو درک کرنے کے لئے عقل کے علاوہ کوئی حربہ استعمال کر سکتے ہیں ؟

یہی عقل جس کی وجہ سے ہم خداوند تعالیٰ کے وجود کے قائل ہیں اور اسے اس جہان کا اور اپنا خالق سمجھتے ہیں اسی عقل کی وساطت سے ہمیں خداوند تعالیٰ کی صفات تک رسائی حاصل کرنا چاہئے۔ ہمارے پاس کوئی دوسرا وسیلہ نہیں ہے جس کے ذریعے ہم جان سکیں کہ وہ کن صفات کا مالک ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا' کیا تم نے پالتو بھیڑ دیکھی ہے ؟ جابر نے کہا خود میرے پاس ایک پالتو بھیڑ تھی۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔

چونکہ تم نے خود ایک بھیڑ کو پالا ہے لہٰذا تمہیں معلوم ہے کہ وہ تمہیں پہچانتی ہے اور جب تم اسے اشارہ کرتے ہو تو وہ تمہاری طرف آتی ہے اور تمہارے ہاتھ سے گھاس اور دوسری چیزیں جو اس کی پسند اور ذائقے کے مطابق ہوتی ہیں انہیں کھا جاتی ہے۔ وہ تمہارے اور دوسرے لوگوں میں فرق کرتی ہے۔ جب تم اسے اشارے سے بلاتے ہو تو وہ دوڑے ہوئے آتی ہے اور تمہارے ہاتھ سے گھاس اور دوسری چیزیں جو اس کی طبیعت اور ذائقے کے مطابق ہوتی ہیں کھاتی ہے وہ تمہیں خوب پہچانتی ہے اور اگر کوئی دوسرا اسے بلائے تو اس کی طرف نہیں جاتی' جونہی تم اسے اشارہ کرتے ہو وہ دوڑ کر تم تک پہنچتی ہے چونکہ وہ تمہیں پہچانتی ہے اور اسے معلوم ہے کہ تم دوسرے سے مختلف ہو۔

جابر نے امام جعفر صادقؑ کی گفتگو کی تصدیق کی۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ وہ بھیڑ جو تمہیں پہچانتی ہے اور تمہارے حکم کی تعمیل کرتی ہے کیا تمہاری صفات کو درک کر سکتی ہے ؟

کیا اس جانور کے لئے یہ بات جاننے کا امکان ہے کہ اس کے بارے میں تمہارا کیا ارادہ ہے ؟

وہ تمہیں پہچانتی ہے اور تمہارے حکم کی تعمیل کرتی ہے' اسے جو شعور عطا ہوا ہے اس کے ذریعے وہ تمہاری شناخت کرنے پر قادر ہے لیکن اس بات پر قادر نہیں کہ تمہاری صفات اور ارادوں حتیٰ کہ خود اس کے بارے میں تمہارے ارادوں سے مطلع ہو سکے اس مثال سے تم یہ سمجھ سکتے ہو کہ خدا کی پہچان کے لحاظ سے ہماری عقل کی حدود کہاں تک ہیں۔

ہم خدا کو پہچانتے ہیں اسے اپنا خالق سمجھتے ہیں اور اس کے فرمان کی اطاعت کرتے ہیں لیکن اس کی صفات تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ ہماری عقل اس قدر محدود ہے کہ اسے پہچانیں اور اس کے حکم کی تعمیل کریں ہم اس بات پر قادر نہیں ہیں کہ یہ جان سکیں کہ وہ کون ہے ؟ اور اس نے اس جہان کو کیوں خلق کیا اور اس دنیا کا خاتمہ کیا ہوگا اس کی نسبت ہماری عقل کی کیفیت پالتو بھیڑ کی مانند ہے جو تم سے مانوس ہے۔ کیا تمہاری بھیڑ جانتی ہے کہ تم کب پیدا ہوئے ؟ کیا وہ گھر جس میں وہ بھیڑ رہتی ہے اسے معلوم ہے کہ تم نے کب بنایا تھا ؟ کیا اسے معلوم ہے کہ وہ گھر کب تک باقی رہے گا کیا اس کے لئے یہ بات جاننا ممکن ہے کہ تم نے اس گھر کی

بناوٹ میں کیسا میٹریل استعمال کیا ہے ؟ اور اسے بنانے والے کون تھے ؟

اس کے باوجود کہ وہ تمہیں پہچانتی ہے اور تمہارے حکم کی تعمیل کرتی ہے ان میں سے کسی مسئلے سے آگاہ نہیں' ہم بھی جو انسانی عقل کے ذریعے خداوند تعالٰی کی معرفت حاصل کرتے ہیں ان میں سے کسی مسئلے سے آگاہ نہیں ہیں مگر صرف اس حد تک کہ جہاں تک قرآن ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ جابر نے کہا' میں جو اپنی انسانی عقل کے ذریعے اپنے خدا کی عبادت کرتا ہوں' مجھ میں اور اس بھیڑ میں ایک فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ میری صفات جاننے کے لئے تڑپ نہیں رکھتی جب کہ میں اپنے خدا کی صفات جاننے کا متلاشی ہوں۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا' تمہیں کیسے معلوم ہے کہ تمہاری پالتو بھیڑ تمہاری صفات سے آگاہی حاصل کرنے کی متلاشی نہیں ؟ تمہیں کہاں سے معلوم ہے کہ جب تم گھر میں نہیں ہوتے وہ جانور تمہاری فکر نہیں کرتا اور تمہیں اچھی طرح پہچاننے کی سعی نہیں کرتا ؟ تمہیں کیسے یقین ہے کہ تمہارے ہاتھ کی پالی بھیڑ تمہاری شناخت کی متلاشی نہیں ہے ؟ اگرچہ اس کا حیوانی شعور ایسا ہے کہ وہ تمہاری صفات تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی اور تمہاری زبان کو نہیں سمجھ سکتی لیکن صرف ایک حد تک۔

تجھے یہ سب معلوم ہے اور اسی وجہ سے جب کبھی اپنی پالتو بھیڑ سے بات چیت کرنا چاہتے ہو تو اس سے ایسی زبان میں بات کرتے ہو کہ وہ تمہارا مدعا سمجھ سکے۔ اور حقیقت میں اے جابر تم اس سے خود اس کی زبان میں مخاطب ہوتے ہو کیونکہ تمہیں معلوم ہے کہ اگر تم اس سے کسی دوسری زبان میں بات کرو گے تو وہ نہیں سمجھ سکے گی کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو ؟

اے جابر' یہ تصور نہ کرو کہ چونکہ خداوند تعالٰی عربی میں کلام کرتا ہے لہٰذا اس نے قرآن کو عربی میں نازل کیا ہے۔ خداوند تعالٰی' دانا و توانائے مطلق ہے' تمام زبانوں سے آگاہ ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اسے اپنا مطلب سمجھانے کے لئے زبان کی احتیاج نہیں۔

یہ ہم ہیں جنہیں اپنے جیسے انسانوں کا مدعا سمجھنے کے لئے زبان کی ضرورت ہوتی ہے اور خداوند تعالٰی نے قرآن کو عربی میں اس لئے نازل کیا ہے کہ اس کا پیغمبر عرب تھا اور عرب قوم میں زندگی بسر کر رہا تھا' لہٰذا قرآن کو ایسی زبان میں نازل کیا کہ اس کا پیغمبر اور وہ قوم جس میں وہ رہ رہا ہے اسے سمجھیں۔ اسی لئے قرآن بنی نوع انسان کی فہم و فراست کی حدود میں نازل ہوا اور جس طرح تم اپنی پالتو بھیڑ سے اس کی زبان میں گفتگو کرتے ہو خداوند تعالٰی نے بھی بنی نوع انسان کی زبان میں ہم سے کلام کیا نہ کہ اپنی فہم و فراست کے مطابق۔

# نیک و نحس گھڑیوں کے متعلق مفضل بن عمر کے استفسارات

امام جعفر صادقؑ کا ایک شاگرد مفضل بن عمر ہے جس کی باقیات میں امام جعفر صادقؑ کی تعلیمات کے آثار ملتے ہیں۔

ایک دن مفضل بن عمر نے اپنے استاد سے پوچھا' سعد و نحس اوقات جن کا تعین قسمت کا حال بتانے والے نجومی کرتے ہیں کی کیا حقیقت ہے ؟

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا' جادوگری کو باطل قرار دے کر اس کی مذمت کی گئی ہے اور خداوند تعالیٰ نے جادو سے منع کیا ہے۔ مفضل بن عمر نے کہا' سعد و نحس اوقات کو اکثر نجومی متعین کرتے ہیں اور وہ جادوگر نہیں ہیں امام جعفر صادقؑ نے اظہار فرمایا' وہ نجومی جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ سعد و نحس اوقات کا تعین کرتے ہیں وہ جادوگر ہیں اور دوسرے جادوگروں کی مانند انہیں بھی گمراہ قرار دے کر ان کی مذمت کی گئی ہے اور خداوند تعالیٰ نے ہر قسم کی جادوگری سے منع فرمایا ہے۔

مفضل بن عمر نے پوچھا پس وہ تمام لوگ جو قدیم زمانے سے آج تک سعد و نحس اوقات کے معتقد رہے ہیں کیا ان کا عقیدہ باطل تھا ؟

امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا ہاں اے مفضل' لیکن انسان کی زندگی میں موافق و ناموافق اوقات ہیں مفضل بن عمر نے اظہار خیال کیا' اگر ایسا ہے تو نجومیوں کے معین کردہ سعد و نحس اوقات میں اور ان میں کیا فرق ہے ؟

امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا' نجومیوں کے متعین کردہ سعد و نحس اوقات جادوگری کے ذریعے متعین کئے جاتے ہیں لیکن موافق و ناموافق اوقات کا تعلق انسان کے مزاج سے ہے اس کا جادوگری سے کوئی تعلق نہیں۔ ہر کسی کو چند دنوں میں ایک مرتبہ یا کبھی رات دن میں مزاج کے لحاظ سے موافق اور ناموافق حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان میں خون و بلغم و سودا و صفرا ہمیشہ ایک حال میں نہیں ہوتا دن رات کے اوقات میں ان کی مقدار میں فرق پڑتا ہے۔ اسی طرح انسانی جسم کے بعض اندرونی اعضاء دن و رات کے اوقات میں ایسے کام انجام دیتے ہیں جو متشابہ نہیں ہوتے قدیم زمانے میں لوگوں کی اس موضوع سے واقفیت تھی جن میں سے ایک حکیم بقراط بھی ہے جس نے کہا کہ جگر انسانی جسم میں چند کاموں کو انجام دیتا ہے لیکن ان کاموں کو ایک لمحے میں انجام نہیں دیتا بلکہ جگر کی طرف سے ہر کام کو انجام دینے میں وقت لگتا ہے وہ اس طرح کہ جگر کی طرف سے وہ کام ترتیب دیئے جاتے ہیں لیکن ہمارے مزاج کے حالات پر وہ چند دنوں یا کبھی ایک

رات و دن میں موثر واقع ہوتے ہیں۔

تمہیں بتانے کے لئے کہ کس طرح سعد و نحس اوقات ہمارے وجود میں ہیں نہ کہ اس صورت میں جس طرح جادوگر کہتے ہیں۔ تمہیں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ دن و رات میں خون کا گاڑھا ہونا ممکن ہے پانچویں حصے یا حتیٰ کہ چوتھائی حصے تک ہی ہو۔

ان معنوں میں کہ ہمارے خون کا گاڑھا پن صبح سو کر نماز کے لئے اٹھنے پر' اس وقت سے پانچواں یا چوتھا حصہ کم ہو جس میں ہم روزمرہ کے کاموں سے تھک کر سونے کا ارادہ کرتے ہیں یہ موضوع ہماری حالت پر موثر واقع ہوتا ہے اور کبھی ہمیں بے نشاط اور کبھی کم نشاط کر دیتا ہے جس کے نتیجے میں رات و دن میں خون کے گاڑھے پن کی کمی کے موقع پر ممکن ہے ہم خوش و خرم ہوں اور اسی طرح خون کے گاڑھے پن کی زیادتی کی وجہ سے بے نشاط ہو جائیں۔ جو لوگ سانس کی تنگی کا شکار ہیں اگر سانس کی تنگی کی دوائی آدھی رات کو کھائیں تو یہ دوائی دن کی نسبت زیادہ موثر ثابت ہوگی کیونکہ رات کو ان میں ایسی کیفیت وجود میں آتی ہے جو دوائی کے اثر کو دگنا کر دیتی ہے۔ اس قسم کے لوگوں کے لئے دوائی کھانے کے لئے آدھی رات ایک سعد گھڑی ہے چونکہ یہ گھڑی سانس کی تنگی کو دور کرنے میں موثر مدد کرتی ہے اور اگرچہ ایک دوائی کھانے سے آدھی رات کو سانس کی تنگی کا علاج نہیں ہوتا لیکن رات کی تکلیف رفع ہو جاتی ہے اور جو شخص سانس کی تنگی میں گرفتار ہے' سو سکتا ہے۔

بعض غذائیں جو ہم کھاتے ہیں ہمارے لئے سعد ہیں اور بعض نحس' وہ غذائیں جن کے کھانے سے جسم بیمار نہیں ہوتے یا ہم اپنے آپ کو بوجھل محسوس نہیں کرتے اور ہمارے کام میں مانع نہیں ہوتیں اور ان کے کھانے سے ہم طاقت محسوس کرتے ہیں اور ہلکے بھی رہتے ہیں ایسی غذاؤں کو سعد کہا جا سکتا ہے۔

لیکن وہ غذائیں جن کے کھانے کے بعد ہم بھاری پن اور بوجھ محسوس کرتے ہیں اس طرح کہ ہم کام نہیں کر سکتے ایسی غذائیں نحس ہیں چونکہ انہوں نے ہم پر منفی اثرات مرتب کئے ہیں۔

اے مفضل' سعد و نحس کا مسئلہ ہماری زندگی میں اس طرح ہے اور ہمارے مزاج سے وابستہ مسائل کی حدود سے باہر سعد و نحس کا وجود نہیں' مفضل نے پوچھا' کیا یہ ممکن ہے کہ آپ ستاروں کی تعداد بتا سکیں ؟

امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا' خداوند تعالیٰ کے علاوہ کوئی بھی ستاروں کی تعداد سے آگاہ نہیں۔

مفضل نے پوچھا' کیا اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا کہ ستاروں کی تعداد کتنی ہے ؟

امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا' اندازا" بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ستاروں کی تعداد کتنی ہے۔ مفضل نے پوچھا آسمان کا روشن ترین ستارہ کونسا ہے ؟ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا' کیا تیرا مطلب آسمان کے ستاروں کی حقیقی روشنی ہے یا وہ روشنی جو ہم تک پہنچتی ہے ؟

مفضل نے کہا' میں سوال نہیں سمجھا' امام جعفر صادقؑ نے اظہار خیال فرمایا' میرا مطلب یہ ہے کہ ہم سیاروں کو ستاروں سے زیادہ چمک دار اور روشن دیکھتے ہیں چونکہ وہ ہمارے زیادہ نزدیک ہیں لیکن ستاروں کی روشنی سیاروں سے کہیں زیادہ ہے۔ مفضل نے پوچھا' سیاروں میں کونسا سب سے زیادہ روشن ہے ؟

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا' سیاروں میں سب سے زیادہ روشن زہرہ ہے اور تم سال کے بعض مہینوں میں اسے اس قدر روشن دیکھو گے کہ تم محسوس کروگے کہ یہ دوسرا چاند ہے جب کہ زہرہ بھی چاند کی مانند سورج سے روشنی حاصل کرتا ہے' اس کی اپنی روشنی نہیں ہوتی۔

لیکن چاند کی روشنی زہرہ کی روشنی جتنی نہیں ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے زہرہ کی زمین کو ایسے مادے یا مواد سے بنایا ہے جو روشنی کو آئینے کی مانند منعکس کرتی ہے اور جس مواد یا مادے سے چاند بنایا گیا ہے وہ زہرہ کی مانند منعکس کرنے کی استعداد نہیں رکھتا۔

مفضل نے پوچھا' زہرہ کے بعد سب سے روشن سیارہ کونسا ہے ؟

امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا' اس کے بعد مشتری تمام سیاروں سے زیادہ روشن ہے اور بعض لوگ اسے غلطی سے زہرہ خیال کرتے ہیں۔

مفضل نے پوچھا' ستاروں میں کونسا ستارہ زیادہ روشن ہے ؟ امام جعفر صادقؑ مسکرا کر کہنے لگے اے مفضل ہمارے آباء و اجداد جو صحراؤں میں زندگی بسر کرتے تھے وہ آسمان کے روشن ستاروں کو بخوبی پہچانتے تھے اور راتوں کو راستے طے کرنے کے دوران بیابان میں ستاروں کی مدد سے راستہ معلوم کرتے تھے۔

لیکن چونکہ ہم اپنے آباء و اجداد کی مانند صحراؤں میں زندگی بسر نہیں کرتے لہٰذا ہمیں ستاروں کی شناخت نہیں اور جان لو کہ آسمان پر سب سے درخشندہ ستارہ "شعرائے یمانی" (۶۸) ہے اور یہ ستارہ صحرائی زندگی بسر کرنے والے ہمارے آباء و اجداد کے نزدیک مشہور تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ یہ ستارہ سال کے کس ماہ میں آسمان کے کونسے مقام سے طلوع کرتا ہے اور اس کا نام بھی انہوں نے رکھا ہے۔

شعرائے یمانی کے بعد آسمان کا سب سے روشن ستارہ "سماک رامح" ہے (۶۹) اور اس ستارے کو بھی صحراؤں میں زندگی بسر کرنے والے ہمارے آباء و اجداد بخوبی پہچانتے تھے۔ اس ستارے کے نام کا انتخاب بھی انہوں نے ہی کیا تھا۔ اگر تجھے آسمان کے تمام ستاروں کو درخشندگی کے مرتبے کے لحاظ سے پہچاننے میں دلچسپی ہے تو میں بطلیموس کی فراہم کردہ ستاروں کی اس تصویر کو تمہارے اختیار میں دونگا' جس میں نہ صرف یہ کہ ستاروں کے نام اور ان کی تصاویر ہیں بلکہ آسمان پر ان کا مقام اور ہر شکل کے تمام کوائف اور ان کا ایک جدول بھی اس میں موجود ہے اور اس میں آسمان کے درخشندہ ترین ستاروں کا ذکر بھی ان کی درخشندگی کے لحاظ سے درج ہے۔

مفضل نے کہا' اگر یہ مجموعہ مجھے عنایت فرمائیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ امام جعفر صادقؑ نے مدرسے کے

خادم کو کہا' جاؤ اور اس کتاب کو لے آؤ' اتنے میں وہ گیا اور کتاب لے کر آ گیا' اور جب امام جعفر صادقؑ کو اطمینان ہو گیا کہ یہ وہی کتاب ہے تو انہوں نے اسے مفضل کو دے دیا۔

مفضل نے کتاب لے لی اور جعفر صادقؑ نے کہا بطلیموس نے اس پر غور نہیں کیا کہ ستاروں میں سے ہر ایک ستارہ روشن ہے اور بعض تو ان میں سے اتنے روشن ہیں کہ ان کی روشنی سورج سے زیادہ ہے اور اس موضوع سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا حجم اور مادہ سورج سے کہیں زیادہ ہے۔

شعرائے یمانی اور سماک رامح' ان میں سے ہر دو سورج سے کہیں زیادہ بڑے ہیں لیکن چونکہ یہ دونوں بہت زیادہ دور ہیں للذا ہم ان کی روشنی کو اچھی طرح سے نہیں دیکھ پاتے اور اگر سورج بھی اس طرح دور ہوتا تو اسے بھی آسمان کے کسی ساکن ستارے کی مانند دیکھتے۔

مفضل کو جب کتاب ملی اور اس نے کتاب کے صفحات پر نگاہ ڈالی تو کہا کتاب کے بارے میں فرمایئے جعفر صادقؑ نے فرمایا کتاب کے متعلق بحث ایک طویل بحث ہے چونکہ یہ کتاب قدیم زمانے میں وجود میں آئی اور یہاں تک کہ اس موجودہ شکل میں یہاں تک پہنچی اور گزشتہ زمانے میں پہلے تو خط بھی نہ تھا کہ کتابت ہو سکتی اور دوسرا یہ کہ کاغذ نہ تھا جس پر لکھا جاتا اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ بنی نوع انسان نہیں جانتے تھے کہ کوئی قابل غور بات لکھیں اور اسے کتابی شکل میں لائیں۔

پہلی کتاب پیغمبروں نے لکھی اور یہ فطری بات ہے کہ انہوں نے اس زمانے میں کتاب لکھنے کی ابتدا کی جب آدمی نے تحریر کے لئے خط ایجاد کر لیا تھا۔ جب خط ایجاد ہوا تو مصریوں کی مانند بعض اقوام نے خط کو درختوں کے پتوں پر لکھا' اور وہ اس طرح کہ کسی مخصوص درخت کے پتے جو مصر میں اگتا ہے لے کر آپس میں جوڑ لیا جاتا تھا اور جب ان کی سیاہی خشک ہو جاتی تو انہیں نلکی کی مانند لپیٹ لیا جاتا اور پھر کتاب کی شکل میں لے آتے تھے۔ قدیم مصریوں میں جن کتابوں پر لکھا جاتا ہے ان میں بعض کی لمبائی چالیس کنال تک بھی تھی۔

چونکہ بعض اقوام مصریوں کی مانند اس درخت کے پتوں تک رسائی نہیں رکھتی تھیں للذا وہ لکھنے کے لئے جانوروں کے چمڑے اور خصوصاً" بکری اور بھیڑ کے چمڑے کا انتخاب کر کے اس پر لکھتی تھیں اور جب اپنے لکھے ہوئے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے باقی رکھنا چاہتیں تو پھر کندہ کرتی تھیں تاکہ وہ آب وہوا کے زیر اثر مٹ نہ جائے۔

مفضل نے پوچھا' تحریر کے لئے کاغذ کیسے ایجاد ہوا ؟

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کاغذ چینیوں کی ایجاد ہے۔ ان لوگوں نے ریشم سے کاغذ بنایا۔ اس کے ایک عرصے بعد ہم عربوں سمیت دوسری اقوام نے چینیوں سے کاغذ تیار کرنا سیکھا لیکن ابھی تک ہمیں یہ معلوم نہیں کہ ریشم سے کاغذ کیسے بنایا جاتا ہے ؟ اسی وجہ سے اب بھی اعلیٰ کوالٹی کا کاغذ چین سے برآمد کیا جاتا ہے اور ہمارے تاجر یہ کاغذ کشتیوں کے ذریعے چین سے لاکر اس شہر اور دوسرے شہروں میں بیچتے ہیں اور چونکہ یہ کاغذ یہاں

تک پہنچتے پہنچتے کافی مہنگا پڑ جاتا ہے لہٰذا درس کے موقع پر ہم حتیٰ الامکان تختی سے استفادہ کرتے ہیں۔
مفضل نے پوچھا' یہاں ریشم سے کاغذ کیوں نہیں بنایا جاسکتا ؟

امام جعفر صادقؑ نے جواب دیا' کیونکہ ریشم سے کاغذ بنانے کے لئے ریشم کے کیڑے پالنے پڑتے ہیں اور یہاں اس پر اس جانب اتنی توجہ نہیں دی جاتی کیونکہ شہتوت جس کے پتے ریشم کے کیڑوں کی خوراک ہیں یہاں بہت کم پائے جاتے ہیں۔ ریشم کے کیڑے پالنے کے بعد ریشم سے کاغذ بنانے کا طریقہ بھی جاننا چاہئے تاکہ ریشمی کاغذ تیار ہو سکے اور چین میں ریشم سے کاغذ بنانے کی روش (Technique) کو غیروں سے پوشیدہ رکھا جاتا ہے۔ غیروں کو ہرگز ریشم سے کاغذ بنانے کی جگہوں پر ملازم نہیں رکھا جاتا تاکہ غیر لوگ ریشم سے کاغذ بنانے کا طریقہ نہ معلوم کرلیں' جس طرح چینیوں نے چینی کے برتن بنانے اور ان پر بیل بوٹے ڈالنے کے سارے مراحل اغیار سے چھپا رکھے ہیں۔ اس کے باوجود سب جانتے ہیں چینی کے برتن ایک قسم کی مٹی سے تیار ہوتے ہیں جو بھٹی میں پکائی جاتی ہے۔ لیکن ابھی تک اغیار کو یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ ان برتنوں کی مٹی کہاں سے حاصل کی جاتی ہے اور کیسے پکائی جاتی ہے اور ان برتنوں پر نقش و نگار کیسے بنائے جاتے ہیں اور کس مواد سے بنائے جاتے ہیں ؟ کہ جب وہ برتن بھٹی میں ڈالے جاتے ہیں تو ان کے رنگ کی جلا باقی رہتی ہے۔ اور نہایت گرم آگ جو مٹی کو پکا کر ایک مضبوط برتن کی شکل دے دیتی ہے چینی کے ان برتنوں کے نقش و نگار کی جلا کو ختم نہیں کر سکتی اور جس طرح چینی اغیار کے مزدوروں کو اپنے ریشم سے کاغذ بنانے والی جگہوں میں کام کرنے کی اجازت نہیں دیتے اسی طرح اغیار کو چینی کے برتن بنانے کی جگہوں پر بھی کام نہیں کرنے دیتے۔ میں نے سنا ہے کہ اس قسم کے برتن بنانے کے کارخانے والدین سے اولاد کو وراثت میں ملتے ہیں اور ان میں کام کرنے والے تمام مزدور یا ان کے دوست ہوتے ہیں یا عزیز وغیرہ' ان پر اس کارخانے کے مالک کا پورا اعتماد ہوتا ہے کہ وہ چینی کے برتنوں کی ساخت کے رازوں سے پردہ نہیں اٹھائیں گے۔

# کرامات امام جعفر صادق علیہ السلام

علامہ عبدالرحمٰن ملا جامی رحمت اللہ علیہ نے اپنی مشہور کتاب "شواہد النبوۃ" میں ائمہ طاہرین علیہم السلام کی اکثر کرامات کا ذکر کیا ہے ملا جامی ایسے عاشق رسولؐ اور محب آل رسولؐ تھے کہ مروی ہے آپ جب بارگاہ رسالتؐ میں حاضر ہونے کے لئے آئے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے والی مدینہ کو خواب میں حکم دیا کہ "میرے عاشق کو شہر کے باہر روک لیا جائے ورنہ جس جذب و کیف میں وہ آرہا ہے مجھے اس کی حوصلہ افزائی کے لئے گنبد خضریٰ سے باہر آنا پڑے گا"

اس واقعہ سے علامہ جامی کی عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ملا جامی نے امام جعفر صادق علیہ السلام کی جو کرامات بیان کی ہیں ان میں سے چند کو بحوالہ کتاب "ذکر اہل بیت" مولفہ محمد رفیق بٹ صاحب اس کتاب کی زینت بنانے کا شرف حاصل کیا جاتا ہے۔

## کرامت نمبرا

ایک دن منصور نے اپنے دربان کو ہدایت دی کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کو میرے پاس پہنچنے سے پہلے شہید کر دینا۔ اسی دن حضرت امام جعفر صادقؓ تشریف فرما ہوئے اور منصور عباسی کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ منصور نے دربان کو بلایا اس نے دیکھا کہ حضرت امام جعفر صادقؓ تشریف فرما ہیں۔ جب واپس تشریف لے گئے تو منصور نے دربان کو بلا کر کہا میں نے تجھے کس بات کا حکم دیا تھا۔ دربان بولا خدا کی قسم میں نے حضرت امام جعفر صادقؓ کو آپ کے پاس آتے دیکھا ہے نہ جاتے بس اتنا نظر آیا کہ وہ آپ کے پاس بیٹھ گئے تھے۔

## کرامت نمبر۲

منصور کے ایک دربان کا بیان ہے کہ میں نے ایک روز اسے غمگین و پریشان دیکھا تو کہا اے بادشاہ ! متفکر کیوں ہیں بولا میں نے علویوں کے ایک بڑے گروہ کو مروا دیا ہے لیکن ان کے سردار کو چھوڑ دیا ہے میں نے پوچھا وہ کون ہے ؟ کہنے لگا وہ جعفر بن محمدؓ ہے میں نے کہا۔ وہ تو ایسی ہستی ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں محو رہتی ہے۔ اسے دنیا کا کوئی لالچ نہیں۔ خلیفہ بولا مجھے معلوم ہے تم اس سے کچھ ارادت و عقیدت رکھتے ہو لیکن میں نے قسم کھائی ہے کہ جب تک میں اس کا کام تمام نہ کرلوں آرام سے نہیں بیٹھوں گا۔ چنانچہ اس نے جلاد کو حکم دیا کہ جونہی جعفر بن محمدؓ آئیں میں اپنا ہاتھ اپنے سر پر رکھ لوں گا تم انہیں شہید کر دینا۔ پھر امام جعفر صادقؓ کو بلایا۔ میں آپ کے ساتھ ساتھ ہولیا۔ میں نے دیکھا کہ آپ زیر لب کچھ پڑھ رہے ہیں جس کا مجھے پتہ نہ چلا لیکن میں نے اس چیز کا مشاہدہ ضرور کیا کہ منصور کے محلوں میں ارتعاش پیدا ہوگیا۔ وہ ان سے اس طرح باہر نکلا جیسے ایک کشتی سمندر کی تند و تیز لہروں سے باہر آتی ہے۔ اس کا عجیب حلیہ تھا۔ وہ لرزہ براندام' برہنہ سر اور برہنہ پاؤں امام جعفر صادقؓ کے استقبال کے لئے آیا اور آپ کا بازو پکڑ کر اپنے ساتھ تکیہ پر بٹھایا اور کہنے لگا۔ اے ابن رسول اللہ ﷺ آپ کیسے تشریف لائے ؟ آپ نے فرمایا۔ تو نے بلایا اور میں آگیا۔ پھر کہنے لگا کسی چیز کی ضرورت ہو تو فرمائیں۔ آپ نے فرمایا مجھے بجز اس کے کسی چیز کی ضرورت نہیں کہ تم مجھے یہاں بلایا نہ کرو۔ میں جس وقت خود چاہوں گا آجایا کروں گا۔ آپ اٹھ کر باہر تشریف لے گئے تو منصور نے اسی وقت رات

کو سونے کا لباس طلب کیا اور رات گئے تک سوتا رہا یہاں تک کہ اس کی نماز قضا ہو گئی۔ بیدار ہوا تو نماز ادا کر کے مجھے بلایا اور کہا جس وقت میں نے جعفر بن محمد علیہ السلام کو بلایا تو میں نے ایک اژدہا دیکھا جس کے منہ کا ایک حصہ زمین پر تھا اور دوسرا میرے محل پر۔ وہ مجھے فصیح و بلیغ زبان میں کہہ رہا تھا مجھے اللہ نے بھیجا ہے اگر تم سے حضرت امام جعفر صادقؓ کو کوئی گزند پہنچی تو تیرے محل سمیت فنا کردوں گا۔ اس پر میری طبیعت غیر ہوگئی جو تم نے دیکھ ہی لی ہے۔ میں نے کہا یہ جادو یا سحر نہیں ہے یہ تو اسم اعظم (قرآن کریم) کی خاصیت ہے جو حضور نبی کریم ﷺ پر نازل ہوا تھا چنانچہ آپ نے جو چاہا وہی ہوتا رہا۔

## کرامت نمبر ۳

ایک راوی کا بیان ہے کہ ہم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے ساتھ حج کے لئے جا رہے تھے کہ راستے میں ایک جگہ کھجور کے سوکھے درختوں کے پاس ٹھہرنا پڑا۔ حضرت امام جعفر صادقؓ نے زیر لب کچھ پڑھنا شروع کردیا جس کی مجھے کچھ سمجھ نہ آئی۔ اچانک آپ نے سوکھے درختوں کی طرف منہ کر کے فرمایا اللہ نے تمہیں ہمارے لئے رزق ودیعت کیا ہے۔ اس سے ہماری ضیافت کرو۔ میں نے دیکھا کہ وہ جنگلی کھجوریں آپ کی طرف جھک رہی تھیں جن پر تر خوشے لٹک رہے تھے۔ آپ نے فرمایا۔ آؤ ! اور بسم اللہ کر کے کھاؤ۔ میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے کھجوریں کھالیں۔ ایسی شیریں کھجوریں ہم نے پہلے کبھی نہ کھائی تھیں۔ اس جگہ ایک اعرابی موجود تھا اس نے کہا آج جیسا جادو میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہم پیغمبروں کے وارث ہیں' ہم ساحر و کاہن نہیں ہوتے ہم تو دعا کرتے ہیں جو اللہ قبول فرمالیتا ہے۔ اگر تم چاہو تو ہماری دعا سے تمہاری شکل بدل جائے اور تم ایک کتے میں تبدیل ہوجاؤ۔ اعرابی چونکہ جاہل تھا کہنے لگا ہاں ابھی دعا کرو۔ آپ نے دعا کی تو وہ کتا بن گیا اور اپنے گھر کی طرف بھاگ گیا۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے مجھے فرمایا اس کا تعاقب کرو۔ میں اس کے پیچھے گیا تو وہ اپنے گھر والوں کے سامنے اپنی دم ہلانے لگا۔ انہوں نے اسے ڈنڈا مار کر بھگا دیا۔ میں نے واپس آکر تمام حال کہہ سنایا۔ اتنے میں وہ کتا بھی آگیا اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے سامنے زمین پر لوٹنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے پانی ٹپکنے لگا۔ حضرت امام جعفر صادقؓ نے اس پر رحم کھا کر دعا فرمائی تو وہ دوبارہ انسانی شکل میں آگیا۔ پھر آپ نے فرمایا اے اعرابی ! میں نے جو کچھ کہا تھا اس پر یقین ہے کہ نہیں ؟ کہنے لگا۔ ہاں حضور ! ایک بار نہیں ہزار بار اس پر ایمان و یقین رکھتا ہوں۔ کفار آپ کے جد حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو بھی (معاذ اللہ) جادوگر کہا کرتے تھے اور ان کی آل پاک کے بارے میں بھی یہی خیال کرنے لگے۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ کافروں میں سے ہوتے تھے اور میں منکرین میں سے تھا۔ اس پر بھی خوشی ہے کہ کتا بننے کے بعد راہ راست پر تو آگیا۔

## کرامت نمبر۴

ایک آدمی آپ کے پاس دس ہزار دینار لے کر آیا اور کہا۔ میں حج کے لئے جا رہا ہوں آپ میرے لئے اس پیسے سے کوئی مکان خرید لیں تاکہ میں حج سے واپسی پر اپنے اہل و عیال سمیت اس میں رہائش اختیار کروں۔ حج سے واپسی پر وہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایامیں نے تمہارے لئے بہشت میں مکان خرید لیا ہے جس کی پہلی حد حضورؐ پر، دوسری حضرت علیؑ پر، تیسری حضرت حسنؑ پر اور چوتھی حضرت حسینؑ پر ختم ہوتی ہے۔ یہ لو میں نے اس کا پروانہ بھی لکھ دیا ہے۔ اس نے یہ بات سنی تو کہا میں اس پر بہت خوش ہوں۔ چنانچہ وہ پروانہ لے کر اپنے گھر چلا گیا۔ گھر جاتے ہی بیمار ہوگیا اور وصیت کی کہ اس پروانے کو میری وفات کے بعد میری قبر میں رکھ دینا۔ اس کے لواحقین نے اس کو دفن کرتے وقت اس پروانے کو بھی اس کی قبر میں رکھ دیا۔ دوسرے دن وہی پروانہ قبر پر پڑا ہوا ملا اور اس کی پشت پر یہ مرقوم تھا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا ہوگیا۔

## کرامت نمبر۵

ابن جوزی نے کتاب "صفۃ الصفوۃ" میں لیث بن سعد سے بہ اسناد خود روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں موسم حج میں مکہ معظمہ میں نماز عصر ادا کر رہا تھا۔ فراغت کے بعد کوہ ابو قبیس کی چوٹی پر چڑھ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں ایک شخص بیٹھا ہوا دعا مانگ رہا ہے۔ ابھی اس کی دعا ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ میں نے وہاں ایک گچھا انگوروں کا اور نئی چادریں پڑی ہوئی دیکھیں۔ اس موسم میں انگور کہیں بھی دستیاب نہ تھے۔ جب وہ روانہ ہوا تو میں بھی اس کے پیچھے چلا گیا۔ جب ہم صفا و مروہ پر پہنچے تو اسے ایک سوالی ملا جس نے کہا اے فرزند رسولؐ! میرا تن ڈھانپئے اللہ تعالیٰ آپ کا تن ڈھانپے گا۔ انہوں نے وہ دونوں چادریں اسے دے دیں۔ میں نے سوالی سے پوچھا یہ چادریں دینے والے کون ہیں؟ تو اس نے کہا۔ یہ جعفر بن محمد علیہ السلام ہیں۔

# حواشی

(۱) امام جعفر صادقؑ کی تاریخ ولادت اور شہادت میں مورخین کا تین سال کا اختلاف ہے۔ بعض نے سن ولادت ۸۰ھ لکھا ہے۔

(۲) یوہان گریگر مینڈل اٹلی کا مذہبی عالم تھا جو ۱۸۲۲ء میں پیدا ہوا۔ وہ ۱۸۸۴ء میں فوت ہوا۔ اس نے ایک نسل سے دوسری نسل تک خاندانی اوصاف (Hereditory Charactors) منتقل ہونے کا قانون دریافت کیا۔

(۳) یہ بات حتمی نہیں لہٰذا مطلب تصحیح طلب ہے کیونکہ زچہ خانوں میں کئی بچے دانتوں کے ساتھ پیدا ہوئے ہیں۔ (مترجم)

(۴) ٹالسٹائی ایک رومی مورخ ہے جو ۵۵ء میں پیدا ہوا۔ تقریباً" دوسو کتب کا مصنف ہے جن میں تین باقی ہیں۔ ایک "جرمینا" جو جرمن قبائل کے بارے میں ایک جلد پر مشتمل ہے اور دوسری تاریخ جو چار جلدوں پر اور تیسری سالنامہ جو بارہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ تاریخ جو تحت اللفظی معنوں میں استعمال ہوا ہے اس کا مطلب ہے پانی دینے یا پلانے کے دوران۔ ٹالسٹائی ۱۱۸ء میں فوت ہوا۔

(۵) مغرب اور افریقہ کے مسلمان مورخین عموماً" اپنے نام عربی میں لکھتے پڑھتے تھے۔ رندقہ کو "ر" کی کسر اور "ن" کے سکون کے ساتھ پڑھا جائے۔

(۶) یہ وضاحت خلاف واقعہ ہے کیونکہ شیعہ رسولؐ کے علم وہبی کا اعتقاد رکھتے ہیں اور آپؐ کو پیدائشی عالم مانتے ہیں۔

(۷) جب یثرب کا نام تبدیل ہوکر مدینہ ہوا تو اس کے کچھ نواحی دیہاتوں کے نام بھی بدل گئے۔ اسی طرح طنفہ کے بارے میں معلوم نہیں کہ یہ اس کا پرانا نام ہے یا جدید گاؤں کا نام ہے۔

(۸) ہمارا عقیدہ ہے کہ امام کا علم وہبی ہوتا ہے۔ اسے ہر شے کا علم ہوتا ہے لیکن مرکز تحقیقات اسلامی اسٹراسبرگ صرف تاریخی نقطہ نگاہ سے اسلامی مسائل کا مطالعہ کرتا ہے۔ حالانکہ بیشک امام محمد باقرؑ بطلیموس نجوی کے نظام میں خرابی سے باخبر تھے۔

(۹) جو لائبریری عربوں کے ہاتھوں خاکستر ہوئی اس کا مفصل تذکرہ قلوپطرہ ملکہ مصر کی آپ بیتی میں موجود ہے۔

(۱۰) نیوٹن ایک انگریز تھا۔ افسوس ہے کہ تاریخ نے اس کے بارے میں مبالغہ سے کام لیا ہے اور کا پلر جیسے نابغہ روزگار جرمن دانشور کے حق کا بعض حصہ نیوٹن کے پلڑے میں ڈال دیا ہے اور کا پلر جس نے سیاروں کی

سورج کے گرد حرکت کے بارے میں تین قوانین وضع کئے نیوٹن سے پہلے قوت کشش کا قانون وضع نہ کرسکا تھا۔ نیوٹن نے جو کاپلر کی موت کے بارہ سال بعد ۱۶۴۲ء میں پیدا ہوا تھا' کاپلر کے ایجادکردہ قوانین سے قوت کشش کو دریافت کیا۔ کاپلر نے کہا کہ دو جسموں کی قوت کشش ان کے وزن کے راست متناسب اور ان کے درمیانی فاصلے کے مربع کے معکوس متناسب ہوتی ہے جبکہ وہ دونوں جسم خط مستقیم میں ہوں۔ نیوٹن نے قوت تجاذب کے قانون کو دریافت کرنے کے بعد کہا کہ دو جسموں کی قوت کشش ان کے وزن کے راست متناسب اور ان کے درمیانی فاصلے کے جذر کے بالعکس متناسب ہوتی ہے جبکہ دونوں جسم خط مستقیم میں ہوں۔ پس اس سے ثابت ہوا کہ کاپلر کے نظریئے نے نیوٹن کی اس ضمن میں خاصی مدد کی نہ کہ سیب کے گرنے نے۔ پس تاریخ علوم میں Law of Force of Attraction کے ضمن میں تمام کریڈٹ نیوٹن کو نہیں دینا چاہئے کیونکہ اس طرح کاپلر کی حق تلفی ہوگی۔

(۱۱) باوجودیکہ کوپرنیک کو معلوم تھا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے وہ روزی کمانے کے لئے اپنے جو کیلنڈر شائع کرتا تھا ان میں سورج کو زمین کے گرد گھومتا دکھاتا تھا۔ مقدر پر ستاروں کے اثرات کا قائل بھی نہ تھا مگر اپنے کیلنڈروں میں نیک اور بد ایام متعین کرتا تھا۔

(۱۲) ورون اٹلی کا ایک شہر ہے جہاں بارھویں صدی عیسوی میں یہ قانون بنایا گیا۔ اس وقت یہ شہر ایک آزاد ریاست تھی۔

(۱۳) ارجوزہ ابن سینا الجزیرہ یونیورسٹی کا شائع شدہ ہے جو ۱۰۲۶ بیت پر مشتمل ہے۔ ان اشعار کا لاطینی ترجمہ بھی ہے۔ ابن سینا نے طب کے بارے میں ۱۰۲۶ مختصر اشعار کہے ہیں۔

(۱۴) اصطلاح جدید میں نجومی اسے اوریگا کہتے ہیں۔

(۱۵) سواک کپڑے صاف کرنے والے کو کہتے ہیں' اسی سے مسواک ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لباس کی حفاظت کرتے تھے۔

(۱۶) مالیکیول کسی مرکب کا چھوٹے سے چھوٹا ذرہ ہے جس میں تمام خواص پائے جاتے ہیں۔ مالیکیول کے لحاظ سے ہم مادہ کو تین حالتوں میں پاتے ہیں ٹھوس' مائع اور گیس۔ جب مالیکیول میں فاصلہ کم ہو تو ہم مادے کو ٹھوس حالت میں پاتے ہیں اور جب تھوڑا زیادہ ہو تو مائع حالت میں۔ اسی طرح جب یہ فاصلہ بہت زیادہ ہو تو گیس کی حالت میں۔

(۱۷) لفظ صابئ میں ب ہمزہ سے پہلے آئی ہے اور صابئین کا ذکر قرآن میں بھی آیا ہے۔

(۱۸) اس کتاب کے فرانسیسی اور انگریزی میں متن ملتے ہیں۔

(۱۹) تذکرۃ الاولیاء کا لکھنے والا محمد عطار نیشاپوری جس کا لقب فریدالدین عطار ہے۔۵۴۰ھ قمری میں پیدا ہوا

اور ۶۲۸ھ میں جب منگولوں نے نیشاپور پر حملہ کیا تو قتل ہوا۔ اس کی تمام کتب مثلاً "منطق الطیر" الٰہی نامہ، اسرارنامہ وغیرہ منظوم ہیں۔ صرف تذکرۃ الاولیاء نثر میں ہے۔ یہ کتاب عرفاء اور بڑے بڑے صوفیاء کے حالات پر مشتمل ہے۔

(۲۰) شیخ ابوالحسن خرقانی بسطام کے علاقے خرقان میں ۳۵۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۴۲۵ھ قمری میں فوت ہوئے۔ یہ رباعی جس کے بارے میں لوگوں کا خیال ہے کہ عمرخیام کی ہے دراصل شیخ ابوالحسن خرقانی کی ہے۔

اسرار ازل را نہ تو دانی و نہ من و این حرف معما نہ تو خوانی و نہ من

اندر پس پردہ گفتگو گوئی من و تو چون پردہ برافتد نہ تو مانی و نہ من

(۲۱) یورپی محققین کا خیال ہے کہ زردشتی مذہب دو خداؤں کے تصور پر قائم ہے۔ حالانکہ زردشتی موحد ہیں اور اہریمن یعنی شیطان سے ان کا خوف اور بچنا اس لئے نہیں تھا کہ وہ دوسرا خدا ہے بلکہ جس طرح قرآن میں شیطان سے بچنے کی بار بار تاکید آئی ہے بالکل ویسے ہی ہے اور کوئی اسے خدا نہیں سمجھتا۔

(۲۲) زردشتی توحید پرست ہیں لیکن اگر یورپ والے منفی اور مثبت قطب کو ان کے مذہبی افکار کے ثبوت کے طور پر انہی کی طرف سے پیش کرتے ہیں تو اس طرح عیسائی اور ہندو بھی فزکس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ ایٹم جو دنیا کی بنیادی اینٹ ہے تین اجزاء سے مل کر بنا ہے پروٹان، نیوٹران اور الیکٹران جو بالترتیب مثبت چارج والے، بغیر چارج کے اور منفی چارج والے ہوتے ہیں۔ لیکن فارسی مترجم ذبیح اللہ منصوری کا کہنا ہے کہ انہوں نے امریکہ کے رسالہ Knowledge میں ایٹم کے اندر پچاس اجزاء کی دریافت کے متعلق پڑھا ہے۔

(۲۳) ابوالقاسم محمودی زمخشری، خوارزم کے ایک قریہ زمخشر میں پیدا ہوئے۔ چونکہ وہ مکہ کے مجاہد ہوگئے اس لئے ان کا لقب جاراللہ ہوگیا۔ ان کا زمانہ نوسو سال قبل کا ہے۔ انہوں نے متعدد کتب تحریر کی ہیں جن میں تفسیر کشاف اور ربیع الابرار بہت مشہور ہیں۔

(۲۴) ترجمان الممالک مرحوم مرتضٰی فرہنگ جو کئی غیرملکی زبانوں پر عبور رکھتے تھے کیمبرج یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ کچھ عرصہ پیرس کی یونیورسٹی میں پڑھایا۔ وہ بلند پایہ صاحب فصاحت لکھاری تھے۔

(۲۵) کیونکہ قدیم مصر کے تمام شہر ساحل نیل پر آباد تھے اور تمام قبرستان دریائے نیل کے مغرب میں واقع تھے اس لئے موت کے بعد کی دنیا کو مغربی دنیا کہا جاتا تھا۔

(۲۶) موجودہ صدی کے پہلے نصف میں ایک بلجیم نژاد یورپی میٹرلنک وحدت الوجود یعنی خالق و مخلوق کی وحدت کا حامی تھا۔

(۲۷) "ناسوت" انسانی فطرت اور "لاہوت" خدائی فطرت کو کہا گیا ہے۔

(۲۸) پہلا درجہ انگریزی میں مونس ٹری اور فرانسیسی میں موناسٹر' دوسرے کو کانونٹ اور کودان' تیسرے کو اسکائیٹ یا اسکیٹ اور چوتھے درجے کو ہم خانقاہ تو نہیں البتہ مقام اعتکاف کہہ سکتے ہیں۔ انگریزی میں ارمیٹیج اور فرانسیسی میں ارمیتاژ کہا جاتا ہے۔

(۲۹) فرانسکو مگابریلی جو روم کی یونیورسٹی کے اورینٹل انسٹی ٹیوٹ میں تاریخ اسلام و ایران کے استاد ہیں اور اسلامک اسٹڈیز سنٹر اسٹرابرگ میں کام کرنے والے دانشمندوں میں سے ایک ہیں۔ انہوں نے پیغمبراسلام ﷺ کی جدید سوانح حیات "محمد""میں دین عیسائیت اور دین اسلام میں موازنہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ عیسائیوں میں حضرت عیسیٰ کی خدائی سرشت کا عقیدہ کیونکر وجود میں آیا؟ ان کے مطابق حضرت عیسیٰ کی ولادت کے واقعات اور قدیم رومیوں کے خدائی فطرت کے عقیدے نے عیسائیوں پر اثر ڈالا اور کہنا پڑتا ہے کہ اس دانشور کا نظریہ تاریخی ہے اور اس نے جناب عیسیٰ کی خدائی سرشت سے انکار نہیں کیا ہے کیونکہ وہ خود عیسائی بلکہ متعصب عیسائی ہے۔

(۳۰) اگرچہ پادریوں کے لئے شادی کے حرام ہونے کا فتویٰ صادر نہیں کیا گیا لیکن بعض مذہبی کمیٹیوں نے شادی کے بارے میں لعن طعن ضرور کیا ہے۔

(۳۱) "کائیوس۔ پلی نیوس زکوندوس" جو پلینی کے نام سے مشہور ہوا' ۲۳ء میں پیدا ہوا اور ۷۹ء میں فوت ہوا۔ تاریخ عمومی اور تاریخ طبیعی درسی جو سات جلدوں میں ہے اس کی مشہور کتابیں ہیں۔

(۳۲) "آناگزاگورس" یونانی فلسفی ہے۔ پانچ سو سال قبل مسیح میں پیدا ہوا جبکہ ۴۲۳ قبل مسیح میں انتقال کیا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ ہر شے کی ایک ہی اصل ہے جس کا نام "نوس" ہے۔ نوس حرکت کو وجود میں لائی ہے اور یہ حرکت ذرات کو۔ یہ ذرے زمین میں پائے جاتے ہیں۔ چونکہ یہ فلاسفر ایرانی علم نجوم کی تعلیم دیتا تھا لہٰذا اسے جلاوطن کردیا گیا۔ یہ قدیم یونان کی سخت ترین سزا تھی۔

(۳۳) او مسیڈ ۱۹۴۵ء میں فوت ہوا۔ یہ شکاگو یونیورسٹی اورینٹل انسٹی ٹیوٹ میں تاریخ ایران کا استاد تھا۔ اس کی کتاب "ایران کی تاریخ" بہت اہم ہے۔ وہ امریکہ کے معروف تاریخ دانوں میں سے ایک ہے۔

(۳۴) کتبہ بے ستون تین فارسی زبانوں یعنی پہلوی' ھخامنشی' بابلی اور ایلامی میں تحریر ہے۔ یہ داریوش اول کی طرف سے لکھا گیا۔ اس کے بیٹے خشایار شاہ نے بھی ان ہی خطوط پر ایک کتبہ لکھا لیکن اس کے بعد ھخامنشی کتبہ کا سراغ نہیں ملتا۔ خیال ہے کہ خشایار کے بعد یہ خط تبدیل ہوگیا۔

(۳۵) ماجیلان پرتگالی' اسپانیہ کے بادشاہ کا درباری تھا۔ جب وہ بغاز (جنوبی امریکہ) سے گزرا تو اس نے ایک سو دس دنوں میں بحرالکاہل کی چوڑائی کو مشرق سے مغرب کی طرف طے کیا۔ چونکہ وہ کسی طوفان میں نہیں پھنسا لہٰذا اس نے اس سمندر کا نام بحرالکاہل رکھ دیا۔ جب وہ جزائر تک پہنچا تو اس نے ان کا نام فلپ بادشاہ کے

نام پر فلپائن رکھ دیا جہاں وہ مقامی باشندوں سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ جبکہ اس کے ساتھیوں نے اپنا سفر جاری رکھا اور کافی تکلیف اٹھانے کے بعد ان میں سے اٹھارہ آدمی سباستیانو الکانو کی قیادت میں ہسپانیہ پہنچے۔ ہسپانیہ کے بادشاہ نے الکانو کو سونے کا ایک ہار دیا جس پر لکھا ہوا تھا کہ میں نے کرہ زمین کے اطراف کا چکر لگایا ہے۔ الکانو کا کتبہ اب ہسپانیہ میں پایا جاتا ہے جس کا بہت احترام کیا جاتا ہے۔ لیکن ماجیلان کے خاندان سے کوئی باقی نہیں رہا کیونکہ اس کی بیوی تھی نہ بچے۔ تاریخ و جغرافیہ کی کتب میں اس کے سفر کی واحد یادگار "آبنائے ماجیلان" ہے جو امریکہ کے جنوب میں جزیرہ ارض النار کے درمیان واقع ہے۔ یہ نام خود ماجیلان نے رکھا تھا لیکن موجودہ دور میں اس مقام سے کشتیاں نہیں گزرتیں کیونکہ راہ پیچیدہ ہے۔ واسکوڈی گاما، کرسٹوفر کولمبس اور ماجیلان صرف کھانے کی ادویات حاصل کرنے کے لئے چل پڑے تھے۔ چونکہ وہ یورپ میں بہت مہنگی تھیں لہذا ان کا شوق سیاحت یا دریافت نہ تھا۔

(۳۶) گول دائرہ کا مرکز ایک ہوتا ہے جبکہ بیضوی کے دو مرکز ہوتے ہیں۔

(۳۷) یعنی وہ ان دونوں شعاعوں کا موصل ہو تو وہ سیاہ ہوگا اس میں چمک نہ ہوگی۔

(۳۸) جیسا کہ یورپ اور امریکہ کے علمی مجلات میں کہا گیا ہے Electro Magnetic Rays وہ شعاعیں ہیں جن کی مدد سے ہم ریڈیو کی آواز سنتے ہیں اور ٹیلی ویژن کی تصاویر دیکھتے ہیں اور دوسرے ممالک کے ریڈیو کی علامتیں بھی انہی شعاعوں کے ذریعے زمین تک پہنچتی ہیں۔ اگر کسی دن دوسرے جہانوں کے عاقل لوگ اس دنیا کے انسانوں سے بات چیت کریں گے تو زیادہ احتمال ہے کہ وہ انہی شعاعوں کے ذریعے باہمی گفتگو کریں گے۔

(۳۹) ہمارے نظریہ کے مطابق شیعی ثقافت کی بنیاد عہد نبویؐ میں رکھی جا چکی تھی لہذا ہمیں فاضل محققین کے اس خیال سے ہرگز اتفاق نہیں ہے۔

(۴۰) سیمنری، مذہبی مدارس کو کہا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے امریکیوں نے محدود کانفرنس کو جو کسی مخصوص موضوع کے لئے ترتیب دی جاتی ہے سیمینار کا نام دیا ہے۔

(۴۱) قانون ایک یونانی لفظ ہے جس کے معنی قاعدہ و دستور بیان کئے گئے ہیں۔

(۴۲) کتاب "امام حسینؑ اور ایران" میں ذبیح اللہ منصوری نے اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ دوسری اور تیسری صدی ہجری کے مترجمین جنہوں نے یونانی فلسفیوں کی کتابوں کا سریانی سے عربی میں ترجمہ کیا ہے انہوں نے کسی قدر لفظی ترجمہ کیا اور اس طرح لوگوں کی غلطیوں کا باعث بنے ہیں۔ حتی کہ ابن سینا جیسا انسان بھی چوتھی صدی میں فلسفہ ارسطو کو ان کتابوں میں پڑھنے کے بعد کہتا ہے کہ جب تک میں نے فارابی کی کتاب نہیں پڑھ لی مجھے ان کتابوں کی ذرا بھی سمجھ نہیں آئی جبکہ ارسطو کا فلسفہ اصلی متن میں سادہ ہے اور اس کا سمجھنا بہت آسان ہے۔ صدیوں بعد وہ لوگ جو قوم پرست عرب تھے کہتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ سریانی کے مترجمین ان کتابوں

کو یونانی سے سریانی میں اچھی طرح ترجمہ نہیں کرسکے جبکہ سریانی کے مترجمین نے دوسری صدی ہجری میں یعنی ہزار سال پہلے یونانی کتابوں کا سریانی زبان میں ترجمہ کردیا تھا اور اپنے کام میں خاصے ماہر تھے۔ البتہ جن لوگوں نے سریانی سے عربی میں ترجمہ کیا وہ فلسفیانہ اصطلاحات سے ناواقف تھے لہٰذا ان کی وجہ سے لوگ سرگرداں ہوئے۔

(۴۳) یہی فلسفہ امام اول حضرت علی علیہ السلام اور آپ کے مربی پیغمبر اسلام ﷺ نے روشناس کرایا جس کی تشریح امام جعفر صادقؑ نے تعلیم فرمائی۔

(۴۴) اتھوپیا دو یونانی لفظوں سے مل کر بنا ہے۔ او یعنی نہ اور دوسرا توپوس یعنی مکان۔ اصطلاح میں اس کا اطلاق اس ملک پر ہوتا ہے جس میں ایک آئیڈیل لیکن غیر عملی حکومت پائی جاتی ہو اور "یوٹوپیا" ایک کتاب کا نام ہے جو تھامس مور انگلستان کے شہنشاہ ہنری ہشتم نے پندرہویں صدی عیسوی کی دوسری دہائی میں لکھی تھی۔ اس میں ایک ایسے معاشرے کے متعلق بحث کی گئی ہے جس کے تمام افراد مادی لحاظ سے یکساں ہیں۔ تھامس مور کو ۹۵ سال کی عمر میں پھانسی دینے کے بعد اس کا سر تن سے جدا کردیا گیا۔

(۴۵) اسکندریہ کے کتب خانے کو آگ لگانے کے بعض دلائل پر عرب شک کرتے ہیں۔ لیکن تاریخ کے مطابق اسکندریہ کا کتب خانہ عربوں کے مصر میں داخلے سے قبل دو مرتبہ جلا۔ پہلی مرتبہ اس وقت جب قشون نزار (قیصر روم) پہلی صدی قبل مسیح میں مصر میں داخل ہوا۔ اس موقع پر شاید رومی سپاہیوں نے کتاب خانے کو نابود کیا اور اس کے بعد کتب خانے کو دوبارہ قائم کیا گیا۔ اس کے بعد ۳۹۰ء میں یہ کتاب خانہ وہاں کے ملازموں کی غفلت کے نتیجے میں جلا۔ اکثر کتابیں جل گئیں جنہیں دوبارہ لکھا گیا۔ بہرحال عربوں کے مصر میں داخلے سے پہلے یہ کتب خانہ دو مرتبہ جل چکا تھا اور اس کی تمام کتابیں تباہ ہوگئی تھیں۔

(۴۶) پانچویں صدی ہجری کے آخری نصف میں غزالی اور زہرہ کی وفات سے آٹھ برس قبل بغداد کی حالت ایرانی رسالے "خواندنیہا" میں شائع ہوچکی ہے۔ اس زمانے میں بغداد کی جھلک دکھانے کے لئے "Callphs Baghdad in the Era of Abbasid" سے استفادہ کیا گیا ہے جس کا مصنف مستشرق لوسترنج ہے۔

(۴۷) فرند کے معنی شمشیر آبدار ہوتے ہیں۔

(۴۸) اسٹرابرگ جو آج اسلامک اسٹڈیز سنٹر کہلاتا ہے قدیم زمانوں سے علمی مرکز تھا۔ اسٹرابرگ کی عظیم یونیورسٹی چھاپہ خانے کی ایجاد سے پہلے وجود میں آئی۔ چھاپہ خانہ گوٹمبرگ کے ہاتھوں اسٹرابرگ میں چلایا گیا۔

(۴۹) شیعہ اثناعشری ائمہ طاہرینؑ کی زندگی کے معتقد ہیں کیونکہ وہ اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں۔ مرکز مطالعات اسلامی اسٹرابرگ کے علماء نے ایسا اظہار خیال صرف تاریخی نقطہ نگاہ سے سپرد قلم کیا ہے۔

(۵۰) انٹی باڈیز کا مطلب جسموں کا مخالف ہے لیکن یہاں اس کے اصطلاحی معنی ان خلیوں کا مخالف ہے جو

جسم پر حملہ آور ہوتے ہیں۔

(۵۱) سیل یعنی خلیہ کے افزائش نسل کے لئے دو حصوں میں تقسیم ہونے کے بعد پھر دونوں حصے مکمل خلیہ بن جاتے ہیں۔ اس طرح یہ تقسیم جاری رہتی ہے اور خلیات یا سیل کی تعداد کئی ملین سے تجاوز کر جاتی ہے۔

(۵۲) ٹاکسن Toxin ایک ایسا زہر ہے جو ہمارے جسم میں پیدا ہوتا ہے۔ ایسی غذا کا استعمال جس میں حرارے (کیلوریز) زیادہ ہوں جسم میں ٹاکسن پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے۔

(۵۳) اراسم یا اراسموس ۱۵۳۶ء میں فوت ہوا۔ اس کا شمار یورپ کے بڑے بڑے مفکرین میں ہوتا ہے۔ جیسا کہ متن میں لکھا ہے وہ ہالینڈی (Dutch) تھا۔ اس نے کئی کتابیں تصنیف کیں۔ وہ طنز نگار بھی تھا۔ ایک عرصہ تک وہ ماہانہ رسالہ نکالتا رہا جس میں وہ اپنے مخالفین کو طنز کا نشانہ بناتا تھا۔ جیسا کہ متن میں مذکور ہے اس کی تصنیفات میں غیر مذہبی یادگاریں بھی ہیں۔

(۵۴) ابن راوندی کا قول غلط ہے۔ نہ تو زردشتی اور نہ ہی مسلمان کاشمر کے اس درخت کی پوجا کرتے تھے بلکہ درخت چونکہ آبادی کے لوازم میں سے ہے لہٰذا اسے ختم ہونے سے بچانے کے لئے اس کا احترام کیا جاتا تھا جیسا کہ آج بھی اسے قابل احترام جانا جاتا ہے۔

(۵۵) بظاہر یہ روایت مبالغے پر مبنی لگتی ہے۔

(۵۶) حراق کے حرف اول "حا" پر زبر اور "ر" پر تشدید ہے یعنی قلاب کے وزن پر یا حرف اول پر زبر "ر" پر شد اور حرف آخر ساکن ہے۔ حجاز کے وزن حراق کے معنی فتنہ انگیز یا ایسے پانی کے ہیں جو بہت زیادہ نمکین ہو۔

(۵۷) روایت کے مطابق یہ درخت کشم میں تھا۔ کشم بست کے شہر میں واقع ہے جبکہ بست نیشاپور کی ایک بستی ہے۔ سیستان میں بھی ایک بستی کا نام کشم ہے اور خوزستان و فارس کی سرحد پر بھی ایک آبادی کا نام کشم ہے اور ایک جزیرہ قشم بھی ہے جو قدیم زمانے میں کسم کہلاتا تھا۔

(۵۸) شیعہ منصوص امامت کے معتقد ہیں۔ مصنف کا خیال قابل اصلاح ہے۔ نیز کوئی بھی امتی کسب علم سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے برابر نہیں ہو سکتا۔

(۵۹) جیسا کہ ہم اس بات کا تذکرہ کر چکے ہیں کہ گوشہ نشینی کا رجحان خانقاہوں سے بعض اسلامی فرقوں میں داخل ہوا۔ آج بھی عیسائی فرقوں میں دنیا سے بے اعتنائی نہ صرف خانقاہوں میں موجود ہے بلکہ ان کے دینی مدارس اسے واجب گردانتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک عیسائی فرقہ جزاہٹ کہلاتا ہے۔ اس کے مذہبی مدرسوں میں پندرہ سال تک دینی تعلیم دی جاتی ہے' جس کے بعد اس کے طالب علم مذہبی رہنما کا درجہ حاصل کرتے ہیں۔ اپنی ساری تعلیم کے دوران اخبار یا رسالہ تک نہیں پڑھ سکتے اور نہ ہی ریڈیو سن سکتے ہیں یا ٹی وی دیکھ سکتے ہیں۔ آپ یہ جان کر اور بھی حیران ہوں گے کہ ان مدارس کے طلباء دوسری جنگ عظیم کے دوران اس بات سے

ذرا بھی مطلع نہ تھے کہ کتنی خوفناک جنگ ہو رہی ہے۔ جو طلبا اس وقت ان مدارس میں زیر تعلیم ہیں ویت نام کی جنگ سے بے خبر اور انسان کے چاند پر قدم رکھنے سے آگاہ نہیں ہوں گے۔ جب ان کا تعلیمی زمانہ گزر جائے گا اور وہ مذہبی رہنما قرار پائیں گے تو وہ ان واقعات سے باخبر ہوں گے۔ البتہ شاید ان کے مذہبی مدارس حالیہ دو سالوں کے دوران تبدیل ہو چکے ہوں جس کے بارے میں مجھے کوئی اطلاع نہیں ہے۔ (مترجم)

(۶۰) بعض عیسائی فرقے جن کی خانقاہیں ہیں ان میں کھیتی باڑی مذہبی واجبات میں سے ہے۔ ان خانقاہوں کے مکین طلوع فجر سے غروب آفتاب تک اردگرد کے صحراؤں میں کھیتی باڑی، مویشیوں، شہد کی مکھیوں اور پرندوں کی پرورش جیسے کاموں میں مشغول ہوتے ہیں۔

(۶۱) کیہ سیاہ کے وزن پر ہے جس کے معنی گھر ہوتے ہیں۔

(۶۲) مطلب یہ ہے کہ بعض یورپی خانقاہوں کے پادری انگور کے باغ کاشت کرتے اور شراب کشید کرتے ہیں۔ اب بھی ان یورپی خانقاہوں کی شراب یورپی ممالک میں معروف ہے اور انہی خانقاہوں کے نام سے بیچی جاتی ہے۔

(۶۳) تیسری صدی ہجری میں ایسا ہوتا ہو گا لیکن موجودہ زمانے میں ایسا نہیں۔ اب خانقاہوں میں ہر کوئی کام کرتا ہے اور اپنی معاشی ضروریات خود پوری کرتا ہے بلکہ تزکیہ نفس کے لئے ضروری ہے کہ وہ شخص کام کرے اور معاشرے پر بوجھ نہ بنے۔

(۶۴) کتاب کا نام ایرانی جنگیں یا ایران کی جنگیں ہے۔

(۶۵) خدائی نامہ جو شاہنامہ فردوسی کا ماخذ ہے۔ ایک روایت کے مطابق ساسانیوں کے زمانے میں لکھا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی تاریخی داستانیں اشکانیوں کے زمانے میں وجود میں آئیں۔ (مترجم)

(۶۶) دساتیر دری فارسی میں لکھی گئی ہے۔ اس میں قدیم ایران کے چند پیغمبروں کا ذکر ہے جن کا تذکرہ کسی بھی تاریخی کتاب میں نہیں ملتا۔ دساتیر میں ایسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو کسی بھی ایرانی لغت میں نہیں ملتے۔ مرحوم میرزا احمد خان قزوینی جب پہلی مرتبہ ایران واپس آکر تہران یونیورسٹی کے استاد مقرر ہوئے تو انہوں نے کہا دساتیر کتاب کے الفاظ جعلی ہیں۔ ان کے بعد مرحوم سید محمد علی داعی الاسلام حیدر آباد دکن یونیورسٹی کے پروفیسر مقرر ہوئے تو انہوں نے نظام کی ڈکشنری کے نام سے ۱۹۲۷ء میں ایک کتاب لکھی جس میں انہوں نے لکھا کہ دساتیر کے الفاظ جعلی ہیں۔ ان کے بعد مرحوم ابراہیم پور داؤد نے جو تہران یونیورسٹی کے پروفیسر رہے ہیں اپنی کتاب "فرہنگ ایران پاکستان میں" جو فریدون پرنٹنگ پریس کی طرف سے چھاپی گئی ہے' میں لکھا ہے کہ ہندوستان میں مشرقی انسٹی ٹیوٹ میں جسے "خورشید جی رستم جی" سے موسوم کیا جاتا ہے ایسی کتابیں ملی ہیں جن میں دساتیر کے لکھنے کی تاریخ ۳۵۸ھ ہے یعنی تقریباً" ہزار سال پہلے یہ کتاب ضبط تحریر میں آئی۔ دساتیر

ہندوستان میں لکھی گئی اور اس کی کچھ کاپیاں ایران میں آئیں۔ جہاں یہ پڑھے لکھے افراد کے ہاتھ لگیں جن پر ان کا اچھا خاصا اثر ہوا' یہاں تک کہ دساتیر کے الفاظ کا نظم و نثر میں استعمال عام ہونے لگا۔ تاہم اس بارے میں تحقیق کی ضرورت ہے کہ کیا دساتیر ہزار سال پہلے لکھی گئی یا صفوی دور میں تحریر ہوئی۔

(۶۷) ۱۹۷۲ء میں امریکی ہفت روزہ ٹائمز نے اپنے چند شماروں میں علمی مقالات شائع کئے جن کا اہم حصہ دوسرے جہانوں کی مخلوقات کے ساتھ رابطے کے بارے میں تھا۔ ٹائمز نے زیادہ تر ان تجربات پر انحصار کیا ہے جو اب تک روس میں دوسرے سیاروں کے ساتھ رابطے کے سلسلے میں انجام پائے ہیں اور لکھتا ہے کہ سابق سوویٹ یونین کے سائنس دان جو ریڈیو ٹیلی اسکوپ کے ذریعے تجربات کرنے میں مشغول ہیں انہیں اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ دوسرے سیاروں سے جو نظام شمسی سے باہر واقع ہیں ایسے پیغامات بھیجے جاتے ہیں جنہیں زمینی ریڈیو ٹیلی اسکوپ بھی ضبط کرتی ہے۔ البتہ ان کے جواب دینے اور دوبارہ اس مخلوقات سے جواب وصول کرنے کے لئے ایک لمبی مدت درکار ہے کیونکہ نزدیک ترین دنیا جس سے ہماری زمین پر پیغام موصول ہوتے ہیں اس کا فاصلہ ایک سو نوری سال ہے لہٰذا اگر سوویت یونین کے سائنس دان ان کے پیغام کا جواب آج ارسال کریں تو اس کے پہنچنے میں سو سال کا عرصہ لگے گا۔ اس طرح وہاں سے جوابی پیام بھیجنے میں مزید سو سال کی مدت درکار ہوگی۔ مجلّہ ٹائم کے بقول بعض پیغامات ایسے جہانوں سے ارسال کئے جاتے ہیں جن کا زمین سے فاصلہ اس قدر زیادہ ہے کہ جس وقت یہ پیغامات بھیجے گئے تھے شاید اس وقت تک اس زمین پر بڑے جاندار پیدا نہیں ہوئے تھے' چہ جائیکہ انسان موجود ہوتا۔ ٹائم نے اپنے مقالات میں لکھا ہے کہ انسان نے اٹلی کے باشندے مارکونی کے ذریعے ۱۹۳۰ءمیں یہ دریافت کرلیا تھا کہ دوسرے جہانوں میں باشعور مخلوقات بستی ہیں۔ اسی وجہ سے بری کمانڈر کینٹ میلو کی لڑکی نے ٹائم مجلّے کو ایک خط لکھا جو ۲۱ مئی ۱۹۷۳ء کے شمارے میں چھپا۔ یہ لڑکی جو آج ایک مکمل خاتون ہے' لکھتی ہے میں اس بات کی عینی شاہد ہوں کہ مارکونی نے میرے باپ کمانڈر میلو سے کہا تھا کہ وہ اپنی کشتی کی وائرلیس مشین جس کا نام الکرا ہے' کے ذریعے دوسرے جہانوں سے پیغام موصول کرتا ہے۔

(۶۸) یہ عدسہ ۱۹۳۶ء میں بننا شروع ہوا۔ جب اس عدسے کا پگھلا ہوا مواد سانچے میں ڈھالا گیا تو یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس مائع مواد کو جس کا درجہ حرارت ایک ہزار دو سو تھا' آہستہ آہستہ سرد کریں تاکہ عدسے میں بلبلہ یا شگاف نہ پیدا ہو اور ایک خاص ٹیکنیک کے ذریعے اس مائع مواد کی حرارت محفوظ کی گئی۔ ہر روز حرارت کا صرف ایک درجہ کم کرتے رہے۔ آخرکار تین سال اور ایک سو پانچ دنوں میں یہ عدسہ ٹھنڈا ہوا جس کے بعد یہ تراشنے والے کو دیا گیا جس نے ملی میٹر کے ہزارویں حصے کی شرح سے تراش کی ٹیکنیک کے ذریعے ۱۹۴۱ء میں یہ عدسہ کوہ پالومر کی فلکی دوربین میں نصب کیا اور اس طرح یہ فلکی دوربین کام میں لائی جانے لگی۔ یاد رہے کہ اس زمانے میں امریکہ دوسری جنگ عظیم میں الجھ پڑا تھا۔ اس وقت سے آج تک صنعتی ممالک میں نہایت پرکشش چیزیں تیار

کی گئی ہیں لیکن اس فلکی دوربین کے عدسے جیسی چیز ابھی تک نہیں بنائی جا سکی۔

(۶۹) فرانس کا فلاسفر برگسن جو ۱۹۴۱ء میں فوت ہوا دو نظریئے پیش کرتا ہے۔ایک کا تعلق زندگی سے ہے اور دوسرا وقائع کے ظہور پذیر ہونے کی بناء پر استنباط کرتا ہے۔

(۷۰) "مارا" ایک قابل ڈاکٹر تھا۔ اٹھارہویں صدی عیسوی کے دوسرے نصف میں ہو گزرا ہے۔ انقلاب فرانس کے زمانے میں اس نے "قوم کا دوست" نامی ایک روزنامہ نکالا۔ اگرچہ یہ ایک سیاسی اخبار تھا لیکن اس کے مضامین میڈیکل اور سرجری کے بارے میں ہوتے تھے۔ اس دوران کہا گیا تھا کہ پوسٹ مارٹم کی آزادی ہونی چاہئے۔ یہ شخص ۱۷۹۳ء میں پچاس سال کی عمر میں شارلٹ کورڈے نامی ایک عورت کے ہاتھوں ایک حمام میں چاقو سے قتل ہوا۔

(۷۱) اب تک کیتھولک عیسائی مذہبی رہنما شادی بیاہ سے بچتے رہے مگر اب یورپی ممالک خصوصاً فرانس وغیرہ میں اس رجحان کے خلاف ایک تحریک نے جنم لیا کہ مذہبی رہنماؤں کو بھی شادی کرنی چاہئے کیونکہ شادی بیاہ جس طرح کسی فوجی کے پیشہ ورانہ فرائض کی انجام دہی میں حائل نہیں ہوتا اسی طرح مذہبی رہنماؤں کے فرائض میں بھی رکاوٹ نہیں بنتا۔

(۷۲) ریاستہائے متحدہ امریکہ کے آئین میں لفظ Impeachment قدیم یونان کے ان شہروں کے قانون سے اقتباس ہے جہاں پر حکومت قائم تھی۔ Impeachment یعنی ایسا مواخذہ جو ممکن ہے صدر کی برطرفی پر منتج ہو جیسا کہ ہم نے متن میں دیکھا ہے کہ Impeachment انگریزی سے امریکی آئین میں وارد ہوا ہے۔ قانون ساز نے چاہا کہ Impeachment کی جگہ لفظ الزام شامل کیا جائے کیونکہ کسی امریکی صدر کو Impeachment قرار دینے کے بعد امریکی سینٹ (جس میں ہر ریاست سے دو ممبر شامل ہوتے ہیں) صدر کو Impeachment (قابل مواخذہ) قرار دینے کی منظوری دیتی ہے۔ اس کے بعد امریکی سینٹ عدالت کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور لگائے گئے الزام پر بحث بھی کرتی ہے اور صدر سے وضاحت بھی طلب کرتی ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ قانون صدر کا اتنا احترام کرتا ہے کہ صدر بذات خود سوالات کے جوابات دینے کے لئے سینٹ کے سامنے پیش نہیں ہوتا بلکہ وزیر قانون سینٹ میں حاضر ہو کر سینٹرز کے سوالات سن کر صدر کو پہنچاتا ہے جو اس وزیر کے ذریعے جوابات دیتا ہے۔ اگر سینٹ کی دو تہائی اکثریت تحقیق کے بعد اپنے اجلاس میں صدر کی مذمت کرے تو صدر برطرف ہو جاتا ہے۔ بصورت دیگر سینٹ کے تمام اعتراضات بے اثر قرار پا کر صدر امریکہ اپنا کام جاری رکھتا ہے۔

(۷۳) واضح ہو کہ یہ مصنفین کا ذاتی نظریہ ہے' شیعہ عقیدہ نہیں۔ یاد رہے کہ کرامت یا معجزہ ہمیشہ محیر العقول ہوتا ہے۔

(۷۴) فن لینڈ کے ایک عظیم مصنف میکا والتاری نے اپنی کتاب "صلیب پر ایک شخص" میں لازاووس کے حضرت عیسیٰ کے ذریعے زندہ ہونے کی تشریح کے ضمن میں لکھا ہے کہ لازاووس بیت عینا کے قبرستان میں جو فلسطین میں واقع ہے دفن تھا۔ حضرت عیسیٰ اس کی قبر پر آئے اور کہا۔ خاک کو اس کی قبر سے ہٹایا جائے۔ جب خاک ہٹائی گئی تو عیسائیوں کی روایت کے مطابق حضرت عیسیٰ نے تین دن کے مردے کو زندہ کردیا۔ اس آپ بیتی میں قابل غور باتیں مردے کے زندہ ہونے کے بعد وہ جذبات ہیں جن کا اس نے اظہار کیا تھا۔

(۷۵) پیغمبر اسلامؐ کی زندگی کے حالات جو روم کی یونیورسٹی کے استاد فرانسیسکو گابریلی نے لکھے ہیں' مغرب میں حضرت پیغمبر اسلام ﷺ کی جدید ترین سوانح حیات شمار کی جاتی ہے۔ لیکن اس میں بعض ایسی باتیں ہیں جو نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے لئے قطعاً" ناقابل قبول ہیں بلکہ انہیں منظرعام پر لانا بھی مناسب نہیں۔

(۷۶) اس اسٹائیل کا اطلاق قدیم مذہبی کتابوں کے طرز تحریر پر خصوصاً" عہد عتیق (یعنی تورات اور اس کے ضمیموں) پر ہوتا ہے۔ (مترجم)

(۷۷) میکس مولر جرمن نژاد تھا جس نے بعد میں برطانوی شہریت اختیار کرلی۔ اس شخص نے ایک ایسے خاندان میں آنکھ کھولی جس میں باپ کے بعد بیٹا اسکالرز تھے۔ اس نے ۱۹۰۰ء میں اس جہان کو الوداع کہا۔ اس نے قدیم ہندوستان کی مذہبی کتب کا سنسکرت سے ترجمہ کرکے دنیا اور یورپی ثقافت کی عظیم خدمت کی ہے اس کا ترجمہ اکاون جلدوں پر مشتمل ہے جو سنسکرت زبان اور ان زبانوں سے آگاہی کے لحاظ سے جو سنسکرت سے اخذ کی گئی ہیں انیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ایک بے مثال ذخیرہ ہے۔ (مترجم)

(۷۸) یہاں پر جو کچھ کہا گیا ہے یہ قدیم یہودیوں' فلسطینیوں اور عربوں پر صادق آتا ہے لیکن ایرانیوں پر صادق نہیں آتا۔ ایرانی روحانی دنیا میں وارد ہوسکتے ہیں اور ان کے روشن خیال لوگ عرفانی ذوق کے مالک بھی تھے۔ (مترجم)

(۷۹) ہمارے پیغمبرؐ نے کئی معجزات دکھائے ہیں۔ ایک قرآن کا نزول' دوسرا معراج ہے۔ شق القمر بھی پیغمبرؐ کے معجزات میں سے ہے۔ اس طرح تین مشہور معجزات ہیں۔ بعض لوگ آیہ اقتربت الساعۃ و انشق القمر کو اس طرح تفسیر کرتے ہیں کہ اس آیہ کے وہ معنی نہیں نکلتے جو ہم نے روایات سے حاصل کئے ہیں۔ (مترجم)

(۸۰) جرمن زبان میں نیشنل سوشلسٹ (National Socialist) یعنی قومی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ (مترجم)

(۸۱) مراد یہ ہے کہ مادہ پرست افراد' توحید پرستوں کی مانند خدائے لم یزل پر ایمان نہیں رکھتے لیکن بہرکیف اپنے ایک آئیڈیل ہدف تک پہنچنا چاہتے ہیں لہٰذا ان کا ہدف ایک ایسا خدا ہوتا ہے جو نہ تو خالق ہوتا ہے اور نہ

ہی خدائی خواص کا حامل۔

(۸۲) قارئین کرام کے لئے عرض ہے کہ اس تاریخی اور علمی بحث سے ہمارا مقصد توحیدی مذاہب اور مسلمانوں کے خدا پر عقیدے کی تشریح نہیں۔ چونکہ خدا کے بارے میں مسلمانوں کا عقیدہ پہلے ہی واضح ہے جس کی تکرار کی کوئی ضرورت نہیں۔ (مترجم)

(۸۳) ایک ایٹم ایک مرکز پر مشتمل ہوتا ہے جس کے دو حصے ہیں۔ ایک پروٹان دوسرا نیوٹران۔ اس مرکز کے باہر ایک الیکٹران متحرک ہوتا ہے جس پر منفی برقی بار ہوتا ہے۔ جبکہ ایٹم کے مرکز میں پروٹان پر مثبت برقی بار ہوتا ہے۔ ہر ایٹم میں الیکٹران کی تعداد' پروٹان کی تعداد کے برابر ہوتی ہے۔ اسی لئے ایٹم پر مجموعا" کوئی برقی بار نہیں ہوتا جبکہ ضد مادہ (Anti-matter) کے ایٹموں میں پروٹان پر منفی اور الیکٹران پر مثبت بار ہوتا ہے۔

(۸۴) جہاں تک مترجم کے علم میں ہے عباسی دور کا ایک مشہور مترجم ایرانی نژاد ابن مقفع تھا۔ بعض لوگوں نے اسے امام جعفر صادق" کا شاگرد کہا ہے۔ یہ شخص عباسی خلیفہ کے حکم سے قتل ہوا۔ اگر ابن مقفع امام جعفر صادق" کے شاگردوں میں سے نہیں تو بھی ان کا ہم عصر ضرور ہے۔ یہ شخص ۱۴۵ھ میں امام کی شہادت سے تین سال قبل قتل کیا گیا۔

(۸۵) چونکہ ہر شیعہ امام جعفر صادق" کو امام مانتا ہے لہذا اس اعجاز کو حقیقت پر مبنی سمجھتا ہے۔

(۸۶) جیسا کہ اخبارات میں آچکا ہے کہ امریکی صدر نکسن نے حکم دیا تھا کہ امریکی سائنس دانوں کا ایک گروہ توانائی کے جدید ذرائع تلاش کرنے کے لئے ریسرچ کرے۔ ہائیڈروجن ایسے ہی ذرائع میں سے ایک ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگی۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ سائنس دان اس پر ریسرچ کریں گے کہ برق پاشیدگی (Electrolysis) کے علاوہ کسی اور طریقے سے ہائیڈروجن حاصل کی جائے جو سستا اور آسان ہو۔

(۸۷) انگلستان میں بیکن نام کے چند اسکالرز ہوئے ہیں۔ راجر بیکن اسی سال کی عمر میں ۱۲۹۴ء میں فوت ہوا۔ اسے ڈاکٹر ایڈمرل کہا جاتا ہے یعنی علامہ یا مجتہد۔ وہ ساری عمر آکسفورڈ یونیورسٹی میں پڑھاتا رہا۔

(۸۸) فلینڈی یا ملک فلینڈز کا رہنے والا۔ یہ ملک پہلے آزاد تھا پھر آسٹریا کی شہنشاہی کا جزو بنا بعد میں فرانس کا حصہ بن گیا۔ ۱۸۳۰ء سے اب تک بلجیم کا حصہ ہے۔ یہاں کے لوگ ہالینڈ کی ڈچ زبان سے ملتی جلتی بولی بولتے ہیں۔ یہاں کے باشندے دراز قد اور خوبرو ہیں۔ انگریزی میں فلینڈی کو فلیمش کہا جاتا ہے۔

(۸۹) اسی مناسبت سے پہلی رائفل جو وینس سے مشرق آئی اسے بندوق کہا گیا۔

(۹۰) گلیلو نے مشاہدہ کیا کہ چاند کی طرح عطارد اور زہرہ بھی مختلف مراحل سے گزرتے ہیں۔ کبھی ہلال بن جاتے ہیں اور کبھی چودھویں کا چاند۔ کوپرنیک نے صرف زبانی یہ بات کہی تھی۔ آنکھوں سے نہ دیکھا تھا۔ لیکن گلیلو نے اپنی آنکھوں سے اس بات کا مشاہدہ کیا تھا۔ یہ موضوع اس بات کا ثبوت تھا کہ عطارد اور زہرہ سورج

کے گرد چکر لگاتے ہیں اور ان کی روشنی ذاتی نہیں ہے۔

(۹۱) ارلیس تادخوس کی تاریخ پیدائش اور وفات معلوم نہیں۔ مگر یہ ارسطو کے بعد غالباً" تیسری صدی قبل مسیح میں ہو گزرا ہے۔ ارسطو ۳۲۲ ق م میں فوت ہوا لیکن ارسطو کا یہ مشہور نظریہ کہ زمین ساکن ہے اور سورج و سیارے اس کے گرد گھومتے ہیں ارلیس تادخوس کے نظریئے کو متزلزل نہ کرسکا۔

(۹۲) چندرا چاترجی ہندوستان کا عظیم و مشہور مفکر ہے۔ اس کی تصانیف بنگالی زبان میں ہیں۔ برصغیر کی آزادی میں روحانی لحاظ سے اس کا نمایاں حصہ ہے۔ اس نے گاندھی اور کانگرس سے پہلے آزادی ہند کی آواز بلند کی۔ گاندھی انگلستان سے بیرسٹر بن کر جنوبی افریقہ گیا اور پھر اپنی جدوجہد کا آغاز کیا۔ جبکہ چاترجی گاندھی کے پیدائش کے سال ۱۸۶۹ء سے ہی ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں پیش پیش رہا۔ مگر اس دور میں یہ تحریک زور نہ پکڑ سکی۔ چاترجی نے ۵۶ سال کی عمر میں ۱۸۹۴ء میں وفات پائی۔ بھارت کا قومی ترانہ اس کی بہترین کتاب آنن داٹ سے لیا گیا ہے جس کا عنوان "بندے ماترم" ہے۔

(۹۳) سیب کے درخت سے گر کر نیوٹن کے سر پر لگنے کا قصہ اتنا مشہور ہے کہ اسٹرا سبرگ کے اسلامک اسٹڈیز سنٹر کے علماء نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ واقعہ نیوٹن کے قانون تجاذب کے وضع کرنے کا سبب نہیں بنا بلکہ کپلر کا مطالعہ نیوٹن کا رہنما بنا۔ کپلر کا قول ہے کہ دو اجسام اپنی کمیت Mass کے راست متناسب اور فاصلے کے مربع کے بالعکس متناسب ایک دوسرے کے درمیان کشش رکھتے ہیں۔ پس کپلر نے قوت تجاذب کے قانون کے ضمن میں نیوٹن کی رہنمائی کی نہ کہ اس کے سر پر گرے سیب نے۔

(۹۴) لونڈ' سویڈن کا ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ یہاں کی یونیورسٹی یورپ میں مشہور ہے۔ پروفیسر برم یہاں شعبہ تاریخ کے مشہور استاد ہیں۔

(۹۵) حدیث میں مجازی معنی مراد ہیں۔ کیونکہ خدا لم یلد و لم یولد ہے۔

(۹۶) ریاضی دانوں کے مطابق چوتھی پیمائش کو زمانہ خیال کرتا ہے مگر یہ ایک تھیوری ہے اور اسے ابھی تک قانون کا درجہ نہیں ملا کہ ہم یقین سے کہہ سکیں کہ کسی شئے کی چوتھی پیمائش زمانہ ہے۔

(۹۷) مالیکیول کو ایٹم نہیں سمجھنا چاہئے کیونکہ دو یا دو سے زیادہ ایٹموں کے ملنے سے ایک مالیکیول وجود میں آتا ہے اور جیسا کہ ذکر کیا گیا کسی جسم کا ساکن یا متحرک ہونا یا بخارات میں تبدیل ہونا اس جسم کے مالیکیول کی رفتار کے باعث ہوتا ہے۔

(۹۸) مترجم کا خیال ہے کہ آئزک آسیموف کا اصلی نام اسحاق عظیم اوف تھا۔

(۹۹) پرانے زمانے میں یہ شہر نوو وو نیکلایو فسک کے نام سے موسوم تھا۔ جبکہ ۱۹۲۵ء میں اس کا نام تبدیل کرکے نوو وو سائی بیرک رکھ دیا گیا۔ آج یہ شہر سائبیریا روس کے بڑے صنعتی اور علمی مراکز میں سے ایک

ہے۔ انگلستان کے جغرافیائی مرکز کے مطابق جب ۱۹۶۳ء میں اس شہر کی مردم شماری کی گئی تو اس شہر کی آبادی نولاکھ نوے ہزار تھی۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ آج اس سے بہت زیادہ ہوگی۔

(۱۰۰) سیلیکا ایک معدنی پتھر ہے جو روس کے یورال پہاڑوں میں خاص طور پر زیادہ ملتا ہے۔ اس کی ایک قسم جو زیادہ چمکیلی ہوتی ہے اسے یورال کے ہیرے کا نام دیا گیا ہے۔

(۱۰۱) تاریخی اصطلاح میں قدیم مصر کے بارے میں ملنے والی تمام دستاویزات جو درختوں سے حاصل شدہ کاغذ پر لکھی جاتی تھیں انہیں پاپی روس کہا جاتا تھا کیونکہ مصر میں بھی جس درخت سے کاغذ حاصل کیا جاتا تھا اس کا نام پاپی روس تھا۔

(۱۰۲) مادہ' فرانسیسی لفظ ماٹے ار' یا انگریزی لفظ Matter کا ترجمہ ہے اور ضدمادہ فرانسیسی لفظ اینٹی ماٹے ار یا انگریزی لفظ Anti-matter کا ترجمہ ہے۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ ضدمادہ' اینٹی ماٹے ار یا اینٹی میٹر کا فصیح ترجمہ نہیں ہے۔ لیکن البتہ اس سے مطلب کی ادائیگی ہوجاتی ہے۔

(۱۰۳) جب مادے کی توانائی میں تبدیلی کے قانون کو توانائی کے پیمانے سے ناپا جائے تو یہ بات توجہ طلب ہے کہ اس قانون میں کمیت کو گرام سے ناپا جاتا ہے اور روشنی کی ولاشی کے جذر کو سنٹی میٹر سے ناپا جاتا ہے۔ یعنی ایک سنٹی میٹر میں روشنی کی رفتار' جب یہ پیمائش حاصل ہوئی تو اسے گرام سے ضرب دیا جاتا ہے تاکہ توانائی کی پیمائش کی جائے۔ یہاں پر یہ بات توجہ طلب ہے کہ جو توانائی حاصل ہوتی ہے اسے ارگ میں ناپا جاتا ہے۔ ایک گرام وزن کو ایک سنٹی میٹر تک ایک سیکنڈ میں لے جانے میں جو توانائی صرف ہوتی ہے اسے ارگ کہا جاتا ہے۔ وہ اس طرح آسانی سے حساب کیا جاسکتا ہے کہ اگر ایک کلوگرام مادہ توانائی میں تبدیل ہوجائے تو وہ کتنی توانائی پیدا کرے گا ؟

(۱۰۴) یہ لفظ انگریزی الفاظ کا مجموعہ ہے جس کے معنی ستارے کی مانند ایسی چیز جو شعاعوں کا سرچشمہ ہے اور وہ انگریزی الفاظ یہ ہیں "کوارزی ایسٹلر ریڈیو سورس" چونکہ علم فلکیات کی تحقیقات باہر کے ممالک کے سکالرز کرتے ہیں لہٰذا جدید اصطلاحات بھی باہر کی زبانوں کی ہوتی ہیں' جن کا متبادل اردو زبان میں نہیں۔

(۱۰۵) ریڈیو ٹیلی سکوپ (Radio Tele scope) کی عظمت کو مجسم کرنے کے لئے ہم اتنا بتا دینا چاہتے ہیں کہ فٹ بال کے ایک میدان کی لمبائی سو میٹر ہے۔ جبکہ ریڈیو ٹیلی سکوپ کی وسعت فٹ بال کے میدان کے طول کے تین گنا ہے۔

(۱۰۶) یہ نظریہ عقل سے دور نہیں ہے کیونکہ بنی نوع انسان آج ایسے ایسے کام کر رہا ہے جو آج سے ایک صدی پہلے ناممکن خیال کیے جاتے تھے مثلاً" چاند اور دوسرے سیاروں پر جانا وغیرہ۔

(۱۰۷) مجھے چھوٹی عمر سے یاد ہے کہ ہمارے ملک کے ڈاکٹر سفلس' (Syphlus) آتشک کے مریضوں کا پارے

کے حقے سے علاج کرتے تھے۔ اس طرح کہ وہ پارے سے حاصل کئے گئے مواد کو مریض کے لئے تجویز کرتے اور اسے کہتے کہ وہ حقے کے ذریعے اسے پیئے۔

(۱۰۸) سمندر کے پانی کی جتنی تقطیر کی جائے اس کا ذائقہ نہیں جاتا لیکن یہ پانی خصوصاً بڑی عمر کے لوگوں کی صحت کے لئے بہت مفید ہے اور خون صاف کرتا ہے۔

(۱۰۹) یہ شخص ۱۹۳۸ء میں فوت ہوا۔ بیسویں صدی کا انوکھا انسان شمار ہوتا ہے۔ داتونزیو کا شمار شروع میں اٹلی کے فاشسٹوں میں ہوتا تھا لیکن بعد میں اس نے فاشسٹوں سے علیحدگی اختیار کرلی اور سیاست کو خیرباد کہہ کر تصنیف و تالیف اور سیرو سیاحت میں لگ گیا۔ اس نے کبھی بھی ایک قمیص، ایک جوڑا لباس اور ایک جوتا دوبار نہیں پہنا۔ اس کے پاس ہمیشہ ایک ہزار لباس اور ایک ہزار جوتوں کے جوڑے ہوتے تھے۔ اس کے ملازموں میں سے کچھ کی صرف یہ ڈیوٹی ہوتی تھی کہ اس کی قمیضوں، لباس اور جوتوں کی دیکھ بھال کریں۔

(۱۱۰) اومسیڈ (شکاگو یونیورسٹی کے مشرقی انسٹی ٹیوٹ میں تاریخ ایران کا پروفیسر) جو ۱۹۴۵ء میں فوت ہوا۔ کی تالیف ایرانی شہنشاہیت کی تاریخ میں لکھا ہے کہ ایرانی ہخامنشیوں کے دور میں اپنی میتوں کو دفن کرتے تھے۔ اس زمانے کے تمام سلاطین بشمول کوروش اور داریوش کے دفن کئے گئے تھے، لیکن ساسانیوں کے زمانے میں میتیں دفن نہیں ہوتی تھیں بلکہ انہیں آبادی سے دور کسی بلند جگہ پر رکھ دیا جاتا تھا تاکہ وہ گل سڑ جائیں۔ اپنی کتاب میں اومسیڈ نے وضاحت کی ہے کہ ایرانی اپنی میتوں کو دفن کرنے کی بجائے گلنے سڑنے کے لئے کیوں چھوڑ دیتے تھے۔

(۱۱۱) ہندوستانی اور یورپی اصطلاح پر جیسا کہ اشارہ کیا گیا ہے اعتراض کیا گیا ہے کیونکہ تمام مورخین اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ آریاؤں کی پہلی قیام گاہ ہندوستان نہ تھی۔ وہ اس وقت ہندوستانی اور یورپی کہلائے جب وہ پہلے ہندوستان اور پھر یورپ گئے۔ اس کے بعد ہندوستان میں رہ جانے والوں کو ہندی اور یورپ چلے جانے والوں کو یورپی کہا گیا۔

(۱۱۲) گمنام نسل۔ انگریز سائنس دان ڈارون کے نظریئے کے مطابق گمنام نسل ایک ایسی نسل تھی جو ایک بڑے بندر اور انسان کی درمیانی نسل ہے، جس کا ڈھانچہ ابھی دریافت نہیں ہوا۔ یاد رہے کہ جو کچھ ڈارون نے موجودہ جانوروں کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے وہ ابھی تک تھیوری کے مراحل میں ہے اور سائنسی قوانین کی صف میں اس کا شمار نہیں ہوسکتا۔ خصوصاً انسانی نسلوں کی انواع و اقسام کا موضوع اس تصور ہی کو قبول کرنے کے راستے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ آج تک سائنس یہ نہیں جان سکی کہ زندگی کے پہلے جرثومے میں ایسی کونسی تبدیلی آئی کہ انسانی نسلوں کی بہت سی اقسام بن گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سفید فام یا سیاہ فام ایک دوسری دنیا سے اس دنیا میں آئے ہیں۔

(۱۱۳) اسٹینے کے سفر کا حال اس کے اپنے سیاحت نامے میں چھپ چکا ہے۔

(۱۱۴) پہلے زمانے میں ڈاکٹروں اور حکیموں کو فلسفی بھی کہا جاتا تھا البتہ موجودہ دور میں حکیم کی اصطلاح صرف جڑی بوٹیوں سے علاج کرنے والے کے لئے مستعمل ہے۔

(۱۱۵) خود مالک بن انس ۱۷۹ھ میں ۸۶ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔

(۱۱۶) امریکہ کا مجلّہ ٹائم ان مصنوعی سیاروں کے نقشوں کے بارے میں تفصیل درج کرچکا ہے۔

(۱۱۷) ڈکارٹ کا لاطینی زبان میں نام کارتزیانوش ہے۔ اسی لئے فلسفی مکتب اسے کارتزیان کہتا ہے اور اس فلسفی مکتب کے اصول فلسفے میں ریاضی کے قواعد پر استوار ہیں۔ ڈکارٹ کے بقول فلسفے میں حساب' ہندسہ' الجبرا' جیومیٹری اور ریاضی کے تمام علوم کے قواعد کے ذریعے چھوٹے سے بڑے مبتدی سے خبر اور استدلال سے استنتاج تک پہنچا جاتا ہے۔ آج جتنے علوم بھی مہارت کے ذریعے وجود میں آئے ہیں وہ ڈکارٹ کے فلسفے کی تحقیق کے سرچشمے سے حاصل ہوئے ہیں۔ لاطینی زبان میں ڈکارٹ کا فلسفیانہ نعرہ یہ ہوتا تھا "کوزیتو' ارگو' سوم" یعنی میرا خیال ہے پس میں ہوں۔

(۱۱۸) پیرس کا ایفل ٹاور فرانسیسیوں کی نظر میں خوبصورت ترین چیز ہونے کے علاوہ فرانس کے لئے آمدن کا ذریعہ بھی ہے۔ میں نے ایک امریکی رسالے میں پڑھا ہے کہ ۱۹۷۲ء میں تین ملین سیاح اس پر چڑھے اور اس طرح پندرہ ملین فرانک آمدنی ہوئی۔ آج جب اس ٹاور کی تعمیر کو ۹۴ سال کا عرصہ ہوچکا ہے اس کی تعمیر پر کچھ زیادہ خرچ نہیں ہوا' البتہ سات سالوں میں ایک دفعہ پینتالیس آدمی اسے رنگ کرتے ہیں۔

(۱۱۹) ریاضی کے کیڈر (Cadre) میں موجود وہ تمام قواعد مراد ہیں جو فزکس' کیمسٹری' میکانکس اور دوسری سائنسز میں موجود ہیں اور جن کے قواعد و فارمولے علم ریاضی کی مدد سے وضع ہوتے ہیں۔

(۱۲۰) انسانی بدن کا عام درجہ حرارت ۳۷ درجے سنٹی گریڈ ہے۔ اگر یہ درجہ حرارت کم ہوکر چوبیس درجے اور حتی کہ اگر پچیس درجہ حرارت تک بھی پہنچ جائے تو انسان کی موت واقع ہوجائے گی۔

(۱۲۱) سرد علاقوں میں رہنے والے بعض جانوروں کا حالت خوابیدگی میں درجہ حرارت صفر سے تین درجہ زیادہ ہوتا ہے اور جو کچھ امام علیہ السلام نے فرمایا ہے اس سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔

(۱۲۲) یہاں قارئین کرام کی خدمت میں یہ عرض کرنا بیجا نہیں ہے کہ امریکہ کے میگزین سائنس ڈائجسٹ میں آنے والے سیلاب کی مکمل طور پر پیش گوئی کی گئی تھی۔ اگرچہ اس میں پاکستان کا نام نہیں لیا گیا تھا لیکن یہ کہ گرمیوں کی بارشیں ہندوستان میں شدید ہوں گی۔ پاکستان اور ہندوستان پر ہر سال گرمیوں میں برسنے والی بارشوں کے بادل خلیج فارس اور بحیرہ عمان میں سے اٹھتے ہیں' لیکن جنوبی ایران میں نہیں برستے اور موسمی ہوائیں بادلوں کو پاکستان اور ہندوستان کی جانب لے جاتی ہیں۔

(۱۲۳) اسٹراسبرگ کے اسلامک اسٹڈیز سنٹر کے علماء منڈلینک کے متعلق غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں۔ میڈ لینک خداشناس انسان تھا۔ اس نے اپنی کتاب "ایک بڑے دماغ کی سوچ" کے شروع میں لکھا ہے کہ اگر آپ کی سوچ موجودہ سوچ سے ہزار گنا طاقتور اور وسیع ہوجائے تو آپ کی سوچ سے ہرگز ایسا خدا وجود میں نہیں آئے گا جو جھوٹا' کینہ اور بغض کا حامل اور انتقام لینے والا ہو جس سے آپ ڈریں۔ میڈ لینک کی کتابوں میں ایسے مضامین زیادہ ملتے ہیں جو اس کی خدائی معرفت کی سند ہیں۔

(۱۲۴) یہاں پر ارسطو کے فلسفیانہ نظریئے کو گزشتہ فلسفیوں جن میں ابن سینا جو ارسطو کے کٹر پیروکاروں میں سے ہے کی فلسفی اصطلاحات سے جدا کیا گیا ہے تاکہ وہ قاری جو طالب علم ہیں یا انہوں نے فلسفہ کا مطالعہ نہیں کیا ارسطو کے نظریئے کو اچھی طرح سمجھ سکیں ورنہ مصنفین فلسفیانہ اصطلاحات سے آگاہ ہیں۔

(۱۲۵) افلاطون کے اسلوب بیان کا مدعا یونانی ہے نہ کہ اس کے تراجم' ان تراجم میں افلاطون کے بیان کی خوبصورتی باقی نہیں رہی۔ جیسا کہ ایلیاد (ہومر) نے اس کی ساری خوبصورتی چھین لی ہے اور اس طرح جیسے شاہنامہ فردوسی کو نثر میں ترجمہ کر دیا جائے۔

(۱۲۶) اس رقم کی بڑائی کو دیکھنے کے لئے تین ہندسہ لکھیں اور اس کے دائیں جانب پندرہ صفر لگادیں۔

(۱۲۷) ستاروں کے اس مجموعے کو یورپ والے ہرکول کا نام دیتے ہیں۔

(۱۲۸) ٹیلی اسٹار دو لفظوں کا مجموعہ ہے۔ ایک ٹیلی جو ٹیلی فون' ٹیلی گراف' ٹیلی ویژن اور ٹیلی کمیونی کیشن کا مخفف ہے اور دوسرا اسٹار جس کے معنی ستارہ ہیں۔ یعنی وہ ستارہ جس کے ذریعے رابطہ قائم کیا جائے۔

(۱۲۹) اس طبیعیات دان کا نام فرانسیسی میں ڈوبروگلے لکھا جاتا ہے اور تلفظ کے وقت گاف اور لام کو زبان پر نہیں لایا جاتا اور صرف "ڈوبری" تلفظ کیا جاتا ہے۔

(۱۳۰) زروم دوکارکوپی' موجودہ دور کا مشہور فرانسیسی مورخ جو قدیم روی تاریخ میں سپیشلسٹ ہے اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ اس کے باوجود روم میں ۳۷ محلات' پانچ' چھ اور سات منزل کی عمارتیں اور بڑے بڑے حمام' میخانے اور عام گھر تھے۔ لیکن ان میں کسی میں بھی ٹائیلٹ Toilet نہ تھی۔ پیرس سمیت فرانس کے بڑے بڑے شہر بھی ایک عرصہ تک ٹائیلٹ سے محروم رہے۔ پیرس کے نزدیک حکومتی محل میں تقریباً" دس ہزار آدمی زندگی بسر کرتے تھے۔ وہاں بھی ٹائیلٹ نہ تھے۔ میں نے فرانس میں شائع شدہ کتاب "تاریخ کا آئینہ" میں پڑھا ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے شروع تک پیرس کے بعض گھروں میں ٹائیلٹ نہیں تھے اور وہاں کی میونسپل کارپوریشن نے ان کے مکینوں کو ٹائیلٹ بنانے پر مجبور کیا۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ ایران میں شروع ہی سے نہ صرف یہ کہ ٹائیلٹ کا گٹر بلکہ فالتوپانی کے لئے علیحدہ گٹر بھی موجود تھا۔

(۱۳۱) کورنیل یونیورسٹی' عذرا کورنیل نے بنوائی تھی۔ اس شخص نے اپنی تمام کمائی اس یونیورسٹی کے بنانے

پر خرچ کر دی تھی۔ جس وقت یہ فوت ہوا تو بالکل خالی ہاتھ تھا۔ یہ یونیورسٹی امریکہ کی ریاست نیویارک میں واقع ہے۔اس نے ۱۸۶۵ء میں تدریس کا کام شروع کیا۔

(۱۳۲) ہولوگرافی یعنی سوراخ کے راستے سے فوٹو لینا۔اس کے سادہ معنی جو سب کے لئے قابل فہم ہیں وہ بہت چھوٹی اور باریک اشیاء کا فوٹو لینا ہیں۔ آج ہولوگرافی کے ذریعے نہ صرف نہایت باریک چیزوں کی تصویریں لی جاتی ہیں بلکہ آواز کی تصویریں بھی لی جاتی ہیں۔ آواز کی لہریں کیمرے کی فلم میں دائروں اور بیضوی صورت میں نظر آتی ہیں۔ہولوگرافی کی نہایت چھوٹی چیزوں سے تصاویر بنانے کی صلاحیت اس قدر زیادہ ہے کہ خون میں پائے جانے والے سفید یا سرخ ذرات (RBC or WBC) کو ایک بڑے جانور جتنا دکھاتی ہے۔

(۱۳۳) مالیکیول کو ایٹم نہیں سمجھنا چاہئے۔مالیکیول کسی مرکب کا چھوٹے سے چھوٹا ذرہ ہے جس میں مرکب کے تمام طبیعی اور کیمیائی خواص پائے جاتے ہیں۔اگر مالیکیول کو تقسیم کیا جائے تو مرکب کے کیمیائی اور طبیعی خواص ختم ہو جاتے ہیں۔ایک مالیکیول چند ایٹوں سے مل کر بنتا ہے۔مالیکیولوں کے ارتعاش کے نتیجہ میں جامد پہلے مائع میں تبدیل ہوتا ہے اور پھر گیس میں تبدیل ہوتا ہے۔ ایک جسم کو جتنی زیادہ حرارت پہنچائی جائے اس کے مالیکیولوں کے ارتعاش میں اتنا ہی اضافہ ہو جائے گا۔

(۱۳۴) سترہویں صدی کی دوسری دہائی میں ایک فرانسیسی مولیئر نے ۱۶۸۰ء میں فرانسز کامیڈی نامی ایک تھیٹر کی بنیاد رکھی۔ یہ تھیٹر ابھی تک موجود ہے۔اس کو چلانے والی ایک مستقل کمیٹی ہے جو اداکاروں کے انتخاب میں سخت احتیاط برتتی ہے۔ الیگزینڈر ڈومائی (فرانسیسی) کے بقول فرانس کی کامیڈی کے اداکاروں کے گروہ میں شامل ہونا انگلستان کے کسی مشہور کلب کا ممبر بننے سے بھی مشکل ہے جس کی مطلوبہ اہلیت (Formalities) کے تقاضوں کو پورا کرتے کرتے بیس سال لگ جاتے ہیں۔

یہاں یہ کہنا بیجا نہیں کہ دوسری جنگ عظیم نے انگلستان کے مشہور کلبوں کی ممبر شپ کو آسان کر دیا ہے۔ آج کوئی ان کلبوں کا ممبر بننا چاہے تو اگر وہ تمام شرائط پر پورا اترتا ہو تو اسے دس سال سے زیادہ عرصہ انتظار نہیں کرنا پڑتا۔

(۱۳۵) اسپی نوزا' ہالینڈ نژاد یہودی تھا۔وہ ۱۶۷۷ء میں پینتالیس سال کی عمر میں فوت ہوا۔جب اس نے اپنے فلسفیانہ نظریئے کو وحدت الوجود کی بنیاد پر چھپوایا تو یہودی مذہب کے علماء نے اسے کافر قرار دے دیا۔اگر وہ عیسائی ہوتا تو اسے اس سے بھی زیادہ خطرہ لاحق ہوتا۔

جب اسے کافر قرار دے دیا گیا تو اس کے کنبے والوں نے بھی اس سے علیحدگی اختیار کرلی۔ انتالیس اور چالیس سال کی عمر میں وہ کسب معاش کے لئے پکی ہوئی دال فروخت کرتا تھا کیونکہ اس سے یونیورسٹی میں استاد کا عہدہ چھین لیا گیا تھا۔ اسے کئی مرتبہ ہدایت کی گئی کہ اگر وہ توبہ کر کے اپنا نظریہ واپس لے لے تو اس کا عہدہ

بحال ہو سکتا ہے لیکن اس نے قبول نہیں کیا اور غربت کی حالت میں اس دنیا سے کوچ کر گیا۔

(۱۳۶) اب تک ایسی احتیاط برتی جاتی رہی ہے۔ مرحوم محمد علی بامراد اپنی کتاب "حافظ شناسی" میں لکھتا ہے کہ ۱۰۲۸ء میں عرفاء میں سے ایک کے گھر میں تھا تو میں نے گھر کے مالک سے ایک آدمی کی موجودگی کی وجہ سے جو اہل عرفان میں سے نہ تھا' عرفانی مسائل کے بارے میں اشاراتی زبان (Code Words) میں گفتگو کی۔

(۱۳۷) یہ قول صحیح نہیں ہے۔ مسلمانوں نے قطب نما ایجاد نہیں کیا بلکہ جس طرح قطب نما کے بارے میں ایک مقالے میں دائرۃ المعارف برٹانیکا نے تفصیل بیان کی ہے۔ ان کے مطابق قطب نما یا کمپاس چینیوں کی ایجاد ہے۔ دائرۃالمعارف برٹانیکا لکھتا ہے کہ چینی دائرۃ المعارف میں بوئی ون یوتو کا نام لکھا گیا ہے۔ قطب نما پہلی مرتبہ ۲۶۳۶ قبل مسیح میں ایجاد ہوا۔ یہ آلہ آنگساتی حکومت کے زمانے میں چار سمتوں کو معلوم کرنے کے لئے چین میں ہی ایجاد ہوا لیکن اسے سمندری سفر کے لئے استعمال نہیں کیا گیا۔ ۳۱۲ء میں چینیوں نے اسے سمندری سفر میں استعمال کرنا شروع کیا۔ مسلمانوں نے اس کا استعمال چینیوں سے سیکھا۔ چونکہ یورپی لوگوں نے مسلمان علاقوں سے اس کا استعمال سیکھا لہٰذا انہوں نے یہ سمجھا کہ ایجاد کرنے والے مسلمان ہیں۔ یہاں اس بات کا ذکر نہیں ہے کہ اگر ۲۶۳۶ قبل مسیح میں قطب نما کی ایجاد چینیوں کے ہاتھوں نہ مانی جائے تو یہ ہرگز درست نہیں کیونکہ کتاب دائرۃالمعارف چینی' جس میں قطب نما کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے وہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے بعد پانچ سو سال کے دوران لکھی گئی ہے اور اس وقت اسلام منصہ شہود پر نمودار نہیں ہوا تھا۔

(۱۳۸) پیرس کے رسالے علم اور زندگی کی اگست ۱۹۷۳ء کی اشاعت میں لکھا ہے کہ فرانسیسی حکومت کئی سالوں سے روسی اور امریکی حکومتوں سے جن کے مصنوعی سیارے مسلسل فرانس کی فضائی حدود سے گزرتے اور تصاویر اتارتے ہیں درخواست کر رہی ہے کہ ان تصاویر کا کچھ حصہ جو فرانس سے متعلق ہے' فرانس کے حوالے کیا جائے لیکن یہ دونوں حکومتیں نہیں مانتیں۔ جبکہ وہ تصاویر فوجی رازوں پر بھی مشتمل نہیں ہیں اور جغرافیائی نقشے شمار کئے جاتے ہیں۔ امریکی حکومت جس نے حال ہی میں جغرافیائی تصاویر بعض ممالک کے حوالے کی ہیں فرانس کو بھی چند تصاویر کی نقول مہیا کرنے پر آمادہ ہوا ہے۔

(۱۳۹) جیسا کہ ہمیں معلوم ہے ریاستہائے متحدہ امریکہ کے دارالحکومت واشنگٹن کو جارج واشنگٹن نے ایک فرانسیسی معمار پیرشال لانفان سے تعمیر کرایا تھا اور وہاں پر ایک یونیورسٹی بھی بنام "واشنگٹن یونیورسٹی" قائم کی گئی۔ انگریز جو ہرگز امریکہ کو آزاد دیکھنا نہیں چاہتے تھے کئی دفعہ امریکہ کے حریت پسندوں سے لڑے۔ ۱۸۱۴ء میں جارج واشنگٹن کی موت کے پندرہ سال بعد انہوں نے امریکہ کے دارالحکومت پر حملہ کیا اور شہر کی عمارات کا کچھ حصہ جس میں واشنگٹن یونیورسٹی بھی شامل ہے کو ویران کیا اور صدارتی محل کو بھی خراب کیا۔ چونکہ انگریزوں کے جانے کے بعد اس ویرانی کے آثار کو مٹانے کے لئے صدارتی محل کی سفیدی کی گئی لہٰذا اسے "وائٹ

ہاؤس" کہا گیا اور آج تک اس کا یہ نام باقی ہے۔ امریکہ میں ایک اور یونیورسٹی بھی "واشنگٹن یونیورسٹی" کے نام سے قائم ہے جسے انگریزوں کے جانے کے بعد دوبارہ بنایا گیا۔ یہاں پر اس بات کا ذکر بیجا نہیں کہ واشنگٹن دارالحکومت ہونے کے باوجود امریکہ کے چھوٹے شہروں میں سے ہے اور صرف ایک انتظامی شہر ہے۔ اس میں تین لاکھ اٹھائیس ہزار ملکی ملازمین اور انتظامیہ کے لوگ ہیں (یہ اعداد و شمار اٹلانٹک رسالے کے مئی ۱۹۷۳ء کے شمارے میں شائع ہوئے ہیں)۔ یہاں پر کام کرنے والے زیادہ تر شہر سے باہر زندگی گزارتے ہیں اور دفتری اوقات کے بعد لے دے کے سیاہ فام لوگ اور سفارت خانوں کے ملازمین ہی شہر میں رہ جاتے ہیں کیونکہ وہ لوگ شہر میں رہنے پر مجبور ہیں۔

(۱۴۰) روشنی کی رفتار کا ۹۵ فیصد' دو لاکھ پچاسی ہزار کلومیٹر فی سیکنڈ بنتا ہے اور کوئی مادہ اس قدر تیز رفتاری سے حرکت نہیں کرسکتا۔ صرف شعاعیں ہی اتنی تیز رفتاری سے حرکت کرسکتی ہیں۔

(۱۴۱) اس نام کی تکرار سے تعجب نہ کریں کیونکہ ایلے لمٹرجو بلجیم کی یونیورسٹی کا استاد تھا وہ چند مشہور ماہرین فلکیات میں سے ایک تھا۔

(۱۴۲) یہاں مراد کیمیا ہے جس سے امام جعفر صادقؑ واقف تھے۔

(۱۴۳) اس سے مراد بین النہرین کے جزیرے کا شمالی حصہ ہے۔ چونکہ قدیم زمانے میں دو دریاؤں نے اسے تینوں اطراف سے گھیرا ہوا تھا لہٰذا اعراب اسے جزیرہ کہتے تھے۔

(۱۴۴) جیسا کہ امام نے فرمایا ہے' ہیرا چشموں' نہروں اور دریاؤں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ براعظم افریقہ کے ہر اس مقام سے جہاں سے ہیرا حاصل ہوتا ہے وہ جگہ قدیم دریاؤں کی خشک گزرگاہیں ہیں۔ صرف روس کے اورال پہاڑ اس قاعدے سے مستثنیٰ ہیں۔ وہاں پر ملنے والا ہیرا اصلی نہیں ہوتا بلکہ کوارٹز کی ایک قسم ہے۔ حقیقی ہیرا کاربن کا ہوتا ہے۔

(۱۴۵) وہ دن آج کا دن ہے۔ امریکہ کے مجلّہ سائنس کی جون ۱۹۷۳ء کی اشاعت میں لکھا ہے کہ لیزر شعاعوں کی مدد سے پہلی مرتبہ مالیکولوں کی حرکت کی تصاویر لے کر ان کا کھلم کھلا مشاہدہ کیا گیا ہے۔ تصاویر لینے والے کیمرے کے فلش کی مدت ایک ٹریلیم سیکنڈ کو ایک سیکنڈ سے کیا نسبت ہے۔ اسے یوں سمجھ لیجئے کہ ہماری زندگی کے چوبیس گھنٹے کرہ زمین کی عمر کے دوگنا کے مترادف ہیں اگر زمین کی عمر پانچ ارب سال ہو۔

(۱۴۶) یہ ایک سائنسی حقیقت ہے کہ زمین کے براعظم مسلسل حرکت کر رہے ہیں۔ براعظم امریکہ اور براعظم افریقہ کی حرکت کی رفتار بیس سنٹی میٹر فی سیکنڈ ہے۔ امریکہ کا براعظم مغرب کی طرف جا رہا ہے اور ایشیا و یورپ کا براعظم ایشیا سے ملحق ہو جائے گا۔ یہ سائنسی حقیقت جیالوجی کی تمام کتابوں میں موجود ہے۔

(۱۴۷) آج علم نباتات بھی درختوں کو ایک سو پچاس طبقات میں تقسیم کرتا ہے جن میں سے ہر طبقہ مختلف

اقسام اور گروہوں پر مشتمل ہے۔ نصف صدی قبل تک ایرانی درختوں کی طبقہ بندی نہیں کی گئی تھی۔ حالیہ چالیس سالوں میں ایک ماہر نباتات رشین گر نے جو آسٹریا کا رہنے والا ہے، ایران میں تین ہزار درخت دریافت کئے ہیں جن کا ذکر کسی کتاب میں نہیں آیا۔ اس سائنس دان نے ایران میں پائے جانے والے درختوں کی درجہ بندی کرکے "ایران کے درخت" نامی ایک کتاب لکھی ہے جس کی ایک سو جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور پچاس جلدیں مزید باقی ہیں۔ یہ کتاب باتصویر ہے اور کہا جاتا ہے کہ ایرانی درختوں کے بارے میں جرمنی زبان میں لکھی جانے والی اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے۔

(۱۴۸) امام علیہ السلام کے فرمان نے ہمیں الیکسی کارل مشہور سائنس دان اور کتاب "موجودہ انسان پہچانا نہیں گیا" کے مصنف کی یاد دلا دی ہے جو موت کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اس راہ میں موثر اقدامات بھی کئے لیکن بعد میں پشیمان ہوا اور موت کو ختم کرنے کے متعلق کاموں کو ترک کردیا۔ امریکہ کا چھپا ہوا رسالہ دائرۃ المعارف کولمبیا، الیکسی کارل کے متعلق اپنے مقالے میں لکھتا ہے کہ اس کے اندر دو انسان ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ ایک سائنس دان جو موت کو ختم کرنا چاہتا تھا اور دوسرا فلسفی جو سائنس دان سے کہتا تھا کہ تم موت کو کیوں ختم کرنا چاہتے ہو ؟ کیا تم لوگوں کی عمردراز کرنا چاہتے ہو جو خودپسند اور بے رحم ہیں ؟ جن کی خواہش صرف یہ ہوتی ہے کہ مال دولت اکٹھی کریں چاہے اس کے لئے انہیں ہزاروں انسانوں کا خون کیوں نہ بہانا پڑے۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ انسان کی قدروقیمت اس کی کیفیت سے ہے نہ کہ اس کی کمیت کے لحاظ سے۔ ایک قیمتی انسان جو اپنے جیسے انسان کی کوئی خدمت کرتا ہے اس کی اہمیت لاکھوں بے قیمت انسانوں سے زیادہ ہے۔ سائنس دان اور فلسفی کی اس لڑائی میں آخرکار فلسفی غالب آگیا اور الیکسی کارل انسانی عمردرازی کے سلسلے میں تحقیقات کے لئے وسائل بروئے کار لانے کے لئے رک گیا۔ بہرکیف اس کی یہ تحقیق کہ اگر جوان کا خون کسی بوڑھے مرد یا بوڑھی عورت (بشرطیکہ خون کے گروپ میں تضاد نہ ہو) کو لگایا جائے تو بوڑھوں کی عمردراز ہوجاتی ہے۔ یہ بات تمام بیالوجسٹس تسلیم کرتے ہیں۔ الیکسی کارل نے تحقیق کے پہلے مرحلے میں عمر کی درازی کے لئے مرغی کے بچے کے عضلے (Muscle) کو اس جانور سے جدا کرنے کے بعد ایک مخصوص مائع میں رکھ دیا۔ آج اس عضلے کو ستر سال کا عرصہ ہوچکا ہے کہ وہ اس مائع میں زندہ ہے۔ وہ چند دنوں میں دگنا ہوجاتا ہے۔ مہینے میں ایک دفعہ اس کا آدھا حصہ دور پھینکنا پڑتا ہے اور اگر اس کا آدھا حصہ نہ پھینکا جاتا تو وہ عضلہ اس قدر بڑھ جاتا کہ ہمارا نظام شمسی اس کے باوجود کہ اس قدر بڑا ہے وہ اس میں نہ سما سکتا۔ الیکسی کارل میڈیکل اور سرجری کی تاریخ میں پہلا ڈاکٹر ہے جس نے شریان کو جوڑا اور طب میں نوبل انعام حاصل کیا۔ اس نے دل کی بڑی شریان lorta کو تین منٹوں میں جوڑدیا اور اس کے بعد آج تک ایسا سرجن پیدا نہیں ہوا جو پندرہ منٹ سے کم وقت میں lorta کو جوڑ دے۔ الیکسی کارل اس دور کے قابل سائنس دانوں میں سے تھا۔ وہ ۱۹۴۴ء

میں فوت ہوا۔

(۱۴۹) اس دور میں اس قسم کا کلام ایک معجزے کی مانند ہے۔ کیونکہ آج ڈاکٹروں کی معلومات کے مطابق دورہ پڑنے والی موت کی تین وجوہات ہیں۔ ایک یہ کہ دماغ میں ایک چھوٹا سا ٹکڑا خون کو روکتا ہے یا دماغ میں خون بہنا شروع ہوجاتا ہے۔ دوسرا یہ کہ دل میں ایک ٹکڑا خون کے بہاؤ کو روک دیتا ہے اور آکسیجن کے خلیات دل کے ایک حصے تک نہیں پہنچ پاتے یا رگ کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے باعث دل کے خلیات کا ایک حصہ غذا سے محروم رہتا ہے۔ دورہ پڑنے کا تیسرا سبب خون کے ایک ٹکڑے کا خون کے بہاؤ کو ایک رگ میں روک دینا ہے جس کی وجہ سے خون ان خلیات تک نہیں پہنچ پاتا' جنہیں اس رگ سے خون حاصل کرنا ہوتا ہے۔ ان تین دوروں میں سے ہر ایک کی مزید اقسام ہیں لیکن مجموعی طور پر بڑی قسمیں دماغ' دل اور خون کے دورے کی ہیں جو ہم نے بیان کردی ہیں۔ یہ بیماریاں موجودہ زمانے میں عام ہو چکی ہیں۔

(۱۵۰) اس کا مطلب ظاہری حیات تک محدود ہے جاودانی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ خاتم الانبیاءؑ اور دیگر خاصان خدا اپنی حیات خاص سے سرفراز ہوکر زندہ جاوید ہیں۔ (مترجم)

(۱۵۱) قارئین پر یہ بات پوشیدہ نہیں کہ آواز کی حرکت کے بارے میں ارشمیدس کا حساب غلطی سے خالی نہیں۔ خاص طور پر یہ کہ ارشمیدس کے دور میں ہمیں یقین ہے کہ سیکنڈ وہی مدت ہے جسے آج کل ہماری گھڑیاں دکھاتی ہیں۔ لیکن یہ معلوم ہے کہ قدیم یونان میں سیکنڈ کا مفہوم موجود تھا۔ یونانی ارشمیدس جو ایک فلسفی' انجنیئر اور طبیعیات دان تھا کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اس نے جیومیٹری اور طبیعیات کے بارے میں نو کتابیں لکھیں جو آج تک محفوظ ہیں۔ آج بھی تیسری صدی قبل مسیح کی طرح جو ارشمیدس کی موجودگی کا زمانہ تھا' ان سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ تمام سمندری جہاز پانی میں غوطہ لگانے والے اجسام کے وزن کے تعین کے بارے میں ارشمیدس کے مشہور قانون سے استفادہ کرتے ہوئے بنائے جاتے ہیں۔ سائنس کی خوبی یہ ہے کہ وہ پرانی نہیں ہوتی' اسی طرح یہ سائنسی قانون انسان اور دوسری مخلوق کی زندگی کے آخر تک باقی رہے گا۔

(۱۵۲) امریکی خاتون "ورارو بین" جو عورتوں میں واحد اور عظیم ماہر فلکیات ہے اس کے بغیر کسی خاتون کو اجازت نہیں کہ وہ پالومر کی عظیم رصدگاہ کی ٹیلی سکوپ کے پیچھے بیٹھ سکے۔ امریکی رسالے "سائنٹفک امریکن" نے اپنی جون ۱۹۷۳ء کی اشاعت میں کہکشاں کے وجود میں آنے اور اس میں تبدیلیوں کے بارے میں ایک مقالہ لکھا ہے۔ اس نے کہکشاں کی تبدیلی اور جو کچھ اس میں ہے اس کا چھ مرحلوں میں ذکر کیا ہے جو کلام خدا اور امام علیہ السلام کے فرمودات سے مطابقت رکھتا ہے۔

(۱۵۳) قدیم یونان کے مادی فلاسفر جن کا کہنا تھا کہ تمام چیزیں مادہ سے بنی ہیں کم از کم وہ مادے کے وجود کے معتقد تھے۔ لیکن جرمن فلسفی شوپنہار جو ۱۸۶۰ء میں ۸۲ سال کی عمر میں فوت ہوا اس نے سات یونیورسٹیوں سے

اجتہادی درجہ حاصل کیا جسے آج کی اصطلاح میں پی ایچ ڈی کہا جا سکتا ہے۔ یہ شخص مادے کے وجود کا مستقل منکر تھا اور کہا کرتا تھا کہ مادہ بذات خود وجود نہیں رکھتا بلکہ ہمارے حواس خمسہ اور دوسرے حواس کی وجہ سے موجود نظر آتا ہے۔ یعنی ہم پتھر کے وجود کے اس لئے معتقد ہیں کہ اسے ہم لمس اور وزن کر سکتے ہیں اور سورج کو اس لئے محسوس کرتے ہیں کہ اس کی روشنی کو دیکھتے اور اس کی حرارت کا احساس کرتے ہیں۔ لہٰذا سورج ہمارے لئے اس بنا پر موجود ہے' بذات خود وہ ہماری نظر میں کچھ نہیں۔ اگر کوئی حواس خمسہ اور دوسرے حواس نہ رکھتا ہو تو وہ مادے کے وجود کو نہیں سمجھ سکتا اور ماد اس کے لئے موجود نہیں ہے۔ شوپنہار جسے بدگمان ترین فلاسفہ میں سے شمار کیا جاتا ہے اس کے بقول بنی نوع انسان کے مقدر میں ہے کہ وہ اپنی زندگی کے خاتمے تک جہان کے بارے میں کوئی اطلاع نہ رکھے اور اپنی اس جہالت سے رنج اٹھاتا رہے۔ لیکن اس بدظن فلسفی نے اپنے منفی نظریئے سے ایک قابل تحسین نتیجہ اخذ کیا ہے اور کہا ہے کہ چونکہ ہمیشہ کی نادانی انسان کو مسلسل رنج میں مبتلا رکھتی ہے لہٰذا ضروری ہے کہ انسان کے لئے تسکین کا کوئی اور ذریعہ موجود ہو۔ انسان کی تسکین کا بہترین ذریعہ علم و ہنر میں مشغول رہنا ہے۔ جس وقت شوپنہار انسان کا نام لیتا ہے تو اس سے اس کی مراد ایک ایسی ہستی ہوتی ہے جو صرف کھانے اور سونے میں اپنی خوش بختی نہیں سمجھتا اور اس فلسفی نے فلسفے میں ڈرامے کی اصطلاح داخل کی اور کہا کہ دنیا ہمارے لئے حواس اور جذبات کے لحاظ سے ایک ڈرامہ ہے اور ہم اس ڈرامے کے علاوہ نہ تو کچھ دیکھیں گے اور نہ ہی سنیں گے۔

(۱۵۴) عبقری سے مراد نابغہ شخص اور عبقریہ سے مراد نابغہ عورت ہے۔

(۱۵۵) یونانی فلسفی افلاطون ۴۲۷ قبل مسیح میں پیدا ہوا اور ۳۴۷ قبل مسیح میں فوت ہوگیا۔ وہ ایتھنز کے امراء میں سے تھا اور جوانی کے آغاز ہی سے سقراط کے حلقہ درس میں فلسفے کا شیدائی ہوگیا۔ ایتھنز کے نزدیک ایک باغ تھا جس کا نام اکیڈمی تھا اس کے بعد اس نے وہاں پر درس دینا شروع کیا اور آخر عمر تک صرف دوبار سیراکوز کا سفر اختیار کرنے کے علاوہ وہیں درس دیتا رہا۔ یونانی زبان میں ان لوگوں کے بقول جو یونانی زبان جانتے تھے اور جانتے ہیں انہوں نے افلاطون کے آثار کو اصلی زبان سے یورپی زبانوں میں ترجمہ کیا ہے۔ وہ اسلوب کے لحاظ سے افلاطون کی تقریروں کو شاہکار سمجھتے ہیں۔ لیکن یورپی زبانوں میں ترجمہ ہونے کے بعد افلاطون کے اسلوب کی خوبصورتی کا کچھ حصہ ضائع ہو جاتا ہے۔ افلاطون کے فلسفے کی بنیاد نظم و ضبط پر ہے یعنی اجتماعی زندگی اور انفرادی زندگی میں نظم و ضبط' اس کا عقیدہ تھا کہ حاکم فلسفی ہونا چاہئے تاکہ انسانوں کی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط میں گڑبڑ نہ ہو اور انفرادی زندگی میں نظم و ضبط کے لئے ہر مرد و عورت میں چار صفات کا ہونا ضروری ہے۔ پہلی عدل و انصاف' دوسری اعتدال' تیسری عقل اور چوتھی سنجیدگی اور سستی سے پرہیز ہے۔ افلاطون عدل و انصاف کی صفت کو اجتماعی اور انفرادی ہر دو زندگیوں کے نظم و ضبط کے لئے ضروری خیال کرتا ہے۔ اس فلسفی

کے افکار جو تقریری صورت میں ہوتے تھے اور شاگرد انہیں لکھتے تھے۔ انہوں نے فلسفے پر گہرا اثر ڈالا۔ آج بھی جبکہ بیسویں صدی کا زمانہ ہے فلسفے میں افلاطون کے افکار کا اثر باقی ہے۔ یورپی مورخین نے افلاطون کو جمہوری حکومت کا کٹر حامی کہا ہے۔ اس کا یہ تعارف صحیح نہیں ہے کیونکہ افلاطون ان غلاموں جو ایتھنز سمیت بعض یونانی ریاستوں میں اکثریت میں تھے کے حق کا ذرا بھی قائل نہ تھا اور انہیں پالتو جانوروں جن کا وجود انسانی زندگی کے لئے ضروری ہے سے مختلف خیال نہ کرتا تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ غلام کو اطاعت اور خدمت کرنی چاہئے۔ بہرحال افلاطون فلسفے میں بڑا مقام رکھتا تھا۔

(۱۵۶) اس لفظ کو سیوا بھی لکھا اور تلفظ کیا جاتا ہے۔

(۱۵۷) ارسطوخوس۔ یونانی زبان میں اس شخص کا نام ارستاخوس ہے۔ علم نجوم کی تاریخ کے مطابق اس نے زمین کی سورج کے گرد حرکت اور دن رات کے مسلسل آنے کا حقیقی سبب معلوم کیا۔ یہ تیسری صدی قبل از مسیح میں ہو گزرا ہے۔

(۱۵۸) اس شخص کا یونانی نام ڈیموکریتس ہے۔ فرانس میں اسے ڈیموکریٹ پڑھا جاتا ہے۔ یہ ۴۶۰ قبل مسیح میں پیدا ہوا اور ۳۷۰ قبل مسیح میں فوت ہوا۔ یہ ارسطوخوس سے ایک صدی پہلے ہو گزرا ہے۔ یہ وہ پہلا عظیم مفکر تھا جس نے ایٹم کے متعلق تحقیق کی تھی اور کہا تھا کہ کائنات اتنے چھوٹے چھوٹے ذرات سے وجود میں آئی ہے جن کو دیکھا نہیں جا سکتا نہ ان کو تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یہ ذرے مسلسل متحرک ہیں۔ اسی شخص نے سب سے پہلے کہا تھا کہ حواس کے ذریعے حقیقت کو نہیں پہچانا جا سکتا کیونکہ حواس ہمیں دھوکہ دیتے ہیں مثلاً ہماری سماعت آسمانی بجلی کی گرج کو ایک خوفناک آواز سمجھتی ہے حالانکہ اس کی حقیقت خوفناک آواز کے علاوہ کچھ اور ہے۔ اسی نے ذرے کا نام ایٹم یعنی مزید نہ تقسیم ہونے والا ذرہ رکھا۔ لیکن موجودہ سائنس نے ثابت کردیا ہے کہ ایٹم بھی مزید چھوٹے چھوٹے ذرات مثلاً "الیکٹران" پروٹان اور نیوٹران وغیرہ میں تقسیم ہوتا ہے۔

(۱۵۹) فن لینڈ کے آرٹسٹ مصنف میکاوالتاری نے اپنی سوانح حیات "میں فرعون کا مخصوص ڈاکٹر تھا" میں مصر میں اجساد خاکی کو محفوظ کرنے والے اداروں کی وضاحت درج کی ہے۔ اس کتاب میں مصریوں کی نعشوں کے بارے میں عقائد اور رسومات کا تاریخی حوالوں سے تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔ کولمبیا کے دائرۃ المعارف کے امریکی ایڈیشن میں موی فیکیشن یعنی "مومیانا" کے عنوان سے ایک مقالے میں درج کیا ہے کہ دنیا میں پہلا بنک مصر میں کھلا تھا جس میں مصری لوگ اپنی زندگی میں اپنے جسموں کو محفوظ رکھنے کے لئے رقوم جمع کرتے تھے۔

(۱۶۰) قابل توجہ بات ہے کہ اریستاخوس (ارسطوخوس) کا اصلی وطن یونان نہ تھا بلکہ وہ ساموس میں پیدا ہوا اور زیادہ گمان یہ ہے کہ وہیں مرا اور اسی جگہ دفن ہوا۔ ساموس موجودہ ترکی کے مغرب میں ایک جزیرہ ہے

جس کی آبادی ساٹھ ستر ہزار نفوس ہے۔ یہ علاقہ کوہستانی ہے اور یہاں کا تمباکو بہت مشہور ہے۔ یونانیوں نے گیارہویں صدی قبل مسیح میں اس جزیرے میں ڈیرے لگائے۔ ارسطوخوس کے زمانے میں اس جزیرے کو یونانی علاقہ بنے آٹھ سو سال گزر چکے تھے۔ باوجودیکہ آریستاخوس سے یونانیوں نے بدسلوکی برتی پھر بھی اس میں وطن پرستی اس قدر زیادہ تھی کہ وہ یونان کی مٹی کے علاوہ کسی دوسری جگہ دفن نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس حب الوطنی کے جذبے کی قوت اور تیسری صدی قبل مسیح ہی میں اس رومی شخص کی وطن سے نفرت کے جذبے میں کتنا فرق ہے جو روم کی سرزمین سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے "اے حق نہ پہچاننے والے وطن ! تیری سزا کے لئے یہی کافی ہے کہ تو میری ہڈیوں کو اپنے دامن میں سمیٹنے کے افتخار سے محروم رہے گا"۔

(۱۶۱) جیسا کہ ہم مطالعہ کر چکے ہیں کہ فرانسیسی بکرل' جرمن آئن سٹائن' انگریز باوارڈ ہیسٹن اور دوسرے تمام Theory of Relativity کے حامیوں سے بارہ سو سال پہلے امام جعفر صادقؑ نے معلوم کرلیا تھا کہ زمانہ نسبی (Relative) ہے اور ہم معمول کی زندگی میں زمانے کے نسبی ہونے کو خصوصاً" خواب دیکھنے کے دوران درک کرتے ہیں اور کبھی خواب میں دیکھتے ہیں کہ خواب کی حالت میں کئی سال گزر جاتے ہیں اور جونہی خواب سے بیدار ہوتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں سوئے تھے۔

(۱۶۲) امامؑ کا فرمان اس لحاظ سے صحیح ہے کہ اگر حافظے کو کام میں نہ لایا جائے تو وہ بڑھاپے میں ضعیف ہوجاتا ہے۔ لیکن موجودہ دور کے سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ حافظے کا مرکز مغز کے دو بیضوی حصوں اور مغز کے باہر والی دیوار پر ہوتا ہے۔ جو لوگ دائیں ہاتھ سے کام کرتے ہیں ان کے حافظے کے مرکز بائیں طرف والے خلیات بڑھاپے کی وجہ سے اپنی نرمی کھو دیتے ہیں اور بڑھاپے میں حافظے کی کمزوری کا شکار ہوتے ہیں۔ ان کو چاہئے کہ بائیں ہاتھ سے کام کرنا شروع کردیں تو ان کے مغز کا دائیں طرف والا بیضوی حصہ کام کرنا شروع کردے گا اور حافظہ پہلی حالت میں آجائے گا۔

سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ ایسے لوگ جو بڑھاپے کے نتیجے میں حافظے کے مرکز کی سختی کا شکار ہوجاتے ہیں اگر ان کا حافظہ مصروف رہے اور وہ اس پر توجہ دیں تاکہ ان کا حافظہ بیکار نہ رہے تو ان کا حافظہ کبھی فراموشی کا شکار نہیں ہوگا۔

(۱۶۳) ملاحظہ فرمایئے امامؑ کا فرمان کس قدر جدید عملی نظریئے سے میل کھاتا ہے جس میں بڑھاپے کو بیماری سمجھا جاتا ہے۔ پیرس میں چھپنے والے رسالے علم و زندگی کے بقول بڑھاپا وارس کی پیداوار ہے۔ بڑھاپے کا وارس اوسطاً" تیس سال تک رشد کرتا ہے یہاں تک کہ کمال کی حد تک پہنچتا ہے اور جب رشد کے اس مرحلے تک پہنچتا ہے تو انسان کو ہلاک کردیتا ہے۔ (مترجم)

(۱۶۴) سر آرتھورڈ برگلن انگلستان کا مشہور طبیعیات دان جو ۱۹۴۴ء میں فوت ہوا اس نے اظہار خیال کیا ہے

کہ اگر انسان یا کسی جانور کے بدن میں خون کا صرف ایک قطرہ قوت تجاذب کے عام قانون پر نہ چلے تو خون کے اس قطرے کی عدم اطاعت سے ایک ایسا ردعمل رونما ہوگا جس سے کم ازکم نظام شمسی جو قوت تجاذب کے قانون کی پیروی کرتا ہے ویران ہو جائے گا اور اگر قوت تجاذب کا قانون جس طرح نظام شمسی میں حکم فرما ہے اسی طرح تمام کائنات میں حکم فرما ہو تو کائنات ویران ہوجائے گی۔

موجودہ صدی کی سائنسی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قانون دوسری جگہوں پر بھی حکم فرما ہے۔ یہی طبیعیات دان آگے چل کر کہتا ہے کہ اگر نظام شمسی کا ایک ایٹم قوت تجاذب کے قانون کی پیروی نہ کرے تو نظام شمسی تباہ ہوجائے گا جس میں ہم بھی شامل ہیں۔ (مترجم)

(۶۵) گویا یہ گفتگو حضرت امام جعفر صادقؑ اور جابر کے درمیان ۱۳۰ھ میں ہوئی ہے کیونکہ یہودیوں کی روایت کی بناء پر اس وقت کائنات کی عمر کو ۴۲۷۴ سال ہو چکے تھے۔

(۶۶) قدیم زمانے میں علمائے اسلام ان صفات کو صفات ثبوتیہ و صفات سلبیہ کا نام دیتے تھے۔

(۶۷) بلجیم کا شہری میٹرلنک کہتا ہے کہ اگر میں آپ کو یہ بتا سکتا کہ خدا کون ہے تو پھر میں آپ جیسا انسان نہ ہوتا بلکہ آپ کا خدا ہوجاتا۔ (مترجم)

(۶۸) شعرائے یمانی "کلب اکبر" (ستاروں کے مجموعے) کا جزو ہے۔

(۶۹) سماک رامع "عوا" (ستاروں کے مجموعے) کا جزو ہے۔ اس کا مطلب "ریوڑ کا محافظ" ہے۔

## اختتام

The work is worth possessing. It certainly help to clear a lot of mis conception that has crept up over a period of time to pollute the clean and free atmosphere of scholarship of the early days of pristine Islam.

| Super Brain of Islam.<br>Islamic Studies Centre.<br>Strasbourg<br>Republished by "The Twelfth Apostles' Publications."<br>Urdu Translation<br>By Syed Kifayat Hussain<br>Pages 472<br>Price Rs. 200/. |
|---|

great grandson. On his mother side, he was descended from Hazret Abu Bakr. That explains why he would never tolerate criticism of the first two caliphs.

The position of the direct descendants of the Prophet (PBUH) has never been contested in Islam. They were the infallible religious leaders or *Imams*, but the political leadership expelled by the caliphs was always shaky. This political leadership, always strove to dilute or amalgamate to the religious leadership for their own purpose, and to the end of the Umayyad rule, the caliphs sometimes used the sermon in the weekly congregation to reinforce their authority in direct contrast to the position of the *Imam*. Consequently after the passing away of *Imam Baqir Imam Jaffar* was seen as a possible clamant to the caliphate and a potential threat to the rulers of the day.

Around 749.750 the Abbasids, descendants of one of the Prophet's uncles, overthrew the Ummayads, however, the new leadership was not different and had to face hostile factors. e. g. the Persians, who resented Arab domination. A mixture of religious, and political opposition confounded the situation. The new rulers were understandably worried about *Imam Jaffar*. Al-Mansur wanted in Baghdad, the new capital, where he could keep him under surveillance. The *Imam* preferred to stay in Medina but after the death of Muhammad Ibn Abdullah, he moved to Baghdad. It passed away in 765 as a result of poison administered by the minions of Abu Jaffar al-Mansur, the second of the Abbasids. He rests in Medina in the Jannat-Ul-Baquie. According to Allama Iqbal the conspiracies against the *Imam* were the result of connivance between the ruler and the mullahs of the day.

The *Imam* was critical of the conditions prevailing in his times and lamented the deviation of the populace from the true path as ordained by The Almighty. People no longer strove to inquire and were content with whatever little information they possessed. Nobody toiled any longer.

The ignoramii rose to claim to be custodians of learning and wisdom, they re-defined their greed as the law, their wealth and pride as respect, their ruse as compassion, their discord as exploration, their contumacy as allegiance, their disbelief and free-thinking as the way of the pious. No longer were the tenets of Islam followed, not hospitality of the age *Jahiliya* practiced.

The *Imam* lays stress upon scholarship, for that purpose he lectured at the school established by his fore-fathers. From the very beginning he emphasizes the need for learning and then applying whatever you have learnt and the knowledge

that you have acquired to your daily life and for public benefit. Many a quotation attributed to the *Imam* exhibit this attitude. For instance, he remarks that knowledge does not negate knowledge and gives birth to no opposition of that knowledge ignorance are poles a part, ignorance belongs to the times and domain of the infidels and that ignorance will keep you away from learned company. Also an orphan is not a fatherless person but an illiterate is.

The *Imam* also took a critical view of recording history for posteriority. Distortion and romanticism has no place to history for posteriority. Distortion and romanticism has no place in history. Perhaps he agreed with the Achkanians and Sasanians in coming to such conclusions.

His contribution to laying the original foundation of the record of Hadiths and Muslim Law is monumental. He elucidated that the traditional sayings of the Prophet cannot be contrary to the Quran. Anything in conflict with the Quran would not be proper. The Fiq-e-Jaferia that is attributed to him is in fact Fiq-e-Muhammadi.

Many a concept that we think to be discovered today seems to have really originated either by Him or His student in His school, for instance the concepts about the origin of matter of universe were expounded by him and this happens to be the foundation of the present theories. It would be of interest to readers that amongst His students were great names that not only we, but also the west revere, for instance Geber (Jabir-ibne-Hayan). Imam-e-Azam Abu-Hannifia, Malik-bin-Ans, Hisham-bin-Hakim, etc, etc. it is a pity that we seem to have lost touch with over heritage in having allowed others to don the mantle of scientific and progressive scholar ship which truly belongs to us. We seem to have developed prejudices against scientific enquiry, pursuit of enquiry and pursuit of knowledge. I am afraid this trend has been and is being encouraged by our so called custodians of religious morals and conviction. So much so that the only Nobel laureate produced by the country is discouraged by stay there and some of the ignorants even refuse to accept him as a citizen of Pakistan. It is a pity that the present day ignorance has managed to wrap knowledge in the veils of ignorance and irrationality. The local ignorance cannot tolerate a dent in his position as the 'know-all' of the place.

**Book Review**

**"The Frontier Post"**
**(A daily Published from Peshawar)**

**"Weekend Post"**
**Friday,October 4. 196**

# Apostle of Humanity

By Sajid Abbas

In the present times, it was most refreshing to read a volume which would take you back to the days of peace and show that progress, discovery and contribution to amity and advancement in this world is not the exclusive result o the so-called present day scientific and technical headway that we have made today. True discoveries of our times have contributed to material improvement of our lives, but despite all that order in the world is still elusive, and man continues his search for a peaceful existence. We fight with each other but yearn for and talk of peaceful coexistence. One is also amused to find that, what we in the West claim to be our gift to the world of science and technology, is infact the heritage of the early Muslims, be they in Arabia, Mesopotamia, Iran or Andalusia.

The volume *'Maghz-e-mufukkar-e-Islam'* is the work of twenty five scholars – both Muslim and non-Muslim – and is about the life and work of *Imam* Ja'far As-Sadiq. It was originally published by Islamic Studies Centre, Strasbourg and was in the French language. It was translated in Persian by Zabihullah Mansouree and the Urdu rendering was done by Syed Kifayat Hussain (Peeran Shahri).

The work covers, in about fifty chapters, subjects which were investigated in the early days of Islam –surely a very vast spectrum of Man's life. There are chapters on the origins of the universe and the world, structure of matter, chemistry and Physics, astronomy and mathematics, geography climatology and environmental sciences anatomy, physiology and medicine philosophy, culture of Man, positive learning and scholarship and above all duty of Man to his Creator and his creatures.

Jaffar ibn Muhammad al-Baqir, popularly known as jaffar-Sadiq– the Trustworthy, was born in 702 in Medina, sixth in the line of *Imams,* i. e. the spiritual successors to the Prophet (Peace be upon Him), being his great, great,

Pakistan
OBSERVER

Islamabad, RAMAZAN 05, 1420 AH, TUESDAY, DECEMBER 14, 1999 E-mail: Observer@best.net.pk

# Kifayat awarded gold medal for translation

OUR CORRESPONDENT

MANSEHRA. A colourful prize distribution was held here the other day with a variety of prgrammes and spell-binding performance by school children.

Kifayat Hussain Shah

Girls and boys of different academic institutions presented a number of skids, tableaus and songs, giving a strong message against the menace of illiteracy and addiction.

Presided over by the district bar association president Advocate Muzaffar Khan, the function was largely attended, besides schoolchildren by artists, writers, poets and scholars.

Silver and gold medal shields were awarded to literary figures of Hazarah and Mansehra for their excellent work including Kifayat Hussain Shah, Jan-e-Alam, Daud Kausar, Parveen Saif and Abdul Rasheed.

Writer Kifayat Hussain Shah was given goldmedal for translating a book titled "Super Brain of Islam" into Urdu.

The writer Kifayat told *Pakistan Observer*, that book comprises of 412 pages. It was written by as many as 25 western Christian scholars about the personality of noted Imam Hazrat Jaffar Sadiq (AS), particularly about his outstanding knowledge regarding the secrets of the universe including the Holy Quran.

My prime aim of translating the book into Urdu was to enable the Pakistanis to study the person, achievements and services of Hazrat Jaffar Sadiq (AS), he explained.

Greatly influenced by the personality of the Imam, Kifayat stated, German and French scholars and researchers produced this landmark enterprise for the generations to come.

The book was first translated from French to Persian and then Kifayat ventured to undertake its translation into Urdu. Speaking on the occasion, the chief guest appreciated the performance of school children and other literary figures.

He called for continuing the tradition of holding such functions in future without any break for encouragement of the people, the youth in particular.

# SUPER BRAIN OF ISLAM
## (GOLD MEDILAST)


| | |
|---|---|
| By | 25 Scholars (Muslim & Non Muslim)<br>Islamic Studies Center Estrasburg France |
| Urdu Translation | Syed Kifayat Hussain Naqvi |
| Co-Operation | Syed Zakir Ali Zadi |
| Edition | Second |
| Quantity | 1000 |
| Price | 200 |

Stockiest **Muhammad Ali Book Agency**

1- Imambargah Imam Al-Sadiq G-9/2 Islamabad.
2- Imambargah Yadgar-I-Hussain Rawalpindi.
3- Imambargah Qasr-I-Abu Talib, Rawalpindi.
4- Imambargah Qadeem Raja Bazar, Rawalpindi.
Phone: 0333-5121442
E-mail: m_alibookagency@hotmail.com
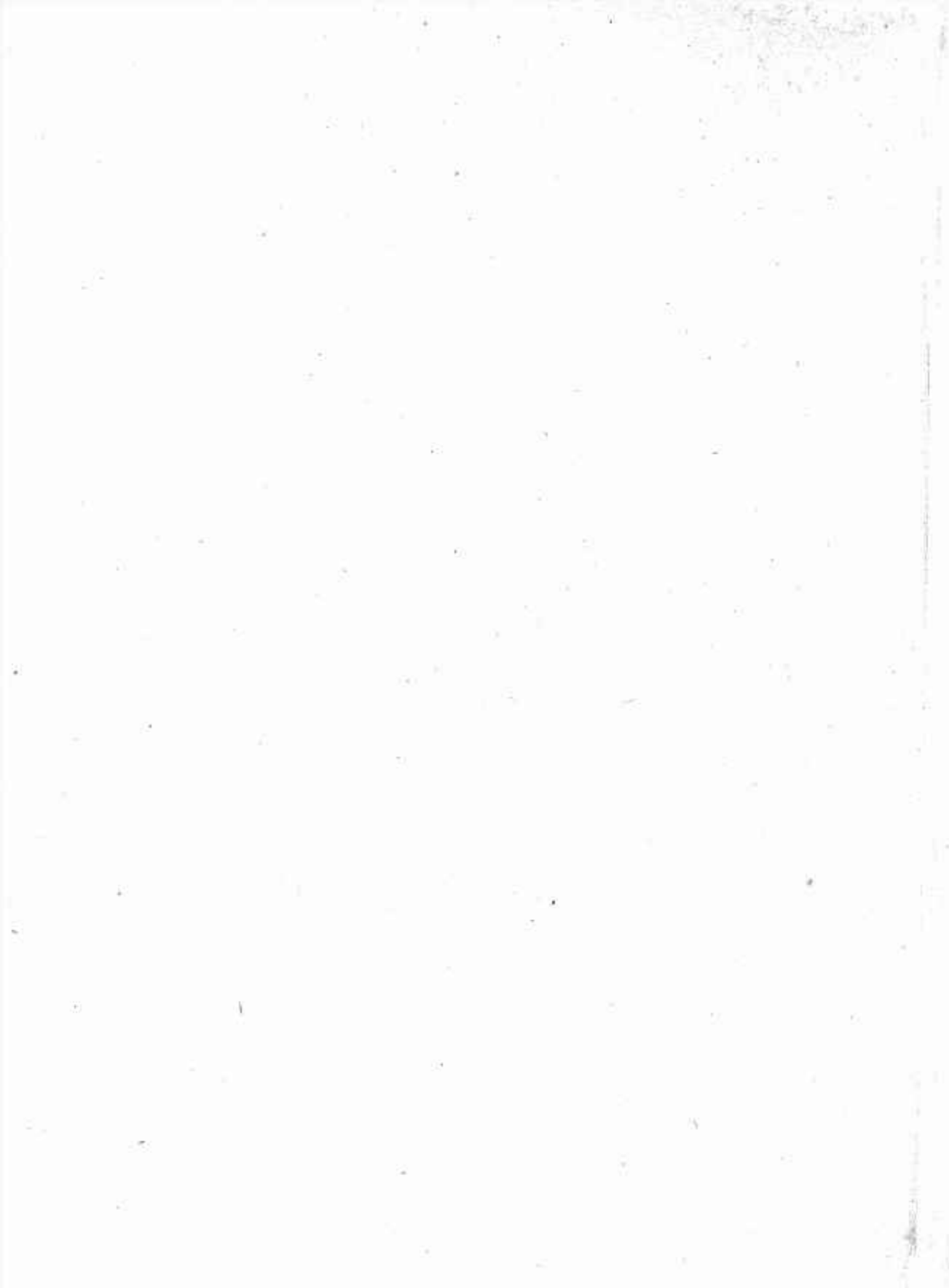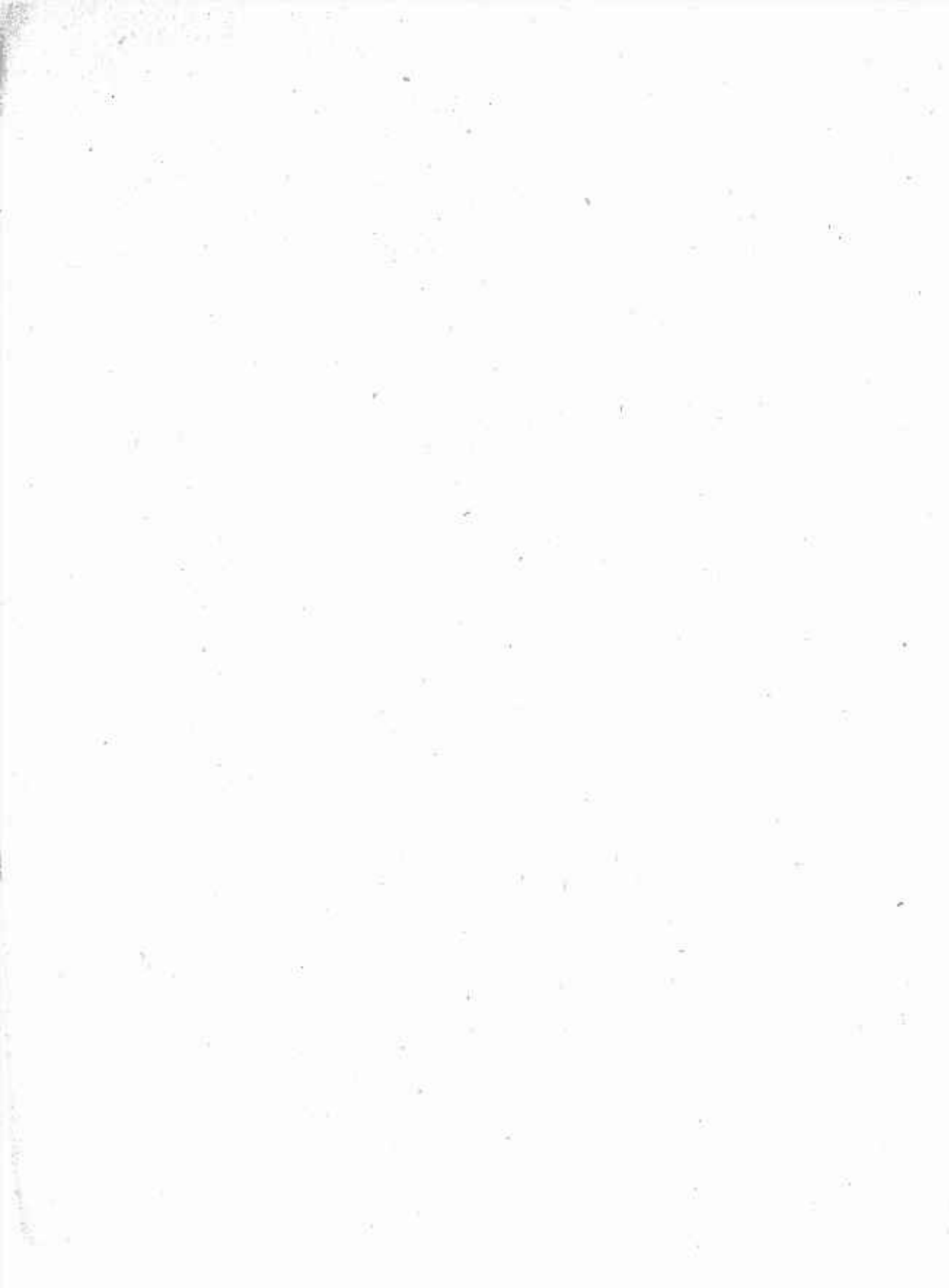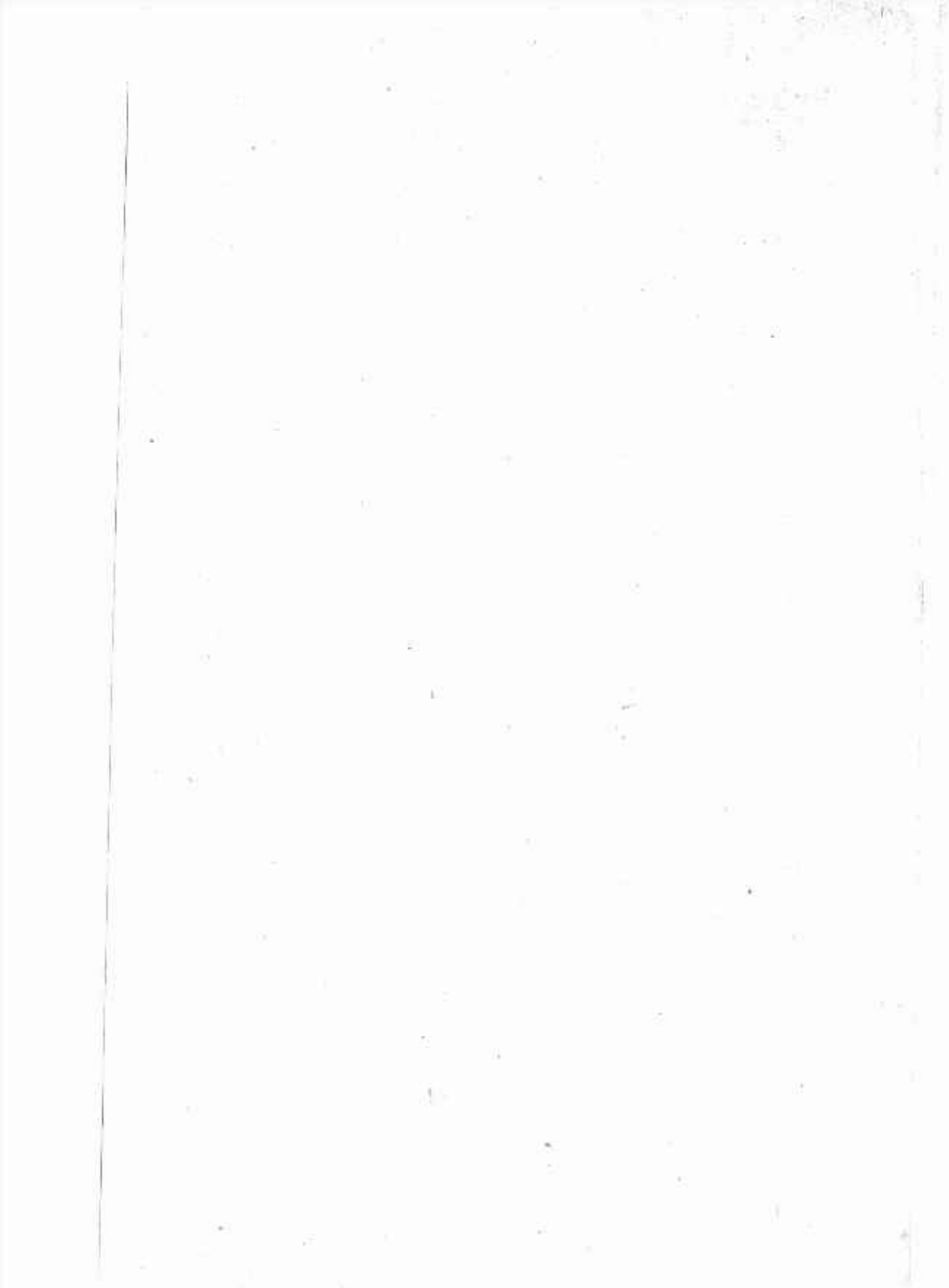
حضرت صادق آل محمدؑ نے حضرت صاحب الزمانؑ کی یاد میں زار و قطار روتے ہوئے فرمایا:

"اے میرے سردار! تیری غیبت نے میری نیند ختم کردی ہے اور میرے آرام کو چھین لیا ہے۔ اور میرے دل کا سکون برباد کر دیا ہے۔ میرے سردار! تیری غیبت نے میری مصیبت کو ہمیشہ کے مصائب تک پہنچا دیا ہے ایک کے بعد ایک کا مفقود ہو جانا ہمارے پیروکاروں کی تعداد کو کم کر دے گا۔ پس میں محسوس نہیں کرتا ہوں کہ میری آنکھ سے آنسو رکے گا یا سینے سے آہ و فغاں ختم ہوگی۔ پاس بیٹھے ہوئے صحابی سدیر کا کہنا تھا کہ جب یہ بات سنی تو ہمارے دل پھٹنے لگے اور ہم نے خیال کیا کہ کوئی ہلا دینے والی مصیبت آنے والی ہے یا زمانہ کی طرف سے آپ پر کوئی مصیبت نازل ہوئی ہے ہمارے سوال کے جواب میں امامؑ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور فرمایا میں نے آج صبح کتاب جفر میں ملاحظہ کیا ہے کہ ہمارے قائم کی غیبت بہت طولانی ہوگی۔ اس زمانے میں مومنین کی آزمائش ہوگی اور بہت سے مومنین کے قلوب میں شکوک و شبہات پیدا ہو جائیں گے۔

اسی بات کو خداوند تبارک و تعالیٰ نے قرآن میں اس طرح ارشاد فرمایا ہے" **وکل انسان الزمناه طائر فی عنقه** "اور ہر انسان کی طائر کو ہم نے اس کی گردن میں لازم قرار دے دیا ہے۔ یعنی ولایت اہلبیت کو ہر انسان کے لیے لازمی و ضروری قرار دیا ہے"

آج ضرورت اس امر کی ہے کہ نہ صرف حضرت صاحب الزمانؑ کے ظہور میں تعجیل کے لئے دُعائیں مانگی جائیں بلکہ آپ کے نام گرامی کو زیادہ سے زیادہ پکارا جائے۔ اس کی قابل تقلید مثال تہران شہر کی ہے جس میں اس وقت ستر ہزار افراد کے نام آپ کے نام پر موجود ہیں اور یہ تعداد روز افزوں بڑھ رہی ہے۔

بارالہا! اپنے حبیب محمد مصطفیٰؐ کو حضرتؑ کے دیدار سے خوشنود فرما اور ان کے ظہور سے امت کی مشکلات اور مصائب کو رفع فرما۔ آمین۔

التماس دعا

سید ذاکر علی زیدی